زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثالث

جلد ۔ ۸ تا ۱۰ شمارہ ۔ ۲۳ تا ۲۶

جولائی ۲۰۲۲ء تا جون ۲۰۲۳ء

مدیر اعزازی

اقبال حسن آزاد

مدیر

ثالث آفاق صالح

تزئین کار: اعجاز رحمانی

سرورق: محمد نعیم یاد (پاکستان)

رابطہ: : شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱

Mob.+91 9430667003

email.eqbalhasan35@yahoo.com

www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● ’ثالث‘ کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

● ’ثالث‘ کے اس شمارے کی قیمت ۷۰۰ روپے ہے۔

فہرست

	اداریہ	اقبال حسن آزاد	۶
	حمد	مرغوب اثر فاطمی	۹
	نعت	رؤف خیر	۱۰
	نظم	نصیر احمد ناصر	۱۱۔۱۲
غزلیں	ضیاء فاروقی، خالد جمال، ڈاکٹر ذکی طارق، شاہد اختر، فردوس گیاوی		۱۳ تا ۱۷
	ثالث افسانوی نشست میں شامل افسانوں کی فہرست	ادارہ	۱۸
ثالث عالمی	کھلا ہے باب سخن	ارشد عبد الحمید	۲۲
افسانویں	فن افسانہ نگاری...... چند اہم باتیں	اقبال حسن آزاد	۲۵
نشست کے	بیانیہ میں راوی کی مداخلت	خالد سعید رمکرم نیاز	۳۰
مضامین	علامتی افسانہ......تخلیقی مضمرات	ڈاکٹر ریاض توحیدی	۳۲
	علامت کیا ہے؟	سیدہ آیت گیلانی	۳۹
	جدید افسانہ کے خدوخال	ثمینہ سید	۴۵
	افسانے میں علامت کیا ہے؟	نوشی قیصر	۴۹
	افسانہ میں مسئلۂ ابہام	ساجد ہدایت	۵۲
	عالمی گاؤں میں معاصر اردو افسانے کی فکری اساس	عظیم اللہ ہاشمی	۵۵
	افسانوی نشست پر تاثرات	ادارہ	۷۱
	خطبۂ صدارت	حسین الحق	۹۳
ثالث عالمی	نیا عالمی چیپٹر	نعیم بیگ	۹۴
افسانویں	بار زیست	محمد جاوید انور	۱۰۲
نشست کے	تازہ ہوا کے شور میں	حسن امام	۱۰۸
افسانے	کووڈ کے ماتم دار	ذکیہ مشہدی	۱۱۲
	ادھورے	ہما فلک	۱۱۷

ثالث

کھیپ	شاہین کاظمی	۱۲۱
رکشہ والا	اقبال حسن آزاد	۱۲۷
افسانہ ہائے خواب	سید کامی شاہ	۱۳۳
سرنگ کے راستے	سبین علی	۱۴۱
اندھیرے میں	دلشاد نسیم	۱۴۵
ایک دوپہر	شاکر انور	۱۵۶
تم	احسان قاسمی	۱۶۵
درپردہ	عشرت ظہیر	۱۷۱
عکس برعکس	شفقت محمود	۱۷۷
مقدس سکہ	محمد شاہد محمود	۱۹۰
میری دلاری	فرحین جمال	۱۹۶
مفاہمت کا عذاب	اسرار گاندھی	۲۰۱
تحفوں کی تھیلی	ڈاکٹر صادقہ نواب سحر	۲۱۱
راجدھانی	کنول بہزاد	۲۱۹
سرنگ کی دوسری طرف	کوثر جمال	۲۲۴
دنانیر بلوچ	فارحہ ارشد	۲۲۸
تعویذ	م۔ص۔ایمن	۲۳۳
ریختہ	ریحان کوثر	۲۴۹
نیلو، ایفرووتی اور ایک خواب	معظم شاہ	۲۵۶
سوکھی باؤلی	مکرم نیاز	۲۵۹
مجھے گھر نہیں جانا	سارا احمد	۲۶۴
مٹی کی چڑیاں	شہریار قاضی	۲۷۲
خسارہ	سلیم سرفراز	۲۷۷
دو پیاسے	رفیع حیدر انجم	۲۸۴
ڈیٹنشن کیمپ	مقصود حسن	۲۸۹

ثالث

	داستاں ایک شجر کی	سیدہ آیت گیلانی	۲۹۲
	باغی	گل ارباب	۲۹۵
	بندھن کا بوجھ	ثمینہ سید	۳۰۵
	درد جب حد سے گذرتا ہے	اقبال مٹ	۳۰۹
	بڑے گھر کی بہو	نشاط پروین	۳۱۲
	گمشدہ آوازوں کا تعاقب	زویا حسن	۳۱۸
	لاش نامہ	رونددر جوگلیکر	۳۲۴
	سونے کا پیالہ	طارق شبنم	۳۳۳
	بلورین	راجہ یوسف	۳۴۱
	یوٹوپیا	امین کنجاہی	۳۴۵
	زقوم کی جانب	محمد ارشد کسانہ	۳۴۸
	ٹائم ٹیبل	آسیہ رئیس خان	۳۵۳
	فریب	نعیم یاد	۳۵۷
سلور جوبلی	بہار کی بہار	ڈاکٹر ابرار رحمانی	۳۶۰
نمبر کے	معاصر اردو فکشن: مسائل و امکانات	پروفیسر صفدر امام قادری	۳۹۸
مضامین	اکیسویں صدی میں اردو افسانہ...... بہار کے پس منظر میں	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	۴۱۵
	افسانوی ادب کا اک روشن ستارہ: عطیہ پروین	ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خان	۴۳۷
	اردو افسانہ ۱۹۸۰ء کے بعد	ڈاکٹر ارشد رضا	۴۴۷
	جاوید دانش کا ڈراما 'عید لاشوں کے دیش میں'	صابر رضا رہبر	۴۵۳
	پاکستان کے ماہر فن قلم کار: نعیم یاد	ڈاکٹر جگ موہن سنگھ	۴۶۶
	''ثالث'' ادب کی معتبر آواز	نیاز اختر	۴۷۴
سلور جوبلی	منتظر آنکھیں	ڈاکٹر شاہد جمیل	۴۷۷
نمبر کے	ایک تھا بادشاہ	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۴۸۹
افسانے	بے چہرگی	ڈاکٹر نگہت نسیم	۴۹۴
	ماموں میاں کا گھرانہ	امین صدر الدین بھایانی	۴۹۹

	نورگل کے حصے کی قیامت	اسحاق وردگ	۵۰۸
	بازگشت	شاہد اختر	۵۱۴
	نقب زن	فرحین چودھری	۵۲۵
	بے نشاں	انجم قدوائی	۵۳۰
	ٹھوکر	نسترن احسن فتیحی	۵۳۴
ثالث پر تبصرے	ڈاکٹر شاہد جمیل، عشرت ظہیر، سلیم انصاری، ڈاکٹر احسان عالم، رفیع حیدر انجم، فخر الدین عارفی، کامران غنی صبا، ڈاکٹر احسان تابش، صابر رضا رہبر، ڈاکٹر شاذیہ کمال، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ، ڈاکٹر خالدہ ناز، مظفر نازنین، محمد مرشد، ڈاکٹر توصیف احمد ڈار، ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر گیاوی، شبنم پروین، محمد معتصم باللہ، محمد ولی اللہ قادری، جرنلست اقبال۔		۵۳۶ تا ۶۳۰
تبصرے	آبیاژہ (غضنفر کے ناول)	مبصر اقبال حسن آزاد	۶۳۱
	دربھنگہ ٹائمز	مبصر اقبال حسن آزاد	۶۳۵
	سب رنگ	مبصر اقبال حسن آزاد	۶۳۸
	تیرہ افسانے	مبصر اقبال حسن آزاد	۶۳۹
	شفیع مشہدی کے افسانے	مبصر پروفیسر منظر اعجاز	۶۴۱
	جدیدیت کے علم بردار شمس الرحمٰن فاروقی	مبصر ڈاکٹر توصیف بریلوی	۶۴۶
	معاصر اردو افسانہ: فکری جہات اور ڈاکٹر مجیر احمد آزاد	مبصر ڈاکٹر منصور خوشتر	۶۴۸
	محبِّ اردو حمید انور اور بک امپوریم	مبصر بینام گیلانی	۶۵۲
مکتوبات	ضیاء فاروقی، شبیر احمد، مرغوب اثر فاطمی، اصغر شمیم، معتصم باللہ، نوشاد احمد کریمی، ابرار رحمانی، ڈاکٹر احسان تابش، اویناش امن		۶۵۸۔ ۶۶۴

◀ ● ▶

اس شمارے کی قیمت ۲۰۰/روپے ہے بیک کور پر دیے گئے کیو آر کوڈ کو سکین کر کے یا دئے گئے بینک اکاؤنٹ نمبر پر بھیجی جاسکتی ہے۔

ثالث ملنے کا پتا: بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بہار) 9304888739 91+

اداریہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر　　لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
(مجروح سلطان پوری)

الحمدللہ! ''ثالث'' کا عالمی افسانہ نمبر رسلور جوبلی نمبر منصۂ شہود پر آ گیا۔ یہ ایک بڑا پروجیکٹ تھا اس لیے اس کے مکمل ہونے میں اندازے سے زیادہ وقت لگ گیا لیکن دیر آید درست آید۔ اس نمبر کی داغ بیل اسی وقت پڑ گئی تھی جب میں نے فیس بک پر ''ثالث افسانوی نشست ۲۰۲۱ء'' کا انعقاد کیا تھا۔ اس افسانوی نشست کا پسِ منظر یہ ہے کہ اپریل ۲۰۲۱ء کے دوسرے ہفتے میں اپنی بیٹی ڈاکٹر فریحہ سبین سے ملنے رانچی گیا۔ وہ ان دنوں RIMS,RANCHI میں M.S کر رہی تھی۔ ارادہ تو پندرہ دنوں کا تھا مگر حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ مجھے وہاں تین مہینوں سے زیادہ قیام کرنا پڑا۔ لاک ڈاون کے باعث گھر سے باہر نکلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اب معاملہ یہ ہے کہ میرے اندر ایک بے چین روح ہے جو مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ بیکار مباش کچھ کیا کر کے مصداق مجھے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت ہے۔ ان ہی بیکار اور بے مصرف دنوں میں مجھے خیال آیا کہ ایک افسانہ ایونٹ کروایا جائے تا کہ وقت گزاری کے لیے ایک مشغلہ ہاتھ آئے۔ چنانچہ میں نے اس کا اعلان کر دیا۔ پروفیسر حسین الحق (مرحوم) اس نشست کے لیے صدر بنائے گئے۔ مہمان ذی وقار جناب نعیم بیگ (لاہور، پاکستان)، مہمان خصوصی جناب مشتاق احمد نوری (پٹنہ، انڈیا)، مہمان اعزازی جناب شبیر احمد (کولکاتا، انڈیا) اور خصوصی مبصرین میں جناب حسن امام (کراچی، پاکستان)، ڈاکٹر شاہد جمیل (پٹنہ، انڈیا) اور ڈاکٹر ریاض توحیدی (کشمیر، انڈیا) بنائے گئے۔ پھر کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے پاس بے شمار افسانے آ گئے۔ چونکہ اس سے پہلے میں کئی افسانہ فورم کے افسانوی ایونٹ میں شرکت کر چکا تھا اور چند ایک کا ایڈمن بھی رہ چکا تھا، لہٰذا مجھے اس کا کچھ نہ کچھ تجربہ ضرور تھا۔ ایک بات جو میں نے دیکھی کہ ساجھے کی ہانڈی بیچ چوراہے پر پھوٹتی ہے اور ایک فورم کئی ٹکروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ بدمزگی جو ہوتی ہے سو الگ۔ چنانچہ میں نے تن تنہا اس سفر کو طے کرنے کا ارادہ کیا اور سر سے کفن باندھ کر نکل کھڑا ہوا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر......لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ اگر آپ کا ارادہ مستحکم اور نیت صاف ہے تو پھر راستے کی دشواریاں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ میں نے ایک ایک کر کے سبھی افسانوں کو پڑھنا شروع کیا۔ جہاں تک ممکن ہو سکا ٹائپوز اور زبان و بیان کی غلطیوں کو درست کرتا گیا۔ بعض افسانوں میں افسانہ نگار سے مشورہ کر کے کچھ تبدیلیاں کیں۔ کسی کا عنوان بدل دیا اور کسی کا کلائمکس۔ ایک بڑے افسانہ نگار کے مشورے سے ان کے

افسانے کوایڈیٹ کیا۔پھر بھی کئی افسانوں میں کچھ غلطیاں رہ گئیں۔غلطی اسی سے ہوتی ہے جو کچھ کرتا ہے۔بیکار لوگ دوسروں کی غلطیاں ڈھونڈنے میں لگے رہتے ہیں۔(اگر کوئی آپ سے اصلاح کا طالب ہے تو وہ اور بات ہے۔) خیر! غلطیاں مجھ سے بھی ہوتی ہیں مگر میں اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہونے کے بجائے ان سے سبق سیکھتا ہوں۔

بہر کیف! افسانوں کے انتخاب اور درستی کے بعد اب اگلا مرحلہ بینرز کا تھا۔ برادرِ عزیز نعیم یاد نہایت عمدہ انسان ہیں۔شریف پرخلوص اور مہذب۔وہ پچھلے کئی برسوں سے میرے افسانوں کے بینر اور ''ثالث'' کا سرورق بناتے آرہے ہیں۔وہ ایک بہترین آرٹسٹ اور خلاقانہ ذہن کے مالک ہیں۔میں نے جب ان سے اس ایونٹ کے بینرز بنانے کی گزارش کی تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔اور اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے سبھی بینرز وقت پر بنا دیے۔بعض اوقات کسی بینر میں اگر کسی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے بغیر کسی حیل و حجت کے وہ کام کر دیا۔افسانوی نشست ختم ہو جانے کے بعد انہوں نے نہایت جاذبِ نظر اسناد بھی بنائے۔لہٰذا سب سے پہلے شکریے کے حقدار وہی ہیں۔

میں اپنی شریکِ حیات محترمہ نشاط پروین کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس کام میں انہوں نے میرا پورا پورا ساتھ دیا، وہ اس طرح کہ انہوں نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا۔وہ عام روایتی بیویوں کی طرح اپنے شوہر کی دم میں لگی نہیں رہتی ہیں اور مجھے سارے کام چین اور سکون کے ساتھ کرنے دیتی ہیں۔اس دوران مجھے وقت پر ناشتہ، کھانا، چائے اور پانی بھی دستیاب ہوتا رہا۔وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہونے کے ساتھ ایک اچھی افسانہ نگار بھی ہیں اور امورِ خانہ داری میں بھی ماہر ہیں۔اندرونِ خانہ اور بیرونِ خانہ کے سارے فرائض وہی انجام دیتی ہیں۔انہوں نے مجھے بالکل ہی ''آزاد'' چھوڑ دیا ہے۔ان کی عنایتوں کا شکریہ ادا کرنا تو ممکن ہی نہیں ہے۔

اس افسانوی نشست سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا اور میں افسانہ نگاری فنّی باریکیوں سے واقف ہوا۔ میں بھائی مشتاق احمد نوری، جناب ارشد عبدالحمید، ڈاکٹر شاہد جمیل، محترم غازی جی۔حسین، محترم بش احمد، محترم احسان قاسمی، محترم حسن امام، محترم عشرت ظہیر، محترم جاوید انور، محترم قیصر نذیر خاور، ڈاکٹر ریاض احمد توحیدی کاشمیری، بھائی رفیع حیدر انجم، محترم الیاس گوندل، محترم صلاح الدین درویش، محترم شفقت محمود، سید کامی شاہ، محترم نثار انجم، بھائی سرور مہدی سرور، محترم سید تحسین گیلانی، محترم محمد شاہد محمود، محترمہ افشاں ملک، محترمہ فارحہ ارشد، محترمہ اسماء حسن، محترمہ سید آیت گیلانی، محترمہ آنسہ ریحانہ، ڈاکٹر فریدہ بیگم، جناب اقبال مٹ اور محترمہ کوثر جمال کے عالمانہ تبصروں سے کافی متاثر ہوا۔ انہوں نے اپنی موجودگی سے اس نشست کو ایک وقار بخشا۔ان کے لیے شکریے کا لفظ ناکافی ہے۔

یہاں میں ایک نوجوان کی تعریف کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ان کا نام عظیم اللہ ہاشمی ہے۔یہ ایک

ابھرتے ہوئے تنقید نگار ہیں۔ان کا ایک مضمون ’ثالث‘ میں شایع ہو چکا ہے۔گو کہ میں نے ان کا افسانہ رجیکٹ کر دیا تھا لیکن بجائے برا ماننے کے وہ شروع سے آخر تک نہ صرف نشست میں شریک رہے بلکہ اپنے تبصروں سے بھی نوازتے رہے۔یہ اعلیٰ ظرفی کی بہترین مثال ہے۔میں ان کے اس جذبے کو سلام کرتا ہوں۔

اس نشست میں مجھے کئی نئے دوست ملے۔ میں ان کی محبتوں کا اسیر ہو کر رہ گیا ہوں۔ غازی جی۔حسین، بُش احمد، صلاح الدین درویش، شفقت محمود، نثار انجم، ابرار احمد صدیقی اور محمد شاہد محمود میں حلقۂ یاراں میں ان کا استقبال کرتا ہوں۔اس نشست کے بعض شرکاء زیادہ وقت نہیں دے سکے۔ساتھ ہی ساتھ بہت سارے ایسے افسانہ نگاروں نے بھی پہلو تہی کی جن کے افسانے میں بصد اہتمام ’’ثالث‘‘ میں شایع کرتا رہا ہوں میں جانتا ہوں کہ ہر شخص کی اپنی مصروفیتیں اور ترجیحات ہوتی ہیں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔یار زندہ صحبت باقی۔

اس نشست سے مجھے ذاتی طور پر یہ فائدہ پہنچا کہ میں رائٹرز بلاک سے باہر نکل آیا۔پچھلے کئی برسوں سے میں نے کوئی نیا افسانہ نہیں لکھا تھا۔کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں اب کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھ سکوں گا۔لیکن اتنے اچھے اچھے پیارے پیارے افسانوں کو جب اپنے اردگرد گھومتے پھرتے، اٹھکیلیاں کرتے دیکھا تو میرے اندر کا قلم کار انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔اور میں نے بھی ایک افسانہ لکھ مارا۔ کیونکہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا لہذا میں نے یہ افسانہ ایک ہی نشست میں مکمل کر لیا۔اب میں اسے دوبارہ لکھوں گا اور مبصروں کی آرا کی روشنی میں اسے بہتر بنانے کی کوشش کروں گا۔جن احباب نے اس نشست کی خامیوں یعنی comingsShort کی جانب اشارہ کیا ہے ان کا بھی شکریہ۔اگلے ایونٹ میں ان کے گرانقدر مشوروں کا ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔

اس نشست میں شامل مضامین اور افسانوں کا ایک انتخاب عالمی افسانہ نمبر میں پیش کیا جا رہا ہے۔افسوس کہ اس نمبر میں بہت سارے عمدہ افسانے جگہ نہیں پا سکے۔ان شاء اللہ وہ آئندہ شماروں میں شامل کیے جائیں گے۔

چونکہ اس شمارے کے ساتھ رسالے کے ۲۶ شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں لہذا اسے سلور جوبلی نمبر سے بھی موسوم کر دیا گیا۔اس حصے میں وہ شعری اور نثری تخلیقات شامل ہیں جو افسانوی نشست کا حصہ نہیں تھیں۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین واثق ہے کہ قارئین ثالث کے سابقہ شماروں کی مانند اسے بھی اپنی محبتوں سے نوازیں گے۔

’’ثالث‘‘ اپنے دسویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ رسالے کی ویب سائٹ کو دم تحریر ترسٹھ ہزار (۶۳۰۰۰) سے زائد بار وزٹ کیا جا چکا ہے۔آپ بھی درج ذیل لنک پر جا کر رسالے کے تمام شماروں کو نہ صرف پڑھ سکتے ہیں بلکہ ڈاؤن لوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

www.salismagazine.in

◆◆ ● ◆◆

● مرغوب اثر فاطمی

حمد باری تعالیٰ

عجب ہے شان کہ اسباب سے مبرا ہے
کتاب عقل کے ابواب سے مبرا ہے

وہ بے نیاز ہے، جیسے پکار لو اس کو
اسی کی ذات، جو القاب سے مبرا ہے

وہی تو ہے جو ہے فہم و گماں سے بالا تر
مقام اس کا ہے کون و مکاں سے بالا تر

تلاشِ حق کی ہر اک رہ وہیں پہنچتی ہے
ولے وہ مخفی ہے، نقش و نشاں سے بالا تر

اسی کے اذن سے وصفِ حیات بٹتی ہے
نوازشات کی صورت ممات بٹتی ہے

وہ ایک نقطہ برابر کہیں نہیں موجود
مگر وہیں سے بنِ کائنات بٹتی ہے

فروغِ ذہن ازل سے ہی اختلاف میں ہے
بھلے ثبات کا پہلو ہر انحراف میں ہے

وہ ہے نگاہِ بصیرت میں ذو فشاں بے شک
یہ اور بات کہ تجرید کے غلاف میں ہے

بس اس کی فہم ہی تکریم ہے ذہانت کی
کہاں ہے اس کو ضرورت کسی عبادت کی

نظامِ شمس و قمر، ارض و جملہ موجودات
نشانیاں ہیں اثرؔ اس کی بادشاہت کی

◀◀ ● ▶▶

Road No;7
Mohalla Ali Gunj
Gaya-823001

● رؤف خیرؔ

نعت پاک

بے فیض ہیں منہ دیکھی عقیدت کے قرینے
مانا ہی اگر دل سے نبیؐ کو نہ کسی نے

اب اپنی کوئی تیسری منزل ہی نہیں ہے
مکے سے اٹھے ہم تو چلے آئے مدینے

جب بھی مرے آقاؐ نے کوئی حکم دیا ہے
آمنا و صدقنا کہا فوری سبھی نے

سرکارؐ یہ کہہ کر کہ لمن غیّر بعدی!
اک گھونٹ بھی کوثر کا نہ دیں گے انھیں پینے

دعویٰ ہے جنھیں عشق نبیؐ عشق نبیؐ کا
رکھا نہ کہیں کا بھی انھیں بے عملی نے

اسلام کے دو رکھے ہیں اپنے ہی حوالے
فرمانِ الٰہی و حدیثِ نبوی نے

میں خیرؔ ہوں منسوب اک ایسے ہی نبیؐ سے
مانے گی جسے مانا ہے ہر ایک صدی نے

◀◀ ● ▶▶

Moti Mahal, Golconda Hyderabad 500008
cell : 9440945645 email : raoofkhair@gmail.com

● نصیر احمد ناصر

میں تمہارے لیے خط نہیں نظم لکھنا چاہتا ہوں

روز سوچتا ہوں
تمہارے لیے ایک خط لکھوں
اور ہوا کے سپرد کر دوں
پھر خیال آتا ہے
آوارہ مزاج ہوا کا کیا ٹھکانا، کیا بھروسا
وہ خط تم تک پہنچانے سے پہلے
کہیں گم کر دے گی
پل بھر کسی آنگن، کسی برآمدے میں رُکی
یا کسی باغ میں رکھی بان کی چارپائی پر بیٹھی
تو خط وہیں پڑا رہ جائے گا
اور باغ سے پھل چوری کرنے والے بچوں کے ہاتھ
لگ جائے گا
ہوا کا کیا ہے
سورج مکھی کے کھیتوں میں
یا کسی جھیل کے کنارے رکھ کر
اٹھانا بھول جائے گی
یا زگ زیگ پہاڑی راستوں پر چلتے ہوئے
اس کے پاوں پھسل گئے
تو خط بھی کسی نشیب میں جا گرے گا
یا جھاڑیوں میں اٹک کر پھٹ جائے گا
راستے میں بارش ہوئی
تو الفاظ پانی بن کر بہ جائیں گے
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بے دھیانی میں
ہوا اسے کسی متروک، خالی گھر کے لیٹر بکس میں ڈال دے
یا تمہاری بجائے
غلطی سے کسی اور گھر کی بالکونی میں پھینک دے
جسے کوئی اور لڑکی پڑھ لے
جس نے کبھی محبت نہ کی ہو
اور وہ خط اسے محبت آشنا کر دے
یہ بھی ہو سکتا ہے
وہ خط تم تک پہنچ جائے
جو کبھی لکھا ہی نہیں گیا تھا!

◄◄ ● ►►

● نصیر احمد ناصر

تم خدا کی لکھی ہوئی ایک نظم ہو

تم ایک نظم ہو
جسے خدا نے لکھا ہے
میں تمہارے خوابوں کی سرزمین میں
ہر جگہ آ جا سکتا ہوں
ہوا کی طرح سرگوشیاں کرتے
یا بادلوں کی طرح
بے آواز چلتے ہوئے
تم ایک پُراسرار گیت ہو
جسے گاتے ہوئے

لب آوازیں بھول جاتے ہیں
اور خاموشیاں گنگنانے لگتی ہیں
میں تمہارے خوبصورت اوطاقوں پر
عقیدتوں کے چراغ جلاؤں گا
تمہاری مقدس گھاٹیوں میں
محبت کے سفید پھول کھلاؤں گا
تمہاری گولائیوں اور قوسوں پر
اقلیدس کی نت نئی اشکال
اور تمہارے نشیب و فراز پر
ڈھلتی ہوئی نارنجی شاموں کے عکس بناؤں گا

اگر لفظوں کو اجازت ہوتی
تو وہ تمہارے وجود کی تختی پر
میری سب سے اچھی نظم بن کر اترتے
تمہیں استعاروں کے لمس سے نہال کر دیتے
علامتیں تمہاری حقیقتوں سے ابدی وصال کرتیں
اور زندگی کے پیکر
تمہارے رگ و پے میں
معانی کی سیال خوشبو بن کر پھیل جاتے
لیکن تم تو خدا کی لکھی ہوئی نظم ہو
میں تمھیں کیسے لکھوں!

◄◄ ● ►►

Editor"Tasteer"
Rawalpindi
Pakistan

ضیاء فارقی

پسِ اشارہ کوئی درد جھانکتا ہوا سا
مجھے لگا تھا وہ لہجے سے بھی تھکا ہوا سا

دیے کی لو سے نکلتا ہوا دھواں جیسے
ہوا کے پاؤں میں زنجیر ڈالتا ہوا سا

یہ کون ہے کہ جو ہے تشنگی کے صحرا میں
ہر اک سراب کو ہونٹوں سے کاٹتا ہوا سا

ترا خیال بھی جیسے کہ ایک جگنو ہے
حیات تیرہ کو میری اجالتا ہوا سا

قدم قدم پہ بدلتا ہے زاویہ اپنا
مرا ہی سایہ مجھی کو سنبھالتا ہوا سا

یہ کون ہے جو فضا کی سنہری کرنوں سے
کوئی طلسم زمیں پر اتارتا ہوا سا

فقیر بیٹھا ہے فٹ پات پر لیے کشکول
نفس نفس کی تھکن کو اتارتا ہوا سا

وہی مکاں ہے وہی بام و در وہی قصے
ضیاؔ یہ میں ہوں کہ بجھ کوئی بجھا ہوا سا

◀◀ ● ▶▶

زمیں پہ بیٹھ گئے آسماں کے ہوتے ہوئے
کہاں مکاں بنایا کہاں کے ہوتے ہوئے

انا پرست رہے رائگاں کے ہوتے ہوئے
یقین کو منھ نہ لگایا گماں کے ہوتے ہوئے

نکل سکے نہ طلسم سراب سے باہر
نظر کے سامنے آب رواں کے ہوتے ہوئے

یہ لگ رہا ہے کہ سب سو گئے ہیں بستی میں
عجب سکوت ہے شور سگاں کے ہوتے ہوئے

سنتا کون یہاں داستانِ تشنہ لباں
کنار آب صف کشتگاں کے ہوتے ہوئے

تھے مہربان بھی مجھ پر بہت مرے آلام
ہر ایک گام پہ نامہرباں کے ہوتے ہوئے

سنے بھی کیوں کوئی رودادِ غم ضیاؔ میری
زبانِ غیر سے اپنے زباں کے ہوتے ہوئے

◀◀ ● ▶▶

M. H. K. I. T. C.
Noor Mahal Road
Bhopal .462001 - (M. P.)
Mob 09685972242

خالد جمالؔ

رات کی پشت پناہی کرتے
وہ جو گزرا تو تباہی کرتے
دور ساحل سے نکل جاتی ہیں
کشتیاں نغمہ سرائی کرتے
سبزۂ خواب کہاں تک ٹکتے
یاں ہوا گزری تباہی کرتے
خاک زادوں سے کہاں ممکن تھا
خون کی عقدہ کشائی کرتے
زندگی تو بھی ہماری ہوتی!
عمر گزری ہے دہائی کرتے
خوب تنہائی نہ اتنا ہوتا
کاش رشتوں کی کمائی کرتے
مکت ہو جاتے سبھی بندھن سے
ہم کبھی اپنی رہائی کرتے
آپ کو مجھ سے کہاں رغبت تھی
آپ کیوں میری گواہی کرتے
رنگ زاروں کی طرف آ نکلے
وحشت شب سے رہائی کرتے

◄● ►

فتنہ سامانی و شر باندھتے ہیں
آ ترا مد و جزر باندھتے ہیں

یہ زمیں پاؤں سے لگتی ہی نہیں
آؤ اب رخت سفر باندھتے ہیں

چارہ گر کوئی نہیں کوئی نہیں
بے سبب رقص ہنر باندھتے ہیں

خون کا ربط حسیں اپنی جگہ
کچے دھاگوں سے ہی گھر باندھتے ہیں

نقد سودائے جنوں لے کے چلو
پھر کوئی عزم سفر باندھتے ہیں

گل تو کھلتے ہی پتا دیتے ہیں
ان ہواؤں سے خبر باندھتے ہیں

◄● ►

B. 17/33 A-1, Tilbhandeshwar,
Varanasi Mobile : 9838202248
e-mail: jamalkhalid700@gmail.com

ڈاکٹر ذکی طارق

آنکھ روئی خیال بھیگ گیا
ہجر کا اک سال بھیگ گیا

کیا کہوں آج دیکھ کر اس کو
میرا ذوقِ جمال بھیگ گیا

جب تفکر کی آندھیاں اٹھیں
جو بنا تھا وہ جال بھیگ گیا

دیکھ کر آج بام پر ان کو
بھولنے کا خیال بھیگ گیا

خواب آنگن میں دیکھ کر ہجر
دل میں میرے وصال بھیگ گیا

رات یادوں پہ ایسی اوس پڑی
جسم کا بال بال بھیگ گیا

بات کیا ہے شب فرق ذکی
میرے دل کا ملال بھیگ گیا

◀◀ ● ▶▶

دلِ خانہ خراب ٹوٹا ہے
جیسے کوئی حباب ٹوٹا ہے

قہر ٹوٹا عذاب ٹوٹا ہے
ان کا مجھ پر عتاب ٹوٹا ہے

انگلیاں ساز پر نہیں چلتیں
زندگی کا رباب ٹوٹا ہے

ہجر کی سن کے آج تعبیریں
وصل لمحوں کا خواب ٹوٹا ہے

یہ صدا سنگ ٹوٹنے کی نہیں
شیشہ دل کا جناب ٹوٹا ہے

جب بھی میں نے کتاب دل کی پڑھی
ہر تعلق کا باب ٹوٹا ہے

میرے حسنِ سوال پر طارق
اس کے لب پر خواب ٹوٹا ہے

◀◀ ● ▶▶

564- Kela Road Gaushala Phatak,
Ghaziabaad, (UP)
Mob: 9818860029

شاہد اختر

شور گر یہ بھی رہا بزم گل افشانی میں
کوئی لذت نہ رہی لذتِ امکانی میں

میں نے دیکھے ہیں برے دن بھی مگر میرے رفیق
فرق آیا نہ مرے جذبۂ ایمانی میں

خود کو رکھتا ہوں ترو تازہ مگر کیا کیجئے
اِن دنوں میں بھی نہیں اپنی نگہبانی میں

سجدہ ریزی کا ہنر راس نہ آیا یعنی
کچھ چمکتا ہی نہیں اب مری پیشانی میں

اتنا سادہ بھی نہیں جتنا نظر آتا ہوں
زندگی گزری مری بے سرو سامانی میں

ناخدا ہو کہ خدا ہو کہ کوئی شاعر ہو
کون دُنیا میں نہیں زعم ہمہ دانی میں

گونجتی رہتی ہیں معنی کی صدائیں ہر سمت
لفظ سب بہہ گئے اظہار کی طغیانی میں

اتنا آسان نہیں توڑنا مجھ کو اختر
خار بھی ہوتے ہیں پھولوں کی نگہبانی میں

◀◀ ● ▶▶

آئے گا اعتبار نہ بے اعتبار کو
سمجھا ہے جس نے خار گلِ لالہ زار کو

ہر شخص مجھ سے ملتا ہے میری طرح یہاں
ہر شخص جانتا ہے مرے انکسار کو

اب کون دیکھتا ہے کسی کی طرف کبھی
اب کون پوچھتا ہے کسی غم گسار کو

کم لوگ جانتے ہیں مذاق سخن شریف
کم لوگ راس آئے غزل کے دیار کو

کچھ روز اپنی آنکھوں کے آنسو تو پونچھ لو
ہنستے ہوئے بھی دیکھ کبھی سوگوار کو

حالانکہ میرا حافظہ مضبوط ہے مگر
کب تک رکھوں گا یاد میں گزری بہار کو

اختر غضب ہے دن کے اُجالے میں عمر بھر
میں ڈھونڈتا رہا ہوں شب انتظار کو

◀◀ ● ▶▶

Gaya College, Gaya,
Bihar-823 001

فردوسؔ گیاوی

کہہ رہا ہے مجھے سنورنے کو
کوئی نسخہ بتا بکھرنے کو

زندگی اور نہ سمیٹ مجھے
میں ہوں تیار اب بکھرنے کو

اور کچھ روز تو ٹھہر جاتے
کس نے تم کو کہا تھا مرنے کو

سامنا میں اجل سے کر لوں گا
موت سے اب نہیں میں ڈرنے کو

تو کہے گا تو ڈوب جاؤں گا
کوئی رستہ بتا ابھرنے کو

جا کہیں اور جا کے ڈیرہ ڈال
کس نے بولا یہاں ٹھہرنے کو

ڈوبتا ہے تو ڈوب جانے دو
کس نے دل میں کہا اترنے کو

اُسی پٹری پہ ہے کھڑا فردوسؔ
جس سے اک ریل ہے گزرنے کو

دیکھا تھا جس کو موسیٰ نے منظر اٹھا کے لا
آنکھوں میں جس کو رکھ لوں وہ گوہر اٹھا کے لا

جا کوہِ طور سے تو پیمبر اٹھا کے لا
ملتے نہیں ہیں گر وہ تو کنکر اٹھا کے لا

اونچا رہا ہے سچ کا ہمیشہ سے سر یہاں
سر کاٹ لے جو سچ کا وہ خنجر اٹھا کے لا

ظلم وستم کے سامنے سینہ سپر ہوں میں
طوفانِ ظلم و جور و ستم گر اٹھا کے لا

مانا کے اس کے قد کے برابر نہیں ہوں میں
کوئی تو میرے قد کے برابر اٹھا کے لا

فردوسؔ ہو نہ پایا کبھی حوصلہ شکن
تو بھی عدو کا جا، کوئی لشکر اٹھا کے لا

Arif Nagar, Gewal Bigha
Gaya. Mob: 9546037777

ثالث افسانوی نشست ۲۰۲۱ء میں شامل افسانوں کی فہرست

نمبر شمار	عنوان افسانہ	افسانہ نگار
۱	نیا عالمی چیپٹر	نعیم بیگ (لاہور، پاکستان)
۲	بارِ زیست	محمد جاوید انور (لاہور، پاکستان)
۳	تازہ ہوا کے شور میں	حسن امام (کراچی، پاکستان)
۴	انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند	مونا شہزاد (کیلگری، کینیڈا)
۵	تحفوں کی تھیلی	صادقہ نواب سحر (کھپولی، مہاراشٹرا، انڈیا)
۶	ادھورے	ھما فلک (جرمنی)
۷	دو پیاسے	رفیع حیدر انجم (ارریا، بہار، انڈیا)
۸	داستانِ شوقین	ڈاکٹر ریاض توحیدی (کشمیر، انڈیا)
۹	کھیپ	شاہین کاظمی (سوئیٹزرلینڈ)
۱۰	میری دلاری	فرحین جمال (واٹرلو، بیلجیئم)
۱۱	نیلو، ایفرودیتی اور ایک خواب	معظم شاہ (کیملپور، پنجاب، پاکستان)
۱۲	سرنگ کے راستے	سبین علی (لاہور، پاکستان)
۱۳	ریختہ	ریحان کوثر (کامٹی، مہاراشٹر، انڈیا)
۱۴	سوکھی باؤلی	مکرم نیاز (حیدرآباد، انڈیا)
۱۵	تُم	احسان قاسمی (پورنیہ، بہار، انڈیا)
۱۶	ایک دوپہر	شاکر انور (کراچی، پاکستان)
۱۷	مٹّی کی چڑیاں	شہریار قاضی (اوکاڑہ، پاکستان)
۱۸	وکاس	تنویر احمد تمّاپوری (ریاض، سعودی عرب)
۱۹	رامین اور وہ	نشاط یاسمین خاں (کراچی، پاکستان)
۲۰	در پردہ	عشرت ظہیر، (گیا، بہار، انڈیا)
۲۱	داستان ایک شجر کی	سیدہ آیت گیلانی (ساہیوال، پاکستان)

ثـــــالـــــث

۲۲	ست رنگی سپنے	فریدہ نثار احمد انصاری (دوحہ،قطر)
۲۳	زقوم کی جانب	محمد ارشد کسانہ (پونچھ، جموں اینڈ کشمیر، انڈیا)
۲۴	بندھن کا بوجھ	ثمینہ سید (لاہور، پاکستان)
۲۵	درد جب حد سے گزرتا ہے	اقبال مٹ (پنجاب، پاکستان)
۲۶	خسارہ	سلیم سرفراز (آسنسول، مغربی بنگال، انڈیا)
۲۷	آخری فیصلہ	ڈاکٹر خالدہ ناز (بھاگلپور، بہار، انڈیا)
۲۸	گمشدہ آوازوں کا تعاقب	زویا حسن (سیالکوٹ، پاکستان)
۲۹	ببر شیر	عبدالشکور جاذب (جھنگ، پاکستان)
۳۰	رنگ بدلتی زندگی	ڈاکٹر فاطمہ خاتون (کولکاتا، انڈیا)
۳۱	محافظ	پرمود بھارتیہ (دہرادون، اتراکھنڈ، انڈیا)
۳۲	افسانہ ہائے خواب	سید کامی شاہ (کراچی، پاکستان)
۳۳	نجات	مریم تسلیم کیانی (کراچی، پاکستان)
۳۴	ٹائم ٹیبل	آسیہ رئیس خاں (ممبئی، انڈیا)
۳۵	ایک رات	توصیف مجید لون (نائل، اسلام آباد، جموں کشمیر، انڈیا)
۳۶	جانِ اماّں	رفعت امان اللہ (فیصل آباد، پاکستان)
۳۷	آخری بارش کا پانی	اکبر شیخ اکبر (بہاول پور، پاکستان)
۳۸	لاش نامہ	روندر راجو گلیکر (بھوپال، مدھیہ پردیش، انڈیا)
۳۹	کنگن	صبیحہ تزئین (کولکاتا، انڈیا)
۴۰	اندھیرے میں	دلشاد نسیم (لاہور، پاکستان)
۴۱	چٹنّی	ناصر صدیقی (کراچی، پاکستان)
۴۲	کووِڈ کے ماتم دار	ذکیہ مشہدی (پٹنہ، بہار، انڈیا)
۴۳	ڈیٹینشن کیمپ	مقصود حسن (کولکاتا، انڈیا)
۴۴	خاموشی	نوشی قیصر (لندن، یوکے)
۴۵	روبوٹ	عمار نعیمی (لاہور، پاکستان)
۴۶	نئی صدی کی کربلا	ڈاکٹر صوفیہ شیریں (کولکاتا، انڈیا)

۴۷	سونے کا پیالہ	طارق شبنم (سرینگر، کشمیر، انڈیا)
۴۸	مقدس سکّہ	محمد شاہد محمود (فیصل آباد، پاکستان)
۴۹	نیل پالش	سیمیں درّانی (بہاول پور، پاکستان)
۵۰	سُراب	نوشابہ خاتون (پٹنہ، بہار، انڈیا)
۵۱	بلورین	راجہ یوسف (اننت ناگ، کشمیر، انڈیا)
۵۲	بے نامی	امجد جاوید (حاصل پور، پنجاب، پاکستان)
۵۳	چوری	سمیرا عابد (لاہور، پاکستان)
۵۴	باغی	گل ارباب (پشاور، پاکستان)
۵۵	چمگاڈر	خالد شیخ طاہری (جامشورو، سندھ، پاکستان)
۵۶	عکس برعکس	شفقت محمود (کراچی، پاکستان)
۵۷	دستک	محمد شمشاد (رانچی، جھارکھنڈ، انڈیا)
۵۸	راجدھانی	کنول بہزاد (لاہور، پاکستان)
۵۹	پتھر	محمد ریاست (کراچی، پاکستان)
۶۰	مجھے گھر نہیں جانا	سارا احمد (لاہور، پاکستان)
۶۱	سیاہ نامہ	فوزیہ مغل (جرمنی)
۶۲	تضاد	ڈاکٹر عائشہ فرحین (گلبرگہ، کرناٹک، انڈیا)
۶۳	سرنگ کی دوسری طرف	کوثر جمال (سڈنی، آسٹریلیا)
۶۴	تیسرا دن	شفا چودھری (خانیوال، پاکستان)
۶۵	تھوک	فاطمہ عثمان (راولپنڈی، پاکستان)
۶۶	نارسائی	فرحانہ صادق (کراچی، پاکستان)
۶۷	خواجہ صاحب	سید صداقت حسین (کراچی، پاکستان)
۶۸	ادھورا وجود	ڈاکٹر شکیل احمد خان (کراچی، پاکستان)
۶۹	نوراڈنگر	شعیب افضل (گوجر خان، پاکستان)
۷۰	دنانیر بلوچ	فارحہ ارشد (لاہور، پاکستان)
۷۱	فریب	نعیم یاد (خوشاب، پاکستان)

۷۲	بڑے گھر کی بہو	نشاط پروین (مونگیر، بہار، انڈیا)
۷۳	خون آلود ہاتھ	سید نصرت بخاری (اٹک، پاکستان)
۷۴	دستک اور پکنک	ڈاکٹر فریدہ تبسم (گلبرگہ، کرناٹک، انڈیا)
۷۵	ویران آنکھوں کا کرب	شفا ناز کنول (ملتان، پاکستان)
۷۶	محروم تمنّا	ہاجرہ عمران خان (لاہور، پاکستان)
۷۷	مفاہمت کا عذاب	اسرار گاندھی (الٰہ آباد، یوپی، انڈیا)
۷۸	یوٹوپیا	امین کنجاہی (اسلام آباد، پاکستان)
۷۹	الوداع	ارشد منیم (مالیر کوٹلہ، پنجاب، انڈیا)
۸۰	رکشہ والا	اقبال حسن آزاد (مونگیر، بہار، انڈیا)
۸۱	تعویذ	م۔ص۔ ایمن (کراچی، پاکستان)
۸۲	اتلافِ عظیم	غازی جی۔ حسین (شیخوپورہ، پاکستان)

اقبال حسن آزاد

کی کتابیں

قطرہ قطرہ احساس (افسانے)   مردم گزیدہ (افسانے)

پورٹریٹ (افسانے)

نثری اصنافِ ادب اور طنز و مزاح کی روایت (تحقیق)

زیر طبع

اوس کے موتی (افسانے)

● ارشد عبدالحمید

کھلا ہے بابِ سخن

حالات نے دنیا کو کم مائیگی کے جس بدترین احساس سے دوچار کر رکھا ہے اس کے سد باب کے لیے ماہرین اپنے طور پر کوشاں ہیں لیکن نفسیاتی سطح پر یاس و حرماں کے چکرویوہ سے نکلنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو تخلیقی کارگزاریوں کی جانب مبذول کرنے سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں۔ جناب اقبال حسن آزاد نے سہ ماہی ''ثالث'' مونگیر کی افسانوی نشست ۲۰۲۱ء کا اعلان کر کے نہ صرف خیر کی ایک راہ نکالی بلکہ ہمیشہ کی طرح ادب اور افسانے کی خدمت کا ایک اور بیڑا اٹھا لیا۔ یہ دیکھ کر مزید اطمینان ہوا کہ اپنے رسالے کی طرح انھوں نے اس نشست کو بھی ادب کے معتبر مجاہدین سے آراستہ کیا ہے اور اسی بنا پر قوی امید ہے کہ یہ نشست نہ صرف کامیاب ہوگی بلکہ ایک معیار قائم کرے گی۔ میں ان کی خدمت میں مبارک باد اور نیک خواہشات پیش کرتا ہوں اور صدرِ محترم سے لے کر جملہ مہمانانِ خصوصی، تمام تخلیق کار حضرات اور قابل مبصرین کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہوں کہ اصل میں انھی کی مساعیِ جمیلہ سے اس نشست کو کامیابی حاصل ہوگی۔

جہاں تک افسانے کا تعلق ہے، عالمی ادب ہی کیا اردو میں بھی افسانے کے آغاز کو اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ اب بنیادی نوعیت کے بہت سے مسائل کا حل نہ سہی، یہ جواز تو مل ہی گیا ہے کہ ہم ان مسائل سے آگے کے بارے میں غور و فکر کریں مثلاً اکثر نو واردانِ ادب افسانے میں دل چسپی، تجسس، زبان و بیان یا پلاٹ، کردار اور دیگر امور پر استفسار کرتے ہیں تو جواب یہی ہوتا ہے کہ یہ سب افسانے کا ذریعۂ تخلیق (medium) ہیں۔ جس طرح لوہے کا کام کرنے والا لوہے کی تمام دستیاب صورتوں سے نہ صرف واقف ہوتا ہے بلکہ لوہے کو موم بنا کر مختلف ہیئتوں میں ڈھالنے کا ہنر جانتا ہے اسی طرح افسانہ نگار پر لازم ہے کہ وہ زبان، اسالیب اور تکنیک کے آہن کو موم کی طرح استعمال کرنے پر قادر ہو۔ اس میں کسی حیل حجت کی گنجائش نہیں۔ حقیقت اور تخیل کی بحث کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ہمیں اس سے بھی باہر نکل آنا چاہیے۔ کامیاب ادبی تخلیق میں جو نتیجہ خیز تجربہ بیان ہوتا ہے وہ ہمیشہ صداقت پر مبنی ہوتا ہے۔ ہم حقیقت، جادوئی حقیقت اور مافوق الفطرت وغیرہ پر اب کوئی بحث نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ اسالیب ہیں، سچ اور جھوٹ کا پیمانہ

نہیں۔سب جانتے ہیں کہ اسلوب کی جاذبیت اور کامیابی کا مدار فن پارے سے مترشح ہونے والے نتیجہ خیز تجربے سے ہم آہنگی اور موزونیت پر ہے۔ یہ اصول نہیں بنایا جاسکتا کہ حقیقت نگاری پر مبنی افسانہ ہر حال میں اچھا ہوگا اور غیر حقیقی عناصر سے مملو افسانے کا خراب ہونا لازمی ہے......نہیں۔ بالکل نہیں۔اب معیار یہ ہونا چاہیے کہ فنکار نے مترشح نتیجہ خیز تجربے کے لیے حقیقت یا تخیل کا جو بھی اسلوب اپنایا ہے وہ اس افسانے کی مجموعی کامیابی کے لیے کتنا ناگزیر اور کارآمد ہے؟

بالکل یہی مسئلہ راست بیانیہ اور علامت وغیرہ کا ہے۔ یہ افسانے کے مقصود بالذات عناصر نہیں۔ یہ بھی اسالیب ہیں...... اور ان میں کسی کو کسی پر کوئی اقداری فوقیت حاصل نہیں۔ ہر اسلوب کی اپنی خوبیاں اور حدود ہوتی ہیں۔ بیانیہ کا اپنا لطف ہے اور علامت کی اپنی خصوصیات۔تمام تر مسئلہ اپنے موضوع، اپنے تجربے اور اپنے تأثر کے اظہار کے لیے موزوں ترین اسلوب کے انتخاب کا ہے۔ اگر یہ انتخاب درست ہے تو آپ بیانیہ کی برکات کو علامت سے نہیں بدل سکتے اور علامت کی خوبیاں بیانیہ سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ فنکار وہ اچھا ہے جس کی وارڈ روب میں اسالیب کے متنوع لباس جمع ہوں اور وہ اپنے موضوع ومقصد کے جسم پر موزوں ترین، مناسب ترین اور دیدہ زیب لباس آویزاں کر سکے۔لباس حقیقت نگاری کا ہو یا تخیل وتصور کا، لباس راست بیانیہ کا ہو یا علامت نگاری کا...... موضوع وفکر کے جسم کی مناسبت سے اسلوبیاتی لباس کا درست انتخاب ہی ادبی فنکاری کی کامیابی کا راز ہے۔بطور فنکار کسی ایک اسلوب میں مہارت حاصل کرنا ایک الگ بات ہے اور اپنے پسندیدہ اسلوب کے علاوہ باقی اسالیب کو رد کرنا دوسری بات۔ یہ دوسری بات مناسب نہیں۔

خیر......تو بات یہ ہو رہی تھی کہ افسانے کے روایتی مباحث سے آگے بڑھنا چاہیے۔اس ضمن میں پہلی بات تو یہ کہ ذرا سی نظر افسانے کی تاریخ پر بھی ہونا چاہیے۔اب تک کیا لکھا جاچکا ہے؟ کون سے موضوعات، اسالیب اور تکنیک کو پامال کیا جاچکا ہے؟ ہم انھیں دوہرانے سے کیسے بچ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے اس آخری سوال کا جواب تازگی میں مضمر ہے اور تازگی کا معاملہ یہ ہے کہ نئے موضوعات کی تلاش کتنی بھی مشکل سہی، اسے بہر حال جاری رہنا چاہیے۔اس ضمن میں عصری مسائل پر نظر رکھنا مفید مطلب ہوسکتا ہے لیکن یہ عصریت خبر اور اطلاع میں نہیں، فن پارے میں تبدیل ہونی چاہیے۔عصریت کا ایک پہلو وہ جدید نظر بھی ہے جس سے آفاقی موضوعات کو پرکھا جاسکتا ہے۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن تازگی کا بیش تر دارومدار موضوع کو برتنے کے طریقۂ کار میں مضمر ہے۔ یہ طریقۂ کار اس نوعیت کا ہو کہ موضوع اور تجربے کی اندرونی پرتیں کھل کر سامنے آجائیں اور افسانہ ایک نامیاتی اکائی میں ڈھل جائے۔اگر افسانے کا مجموعی تأ

ثر خوبصورت نہیں ہے تو محض بیانیہ، محض کردار یا محض تکنیک کا عمدہ ہونا کچھ خاص معنی نہیں رکھتا۔ میرے خیال میں آج کا افسانہ وہ ہے جو تازہ کار موضوع اور اسلوب میں ایک جانب حالات سے نبرد آزما، لاچار انسان کی گہری اور داخلی کیفیات کی پرتیں کھولے تو دوسری جانب انسان دوستی سے متعلق جذبے اور احساس کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دے۔

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

◀◀ ● ▶▶

Plot No: 64 to 67 Firdos Nagar
Near Rajban Tonk-304001
(Rajasthan)

مکتبۂ صدف پٹنہ کی نئی سوغاتیں

نام کتاب: بزم صدف ایک مشن صنف: یادگاری مجلّہ ۲۰۲۳ء ترتیب وتدوین: ڈاکٹر افشاں بانو ڈاکٹر نظام الدین احمد سن اشاعت: ۲۰۲۳ء صفحات: ۸۸ قیمت: ۵۰۰/روپئے	نام کتاب: سوغات (رباعیاں صفدر امام قادری کے لیے) صنف: رباعیاں مصنف: ظفر کمالی سن اشاعت: ۲۰۲۳ء صفحات: ۷۲ قیمت: ۱۰۰/روپئے
نام کتاب: سرپٹ گھوڑا مصنف: شوکت حیات سن اشاعت: ۲۰۲۲ء قیمت: ۳۵۰ روپے (مجلد)	صنف: ناولٹ مرتبہ: صفدر امام قادری صفحات: ۱۶۰

ملنے کا پتہ
Maktaba-e-Sadaf
(The Publication Unit of Bazm-e-Sadaf International)
☆ 202, Abu Plaza, NIT More, Ashok Rajpath, Patna 800006 Bihar
☆ Quadri Manzil, Church Road, Chandwara, Muzaffarpur 842001

● اقبال حسن آزاد

فن افسانہ نگاری...... چند اہم باتیں

(ا) افسانہ نگار کی خوبیاں:

ایک اچھے افسانہ نگار میں درج ذیل خوبیاں ہونی چاہییں:

اسے وسیع المطالعہ ہونا چاہئے۔

اسے وسیع المشرب ہونا چاہیے۔

اسے وسیع القلب ہونا چاہیے۔

اسے ملکی اور بین الاقوامی حالات پر گہری نظر رکھنی چاہیے۔

اسے اپنی زبان پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔

اسے چند دوسری زبانوں کا بھی علم ہونا چاہیے۔

اسے ادب کی دیگر اصناف سے بھی شدبد رکھنی چاہئے۔

اسے فنون لطیفہ یعنی مصوری، موسیقی، سنگ تراشی وغیرہ کا بھی تھوڑا بہت علم ہونا چاہئے۔

اسے نئے نئے تجربے کرتے رہنا چاہیے۔

اس کے اندر صبر اور ضبط کا مادہ ہونا چاہیے۔

اسے دوسروں کی رائے کا احترام کرنا چاہیے۔

اسے حکومت سے دوری بنائے رکھنی چاہیے۔

(۲) مختصر افسانے کی تعمیر میں مطالعہ، مشاہدہ اور تجربے کی اہمیت...... چند نکات

افسانہ نگار کا ذہن زرخیز مٹی کی طرح ہوتا ہے۔ جب اس میں مطالعہ کا بیج ڈالا جاتا ہے تو اس میں خود بخود نئے خیالات پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں۔ پھر افسانہ نگار کو ان مختلف خیالات میں سے سب سے عمدہ خیال کو چننا ہوتا ہے۔ اس منتخب خیال کو افسانے کی شکل میں ڈھالنے کے لیے افسانہ نگار کو مشاہدے کی دھوپ اور تجربے کے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض افسانہ نگار ان چیزوں کے بغیر بھی افسانہ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کے تحریر کردہ افسانے کاغذی پھول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو قدرتی گلاب کا

مقابلہ نہیں کر سکتے۔

(۳) مختصر افسانے کے موضوعات:

مختصر افسانے کے موضوعات گونا گوں ہیں۔کوئی بھی واقعہ،جذبہ،خیال یا احساس افسانے کا موضوع بن سکتا ہے۔دنیا اور ماورائے دنیا کی کوئی بھی بات افسانے کے قالب میں ڈھالی جاسکتی ہے۔ موضوعات دوطرح کے ہوتے ہیں: مقامی اور وقتی یا ہنگامی، بین الاقوامی اور آفاقی۔

مقامی اور وقتی موضوعات پر تحریر کردہ افسانے ٹشو پیپرز کی طرح ہوتے ہیں۔ان کی حیات زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ وقت گذر جانے کے بعد بہت ساری باتوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی جبکہ بین الاقوامی اور آفاقی موضوعات پر لکھے گئے افسانے نہ صرف دیرپا اثر چھوڑتے ہیں بلکہ ان کی حیات بھی زیادہ ہوتی ہے۔مقامی یا وقتی/ ہنگامی موضوعات میں ایسے مسائل اٹھائے جاتے ہیں جن کا تعلق صرف ایک خاص علاقے اور وقت سے ہوتا ہے اور اس کے قاری بھی محدود ہوتے ہیں جبکہ آفاقی مسائل پر جو افسانے لکھے جاتے ہیں وہ پوری دنیا کے لیے ہوتے ہیں۔محبت،نفرت،جنس،یا دیگر انسانی جذبات و احساسات وہ موضوعات ہیں جنہیں ہم بین الاقوامی یا آفاقی کہہ سکتے ہیں۔

(۴) مختصر افسانے میں عنوان کی اہمیت:

مختصر افسانے کا عنوان انوکھا اور اس کے مرکزی خیال یا نفس قصہ کو اجاگر کرنے والا ہو۔لیکن اس سے افسانے کے انجام کا پتہ نہیں چلنا چاہیے۔اگر ایسا نہ ہوگا تو قاری صرف عنوان دیکھ کر ہی پورا قصہ سمجھ جائے گا اور افسانے سے اس کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔

(۵) مختصر افسانے کا قصہ:

ہر مختصر افسانے میں ایک قصہ ہوتا ہے۔گو کہ بغیر قصے والے افسانے بھی ضبط تحریر کیے گئے ہیں لیکن یہ تجربہ ناکام رہا ہے۔افسانے کا قصہ اکہرا بھی ہوسکتا ہے اور تہہ دار بھی اور دونوں طرح کے افسانے کامیابی کے ساتھ لکھے جاسکتے ہیں۔جس افسانے میں کسی ایک واقعے کی کہانی بیان کی جاتی ہے اسے اکہرا کہتے ہیں اور جس افسانے میں ایک سے زیادہ واقعات کا بیان ہوتا ہے اسے تہہ دار کہتے ہیں۔اکہرے قصے میں کسی ایک بات یا واقعہ کو افسانے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔مثلاً گھر،بازار،رہگزر یا آفس میں پیش آنے والے کسی واقعے کا بیان ہوتا ہے جبکہ تہہ دار افسانے میں کئی قصے ہوتے ہیں۔یہاں پر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ جس واقعہ یا واقعات پر افسانے کی عمارت کھڑی کی جائے وہ انوکھے ہوں۔اگر ہم یوں لکھیں کہ ''میں حسب معمول سات بجے بیدار ہوا۔حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا اور آفس کے لئے نکل

کھڑا ہوا‘‘ تو اس سے افسانہ نہیں بنے گا۔ یادرہے کہ افسانہ ہمیشہ ’’خلاف معمول‘‘ واقعات اور حالات سے بنتا ہے، ’’حسب معمول‘‘ واقعات اور حالات سے نہیں۔

(۶) مختصر افسانے کا پلاٹ:

مختصر افسانے میں پلاٹ کی اہمیت وہی ہے جو جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی ہوتی ہے۔ اردو میں گرچہ بغیر پلاٹ والے افسانے بھی تحریر کیے گئے ہیں مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پلاٹ جس قدر گٹھا ہوا، چست اور درست ہوگا، افسانہ بھی اسی قدر کامیاب ہوگا۔ ڈھیلے ڈھالے پلاٹ پر تعمیر کیا گیا افسانہ کمزور ہوتا ہے۔ پلاٹ سازی کا فن مکان کا نقشہ بنانے جیسا ہے۔ جب ہم کوئی عمارت تعمیر کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو پہلے اس کا ایک نقشہ بناتے ہیں جس میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ مکان کا صدر دروازہ کدھر ہوگا۔ ڈرائنگ روم، بیڈروم، ڈائننگ روم اور دیگر جگہیں کہاں پر ہوں گی۔ اسی طرح افسانہ نگار کو یہ طے پڑتا ہے کہ افسانہ کس طرح شروع ہوگا۔ افسانہ کس طرح آگے بڑھے گا اور اس کا اختتام کیسے ہوگا۔

ہر افسانے کے تین حصے ہوتے ہیں۔

ابتدا، ارتقا، انجام

افسانے کی ابتدا نہایت دلچسپ انداز میں ہونی چاہیے جسے پڑھ کر قاری کے ذہن میں تجسس پیدا ہو اور وہ آگے پڑھنے کے لیے خود کو مجبور پائے۔ افسانے میں ایک واقعہ دوسرے واقعہ سے یوں پیوست ہو جیسے زنجیر کی ایک کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہوتی ہے افسانے کا انجام غیر متوقع لیکن منطقی ہونا چاہیے۔

(۷) مختصر افسانے کا اسلوب:

مختصر افسانے میں موضوع کی حیثیت جسم کی ہے اور اسلوب/ بیانیہ/ ٹریٹمنٹ کی حیثیت لباس کی ہے۔ جسم خواہ کتنا ہی تندرست و توانا ہو اگر اس پر بدوضع اور بھدا لباس زیب تن کیا جائے گا تو صاحب لباس کی شخصیت بھی بھدی اور بدنما معلوم ہوگی۔ لباس کو جسم پر فٹ آنا چاہیے۔ ڈھیلا ڈھالا یا تنگ لباس دیکھنے میں بھی خراب لگتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی شخص بہت زیادہ تندرست نہ بھی ہو لیکن اس نے نہایت عمدہ تراش خراش کا لباس پہن رکھا ہو تو وہ جاذب نظر دکھائی دیتا ہے۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ آپ خواہ کسی موضوع پر افسانہ تحریر کریں اس کی زبان و بیان اور اسلوب پر پورا پورا دھیان دیں۔

(۸) مختصر افسانے میں کردار نگاری:

ہر افسانے میں کسی نہ کسی کردار کا ہونا ضروری ہے۔ بغیر کردار کے کوئی بھی افسانہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اگر واقعتاً افسانے میں کوئی کردار نہ بھی ہو تو ہم ’’راوی‘‘ کو ہی کردار فرض کر لیتے ہیں۔ افسانے میں

کردار کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو کسی مکان میں مکین کی۔جس طرح بغیر مکین کے مکان سنسان اور ویران لگتا ہے اسی طرح کردار کے بغیر افسانہ بھی بے جان لگتا ہے۔مختصر افسانے کا فریم چونکہ چھوٹا ہوتا ہے اس لیے اس میں زیادہ کرداروں کی گنجایش نہیں ہوتی۔مختصر افسانے میں کم سے کم ایک اور زیادہ سے زیادہ دس کردار ہونے چاہئیں۔ان میں سے ایک مرکزی کردار ہوتا ہے اور باقی ذیلی کردار ہوتے ہیں۔مرکزی کردار وہ ہوتا ہے جس کے گرد کہانی گھومتی ہے اور ذیلی کردار کہانی کو آگے بڑھانے میں افسانہ نگار کی مدد کرتے ہیں۔کردار دو طرح کے ہوتے ہیں۔

(ا)زندہ اور متحرک

(۲) بے جان اور ساکت

زندہ اور متحرک کردار جیتا جاگتا ہوتا ہے۔کسی بھی انسان میں نہ تو صرف اچھائیاں ہوتی ہیں نہ صرف برائیاں۔اگر کسی انسان میں اچھائیاں زیادہ ہیں اور برائیاں کم تو ہم اسے ایک اچھا انسان کہتے ہیں۔برخلاف اس کے اگر کسی شخص میں برائیوں کا تناسب زیادہ ہوتا ہے تو ہم اسے برا کہتے ہیں۔افسانے میں ہم جس کردار کو پیش کر رہے ہیں ہمیں اسکی اچھائیوں اور برائیوں دونوں کو اجاگر کرنا ہوگا تبھی ہم ایک زندہ اور متحرک کردار تخلیق کر سکتے ہیں۔زندہ اور متحرک کردار کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ افسانہ نگار کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر نہیں رہتا بلکہ اپنے اعمال اور افعال کا خود مالک ہوتا ہے۔جبکہ بے جان اور ساکت کردار افسانہ نگار کے اشاروں پر کام کرتا ہے۔وہ وہی سوچتا ہے جو افسانہ نگار سوچتا ہے اور وہی کرتا ہے جو افسانہ نگار اس سے کہتا ہے اور وہ مکالمے بھی افسانہ نگار کی زبان میں ادا کرتا ہے۔ایک کامیاب افسانہ وہی ہوتا ہے جس کے کردار زندہ اور متحرک ہوتے ہیں۔بے جان کرداروں والا افسانہ ناکام ہوتا ہے۔

مختصر افسانے میں کردار کی تخلیق کے لیے نہایت عمیق مشاہدے اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ہمارے آس پاس بے شمار لوگ پائے جاتے ہیں اور جس طرح ہر انسان کی شکل وصورت ایک دوسرے سے جداگانہ ہوتی ہے اسی طرح مختلف انسانوں کی حرکات وسکنات،وضع قطع،لب ولہجہ،نشست و برخاست کے طریقے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔اور ہر انسان کی کوئی نہ کوئی عادت یا خصلت ایسی ہوتی ہے جو اسے دوسروں سے ممیّز وممتاز کرتی ہے۔ایک اچھا افسانہ نگار ان کرداروں کا برسوں مطالعہ ومشاہدہ کرتا ہے اور جب وہ افسانہ لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہے تو اس کے ذہن میں خود بخود ایسے کردار آجاتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو افسانہ نگار کو اپنے دیکھے بھالے کرداروں میں سے ایک یا افسانے کی ضرورت کے مطابق ایک سے زیادہ کرداروں کو اپنے تصور میں لانا ہوتا ہے۔اور جب آپ کسی کردار رکرداروں کو منتخب کر لیں تو سب سے

پہلے اسے رانہیں، نیا رنئے نام دیں۔پھر اپنے تصور سے چند واقعات گڑھ لیں اور چند حقیقی واقعات کو لیں۔اس کے بعد کہانی کا سانچہ تیار کریں اور اس میں اس کردار رکرداروں کو فٹ کر دیں۔ملحوظ رہے کہ کرداروں کے افعال و اعمال بالکل فطری انداز میں پیش کیے جائیں۔ان میں کوئی بناوٹ یا تصنع نہ ہو۔

(۹)مختصر افسانے میں مکالمہ نگاری:

مختصر افسانے میں مکالمہ نگاری کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ افسانے میں مکالمے شامل ہوں۔بغیر مکالموں کے بھی بہترین افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔اور بعض افسانے تو مکالموں کے ستون پر ہی کھڑے کیے جاتے ہیں۔بہر کیف!اگر کسی افسانے میں مکالمے شامل کیے جائیں تو اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ یہ مکالمے کردار کی مناسبت سے ہوں۔جیسا کردار ویسے مکالمے۔آپ کسی ناخواندہ شخص کی زبان سے جس کا تلفظ درست نہ خالص اردو کے مکالمے ادا نہیں کروا سکتے۔ہر قوم، ہر علاقے اور ہر طبقے کی زبان، بولی ٹھولی اور تلفظ الگ ہوتا ہے۔مکالمے لکھتے وقت ان باتوں کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔

(۱۰)منی افسانہ یا افسانچہ لکھنے کے اصول:

اگر آپ منی افسانہ یا افسانچہ تحریر کر رہے ہیں تو درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

افسانچے کا موضوع بالکل نیا اور انوکھا ہونا چاہئے۔

افسانچہ کا بیانیہ حد سے زیادہ چست اور درست ہونا چاہئے۔

افسانچہ آخری سطر سے پہلے کسی بھی حال میں نہیں کھلنا چاہیے۔

◀◀ ● ▶▶

Shah Colony, Shaha Zubair Road
Munger Bihar 811201

’ایک اچھا افسانہ وہ ہے جس میں کوئی کہانی ہو اور ایک اچھی کہانی وہ ہے جو افسانوی انداز میں لکھی گئی ہو۔‘

اقبال حسن آزاد

- **پروفسر خالد سعید**
- **ترتیب و پیشکش: مکرم نیاز**

بیانیہ میں راوی کی مداخلت

پروفیسر خالد سعید (پیدائش: ۱۰ر ستمبر ۱۹۵۰ء، گلبرگہ) رضائے الٰہی سے بروز بدھ ۲۶ر مئی کو بعمر ۷۱ سال حیدر آباد میں وفات پا گئے۔

پروفیسر مرحوم اردو کے ایسے ممتاز شاعر، محقق و نقاد رہے ہیں جن کی تدریسی خدمات کا دائرہ کار بھی نہایت اہمیت کا حامل رہا۔ انہوں نے پہلے میکانیکل انجنیئر نگ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی، بعد ازاں اردو سے گہرے لگاؤ کے سبب ممتاز افسانہ و ناول نگار عزیز احمد کے فن اور شخصیت پر اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ وہ ۲۰۰۴ء میں مولانا آزاد قومی اردو جامعہ سے وابستہ ہوئے تھے، جامعہ کے شعبۂ اردو کے بانی صدر تھے اور ۲۰۱۵ء میں 'مانو' سے وظیفہ حسن خدمات پر سبکدوش ہوئے۔ انہوں نے اپنے دورِ تدریس میں 'مانو' کے مختلف تعلیمی پروگراموں کے لیے بہترین نصاب ترتیب دینے کے علاوہ ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی معیار کو بلند مقام بھی عطا کیا۔ مختلف موضوعات پر انہوں نے تقریباً پندرہ کتابیں (بشمول سات نصابی کتب) تصنیف کی تھیں اور تقریباً اتنی ہی کتابیں زیر اشاعت تھیں۔ وہ کرناٹک کے ممتاز شاعر اور ادیب حمید الماس کے بھتیجے تھے اور بنگلور میں مقیم ادیب، محقق، مزاح نگار اور ادب اطفال کے میدان میں مشہور ڈاکٹر حلیمہ فردوس ان کی ہمشیرہ ہوتی ہیں۔

پروفیسر خالد سعید کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ''معنی کا گمان'' کرناٹک اردو اکادمی نے شعر و ادب کی منتخب کتابوں کی اشاعت کی اپنی خصوصی اسکیم کے تحت ۲۰۰۹ء میں شائع کیا تھا۔ اسی کتاب کا ایک مضمون ''بیانیہ میں راوی کی مداخلت'' ہے، جس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔ ثالث افسانوی نشست ۲۰۲۱ء کے حوالے سے شاید یہ تنقیدی نقطۂ نظر اہمیت کا حامل رہے۔ بیانیہ کی موجودہ روایات، اس کی حد بندیاں اور بیانیہ کے تخلیقی عمل پر درج ذیل چار سوالات قائم ہوتے ہیں۔

۱) صیغۂ غائب اور صیغۂ واحد متکلم کے راویوں کے درمیان کیا کوئی امتیازات پائے جاتے ہیں؟

۲) ان دونوں راویوں کے اختیارات اور حد بندیاں کیا ہیں؟ اور کیا یہ بجا ہیں؟

۳) صیغۂ غائب میں ماجرا بیان کرتے ہوئے کیا راوی خود کو نمایاں کرنا چاہیے؟ یعنی بیانیہ میں راوی کی مداخلت کرنی چاہیے کہ نہیں؟ اس مداخلت کو عیب سمجھا جائے یا ہنر؟

۴) کیا ہماری قدیم بیانیہ اصناف میں راوی کی مداخلت کی روایت ملتی ہے یا نہیں یا یہ کوئی طرز جدید ہے؟

فکشن کی موجودہ روایات کے پس منظر میں ان سوالات کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً سوال نمبر ا تا سوال نمبر ۳ کے جواب کچھ یوں ہوں گے:

''صیغۂ واحد متکلم اور صیغۂ غائب کے راویوں میں یقیناً فرق پایا جاتا ہے، جن کے اپنے اختیارات اور حد بندیاں ہیں، جن کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے۔ اور صیغۂ غائب بیانیہ کے دوران راوی کی مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔''

اب ذرا ہماری داستانوں پر نظر ڈالیے۔ گل بکاؤلی، توبۃ النصوح، فسانۂ آزاد جیسی ہماری شعری/نثری داستانیں تو راوی کی مداخلت یا گڈمڈ طرز ہائے بیان کی بہترین مثالیں ہیں۔

ان مثالوں کے علاوہ میرے بچپن کا ایک واقعہ سن لیجیے۔ ہمارے گاؤں میں کنڑ لوک ناٹکوں میں، کھیل کے دوران اچانک ہی ایک صاحب اسٹیج پر نمودار ہوتے، یا کبھی خود کوئی کردار کھیل چھوڑ کے آ کھڑا ہوتا۔ وہ صاحب یا وہ کردار...... ناٹک کے واقعات پر تبصرہ کرنے لگتا...... ادھر اس کا تبصرہ ختم اور ادھر کھیل جاری۔ غرض ناٹک کے دوران، بیچ بیچ میں تبصرہ بھی ہوتا رہتا اور ناٹک بھی کھیلا جاتا۔

تو یہ ہماری داستانوں اور لوک ساہتیہ کی روایت ہے۔ اور عرض کرنا یہی ہے کہ ہماری قدیم بیانیہ اصناف میں راوی کی مداخلت کی اجازت ہے اور اس طرح کے گڈمڈ بیانیہ کو ماضی میں عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یعنی صیغۂ غائب اور صیغۂ متکلم کے راویوں میں کوئی خاص امتیاز نہیں پایا جاتا تھا۔ لیکن بیسویں صدی تک آتے آتے، مغربی فکشن کی پیروی کے نتیجے میں رفتہ رفتہ یہ طرز معدوم ہوتا گیا۔ مگر جب عزیز احمد نے اپنے ناولوں ''ایسی بلندی ایسی پستی'' اور خصوصاً ''آگ'' مین اس انداز کو اپنایا تو گویا انہوں نے ایک قدیم روایت کی بازیافت کی۔ عزیز احمد کے نزدیک بیانیہ کے دوران راوی کا نمایاں ہونا یا پوشیدہ رہنا کوئی لازمی امر نہیں بلکہ یہ تو اپنی اپنی ضرورت پر منحصر ہے۔ عزیز احمد نے محولہ بالا ناولوں میں جو کچھ کیا، درحقیقت ہماری بیانیہ اصناف کا تتبع ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تخلیقی بیانیہ کے دوران راوی کا پوشیدہ رہنا یا نمایاں ہونا (مداخلت کرنا) کوئی ہنر ہے اور نہ کوئی عیب۔ بلکہ ضرورت کے لحاظ سے بیک وقت دونوں طرز ہائے بیان اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ ہماری قدیم بیانیہ اصناف کی روایات نے تو اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ لہذا صیغۂ واحد متکلم یا صیغۂ غائب کی حد بندی یا اس کی پابندی پر اصرار کرنا کوئی مناسب بات نہیں۔ دراصل ہم نے مغرب کی پیروی میں اپنے آپ پر پابندیاں عائد کرلیں اور یوں تخلیقی آزادی سے محروم ہوئے ہیں۔

● ڈاکٹر ریاض توحیدی

علامتی افسانہ......تخلیقی مضمرات

لغوی اعتبار سے علامت کے معنی نشان، مارک، سراغ، کھوج،اشارہ، کنایہ وغیرہ ہیں۔اصطلاحی مفہوم میں علامت نمائندگی کا ایک ایسا وسیلہ ہے جو کسی لفظ، شئے، کردار یا تصوّر کو کسی خاص معنی،مقصد یا مفہوم میں پیش کرتا ہے۔مثلاً پھول ایک شئے ہے۔یہ محبت کی علامت بھی ہے اور ماتم کی نشانی بھی۔اب یہاں پر پھول کے حقیقی معنی کے برعکس جو دوسرے مفہوم سامنے آتے ہیں،اس کی نمائندگی علامت کرتی ہے۔علامت سازی کی اہمیت پر چارلس بودلئیر (BaudelaireCharles)روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاثرات کی تہہ میں جو ایک اساسی عالم چھپا ہوا ہے،اس کے رموز کا اظہار صرف علامتوں کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔''

کسی بھی لفظ یا شئے کے علامتی اظہار کا مدار ماحول کی کیفیت میں مضمر ہوتا ہے۔اب شعروادب میں علامت نگاری کی بات کریں تو شعروادب میں علامت کا استعمال تخلیقی اظہار کا ایک معنی خیز وسیلہ ہے، اسی بنیاد پر علامت کو''تخیلی تجربات کی گاڑی'' (experienceimagnativeforVehical) بھی کہا جاتا ہے۔کیونکہ علامتی اسلوب،کسی بھی تخلیق کی امکان خیز معنویت میں توانا کردار ادا کرتا ہے اور تخلیق کی معنوی جہات میں وسعت پیدا کرنے کا تخلیقی وسیلہ بنتا ہے۔افسانے میں علامتوں کے استعمال اور معنوی تہہ داری پر بات کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''علامتیں ایک طرح کے وسیع استعارے ہیں جن کے شعوری اور نیم شعوری رشتوں کو ابھار کر افسانہ نگار معنوی تہہ داری پیدا کردیتا ہے۔علامتوں کے حسی پیکر ہوتے ہیں،لیکن بعض علامتوں سے افسانہ نگار فضا آفرینی کا یا محض خاص طرح کے تاثر ابھارنے کا کام لیتا ہے۔ایسے افسانے کا کمال یہ ہے کہ وہ لغوی اور علامتی دونوں سطحوں پر پڑھا جاسکے۔افسانوں میں خاص خاص لفظوں کا استعمال ایسی معنوی وسعت اختیار کرلیتا ہے کہ ان میں علامتی افسانہ کی شان از خود پیدا ہوجاتی ہے۔'' (فکشن کی شعریات،تشکیل وتنقید)

علامت کو 'تخلیق کا حسن' بھی قرار دیا جاتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک علامتی افسانہ یا شعر کی قرات میں جو فنی حسن اور معنی خیزی کا لطف موجود ہوتا ہے وہی اس کی تخلیقیت کا موثر فنی جواز فراہم کرتا ہے۔علامتی اظہار میں جو مثبت معنوی ابہام پوشیدہ رہتا ہے وہ تخلیق کی تنقید و تفہیم کے لئے بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔اسی بنیاد پر کوئی بھی باخبر ناقد اور باشعور قاری علامتی تخلیق کی معنوی جہات کی تفہیم اپنی اپنی علمی بصیرت کے مطابق کرتا رہتا ہے۔تفہیم کا یہ تصوراتی اظہار ہی ایک علامتی تخلیق کی کامیابی ہوتی ہے۔اس کے برعکس ایک معمولی شعر یا افسانے میں جو عام سے خیالات پیش کئے جاتے ہیں وہ معنی کے اکہرے پن کی عکاسی کرتے ہیں۔اس تعلق سے پروفیسر مجید مضمر اپنی تصنیف ''اردو کا علامتی افسانہ'' میں لکھتے ہیں:

''ادب میں علامتوں کا استعمال کئی طرح سے ہوتا ہے۔کہیں الفاظ یا زبان سے،کہیں تصورات سے،کہیں پیکروں سے اور کہیں پر کردار یہ کام انجام دیتے ہیں۔اور کہیں واقعات علامتی روپ اختیار کر لیتے ہیں۔اس لئے یہ مفروضہ بے بنیاد ہے کہ ادب میں صرف زبان یا الفاظ کے ایک خاص استعمال سے ہی علامتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔اگرچہ علامت کی ترسیل زبان کے ذریعہ ہی سے ممکن ہے کیونکہ ''زبان سے آگے جانے کا راستہ بھی زبان ہی سے گزرتا ہے'' لیکن زبان کا علامتی استعمال علامتی فکر سے الگ کوئی معانی نہیں رکھتا۔دراصل علامتی لفظ اور علامتی فکر۔دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔اس کے علاوہ علامتوں کی ایک اور سطح بھی ہے یعنی کبھی کسی ادبی تخلیق میں لفظ،کردار یا کوئی واقعہ بطور علامت استعمال ہوتا ہے،جس سے پوری تخلیق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور کبھی پوری تخلیق علامتی روپ اختیار کر لیتی ہے۔ادبی علامت اور علامتی ادب میں اس طرح یہی فرق ہے کہ آخر الذکر ایک علامتی کل ہوتی ہے جبکہ اول الذکر اسی کل کے جز کا کام دے دیتی ہے۔علامتی تخلیق کے عناصر تخلیق سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتے۔بلکہ پوری تخلیق کے اجزاء بن کر اس کی مکمل ساخت کو تشکیل دیتے ہیں۔'' (اردو کا علامتی افسانہ)

علامتی اسلوب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس اسلوب کی ضرورت ماحول کے تابع ہے یعنی اگر کہیں پر حالات اتنے سنگین ہیں کہ کوئی قلمکار اپنی بات عام فہم انداز سے نہیں کر سکتا ہے تو وہاں پر علامتی اظہار کی ضرورت پڑتی ہے لیکن علمی و فنی نقطہ نگاہ سے یہ رائے صحیح نہیں ہے کیونکہ علامتی اسلوب' فنی اظہار کا ایک تکنیکی اسلوب (Style Technical) ہے جو بقول ڈبلو۔بی۔ یے ٹس'' تمام اسلوب کا

جو ہر ہے۔"(styleallofsubstanceThe)۔فنی طور پر کسی بھی ادیب یا شاعر کی تخلیق میں الفاظ وخیال کا علامتی برتاؤ معنوی جہات کی تفہیمی راہیں استوار کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔بطور مثال پروفیسر حامدی کاشمیری کے درجہ ذیل شعر دیکھیں تو علامتی اسلوب کی معنوی جہات کا تصور واضح ہوسکتا ہے۔

جتنے بھی اہل گلستاں تھے ہوا کی زد میں تھے ۔۔۔ طائران صبح کس کو حوصلہ دیتے رہے

ان کا شوقِ کوہ پیمائی جنوں انگیز تھا ۔۔۔ اہلِ وادی دیر تک ان کو صدا دیتے رہے

(خواب رواں)

اب افسانے میں علامتی اسلوب کی بات کریں تو اس مناسبت سے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔اختصاراً درجہ ذیل اقتباسات بھی مناسب رہیں گے:

"شیخ ابوالعباس اشقاقی ایک روز گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا ایک زرد کتا ان کے بستر میں سو رہا ہے۔انہوں نے قیاس کیا کہ شاید محلے کا کوئی کتا اندر گھس آیا ہے۔انہوں نے اسے نکالنے کا ارادہ کیا مگر وہ ان کے دامن میں گھس کر غائب ہوگیا۔میں یہ سن کر عرض پرداز ہوا:

"یا شیخ' یہ زرد کتا کیا ہے؟"

"فرمایا' زرد کتا تیرا نفس ہے۔"

(افسانہ: زرد کتا۔انتظار حسین)

"لیکن عجیب بات تھی۔بے حسی میں صدیاں بیت گئی تھیں مگر احساس کی بیداری کے بعد ایک لمحہ بھی اس کیفیت میں نہیں گزارا جارہا تھا۔میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔مکمل کوشش اور وہ کوشش ناکام رہی۔پھر کوشش کی اور......اور پھر میں اٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔" (افسانہ: سرنگ۔سریندر پرکاش)

"ہوا آئی تو وہ بھی یہی خبر لائی۔پھر تو جو بھی آیا' یہی خبر لایا۔ایک ہی خبر......اور پھر......خوف اور مایوسی نے جسم کے خوبصورت حصوں پر تعمیر شدہ مسرت' آزادی اور امنگ کی خوبصورت عمارتوں کو منٹوں میں ڈھا دیا اور اپنی جڑیں مضبوط کرلیں۔ہواؤں کی دیواروں پر لکھی تحریر سے آنکھیں موندی جاسکتی ہیں لیکن پلکوں کی دیواروں پر لکھی تحریریں!

تمام دروازے، کھڑکیاں، روزن اور ہر وہ گوشہ بند کردیا گیا جس سے باہر کے ذرے کے آنے کی امید بھی کی جاسکتی تھی۔

لوگ گھروں میں بند ہوکر بیٹھ گئے لیکن سکون سڑکوں پر آزادانہ گھوم رہا تھا۔بہت دنوں کے بعد اس بند کمروں سے نجات ملی تھی......یعنی بات الٹی ہوگئی تھی، لوگ گھروں میں اور سکون سڑکوں پر۔

میں نے اپنے بچے کھچے دل سے کہا...... یہ بہت براہوا۔
زبان نے فوراًاس کی تائید کی...... بہت براہوا۔''

(افسانہ:اندھیرے میں چلنے والے......عبدالصمد)

''اجنبی سائے چیخ چیخ کر رونے لگے اور بین کر کے موسیٰ سے پوچھنے لگے۔ کیا خوف ہی سب کچھ ہے؟ نہیں...... وہ تو محض ابتداء ہے۔ خون گاڑھا ہوکر جمنے لگا۔ پانی جوسورج کی گرمی سے اڑا تو جمتا خون بساندبھی دینے لگا۔ مہاویاء شکلیں بدل کر ڈرانے لگا مگر اجنبی سائے یونہی ایک دوسرے کا گوشت کھا کھا کر پلنے لگے۔ وہ اپنی دستار پر ستارے سجائے میلے پر قبضہ جمانے لگے......ہتھیار آگ برسانے لگے۔ چرند پرند بھاگنے لگے۔ بستیاں لاشوں سے پٹنے لگیں......محابا، محابا، اجنبی سایوں میں مسیحا ڈھونڈنے لگا...... محبت کرواپنے جیسوں سے کہ تمہیں اس نے محبتوں سے پیدا کیا اجنبی سائے چیخ چیخ کر ہنسنے لگے اور بے حیائی سے عیسیٰ سے پوچھنے لگے۔ کیا محبت ہی سب کچھ ہے؟''

(افسانہ''ستیہ کے بکھرے ہوئے بال''......ڈاکٹر بلند اقبال)

تخلیق کی کامیابی کا انحصار تخلیقیت (Creativity) پر ہوتا ہے۔ جو ذہن تخلیقی طور پر جتنا زرخیز ہوگا تو اس کی تخلیق میں بھی اتنی ہی تخلیقیت در آئے گی۔ علامتی اظہار کا تعلق بھی تخلیقی زرخیزی سے جڑا ہوا ہے۔ اب یہ تخلیق کار کے تخلیقی روّیہ (AttitudeCreative) پر منحصر ہے کہ وہ تخلیق میں اپنے خیالات کو راست بیانیہ میں پیش کرتا ہے یا علامتی اسلوب اپناتا ہے۔ علامتی اسلوب کے لئے علامتوں کا صحیح اور واضح شعور ہونا ضروری ہے تاکہ تخلیق کار صحیح تصور کے ساتھ کسی علامت کا استعمال کر سکے اور یہ حد سے زیادہ تجریدیت کا شکار ہوکر مہمل تصور نہ بن جائے۔ تخلیق میں علامت کا استعمال پہلودار معنویت کا غماز ہوتا ہے اور سودمند بھی ،لیکن اس میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ جو علامت استعمال کی جارہی ہے یا تو اس کا تصور تخلیق کار اور قاری کے ذہن میں بھی واضح ہو یا تخلیق میں وہ اس طرح سے مستعمل ہو کہ موضوع کے ماحول کے مطابق وہ اپنی مخصوص معنوی جہت بنا سکے۔ مثلاً، کبوتر امن کی علامت ہے۔ اب اگر یہ بطور علامت کسی تخلیق میں مستعمل ہوگا تو قاری کے ذہن میں پہلے ہی اس کا علامتی تصور یا جواز موجود ہے، اسلئے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی افسانے میں کالا دیو کی علامت لائی جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ یا تو دیو کے اصلی تصور کا فنی اظہار ہونا چاہئے یا پھر یہ علامت کسی مخصوص تصور مثلاً کسی ظالم و جابر قوت، انسان، حکمران، نظام، یا سیاسی وسماجی ظلم وستم کا تخلیقی اظہار ہونا چاہئے۔ اس قسم کے فنی اظہار کی صراحت درجہ ذیل اقتباسات سے بھی ہوسکتی ہے :

''خیال آتا ہے کہ ایک پنجرہ یہ ہے جس میں وہ ہے اور جس کی دیوار پر لٹکے کلینڈر پر ہر روز تاریخ بدلتی

ہے اور ایک دن مرجھا کر نیچے جا گرتا ہے۔ وقت کے کوڑے دان میں گرا یہ دن، نئے دن کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے، یہ اس کا پنجرہ ہے۔ کھڑکی، کھڑکی سے دکھائی دیتا برآمدہ اور برآمدے میں دوسرا پنجرہ، جس میں طوطوں کا جوڑا...... بلی کے موڈ کے مطابق اپنا رویہ بدلتا رہتا ہے۔ خوشی کے چند لمحے بل پر منحصر ہیں۔'' (پنجرہ رشید امجد)

''پولیس والا ہاتھ میں ڈنڈا گھماتے ہوئے چپ چاپ اپنے قدم آگے بڑھانے لگا۔ وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ دھند میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پھیلتی دھند میں لپٹے سرسبز درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھے کبوتروں کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور وہ بکھرتے گھونسلوں کو کوؤں کی یلغار سے بچانے کے لئے اپنے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ کبوتروں کی بدحواسی دیکھ کر وہ سرد آہ بھرتے ہوئے سوچنے لگا کہ دہائیوں سے ان کبوتروں کی روح زخمی ہو رہی ہے، کب انہیں کوؤں کی یورش سے نجات ملے گی۔'' (سفید کبوتر.. ڈاکٹر ریاض توحیدی)

''کالے دیوؤں کا یہ منحوس سایہ کئی دہائیوں سے بستی کے اوپر چھایا ہوا تھا۔ اس جنت نُما بستی کے روح پرور مشک بار ماحول کو ان بدصورت کالے دیوؤں کی بدبودار سانسوں نے پلیگ زدہ بنائے رکھا تھا اور ان خبیث روحوں کی جابرانہ موجودگی کی وجہ سے بستی کے عنبر آگیں چمن زاروں، چھر چھر کرتے آبشاروں، پرفریب کہساروں اور حسن خیز سبزہ زاروں پر منحوسیت کے سیاہ سائے چھائے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں یہ چنڈال فطرت بدصورت مخلوق کن بدتہذیب ویرانوں سے نکل کر ہاتھی کے دانت دکھائے بستی کے ریشم مزاج انسانوں کے سروں پر موت بن کر سوار ہو چکی تھی...... یہ بدفطرت کالے دیو بستی کے کسی بھی گھر میں بے دھڑک گھس جاتے اور اپنی خون خوار آنکھوں کا رعب جماتے ہوئے بستی کے مکینوں کی بے بسی اور بے کسی کے ساتھ جس طرح سے چاہتے کھلی اڑاتے رہتے۔ اگر کوئی انسان اپنی آن بچانے کے لئے ان درندوں سے اُلجھ پڑتا تو ان وحشیوں کے خونخوار پنجے اس مظلوم کو نوچ نوچ کر لہولہان کر جاتے اور ان معصوموں کو پلک جھپکتے ہی جھپٹ کر لے جاتے۔ بستی کے لوگ ان آدم خوروں کے بجائے ان بے زبان کتوں کی وفاداری اور انسان دوستی کے شکرگزار نظر آتے تھے۔ جورات کے گھنے سائے میں اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر بستی کے لوگوں کو بھونکتے بھونکتے ان ظالموں کی آمد کا اشارہ کرتے رہتے۔ پھاٹک کے سامنے مارے گئے کتوں کی بدبو سے جب کالے دیو تنگ آ گئے تو انہوں نے بستی کے لوگوں کو حکم جابری سنایا کہ وہ ان خون آلودہ کتوں کو اپنے اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر دور کسی نالے میں پھینک دیں۔ بے بس لوگ حکم جابری کی تعمیل کرتے ہوئے کتوں کو کاندھوں پر اٹھائے جا رہے تھے۔'' (افسانہ: کالے دیوؤں کا سایہ۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی)

افسانے میں علامتی اظہار عنوان، کردار، موضوع، چند جملوں اور کبھی کبھی پورے متن میں بھی چھایا رہتا ہے لیکن اس کے لئے اہم بات یہ ہے کہ تخلیق کار علامتی اسلوب اپناتے ہوئے تخیل کے سیال تصور کو معنی خیز تصور

کی ترسیل کرنے پر قادر ہو‘نہیں تو وہ تخلیق ایک بے معنی پہیلی کے سوا کچھ بھی نہ ہوگی۔تخلیق کی کامیابی کا انحصار فنی رموز کی شناسائی اور پہلودار معنویت پر ہے۔فنی اور معنوی طور پر افسانے کے متن میں خلقی رچاؤ ہونا چاہئے نہ کہ کسی واقع یا خیال کو صحافتی انداز سے روداد نما بنایا جائے۔تخلیقی رچاؤ کے لئے علامتی اسلوب بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔کیونکہ یہ متن میں امکان خیز معنویت پیدا کرتا ہے اور قرات کے دوارن قاری کا ذہن متن میں پوشیدہ معنی و مفہوم اور کیفیت و تاثر کے کئی تفہیمی جہات انگیز کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کسی بھی علامتی شعر یا افسانے کی تفہیم باشعور قارئین مختلف زاویوں سے کرتے رہتے ہیں کیونکہ علامتی تخلیق کے متن میں معنی سے زیادہ مفہوم کو انگیز کرنا پڑتا ہے،اس لئے علامتی تخلیق میں لفظ کے لغوی مفاہیم کے علاوہ وسعت پذیر معنوی انسلاکیت مضمر ہوتی ہے۔

علامتی اسلوب کی یہ وسعت پذیر معنوی انسلاکیت درجہ ذیل اقتباس سے بھی ظاہر ہوتی ہے :

’’ریوڑ کی حفاظت کی خاطر دائیں بائیں‘ آگے پیچھے چند خوانخوار کتے لمبی لمبی زبانیں نکالے رال ٹپکاتے دوڑ رہے ہیں،بھیڑوں کی معمولی حرکت پر بھی ان کی کڑی نظر ہے۔دفعتاً اس نے دیکھا کہ ایک بھیڑ ریوڑ سے کٹ کر دوسری سمت مڑ گئی ہے۔ابھی وہ چند قدم ہی چلی ہوگی کہ ایک محافظ کتے کی نگاہ اس پر پڑ جاتی ہے اور وہ غرا کر اس پر جست لگا دیتا ہے۔کتے کے تیز اور نکیلے دانت بھیڑ کی گردن میں پیوست ہو جاتے ہیں۔دوسرے کتے بھی غراتے ہوئے اس گمراہ بھیڑ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں کہ چند لمحوں بعد وہاں ادھ چچھوڑی ہڈیوں،ریت میں جذب لہو کے بڑے بڑے دھبوں اور بھیڑ کی بھوری کھال کے خون آلود چیچھڑوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔دیگر بھیڑیں سہمی ہوئی نظروں سے اس منظر کو دیکھتی ہیں اور خوف و دہشت سے ایک دوسرے میں یوں سمٹ سکڑ جاتی ہیں کہ دور سے پورا ریوڑ زمین میں رینگتے ایک بھورے بادل کی مانند دکھائی دیتا ہے۔‘‘(افسانہ:معبر......سلام بن رزاق)

’’تم آسمان کی بلندیوں میں تب بھی اڑتے تھے اور اب بھی اڑ رہے ہو اور ہم......ہم نے جب تمہاری طرح بلندیوں کو چھونے کی کوشش کی،آزاد فضاؤں کو چھونے کی آرزو کی۔تہذیبی قدروں کی آبیاری اور انسانی عظمت کی بلندیوں کے لئے اپنی آواز بلند کی تو ہم سے ہماری دنیا چھین لی گئی۔ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔ہمارے لئے دو قدم چلنا مشکل ہو گیا اور جب ہم نے اپنے پاؤں کو اپنے وجود کو ان بیڑیوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی تو ہماری بے بس بے حرکت اور بے آواز جسموں کو ان قبروں کی گہرائیوں میں دھکیل دیا گیا۔‘‘(نورشاہ......افسانہ اڑان)

’’رات بالکل سیاہ تھی۔اتنی سیاہ کہ کالے ناگ کی سیاہی بھی اس کے آگے ہیچ تھی۔اسے اپنے قریب،بہت قریب ایک زوردار پھنکار سنائی دی۔وہ سہم کر کونے میں دبک گیا۔پھنکار پھر سنائی دی۔اس نے دھیان سے آواز کی سمت کان لگایا۔یہ پھنکار اس کے اندر سے آ رہی تھی۔سانپ جیسے کنڈلی مار کر اس کے دل کے اندر بیٹھ گیا

تھا.....خوف کا سانپ۔وہ خوف زدہ تھا۔صرف وہی نہیں بلکہ پوری وادی خوف زدہ تھی۔اونچے اونچے برف پوش پہاڑ، گھنیرے پیڑ،جھیل میں بہتا ہوا پانی یہاں تک کہ فضاؤں میں چلتی ہوا بھی خوفزدہ تھی۔"(رات:اقبال حسن آزاد)

افسانے میں علامتوں کا تخلیقی استعمال اسی وقت مفید ثابت ہوتا ہے جب افسانے کی علامتی فضا بامعنی افسانوی اظہار کی حامل ہو اور اس کے متن میں کہانی پن کے ساتھ ساتھ خیالات کا ٹھوس پن بھی موجود ہو تا کہ افسانے کے علامتی ماحول کی تفہیم میں کوئی بے معنویت یا بے مقصد ابہام موجود نہ رہے۔زبان و بیان کے اعتبار سے بھی علامتی افسانے میں مستعمل تراکیب اور جملوں کی ساخت کا صحیح ادراک ہونا لازمی ہے تا کہ تخلیق کار کسی بے معنی ترکیب یا جملے کو علامت سمجھ کر خود بھی دھوکے میں نہ رہے اور قاری کو بھی ذہنی الجھن میں نہ ڈال سکے۔تنقیدی نقطہ نگاہ سے ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ کسی بھی علامتی تخلیق کی تفہیم و توضیح کے دوران صرف متنی ماحول سے سروکار رکھنا ضروری ہے اور اسی ماحول کے دائرے میں تشریح و توضیح کرنا صحیح طریقہ تجزیہ ثابت ہوسکتا ہے،نہیں تو معاملہ سوال از آسماں جواب از ریسماں کے مثل بن جائیگا۔اردو میں کافی تعداد میں علامتی افسانے تخلیق ہوئے ہیں اور آج بھی لکھے جا رہے ہیں۔موضوع کی مناسبت سے چند افسانوں کا ذکر (جو اس وقت یاد آ رہے ہیں) کرنا مفید رہے گا۔

"سلطان،وحشی"(احمد ندیم قاسمی)'غالیچہ(کرشن چندر)' آخری آدمی،کایا کلپ،وہ جو کھوئے گئے(انتظار حسین)،ماچس،کمپوزیشن دو(بلراج منرا)،دوسرے آدمی کا ڈرائینگ روم،بجوکا(سریندر پرکاش)،لمحے کی موت(غلام الثقلین)،پرندے،چوراہا(انور سجاد)،میگھ ملہار(ممتاز شیریں)،معبر(سلام بن رزاق)،اندھیرے میں چلنے والے (عبدالصمد)،سرنگ (سریندر پرکاش)،اندھے پرندے کا سفر، پرندہ پکڑنے والی گاڑی (غیاث احمد گدی)، جلاوطن(عبداللہ حسین)،اپنا گوشت،تفتیش (شوکت حیات)،اور ٹائم (منشا یاد)ہارا ہوا پرندہ (مظہرالزماں) آسمان ،پھول اور لہو(نور شاہ)،شہر کا اغوا(عمر مجید)،پنجرہ (رشید امجد)ڈاکو پھر واپس آ گئے(نورالحسنین) بھوکا ایتھوپیا(مشرف عالم ذوقی)ارسطو کی واپسی (وحشی سعید) گھونسلہ (دیپک بدکی) پہلا چہرہ (زاہد مختار)،ہاؤس ہوسٹس،عمارت(پروفیسر غضنفر)رنگ،سوچ بورڈ کے نمبر،جنگل کے قیدی (مشتاق مہدی)، ستیہ کے بکھرے بال(ڈاکٹر بلند اقبال)،بابل کا مینار(ڈاکٹر اختر آزاد)"رات"(اقبال حسن آزاد) "سمندر جہاز اور میں(ڈاکٹر افشاں ملک)،نقش فریادی (راجہ یوسف)،لاشے،اماوس نگری (سید تحسین گیلانی)،بددعا کرنے والے(سلیم سرفراز)،مرگھٹ (شموئل احمد)،چیل چنار اور چوزا(راجہ یوسف)،کالے دیوؤں کا سایہ،سفید کبوتر،سفید نور کا راز(ریاض توحیدی)وغیرہ

◀◀ ● ▶▶

Wadipora Handwara
Kashmir 193221.9906834877

● سیدہ آیت گیلانی

علامت کیا ہے؟

علامت ایک ایسا تخلیقی آلہ یعنی tool ہے شعر ونثر کی دنیا میں جسے رد کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ زمان و مکان کے دائرے میں وقوع پذیر وارداتوں کو ایسے الفاظ کا پیراہن اوڑھاتی ہے جو معنویت کے بدن کو نئی سج دھج اور زینت بخشتی ہے کہ اس کے مقام و مرتبے میں وہ بلندی نظر آتی ہے جو براہ راست اس کے معنی میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔ اس سے پہلے کہ ہم علامتی افسانہ نگاری کے پیچیدہ رستوں پر خیال کے گھوڑے اندھا دھند دوڑائیں ہمیں اس مشکل ترین عُقدے کو حل کرنا ہوگا کہ علامت کیا ہے؟

علامت یعنی ''Symbol'' یونانی لفظ ''Symbaline'' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں...... ''چیزوں کو ایک ساتھ رکھنا''...... یہ الفاظ دیگر ایک شے کے بجائے دوسری شے کا استعمال ہے......

یہ تعریف علامت کی ہئیت ،استعمال اور اس کی ذات یعنی حقیقت کو سمجھانے سے قطعی طور پر قاصر ہے۔ ہمیں علامت کی جہات اور اس کے وسیع و عریض جہان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم علامت کو ان فکری حوالوں کے ذریعے سے سمجھنے کی کوشش کریں جو ناقدینِ ادب نے اس کے اوصافِ کثیر کے باعث مختلف تعریفوں اور توضیحات کی صورت میں پیش کیے ہیں۔ بلاشبہ تفہیم کے اعتبار سے بذاتِ خود یہ تعریفیں اس قدر مبہم اور پیچیدہ ہیں کہ ان کی توضیح کے لیے الگ باب درکار ہے مگر اس کے باوجود ان کی روشنی میں ایک مجموعی اور مشترک نتیجہ برآمد کرتے ہوئے ابتدائی سطح پر علامت کو اس حد تک ضرور سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمیں یہ تمثیل ،استعارے یا کنایے سے الگ پورے قد کے ساتھ اپنی جداگانہ حیثیت منواتی نظر آتی ہے۔

علامت کی تعریف پیش کرتے ہوئے کولرج کہتا ہے کہ:

''علامت سے میری مراد استعارہ یا تمثیل یا کوئی اور صنعت بیان یا محض واہمے کی صورت نہیں بلکہ جس کُل کی وہ (علامت) نمائندگی کرتی ہے اسی کا ایک اصلی اور لازمی جز ہے۔''

ناقد (OlsonElder) کے نزدیک:

''علامت نگاری سے مراد ایک ایسی ترکیب ہے جو بسا اوقات لکھنے والا اس تاثر کے لیے استعمال کرتا ہے جو ایک قاری کسی فن پارے کی مجموعی حیثیت سے قبول کرتا ہے۔ یہ ترکیب دور افتادہ

خیالات کے اظہار میں بھی مدد کرتی ہے پُھس پُھسی یا بے جان چیزوں میں روح پھونکنے اور قاری کے جذباتی ردعمل کے تعین میں بھی یہ ترکیب مفید ہوتی ہے......''

نارتھ روپ فرائی نے''CriticismofAnatimy''میں علامت کی تعریف ان الفاظ میں کی۔

"Anyunitofanyworkoflitraturewhichcanbelsolatedforcritical attention. In general usage restricted to the smaller units such as words ' phrases'imagesetc"

وہائٹ ہیڈ کے مطابق:

''لفظ شے کی علامت بنتا ہے اور علامتی حوالوں کے سہارے کسی شے کی ترجمانی کرنے کی واضح ضرورت پوری کرنے کے لیے زبان کا استعمال ہوتا ہے۔''

یہاں اس بات کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عرفی شیرازی بھی ہر لفظ کے فی نفسہ علامت ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''تحقیق آنست کہ لفظ علامت است مقصود بالذات۔''

یعنی ہر لفظ اپنی ذات کے عرفان کی طلب کے حوالے سے ایک علامت ہے۔لفظ کو علامت کے طور پر اگر متصور کر لیا جائے تو ہمیں زبان وکلام کا کوئی گوشہ علامت سے خالی نظر نہیں آئے گا۔ایک مسلسل علامتی نظام حرف ولفظ کے گورکھ دھندے میں بتدریج ہر سو بل کھاتا نظر آئے گا۔

یہاں یہ معنی مجھے سوزین لینگر (LangerSusane) کے خیالات کی تفسیر لگتے ہیں جن کے مطابق وہ ساری گفتگو کو علامت قرار دیتی ہیں۔

بقول سوزین لینگر:

''گفتگو دراصل انسانی ذہن کے اس بنیادی عمل کی سب سے آسان اور فعال منزل ہے جس کو ہم تجربے کی علامت میں ڈھل جانے کا نام دیتے ہیں۔''

اس سے کچھ ملتا جلتا پروفیسر A.D.Ritche کا خیال ہے کہ:

''فکر کی ہر سطح پر ذہنی زندگی ایک علامتی عمل ہے۔فکر کا بنیادی کام ہی علامت سازی ہے۔''

ڈاکٹر انیس ناگی لکھتے ہیں کہ:

''علامت سے مراد وہ بیان ہے جس کے ذریعہ جو کہا جائے اس سے کچھ زیادہ اور کچھ الگ معنی مراد لیے جائیں۔علامت ہمارے ذہن کو معانی کی کئی جہتوں کی طرف منتقل کرتی ہے اور اس کی خوبی یہی

ہے کہ یہ ان میں سے ہر جہت کے لیے موزوں قرار پائے۔علامتی اظہار بجائے خود بیان واقع ہوتا ہے لیکن اس بیان واقع کے ظاہری مفہوم سے ذہن اس مفہوم کے مماثل کسی اور مفہوم کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے یہ بیان واقع کسی شے کا بھی ہوسکتا ہے، کسی وقوعے کا بھی اور کسی صورتحال کا بھی۔''

مشہور ناقد (Littre) کے مطابق:

''علامت ایجاد نہیں کی جاسکتی یہ تو لاشعور کا حصہ ہے یا Hybernate ہوتا رہتا ہے۔''

ہیگل اور برگساں کے نزدیک:

''علامت ایک امتزاجی اتحاد (Harmony Synthetic) ہے اور ایک ایسا تصور جو وجدان سے مشابہ ہے۔''

بیلا نشے (Ballanche) نے ایک دم اس کے قد کو بلند کرتے ہوئے اسے دائمی مفہوم کا لبادہ پہنا دیا وہ کہتے ہیں کہ:

''علامت کا مخاطب انسان نہیں بلکہ یہ تو روح کا روح سے اتصال ہے۔''

انسان سے مراد یہاں مادہ یا فانی جسم ہے۔اور روح جسے موت نہیں آتی بقا کا اشارہ ہے۔یعنی ان کے نزدیک علامت تخیل کی حیات ہے۔لفظ جس میں بقا کا آبِ حیات پی کر سدا زندہ رہیں گے وہ علامت کو ایسا جادہ قرار دے رہے ہیں۔روح کے تناظر میں علامت کا دائرہ آفاقی ہوتا چلا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں بیلا نشے کا شاید یہ خیال ہے کہ اگر لازوال ادب کی تخلیق مقصود ہے تو اسے علامت کے ذریعے زندہ رکھنا ہوگا۔

جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

''اصل ادب تو علامتی ادب ہی ہوتا ہے۔''

تخیل کے کورے جسم میں علامت وہ پھونک ہے جو زندگی کی رمق بن کر جسم کی کالی کوٹھڑی کو اجالا بخشتی ہے۔

بقول شخصے:

''ادبی علامت خواہ کوئی تصنیف ہو یا اس کا ایک حصہ واضح تجسیم ہے جس طرح روح یا قوتِ حیات ہمارے جسم کے اندر رہتی اور باہر جھلکتی ہے اسی طرح خیال اور احساس اس ہئیت، شکل یا جام میں رہتے ہیں جسے ہم علامت کہتے ہیں۔''

علامت کی مندرجہ بالا تمام تعریفوں کی روشنی میں جو مشترک نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ کہ

علامت نمائندگی کا ایک طریقہ ہے۔ یہ کسی شے کی متبادل ہوتی ہے اور کسی دوسری شے کی نمائندگی کرتی ہے۔اس میں جو کچھ (کسی تلازمے کے ساتھ) ظاہر کیا جاتا ہے اس سے کچھ دوسرے اور منتخب معانی مراد لیے جاتے ہیں۔ یہ غیر مرئی شے کا مرئی نشان ہوتی ہے اور جس کُل کی نمائندگی کرتی ہے اس کا اصلی اور لازمی جز ہوتی ہے۔اس میں جذبات و خیالات کا براہ راست ذکر نہیں ہوتا بلکہ ان کے تصورات کی نقش گری بالواسطہ عوامل وعناصر کے ذریعے کی جاتی ہے۔

جیسا کہ سوزین لینگر نے کہا کہ

''ہر ذہن میں علامتی کا ایک بڑا ذخیرہ ہوتا ہے جس کے استعمال مختلف ہوتے ہیں......''

جہاں تک میرا خیال ہے الفاظ کے استعمال کا تعلق براہ راست ذہن کی تیزی اور فکر کی اپروچ سے ہوتا ہے۔فکر کی پختگی اور ادراک لفظ کو بدل یا نیا لبادہ دیتا ہے۔ یہ منفرد لبادہ ہی ''علامت'' ہے جو بعض اوقات پیچیدہ اور مبہم صورت کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جب یہ لبادے براہ راست کسی معنی سے تعلق رکھتے ہیں تو اکہری علامت یعنی واحد مفہوم، واقعے یا اندرونی وخارجی کیفیت کے عکاس ہوتے ہیں۔ یہاں یہ ''نشان'' سے کافی حد تک مماثلت رکھتے ہیں اور اسی مماثلت کے باعث علامت کو ''sign'' سمجھنے کی غلطی کا امکاں پیدا ہوتا ہے۔واضح ہو کہ نشان یا Sign مخصوص واقعے یا ثقافت کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس سے چھوٹے سے بڑے دائرے تک یکساں معنی کشید کیے جاتے ہیں۔جیسے کسی ملک کا جھنڈا۔ جو کہیں بھی لہرایا جائے فوراً اس ملک کا نام ذہن میں آئے گا......اسی طرح صلیب کا نشان......عیسائیت کا نشان ہے۔

لفظ اگر پرتوں کے ساتھ تہہ دار استعمال کے ساتھ اجاگر ہو تو علامت کا اظہار یہ اپنی حدوں کو پھیلا لے گا......اسی نکتے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ علامت کی اقسام کا جائزہ لیا جائے۔

ایچ فلینڈ رز ڈنبار (DunbarH.Falnders) نے مندرجہ ذیل تین قسمیں مقرر کیں......

۱۔خارجی یا من مانی (ArbitsosyorExtrinsic)

۲۔داخلی یا توصیفی (DescriptiveorIntrinsc)

۳۔بصیرتی یا کشفی (SymbolsInsight)

خارجی علامتیں محض دم چھلے ہوتی ہیں۔داخلی علامتیں کسی نہ کسی طرح نفسِ شے سے تعلق رکھتی ہیں۔فنون لطیفہ اور مذہب کی علامتوں میں یہی خصوصیت پائی جاتی ہے۔جبکہ بصیرتی علامتیں گہرائی کی حامل ہوتی ہیں۔بصیرتی علامتیں اس لیے بھی اہم ہیں کہ یہ عقلی تصور کے ذریعے معلوم تک رسائی ہی حاصل نہیں کرتیں بلکہ مثالی اور روحانی دنیا کے تصور سے ماورا حقیقتوں کے دروازے کھول کر متن کو کثیر الجہت بنا دیتی ہیں۔

علامت پر اتنا کہا نا کافی ہے کہ یہ بہت وسیع موضوع ہے امید ہے اس موضوع پر مزید گفتگو ہوتی رہے گی۔علامت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ:

''علامت حقیقت کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہے۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی کی اس بات کے جواب میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر صاحب نے علامت کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ حقیقت کو اجاگر کرنے کا ایک ذریعہ ہے جس سے ان کا مقصود یہ ہے کہ اگر علامت حقیقت کی عکاسی کرے تو اس کا فرض پورا ہو جاتا ہے۔بس یہی بڑا گھپلا ہے کیونکہ علامت عکاسی کا نہیں دریافت اور قلبِ ماہیت کا عمل ہے یہ کسی مرتب شدہ صورتِ حال کو سامنے نہیں لاتی بلکہ امکانات کو مس کرتی ہے تا کہ حقیقت کی پر اسراریت کو جان سکے۔''

وہ اپنی بات کو مزید واضح کرنے کے لیے یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ......

''فرض کیجئے رات اندھیری ہے اور آپ بجلی کے کھمبے کی طرف رواں دواں ہیں ایسی صورت میں آپ کا سایہ آپ کے پیچھے پیچھے آئے گا اور جیسے جیسے آپ روشنی کے قریب آئیں گے سایہ چھوٹا ہوتا چلا جائے گا تا آنکہ جب آپ کھمبے کے بلب کے نیچے آ کھڑے ہوں گے تو سایہ آپ کے قدموں میں سمٹ کر غائب ہو جائے گا۔مگر اس کے بعد جب آپ کھمبے کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھیں گے تو یہ سایہ آپ کے قدموں کے نیچے سے بر آمد ہو کر آپ کے آگے آگے چلنے لگے گا اور لمحہ بہ لمحہ طویل تر ہوتا چلا جائے گا تا آنکہ افق کو چھونے لگے گا......یہی حال علامت کا ہے جب معنی آپ کے پیچھے پیچھے آئے یعنی آپ کا تابع مہمل ہو تو یہ علامت نہیں جب یہ آپ کے قدموں تلے آ کر غائب ہو جائے تو یہ علامت بننا در کنار اپنے وجود سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا مگر جب معنی تخلیق مین پھوٹ کے لمحہ بہ لمحہ اپنے دائرہ کار کو بڑھانے لگے اور امکانات مین ڈھلتا چلا جائے تو ہم کہیں گے کہ ان معنی کی صورت علامتی ہو گئی۔''

یہاں اس بات کو یاد رکھنا بے حد ضروری ہے کہ علامت کسی مقررہ معنی کا نام نہیں کیونکہ ایسی صورت میں وہ فوراً ''نشان......(Sing)'' بن جائے گی جیسے صلیب جو قربانی کی نشانی ہے چونکہ یہ قربانی تک ہی محدود ہو گیا اس لیے معنی محدود کے باعث محض نشان بن کر رہ گیا۔اس کے برعکس علامت تو ہر دم پھیلتی ہوئی شعاعوں کا دوسرا نام ہے (میرے نزدیک یہ معنی کی وہ شعاعیں ہیں جو ٹوٹے ہوئے آئینے پر سورج کی کرن پڑنے سے ہر کرچی سے نئے رنگ کی صورت پیدا ہو کر چشم زدن میں ہر سمت پھیلتی نظر آتی ہیں) یہ شعاعیں دراصل وہ ''Tentacles'' ہیں جو ''حقیقت'' کے بطون میں اتر کر اس کے امکانات کو مس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

علامتی پسندوں کا خیال ہے کہ خارجی دنیا حقیقی دنیا نہیں ہے بلکہ (Absolute Inner) کا عکس ہے اگر اس بات کو مدنظر رکھا جائے تو صورتحال کچھ یوں واضح ہوتی ہے کہ زمان ومکان کے ظروف میں حیات جو مختلف شکلوں میں ظہور پذیر ہے، عقل وعرفان اس کا جاری وظیفہ ہیں جن کی بنیاد پر اذہان کی مختلف پرتیں (شعور، لاشعور، تحت الشعور) ناخنِ فکر وتدبر سے مسلسل زمین وآسمان کی گرہیں کھولنے میں منہمک رہتی ہیں۔ جب کائناتی صداقتیں اور حقیقتیں گہرے شعور وادراک کے ساتھ الحاق کر لیتی ہیں تو پھر جذبات واحساسات کا حصہ بن کر بطونِ تخیل سے علامت کی صورت قدرتی چشمے کی طرح پھوٹتی ہیں۔ ان کو اظہار کے لیے کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ازخود بیان کے پیرائے میں ڈھلتی جاتی ہیں۔ ادراک جس قدر وسیع وعمیق ہوگا علامت اسی قدر کثیر الجہت ہوتی جائے گی۔ ایسی علامتیں تہذیب کا حصہ اور ثقافت کا آئینہ بن کر ابھرتی ہیں۔ اور زبان کی طرح فاصلاتی اکائیوں کے ساتھ ہیئتی لبادہ اوڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں یہ امر ناقابل فراموش ہے کہ علامت کو فقط خارجی عوامل کسی تہذیب یا تاریخ کا اظہاریہ سمجھ لیا جائے گا تو وہ محدود ہوتے ہوتے معدوم ہوتی چلی جائے گی لہذا اس بات کا علم ہونا لازم ہے کہ علامت باطن کے باطن تک بھی رسائی رکھتی ہے اور یہ فقط مروجہ پیرائے میں ہی استعمال نہیں کی جاسکتی بلکہ جب یہ اندرون ذات یا پنہاں اسرار کی زبان بنتے ہوئے کسی قالب کی باطنی کیفیت کی مظہر بنتی ہے تو پھر یہ اسی قالب کی باطنی دنیا کی دریافت ہونے کے ناطے اس کے محسوسات اور جذبات کی زبان بن جاتی ہے......اسی کی درجہ بدرجہ ارتقائی صورت بلند ہوکر فرد سے اجتماع تک اور پھر زمان ومکاں کے سلسلوں حتیٰ کہ طبیعات ومابعد طبیعات کے ممکنہ رازوں کا روشن باب بنتی چلی جاتی ہے۔

Holding No. 11 Safari Block
Behind of DPS, 94 Road
Sahiwal, Panjab, Pakistan

نام کتاب: راستے خاموش ہیں — صنف: افسانے
مصنف: مکرم نیاز — سن اشاعت: ۲۰۲۲ء
صفحات: ۱۹۲ — قیمت: ۳۰۰ روپے
ملنے کا پتے
تعمیر پبلی کیشنز، نیو ملک پیٹ، حیدرآباد۔ نوبل انفوٹیک، لکڑی کا پل، حیدرآباد۔ مرشد پبلی کیشن، نئی دہلی
پاریکھ بک ڈپو، لکھنو۔ مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد، مہاراسٹر

● ثمینہ سید

جدید افسانہ کے خدوخال

اردو افسانہ شروع سے لیکر جدید دور تک نت نئے تجربات کرتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اردو افسانہ ان تجربات سے گزر کر اپنی شناخت اور وسعت میں اضافہ حاصل کرتا گیا اور ان ہی تجربات کی بنا پر اردو افسانے کی مختلف زمانوں میں مختلف ناموں سے تقسیم بندی کی گئی۔ اردو افسانے کو آغاز سے لیکر ترقی پسند تحریک کا سفر طے کر کے جدید دور تک بہت سارے تجربات کا سامنا کرنا پڑا اگر دیکھا جائے اردو افسانہ تجربات کا مرکز بنا ہوا نظر آتا ہے اور آج بھی اردو افسانے کو مختلف تجربوں سے گذرنا پڑ رہا ہے۔ ہر زمانے کے حالات، مسائل، موضوع، تکنیک، اسلوب، کردار، زبان و بیان، فن اور فکشن نگار مختلف نظر آتے ہیں۔ اتنی کم مدّت میں اردو افسانے میں یہ تبدیلیاں آئیں جو افسانے کی وسعت کی دلیل کو دھراتا ہے کہ ہر زمانے میں مختلف فکشن نگار نئے نئے تجربات، چاہے وہ موضوع، مسائل، تکنیک، اسلوب، کردار، زبان و بیان اور فن وغیرہ کے اعتبار سے کیوں نہ ہوں۔ یہ تجربات اردو افسانے میں لازم وملزوم نظر آتے ہیں۔ اردو افسانے پر اگر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو ہمارا افسانوی ادب درخشاں ستارہ کی طرح تابناک نظر آتا ہے۔ شروع سے ہی اردو افسانے میں مختلف قسم کے افسانے تخلیق ہوئے۔ جو زمانے اور حالات کے عین مطابق افسانہ نگاروں نے تخلیق کئے۔ اسی وجہ سے اردو افسانہ کبھی رومانی افسانہ، کبھی حقیقی افسانہ، کبھی نفسیاتی افسانہ، کبھی ترقی پسند افسانہ، کبھی تقسیم ہند کا افسانہ، کبھی جدید دور کا افسانہ، کبھی مابعد جدید دور کا افسانہ، کبھی نیا افسانہ اور کبھی ہم عصر افسانہ کے مختلف ناموں سے تعبیر کیا جانے لگا۔ آج ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ نام اردو افسانہ کے لیے لازم وملزوم نظر آتے ہیں۔ اور افسانوی ادب میں یہ نام اردو افسانہ کی پہچان بن کر ابھرے ہیں۔ پروفیسر خورشید احمد اپنی کتاب ''جدید اردو افسانہ'' میں لکھتے ہیں:

''کہ افسانہ کوئی جامد یا سنگ بستہ صنف نہیں ہے۔ اس میں تجربہ، تبدیلی اور اضانہ کو قبول کرنے کی بھر پور صلاحیت موجود ہے۔''

جدیدیت کا دور جہاں سارے ادب پر اثر انداز ہوا ہے۔ وہاں اردو افسانہ بھی اس کے اثر سے باہر نہیں۔ جدیدیت نے اردو افسانہ کو نئے موضوع، نئے مسائل، نئی تکنیک،، نیا اسلوب، نئے کرداد، نئی زبان، نیا فن، نئے تجربات، اور نئے افسانہ نگار عطا کیے۔ وہاں اردو افسانہ کو جدید نام (جدید افسانہ) سے منسوب کردیا۔

جدیدیت نام ہے پرانی روایت سے انحراف اورنئی درآنے والی روایت کی پیروی ہے۔

غرض جدیدیت ان ہی تبدیلیوں کا نام ہے جس کا آغاز اردو ادب ۱۹۵۵ء ۱۹۶۰ء کے آس پاس ہوا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے میں نئی فکر اور نئے احساس کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان افسانوں میں پریم چند اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کی حقیقت نگاری سے انحراف اور آدرشوں کے باطل ہونے کی مایوسی ملتی ہے۔ افسانے کا اسٹرکچر پوری طرح توڑ دیا گیا۔ کہانی سے انحراف، پلاٹ، کردار، آغاز، انجام اور وحدت ثلاثہ اور ربط ضروری نہیں سمجھا گیا۔ زماں ومکاں کا ماورائی تصور اور انسان کا بعد الطبیعاتی تصور پیش کیا گیا۔ زبان کی شکست وریخت اور شخصی علامات کا استعمال کیا جانے لگا۔ ہندی، ریاضیاتی اور علمی اشکال کے استعمال کی کوشش کی گئی۔ انور سجاد، بلراج مین را، سریندر پرکاش اور احمد ہمیش، احمد ندیم قاسمی، خالدہ حسین اور سعیدہ گزدار نے افسانے کے اسٹرکچر کو بالکل بدل کر رکھا دیا۔ نئے تجربات کیے، نیا پیرایۂ اظہار وضع کیا۔ لسانی سطح پر بھی شکست وریخت کے عمل کو روا رکھا۔ اور ایک نیا اسٹرکچر فراہم کیا۔ یہ افسانہ ترقی پسند افسانے سے مختلف تھا۔ وہ انسان کی خارجی زندگی کا سیدھا سادہ بیان نہ ہو کر انسان کے ظاہر و باطن کا امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہ افسانہ کوئی سماجی حل پیش نہیں کرتا صرف سماجی صورت حال کو سامنے لاتا ہے۔ افسانہ نگار کسی خاص نظریے یا مقصد کے حصول کے تحت افسانہ نہیں لکھتے۔ معمول سے الگ کوئی انوکھی یا سنسنی خیز بات کہہ کر یا کوئی غیر متوقع انجام پیدا کر کے قاری کو حیران کرتا ہے۔

افسانہ میں غیر ضروری تفصیلات سے گریز کیا گیا۔ حقیقت کو نظر انداز کر کے اس کو ماورائے حقیقت بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے لیے ایسا اسلوب منتخب کیا گیا جو داستانوی، خواب نویسی جیسا ہو۔ اس کے لیے بیان کی منطقی تسلسل کو جوڑ کر پیش کیا جانے لگا۔ شہروں کے نام نہیں لکھے گئے تاکہ افسانہ میں مقامی رنگ نہ آنے پائے۔ کرداروں کی جگہ ا، ب، ج یا پھر اس کے صفات معمر آدمی، سرخ بالوں والا، نجات دہندہ استعمال کیے جانے لگے۔ جدید افسانے کو اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ داستانوی، علامتی، تجریدی۔ داستانوی فضا میں حکایتی اسلوب کو بروئے کار لا کر اسطور اور دیومالائی کہانیوں کے ذریعہ کسی عصری واقعے کو بیان کیا جاتا ہے۔ علامتی اظہار کے ذریعہ شعوری اور نیم شعوری رشتوں کو ابھار کر افسانہ نگار معنوی تہہ داری پیدا کرتا ہے۔ جدید افسانے کے وجود واسباب کے بارے میں صبا اکرام نے اپنی کتاب ''جدید افسانہ چند صورتیں'' میں لکھا ہے:

''۱۹۶۰ء کے عشرے کو اردو افسانے کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اسی عشرے کے دوران اردو افسانے کا نیا رخ اس وقت متعین ہوا۔ جب جیمز جوائس Joyee James، ورجینیا وولف woolf Virginia، البیرٹ کامیو Comus Albert اور فرانز کافکا Kafka Franz کے زیر اردو افسانے میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ اس کے خدوخال میں یہ تبدیلیاں جو منٹو کے ''پھندے'' کرشن چندر کے ''غالیچہ'' احمد علی کے ''قید خانہ'' اختر اورینوی کے ''کینچلیاں اور بال جبریل'' عزیز احمد کے ''تصور

شیخ''،حسن عسکری کے ''حرام جادی''، سہیل عظیم آبادی کے ''الاؤ'' اور غلام عباس کے افسانہ'' آنندی'' میں ذرا دھندلی دھندلی سی تھیں وہ اب بالکل واضح ہو چکی تھیں اور جدید افسانے کا نیا چہرہ دمکنے لگا تھا۔''

اردو افسانے کی واضح تعبیر اور خدوخال اگر دیکھا جائے تو وہ ترقی پسند افسانے میں ہی نظر آتا ہے۔ واقعی ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اس فن کو فن کے اعتبار سے برتا اور اردو افسانے میں ایسے افسانے تخلیق کیے جنکی مثال عالمی ادب میں بھی ملنی مشکل ہے۔ افسانے کا یہ دور سنہری دور سے تعبیر کیا جائے تو کوئی شک و شبہ نہیں ہوگا۔ ترقی پسند تحریک کے بعد اردو افسانے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اگر چہ ترقی پسند افسانے پر بہت سارے اعتراضات بھی ہوئے پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ اردو افسانے کا یہ دور قیمتی دور سے یاد کیا جائے گا۔ اس نے اردو افسانے کو سماج کے قریب تر کیا اور افسانے میں اجتماعی سماج کے دکھ سکھ، درد و کرب، مفلسی، غریبی، ظلم و تشدد وغیرہ کی عکاسی نظر آنے لگی اردو افسانہ کی نشو و نما نئی سج دھج کے ساتھ وسیع تر فکری اور فنی بلندیوں کے زیر اثر ہوئی۔ چوتھی دہائی میں مختلف افکار و نظریات کی بدولت ہندوستانی عوام نمائشی اور مصنوعی زندگی کے خول سے باہر نکلنے کی جدوجہد میں مصروف تھے، نئی اور پرانی نسل کی ذہنی کشمکش نے بالآخر سیاسی اور سماجی بیداری کے ایسے آثار پیدا کر دئے تھے جن کی بنا پر انگریزی تسلط کے قدموں میں لرزش طاری ہو چلی تھی۔ یہ عہد افسانہ میں مذکورہ تغیر و تبدل کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ عکاسی شہری زندگی اور دیہی ماحول دونوں کی ہے۔ ادبی حلقہ میں اسے ترقی پسند تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے وابستہ افسانہ نگاروں نے اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کی بدولت افسانہ کے موضوع، اسلوب، تکنیک میں تنوع پیدا کیا، اور اپنے افسانوں کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن کا تعلق جیتی جاگتی دنیا کے بے بس اور مظلوم انسانوں سے تھا۔ دیہی لوگ عرصہ دراز سے لگان، بیگار، سود، موروثی قرض اور بے دخلی کے شکار تھے۔ رسم و رواج اور عقائد سے اندھی عقیدت مندی ان کی مفلوک الحالی میں اضافہ کرتی جا رہی تھی۔ چھوت چھات کے بھید بھاؤ نسبی اونچ نیچ، رنگ و نسل کی تفریق، اعلیٰ و ادنیٰ کا امتیاز، استحصال کی جڑوں کو مضبوط کر رہی تھیں۔ کم مائیگی اور بالا دستی کے تصور نے زندگیوں کو پیچیدہ، بے کیف اور لوگوں کو عسرت زدہ و تنگ حال کر دیا تھا۔ ریا کاروں نے جادو ٹونے اور آسیب کا جال پھیلا کر بھولے بھالے لوگوں کو ذہنی طور پر پسماندہ اور توہم پرست بنا دیا تھا۔ عورت کی حالت اور بھی دگرگوں تھی۔ جہیز کی قبیح رسم نے عام آدمی کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے کینوس میں اس عہد کے مزاج اور تغیر کی بھرپور ترجمانی کی۔ ترقی پسند تحریک میں بھی اردو افسانے میں نئے تجربات فن، اسلوب، موضوع، مواد ہیئت وغیرہ کے اعتبار سے کیا گیا یہاں ان کا تذکرہ مناسب نہیں ہے بلکہ جدید دور میں نئے تجربات ہوئے ہیں ان کا تذکرہ کرنا زیادہ مناسب رہے گا، کیونکہ اگر افسانوی ادب کو دیکھا جائے زیادہ تجربات جدید دور میں ہی سامنے آئے اور افسانے کو نت نئے تجربات سے ہمکنار ہونا پڑا۔ جدید دور کے افسانہ نگاروں نے یہ تجربات اپنے مزاج اور بدلتے حالات کو مدنظر رکھ کر بروئے کار لائے ہیں۔ جدید دور میں افسانے کو کن کن تجربوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس بارے میں ممتاز

شیریں اپنے ایک مضمون......''ناول اورافسانے میں تکنیک کا تنوع''میں لکھتی ہیں۔

''جب سے افسانہ اپنے مخصوص دائرے سے باہر آیا ہے اس میں بلا کا تنوع،وسعت اورقوت آ گئی ہے ۔افسانوی ادب متمول اورآزاد ہوگیا ہے۔ساری پابندیوں کوتوڑ کرزندگی کی ساری وسعتوں اور پیچیدگیوں کواپنے آپ میں سمولینا چاہتا ہے۔اب ایسے افسانے بھی ہیں جن میں پلاٹ نہیں ہوتا،جن کی کوئی متناسب اورمکمل شکل نہیں ہوتی،وقت اورمقام کاتسلسل نہیں ہوتا،اردوافسانے میں نئے تجربات کا سلسلہ ترقی پسندتحریک اوراس کی ہم عصرمتوازی تحریک''حلقۂ ارباب ذوق'' سے منسلک فنکاروں کی تخلیقات میں بھی جاری رہاجنہوں نے مل کرمغربی اثرات کے تحت حیاتِ انسانی کے خارجی وداخلی دونوں پہلوؤں کی ترجمانی کی۔خارجی اثرات چارلس ڈکنس،میکسم گورکی، ژولا، موپاساں،ایچ۔جی۔ویلز،بالزیک، ٹالسٹائی جیسے فنکاروں کی تخلیقات کے مطالعہ کی دین ہیں۔جبکہ مارشل ،ڈوروتھی،رچرڈسن،جیمس جوائس اورورجینا وولف کی قیادت میں داخلی زندگی کی عکاسی کی گئی۔دوسری جنگِ عظیم کے بعدداخلی نفسیاتی میلان بالخصوص فرائڈ کی تحلیل نفسی اورجنسی نفسیات کا اردوافسانہ پر گہرااثر پڑا۔مغربی اثرات کے باوجود ہردورمیں مشرقی روایات سے مکمل طورپر جڑے رہے اسی لیے ہمارے ادب میں روایت پرستی اورجدت طرازی کا اچھا امتزاج ملتا ہے۔

اسی زمانے میں ادب کے کینوس پر کچھ ایسی ہستیاں ابھریں،جنہوں نے اپنے آپ کوکسی تحریک یاازم سے منسلک نہیں کیا، بلکہ اپنی فنی بصیرت وسیع مطالعہ،عمیق مشاہدہ کثیرالجہات تجربات کے ذریعہ اپنی اوراپنے فن کی شناخت کروائی اورافسانوی ادب کوتخلیقی اظہار کی نئی جہات سے روشناس کرایا۔یہ ممتاز افسانہ نگارسعادت حسن منٹو، قرۃالعین حیدر،اورانتظارحسین،ڈاکٹرانورسجاد ہیں جنہوں نے آزادانہ طورپرادب میں نت نئے تجربے کیے۔

جدیدافسانہ اورافسانہ نگاروں کو یہ شاندارادبی پسِ منظرورثہ میں ملاتھا۱۹۵۵ء کے بعدہمارے ملک میں سیاسی،تہذیبی وثقافتی سطح پررونما ہونے والی تبدیلیوں سے عام زندگی متاثر ہوئی۔فردکی خارجی زندگی ہی انقلاب پذیرنہیں ہوئی بلکہ اب اس کے ذہن،تخیل اورافکار کاڈھانچہ بھی نیا تھا۔گویاایک نیاذہنی نظام وجودمیں آیاجوروایتوں کی سطح سے اٹھ کر نئے افق دیکھنے اور نئے زمانہ کے ساتھ چلنے کاخواہاں تھانتیجہ ظاہرتھا۔روایات کی اہمیت کم ہونے لگی۔تخلیق کاروں نے اپنے عہد کے تمام انقلاب اورتبدیلیوں کوجدید ڈھنگ سے پیش کرنیکی کوشش کی۔اس طرح جدیدافسانہ وجودمیں آیا۔ جس کے واضح خدوخال۱۹۶۰ء کے بعدابھرے۔یہ افسانہ کا تجرباتی دورتھاجس کامرکز افسانہ کی ہیئت اورتکنیک تھا۔

جدیدافسانہ میں طرح طرح کے تجربات کئے گئے ۔جو جاری وساری ہیں اورنئی جہتوں کی وجہ بنے ہوئے کامیابی سے افسانے کوادب کی مقبول اور ہردلعزیزصنف بنائے ہوئے ہیں۔

◄◄ ● ►►

● نوشی قیصر

افسانے میں علامت کیا ہے؟

جدید اردو افسانے کے رجحانات میں علامتی پیرایۂ اظہار کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر اچھا افسانہ، کہانی کے عقب میں موجود امکانات یعنی کہانی کے مخفی پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے، ابعاد کو چھوتا ہے ۔ بصورتِ دیگر افسانہ، کہانی کی سطح سے اوپر اٹھنے میں کامیاب نہ ہوگا اور محض اک ہی صورت، یعنی واقعہ کے بیان تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔مگر جب ہم افسانے کے علامتی رجحان کا ذکر کرتے ہیں،تو دراصل یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ کسی ایک دور میں بعض خارجی اور داخلی وجوہ کے باعث افسانہ نگار نے واقعہ کے خدوخال کو دھندلا کیا ہے،تاکہ اس کے عقب میں موجود نقوش شوخ ہو جائیں،مگر اس قدر نہیں کہ وہ کسی اور افسانے کے خدوخال بن جائیں۔اس ضمن میں SeturamamV.S لکھتے ہیں:

''تصنیف کی نقاب درنقاب ساخت ہوتی ہے،جس میں دوسری تصانیف کے حوالے مدہم طور پر موجود ہوتے ہیں۔گویا تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے ''Palimpsest'' یہ Palimpsetواضح رہے کہ اس تحریر کو کہتے ہیں جس کے نیچے سے مٹی ہوئی تحریر کی مدہم جھلکیاں نظر آتی ہیں۔اس خیال کا اطلاق اگر افسانے پر کیا جائے،تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر افسانے کے اندر مخفی نقوش موجود ہوتے ہیں۔علامتی افسانہ نگاروں کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انہوں نے ہر افسانے کے اندر کی مخفی سطحوں کو دریافت کیا ہے اور انہیں افسانوی پیکر عطا کیا ہے،مگر جدید اردو افسانے کے اس علامتی رجحان کا ذکر کرنے سے پہلے خود علامت کے مفاہیم کو اجاگر کرنا ضروری ہے۔''

لفظ سمبل (Symbol) یونانی لفظ (Symbolon) یہ لفظ دو لفظوں (Sym) اور Bolon) کا مرکب ہے۔ پہلے لفظ کا مفہوم ''ساتھ'' ہے اور دوسرے کا ''پھینکا ہوا''۔ چناں چہ پورے لفظ کا مطلب ہوا'' جسے ساتھ ملا کر پھینکا گیا۔'' اصل یونانی مفہوم میں اس کا استعمال کچھ یوں تھا کہ دو فریق کوئی چیز مثلاً (چھڑی یا کوئی سکہ) توڑ لیتے تھے اور بعد میں ان دو ٹکڑوں کو دونوں فریقوں کے درمیان کسی معاہدے کی شناخت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔اس طرح سمبل کا مطلب ہوا کسی چیز کا ٹکڑا جسے جب دوسرے ٹکڑے کے ساتھ رکھا جائے یا ملایا جائے،تو وہ اس اصل مفہوم کو زندہ کردے یا یاد دلادے جس کا وہ شناختی نشان ہے۔

وہ اس بارے میں مزید اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب کسی لفظ کو نئے مفاہیم عطا کیے

جاتے ہیں، تو علامت معرضِ وجود میں آتی ہے کہ علامت کسی مفہوم یا قدر کی نمائندگی کرتی ہے۔

علامت بیک وقت معاشرے کے افراد کی دلچسپیوں کا نقطۂ ارتکاز، ذریعۂ ابلاغ اور باہمی مفاہمت کی مشترکہ اساس ہے۔ مذہبی رسومات، علامتوں ہی کے حصار میں مقید ہوتی ہیں۔

بیشتر علامتیں فقط ضابطۂ کردار کی نمائندگی کرتی ہیں اور فرد سے مکمل اور جامع وفاداری کی متقاضی ہوتی ہیں۔ ہر علامت کی کچھ معلوم اور معروف توسیعات ہوتی ہیں اور کچھ نسبتاً غیر معروف۔

جدید افسانے کا آغاز ۱۹۵۵ء میں ہوا اور باقاعدہ علامتی افسانہ کی ابتدا ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ پاکستان میں انتظار حسین، خالدہ حسین، انور سجاد اور ہندوستان میں جوگندر پال اور سریندر پرکاش کی معرفت ہوئی۔ افسانہ معلوم سے نامعلوم کے سفر پر ہے، کیوں کہ حقیقت صرف وہی کچھ نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو ہماری سطحی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ جدید افسانہ ماضی سے ٹوٹے ہوئے رشتوں کی تلاش میں مصروف نظر آتا ہے۔ تلاش کے اس عمل میں داستان کی بھرپور اسلوبیاتی سپلائی لائن سے استفادہ کرنے کا رجحان نمایاں تر ہے اور نئی کہانی میں علامت، تمثیل، کتھا اور داستان مل کر ایک نیا تخلیقی پیکر اختیار کر رہے ہیں۔

بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: ''نئے افسانے میں داستانوی افسانہ، علامتی افسانے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ نیز یہ بھی کہ علامت ہمارے لاشعور کو تمثیلی پیرائے ہی کے ذریعے راس آتی ہے اور اردو کے نئے افسانے میں اکثر و بیشتر تمثیلی عنصر، علامتی عنصر کے ساتھ باہم آمیز ہو کر آتا ہے، اس میں قدیم کتھا کہانی کی سادگی بھی ہے اور آرٹ کا ڈسپلن بھی۔ چناں چہ افسانوی یا تمثیلی کہانی کی الگ درجہ بندی غلط ہے اور یہ اصلاً علامتی کہانی ہی کا ایک پیرایہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے علامتی تمثیلی کہانی کہا جا سکتا ہے۔''

یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اردو افسانے میں علامت کا استعمال اچانک شروع نہیں ہوا بلکہ علامتی افسانے کا شانہ روایتی افسانے کے شانے کے ساتھ ملا ہوا ہے، چناں چہ علامتی افسانے کی تحریک برپا ہونے سے پہلے احمد علی (میرا کمرہ)، سعادت حسن منٹو (پھندنے، ٹوبہ ٹیک سنگھ)، عزیز احمد (مدن سینا اور رصدیاں)، کرشن چندر (غالیچہ اور ایک سریلی تصویر)، ممتاز شیریں (میگھ ملہار) نے چند عمدہ علامتی افسانے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر پیش کیے تھے۔

علامت، سچے فنکار کے باطن سے پورے تخلیقی ہیجان کے ساتھ اُمنڈتی ہے اور اپنے انوکھے پن سے بے رنگ بیانیہ اور معمولی صورت واقعہ میں معنی کے نئے ابعاد روشن کر دیتی ہے۔ کانٹ نے علامت کو ''ترجمانی خیال'' قرار دیا۔ علامت، مرئی کے اندھیروں کو غیر مرئی کے اجالوں سے اور غیر مرئی کی دھندلاہٹوں کو مرئی روشنیوں سے یوں منور کرتی ہے کہ ہمارے سامنے حقیقت کے نئے اور انوکھے زاویے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ڈبلیو بی نے مسلسل ناقابل تعریف علامت نگاری کو اسلوب کا جز قرار دیا ہے۔ چناچہ علامت منزل کے راستے کو خوبصورت اور

معنی آفریں بنانے کا وسیلہ ہے اور ہر بڑا فنکار اسے اپنے ظرف اور ضرورت کے مطابق کام میں لاتا ہے اور قلب و روح میں پوشیدہ اقدار اور روایات کے صدیوں پرانے خزینے کو علامتوں کی مدد سے سطح پر لے آتا ہے۔

حالیہ دور میں کہانی کی بازیافت ہوئی ہے اور ٹھوس با ماجرا افسانہ کثرت سے لکھا جانے لگا ہے۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ تجریدی اور علامتی افسانے کے فنکار چوں کہ اپنے ساتھ اپنے نقاد بھی لائے تھے، اس لیے اس قسم کے افسانے کو متعارف کرانے، فروغ دینے اور مستحکم کرنے کی کوشش وسیع پیمانے پر ہوئی جس سے حقیقی افسانے کے ارتقا کا قدم قدرے رک گیا تھا۔ تاہم خوش آئند بات یہ ہے کہ افسانہ نگاروں کی ایک خاصی بڑی تعداد نے علامت اور تجدید نگاروں کے ساتھ ساتھ کنکریٹ افسانہ لکھنے کی کاوش کی اور حقیقت نگاری کے دروازے کو کسی زمانے میں بھی کلیتاً بند نہیں ہونے دیا۔ چناں چہ گذشتہ تین دہائیوں میں جو افسانہ نگار سامنے آئے، ان کی مجموعی تعداد شائید علامتی اور تجریدی افسانہ نگاروں سے زیادہ ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے شعوری طور پر ترقی پسند طبقے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن انسان دوستی کا جذبہ ابھارنے سے گریز نہیں کیا اور انسان کو زندگی کے گھمسان میں موجود رہنے اور بادِ حوادث کے تھپیڑے برداشت کرنے کی قوت عطا کی۔ کردار کے مثبت پہلوؤں کی تلاش شروع ہوئی، تو بہت سے منفی گوشے بھی سطح پر آ گئے۔

جدید علامتی افسانے کا آغاز جوگندر پال، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، غیاث احمد گدّی، سریندر پرکاش، انور سجاد اور خالدہ حسین کی معرفت ہوا۔ اس حوالے سے انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر سب سے نمایاں ہیں۔ اردو افسانے نے داستان کے بطن سے جنم لیا۔ اولین افسانہ نگاروں کی تخلیقات اس کی شاہد ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اردو افسانہ مشرقی سپلائی لائن سے کٹتا گیا۔ داستان کے حوالے سے علامتی طریق کار کا تجربہ بھی ابتدا ہی میں ہوا لیکن اس کی ترویج ممکن نہ ہو سکی۔

جدید علامتی افسانے کی تحریک کو اس وقت مزید فروغ ہوا، جب پاکستان میں آمرانہ حکومتوں میں حقیقت پسندانہ انداز سے اور کھل کر بات کہنے پر قدغن تھی۔ سو پاکستانی افسانہ نگاروں نے علامتوں، استعاروں اور اشاروں کنایوں میں اپنا مافی الضمیر بیان کیا اور بھرپور طریقے اور سلیقے سے نہ صرف معاشرے میں موجود سیاسی جبر، گھٹن کو علامتی اور استعاراتی انداز میں پیش کیا بلکہ اس جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشی مسائل، ذات کے اکیلے پن اور رشتوں کی توڑ پھوڑ کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ جدیدیت اور علامت نگاری کی اس تحریک نے اردو ادب کے قارئین کو بہت سے نئے اور اہم افسانہ نگاروں سے روشناس کرایا۔

◄◄ ● ►►

113 locket Road Harrow Ha37ny
London (UK)
Phone number +447944090733

● ساجد ھدایت

افسانہ میں مسئلہ ابہام

آپ نے اکثر پڑھا اور سنا بھی ہوگا کہ اچھے افسانے کی خوبیوں میں سے ایک خوبی اس میں ''تفہیمی ابہام'' کا ہونا بھی ہے۔اسی طرح اچھے افسانے کی خوبی ''تفہیمی ابہام'' سے پاک ہونا بھی قرار دیا جاتا ہے، یہ جملے لکھ اور کہہ کر ناقدین ومبصرین آگے بڑھ جاتے ہیں اور ادب کے طالب علم اور نو آموز مصنف کو اس سوچ میں غلطاں چھوڑ جاتے ہیں کہ ''ابہام'' ہے کیا؟؟ اس کا افسانویت سے کیا تعلق ہے؟؟ ......کیوں ایک ناقد اور صاحب علم تو اسے افسانے کی خوبی اور دوسرا اسے افسانہ کی خامی قرار دیتا ہے ؟؟.
کیوں کوئی ایک اسے افسانے کا اسرار کہتا ہے اور دوسرا اسے محض ''افسانویت'' کی اصل کہتا ہے؟؟

اس مضمون میں انہی سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی سعئ کی گئی ہے۔اس کے لئے ہمیں پہلے افسانہ، اسلوب، افسانہ کو احاطۂ تحریر میں لانے کا مقصد اور متنی معنویت اور تفہیم کی اہمیت وضرورت اور ابلاغِ متن کو سمجھنا ہوگا۔

ا۔افسانہ

افسانہ بنیادی طور پر اختراعی بیانیہ ہے، کہانی جس کا ایک اہم عنصر ہے، افسانہ کی افزائش مصنف کے ذہن میں فکری سطح پر ہوتی ہے اور پھر ایک بیانیہ ڈھنگ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتا ہے (اسے کہانی کی نسبت سے سنانے سے متعلق بھی سمجھا جاتا ہے)۔اردو افسانہ کی دو بنیادی اقسام ہیں۔

ا۔حقیقی افسانہ: ایسا افسانہ جو کسی انفرادی یا اجتماعی واقعہ، سانحہ، حادثہ، یا اردگرد کے معاشرتی ماحول یا سماج سے اخذ شدہ ہو۔

ب۔اختراعی افسانہ: ایسا افسانہ جو خالصتاً مصنف کی فکر اور تخیل کی پیداوار ہو اس کا عام زندگی، معاشرت اور سماج سے بظاہر کوئی تعلق نہ ہو مگر اپنے بیانیہ سے وہ حقیقی اور مانوس لگے اور کسی قابلِ قبول حقیقت یا گمان پر مبنی معلوم ہو۔

۲۔اسلوب

اسلوب یعنی انداز بیاں یا روشِ تحریر کو کہتے ہیں۔مصنف کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اسلوب کو متعین ومنتخب کرے۔اس میں مصنف کی میلانِ طبع کا عنصر بھی اہم ہوتا ہے۔متعین ومستعمل اور مستند اسالیب مندرجہ ذیل ہیں۔

☆ رواں بیانیہ اسلوب
☆ داستانوی اسلوب
☆ تمثیلی اسلوب
☆ اساطیری اسلوب
☆ مکالماتی اسلوب
☆ شاعرانہ اسلوب
☆ علامتی اسلوب
☆ تجریدی اسلوب

۳۔ مقصدِ تحریر

ہر تحریر کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ تحریر کے، متن کے ''معانی'' اس مقصد کو ابلاغی سطح پر لاتے ہیں۔ کوئی ایسی تحریر نہیں جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ یوں افسانہ میں ''مقصدِ تحریر'' کے عنصر سے پہلوتہی ممکن نہیں۔ لہذا ایسے افسانے جو ''مفہوم سے عاری''، تفہیم و ابلاغ سے کورے اور اہمال پر مشتمل ہوں وہ بے مقصد ہوتے ہیں۔ یعنی اگر افسانہ قابل تفہیم ہے تو اس کا تحریری مقصد پورا ہو رہا ہے، یعنی قاری کے ذہن سے اس کے متن کی ابلاغی سطح پر جڑت ممکن ہوئی ہے اور قاری کا ذہن اس کے مطالعہ سے فکری طور پر مہمیز ہوا ہے تو افسانہ ہے، وگرنہ وہ کوئی بے معنی، بے مقصد، معمہ نما، لایعنی تحریر کے سوا کچھ نہیں۔

افسانہ اپنی بنت میں فن (پیشکش) کی سطح پر چند بنیادی اصولوں/اجزا پر مبنی ہوتا ہے۔ یعنی پلاٹ، بیانیہ (اسلوب/انداز بیاں)، کہانی، کردار، مکالمہ، منظر نگاری، کیفیت نگاری، تحیر اور رد تحیر، آغاز اور اختتام۔ ان کی پاسداری اور ان کا اہتمام کرنا مصنف کے لئے لازمی ہے۔ (جدید اور مابعد الجدید افسانہ نویس ان میں سے کئی اصولوں سے گریز اختیار کرتا ہے، اس پر گفتگو آئیندہ کسی نشست میں کی جائے گی)۔

سو ان تمام بنیادی باتوں یعنی افسانہ، اسلوبِ افسانہ اور مقصدِ تحریر سمجھ لینے کے بعد ہم اب افسانہ میں ''ابہام کے مسئلہ'' کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس مسئلہ کا تعلق بنیادی طور پر مصنف کی فکر، اس کے سلوب اور افسانہ کے اصل تاثر/پیغام کی تفہیم و ترسیل کی باہمی بافت سے جڑا ہے۔ مصنف اپنی فکر (سوچ، تخیل) کو جب بیانیہ میں پیش کرتا ہے تو صنعتِ لفاظی کو استعمال کرتے ہوئے بہترین الفاظ کے ذریعے تحریر میں معانی و مطالب کا ایک جہان آباد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے مصنف استعاروں، تشبیہوں، تلمیہات، کنائیوں، علامتوں، کا سہارا بھی لیتا ہے۔ اس شعوری کوشش سے پیدا ہونے والے فکری لطف کو ہی جس سے قاری بھی حظ اٹھاتا ہے ''افسانویت'' کہتے ہیں۔

اور جب مصنف کے الفاظ ہر قاری کو نئے نئے معانی اور تفہیم سے روشناس کروائیں مگر وہ مجموعی تاثر میں اصل تفہیمِ متن سے وحدت تاثر کی صورت جڑے رہیں تو وہ ''معنوی ابہام'' ہوگا۔ جسے متن کی خوبی گردانا جائے گا۔ لیکن اگر معانی کا یہ جہاں افسانہ کی اصل کہانی کی تفہیم و پیغام کو نیا ہی رنگ دے کر وحدت تاثر کی خوبی کو ختم کر دے تو وہ ''قطعی ابہام'' ہوگا۔ جس سے پورے افسانہ کی ڈھانچ ہی گر جائے گی اور یہ قطعی ابہام افسانہ کے

اصل تحریری مقصدو پیغام، ابلاغ و تفہیم سے متصادم ہو کر وحدتِ تاثیر کا شیرازہ بکھیرتے ہوئے کہانی کو قاری کے ذہن میں کہیں کا کہیں لے جائے گا جس سے متن قاری کے لیے بھول بھلیاں سا بن کر رہ جائے گا۔

کیونکہ کسی بھی مصنف کا مقصدِ تحریر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے ذریعے سے قاری سے مخاطب ہو اور اسے ان تجربات، احساسات، رویوں، سوچ، فلسفہ، اور فکر سے روشناس کروائے جن کو وہ داخلی و خارجی سطح پر خود محسوس کرتا ہے یا جن سے وہ گزرا ہے، یا جن کو کسی پر اس نے گزرتے ہوئے دیکھا ہے یا وہ سماج اور اس میں وقوع پزیر واقعات کو کیسا دیکھتا ہے یا اس کی نظر میں یہ سب اردگرد، سماج کیا ہے اور اسے کیسا ہونا چاہیئے۔ اگر افسانہ میں ''قطعی ابہام'' در آئے گا تو اس کی تخلیق ''تشکیک و اہمال'' کے دائرے میں داخل ہو جائے گی اور ایسے قطعی ابہام کے حامل افسانے مصنف کی بے جا مشقِ قلم، پراگندہ ذہنی یا اس کے ذاتی کتھارسس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں گے۔

ایسے ''قطعی ابہام'' کے حامل افسانے بے شمار ہیں۔ لیکن زیادہ تعداد ان افسانوں کی ہے جنہیں علامت نگاری یا تجرید نگاری کے نام پر خلق کیا گیا۔ ان میں علامتوں کا بے مہار، بکثرت اور غیر مناسب استعمال کیا گیا جس سے متن ''قطعی ابہام'' کا شکار ہو کر، بے معنی اور تفہیم سے عاری اور تحریر کے اصل پیغام کی ترسیل سے دور ہو کر معمہ اور ناحل شدہ پہیلی بن گیا۔ جبکہ علامتی اسلوب اور علامت نگاری تو اصل میں علامتوں کے معنوی و تفہیمی نظم وضبط کا بندوبست رکھنا ہے۔ جس میں برتی گئی علامتیں ''معنوی ابہام'' (ہما جہتی تاثراتی یا فکری تفہیم) ''پیش قدم اور پیش بند یا پیش رو'' کے اصول پر عمل پیرا ہوتی ہیں۔ جو کہانی کے بنیادی پیغام کو متاثر کر کے اس کی ڈھانچ کو نہیں گراتیں اور قاری کے ذہن کو کہانی سے جوڑ کر رکھتی ہیں اور کہانی کے آغاز واختتام تک ایک بنیادی پیغام کو اس کی فکر میں رواں دواں رکھتی ہیں۔

''سو افسانہ چاہے وہ کسی بھی اسلوب میں تحریر کیا گیا ہو میں ''معنوی ابہام'' کی گنجائش بہر طور موجود رہتی ہے، مگر ''قطعی ابہام'' جو کہانی کے اصل پیغام کی ترسیل نہ کر سکے، اسے اہمال و زومعنویت میں ڈھال دے یا اصل پیغام کو ہی الٹ پلٹ کر رکھ دے یا وحدت تاثر کو یکسر ختم کر دے اس کی کوئی گنجائش نہیں۔''

◀◀ ● ▶▶

Lahore, Pakistan

نام کتاب	:	دوور لیش میں	مصنف وناشر	:	مجیر احمد آزاد
سن اشاعت	:	۲۰۱۵ء	قیمت	:	۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ
نولٹی بکس، قلعہ گھاٹ دربھنگہ

● ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی

عالمی گاؤں میں معاصر اردو افسانے کی فکری اساس

جب معاشرے کی تکالیف، اس کی محرومیاں، مایوسیاں، اداسیاں اور مجبوریاں افسانے کے کرداروں میں نمودار ہونے لگتی ہیں تو وہ اپنے عصر کی ترجمانی کا دعویٰ کرتا ہے۔اس کی ایک تاثیر ہوتی ہے جو معاشرے کی منافقت اور اس کے گھناؤنے پن کو آئینہ دکھاتی ہے۔ جب سوچ کے آبشار پھوٹتے ہیں تو اس کی نمی سے فکر کی شاخوں پر وہ برگ و بار اور کلیاں پھوٹتی ہیں جن کے رس معاشرے میں پھیلی بیماریوں کے لیے تریاق کا کام کرتا ہے اور یہ سب کام سہل پسندی سے نہیں جنوں آمیزی سے ہوتا ہے اور جنوں آمیزی آتش نمرود کو بھی سرد کر دیتی ہے اور جب آتش نمرود سرد ہوتا ہے تو جلتی انگیٹھی بھی گلزار بن جاتی ہے۔ یہ سوچ جب اردو افسانے کے کینوس پر اپنا جلوہ دکھاتی ہے تو قاری اس کے دام الفت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ خون دل کے خراج سے ان فن پاروں کے رخسار پر نکھار آتا ہے۔ان افسانوں میں احساس وجذبات کی تاباں وتوانا دنیا آباد ہوتی ہے۔ جہاں تہذیبی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی زوال اظہاریت کا لبادہ زیب تن کر کے قاری کے سامنے کھڑے ہو کر بے ساختہ کہتا ہے۔خوش فہمیوں کے جھولے میں خواب نہیں پلتے۔! ایسے افکار کی شناوری کوئی معمولی عمل نہیں ہے اس کے لیے احساسات کی ہر مقناطیسی سوئی کو باعمل ہونے پڑتا ہے نیز حساسیت بام عروض پر کمندیں ڈالنے کی توانائی رکھتی ہو۔

ہر فن پارے کے باطن میں معنی ہوتا ہے اس معنی کی تلاش کرنا، اس کو قاری کے سامنے اجاگر کرنا اس کے حسب ونسب کو پر اثر طریقے سے پیش کرنا صاحب علم وادب کا ادبی فریضہ ہے کیونکہ ہر فن پارے میں بلاواسطہ یا بالواسطہ فن پارے کا خالق ایک خواب دیکھتا ہے۔اس خواب کی تعبیر کی اسے تلاش ہوتی ہے۔ جب ایسے سیکڑوں خواب مجسم ہوتے ہیں تو ایک عہد کی تعمیر ہوتی ہے۔اسی لیے ایسا کہا جاتا ہے کہ فن پارے میں اس کا عہد جھانکتا دکھائی نہ دے تو پھر وہ کس کام کی چیز؟ رہی بات دل بہلانے کے لیے تو اس کے لیے دنیا میں ہزاروں وسائل میسر ہیں۔

جب تک افسانہ عصری حقائق کی جستجو پر توجہ مرکوز نہیں کرے گا عصری مقبولیت اس کو نہیں ملے گی اور جس فن پارے کو عصری مقبولیت نہیں ملتی وہ حاشیے پر چلا جاتا ہے۔افسانے کے کینوس پر جب معنیاتی، نحویاتی اور لفظیاتی جہاتوں کا سنگم ہوتا ہے تب اس میں موضوعاتی، جمالیاتی اور لسانی شعاعیں ایک ساتھ ایک

نکتے پر مرکوز ہوکر قاری کے دل ودماغ کو منور کرتی ہیں۔اس ضمن میں نعیم بیگ (لاہور) کا افسانہ ''نیا عالمی چیپٹر'' سرمایہ داری کی عفریت کو دامن میں سمیٹے ایک ایسے عالمی چیپٹر سے قاری کو روشناس کراتا ہے جس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔اس افسانے کا مرکزی کردار ماہر معاشیات ہے جس کا نکتہ نظر مرکزی مالی استطاعت پر استعماری اعداد وشمار کے نظام سے منحرف ہے۔وہ انسانیت کو فوقیت دیتا ہے جبکہ ثانی الذکر ادارہ کا مقصد دنیا کا نقشہ عددی لحاظ سے مختصر کرنا ہے۔عالمی دولت میں اضافہ ہو لیکن اس کی محدودیت چند ہاتھوں تک ہی رہے اور وسائل کی مکمل اجارہ داری رہے۔اس فلسفہ حیات کو سامنے رکھ کر ادارہ فعال ہے۔اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے توزی چیا کو غدار قرار دے کر وہاں میں ایکٹویٹ کر دیا جاتا ہے۔

''ہمیں بتایا گیا کہ یہ سزائی زندگی ہوگی جو 'وائرس ایکٹیویشن' سے ہوگی۔غدار خود زندہ رہے گا لیکن موت کے تباہ کن و تیز ترین پھیلنے والے جرثوموں کا کیریئر ہوگا۔اس کے قریب پھٹکنے والی ہر زندگی موت میں بدل جائے گی۔لاکھوں انسانوں میں بیماری پھیلانے کے بعد ایک مخصوص وقت کے بعد خود بھی انہیں جرثوموں کے ہاتھوں عبرتناک موت کا شکار ہوجائے گا۔''

افسانے کے مرکزی کردار کا ذہنی کشمکش شباب پر تب آجاتا ہے جب اس کے پاس آپشن آتا ہے کہ غلام بن کر رہو اور انسانیت کو مارو۔ایسے میں اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون ہے جو عالمی اعداد وشمار کو شفاف بنا کر انسان کے حق میں کردے۔افسانے کا تھیم یہاں آکر سمٹتا ہے کہ فطری آزادی انسانی زندگی کی معراج ہے اور سرخاب احمد خان غلامی کے سنہرے طوق کو گلے سے نوچ کر اتار پھینکتا ہے۔ المختصر افسانے میں جہاں انسان دوستی کی تبلیغ ہے وہیں اس کا ملال بھی ہے:

''ڈارلنگ! میں دھوکا کھا گیا۔یہ سب سراب تھا۔مجھے بتایا گیا تھا کہ ہم انسانی تحفظ کی نئی راہیں استوار کرنا چاہتے ہیں۔لیکن یہاں 'سروئل آف دی فٹسٹ' کے معنوں کو بالکل نئی تفہیم دی جارہی ہے۔اور اِس کے نتائج کو سرمایہ سے نتھی کر کے انسانیت کو روندا جارہا ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ دولت بڑھ جائے اور اس کا ارتکاز چند لوگوں تک سکڑ جائے۔نیو لبرل فلاسفی کا آخری حربہ آزمایا جارہا ہے۔جب تک حیات کی گلوبل سطح پر عددی کمی نہ ہوگی۔ان کے لیے مثبت نتائج سامنے نہیں آئیں گے۔''

مونا شہزاد (کینڈا) کا افسانہ ''انوکھا لاڈلہ کھیلن کو مانگے چاند'' تین حصوں پر مشتمل ہے۔تینوں حصے ایک نکتے پر سمٹتے ہیں جہاں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ نئی نسل کے لڑکے اپنے خواب کو پورا کرنے کے لیے والدین، ان کی وراثت اور دوسرے خونی رشتے کو صرف جذباتی وابستگی سمجھتے ہیں۔افسانے سے یہ بھی تاثر ابھرتا ہے کہ بیٹیاں مکان اور گھر کے افتراق کو بیٹوں سے زیادہ سمجھتی ہیں۔افسانے میں بچھڑنے والی روح

کے کرب کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔جس میں ایک چبھن ہے۔حساس دل ہی اس ٹس کو محسوس کر سکتا ہے۔ افسانہ یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ ڈالر بیٹے کا بدل نہیں ہے۔نیز ماں کی ممتا پیپل کی چھاؤں ہے جس کے نرم نرم سایے میں بچپن لڑکپن کے حدود کو پھلانگتے ہوئے جوانی کی دہلیز پر دستک دے کر نا خلف ہو جاتا ہے۔یہ وہی ماں ہے جو جب تک بیٹا سفر میں رہتا ہے وہ سجدے میں رہتی ہے۔اس کی مقدس نگاہیں بیٹے کے قدموں کے غبار کی واپسی کا منتظر رہتی ہیں۔بہر حال افسانہ قاری کے جمالیاتی حس کو تسکین دیتا ہے۔ افسانے میں جن مسائل کی طرف نشاندہی کی گئی ہے وہ اچھوتا نہیں ہے لیکن انداز پیشکش جداگانہ ہے۔اس افسانے کو پڑھ کر ذہن کے سائبان میں اس شعر کی بازگشت سنائی دینے لگتی ہے۔

وہ دیا ہوں جو سدا طوفان کی زد پر جلا　　میری جاں بازی کے منظر موسموں کو یاد ہیں

ڈاکٹر ریاض توحیدی (کشمیر) کا افسانہ ''داستان شوقین'' روایتی موضوع کا ایک دلگداز افسانہ ہے جو اختتام پر رزم گاہ عشق میں الم کی داستان سناتا ہے۔افسانے میں منظر کشی اپنے شباب پر ہے۔افسانہ پڑھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے میں خود کشمیر یونیورسٹی کے باہر ڈل جھیل کے کنارے کھڑے ہو کر سارے مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔افسانہ کیا ہے دو اسکالروں کی پریم کہانی جو پریم رس سے شرابور ہے جس کا اختتام الم ناک ہے۔کہانی بس اتنی سی ہے کہ شوقین اور شائستہ ایک ہی نگراں کے ماتحت کشمیر یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہے ہیں۔دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت کے کنول کھلتے ہیں۔خیالات وجذبات کے امانت دار بنتے ہیں۔جب زندگی گلستان بننے لگتی ہے تو مغل باغات کی سیر کا مزہ بدل جاتا ہے اور چشمۂ شاہی کا نظارہ فردوس نگاہ لگنے لگتا ہے۔ایسے نظارے جب شباب پر پہنچتے ہیں تو اس کا نکتہ راس یہ ہوتا ہے۔

''ہم دونوں اکثر چشمہ شاہی کے فردوس نگاہ سبزہ زار، گنگناتے آبشار اور رنگ برنگ کے گلزاروں کے دل آویز نظاروں میں پہروں کھو جاتے اور بے کنار آسمان کے نیلے عالم کو تکتے رہتے۔خاموش فضا میں کبھی کبھی ملائم ہوائیں پیڑوں کی شاخوں سے ٹکراتیں اور ان پر بیٹھے پرندوں کی سریلی آوازیں ہماری سماعتوں کو قیدی بنا کر بانسری کی میٹھی اواز کی حریف بن جاتیں۔''

اس اقتباس کو پڑھ کر کرشن چندر کا افسانہ ''پورے چاند کی رات'' کی یاد دل پر دستک دیتی ہے اور جمالیاتی حس ایک ان کہی لذت محسوس کرتی ہے۔افسانے کے اختتام پر شائستہ اپنے نگراں کے ایم بی بی ایس بیٹے کے ساتھ گھر والوں کی مرضی سے انگیج ہو جاتی ہے اور رو رو کر کہتی ہے۔

''زون کا یوسف سے جدا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی۔''

اس جملے سے قاری کے دل پر بھی دھکا لگتا ہے اور قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈل جھیل میں

تیرتے تیرتے محبت کا شکار ایک بہ یک غرق آب ہوگیا۔ پھر موسم بہاراں میں خزاں کا ماتم ہونے لگتا ہے۔ جھیل سی آنکھوں کے کنول کمہلا جاتے ہیں۔ تب افسانے کا راوی کہتا ہے۔

''وقت کتنا بے رحم ہے کہ گلابی چہروں کے حسن کو جھریوں کے زہریلے کانٹوں سے ریزہ ریزہ کرتا رہتا ہے۔ وہ اگر حسن پرست ہوتا تو حسین شے کو ہمیشہ حسین ہی رکھتا۔''

یقیناً یہ شکوہ کچھ بجا سا لگتا ہے۔ افسانے کے کرداروں میں اپنے کلچر کی تحفظ کا احساس جا گزیں ہے۔ اس میں تذبذب ہے۔ میرے خیال سے اختتام اگر شعر کی بجائے ایک پنچ لائن سے ہوتا تو بہتر ہوتا۔ زبان کی روانی کیا کہنے بس لگتا ہے جیسے ڈل جھیل کی نرم نرم کومل وملائم لہریں سبک رفتاری سے آگے بڑھتی جارہی ہیں۔ افسانے کی فضا میں ایک سمفنی ہے۔ آغاز میں ایک جگہ افسانے میں بین المتونی کا عنصر کا شائبہ بھی ہے لیکن دو ہنسوں کے جوڑے کو بچھڑ جانے کا احساس قاری کو شدت سے ستا تا ہے۔

افسانہ ''کھیپ'' (شاہین جمال، سوئزرلینڈ) میں دو کردار سامنے آتے ہیں۔ سالار اور احیا۔ افسانے کی نسائی کردار احیا سے سالار کی قربت بڑھتی ہے۔ سالار احیا کی محبت میں خود کو بھول جاتا ہے۔ وہ اس کی محبت کو اوڑھ لیتا ہے۔ اس کی دھڑکنوں کو اپنی دھڑکن میں مدغم کر لیتا ہے۔ سالار جس فارماسیوٹیکل کمپنی میں ملازم ہے وہ کمپنی قصبے کے مضافات میں ایک تحقیقی مرکز قائم کرنا چاہتی ہے تا کہ اس قصبے کی بنجر زمین اس قابل ہو جائے کہ اس میں ایک مخصوص فصل کی کھیتی کی جائے۔ کمپنی سالار کو وہاں بھیجتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کی زندگی بس ایک روبوٹ کی طرح ہے۔ سالار سے ان کا رشتہ ناطہ صرف صبح وشام کے صاحب وسلام سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ غالباً اسی کو افسانے میں معدوم شدہ قدیم انسانی خصوصیات کہا گیا ہے جس کو تبدیل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور مٹی کو زرخیز کیا جا رہا ہے۔ افسانے کا اختتام اس کو سائنسی فکشن کی قطار میں کھڑا کرنے کی کوشش ہے۔ نئی کلون کھیپ میں معدوم شدہ قدیم انسانی خصوصیات کا پایا جانا اور پھر اگلی کھیپ تیار کرنے سے پہلے ڈی۔ این۔ اے پر تحقیق کی ضرورت یہ اشارہ کرتی ہے کہ معدوم شدہ انسانی خصوصیات کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے آپریشن کلین اپ ضروری ہے۔ یہ آپریشن ڈی۔ این۔ اے پر کرنے کا منصوبہ ہے۔ ڈی۔ این۔ اے وراثت (Heredity) کی اکائی ہے جس کی تشکیل چار قسم کے بیس,Adenin,Guanin,Cytocin Thiamin orUrecil سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں فاسفورس بھی ہوتا ہے۔ ایک جاندار کے تمام اوصاف اس میں موجود ہوتے ہیں جو موافق حالات میں ڈی کوڈ ہو کر اوصاف ظاہر کرتے ہیں۔ اس افسانے کا اشارہ اس جانب ہے کہ قصبے میں بسنے والے لوگوں کی خصوصیت کو بیرونی وائرس سے بدلنا ہوگا۔ یہ بیرونی وائرس سالار کے نظریات کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

افسانے کی کلید آخری اقتباس ہے جس سے افسانہ کھلتا ہے۔یعنی موصوفہ افسانے کو سائنس کی کلید سے کھول کر اس کو سائنسی فکشن کے قریب کر دیا ہے۔

فرحین جمال (بیلجیم) کا افسانہ ''میری دلاری'' نصیحت کا ایک پٹارہ ہے جس کی ضرورت ہماری زندگی کو بھی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار اپنی ماں کی نصیحت سنتے سنتے یہ بھول جاتا ہے کہ لڑکپن کے سندر سپنے کیا ہوتے ہیں۔بیٹی کو حرافہ بننے سے روکنے کے لیے اور ایک مہذب زندگی جینے کے لیے کن کن باتوں پر دھیان رکھنا پڑتا ہے، اس کی تاکید ماں روزانہ کرتی ہے لیکن خورشید سے شادی کے بعد جب وہ دو بچیوں کی ماں بن جاتی ہے تو زندگی کے سائبان میں خورشید کی تمازت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ایک دن طلاق کا طوق پہن کر نفسیاتی اذیت پہنچانے والے شوہر کے گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔اس دوران زندگی کے رن میں ماں کی پوٹلی سے ایک بھی گر کام نہیں آیا۔افسانے کا آخری جملہ پڑھ کر ایسا لگا جیسے افسانہ نسائیت کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ مرد اساس معاشرے میں زندگی جینے کا ہنر نبرد آزمائی میں ہے۔افسانے میں خورشید کی زیادتی کا بھی ذکر ہوتا تو سکے کے دوسرے رخ سے بھی قاری واقف ہوتا۔افسانے کی زبان رواں دواں اور پر تاثر ہے۔

''نیلو، ایفروتی اور ایک خواب'' (معظم شاہ پاکستان) ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔بابا گیری کے نام پر خواتین کا جو استحصال ہوتا ہے اس پس منظر میں افسانے کا تانا بانا بنا گیا ہے جس میں ہر کردار باعمل ہے۔اس افسانے میں قاری تک یہ پیغام دینے کی کوشش ہوئی ہے کہ انسان کی سرشت میں خباثت چھپی ہوتی ہے لیکن ایمانی جذبہ جب تک اس پر غالب رہتا ہے شیطانی نفسیات قابو میں رہتی ہے۔جیسے ہی یہ بے لگام ہوتا ہے، دور کھڑے ہو کر شیطان اپنی کامیابی پر قہقہے پر قہقہے لگاتا ہے۔افسانے سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ محبت جب فحاشی بن جاتی ہے تو اس کی شکل کیسی شرمناک ہو جاتی ہے۔افسانہ میں ذات کا نفسیاتی کرب اپنے عروج پر ہے۔زبان کی روانی خوب ہے۔قاری جس جذبے کے بہاؤ میں بہتا ہے وہ اختتام سے کچھ قبل اس جملے سے ٹھٹھک جاتا ہے۔

''حضرت صاحب میں نے پانی گرم کر دیا ہے، وضو کر لیں۔''

سبین علی کا افسانہ ''سرنگ کے راستے'' جدید اسلوب میں لکھا گیا ہے۔افسانے میں تذبذب کی کیفیت ہے۔سرنگ زندگی کی علامت ہے۔جس میں راوی کو کبھی وقت کا پہیہ رک جانے کا خوف ستاتا ہے تو کبھی ماضی کی تاریکی میں گم ہو جانے کے ساتھ ساتھ مستقبل کو پیچھے چھوٹ جانے کا تذبذب ہے۔راوی کو خود اپنے وجود کی شناخت نہیں مل رہی ہے کہ وہ کون ہے اور کس عہد میں زندہ ہے۔اس کی زندگی کے سفر میں ایسا کوئی موڑ نہیں آیا کہ اس سے باہر نکلے۔یہاں راوی عورت ہے جو اپنی مظلومیت کو یوں پیش کرتی ہے:

''اختیار اور بے اختیاری کی کشمکش ایسی ہے جیسے تنگ راہگزر میں کھائی کے ساتھ چلتا مسافر یا

ایک تنے رسے پر چلتا مداری جو منزل تک پہنچ جائے گا یا کہیں بیچ راہ محض ورق گم گشتہ بن جائے گا۔''

یہ وہ عورت ہے جس کا وجود تپتی مٹی کے ذروں سے بنا ہے جس میں کیکر کے پھولوں کی مہک ہے اور قدم گرد آلود ہیں اور چہرہ غیر واضح ہے۔ ایسا اس لیے کہ یہ اپنا سب کچھ بے اختیاری میں تیاگ دیتی ہے۔ زندگی کے طلاطم خیز لمحوں کے بعد دور دیس سے آئے سواری اسے راج سنگھاسن پر بٹھا کر اس کی ذات پر پریم رنگ ایسے چڑھاتا ہے کہ وہ چاہ کر بھی اپنا کورا رنگ واپس نہیں لاسکتی ہے کیونکہ سفید کپاس پھول کے ریشوں پر کوئی بھی رنگ ہو چوکھا چڑھ جاتا ہے۔ افسانے میں جہاں عورت کی مظلومیت کا کرب ہے وہیں حسین زادیوں کے بے قیمت حسن کا رونا بھی رویا گیا ہے جو پارکنگ کی ٹکٹ کاٹتے بسوں میں دھکے کھاتے، ریسپشنسٹ کے کاؤنٹر پر گھنٹوں کھڑی رہتی ہیں۔ ان حسین زادیوں کو دیکھ کر افسانے کے کینوس پر سوال کا یہ سکہ اچھالا جاتا ہے۔

''کیا حسن اتنا ارزاں ہوتا ہے یا چند سکے اتنے گراں مایہ؟''

اس کے علاوہ افسانے میں تعلیم یافتہ لڑکیوں کی بے بسی اور مرد اساس معاشرے میں ان کی گم ہوتی شخصیت پر بھی چوٹ کی گئی ہے۔ افسانے کا اختتام یہ اشارہ کرتا ہے کہ ایک عورت کی زندگی سانپ کی مانند گھوم کر زندگی کی اسی سرنگ میں دوبارہ داخل ہو جاتی ہے جہاں مرد اساس معاشرے میں وہ کولہو کا بیل ہے جس کی اپنی شناخت اور قدر و قیمت گم ہے۔

ریحان کوثر کا افسانہ ''ریختہ'' جدید اسلوب و نیم علامتی پیرائے میں لکھا گیا ہے جس کا بے نام کردار جدید افسانے کے کرداروں کی طرح الجھن کا شکار ہے۔ افسانے میں تذبذب ہے۔ ایک قتل کی پر اسراریت پر سے پردہ اٹھانے کے لیے پلاٹ کے تانے بانے کو اس طرح بنا گیا ہے جیسے ہم کوئی جاسوسی ناول کا باب پڑھ رہے ہوں۔ افسانے میں ٹرین کا کمپارٹمنٹ دراصل ہمارا وہ سماج یا معاشرہ ہے جس میں ہم زندگی کی ایک ایک سانس لے رہے ہیں۔ جہاں جسم میں سر نہیں بلکہ دونوں طرف پیر ہی پیر ہیں۔ کھڑکیاں کھلی ہیں لیکن پردے حائل ہیں۔ منہ پر کالے بینڈس ہیں۔ امن کمیٹی کی سربراہی مذہبی پیشوا کر رہے ہیں۔ افسانے میں عالمی سطح پر ایک مخصوص قوم کی زبوں حالی کا فلیش بیک مقتول کے نوٹ بک کے سہارے پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کے کینوس پر ڈرائیور کی پر اسراریت آخر آخر تک سمجھ میں نہیں آئی۔ سیریا، روہنگیا، فلسطین میں مسلمانوں کی گم ہوتی شناخت کے المیے کو افسانے میں بڑی ہنر مندی سے پیش کیا گیا ہے۔ پریاگ راج، مرلی، بنسل کے علاوہ امام صاحب اور ڈرائیور اس افسانے کے متحرک کردار ہیں لیکن افسانے کا محور جس کردار کے گرد و پیش گھوم رہا ہے وہ بے نام ہے۔ جدید افسانے میں بے نام کرداروں کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ افسانے میں قتل کی پر اسراریت سے اختتام تک پردہ نہیں اٹھتا ہے۔ یعنی اس گتھی کو سلجھانے

کی ذمہ داری قاری کے سر رکھی گئی ہے۔افسانہ کچھ طویل ضرور ہوگیا ہے۔خصوصاً ابتدائی حصے میں اتنے مکالمے بازی ہوئے ہیں کہ ذہن بوجھل ہوجاتا ہے۔

مکرم نیاز کا افسانہ ''سوکھی باؤلی'' سادہ بیانیہ اسلوب میں ایک سبق آموز افسانہ ہے۔افسانے کا مرکزی خیال گھر کے بزرگوں کی ناقدری کا شکوہ ہے۔عصر حاضر میں یہ گھر گھر کا قصہ ہے کہ بوڑھے والدین گھر کا اچھوت بن گئے ہیں۔جن کی خوشحالی کے لیے ان بزرگوں نے سنہری خواب دیکھے،رات کی نیند حرام کی،زندگی کی دھوپ کی تمازت برداشت اور خود بھوکے رہ کر اپنی اولادوں کے منہ میں نوالہ ڈالا،لیکن افسوس جب ان پر ضعیفی طاری ہوئی تو ان کو اولڈ ہوم بھیج کر یا اپنے ہی مکان کے گودام میں ان کے لیے کمرے بنا کر ان کو زندگی گھسیٹنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔اس افسانے کے کینوس پر یہ کرب جا گزیں ہے۔

''اس دنیا میں لوگ عمارت دیکھتے ہیں،مکان کی منزلیں گنتے ہیں،لیکن کوئی سنگ بنیاد کے بارے میں دریافت نہیں کرتا۔دادی جان بھی محض بنیاد کا پتھر تھیں۔لوگ سمجھتے ہیں بڑھاپا آدمی کو تمام جذبات،احساسات اور ضروریات سے بیگانہ کر دیتا ہے اس لئے ہمارے معاشرے میں بوڑھے لوگوں کو ''دادی جان'' جیسا کوئی معزز خطاب عطا کر کے گھر کے کسی کونے میں شو پیس کی مانند بٹھا دیا جاتا ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار دادی جان ہیں جو ایک بالٹی پانی کے لیے ترس رہی ہیں۔یہ وہی دادی جان ہیں جنہوں نے کبھی ایک پرسکون جگہ پر حویلی تعمیر کر کے اس میں ایک باؤلی بنوائی تھیں لیکن ان دنوں ان کے لہو میں بھی گرمی تھی۔اس لیے انہوں نے بھی ایک مزدور کو اس باؤلی سے پانی لینے پر یہ کہہ کر اعتراض کیا تھا۔

''اے دور ہٹو! یہ تمہارے باپ کی باؤلی نہیں ہے۔پانی پینا ہے تو باہر جا کر کسی دوسری باؤلی کا پانی پیو۔خبردار اس پانی کو جو اپنے غلیظ ہاتھوں سے ناپاک کیا۔چلو نکلو یہاں سے۔''

دادی کے اس کلمے میں تھوڑا سا غرور کا شائبہ ہے جو اللہ کو پسند نہیں۔بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ آپ دنیا میں جیسا کیجئے گا ٹھیک وہ اسی شکل میں ایک دن آپ کے سامنے آئے گا۔لہذا دادی جان کو بھی یہ دن دیکھنا پڑا کہ ان کو بہوؤں نے اپنے حمام میں داخل ہونے سے روک دیا۔افسانہ خودغرضی پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔یہ بھی سبق پڑھا رہا ہے کہ بدیانتی ناانصافی کے بطن سے پنپتی ہے۔یہ نکتہ بھی قاری کے ذہن میں ڈالتا ہے کہ ہم اپنی ضرورت کی تکمیل تو کر لیتے ہیں لیکن جن کی ضروریات کی تکمیل ہمارے ذمہ ہوتی ہے اس سے آنکھیں چراتے ہیں۔افسانے میں دادی جان کی خودداری کی شعاعیں بھی قاری کی نگاہوں تک آتی ہیں۔اس کردار کے معرفت افسانہ نگار یہ بات گوش گذار کرنا چاہتا ہے کہ انسانیت کے تقاضے کا لحاظ اور اس کی تعمیل ہی انسان کو حقیقی معنوں میں عزت دار بناتی ہے۔افسانے میں دادی کے کردار کے حوالے سے

ہمارے گھر کے بزرگوں کے اس کرب کو اجاگر کیا جا رہا ہے:

''اپنی آن کی خاطر جان جا رہی ہو تو کوئی اپنا قاتل آپ نہیں بنتا بلکہ بخوشی آن کو ٹھوکر مار دیتا ہے لیکن اپنی آن کی خاطر دوسروں کی جان جا رہی ہو تو شوق سے جائے۔ایسے معاملے میں اپنی آن پر آنچ آنے دینا کوئی گوارا نہیں کرتا۔رسم و رواج، روایات اور قدریں کیا گردش زمانہ کا شکار ہو گئیں؟ زمین بدل گئی کہ آسمان بدل گیا؟ خون بے وفا ہوا ہے یا جذبات فنا ہو گئے؟ کسے پتا کون بتائے؟''

افسانے کی پنچ لائین قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ کہیں ہم بھی تو اپنے گھر کی بوڑھی آنکھوں کے دو انمول قطروں کو جذب کرنے والی بنجر زمین تو نہیں بن گئے ہیں۔اس طرح یہ افسانہ عصری حسیت کو دامن میں سمیٹ کر موضوعاتی اعتبار سے عصری ترجمان ہونے کا دعوی کرتا ہے۔

افسانہ''تم''احسان قاسمی کا ایک مونو لاگ افسانہ ہے۔جس کی زبان و بیان پر مقامی اثرات در آئے ہیں۔گرچہ افسانہ رومانی ہے لیکن اس کے دامن میں پونجی وادی، سیاسی، مذہبی، اور فرقہ واریت اور کرونا سے نبرد آزما زندگی میں سرمایہ داروں کے داس بننے پر کف افسوس ملا جا رہا ہے جہاں انسان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ایسے میں راوی کو کارل مارکس کا داس کیپیٹل کی تھیوری بے کار لگ رہی ہے۔افسانے میں جاری سسٹم کے خلاف ایک عدم اعتماد کا اظہار ہوا ہے جہاں حقدار کو ان کا حق نہیں مل رہا ہے نیز پر تبھا کا سمان ان کو نہیں مل رہا ہے۔

شاکرانور کا افسانہ''ایک دوپہر''انسانی شک کی جبلت بہت نقصان دہ ہوتی ہے کے محور پر گھوم رہا ہے۔کرشن چندر کا افسانہ''پورے چاند رات''میں اسی جبلت کی وجہ سے محبت کا تاج محل کھنڈر میں تبدیل ہو جاتا ہے جبکہ وہاں رشتے بہت پاکیزہ تھے۔اس افسانے میں بھی ایسی ہی کچھ کیفیت ہے جہاں دو دوست علی اور زین کی کہانی قلم بند ہوئی ہے۔کہانی بس اتنی سی ہے کہ بازار جانے کے دوران علی کی بیوی شگفتہ کے ماتھے میں مائگرین کا درد اٹھتا ہے۔وہ سر پکڑ کر راستے میں علی کے دوست زین کے گھر چلی جاتی ہے۔زین کی بیوی کے ذہن میں شک کی ناگن پھنکارنے لگتی ہے۔ادھر ایک رات شگفتہ پیار کے نشے میں علی کی بانہوں میں لیٹے لیٹے اس زرد دوپہر کی روداد سناتی ہے۔اس کے بعد علی کے اندر کا جن باہر آتا ہے اور اس پر بدچلنی کا الزام لگا کر اسے طلاق دے کر سعودیہ سے کینڈا چلا جاتا ہے جہاں میرین اسے اس کے غلط رشتے ہموار ہو جاتے ہیں۔باپ جب بدچلنی کے ڈگر پر قدم رکھتا ہے تو بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے:

''جب باپ کے قدم ڈگمگا جائیں تو بچوں کو کون روک سکتا ہے۔ بیٹا' بیٹی دونوں ڈیٹس (Dates) پر جانے لگے۔ایک رات علی جب گھر آئے تو ان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔وہ سیدھا بستر پر جا کر لیٹ گئے۔میں بھی بے نیند سونے کی کوشش کرنے لگی کہ اچانک دوسرے کمرے میں کھٹکا سا ہوا، دل کسی

چمگادڑ کی طرح اندھیرے میں پھڑ پھڑایا۔سونی کے کمرے سے ایک سایہ باہر نکل رہا تھا۔ میں نے علی کو جگانے کی کوشش کی اس کے جسم کو چھوا، پھر ٹٹولا ہر کونے کو......میرے ہاتھ خالی کے خالی رہے۔اس کے جسم پر کسی دوسری عورت کی بہت ساری نشانیاں تھیں۔شاید میرینا کے، جو بعد میں اس کی داشتہ بن کر رہی۔اس کے بعد سے میں اس سے بہت دور، بہت دور ہوتی چلی گئی۔''

حالانکہ شگفتہ اور زین کے بچپن کی دوستی میں عزت واحترام کی خوشبو تھی۔شگفتہ کو بھی اس کا احساس تھا کہ زین کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اکیلے کمرے کی تنہائی میں سوئی ہوئی عورت کی حفاظت کرتے ہیں لیکن روح کی اس پاکیزگی کا احساس نہ علی کو تھا اور نہ ہی زین کی بیوی کو۔نتیجہ یہ ہوا کہ علی کو شراب اور شوگر نے مار دیا اور اپنے سارے خواب کے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں کی خوشیوں کو لے کر مر گیا۔علی کو موت کے دروازے تک لانے میں شگفتہ کی بددعائیں بھی ساتھ ساتھ رہیں۔کیونکہ شراب کے نشے میں اس کی ہوس کو ہر رات پورا کرنا اس کے لیے پہاڑ جیسے گناہ کے بوجھ تلے ہر رات مرنے کے مترادف تھا۔اس لیے علی کی موت کی دعا کرنے لگی لیکن اس کا قلق شگفتہ کو ہے۔

''کسی بھی عورت نے اپنے شوہر کی موت کے لیے دعا نہیں مانگی ہوگی۔ میں وہ بدقسمت ہوں۔''

افسانہ یہ بھی تاثر دیتا ہے کہ ظاہر ہمیشہ انسان کو دھوکے میں رکھتا ہے۔اندر جھانکو گے تو صرف کھوکھلا پن ملے گا۔افسانے سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ وطن کی مٹی کبھی نہ کبھی بلاتی ہے۔افسانے کا سب سے بڑا پیغام یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں بہت سنبھل کر رہنا چاہیے۔اس زندگی میں شک کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے کیونکہ زندگی کا یہ سفر بہت نازک ہوتا ہے۔یعنی لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام!

شہریار قاضی کا افسانہ ''مٹی کی چڑیاں'' مرد اساس معاشرے میں نسائی استحصال،ان کی بے بسی،ان کی محرومیت کی ایک گاتھا ہے جس میں رانو جب بیاہ کر اپنے سسرال آئی ہے جہاں اس کا شوہر شرفو صبح اٹھ کر کبوتروں کو کھڈے سے نکالتا، دانہ ڈالتا اور انھیں آسمان کی طرف اڑا دیتا اور پھر دن بھر آسمان کو تکتا رہتا ہے۔ایک ہفتہ گذر جانے کے بعد ایک دن اس نے رنگ اور ربر لاکر اپنی بیوی کو دیا۔رانو متعجب ہوکر اس کے بابت پوچھتی ہے۔تب وہ کہتا ہے۔

''ہاں تمہاری اماں نے، ابا کو بتایا تھا کہ تم مٹی کی چڑیاں بناتی ہو،جنہیں رنگ کر کے اور خوبصورت کر دیتی ہو۔'' رانو جواب دیتی ہے بات تو صحیح ہے لیکن اس کو بیچنے میری اماں جاتی تھی۔شرفو بڑی بے حیائی سے تحکمانہ انداز میں اس سے کہتا ہے۔

''نہیں گئی تو اب چلی جانا، چڑیاں ہی بیچنی ہیں نا کونسا ڈنگروں کا ویپار کرنے بھیج رہا تجھے،اب اٹھ جا۔جا کے مٹی کا انتجام کر۔''

بے بسی کے عالم میں رانو چڑیا بناتی ہے اور ٹوکری میں رکھ کر بیچنے نکل جاتی ہے۔ یہاں پر ایسا لگتا ہے جیسے رانو شرفو کی بیوی نہیں اس کی غلام ہے۔ یہاں کمزور طبقے میں نسائیت کی بے بسی کی تصویر صاف صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ جب آمدنی کم ہوتی ہے تو شرفو رانو کو چڑیاں فروخت کرنے کے گر بتاتا ہے لیکن بیوی کی کمائی کھانے والے اس نکمے کے پاس اتنا ظرف نہیں ہے کہ وہ خود جا کر چڑیاں فروخت کرے۔ رانو اس کے مشورے سے گھر گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔اب سماج کے ہاتھوں اس نسائیت کا استحصال کیسے ہوتا ہے۔اس کی منظر کشی شہر یار یوں کرتے ہیں:

''ایک گھر کا دروازہ تھوڑا سا کُھلا تھا جسے رانو نے اور کھول دیا اور بولنے لگی۔

''اے باجی چڑیاں لے لو چڑیاں، بچوں کے لیے رنگ برنگی چڑیاں۔''

کوئی جواب نہ آیا تو وہ گھر کے اندر چلی گئی۔اِتنی دیر میں بنیان پہنے آدمی کمرے سے باہر نکلا:

''ہاں کیا ہے؟''اس نے رانو کے بہت قریب آ کر کہا۔

''وہ چڑیاں......''پسینہ اس کی کنپٹی سے بہتا ہوا سانولی گردن پر بہنے لگا۔وہ جلدی سے دوپٹہ سنبھالتی دروازے کی طرف پلٹی تو آدمی نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا جس سے ٹوکری نیچے جا گری اور کئی ساری چڑیوں پر آٹا کفن کی مانند پھیل گیا۔''

نسائیت کی مظلومیت کا اس سے کریہہ منظر اور کیا ہوگا جہاں فرش پر بکھری مٹی کی چڑیوں کے درمیان رانو بھی مانند چڑیاں نوحہ کناں ہے۔ایسے میں اگر رانوں کے ذہن میں یہ سوال کوندتا ہے تو بے جا نہیں ہے۔

''کیا اُنھیں اِس لیے بنایا جاتا ہے؟''

یقیناً یہ افسانہ بے حس معاشرے میں عورتوں کی سماجی اور جنسی استحصال کو پیش کرتا ہے جس کے زبان و بیان میں صفائی وستھرائی ہے۔اس کے کینوس پر مقامی رنگ ہے لیکن شاداں اور رانو کے اندر مزاحمت کا مادہ نہیں ہے کہ وہ اپنے استحصال کی پر زور مخالفت کریں بلکہ حالات کے سامنے ایک طرح سے خودسپردگی ہے جیسے دونوں یہ مان کر چل رہی ہیں کہ مردوں کی محکومیت ان کا مقدر ہے، جس کے باعث یہ دونوں کردار تانیثی کردار بن کر ابھرنے سے قاصر رہ گئے ہیں۔افسانہ بڑی خاموشی کے ساتھ قاری سے یہ اپیل کرتا ہے کہ جیون چکر میں خواتین کے ساتھ یہ قصے کب تک دوہرائے جاتے رہیں گے؟

تنویر احمد تماپوری کا افسانہ''وکاس''سادہ بیانیہ اسلوب میں لکھا گیا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں منظر کشی خوب ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے تمام مناظر آنکھوں کے سامنے آ رہے اور جا رہے ہیں۔افسانہ عصری مسائل پر خاموشی سے بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔افسانے میں غربت کی لکیر مٹانے کے لیے جرائم پیشے کو اپنانا

ایک طرح سے انسان کی تنزلی کی طرف جانے کا اشاریہ ہے۔ابتداء میں گوپال کی غربت کے پیش نظر ہمدردی کی لہر اٹھی ہے لیکن اختتام پر نفرت تو نہیں بلکہ اس کی بے بسی پر رونا آیا ہے کہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے اس سادہ لوح انسان نے بھی عصر کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتا ہے جو خودغرض انسان کی اس جبلت کو اجاگر کرتا ہے کہ روٹی اور کوٹھی کے لیے سب کچھ جائز ہے۔لہذا افسانے کا مرکزی کردار آج بھی گورکن ہے فرق یہ ہے کہ کل تک میت کے لیے قبریں کھودتا رہا،اب انسانیت کی قبریں کھودرہا ہے۔

نشاط یاسمین خاں کا افسانہ''رامین اور وہ''اسلوب کے اعتبار سے سادہ بیانیہ ہے۔افسانے میں نسائیت کا جنسی استحصال موضوع بحث ہے۔بہرام صاحب کی بدکرداری کا بدلہ انہیں کی ہاتھوں کی ستائی ہوئی عورت کی روح لیتی ہے جو بہرام صاحب کی زیادتی کا شکار ہوکر خودکشی کرلی تھی لیکن افسانے کیا ختتام سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ایک ناری کی روح ناری کی عصمت کو بچانے کے لیے آرٹ گیلری میں شراب پھینک کر آگ لگادیتی ہے اور سب کچھ جل کر بھسم ہوجاتا ہے کیونکہ اس آرٹ گیلری کے مالک بہرام صاحب کے کرتوت کالے تھے:

''عورتوں کی برہنہ تصویریں بنا کر وہ عیاش امیروں کو بیچتے تھے اور انھوں نے یہ گیلری بھی اسی پیسے سے بنائی تھی۔''

افسانے کے کینوس پر اس کی اس فطرت کا شکار رامین بھی ہوتی ہے۔اسے جب نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنی بے لباسی کا احساس ہوتا ہے تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سامنے ایزل پر اس کی برہنہ تصویر تھی اور قریبی کاؤچ پر بہرام صاحب آڑے ترچھے پڑے تھے۔تپائی پر شراب کی بوتل اور آدھا بھرا گلاس رکھا تھا۔سگریٹ کے ٹکروں سے ایش ٹرے بھری ہوئی تھی۔کمرے میں سگریٹ اور شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی اور شرافت کے چولے میں بے غیرت بہرام شراب کے نشے میں اپنی کامیابی کا جشن منا رہا تھا کہ اچانک ایک عورت کا ہیولہ سامنے آتا ہے اور تپائی سے شراب کا گلاس اٹھا کر برہنہ تصویر پر پھینک کر پورٹریٹ کو آگ لگا دیتا ہے تاکہ رامین کے ساتھ اس کی کہانی دوہرائی نہ جائے۔اس افسانے کو پڑھ کر ایسا لگا جیسے کوئی من گھڑت کہانی ہے۔اگر افسانے میں ایزل کو نذر آتش رامین کرتی تو افسانہ مزید جاندار ہوجاتا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہورہا ہے کہ عورت اتنی کمزور ہے کہ مردوں کی حیوانیت سے ان کی حفاظت روحیں کررہیں ہیں۔افسانہ یہ بتانے کی کوشش کررہا ہے کہ عورتوں کا جنسی استحصال ہمارے سماج میں شرافت کا چولا پہن کر شرفا کررہے ہیں۔افسانے کی تکنیک میں ڈرامائیت زیادہ لگی۔کردار متحرک نظر آئے اور سسپینس بنا رہا۔

عشرت ظہیر کا افسانہ''درپردہ''یہ بتانے کی کوشش کررہا ہے کہ جب بچے والدین کی حقیقی محبت و شفقت سے محروم ہوجاتے ہیں تب وہ نفسیاتی بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔جب یہ بیماری اپنا بال و پر کھولنے لگتی

ہے تو اس کے بطن سے نفسیاتی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں اور جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے مریض دماغی خلل، ڈیپریشن کا شکار ہونے لگتا ہے اور جسمانی کمزوری دن بہ دن بڑھتی جاتی ہے جس سے بدن کی مزاحمتی قوت کم ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں وبائی مرض کا حملہ ہوتا ہے اور مریض آئی سی یو میں چلا جاتا ہے۔ افسانے کا دوسرا پہلو یہ کہ دو محبت کرنے والے کی لاپرواہی کا خمیازہ ان کی اولاد کو بھوگنا پڑتا ہے۔

''بسا اوقات انسان اپنی زندگی میں رونما ہونے والے غیر ارادی اور غیر متوقع واقعے کو کوئی معنی نہیں دے پاتا لیکن ایسے لمحے، دیر تک اور دور تک اپنی اثر انگیزی کے باعث چبھتے ہیں۔''

فائزہ دراصل ڈاکٹر وقار اور غزالہ کی بیٹی ہے لیکن افسانے میں اس جوڑے کے درمیان خط فاصل کیوں آیا اس کا اسرار کہیں نہیں کھلتا ہے۔ ادھر ماں کی مصروف زندگی اور باپ کی غیر موجودگی فائزہ کو نفسیاتی الجھن میں ڈالتی ہیں جس کے باعث وہ کبھی خواب میں روتی ہے تو کبھی اسے اپنے آیا کا چہرہ بے رونق لاش کی طرح دکھتا ہے جس پر زندگی کی کوئی رمق نہیں ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی ماں کی محبت خالص نہیں ہے۔ اس کے سامنے محبت کا معیار یہ ہے کہ محبت ہمدردی کی ملاوٹ اور دلجوئی کی کثافت سے بوجھل ہو جاتی ہے۔ اسے خالص رکھنے کے لیے بے غرض ہونا ضروری ہے۔ اختتام پر افسانے کا پیغام یہ ہے۔

''جس سے محبت کرو، اس کے آرام، اس کی سہولت کا خیال کرو، اسے ہر کلفت اور پریشانی سے بچائے رکھو۔''

ثمینہ سید کا افسانہ ''بندھن کا بوجھ'' سماجی افسانہ ہے جس میں انسانی نفسیات، تعلیم نسواں پر پرانے لوگوں کی دقیانوسی، اعلی اور درمیانی طبقے کی سوچ کے درمیان فرق اور وبا کے دوران اس کے بطن سے پنپے متعدد مسائل کا ذکر فن کے دائرے میں رہتے ہوئے کمال ہشیاری سے کیا گیا ہے۔ افسانہ الم ناک ہے اس معنوں میں کہ حبیب کی سرگوشی سے شفق کے اندر کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ سو بھید کھولتی زہریلی چپ کے درمیان اس کو احساس ہوا کہ وہ رشتوں کے بندھن کے بوجھ تلے دبی سسک رہی ہے۔ سسک کی ایسی آواز ہمارے معاشرے میں گھونجتی رہتی ہے لیکن بے حس لوگ اس آواز کو سننے سے محروم رہتے ہیں۔

اقبال مٹ (لاہور) کا افسانہ ''درد جب حد سے گذرتا ہے'' میں اظہار خیال پر جبر کے بڑھتے ہوئے شکنجے کو قاری کے سامنے اجاگر کرنے کی کوشش ہوئی ہے۔ درد، خوف، بے بسی، جبر، ذات کا بکھراؤ، داخلی کشمکش، ذات کا نوحہ کو علامتی اسلوب میں پیش کرنا جدید افسانوں کے خاصہ ہیں۔ مٹ صاحب نے ان ہی عناصر کو مذکورہ اسلوب میں اپنے افسانے کے کینوس پر پیش کرنے کی ادبی کوشش کی ہے جہاں علامتیں زیادہ گنجلک نہیں بلکہ شفاف ہیں۔ افسانے کا محور اس مرکزی خیال پر گردش کر رہا ہے کہ قلم جب جبر کی آگ میں تپتا ہے تو اس

کی نوک سے شعلے ابلنے لگتے ہیں۔ ایسا اس لیے کہ مزاحمتی قوت، جبر کی قوت کے براہ راست متناسب ہوتی ہے۔

سلیم سرفراز کا شمار معاصر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ موصوف کا افسانے ”خسارہ“ میں کفیل احمد اور ریحانہ کی رومانی زندگی کی روداد بیانیہ اسلوب میں رقم ہوئی ہے۔ افسانے کی رومانی فضا میں متعدد شعرا کے اشعار کی شمولیت افسانے کی فضا کو مزید رومانیت سے شرابور کرتی ہے جن کی بازگشت سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔ اس افسانے کے کینوس پر دو روحوں کا ملن جب روحانیت سے لبریز مزار شریف کے احاطے میں ہوتا ہے تو منظر بڑا دل گداز ہو جاتا ہے۔ روحانیت سے لبریز اس مقام کی منظر نگاری خوب ہوئی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے خود قاری مزار شریف کے احاطے میں کھڑا ہو کر سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ یہ منظر نگاری حرف حرف صحیح ہے کیونکہ خاکسار کو بھی رانی گنج کے اس مشہور مزار شریف پر کئی دفعہ حاضری دینے کا شرف حاصل ہے، جہاں کی فضا میں ایک پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔ افسانے میں روایتی طور پر دو ہنسوں کا جوڑا بچھڑ جاتا ہے اور مدتوں بعد ایک بار پھر دونوں کی ملاقات بس میں ہوتی ہے جہاں ریحانہ کفیل کو پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے جس سے یہ تائثر ابھرتا ہے کہ نسائیت بزدل مرد کو پسند نہیں کرتی ہے۔ کفیل برسر روزگار ہونے کے بعد ازدواجی زندگی کی تکرار اور بچوں کے شور کے دوران جب اس کی سماعتوں سے ماضی کی یہ خوش آہنگ آواز لہراتی ہے:

”موہے چاندی کی پائل منگا دو سجن۔“ تو وہ ایک عجیب درد و کرب میں ڈوب جاتا ہے اور وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے کہ: ”حیات نفع بخش رہی یا سراسر خسارے میں گزری؟“

زویا حسن کا افسانہ ”گم شدہ آوازوں کا تعاقب“ اسلوب خود کلامی بیانیہ ہے جس کے زیریں تہہ میں جو کرنٹ ہے اس کا اسپارک بڑا اشدید ہے۔ افسانہ بیوی اور شوہر کی کہانی ہے۔ یہ دونوں افسانے میں میں (شوہر) اور وہ (بیوی) کی صورت میں کینوس پر نمودار ہوتے ہیں۔ دونوں عمر کے آخری پڑاؤ میں ایک ہی چھت کے نیچے زندگی کی آخری سانس لے رہیں ہیں۔ وہ ٹی بی،، بلڈ پریشر، دل کے عارضے، بہرے پن اور بڑھاپے کی مریضہ ہے جبکہ میں (شوہر) اپنی کھوئی آوازوں کے تعاقب میں سرگرداں ہے کیونکہ اس کی آواز کئی عرصہ سے کہیں گم ہو گئی ہے۔ اسی لیے وہ اس تعاقب میں ہے کہ شاید کہیں سے اس کی آواز اس کو واپس مل جائے۔ افسانے میں شوہر میکانکی انداز میں اٹھ کر اپنی بیوی کا پیشاب سے بھرا بیڈ پین غسل خانے میں خالی کرتا ہے اور اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتا ہے۔

”تم بہت پیاری ہو قدسی۔ تمہارے گلابی ہونٹ میری کمزوری ہیں۔“

مگر وہ سنتی کب ہے؟ وہ مسلسل اپنے ایک گھٹنے میں مکے چلاتی چلی جاتی ہے۔ کبھی وہ دن تھے جب قدسی اس آواز پر ایمان لے آتی تھی اور اسی آواز پر ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنے کو تیار ہو گئی تھی۔ افسانے کا وہ ایک انقلابی تحریک کا صدر تھا اور اپنی پارٹی کے جلسوں میں اپنی آواز کے طلسم سے ثور پھونک دیتا تھا۔ مائیک پر پورے جوش وخروش سے اپنی آواز کا جادو جگاتا تھا اور لوگوں کے ایک جم غفیر کو اپنے نام کا ورد جپتے سنتا تھا لیکن اب اس کے ساتھ صرف

کمرے کی خاموشی ہے۔قدس کے رہتے ہوئے اسے تنہائی کا احساس ستاتا ہے۔افسانہ یہ درس دیتا ہے۔

’’کہی بات اور لکھا جملہ درست سامع اور قاری کے محتاج ہوتے ہیں میرے عزیز۔دانا شخص عام لوگوں میں بے وقوف اور مسخرہ کہلاتا ہے اور بے وقوف، دانا لوگوں میں قابل رحم سمجھا جاتا ہے۔لفظ کی حرمت میں یہ بھی ہے کہ اسے درست سامع کے کان میں انڈیلا جائے۔‘‘

افسانے میں الائچی کے کھیت میں گذرے دنوں کا ذکر روح کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔اس کے باطن میں آواز کی گمشدگی کا کرب ہے۔کمرے کی جزئیات نگاری بہت خوب ہے جہاں اس کی بیوی بلغم کھانستے کھانستے خون تھوکنے لگی ہے جس کے باعث کمرے میں درد کا نوحہ نکتہ راس پر ہے۔بہر حال آخری عمر میں زندگی کی کرب ناکی کو پیش کرتا یہ افسانہ اپنا ایک تاثر چھوڑنے میں کامیاب ہے لیکن افسانے میں شامل پنجابی اشعار سر کے اوپر سے گذر گئے۔

ڈاکٹر فاطمہ خاتون (کولکاتا) کا افسانہ ’’رنگ بدلتی زندگی‘‘ سادہ بیانیہ اسلوب میں لکھا گیا ہے جس میں عورت کی زندگی کے مختلف شیڈز کو ابھارا گیا ہے۔افسانے میں احتجاجوں کا شہر کلکتہ کو بلڈنگوں کا جنگل کہہ کر متعارف کرا کے جہاں اس کی تعمیراتی پیش قدمی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہیں اس کے دوسرے رخ کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ یہاں کے باشندوں کو قدرت کے خوبصورت مناظر دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس جاتی ہیں۔اس کمی کو افسانے کی پہلی راوی ٹرین کے سفر میں پوری کرتی ہے جو وشوا بھارتی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہے۔افسانے میں درمیانی طبقے کے طلبہ و طالبات کی نفسیات کو بھی پیش کیا گیا ہے کہ ان کے والدین ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کرتے جیسا کہ تعلیم یافتہ گھرانے کے گارجین اپنے بچوں کے ساتھ اپناتے ہیں۔افسانے میں اس کا بھی ذکر ہے کہ اس بناوٹی دنیا میں خالص معصومیت بڑی مشکل سے دیکھنے کو ملتی ہے۔افسانہ دراصل رادھیکا کی زندگی کے محور پر ہی گھوم رہا ہے جس کی زندگی بے بادباں کشتی کی طرح ہے۔جو تیرہ سال کی عمر میں اپنے ماسٹر جی اور والدین کی مرضی کے خلاف آنند کے ساتھ بھاگ کر شادی کرتی ہے۔قدرت ہر چیز کا انتقام لیتی ہے اس لیے اس کی بیٹی درگا کی زندگی میں بھی ایسا موڑ آتا ہے:

’’میری ماں درگا کے ساتھ رہتی ہے۔آج درگا چودہ سال کی ہے اور اسی سال اس کا میٹرک کا امتحان ہونے والا ہے۔لیکن مجھے بہت غصہ آتا ہے کہ جو غلطی میں نے کی وہی غلطی وہ بھی کر رہی ہے۔وہ بھی ایک لڑکے کے چکر میں ہے۔اور اس سے شادی کرنے کے لیے ضد کر رہی ہے۔میں اس کو کتنا سمجھاتی ہوں کہ پہلے پڑھائی پوری کرو لیکن وہ میری بات ماننے کو ہی تیار نہیں۔ڈر لگتا ہے کہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھالے۔میں ہر وقت اس پر نظر تو نہیں رکھ سکتی۔‘‘

رادھیکا کی زندگی مسائل کے چوراہے پر کھڑی ہے۔اس کے باوجود چہرے کی مسکراہٹ، اس کا

پر اعتماد لہجہ راوی کو جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ افسانہ کوئی بڑا بول یا فلسفہ نہیں پیش کر رہا ہے لیکن زندگی کی ایک سچائی کو بڑے خلوص کے ساتھ قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔

سید کامی شاہ کا ''افسانہ ہائے خواب'' ایک نفسیاتی افسانہ ہے جس کو پڑھ کر ایسا لگا جیسے کوئی میرے سامنے کھڑا ہے اور CommentaryRunning جاری ہے۔ افسانے میں منتشر ذہن کی روداد قلم بند کی گئی ہے۔ ایک آدمی میں شیطان اور رحمان دونوں کی موجودگی کا اعتراف افسانے میں کیا گیا ہے۔ یہ دونوں آپس میں برسر پیکار رہتے ہیں۔ جو غالب آتا ہے آدمی وہی دِکھتا ہے۔ اختتام پر لڑکی کو اس کی ماں لٹا دیتی ہے اور اس پر خنجر چل جاتا ہے۔ لہو کے چھینٹے راوی کے منہ پر پڑتے ہیں۔ اس دلخراش منظر سے دل دھک سے کرتا ہے۔ کوئی بھی فن پارہ قاری جمالیاتی آسودگی کے لیے پڑھتا ہے۔ جدید ذہن ایسے افسانے سے لذت کشید کرتا ہے۔

رفعت امان اللہ کا افسانہ ''جانِ امّاں'' جذبات سے لبریز ادبی فن پارہ ہے جس میں ماں اور بیٹے کے فطری جذبے کی خوب خوب عکاسی ہوئی ہے جس کے باعث افسانے میں جذباتیت کے عنصر کا تناسب کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ خصوصاً ماں کے جذبے کی عکاسی کرنے کے دوران افسانہ نگار کے قلم میں جذباتیت کچھ زیادہ سمٹ آئی ہے۔ افسانے میں سرحد کا قیدی بن جانے کا المیہ ماں کی زبان سے یوں ہوا ہے۔

''انسان ان ملکوں کی حدود میں قید ہو کے رہ گیا ہے۔ لیکن یہ روکیں تب تک ہیں جب تک سانس چل رہا ہے، سانس کی ڈوری ٹوٹتے ہی سب روکیں سب واسطے ختم۔''

اس فن پارے میں ماں کی طرف سے قاری کے لیے کچھ نصیحتیں بھی بہت قیمتی ہیں۔ خصوصاً یہ کہ مظلوم کی بدعا عرش ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ کسی کمزور کا دل کبھی نہ دکھانا، کسی ماتحت ملازم اور اپنی بیوی پہ بلاوجہ غصہ نہ کرنا اور ان کی خطاؤں کو درگذر کرنا وغیرہ۔ اس افسانے کو پڑھ کر منوررانا کا یہ شعر ذہن کے سائبان میں گونج اٹھتا ہے۔

اب اندھیرا مستقل رہتا ہے اس دہلیز پر　　جو ہماری منتظر رہتی تھی آنکھیں بجھ گئیں

صبیحہ تزئین کا افسانہ ''کنگن'' نئی نویلی دلہن کے نسائی جذبے اور نئی تہذیب کے پروردہ نوجوانوں کی بے راہ روی اور اس کے بدانجام پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر نسائی جذبے کی عدم برداشت کا بے باکی کے ساتھ مظاہرہ عصمت چغتائی کی یاد دلاتا ہے۔ اسلوب سادہ بیانیہ ہے۔

دلشاد نسیم کا افسانہ ''اندھیرے میں'' دکھ کی ایک ایسی گاتھا ہے جہاں محبت کرنے والے دو ہنسوں کا جوڑا سسک سسک کر ایک کرب ناک زندگی جی رہا ہے۔ افسانے میں غربت کی جو روداد رقم ہوئی ہے، بہت کرب انگیز ہے۔ کینوس پر آغاز سے درمیانی حصے تک سبین کے لیے قاری کے دل میں نفرت کی چنگاری پھوٹ رہی تھی لیکن اچانک افسانہ ٹوئسٹ لیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سبین سے نفرت ہمدردی میں بدل جاتی ہے اور

اس کا قد اونچا دکھائی دینے لگتا ہے کیونکہ اس نے جو بھی کیا وہ ایک وفا شعار بیوی اور محبوبہ بن کر کیا۔ اپنی محبت اور ازدواجی زندگی کی لاج اپنی عصمت کو داؤ پر لگا کر بچائی۔ یقیناً سبین کا محبوبہ سے بیوی اور پھر کال گرل بن جانا اس کی محبت کے ارتقائی پہلو ہیں لیکن یہ بھی واضح رہے کہ سبین اور احسان جس زندگی کو جھیل رہے ہیں وہ والدین کی بددعائیں ہیں جو ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہیں۔ افسانے میں چند مکالمے جاندار ہیں۔

''تم بغیر محبت کے کیسے اپنا آپ کسی غیر کو سونپ دیتی ہو۔''

''بات تو واقعی یہ اور ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ معاشرے نے ہی مجھے باہر نکلنے پر مجبور کیا ہے تو......؟''

''سلمان صاحب! ہم اس دو گھنٹے کی ملاقات کو اپنے اپنے مقصد کی حد تک رکھیں تو بہتر ہوگا۔''

''نہ یہ لڑکیاں تھیں نہ عورتیں...... یہ سب گالیاں ہیں...... مجھ سمیت۔''

یہ سوال کرتی ہیں۔

''جی امی...... کیونکہ اب گھر میں میری جوانی کے علاوہ بیچنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔''

''بات پیٹ کی دوزخ تک پہنچے تو حرام حلال ایک ہو جاتے ہیں۔''

افسانے میں روایت کے پاسدار والدین کی سخت مزاجی، ذات پات اور برادری کی بو بھی آتی ہے۔ اس میں درد کے آنسوں کا جو سیلاب آتا ہے اس میں قاری بھی بہہ جاتا ہے۔ مکالمے میں برجستگی، زبان و بیان میں روانی اور اسلوب سادہ بیانیہ ہے لیکن ایک دو جگہ ڈرامائی انداز سے بھی واسطہ پڑا۔

ذکیہ مشہدی کا شمار عصری منظر نامے پر معتبر افسانہ نگاروں کی صف میں ہوتا ہے۔ افسانہ ''کووڈ کے ماتم دار'' میں ایک غریب جوڑے کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کی غربت کی ریکھا لاک ڈاؤن کی وجہ سے مزید لمبی ہوگئی ہے۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے مالی تنگی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اسے بیٹی کا کھلونا بہلا بکری کو بھی فروخت کرنا پڑتا ہے۔ اس کی معصوم بیٹی جاتی بکری کو دیکھ کر چیخنے لگتی ہے۔ اس وقت پھول سنگھ غصہ سے لال ہو کر بیٹی کو پٹخ دیتا ہے۔ افسانے میں مقامی زبان کا استعمال اس کو حقیقت سے بہت قریب کرتا ہے۔ افسانے میں سونا ایک پتی ورتا ناری کے روپ میں دکھائی دے رہی ہے۔ دونوں کی نوک جھونک دلچسپ ہے۔ عورت کی کم عقلی اور بیٹی جننے کا طعنہ مرد اس معاشرے کی پول کھول رہا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

H.No:1/A, BL No:23,
Kela Bagan Po:Jagatdal
Dist:North 24 Parganas(W.B.)
PIN:743125
Mob::9339327323.

● ادارہ

افسانوی نشست پر تاثرات

(۱)

ایک عمدہ ایونٹ اختتام کو پہنچا۔ مبصرین، قارئین اور تخلیق کاروں کی بھرپور دلچسپی نے ایونٹ کو یادگار بنا دیا۔ افسانہ نگاروں نے انسانی رویوں کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی، جذبات و تاثرات کے مختلف گوشے ابھارے اور کرداروں کی نئی جھلکیاں دکھائیں۔ ان افسانہ نگاروں نے خواہ تسلیم شدہ اجزائے افسانہ کے در و بست سے ابلاغ و ترسیل کا جادو جگایا ہو، کسی ایک جزو پر زیادہ توجہ دی ہو یا ابہام، علامت اور تجرید کے پردوں میں اپنی بات کہی ہو اس سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر افسانہ نگار نے افسانے کی متشکلہ صورت میں اظہار کیا ہے اور اپنے مزاج و ماحول کے اعتبار سے اپنی ذہنی رو کی ترجمانی کی ہے۔ مبصرین نے اپنا کردار بخوبی نبھایا۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ تبصروں کو پڑھ کر ایسا لگا جیسے کہانی کو مختصراً بیان کر دیا گیا ہو۔ مبصرین کا کام ان کیفیات کو دہرا دینا نہیں جو ادیب پر تخلیق کے وقت گزرتی ہیں بلکہ تخلیق کے متعلق فیصلہ ک±ن رائے دینا ہے۔ اس ضمن میں جناب ارشد عبدالحمید کے تبصروں کی مثال دی جا سکتی ہے جن میں عالمانہ اور حکیمانہ ہمہ گیری اور تخلیق کے عیوب و محاسن پر گفتگو ہوتی ہے۔ وہ تخلیق کو فن کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور تنقید کے اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں۔ ان کے تبصروں سے مجھ جیسے نو آموز کو بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ ان کے علاوہ بھی ایونٹ میں اچھے تجزیہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے جن کا نام اس ڈر سے نہیں لے رہا کہ کوئی نام رہ نہ جائے اور مجھے خفت اٹھانی پڑے۔ ایونٹ کی کامیابی تمام شرکاء کی مرہون منت ہے لیکن سب سے اہم کردار جناب اقبال حسن آزاد کا رہا۔ انہیں One Man Army کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ایونٹ میں پیش کیے جانے والے افسانوں کا انتخاب، وقت مقررہ پر افسانہ لگانا، تمام ممبرز کو ٹیگ یا مینشن کرنا، ہر تبصرے کو پڑھنا اور بیشتر تبصروں پر اپنی رائے دینا، بہت سی باتوں کو برداشت کرنا، نظم و ضبط قائم رکھنا اور ایونٹ کو خیر و خوبی سے منطقی انجام تک پہنچانا ان کی کارکردگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کی کاوشوں کو میرا سلام عقیدت ہے۔ ایونٹ کی کامیابی کا ذکر ادھورا رہ جائے گا اگر نعیم یاد صاحب کی تخلیقی صلاحیتوں کی تعریف نہ کی جائے۔ ان کے بنائے گئے بینرز گہری معنویت کے حامل ہوتے ہیں۔ تمام متعلقین کو ایونٹ کی کامیابی کی مبارکباد۔

حسن امام

◄◄ ● ►►

(۲)

آنکھوں میں بس گئی تری محفلوں کی دھوپ

اردو افسانوی نشست ۲۰۲۱ء، تخلیق کاروں، افسانوی ادب کے شیدائیوں، اور ادب نوازوں کے اذہان وقلوب پر انوکھے اور تنوع آمیز انداز پیش کش کے نہ مٹنے والے نقوش مرتسم کر کے بالآخر اختتام پذیر ہوا۔

جس منظّم طریقے سے اور سلیقہ و ہنرمندی کے ساتھ یہ ایونٹ شروع کیا گیا، اور اسے پر شوکت طور پر کامرانی و کامرانی کے ساتھ اختتام کے مرحلے تک پہنچایا گیا، اس کی مثال آن لائن تو کیا آف لائن بھی کہیں نہیں۔

نشست کے صدر ممتاز و مقبول فکشن نگار حسین الحق تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بطور مہمان ذی وقار نعیم بیگ (لاہور) مہمان خصوصی مشتاق احمد نوری، مہمان اعزازی شبیر احمد اور خصوصی مبصر ارشد عبدالحمید کے علاوہ کئی اور بھی مبصرین نامزد کیے گئے تھے۔ افسانوں کو دلکش مصوری سے سجانے میں نعیم یاد کی فعالیت اس ایونٹ کا اہم حصہ رہی۔

افسانوں کی پیش کش سے قبل افسانے کے فن سے متعلق مختلف زاویہ نگاہ سے کئی قابل قدر اور راہنما آرٹیکل کی پیش کش، اپنے آپ میں انوکھا، منفرد اور جاذبیت کا متحمل طریقہ کار رہا۔ جس نے نہ صرف اس نشست کو باوقار بنایا بلکہ اسے ثروت مندی بھی عطا کی۔

افسانوی نشست ۲۰۲۱ء کے تحت فیس بک کے ذریعے نمودار ہونے والے افسانوں کے سلسلوں نے سامعین کو کئی لحاظ سے انگشت بدنداں کیا۔ ان افسانوں نے اپنی تعداد کے اعتبار سے ادبی نشست کی ایک نئی، سنہری اور یادگار تاریخ رقم کی ہے۔ افسانے کے مختلف النوع موضوعات، زندگی کی تہہ در تہہ کیفیتوں اور پیچیدگیوں کے غماز اور انداز فکر کے نادر سلسلے کی صورت بہترین نمونے تھے۔ اسلوب اور طرز اظہار کی ندرت، انسانی ذہن کی اڑان کے نشان اور ذکاوت و ذہانت کے امین کی صورت اجاگر ہوئی۔

مجموعی طور پر یہ افسانے اچھے بھی تھے اور بہت اچھے بھی۔ اور ان افسانوں پر تبصروں تجزیوں کی برسات، معاذ اللہ!

ایسا اہتمام وانصرام پہلے نہ کبھی دیکھا نہ سنا یہ طریقہ کار اگر نشان راہ بن سکا تو یہ مسحور کن کارنامہ ''ثالث'' کے نام ادبی تاریخ میں محفوظ رہے گا۔ تبصروں کے سلسلے کی صورت حال فکر انگیز بھی تھی اور دلچسپ بھی دراصل اکثر مبصرین اگلے تبصروں کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کرتے رہے، ایسے میں کسی افسانے کے حصے میں توصیف وتعریف آئی تو کسی افسانے کا گویا قتل ہو گیا۔

ایسے موقعے پر جناب صدر نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے تبصروں کی مثبت رہنمائی کی اور اسے بے سمتی سے محفوظ کیا ہاں اس کا احساس رہا کہ ''اپوائنٹیڈ'' مبصرین نے تساہلی سے کام لیا

جبکہ ’’حاشیائی مبصرین‘‘ خاصے فعال رہے۔

اس نشست میں شامل افسانہ نگار حضرات، محترم مبصرین اور گیلری میں بیٹھ کر تالی بجانے والے (یعنی جنھوں نے محض لائک کرنے پر اکتفا کیا) کو اس ایونٹ کی شادکامی اور انبساط کی حصولیابی بہت مبارک اقبا حسن آزاد کی ہنگامہ خیز شادکامی انہیں بہت مبارک۔ عشرت ظہیر

◀◀ ● ▶▶

(۳)

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد ضد کے پکے ہیں نہ کسی کی سنتے ہیں نہ ہی کسی کی پرواہ کرتے ہیں۔ثالث تن تنہا نکال رہے ہیں۔سارا کام خود کرتے ہیں تسلی اور تشفی کے بعد ہی رسالہ پریس جاتا ہے۔

ایک باران کے من میں کیا سمایا کہ ثالث افسانوی نشست کا آغاز کر دیا۔اس کے لیے کئی اڈمنز کی ضرورت کچھ صلاح کار بھی چاہئے۔افسانے پسند کرنے کی ٹیم چاہئے اور بھی احباب ضروری ہوتے ہیں لیکن آزاد بندے کو جو سوجھ گئی سو سوجھ گئی۔نہ آئے دیکھا نہ تائے افسانوی نشست کا آغاز کر دیا۔حیرت بھری خوشی تب ہوئی جب انہوں نے افسانے پیش کرنے شروع کر دئے۔یہ نشست امید سے زیادہ کامیاب رہی پھر یہ ضد پال بیٹھے کہ ان افسانوں کا نمبر شائع کرونگا۔مجھے یقین ہے کہ اقبال بھائی ایک شاندار نمبر ضرور پیش کرینگے۔ ہم لوگ اردو کے قاری ہیں لیکن اقبال اردو کے مجاہد ہیں جس لگن اور جانفشانی سے وہ ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔سچی بات بتائیں یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں۔مشتاق احمد نوری

◀◀ ● ▶▶

(۴)

یہ بہت شاندار افسانوی نشست رہی۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ خاص طور پر درویش صاحب اور فارحہ صاحبہ کے تبصروں سے بہت سی نئی چیزیں سیکھنے کو ملیں۔

ایک عمدہ اور معیاری ایونٹ کے لیے بہت مبارک باد۔ شعیب افضل

◀◀ ● ▶▶

(۵)

ماشاءاللہ، زبردست قدم، ایک بہترین نشست رہی۔ بہت اچھے افسانے پڑھنے کو ملے۔آپ نے تن تنہا ایک بہترین منتظم کی حیثیت سے فورم پر اس نشست کو عمدگی سے چلایا۔آپ کو مبارکباد اور داد۔محمد ریاست

◀◀ ● ▶▶

(۶)

ایک عمدہ ادبی نشست جس سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ بہت شکریہ۔ ہاجرہ عمران خاں

◄● ►

(۷)

اچھا ایونٹ رہا اچھے افسانے پڑھنے کو ملے بہت مبارک باد۔ نشاط یاسمین خاں

◄● ►

(۸)

حاضر جناب، شاندار افسانوی نشست۔ اساتذہ، نقاد، تبصرہ نگار، قاری، سب اس نشست محظوظ ہوئی۔ ایونٹ کے درمیان کوئی بدمزگی نہیں ہوئی اور تبصرہ نگاروں نے ہر افسانے کا گہرائی میں جا کر تجزیہ کیا۔ اساتذہ کی تنقید اور اصلاح سے یقیناً سب نے بہت کچھ سیکھا۔ ماحول مجموعی طور پر ''دوستانہ'' اور خوشگوار رہا۔ اقبال حسن آزاد صاحب کو اس کامیاب ایونٹ کے لئے مبارکباد۔ فرحین جمال

(۹)

ماشاءاللہ بہت خوبصورت اور کامیاب نشست رہی بہت اچھا لگا فرصت کے اوقات اس کے لئے وقف ہیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ ڈاکٹر خالدہ ناز

◄● ►

(۱۰)

شاندار مزے کا طویل دورانیے کا افسانوی جہان خوب آباد رہا۔ دوستوں نے پورے اعتماد کے ساتھ افسانے پیش کیے مدید دوستوں نے بغیر لگی لپٹی جو فکر و فن میں اچھائی کمی بیشی تھی دل کھول کر بیان کر دی...... میں جو فکشن کو اپنے لئے زندگی موت سمجھتا ہوں میرے لئے یہ ایونٹ بہت اہمیت کا حامل تھا، جہاں جہاں پسند آیا کی کمنٹ بنتا ہے تو اپنے آپ کو بلاوجہ روکا بھی نہیں ہے...... تقریباً اسی فیصد افسانے ایسے ہیں جن کو واقعہ نگاری کہنا چاہیے یعنی جن میں فکشن بہت کم کم پایا گئے بعض بہت نادر افسانے بھی پیش ہوئے جن میں اسلوب کی سطح پر تجربے بھی کیے گئے......سب سے زیادہ محنت و اخلاص جس شخص کا سامنے آیا وہ اقبال حسین آزاد ہیں۔ صلاح الدین درویش

◄● ►

(۱۱)

اس کامیاب اور میچور افسانوی نشست پر آپ اور تمام منتظمین مبارکباد کے مستحق ہیں۔منیر احمد فردوس

◀◀ ● ▶▶

(۱۲)

ایک خوبصورت سلسلہ تمام ہوا۔ حریم فاطمہ

◀◀ ● ▶▶

(۱۳)

بے حد خوبصورت ایونٹس کی لیے۔ بہت ساری مبارکباد۔ شاکر احمد

◀◀ ● ▶▶

(۱۴)

کامیاب افسانوی نشست پر اقبال حسن آزاد صاحب کو بہت مبارکباد۔سید صداقت حسین

◀◀ ● ▶▶

(۱۵)

اس اوینٹ میں افسانوں کو پڑھنا اور تبصرہ کرنا دماغ کو کھول دینے والا ثابت ہوا۔بہت سے انجانے احساسات کو لفظ ملے اور تاثرات شعور سے نکل کر باہر سامنے آن کھڑے ہوئے۔سبھی افسانہ نگاروں اور مبصرین کو اوینٹ میں شرکت کے لئے مبارک باد۔آنے والے تخلیقی عمل کے لئے نیک خواہشات۔رویندر اجو گلیکر

◀◀ ● ▶▶

(۱۶)

ایک بہترین ایونٹ کے کامیاب اختتام پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔تمام شرکاء کے لیے۔نیک خواہشات۔نعیم یاد صاحب کے لیے خصوصی داد۔ محمد شاہد اقبال

◀◀ ● ▶▶

(۱۷)

بہت اچھا ایونٹ رہا۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔امید ہے آئندہ بھی ایسی افسانہ نشستیں ہوتی رہیں گی۔اقبال حسن آزاد صاحب نے جس طرح تنہا اتنے بڑے ایونٹ کا انتظام کامیابی سے سنبھالا وہ قابل تعریف ہے۔بہت بہت مبارکباد۔ فارحہ ارشد

(۱۸)

بہت زیادہ تو نہیں وقت دے پائی مگر جب بھی فیس بک آن کی تو واحد اسی ایونٹ کے افسانے پڑھنے کے لیے آن کی اور جہاں تک ہو سکا ادنی رائے دی...... کچھ افسانے پڑھے مگر چاہتے ہوئے بھی مصروفیت کی بنا پر رائے قائم نہیں کر پائی۔

مختصراً یہ کہ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اتنا عمدہ ایونٹ منعقد کروایا......ہم جیسے لوگ جنہیں پڑھنے کا شوق ہوا ن پر آپ جیسے ادباء منتظمین کا یہ احسان ہی ہے۔ سلامت رہیے۔ اسماء حسن

◄◄ ● ►►

(۱۹)

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یہ لازوال شعر ہر اس موقعے پر یاد آتا ہے جب کوئی پر عزم اور باحوصلہ شخص کسی مشکل مہم کو سر کرنے نکلتا ہے اور لوگ اس کی ہمت اور حوصلے کی داد دیتے ہوئے اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ جناب اقبال حسن آزاد کے عزم واستقلال کو کسی سند کی ضرورت نہیں۔ برسوں سے تن تنہا ''ثالث'' جیسا معتبر وموقر رسالہ مسلسل شائع کر کے وہ ثابت کر چکے ہیں کہ زمانہ کبھی جنوں پسندوں سے خالی نہیں رہا۔

اس باوقار ایونٹ کی بے مثال کامیابی سے آشکار ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے مدیر کے ساتھ ایک باصلاحیت اور مستقل مزاج منتظم بھی ہیں۔ پورے عالم سے اردو ادب کی نابغۂ روزگار شخصیات کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر لینا اور ایونٹ کو یادگار بنا دینا آسان کام نہیں۔ یہ ان کی مقناطیسی شخصیت کا سحر ہے کہ بیشتر معتبر ومستند قلم کار جانب بزم کھنچے چلے آئے۔ اس ایونٹ کی بے پناہ کامیابی میں مشاق مصور جناب نعیم یاد کے یوگدان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے بنائے ہوئے خوبصورت اور معنی خیز بینرز نے اس بزم کی رونق میں چار چاند لگا دیئے۔ ساتھ ہی ان فاضل مبصرین کا کاز بھی کم اہمیت کا حامل نہیں رہا جنہوں نے اپنی انتہائی مصروفیت کے باوجود پیش کردہ افسانوں پر علمی وتنقیدی گفتگو کی اور ادباء وقارئین کی بھرپور رہنمائی فرمائی۔ خصوصاً جناب حسین الحق، جناب ارشد عبدالحمید، جناب نعیم بیگ، جناب اقبال مٹ، جناب مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر ریاض توحیدی، جناب صلاح الدین درویش، جناب شاہد جمیل، جناب حسن امام، جناب جی حسین، جناب قیصر نذیر خاور، جناب رفیع حیدر انجم، جناب محمد شاہد محمود، جناب مکرم نیاز، جناب اکرم نقاش، جناب سید کامی شاہ، جناب بش احمد، جناب محمد جاوید انور، جناب اکبر شیخ اکبر، جناب راجہ یوسف، جناب ریحان کوثر، جناب ناصر صدیقی، جناب شفقت محمود، جناب نصرت بخاری، جناب شبیر احمد، جناب

رویندر جوگلیکر، جناب عبدالشکور جاذب، جناب سید صداقت حسین، جناب احسان قاسمی، جناب عظیم اللہ ہاشمی، محترمہ کوثر جمال، محترمہ فارحہ ارشد، محترمہ اسما حسن، محترمہ فریدہ انصاری، محترمہ ہما فلک، محترمہ افشاں ملک، محترمہ ثمینہ سید، محترمہ دلشاد نسیم، محترمہ فرحین جمال، محترمہ فریدہ تبسم، محترمہ سیدہ آیت گیلانی، محترمہ سارہ احمد، ڈاکٹر صوفیہ شیریں وغیرہ کے گراں قدر تبصروں نے محفل افسانہ کو یادگار روشاندار بنانے میں نمایاں اور مخلصانہ کردار ادا کیا جس کے لیے منتظم بزم کے ساتھ ہم قارئین بھی متشکر ہیں۔

اللہ کرے کہ آئندہ بھی ایسی بزم سجائی جاتی رہے۔ آمین سلیم سرفراز

◀◀ ● ▶▶

(۲۰)

یہ بڑا مشکل کام تھا۔ مجھے اس کا تجربہ ہے اس لئے اندازہ بھی ہے اور قدر بھی۔ آپ نے اچھے طریق سے یہ کارنامہ سرانجام دے لیا۔ مبارک ہو۔ محمد جاوید انور

◀◀ ● ▶▶

(۲۱)

ماشااللہ بہت عمدہ ایونٹ۔ کامیاب ایونٹ پر محترم اقبال حسن ازاد صاحب کو داد و تحسین۔ یہ شعر

مقام ہمسفروں سے ہو اس قدر اگے کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو

کسی بھی کام کو کامیاب بنانے کے لئے انتھک محنت ولگن درکار ہوتی ہے۔ محترم اقبال حسن ازاد صاحب کی ایک انسان کی اکیلے محنت بہترین کاوش سارے ایونٹ کو سنبھال کر نیشل اور انٹرنیشنل تخلیق کاروں کو نہ صرف مدعو کیا بلکہ ان کی تخلیقات کا مطالعہ کر انہیں شامل فرمایا پھر کچھ افراد کی مخالفت کو بھی بہ حسن خوبی پورے خلوص کے ساتھ نبھایا۔ اور سب سے اہم کام ہر دن تبصرہ پڑھ کر پوری توجہ دے کر مبصرین کی فرداً فرداً حوصلہ افزائی فرمائی۔

آپ کی محبت اور محنت کو سلام۔

بہت حوصلہ اور صبر آزما کام تھا مگر آپ نے بہ حسن خوبی احسن طریقے سے ذمہ داری نبھائی۔ اس ایونٹ میں قدم قدم پر سیکھنے کے پورے مواقع فراہم رہے۔ مختلف موضوعات پر مختلف النوع خیالات نظریات جذبات واحساسات کے اظہار نے اس پلیٹ فارم کو بہترین تجربہ گاہ بنا دیا اس ایونٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی کہ بلاتخصیص سینئیر اور جونیئر تخلیق کار اور مبصرین و تجزیہ نگار کو ان کی بہترین کاوش کو سراہا گیا حوصلہ افزائی ملتی رہی۔ سبھی کے ساتھ انصاف ہوا۔ یہ عمدہ کوشش رہی۔ بلکہ وقفہ وقفہ سے کئی سوالات کے ذریعے سب کے سوئے ہوئے قلب و ذہن کو بیدار کر کے متحرک و فعال کرتے رہے اور ایک دوسرے سے سیکھنے کے مواقع فراہم

کئے۔ان سب تجربات نے واقعی اس ایونٹ کو نہ صرف کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کیا بلکہ اسے معیار کی بلندی تک پہنچادیا۔اس اہم کاوش اردو زبان کی ترویج وترقی کے لئے محترم اقبال حسن ازادصاحب کی خدمت عالیہ میں ہدیہ تبریک وتحسین پیش کرتے ہیں۔محترم نعیم یادصاحب نے شب وروز محنت کرکے بہت عمدہ بیانر بنا کراس ایونٹ کورنگ ورعنائی بخشی۔لائق تحسین ہے۔قابل قدر مبصرین نے متن کی بہترین تفہیم وتوضیح اور تبصرے کئے جنھیں ''عمدہ اور تفصیلی تبصرہ'' کی داد ملی ہماری نظر میں وہ واقعی قابل داد وتحسین ہیں۔مبارک باد

ہم ثالث کے منتظمین کے بے حد سپاس گزار ہیں کہ ہماری تخلیق ادنی کاوش کواس ایونٹ میں نہ صرف شامل فرمایا بلکہ اشاعت کی منتخب فہرست میں بھی شامل کر یہ موقع عنایت فرما کرعزت افزائی فرمائی۔

مخصوص مبصرین کی فہرست میں ناچیز طالبہ کوسیکھنے کا موقع عنایت فرمایادل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔اور امید کرتے ہیں اسی طرح مزید ایونٹ ہوتے رہیں گے اور ہمیں سیکھنے کے مواقع فراہم ہوتے رہیں گے۔اللہ آپ کوشادوآبادرکھے آمین۔ایک اور باراس کامیاب ایونٹ پر ہم بہت مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹرفریدہ بیگم

◄◄ ● ►►

(۲۲)

ماشااللہ۔بہت ہی عمدہ اور تاریخی کام۔محترم میری ادنی کاوش کواپنے شمارے کی زینت بنانے کے لیے میں دل سے ممنوں ہوں۔آپ کی یہ محنت اس لیے بھی قابل ستائش اور قابل تقلید ہے کہ آپ نے تن تنہا ایونٹ کی کاروائی بحسن وخوبی اختتام تک پہنچائی۔اس مصروف زندگی میں آپ کی یہ محنت،ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ایونٹ کی کامیاب اختتام پر دل سے مبارکباد ثالث کے اگلے شمارے کے لیے نیک خواہشات۔عائشہ فرح

◄◄ ● ►►

(۲۳)

ماشااللہ،جس خوبی اور کامیابی سے ایونٹ اختتام پزیر ہوا ہے بیشک لائق ستائش ہے۔ساتھ ہی رسالہ کی اشاعت کے لیے پیشگی مبارک باد۔ صبیحہ تزئین

◄◄ ● ►►

(۲۴)

ماشاءاللہ کامیاب ایوینٹ کے انعقاد پر اقبال حسن آزادصاحب کومبارکباد۔ ریحان کوثر

◄◄ ● ►►

(۲۵)

گئے دن بہار کے...... بہت شاندار اور کامیاب نشست ...... بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا......اس نیک تمنا کے ساتھ الوداع کہ پھر آئے ایسے دن بہار کے۔ عظیم اللہ ہاشمی

◄ ● ►

(۲۶)

بہت اچھا ایونٹ رہا۔ کچھ افسانے پڑھے اور کچھ لائک کر کے سیئو کر لیے ہیں۔ وقت ملتے ہی پڑھ کر یک سطری رائے تو دے ہی دوں گی۔ آپ کی ہمت کو داد کہ اتنا بڑا ایونٹ بنا کسی بڑی بدمزگی کے چلایا اور وہ بھی احسن طریقے سے کسی بڑے رولے کی توقع تھی لیکن امید بر نہ آئی کچھ افسانے جو پڑھے وہ بہترین تھے کچھ بہتر اور کچھ نصف بہتر لگے۔ گل ارباب

(۲۷)

ایک ایونٹ کو چلانا وہ بھی تن تنہا۔ آپ کے جذبے اور لگن کو سلام۔ مصروفیات کی وجہ کر کچھ افسانے رہ گئے ہیں انہیں بھی پڑھ لوں گی۔ کسی بھی افسانہ نگار کے تمام افسانے شاہ کار نہیں ہوتے اسی طرح ایونٹ کے کچھ افسانے ٹھیک کچھ اچھے اور کچھ بہترین ہیں۔ میری خوش نصیبی کہ چند عمدہ افسانے پڑھنے کا موقع ملا اور چند اچھے دوست بھی ملے۔ آپ کا تہہ دل سے شکریہ۔ ڈاکٹر صوفیہ شیریں

◄ ● ►

(۲۸)

شاندار ایوینٹ رہا۔ ایونٹ کی کامیابی کے لئے مبارکباد جس طرح آپ نے اس ایونٹ کو پایا تکمیل تک پہنچایا یہ آپ کا ہی کام ہے آپ کی عظمت کو سلام۔ شفا کنول ناز

◄ ● ►

(۲۹)

آپ نے تنہا ایک بہترین اور یادگار ایونٹ کا انعقاد کیا جو آسان نہیں۔ ہر قسم کے افسانے پڑھنے ملے اچھے، برے، بہت اچھے، بہترین۔ بہت کچھ نیا سیکھا اور ذہین نیشن کیا۔ تہہ دل سے شکریہ آپ کا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے۔ آمین

جو افسانے رہ گئے ہیں وہ بھی ان شاء اللہ جلد پڑھوں گی۔ آسیہ رئیس خاں

◄ ● ►

(۳۰)

اردو افسانے کا یادگار ایونٹ کروانے پر مبارک باد۔اردو برصغیر کی مشترکہ زبان ہے۔آپ کی ہمت و حوصلے کو سلام۔میں سمجھ سکتی ہوں کہ دنیا کے کونے کونے سے افسانہ نگاروں کے مختلف نفسیاتی مسائل کو ساتھ لے کر چلنا کتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ مریم تسلیم کیانی

◀◀ ● ▶▶

(۳۱)

ایک بہترین ایونٹ مکمل کرلیا یہ بہت بڑی کامیابی ہے. مبارکباد جناب۔ ثمینہ سید

◀◀ ● ▶▶

(۳۲)

دوستو! سہ ماہی ثالث کا افسانہ میلہ, اکا دکا بدمزگی کے سوا, بہترین گزر گیا۔ میں نے جناب اقبال حسن آزاد کو ہمیشہ ایک کرخت مزاج اور خشک طبع انسان سمجھا۔ان کے افسانے پڑھ کر ہمیشہ ایک اور ہی شخصیت کا من موجی سی شخصیت کا تاثر بنتا رہا۔

لیکن یہ افسانہ میلہ ہی ہے جس کے توسط سے ان کی شخصیت کے متعلق میرا نظریہ بدلا۔آپ محبت و حلم کا بہتا دریا ہیں۔آپ نے میرے ساتھ کم کم انباکس چیٹ کی۔لیکن ہر بار ہر جملے سے ایک دانائی اور محبت کی وائبز مجھ تک پہنچیں۔ان کی تحکمانہ تحریک کی بدولت ہی مجھ سے ''اتلافِ عظیم'' جیسا افسانہ تخلیق ہوا۔آپ کی شخصیت کا ہی اثر تھا کہ میں ایونٹ کو بیچ راہ چھوڑ کر واپس آ گیا۔لہذا میں اس ایونٹ کی کامیابی کے پیچھے ان کی شخصیت اور انسان دوست آدرشوں کو ہی وجہ قرار دوں گا۔

باقی اس ایونٹ میں صلاح الدین درویش صاحب اور جناب جاوید انور کی لگاتار موجودگی نے نہ صرف چونکایا بلکہ ان کے کمنٹس اور تبصروں کے ذریعے بہت ساری تحریروں کے کچھ الگ رنگ دکھائی پڑے۔ اور میں نے دیکھا جاوید انور صاحب نے اس ایونٹ کا سب سے لمبا تبصرہ اس فقیر کے افسانے پر کر کے اعزاز بخشا۔جناب قیصر نذیر خاور مہان انسان ہیں ان کی نگاہ سے شاید ہی کوئی فنی ،فکری یا تکنیکی غلطی او جھل ہوسکی ہو جو سبھی کے لیے سیکھنے اور فکری ترقی کا سبب رہی۔ میں نے واضح طور پر ڈاکٹر توحید کشمیری صاحب کی schoolistic تجزیہ نگاری میں بڑا فرق اور ترقی دیکھی۔جو برصغیر پاک و ہند میں اردو ادب کے لیے ایک خوش آئند اشارہ ہے۔سرفراز سلیم صاحب آسنسولی، راجہ یوسف صاحب، پیارے بھائی مشتاق احمد نوری صاحب کے تاثرات بھی کمال است۔میرے پیر و مرشد ارشد عبدالحمید صاحب کے بنا کیسے ممکن تھا کہ یہ ایونٹ

مکمل ہوتا۔ان کی تفہیمی تبصرے بذات خودکسی رومانس سے کم نہیں۔ان کی بابرکت شخصیت محبت کا بہتا دریا۔

خواتین مبصرین میں ڈاکٹر کوثر جمال صاحبہ،محترمہ بہزادکنول،محترمہ ثمینہ سید،فرحین جمال صاحبہ،ڈاکٹر فریدہ صاحبہ،محترمہ فارحہ ارشداور دیگر معزز خواتین نے ایونٹ میں نہایت سنجیدہ تبصرے لکھے جو معتبری کا درجہ رکھتے ہیں۔

آخر میں نعیم یاد صاحب کو یاد نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ وہ لازماً advance in افسانہ پڑھتے ہونگے پھراس کی روح کے مطابق اس کا بینر بناتے ہونگے۔ان کے لیے ڈھیروں داداور شاباشی !!!!

جن خواتین وحضرات کے افسانے پیش ہوئے ان سب کو مبارکباد اور ایک بار پھر اقبال حسن آزاد صاحب کے SHOW MAN ONE کے کامیاب انعقاد اور اختتام پر انھیں بہت بہت مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ غازی جی۔حسین

◄● ►

(۳۳)

میرا خیال ہے کہ ایک عرصہ بعد کسی فیس بک فورم پر افسانہ ایونٹ اس قدر کامیاب رہا۔افسانوں کا معیار بھی فیس بک کے ابتدائی دنوں میں لکھے جانے والے افسانوں سے کہیں بہتر اور عمدہ تھا بلکہ کچھ دوست احباب کی تنقیدی بصیرت کے جوہر بھی یہاں خوب کھلتے نظر آئے۔

یہ ایونٹ قرار واقعی داد وتحسین کا مستحق ہے۔ثالث کا سٹاف اور انتظامیہ بشمول اقبال حسن آزاد صاحب اور نعیم یاد صاحب داد کے مستحق ہیں۔ نعیم بیگ

◄● ►

(۳۴)

ثالث افسانہ ایونٹ ایک یادگار تقریب کا انعقاد تھا۔ جہاں اقبال حسن آزاد صاحب کے انتظامی امور قابل داد ہیں، وہاں ایونٹ کے دوران نعیم یاد صاحب کا شانہ بشانہ نظر آنا قابلِ داد ہے۔آپ دونوں معزز حضرات نے ہراک افسانہ پڑھا، پرکھا، پوسٹ کیے اور سرورق بنائے۔ بلاشبہ ادب کے لیے آپ کی خدمات بے مثال اور بے لوث ہیں۔معزز مبصرین معزز مصنفین کے شانہ بشانہ نظر آئے۔ مصنفین کی جانب سے مختلف موضوعات کا احاطہ کیے فن پارے پڑھنے کو ملے اور مبصرین نے اپنے تبصروں سے محفل کو چار چاند لگائے۔ کسی ایک بہترین مبصر /مبصرہ اور مصنف /مصنفہ کا نام لکھنا ناممکن جتنا مشکل ہے۔قوی امید ہے کہ ثالث کی جانب سے آئندہ بھی اسی طرح کی رنگارنگ تقریبات کا انعقاد کیا جائے گا اور مل بیٹھنے کے مواقع میسر آئیں گے۔ محمد شاہد محمود

◄● ►

(۳۵)

کسی بھی ایونٹ کا آغاز بہت دور سے دیکھے گئے پہاڑ سا قابلِ تسخیر لگتا ہے،لیکن جب کوہ پیمائی کی باضابطہ شروعات کی جاتی ہے،تب یہ عقدہ کھلتا ہے کہ مہم کوسر کرنے سے بھی بڑا جوکھم ہے،خودکو بچائے رکھنا اور محفوظ واپسی۔اقبال حسن آزادکو میں زمانۂ طالب علمی سے ہی جانتا ہوں کہ برادر محترم بڑے الولعزم ہیں اور نئے نئے تجربات میں انھیں لطف ملتا ہےاوروہ اپنی باتوں کواپنے بڑوں سے بھی تسلیم کرالینے کا ہنر رکھتے ہیں۔ وہ فیصلہ سوچ سمجھ کر لیتے اور اسے منطقی انجام تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔وہ خود منفرد افسانہ نگار ہیں اس لئے افسانوں کے انتخاب میں قدرے سختی سے کام لیا ہے ورنہ قارئین ومبصرین کوکمزور کہانیوں کوبھی جھیلنا پڑتا۔

ایونٹ کے تقریباً تمام بینر برادر عزیز نعیم یاد کےفن کے اعلی نمونے ہیں۔انھوں نے بینر کے توسط سے افسانے پر دلکش تبصرہ بھی کیا ہے۔ان کی پرخلوص خدمات کواحباب نے خوب سراہا ہے۔اسی طرح انھیں افسانے پر بھی خصوصی توجہ دینی چاہئے کہ ان میں ایک اچھے افسانہ نگار کی بیشتر خصوصیات موجود ہیں۔

میں نے ’ثالث‘ کے علاوہ اب تک کسی گروپ کی نہ ممبری تسلیم نہیں کی اور نہ اتنا فعال ومتحرک رہا ہوں۔موصوف کی پرخلوص دعوت کوقبول کرنا پڑا۔لہذا میں بھی مبصروں میں شامل ہوگیا۔

آخری دور میں غیر فعال ہوگیا تھا کہ گاؤں کے گھر کی چھت پر لگے جھولے ہر بیٹھا نیوز سن رہا تھا کہ اچانک وہ ٹوٹ کر سر پر آ گرا اور میں شدید زخمی ہوگیا۔اپنی بیماری کی تشہیر مجھے پسند نہیں،اس لئے خاموش رہا۔

احباب کو میرے تبصرے قدرے سخت اور کچھ زیادہ ہی بے باک لگے ہوں گے۔ظاہر ہے کم علمی اور سمجھ کے ساتھ میرا یہ رویہ کہ زیرِ تبصرہ تخلیق کے تبصرے میں منافقت در نہ آئے۔ممکن ہے اس رویے سے کسی کی دل آزاری ہوئی ہو،اس اندیشے کے سبب میں معذرت خواہ ہوں۔

سب سے اہم بات اور بڑا اعتراف یہ ہے کہ اس ایونٹ میں پیش کئے گئے بیشتر افسانوں پر تبصرے اور تاثرات کو پڑھ کر محفوظ ہوا اور میرے علم و دانش میں غیر معمولی اضافہ بھی ہوا ہے۔میں بہت سارے افسانوں پر تبصرہ کرنا چاہتا تھا لیکن سر میں لگی شدید چوٹ کے سبب نہیں کر سکا،جس کا مجھے ملال ہے۔

یہ ایونٹ ختم ہوا لیکن تاریخ کا حصہ بھی بن گیا۔

آخر میں منتظم ون مین آرمی، برادر محترم اقبال حسن آزاد، مدیر اعلی، ’ثالث‘،مونگیر اور اپنے دلکش بینر سے ہر افسانے کو پڑھنے کے لئے اکسانے والے برادر عزیز،نعیم یاد صاحب کے ساتھ ساتھ سبھی افسانہ نگاروں،قارئین،مبصرین اور دیگر احباب کو مبارکباد اور نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر شاہد جمیل

(۳۶)

ایونٹ تو واقعی شاندار اور کامیاب تھا۔ سب افسانے تو ابھی تک نہیں پڑھ سکا لیکن جو پڑھے ہیں ان سے اور ان پر تبصروں سے میں نے خود بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ محترم آزاد صاحب کی عظیم کوشش کو انتھک کہنے کی جرأت نہیں کرونگا کیونکہ بعض اوقات کسی لکھاری یا قاری کی تحریر پر ان کے رَدِّ عمل سے معلوم ہو جاتا تھا کہ اس ایونٹ کا منعقد کرنا واقعی تھکا دینے والا کام تھا۔ وہ بھی آخر انسان ہی ہیں، فوق البشر نہیں۔ شاید آئندہ ایونٹ کے لئے مناسب ایڈمن کی ایک ٹیم بنالیں تو کام بٹ جائے گا۔ بش احمد

◀● ▶

(۳۷)

پتا نہیں کیوں؟ لیکن اب تک فیس بک پر افسانوی نشست میں حصہ لینے کا کبھی کوئی اشتیاق نہیں رہا۔ ایک روز اقبال حسن آزاد صاحب کے اعلان پر نظر گئی تو میں نے اپنا افسانہ ''ریختہ'' انھیں واٹس پر بھیج دیا۔ دل میں جو آتش اشتیاق بڑھک اٹھی اس کی وجہ شاید اقبال حسن آزاد صاحب کا نامِ نامی ہی رہا ہوگا۔ اس ایوینٹ کے شاندار انعقاد سے حیران کن خوشی ہوئی اور یہ انکشاف بھی ہوا کہ 'ون مین آرمی' کسے کہتے ہیں!

اس خوبصورت بزم کو سجانے سنوارنے میں اقبال حسن آزاد صاحب نے کسی قسم کی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اس پر نعیم یاد صاحب کے تمام بینر بھی یادگار اور قابلِ قدر ہیں۔ یہ ایوینٹ افسانوی ادب میں ایک معیاری اور باوقار اضافہ ہے۔ ایوینٹ میں اسی سے زائد افسانے پیش کیے گئے۔ یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے اور اس پر ثالث جیسے معروف، مؤقر اور معیاری ادبی رسالے میں منتخب افسانوں کی اشاعت قابل تحسین قدم ہے۔ اس خوبصورت اور معیاری نشست کے انعقاد کے لیے محترم اقبال حسن آزاد صاحب اور ثالث گروپ کو مبارکباد اور دعائیں۔ ریحان کوثر

◀● ▶

(۳۸)

سب سے پہلے منتظم محترم اقبال حسن آزاد صاحب کو ثالث افسانہ ایونٹ کے کامیاب انعقاد اور اختتام پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد۔ آپ نے جس طرح تن تنہا اس پورے ایونٹ کو سنبھالا، آپ کی جستجو محنت لگن اور اردو زبان و ادب کی خدمات قابل ستائش اور قابل تقلید ہیں۔ ایونٹ میں بہترین افسانوں کے ساتھ بہترین تبصرے بھی پڑھنے کو ملے۔ بالخصوص محترم ارشد عبدالحمید صاحب، محترمہ فارحہ ارشد صاحبہ، محترم شاہد جمیل صاحب، محترمہ اسما صاحبہ، محترم مشتاق احمد نوری، محترم امام حسن صاحب، محترمہ فریدہ تبسم

صاحبہ، محترم ریاض توحیدی صاحب، محترم غازی حسین صاحب، شفقت صاحب، محترمہ فرحین جمیل صاحبہ وغیرہ کے تبصروں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔اس بہترین علمی وادبی ستاروں سے مزئین محفل کو سجانے کا سہرا محترم اقبال حسن آزاد صاحب کے سر ہے۔موصوف نے عالمی سطح پر متنوع مزاج کے حامل مختلف حضرات و خواتین کو ایک ہی پلیٹ فارم پر اس طرح جمع کر دیا کہ نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز......یہی وجہ ہے کہ ایونٹ کے دوران کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ، آپسی چپقلش، طعنہ وتشنہ کی باتیں نہیں ہوئیں۔کہیں کچھ ایسا ہوا بھی تو موصوف نے بروقت بحیثیت منتظمین درست فیصلہ لیتے ہوئے، بات کو بڑھنے سے پہلے ہی ختم کر دیا۔اس بات کا تجربہ مجھے ایونٹ کے ابتدا میں ہی ہوگیا تھا۔محترم اقبال حسن آزاد صاحب نے ایونٹ میں جس تندہی، انہماک، بردباری اور تحمل مزاجی کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل ستائش اور قابل تقلید ہے۔میں آپ کی اس منکسرالمزاجی، معاملہ فہمی، ادب دوستی کو سلام کرتے ہوئے امید کرتی ہوں کہ آپ مستقبل میں بھی ایسے ہی کامیاب ایونٹ کا انعقاد ضرور کریں گے۔

جس میں شامل ہو کر ہم سب کو ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ضرور ملے گا۔ایک اور بات ایونٹ سے پہلے افسانہ اور افسانوی فن سے متعلق معلوماتی مضامین کی اشاعت بھی مفید رہی اور دوران ایونٹ موصوف کی مختلف پر تجسس اعلانات دلچسپ اور اہم تھے۔ایونٹ کی اس کامیابی میں محترم نعیم یاد صاحب کی فنکاری بھی قابل ستائش ہے۔موصوف نے ہر افسانے کے موضوع کی مناسبت سے بہترین بینر تیار کیے۔جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ موصوف نے ایونٹ میں شامل ہر افسانے کا مطالعہ کیا۔آج کی اس مصروف ترین زندگی میں اس طرح مکمل توجہ اور خلوص سے اپنی ذمہ داری کو انجام دینے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔اس اہم ذمہ داری کو بحسن خوبی سرانجام دینے پر میں محترم نعیم یاد صاحب کو دل سے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

ایونٹ میں افسانہ نگار قارئین اور مبصرین کا بھی اہم کردار رہا کہ ان سب کی موجودگی نے اس قدر طویل ایونٹ کو کامیاب اور یادگار بنادیا۔اس لیے تمام شرکا کو دلی مبارکباد۔اپنی ذاتی مصروفیات کے باعث کچھ افسانوں کو پڑھنے سے قاصر رہی۔لیکن ان شااللہ جب بھی فرصت ملے گی، مابقی افسانوں کو پڑھنے کی کوشش رہے گی۔ایک بار پھر محترم اقبال حسن آزاد صاحب کو ثالث ایونٹ کی کامیابی اور ثالث شمارے کی اشاعت پر دل سے مبارکباد اور نیک خواہشات۔

ڈاکٹر عائشہ فرحین

◀◀ ● ▶▶

(۳۹)

افسانوی نشست بہت کامیاب رہی۔کئی بہترین افسانے پڑھنے کو ملے۔عمدہ تبصروں سے سیکھنے کو بھی

بہت کچھ ملا۔نسشت میں امن وامان اورافہام وتفہیم کی فضارہی۔اس خوش انتظامی کا سہراڈاکٹر اقبال حسن آزاد کے سر جاتا ہے۔اس کامیابی پر دلی مبارکباد۔گذارش یہ ہے کہ آئیندہ افسانوں کی طوالت کی ایک خاص حد مقرر کی جائے اور کوشش کی جائے کہ اوسط سے بلند سطح کے افسانے ہی نشست میں شامل کیے جائیں۔ڈاکٹر کوثر جمال

◀ ● ▶

(۴۰)

ایسے افسانوی ایونٹس پہلے بھی ہوتے رہے ہیں مگر آپ نے نئے نئے اور خوبصورت تجربوں کے ذریعے اسے ایک یادگار واقعہ بنادیا ہے۔بہت بہت مبارکباد جناب۔ رفیع حیدر انجم

◀ ● ▶

(۴۱)

ایک شاندار سلسلہ جس سے بہت کچھ سکھنے کو ملا اقبال صاحب اور تمام احباب تعریف کے حقدار ہیں۔ امین کنجاہی

◀ ● ▶

(۴۲)

افسانے کا انتخاب، بینرز کی تیاری اور پیش کش کے بعد تمام تبصرے اس نیت سے بھی پڑھنا کہ کہیں کوئی مبصر کوئی ایسی بات نہ لکھ دے جو کسی کی دلآزاری یا تنازع کا سبب بن جائے،ایک ذمہ داری کا کام تھا اور آپ نے اس ذمہ داری کو خوب نبھایا۔افسانہ ایونٹ کے بعد آپ نے جو سکون کی سانس لی،اسے میں محسوس کر سکتا ہوں۔اہونٹ کے اختتام پر آپ نے آنکھیں بند کر کے جو چاہے پی،اس کا بھی مجھے احساس ہے۔اس کام ایونٹ کے انعقاد پر آپ کو بہر حال مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ نصرت بخاری

◀ ● ▶

(۴۳)

ایک معیاری ایونٹ اختتام پذیر ہوا،جس سے بہت کچھ سیکھا سب افسانہ نگار اور مبصرین کے محنت کو سلام! سر اقبال حسن آزاد اور نعیم یاد صاحب کی محنت،استقامت اور لگن کو سلیوٹ۔عبدالشکور جاذب

◀ ● ▶

(۴۴)

ماشاءاللہ بہترین اور کامیاب ایونٹ پر دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ہم سب کو سیکھنے کے شاندار مواقع

میسر آئے۔ایڈمن،مبصرین اور تخلیق کار سبھی قابل تحسین ہیں۔یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ کنول بہزاد

◀◀ ● ▶▶

(۴۵)

بہت کامیاب ایونٹ تھا۔جند ایک افسانے ہیں جو میں پڑھ نہ سکی۔باقی سب پڑھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا مبصرین کے تبصروں سے بھی تنقید نگاروں کی تنقید سے بھی......اقبال صاحب اس ایونٹ کی کامیابی کے لیے مبارک باد کے حقدار ہیں۔ دلشاد نسیم

◀◀ ● ▶▶

(۴۶)

معیاری اور کامیاب افسانہ ایونٹ کا انعقاد کوئی آسان کام نہیں۔اسے ناکام بنانے کے لیے درپردہ کئی مخالفین بھی سرگرم ہوتے ہیں، وہ لڑائی جھگڑے اور بدمزگی کی فضا پیدا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔آپ بخیر وخوبی تمام مراحل سے گزر گیے ،لگتا ہے آپ کو کسی فقیر کی دعا ہے۔ خاقان ساجد

◀◀ ● ▶▶

(۴۷)

ایک خوبصورت اور کامیاب ایونٹ کے لیے مبارک باد۔آپ نے بخوبی تمام مراحل طے کیے۔ دلکش بینرز کے لیے نعیم یاد صاحب داد کے مستحق ہیں۔ شاہین کاظمی

◀◀ ● ▶▶

(۴۸)

ماشاءاللہ۔سب تبصرے بہت محبت سے لکھے گئے ہیں،شاندار اور کامیاب ایونٹ منعقد کروانے کے لیے محترم اقبال صاحب کو مبارک۔ رفعت امان اللہ

◀◀ ● ▶▶

(۴۹)

ایونٹ کے لیے مجموعی تاثرات عمدہ طریقے سے دوستوں نے قلمبند کیے۔سب افسانے پڑھے اور کچھ نہ کچھ رائے بھی دی۔میرے لیے اس ایونٹ میں سیکھنے کو بہت کچھ تھا۔خصوصا سر قیصر نذیر خاور اور صلاح الدین درویش کی تنقید نے آنکھیں روشن کیں۔دھنے واد۔ اقبال مٹ

◀◀ ● ▶▶

(۵۰)

دعا ہے ادب کی خوبصورت محفلیں آباد رہیں۔ سر اقبال حسن آزاد صاحب اور نعیم یاد صاحب کی کاوش کو سراہا جاتا ہے۔
اکبر شیخ اکبر

◀◀ ● ▶▶

(۵۱)

ایک بہت خوبصورت اور کامیاب افسانوی ایونٹ کے انعقاد پر انتظامیہ کو بہت بہت مبارکباد۔ میں نے کافی افسانے پڑھے ہیں لیکن کچھ رہ گئے ہیں۔ مجموعی تاثر بہت اچھا ہے۔ بہت معیاری افسانے تھے۔ ایک بار پھر مبارکباد۔
بادِ صبا

◀◀ ● ▶▶

(۵۲)

مسرتوں کی اسی نمو سے یہ کہنا تو بجا ہے کہ میں شہرِ ادب کا ''راہ نوردِ شوق'' ہوں مگر یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ میں اچانک ہی یہاں آنکلا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کسی نے یہاں بلاتے ہوئے کہا تھا کہ: ''گلستانِ ثالث میں پھولوں کا میلہ ہے۔ اس فلورل شو میں میرے پھول بھی موجود ہیں'' یہاں پہنچا تو ایک جشن کا عالم بپا تھا اور جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ ہر گوشہ خوب صورت اور رنگ برنگے پھولوں سے سجا تھا۔ مزید یہ کہ شاخ ہائے ثمر بار پر بیٹھے خوش گلو پرندوں کی چہکار! گویا باہر کے موسم سے بے نیاز یہاں تھی بہار ہی بہار!! چشمِ حیرت وا کیے آگے بڑھا تو سامنے ہی چند جانے پہچانے چہرے نظر آئے، جنہوں نے خوش آمدید کہا، ان میں وہ ہستی بھی موجود تھی جس نے اس مقامِ خوش رنگ و خوش بو میں آنے کی دعوت دی تھی۔ گلستانِ ثالث کے باغ باں، روحِ رواں اور میزباں اقبال حسن آزاد سے ملاقات ہوئی تو بڑے پر تپاک انداز سے ملے۔ تھوڑی ہی دیر میں، تکلفات کے حائل پردے ہٹ گئے۔ میں جو بنیادی طور پر ایک اداس شخص ہوں اس جشن کا یوں حصہ بنا کہ اپنی اداسی بھلا بیٹھا اور رنگِ محفل دیکھ کر طرب سے جھوم اٹھا۔ اس موقع پر میری ہی ایک نظم یادوں کے دریچے سے جھانکنے لگی۔ اداس لمحوں کی کھیتیوں میں مسرتوں کی نمو ہے جاری مسرتوں کی اسی نمو سے فضائے ہستی مہک اٹھی ہے مری تمنا کے سارے جگنو عجیب نوری لبادہ اوڑھے شبِ سیہ میں ستارے بن کر چمک رہے ہیں دمک رہے ہیں تمام شب ایک رقصِ پیہم تمام شب ایک رقصِ مستی بالآخر ہر شے کی طرح اس شب کو بھی تمام ہونا تھا اور وہ تمام ہوئی، وہ رقصِ مستی ختم ہوا مگر ''گلستانِ ثالث'' کی یادیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ وہ گلستاں جہاں افسانوں کے پھول مہکتے رہے، حاضرینِ سخن شناس حظ اٹھاتے رہے، ماہرینِ حرف ونقد نکتہ سنجی کرتے رہے، باغبانِ گلستانِ ثالث اقبال حسن آزاد بڑے سلیقے سے

کاروبارِ بزم چلاتے رہے اور مشکل معاملاتِ بے رخی و بے رخاں سے بھی بطریقِ احسن نمٹتے رہے، نعیم یاد ایک سے بڑھ کر ایک یادگار بینرز بناتے رہے اور ایونٹ کی شان بڑھاتے رہے۔ گویا کہ تمام شرکا نے اپنے اپنے حصے کے چاند اور ستارے لے کر گلستانِ ثالث کی شب کو روشن و رخشاں اور منور و تاباں کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔
بحیثیت ناظر میری یہ حالت ہے کہ دل پکارے ہی چلا جاتا ہے:
''ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔'' آخر میں تمام شرکاء بالخصوص اقبال حسن آزاد کو داد جنہوں نے منوالیا کہ وہ اقبال بھی ہیں، حسن بھی اور آزاد بھی۔ شفقت محمود

◀◀ ● ▶▶

(۵۳)

لکھنا دراصل پڑھنے کا فن ہے۔ جس طرح شاعری کیفیات کے اظہار کا ہے، اسی طرح افسانہ بھی جذبات، احساسات اور کیفیات کو بیان کرنے کا ہنر ہے۔ شاعری تب تک شاعری نہیں مانی جاتی جب تک اس میں وزن نہ ہو اور کہانی پن کے بغیر افسانہ نامکمل ہے۔ شاعری میں ایک مضمون کو نکتہ کی صورت بیان کیا جاتا ہے جبکہ افسانہ میں ایک نکتے کا پھیلاؤ ہے۔ آپ کس شے کو کیسے دیکھتے ہیں اس کا بیان انشائیہ ہے تاہم ایک نکتے کو کہانی پن کے ساتھ بیان کرنا افسانہ ہے۔ افسانہ ایک خیال یا ایک نکتہ کے پھیلاؤ کا نام بھی ہے تو اس نکتے یا خیال کے ابلاغ کے لئے واقعات کا سہارا لیا جاتا ہے ممکن ہے اس نکتہ یا خیال کا ابلاغ چند واقعات سے ہو جائے یا زیادہ میں۔ اس کے ساتھ فلسفہ، منظر نگاری، سراپا نگاری جو بھی ہو، ان سب میں وحدت تاثر ہونا چاہئے۔ زائد وہ ہوتا ہے جو وحدت تاثر میں زائد ہو، ان سب کو مہارت کے ساتھ استعمال کرنا ہی فن کاری ہے۔ اصل شے ابلاغ ہے۔ اس نکتے یا خیال کا۔

ہم جو افسانہ اور کہانی کی حد بندی میں پھنسے ہوئے لکھاری...... تنقید کے بارے میں انتہائی سطحی سوچ رکھتے ہیں۔ یہ خیال مجھے اپنے افسانے کے تاثرات پر آیا، جب افسانہ ''ثالث'' پر پیش کیا گیا۔ میں اپنے لکھے کی وضاحت نہیں دیتا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ''مستند ہے ہمارا فرمایا ہوا'' کیونکہ کسی بھی تحریر میں بہتری کی گنجائش ہمہ وقت رہتی ہے۔ میں نے کسی بھی لکھاری کے افسانے پر تبصرہ اس لئے نہیں کیا کہ تنقید کے اس معیار کا چلن یہاں نہیں تھا، جس کی مجھے امید تھی۔ یہاں بنا پڑھے بھی افسانوں پر تبصرہ بازی ہوتی رہی۔ جس کا بے حد افسوس ہوا۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمیں تنقید کا اعلیٰ معیار حاصل نہیں کر پائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم شاید ابھی تک افسانہ ہی کو نہیں سمجھے۔

میں اپنی اس بات کی وضاحت دلائل سے کروں گا۔ جو میرے افسانے پر تاثرات آئے، اس

حوالے سے۔ میں کسی دوسرے صاحب یا صاحبہ محترم لکھاری کی بات کو نہیں لوں گا۔ میری درخواست یہ بھی ہوگی کہ اس بحث برائے بحث کے زمرے میں نہ لیا جائے بلکہ حقائق پر پرکھا جائے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کسی بھی خیال یا نکتے کو ہم کس ''شئے'' سے ابلاغ کریں گے؟ ظاہر ہے وہ واقعات ہیں، جن کو لے کر ہم خیال یا نکتے کی بنت کرتے ہیں۔ اب چونکہ ہم افسانہ لکھ رہے ہیں تو اس میں واقعات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ واقعات کو کس طرح لے جا کر اس خیال یا نکتے کو ابلاغ کیا گیا ہے۔ اب صرف واقعات میں اٹک کر کسی افسانے کو رد کرنا کوئی دانشوری نہیں۔ پھر یہ اعتراض کہ یہ واقعہ کیوں ہوا، ایسا تو نہیں ہونا چاہئے، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم نے تو نہیں دیکھا؟ تو کیا یہ کسی بھی افسانے کے رد کردینے کی دلیل ہیں، یا تنقید کا کوئی اصول؟ دیکھنا یہ ہے کہ سارے واقعات مل کر آخر میں کیا ابلاغ کرتے ہیں۔ آپ کسی لکھاری کو یہ اجازت کیوں نہیں کہ وہ مرضی کے واقعات چنے، بھئی وہ ''افسانہ'' لکھ رہا ہے، کوئی خبر نہیں لکھ رہا، رپورٹنگ نہیں کر رہا کہ وہ حقائق پر مبنی ہوں۔

دیکھیں، مجھے عینک والا کوئی شخص پسند نہیں، لیکن افسانے میں ایک کردار عینک والا ہے، تو کیا افسانہ اسی لئے رد ہوجائے گا کہ اس میں عینک والا کردار کیوں ہے؟ دیکھنا یہ ہوگا کہ کیا اس افسانے میں عینک والے کردار کی ضرورت تھی یا نہیں، پھر تنقید بنتی ہے۔ کیا وہ اصل خیال یا نکتہ کے ابلاغ میں وحدت تاثر میں فٹ تھا یا مس فٹ؟ بور سے بور ترین تحریر میں بھی کوئی نہ کوئی اچھی شے ضرور ہوتی ہے اگر پڑھنے والے کے پاس تحمل، بردباری اور ذوق ہو۔ ہمارا وطیرہ یہ ہے کہ ہم ذرا سی غلطی کو فوراً سامنے لاتے ہیں، لیکن اچھی شے کا اظہار نہیں کرتے، ذرا سوچیں یہ ہماری کس نفسیاتی گرہ یا احساس کمتری یا برتری کی نشاندہی کرتا ہے؟

کیا کتابت کی غلطی سے افسانہ رد ہوجاتا ہے؟ ہم افسانے میں ''سچائی'' تلاش کرنے والے لوگ......واقعات پر تو بحث کرتے ہیں، کرداروں کے کرادار پر انگلی رکھ دیتے ہیں، یہ کیوں نہیں تلاش کرتے کہ اس افسانے کی اصل کیا ہے؟ مثال کے طور پر......(یہاں مجھے افسوس بھی ہے کہ شاید میں ہی ابلاغ نہیں کرسکا، یا مشہور افسانہ نگار نہیں سمجھ سکے۔) میرے افسانے میں تخلیق اور اولاد کو برابری کی سطح پر رکھا گیا ہے۔ جیسے کسی بھی تخلیق کار کی تخلیق اولاد کی مانند ہوتی ہے، اس طرح اولاد بھی تخلیق ہے۔ وہ عورت اگر بازار سے شاعری خرید سکتی ہے تو اپنی ماتا کی تکمیل بھی کرسکتی ہے، کیونکہ یہ بازار میں دستیاب ہے۔ (عورت بری ہے یا اچھی مجھے اس سے سروکار نہیں، میرے نزدیک وہ عورت ہے، (یہ ایک محترمہ کے سوال کا جواب بھی ہے) عورت اپنی تکمیل چاہتی ہے، اب یہ عورت پر ہے کہ وہ بازار سے خریدتی ہے یا نہیں) دوسری طرف مرد ہے، (اب وہ مرد اچھا ہے یا برا، بزدل ہے، کمینہ ہے یا بہادر، اس سے بھی سروکار نہیں) وہ اپنی تخلیقات بیچتا

ہے،اس کی کوئی بھی مجبوری ہو...... وہ بیچتا ہے۔ یہاں مرد کا المیہ یہ ہے وہ اپنی تخلیق کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتا، وہ چاہے شاعری ہے یا اولاد ہے، وہ کون سا معاشرتی المیہ ہے جو ایسے حالات پیدا کرتا ہے یا کر سکتا ہے؟

لکھنے کو تو یہاں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ چلتے چلتے ایک دو باتیں عرض کر دوں۔ یہی افسانہ پاکستان کے ایک معتبر رسالے میں شائع ہو چکا ہے۔ (یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں یہ اس لئے لکھا کہ یہ افسانہ جلدی میں یا گن پوائنٹ پر نہیں لکھا گیا) دوسرا...... مجھے یہ عرض کرنا ہے لکھنا، دراصل پڑھنے کے فن کا نام ہے...... میں اپنے آپ سے کہتا ہوں (دوسرے لکھاری بھی اگر چاہئیں تو......) پہلے ہم پڑھنا سیکھیں، لکھ بعد میں لیں گے۔ پھر ہم تنقید بھی کر لیں گے۔ کبھی بھی کوئی نام ہر تحریر کی ضمانت نہیں ہوتا، ممکن ہے ایک کہانی کار کوئی بہترین افسانہ دے دے، اچھا شاعر زبردست کہانی لکھ دے، اچھا افسانہ نگار بھی کوئی ماٹھا افسانہ لکھ سکتا ہے، مقصد کہنے کا یہ ہے کہ نام کو نہیں، اس تحریر کو دیکھنا چاہئے، جو آپ کے سامنے ہے، اسے کسی خاص خول میں بند نہیں کرنا چاہئے اور اس وقت قلم اٹھائیں، جب اس تحریر کو سمجھ چکے ہوں، ورنہ تبصرہ، تنقید یا رائے فوراً اظہار کر دیتا ہے کہ تبصرہ نگار کتنی ذہنی رسائی رکھتا ہے۔ میں شاید خود پر افسوس کرتا کہ میں افسانے میں اپنا خیال یا نکتہ بیان نہیں کر پایا، مجھے نظر ثانی کرنی چاہئے لیکن درج ذیل تبصرے نے بہر حال مجھے اس خفت سے بچا لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بھلے ایک آدمی ہی سہی، سمجھ لیا، کافی ہے، تبصرہ پڑھیں، مزہ لیں اور دعاؤں میں یاد رکھیں۔ IqbalShahidMuhammad بے نامی اکاؤنٹ ہولڈر ادیب اور آف شور کمپنی کی مالک شاعرہ کے درمیان تعلق کی داستان سناتا رواں افسانہ جس نے اپنے پڑھنے والوں کو بھی چیں بجبیں کرنے پر مجبور کر دیا......ڈھیروں داد اس عمدہ کاوش پر امجد جاوید۔

''ثالث افسانہ ایونٹ......'' ایک کامیاب سرگرمی رہی۔ بہت سارے افسانے پڑھنے کو ملے، ان سے بہت کچھ سیکھا، میں محترم اقبال حسن آزاد کو اس قدر محنت، لگن اور رچاؤ کے ساتھ ایونٹ کی کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ڈھیروں داد اس عمدہ کاوش پر۔

امجد جاوید

◄◄ ● ►►

(۵۴)

یہ کہنا نے جانہ ہوگا کہ تنہا اس سفر پر نکل پڑنا اور اپنے جلو میں افسانوں کی کہکشاں سجا لینا آسان کام نہیں۔ جس خوش اسلوبی سے آپ نے ان تمام دنوں ایک کے بعد دیگر پڑاؤ پار کئے، وہ لائق ستائش، قابل قدر، قابل احترام ہے۔ آپ کی یہ عرق ریزی ادب کی راہوں میں یاد کی جائے گی۔ عالمی طور پر افسانہ نویسوں کو ایک پلیٹ فارم عطا کرنا ساتھ ان کے تبصروں ونقد پر نظر رکھنا سہل نہیں۔ تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے

میری تحریرکواس خوبصورت بزم کی زینت بنایا۔ بہت بہت بہت شکریہ۔ سلامت رہیں۔ فریدہ انصاری

◄● ►

(۵۵)

رسالہ ثالث ۔اس خوبصورت ایونٹ کے ذریعے ثالث ٹھہرا کئی ممالک سے اردو لکھنے والوں کی کاوشوں کا۔ کتنی کہانیاں، کتنے کردار، کتنے قصے ثالث سے اپنی کہنے آئے۔ کتنے الفاظ، کتنے جذبات، کتنے احساسات مصنف کے دل سے قاری کی نظر تک مسافر ہوئے۔ کتنی طرح کے افسانے اپنی چھب دکھا کر گئے۔ کتنے ہاتھ ایک کینوس پر رنگ بھر گئے۔ اور کس کس ہتھیلی میں تھامے موبائل پر یہ رنگ بکھر گئے۔ اس ایکٹوٹی کے ذریعے لکھنے والوں نے لکھا۔ پڑھنے والوں نے پڑھا۔ جاننے والوں نے جانا۔ سیکھنے والوں نے سیکھا۔ چاہنے والوں نے جی لیا اور ڈھونڈنے والوں نے پا لیا۔ ان سب کا بہت شکریہ جنہوں نے جان پہچان، عمر، شہرت، تعلق، دوستی، سرحد اور منصب سے بالاتر ہو کے تبصرے کیے۔ شکریہ ثالث! سمیرہ عابد

◄● ►

(۵۶)

ایونٹ میں شامل تمام افسانے میں نے دلچسپی سے پڑھے اور چند کو چھوڑ کر تمام افسانے پسند آئے۔ جناب اقبال حسن آزاد نے ملک اور بیرونِ ملک کے لائق ترین افسانہ نگاروں کو ایونٹ میں شامل کر کے کارہائے نمایاں انجام دیا ہے جس کے لیے انہیں جتنی بھی مبارکباد دی جائے وہ کم ہے۔ ابرار احمد صدیقی

◄● ►

(۵۷)

محترم اقبال حسن آزاد صاحب اور نعیم یاد صاحب کی محنت قابل ستائش ہے، تنقید برائے اصلاح ہونی چاہئے بس اس امر کی بعض اوقات کمی محسوس ہوئی کیونکے جو حضرات موضوع یا پروف کی غلطیوں پر تنقید کرتے ہیں یہ کمی پھر انکے ہاں نہیں ہونی چاہئے جبکہ موضوع کے اعتبار سے انکے افسانے کسی طرح بھی نیوز پیپر کی نیوز سے کم نہیں لگے عام قاری کو اور نیوز کی طرز پر لکھے افسانے کو بلا وجہ منٹوازم کا تڑکا لگا دیتے ہیں اور پروف غلطیاں انکی اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں۔ بہرحال کامیاب ایونٹ پر مبارکباد۔ فوزیہ مغل

◄● ►

(۵۸)

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی زیرنگرانی ثالث مونگیر افسانہ ایونٹ اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑنے

کے بعد اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ افسانوی ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اگر میں یہ کہوں کہ ''مجھے اس ایونٹ سے سیکھنے کو اتنا کچھ ملا ہے کہ میں احاطہ تحریر میں نہیں لاسکتا''، تو بے جا نہ ہوگا۔ میری خوش قسمتی رہی کہ ایونٹ کے آغاز سے ذرا پہلے میں اس گروپ کا حصہ بنا اور اب تک تقریباً ایک دو کو چھوڑ کر سبھی افسانے نہ صرف پڑھے ہیں بلکہ ہر ایک پر اپنی ناقص رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس رائے کے حوالے سے میری تمام فاضل تخلیق نگاروں سے دست بستہ استدعا ہے کہ اگر میری کم علمی کی وجہ سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہو تو بندہ معذرت خواہ ہے۔ استاد افسانہ نگاروں کا اپنی شاہکار تخلیقات کے ساتھ اور ماہر نقادوں کا فورم پر نہ صرف موجود رہنا بلکہ اپنی تکنیکی رائے کے بے باکانہ اظہار نے جہاں اس ایونٹ کی ساکھ میں اضافہ کیا ہے وہیں ہم ایسے تشنگان ادب کی سیرابی کا ساماں بھی......

تاثرات پیش کرنے کی اس نشست کی مناسبت سے میں ایک بات البتہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ تبصرہ نگار زیادہ تر وہی تھے جن کی تخلیقات بھی ایونٹ کا حصہ بنائی گئی تھیں لیکن ان کی طرف سے کم و بیش اسی طرح کا رویہ دیکھنے کو ملا جو دیگر فورمز پر ایونٹس میں ہوتا ہے۔ زیادہ تر اپنے افسانہ لگنے تک ایکٹو رہے بعد میں مختلف بہانے پیش کرتے نظر آئے۔ اسی طرح جو ناانصافی دیکھنے میں آئی وہ یہ تھی کہ کچھ افسانوں پہ کمنٹس کی تعداد بمشکل سو تک پہنچی جبکہ کچھ پر پانچ سو سے بھی تجاوز کر گئی۔ یقیناً بہترین تخلیق اپنا آپ منواتی ہے اور زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ لیکن یہ صورت حال بالکل اسی طرح نہیں تھی......

اساتذہ کرام کی ہمت کی داد بنتی ہے جو بنا کسی لالچ اور ذاتی مفادات کے ہر تخلیق پر نہ صرف وقت پر پہنچے بلکہ اس کے عیوب و محاسن پر کھل کر گفتگو کی جس سے ہم ایسے عامیوں کو بہت فائدہ ہوا...... میں اس حوالے سے جہاں تخلیق کار خواتین و حضرات کا شکر گزار ہوں وہیں اساتذہ کرام کا ممنون بھی ہوں۔

آخر میں اتنا کہوں گا کہ، نعیم یاد صاحب نے جہاں اپنے بینرز سے کسی بھی افسانے کی بہترین انداز میں تفہیم کرائی وہیں اقبال حسن آزاد صاحب کا تن تنہا مورچے پہ ڈٹے رہنا اور ایک دن میں دو دو تین تین افسانے لگانا اور پھر ہر ایک ناقد کے تبصرے پر پہنچنا اور ہر حرکت پر نظر رکھنے کی کوشش کرنا بھی اس ایونٹ کی خاص بات ہے اور اس خاص بات کے لیے یہ دونوں مردِ جرّی داد و تحسین کے مستحق ہیں...... محمد شاہد اقبال

◄◄ ● ►►

● حسین الحق

خطبہ صدارت

ایک طویل سلسلہ آج اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔
اقبال حسن آزاد اور تمام شرکاء کو بہت بہت مبارک باد۔

جب آغاز سے پہلے اقبال صاحب نے مجھ کو اس بزم میں شامل ہونے کی دعوت دی تو میں نے سوچا کہ جیسی ساری افسانوی نشستیں ہوا کرتی ہیں، یہ بھی ویسی ہی ایک نشست ہوگی، جس میں بیس پچیس افسانے پیش کئے جائیں گے اور اس پر کچھ باتیں ہونے کے بعد وہ محفل اپنے اختتام کو پہنچے گی۔ مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ ۸۰ سے زیادہ افسانے پیش کئے جائیں گے اور تمام شرکاء آخری نشست تک پوری دلجمعی کے ساتھ شریک محفل رہیں گے۔ اتنی طویل افسانوی نشست اتنی دلجمعی کے ساتھ اس بات کا ثبوت ہے کہ افسانہ سازی اور افسانہ خوانی ابھی جاری رہے گی۔

البتہ شعر و ادب کی کوئی محفل خصوصی نہ ہو کر محفل عام ہو جاتی ہے تو اس کا موڈ بھی عوام پسند ہو جاتا ہے، اس محفل میں بھی لوگ باگ خوب خوب شریک ہوئے لہٰذا افسانے بھی بھانت بھانت قسم کے پیش کئے گئے...... عصری مسائل سے مملو، افسانوی تکنیک کے لحاظ سے نک سک سے درست، ڈھیلے ڈھالے، آفاقی انسانی قدروں کے عکاس، رومانی کسک اور رومانی حظ کے حامل، کچھ سرّی افسانے بھی پڑھنے کو ملے، بعض ایسے بھی تھے جس میجک ریلزم کی جھلکیاں دکھائی دیں، ایک افسانہ تو دعا تعویذ کے پس منظر میں اپنا بیانیہ قائم کرتا نظر آیا۔

قصہ مختصر یہ کہ محفل یک رخی نہیں بلکہ متنوّع تھی۔ متنوع تھی اس لئے معیار بھی یکساں نہیں تھا اور ایسا ہونا فطری بھی ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ بھی بڑی بات ہے کہ ہم عصر بزرگ اور نمایاں افسانہ نگار مثلاً ذکیہ مشہدی، اسرار گاندھی، صادقہ نواب سحر، اقبال حسن آزاد، نعیم یاد، حسن امام، سید کامی شاہ، جی حسین، نعیم بیگ، مونا شہزاد، تنویر احمد تماپوری، سبین علی، اور مقصود حسن وغیرہ سبھی رونق محفل رہے۔

گویا محفل شاندار رہی۔ بس دم آخر اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ ہر پہلو سے تنوع صائب ہے مگر کوشش کی جانی چاہئے کہ معیار کے محاذ پر سب سپہ سالار ہی رہیں، پیدل کوئی نہ رہے (گو کہ شاید یہ ممکن نہیں ہے، پھر بھی اپنی جانب سے کوشش یہی ہونی چاہئے) بہر حال! آپ تمام حضرات کا بہت بہت شکریہ!

◀◀ ● ▶▶

● نعیم بیگ

نیا عالمی چیپٹر

ممکنہ طور پر آج میری زندگی کا آخری دن ہے۔گھڑی بھر میں فیصلہ سامنے آنے والا ہے۔ یہاں غداری کی سزا نئی زندگی ہے۔

کھڑکی سے باہر پانی میں روشنی کم نظر آنے سے احساس ہوا کہ سطح سمندر پر شام اپنے پر پھیلا رہی ہے۔ابھی چند لمحے پہل مجھے سرخ شراب سے لبریز ایک پیمانہ اور خشک میوے کا بھرا ہوا پیالہ دیا گیا ہے۔کل رات مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ یہ سویڈن سے اوپر شمال کی جانب نارو تجئن سمندروں کے نیچے سائنسدانوں کی عالمی لیبارٹری ہے۔ میں یہاں پہلے بھی ریسرچ کے لئے آچکا ہوں۔لیکن آج میں میز کی دوسری طرف ہوں۔میرے فکری انکار پر میری ذہنی کیفیت جانچنے کے لئے مجھے یہاں لایا گیا ہے۔انھیں یہ ریسرچ کرنی ہے کہ ان کا سدھایا ہوا انسان منحرف کیسے ہوسکتا ہے۔

یہاں انویسٹیگیشن کا طریقہ الگ ہے۔ذہنی یا جسمانی ریمانڈ نہیں لیا جاتا بلکہ سہولیات دے کر نفسیاتی طور پر جرم کے ارتکاب کے پس پردہ محرکات کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔جینیٹک انجینئر نگ کی مدد لی جاتی ہے۔ مسلسل انسانی حرکات کو پرکھا جاتا ہے۔تا کہ عالمی اداروں سے دوبارہ ایسی غلطی سرزد نہ ہوسکے۔ گو مروجہ قانونی سزائیں دینا ان کے لئے مشکل نہیں تاہم انسان کی قدر ان کے ہاں دولت سے بڑھ کر کبھی نہیں رہی۔وہ جب چاہیں انسان خرچ کردیں۔

کچھ دیر پہلے میرے پسندیدہ ہوانا کے سگار میرے قریب رکھ دئے گئے تھے۔ایسے وقت میں ان کی تعریف کئے بنا نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے باوجود تمام تر نفرت جو میرے انکار سے ان کے نظام میں خلل پڑنے سے پیدا ہوئی۔وہ معلوم دشمن کے جذبات کا احساس اس آخری وقت میں بھی روا رکھے ہوئے ہیں۔

''یہ لوگ برسوں سے رائج نظام کے ہاتھوں یرغمال بننے والے اپنے غلاموں کا کچھ خیال رکھتے ہیں۔تم یہ دیکھنا۔ڈارلنگ!''

یہ بات مجھ سے میری امریکن دوست کیترین نے کئی روز پہلے اس وقت کہی تھی۔ جب میں نے اپنی بغاوت بارے اسے بتایا تھا۔کیترین کو پیار سے میں درگا ماں کہتا ہوں۔ درگا اُس وقت لیک چارلس

یونیورسٹی میں ڈیپارٹمنٹ آف بائیولوجیکل ریسرچ میں رات دیر گئے تک کام کرنے کے بعد واپس گھر جارہی تھی۔اِس نے میرا فون سنتے ہی کہا۔

''سرخ'میں گھر پہنچ کر تمہیں فون کرتی ہوں۔بس دس منٹ دے دو۔''

گھر پہنچتے ہی اس کی ویڈیو کال آ گئی۔اس کا خیال تھا کہ ہم فاصلوں کے اسیر ہیں تو کیا ہوا' ہم انھیں یوں دور بھی تو کر سکتے ہیں۔میں اس کا کرب سمجھتا ہوں۔وہ ہمیشہ دل کی گہرایوں سے میرے قرب کی متلاشی رہی جب کہ میں عمل کا اسیر تھا خوابوں میں رہنے سے گھبراتا رہا۔

مجھے وہ خوشگوار دن اچھی طرح یاد ہے۔ابھی نائن الیون گزرے تین برس ہی ہوئے تھے کہ عالمی ادارے نے مجھے ویانا سے اپنی ڈاکٹریٹ کے دوران پہلی بار نیویارک میں مختلف یونیورسٹیوں کے طالب علموں کے ساتھ سٹڈی ٹور پر بلایا۔میں اُن دنوں 'عالمی معیشت کا نیا چہرہ' جیسے حساس موضوع پر مقالہ لکھ رہا تھا۔نیویارک میرے خوابوں کا شہر۔مین ہٹن کی درجنوں بلند و بالا عمارتوں پر لگی دیو قامت سینما سکرینیں جس پر دوڑتے پھرتے انسانی تصور سے بڑی انسانی حیات و ممات،خوفناک مونسٹرز کی فلمی لڑائیاں ، انجان طاقتوں کے سرچشمے نئے عالمی کردار سپائیڈر مین سے آئرن مین اور ہیری پورٹر تک انسانی حیات کے محافظ بن کر نیویارک کو ایسے شہر میں بدل دیتے ہیں جو کارپوریٹ دنیا کی اولین ورچوئل آبادکاری میں مضبوط مالی کردار ادا کر رہا ہے۔ایسے شہر سرمایہ کی دوڑ میں خرچ ہو جانے والے ایندھن کی پروا نہیں کرتے صرف انھیں زندہ رکھتے ہیں تاکہ بیک وقت سرمایہ اور نظام دونوں چلتے رہیں۔

اسی سٹڈی ٹور میں مجھے کیترین ملی' جو شام تک میری بہترین دوستوں میں شامل ہو چکی تھی۔ کیترین کا ساتھ،معنی خیز مکالمے،گورے جسم کا حرارت خیز قرب اور نیویارک کی کارپوریٹ فضا نے ترقی پذیر اور پابندیوں میں جکڑے ملک کے شہری کو سحر آگیں کر دیا تھا۔

کیترین یوں تو استاد ہے لیکن ساتھ ہی بہترین آرٹسٹ اور سنگر ہے۔ذہانت و فطانت کی پیکر وہ اپنے ہزاروں مداحوں میں بے حد مقبول۔اس کا سنگ بہاروں میں پھولوں پر اڑتے چہکتے پرندوں جیسا ہے، جنھیں گیت گانے کے سوا اور کچھ نہ آتا ہو۔وہ اِس حبس زدہ اعداد و شمار کی پاور پوائنٹ دنیا میں بادِ نسیم کا ایک مہکتا جھونکا ہے۔میں جب بھی کیترین کی ہشت پہلو فعالیت کو دیکھتا تو نفیسہ کا ہیولہ سامنے ابھر آتا۔وہی قد و قامت، وہی انسانی ہمدردی اور حساسیت' وہی آٹھ ہاتھوں والی میری درگا ماتا دیوی، جو ہمارے جوان ہونے سے پہلے ہی ہم سے بچھڑ گئی اور اب کیترین کے روپ میں سامنے آئی ہے۔

اگلے روز ہمارا پڑاؤ وال اسٹریٹ تھا۔وہ میرے مضمون سے جڑت رکھتا تھا۔وہاں میں کیترین کو

بھول گیا۔عالمی معیشت اوراس کےعظیم گلوبل منصوبوں کی زیرِ سطح خفیف سی جھلک نے میرے اندر عالمی ادارے کو جائن کرنے کا تہیہ جا گزیں ہوگیا۔ جوں جوں میں مالی منصوبوں اوران کی شماریات کے در وبست میں داخل ہوتا گیا مجھ پر گریٹ گیم، انڈر ورلڈ کارپوریٹ،گلوبل امورٹائزیشن اور محدودِ فسکل الٹروزیئم جیسی اصطلاحات اپنی معنیٰ خیزی میں اسیر کرتی رہیں۔ یہ سب اکیسویں صدی کے عالمی خواب تھے۔

اب میں ایک نیا انسان بن چکا تھا۔

''اچھا تو تم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ عالمی ادارہ چھوڑ دو گے۔لیکن وہ ایسا سب کچھ کیوں ہونے دیں گے۔انھوں نےتم پرانوسٹمنٹ کی ہے۔ برسوں ٹریننگ کے بعد تمھیں سلیکٹ کیا ہے۔''

''کیا وہ اپنے مفادات کو یوں زک پہنچنے دیں گے؟''

''کیترین !تم جانتی ہو میں نے اپنی تمام زندگی ہیومن کاز کے لئے وقف اعداد وشمار میں اسیر کر رکھی ہے۔میری معیشت فطری عدل سےشروع ہوکرانسان پرختم ہوجاتی ہے۔میں ڈاروِن کےالٹروزیئم کا قائل ہوں۔''

''لیکن سرخ سنو۔ جب تم جانتے تھے کہ عالمی اداروں میں کیا ہونے جارہا ہے۔اس کے باوجود تم نے حلف لیا۔''

''ڈارلنگ ! میں دھوکا کھا گیا۔ یہ سب سراب تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ہم انسانی تحفظ کی نئ راہیں استوار کرنا چاہتے ہیں۔لیکن یہاں 'سروائول آف دی فٹسٹ' کے معنوں کو بالکل نئ تفہیم دی جارہی ہے۔ اور اِس کے نتائج کو سرمایہ سے منتھی کر کے انسانیت کوروندا جارہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دولت بڑھ جائے اور اس کا ارتکاز چندلوگوں تک سکڑ جائے۔ نیولبرل فلاسفی کا آخری حربہ آزمایا جارہا ہے۔ جب تک حیات کی گلوبل سطح پر عددی کمی نہ ہوگی مثبت نتائج سامنےنہیں آئیں گے۔''

''یہ تمہاری سوچ ہے۔ ممکن ہےان کے ہاں اس عمل کی دوسری شرح ہو۔''

کیترین کی سوچ اب بھی تنقیدی تھی۔

''دیکھو......ڈارون نے کہا تھا۔''میں درمیان میں بول اٹھا۔

''یہ مضبوط ترین اقسامِ نوع کی حیات کا مسئلہ نہیں، نہ ہی ذہین ترین ہونے کا خواب۔ حیاتِ جاوداں اس کی ہوگی جو ارتقاء کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے گا۔''

''تم بائیولوجیکل سائنس کی استاد ہو خوب جانتی ہو۔ کہ انسانی جدوجہد اپنے ارتقاء کے پروسس میں اگر فطری حیاتیاتی زندگی سے مراجعت کرتی ہےتو انسان کامیاب ہے۔ عالمی چیپٹر اس مراجعت کی راہ میں روڑے اٹکانا چاہتا ہےاور غیر فطری انداز میں انسانی حیات کوسکیڑ کر اپنے مفادات کے تحت لانا چاہتا

ہے۔ وائلڈسپیسز کی حیات کوتو پہلے ہی مشکلات درپیش ہیں۔ہم جنگل ختم کرتے جا رہے ہیں۔سرمایہ کی غیر منصفانہ تقسیم دنیامیں ہر قدرتی شے کوکھا رہی ہے۔''

''اچھااب یہ چاہتے کیا ہیں تم سے؟'' کیترین نے پوچھا۔

میں اِس لمحے اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔اس طرح وہ کمزور ہو جائے گی۔

'' کچھ نہیں، بظاہر وہ مجھے سوچنے کا موقع دے رہے ہیں اور مجھے یہاں لیب میں لے آئیں ہیں۔معلوم نہیں کب کیا ہو جائے؟

تاہم میرے لئے یہ سوچنے کا موقع ہے کہ کیا میں ان کا ساتھ دے سکتا ہوں یا نہیں؟اس کے لئے انھوں نے مجھے آج رات تک وقت دے رکھا ہے۔''

''خیرتم ماہر معاشیات ہو،خوب سمجھتے ہو۔یہاں ہمیشہ انسان اور دولت ایک دوسرے سے برسر پیکار رہے ہیں۔تم کسی ایک کا چوائس نہیں کر سکتے۔تمہیں ذہانت کے ساتھ زندہ رہ کر ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔میں تمھارے ساتھ ہوں۔ہم مل کر مقابلہ کریں گے۔''

معصوم کیترین مسلسل بولے جا رہی تھی

''اچھا سنو ہمارا ایک کامن دوست زی چیاؤ جو میرے ساتھ یہیں یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کر رہا تھا،ووہان چلا گیا ہے۔''

کیترین نے مجھے بتایا۔

میرا ماتھا ٹھنکا اور ذہن الجھنے لگا۔زی چیاؤ تو ہماری ٹیم کا ممبر ہے وہ ووہان میں کیا کر رہا ہے۔کیا وہ بھی۔

فوراًہی کال کے دوران میری طرف مسلسل بیپ بجنے لگی۔کچھ گڑبڑ ہے۔کیا گفتگو میں آڈنٹیٹی کوڈ استعمال ہوا ہے جو'ووہان' کا لفظ سنتے ہی ریکارڈنگ پر چلا گیا ہے۔

میں رک گیا۔' آڈیوٹروجن؟؟'میں نے خود سے سرگوشی کی۔

''اچھا میں تمہیں کچھ دیر میں کال کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فوراً فون بند کر دیا۔کال ریکارڈنگ پر چلی گئی تھی۔یہ میری ڈیوائس کا کمال تھا جو کال ریکارڈنگ مطلع کر دیتا تھا۔

فون بند کر کے میں نے سرخ شراب سے چند گھونٹ حلق میں اتارے اور کرسی پر ٹیک لگا کر ریلیکس ہونے کی کوشش کرنے لگا اور خود کلامی میں بڑبڑانے لگا۔

'سرخاب احمد خان......تمارے پاس دو آپشن ہیں۔پہلا کہ غلام بن کر زندہ رہو اور انسانیت کو مار دو،دوسرا کہ باغی بن کر زندہ رہو اور ایکٹیویٹ ہو کر انسان دشمنوں کو ماردو۔تمارے پاس یہی چند گھنٹے ہیں۔

انھوں نے مجھے ایک ڈیوائس دے رکھی ہے جس میں دو بٹن ہیں۔ پہلا آپشن گرین۔ دوسرا سرخ...... بارہ گھنٹے تک میں کوئی بھی بٹن اپنی مرضی سے دبا سکتا ہوں۔اس کے بعد دونوں بٹن بے رنگ ہو جائیں گے۔جس کا مطلب ہوگا کہ مجھے دی گئی سہولت ختم۔اب عالمی چیپٹر اپنا فیصلہ خود صادر کرے گا......میں گداز کرسی پر مزید نیچے سرک گیا۔

آج جب میں پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کی طرف دیکھتا ہوں تو احساس کے ان بن مانگے لمحات کے آنگن میں جو پایا اس میں ملال و رنج سے کہیں زیادہ معصوم خوشیوں کے پوٹلیوں میں بندھے خزینے تھے جو ہم سب سے مل کر بھی ختم نہ ہوتے۔بچپن میں اسکول سے واپس آنے اور ننھا سا پیٹ بھرنے کے بعد بھلا کام ہی کیا ہوتا۔اب تو جو کچھ ہونا ہے وہ شام ہی کو ہوگا۔بھلے اسکول کا کام ہو یا اماں کی ڈانٹ پھٹکار۔یہ چند گھنٹے ہمارے ہیں،صرف ہمارے ہیں۔

سرخ اینٹوں والے گھر سے سجاد نکل آتا جسے ہر وقت فوجی بننے کا شوق ہوتا اور اِس شوق کی تکمیل میں ہمیشہ ایک ننھی سی چھڑی بغل میں دبائے رکھتا۔کونے والے خستہ حال گھر سے بالے کو نکال لیتے۔جس کے ہمہ وقت پاجامے کا آزار بند لٹکا نظر آتا۔ہماری آواز سن کر بڑی حویلی سے بھی تین چار بچے لپک کر گلی میں نکل آتے۔ان بچوں میں سب سے بڑی نفیسہ ہوتی۔نفیسہ ہم سب لڑکوں سے بس کوئی ایک دو برس ہی بڑی ہوگی لیکن قد آور ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ہماری ماں بن جاتی۔اسی کا حکم چلتا۔یہ کھیل ہوگا۔وہ نہیں ہوگا۔ہر لڑائی کے بعد نفیسہ ہماری جج ہوتی۔بھوک لگنے کی صورت یہی ہماری ماں بنتی اور اِن آوارہ زادوں کے لئے دانے دنکے کا بندوبست کرتی۔کسی گھر سے بچے ہوئے پراٹھے نکل آتے،کہیں سے پھل یا ماؤں کی چھپائی ہوئی کھِیل یا مونگ پھلی گجک۔جب کچھ نہ ملتا تو کچی سبزیاں مولی گاجر کھیرے وغیرہ ہم معصوموں کی خوراک ہوتی۔یہ چوری ہمارے گھر سے لے کر ہر اس گھر میں جائز ہوتی،جہاں جہاں تک ہم بچوں کی رسائی ہوتی۔ دوپہر بھر اپنی تنگ سی گلی میں وہ ادھم مچتا کہ خدا بھی شیطانوں کے چیلے آوارہ زادوں سے پناہ مانگتا نظر آتا۔

اُن دنوں بھی جب ہم سب ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے میں اچانک رک کر کسی دیوار کے ساتھ گم سم سا لگ جاتا اور چشم تصور میں نفیسہ کے کندھوں سے نکلے کئی ایک ہاتھوں کو حیرت سے دیکھتا۔میں دم بخود رہ جاتا،جب وہ بچوں کو چھڑی سے مارنے کے جرم میں اپنے ایک ہاتھ سے سجاد کے کندھے پر لگے سٹارز کو نوچتی اور دوسرے ہاتھ سے مجید کا آزار بند باندھ رہی ہوتی۔تیسرے ہاتھ کو دراز کر کے چھت پر بیٹھے کبوتروں کو دانہ دنکا ڈالتی۔جب میری طرف بڑھتی تو ماؤں کی طرح میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی ہوئی نامعلوم محبتوں کا پیغام دیتی۔میری درگا ماں!

نفیسہ کا خیال تھا کہ بچوں کو مارنے سے محلے سے پرندے اڑ جاتے ہیں۔ اور جس محلے میں پرندے نہ ہوں وہاں رزق کی کمی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ رہے محلے والے، یہ کوئی محلے والے تھوڑی تھے، بلکہ ایسے قبیلوں کے چشم و چراغ تھے جو صدیوں سے سفر کرتے اپنے اپنے قافلوں سے بچھڑ کر کسی ایک ایسی گلی میں جمع ہو گئے تھے، جس کی فضا محلے کے پچھواڑے میں لہلہاتے کھیت کھلیانوں کی سوندھی خوشبو سے لبریز تھی۔

اسے قصبے کا آخری سرا سمجھ لیجیے۔ ابتدا میں کسی کی آپسی جان پہچان نا تھی، لیکن ہماری آوارہ گرد زندگی کے بھرپور قہقہوں اور چھتوں پر بھاگ دوڑنے سے محلے کی عورتیں ایسی شیر و شکر ہوئیں کہ محلے کو زندہ کر دیا۔

اب ایسے منفرد خوشیوں بھرے سماج کی آکائی ناتے غربت و افلاس میں بھی ہم نے خوب رنگ جمایا۔ لیکن انجان رستوں میں معاشرتی و اخلاقی تہذیبی ارتقاء غیر محسوس تنزلی کی جانب رواں دواں رہا۔ تاہم انھی خشک بادلوں کے سایہ تلے ہم سب جوان ہوتے گئے۔ تب ہمارا قصبہ اچانک پھیلنے لگا اور اس نے اپنا دامن ہم پر تنگ کر لیا۔ بچھڑنے کا موسم آ گیا۔ میں دارالحکومت چلا گیا جہاں ملکی معیشت کے بنتے بگڑتے اعداد کی شمار نویسی میں مصروف کیا ہوا کہ رفتہ رفتہ 'ترقی' کی منازل طے کرتے ہوئے سینئر عہدوں کی زنجیروں میں قید ہو گیا۔

جہاں ہماری نسل نے فطری ارتقاء کے تقاضے پورے کئے وہیں پچھلی نسل نے اپنا سفر تمام کیا اور عدم کی راہ لی۔ دنیا بھر میں نت نئی سائنسی ایجادات نے عالمی سماج میں تیزی پیدا کر کے انسانوں میں تقسیم کی نئی راہیں ہموار کر دیں۔ کہیں نسلی تو کہیں لسانی۔ مذاہب میں فرقے پہلے سے موجود تھے لیکن ان میں عدم تعاون اور عدم برداشت کے مادے نے سماجی چہرہ بدلنا شروع کر دیا۔ ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست کے نیچے غلام ترقی پذیر ملکوں کا اندراج ہونے لگا اس سے نیچے غریب ملکوں کی ایک طویل فہرست بنتی چلی گئی۔ تب اکیسویں صدی کی پہلی دھائی کی ابتدا میں ایک حادثہ کو جواز بنا کر دنیا بھر کے نظام ہائے حکومتوں میں مرکزی مالی استطاعت پر استعماری اعداد و شمار کا نظام سرفہرست آ گیا۔

انھی دنوں میں نے ویانا سے اپنی ڈاکٹریٹ کے بعد عالمی مالی ادارے کو جائن کر لیا تھا۔ چند برس یوں ہی گزر گئے۔ تب ترقی کر کے ادارے کی ایک سینئر پوزیشن پر مشرق بعید کے ایک ملک میں تعینات ہوا، کہ مجھے حکم ملا کہ فوراً نیویارک پہنچو۔ اگلے دن میں نیویارک میں تھا۔ پوری دنیا سے کوئی دس ملکوں سے سینئر نمائندے میٹنگ ہال میں جمع ہوئے، جہاں سے ہمیں آدھے گھنٹے کی مسافت پر ایک دوسری بڑی سے عمارت میں لے جایا گیا جو چاروں طرف سے سیکورٹی کے حصار میں تھی اور بظاہر ویران و بیابان نظر آتی تھی۔ یہاں ہماری سیکورٹی دوبارہ چیک کی گئی۔ نئے سرے سے بائیومیٹرک ہوا۔ آنکھوں کی پتلیوں کی پہچان پر نئی آئی ڈی اور ایک مخصوص ویکسین کے انجکٹ کرنے کے بعد خون کے نمونوں کا اندراج اس کوڈ آئی ڈی جو

بظاہر ایک کوڈ بار اور میری تصویر پر منحصر تھی پر درج کر کے نیا کارڈ سب کے حوالے کر دیا گیا جو آئندہ سے دنیا کے کسی بھی حکومتی یا خفیہ ادارے میں ہماری رسائی کا عالمی اجازت نامہ تھا۔

جب میٹنگ شروع ہوئی تو ہم سب سے باقاعدہ ایک عالمی حلف نامہ (نان ڈسکلوزر ایگریمنٹ) لیا گیا جس کے مندرجات میں جہاں سیکریسی اور عالمی معلومات کو خفیہ رکھا جانا مقصود تھا وہیں ایک آخری جملہ یہ بھی تھا کہ اگر کسی بھی وقت کسی فرد نے عالمی حلف نامے سے روگردانی کی تو عالمی چیپٹر کے صدر کو یہ اختیار ہو گا کہ اسے عبرت ناک سزا دے۔

ہمیں بتایا گیا کہ یہ سزا ئی زندگی ہوگی جو 'وائرس ایکٹیویشن' سے ہوگی۔ غدار خود زندہ رہے گا لیکن موت کے تباہ کن و تیز ترین پھیلنے والے جرثوموں کا کیریئر ہو گا۔ اس کے قریب پھٹکنے والی ہر زندگی موت میں بدل جائے گی۔ لاکھوں انسانوں میں بیماری پھیلانے کے بعد ایک مخصوص وقت کے بعد خود بھی انھی جرثوموں کے ہاتھوں عبرتناک موت کا شکار ہو جائے گا۔

حلف اٹھانے کے بعد مجھے یکلخت ایسا محسوس ہوا، جیسے اعداد و شمار نے میری عقل و فہم کے غبارے سے ساری ہوا نکال دی ہو۔ جس عمل کی ابتدا میں اس قدر سیکریسی ہو اور خوفناک مقاصد میں الٹے قدموں چلنے پر پتھر بن جانے کا احتمال ہو۔ یقیناً یہ عمل منفی اثرات کا حامل ہے۔ مثبت اثرات کے لئے بنے ضوابط اس قدر مخفی سزا کے حامل نہیں ہو سکتے۔ یہی پہلا خیال ذہن میں کوندا۔

میٹنگ ختم ہونے کے بعد ہم سب حلف یافتہ عالمی افسران کو دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلا دیا گیا کہ اب اس سارے عمل کا فیز ٹو لاگو ہو گا۔ وہ کیا ہو گا ابھی مخفی تھا۔ میرے حصہ میں جنوب مغربی ایشیا کے مالی معاملات کے مستقبل کا پلان تھا۔ اُس دن سے میرے دل میں بغاوت کا ایک طوفان بر پا ہو چکا تھا۔ میں انسان ہوتے ہوئے سرمائے کا غلام بن چکا ہوں میرے لئے یہ قابل قبول نہ ہوا۔

اچانک میرے فون میں ایک بیپ ہوئی جو مجھے اپنے خیالوں سے باہر کھینچ لائی۔ یہ کیترین کا کوڈڈ میسج تھا۔ میسج سکرین پر بار بار فلیش ہو رہا تھا۔ میں نے روک کر اسے پڑھنا شروع کیا۔

''پیریگرائن نے چینی سمندری مچھلی کو جھیل ڈبلیو میں دبوچ لیا ہے۔''

اوہ......توزی چیاؤ کو غدار قرار دے کر ووہان میں ایکٹیویٹ کر دیا گیا ہے۔

میرے لئے یہ ایک خوفناک خبر تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اِن کا پہلا غدار چینی نکلا۔

پہلے میں گمان اور یقین کی کشمکش میں تھا۔ اب اعتماد اور بھروسے کی دنیا میں لوٹ آیا ہوں۔ دنیا کا نقشہ عددی لحاظ سے مختصر، عالمی دولت کی بڑھوتری لیکن پھیلاؤ میں محدود رکھنا اور معاشی لحاظ سے وسائل کی

تقسیم پر مکمل اجارہ داری ہی ان کا مکمل فلسفہ حیات ہے۔ان کے لئے انسانی حیات بیکار شے ہے اس کی سرمائے کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔کیا اسی دن کے لئے میں نے اپنے آدرش پالے۔ کیا یہی وہ میرا سماجی اخلاق ہے کہ میں نفیسہ اور کیترین کو زندگی سے نکال دوں۔اپنی درگا ماں کو بھول جاؤں۔اپنے قصبے اور شہروں کو بھول جاؤں جہاں میری پہچان میری زندگی ہے جو میری روح میں بالیدگی کا سامان پیدا کرتی رہی۔بھوک،کھیل کود،بے سمت زندگی میں ماں نے میرا ہاتھ پکڑا۔آخر مجھے اِن لمحات کا ادھار کس سے چکتا کرنا ہے؟

کون ہے جو اِن عالمی اعداد و شمار کو شفاف بنا کر انسان کے حق میں کردے؟

میری آنکھیں بھرانے لگیں اور شفاف موتی گالوں پر بہنے لگے۔میں نے ایک جھٹکا لے کر سرخ شراب کے پیمانے کو حلق میں انڈیل لیا اور چیخ اٹھا۔

میں ہوں......صرف میں ہوں میری ماں......

یہ میں ہوں میری ماں! مجھے انسان رہنا ہے......انسان کو بچانا ہے۔

میں نے ماں کے ہیولے کو ابھی اپنے اطراف میں دیکھا ہے۔وہ رہی......

درگا ماں کو دیکھتے ہی میں نے غلامی کے سنہرے طوق کو گلے سے نوچ کر اتار پھینکا۔فطری آزادی انسانی زندگی کی معراج ہے اور میں نے ماں کے محبت بھرے لمس کو محسوس کرتے ہوئے سرخ آپشن کا بٹن دبا دیا۔

◀◀ ● ▶▶

Defence Road Lahore Cantt Pakistan
Post code 54792 Ph +92321 8433424

نام کتاب	:	مونتاژ	صنف	:	افسانہ
مصنفہ	:	فارحہ ارشد	سن اشاعت	:	۲۰۲۲ء
قیمت	:	۵۰۰ روپے	صفحات	:	۱۶۶

ملنے کا پتہ

آفس نمبر ۶۔بلاک ۷،سکنڈ فلور،میاں چیمبر،۳ ٹمپل روڈ،لاہور

● محمد جاوید انور

بارِزیست

عبداللہ کو ایک صحت مند نومولود کی شکل میں دین محمد کریانہ فروش کے گھر بھیجا گیا۔ جب وہ بڑا ہوا اور اس نے سوچا کہ ایا اس ساری کاروائی میں اس کا کوئی عمل دخل تھا تو اسے کچھ یاد نہ آیا۔ مذہبی تاویلات بہرحال تھیں جو معاشرتی اثرات کے زیرِ اثر بہت مقبول اور کائناتی سچ کا درجہ رکھتی تھیں۔ عبداللہ دین محمد کی اکلوتی اولاد تھا۔ اسے اپنے باپ کے دین محمد کریانہ سٹور سے کبھی کوئی خاص دلچسپی نہ رہی۔

دین محمد کی دکان قصبہ میں موجود اسی نوعیت کے دیگر دو سٹورز سے زیادہ چلتی تھی کیونکہ اس کی ایمانداری مشہور تھی۔ چیزیں تھوک میں بوریوں یا ٹین کنستر میں بند آتیں اور کریانہ کے گاہکوں کو دوکاندار چھوٹے بڑے ترازو سے تول کر اور بعض اوقات محض قیافے سے آنک کر دے دیتے۔ دین محمد جیسے کھلے دل والے دکاندار ترازو کو تھوڑا سودے کی سمت جھکا چھوڑتے، بلکہ اوپر سے چٹکی بھر اور ڈال دیتے جو اُن کے خیال میں ان کی گاہکی میں برکت کا سبب بنتا۔

سودا عموماً اخبار یا ردی میں بکی پرانی درسی کتب کے پیلے پڑتے کاغذ کا پُڑا بنا کر گاہک کے حوالے کر دیا جاتا۔ پلاسٹک شاپر نامی ماحولیاتی عذاب کا زیادہ رواج نہیں پڑا تھا۔ سادہ سا زمانہ تھا اور بھلے لوگ۔ عدم دلچسپی کے باوجود عبداللہ کو والد کے ساتھ کریانہ سٹور ہی سنبھالنا پڑا کیونکہ وہ ساتویں جماعت میں تین بار فیل ہوا۔ ماسٹر اقبال کا خیال تھا کہ اسے کم از کم اتنا تو پڑھ لکھ لینا چاہیے جو دوکان کا حساب کتاب باسہولت تحریر کرنے کے قابل بنا دے لیکن اس ضمن میں نہ دین محمد کی نصیحت اور مار پیٹ کسی کام آئی اور نہ ماسٹر اقبال کی۔ عبداللہ نے نہ پڑھنا تھا اور نہ پڑھا، بس دین محمد کا مددگار بن گیا۔

زمانہ بہت تیزی سے بدلا۔ قصبہ شہر کی صورت اختیار کرنے لگا۔ نئے سٹور کھلنے لگے۔ وہ لوگ کاروبار میں آ گئے جن کا کسی نے کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ پرانے قصبہ والے بڑھاپے کو پہنچنے لگے۔ نئی نسل کو نہ دین محمد کی مسلمہ دیانت داری کا کوئی لحاظ رہ گیا نہ اُس رواداری کی کوئی فکر جس نے اُن کے بزرگوں کو دین محمد سے خلوص اور اپنائیت کے بندھن میں باندھ رکھا تھا۔ عبداللہ کے خاندان میں اتفاق سے یا قدرت کی کسی نیرنگی کے طفیل کئی پشتوں سے ایک ہی بچے کی روائت چلی آ رہی تھی۔ عبداللہ کی اماں سارے محلے میں

تائی سکینہ کے نام سے جانی جاتی تھی اور بہت بھلی عورت تھی۔سکینہ کی خواہش تھی کہ عبداللہ کے زیادہ بچے ہوں اوراکلوتے کی رسم ختم ہو۔اس مقصد کے پیش نظراس نے اپنے میکے سے ایک سگھڑسی، پانچویں پاس لڑکی شکیلہ،اس کے لیے ڈھونڈھ نکالی۔عبداللہ کی اوائل عمر ہی میں شادی کر کے زیادہ بچوں کی امید باندھ لی گئی کہ بندہ کا کام تو تدبیر کرنا ہی ہے نا۔

شکیلہ بہت اچھی بیوی اور بہو ثابت ہوئی۔دین محمد کی بیوقت موت کے بعد عبداللہ نے بڑی منت سے دکان چلانے کی سرتوڑ کوشش کی۔شادی کے بعد اس نے اپنی بڑھتی ہوئی ذمہ داری کا ادراک کر کے دن رات ایک کر دیا لیکن سب کچھ انسان کے بس میں ہے نہیں۔اگر محنت ہی کامیابی کی ضمانت ہو تو بہت سے تاجور خاک بسر اور خاک نشیں بخت آور بن جائیں۔قدرت کے کارخانے کے بہت سے راز خفیہ ہیں۔بہت سی ہونی انہونیوں کو ہم جب سمجھ نہیں پاتے تو قدرت کے نہ سمجھ میں آنے والے نظام اور مشیت و مقدر کے زمرے میں ڈال دیتے ہیں۔کچھ ایسا ہی عبداللہ کے ساتھ ہوا۔وہ اپنے روائتی سٹور کی بُھر بُھری چٹان کو جدید جنرل سٹورز کے منہ زور سیلاب کے سامنے قائم رکھ سکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا کہ ایک نئی افتاد آ پڑی۔بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر حکومت نے اس،سب تحصیل،کو مکمل تحصیل کا درجہ دے دیا۔سرکاری دفاتر،اور ہسپتال پہلے سے بڑے تعمیر کیے گئے۔اکثر سرکاری عمارتوں کی توسیع ہوگئی۔کچہری کی رونق اور رقبہ دوچند ہو گئے۔قصبہ شہر بن گیا اور گاڑیوں موٹر سائیکلوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔تانگے غائب ہو گئے اور ان کی جگہ بدنما، بے ڈھنگی اور پرشور چنگچیوں نے لے لی۔شہر کی اکہری سڑکیں،جن کے کچے کناروں پر کبھی کمیٹی کی لال رنگی گاڑیاں صبح ہی صبح چھڑکاؤ کرتی تھیں تو کچی مٹی کی مہک دیسی گلاب اور چنبیلی کی خوشبو سے مل کر کمپنی باغ میں سیر کرتے سحر خیز مرد و زَن کے نتھنوں میں گھس گھس جاتی تھی خالی ہی نہ ہو پاتیں کہ چھڑکاؤ کی نوبت آ ئے۔دھول مٹی اور ڈیزل پٹرول کے دھویں کا آمیزہ صبح شام ہوا پر سوار لوگوں کے نظام تنفس کا وہ حال کرتا کہ وہ چنگچی کے سائلنسر بنے پھرتے۔طرح طرح کی بیماریاں عام ہوتی چلی گئیں۔مین بازار کے چوک سے، جہاں عبداللہ کا سٹور تھا، گزرنا محال ہو گیا۔ٹریفک کے مریل سپاہیوں کی سرتوڑ کوشش کے باوجود سارا دن چوک اور چاروں سڑکوں پر ٹریفک بند رہنے لگی۔گاہکوں کا چوک کی دوکانوں تک آنا دوبھر ہوا تو پرانے اور وضع دار گاہکوں نے بھی قدیم شہر کے تنگ گلیوں والے مین بازار کی نسبتاً آسان رسائی والے نئے سٹورز پر قناعت کر لی۔پرانے گاہکوں کو نئے اور کشادہ لیکن جدیدیت کی رعونت اور خشکی لیے جنرل سٹورز سے خریداری میں وہ مزہ بالکل نہیں آتا تھا جو عبداللہ کی پرانی دوکان کی پٹ سن کی بوریوں میں رکھی مختلف اشیاء کی خوشبو سونگھتے سودا بندھواتے ایا کرتا تھا لیکن ان کے بوسیدہ جسم بھیڑ بھاڑ کی مار کھانے کے قابل بھی تو نہیں تھے۔

وقت بہت طاقت ور اور من موجی ہے۔ جب بدلتا ہے تو اس کی سفاک بے نیازی سے جو بھی تہہ و بالا ہو یہ پرواہ ہی نہیں کرتا۔ عبداللہ کریانہ سٹور سے روح نچڑتی چلی گئی۔ عبداللہ کو باپ بھی یاد آتا اور ماں بھی۔ باپ کے سفید بالوں بھرے سینے کی وسعت بڑھاپے تک عبداللہ کے آلام و مصائب کو خود میں سمونے سمیٹنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ اور ماں۔ وہ بے چاری تو عبداللہ کی جلد شادی کر کے بھی پوتا پوتی کو ترستی مر گئی۔ شکیلہ نے سٹور کی آمدن میں کمی ہونے کے باوجود اپنے سگھڑ پن سے گھر کا بھرم بنائے رکھا۔ انہی بڑھتی ہوئی پریشانیوں میں قدرت نے شکیلہ کو امید کی کرن بخشی تو دونوں اپنی نیم تاریک زندگیوں میں روشنی کے منتظر ہو گئے۔ دن گنتے گنتے وہ وقت آ پہنچا کہ جس کے وہ شدت سے منتظر تھے۔ بے وقت ضرورت آ پڑی تو ہسپتال پہنچنے کا انتظام ہونے سے پہلے ہی پڑوس میں رہتی مڈ وائف نے جو محلے میں اچھا خاصہ میٹرنٹی ہوم چلاتی تھی مشکل آسان کر دی۔

شاہد کو ایک چیختے چلاتے بچے کی شکل میں عبداللہ کے گھر پیدا کر دیا گیا۔ بچہ بظاہر صحت مند تھا لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اس کے دیکھنے کے انداز اور ردعمل سے یہ شک پختہ ہوتا گیا کہ شاہد عام بچوں سے قدرے مختلف ہے۔ جب یہ شک یقین میں بدل گیا تو عبداللہ اور شکیلہ ایک شام روتے بسورتے شاہد کو لے کر بچوں کے بڑے ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد اُن کے شک کی تصدیق کی۔ بیج سے نکلتے نازک پودے کو ذرا سا بھی مسل دیا جائے تو وہ فطری نمو سے محروم ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا سلوک شاہد کے ساتھ اس مڈ وائف نے کیا جو اس کے دنیا میں آنے کو مددگار بنی۔ شاہد کے ساتھ کچھ ایسا ہو گیا کہ اس کے دماغ کے کسی خاص حصے کو آکسیجن کی کمی نے متاثر کر دیا۔ مسلا ہوا پودا بچ تو گیا لیکن کمی مستقل رہ گئی۔ شاہد کو لگا روگ عبداللہ اور شکیلہ کی جان کا روگ بن گیا۔ شاہد ان کی واحد اولاد ہی رہا اور اکلوتے کی رسم ادھورے پر جا پہنچی۔ اب شاہد کی پرورش دونوں کی زندگی ٹھہری۔ بچے کے بڑا ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مسائل بڑھتے چلے گئے۔ اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ نہ خود کھا سکتا نہ پہن سکتا۔ پاخانہ پیشاب کروانا صفائی کرنا، کپڑے بدلنا، منہ سے بہتی جھاگ سنبھالنا۔ سب شکیلہ کی ذمہ داری بن گئی۔ گھر کے کام کے علاوہ یہ مشقت شکیلہ کی کمر توڑ کر رکھ دیتی۔ عبداللہ دوکان بھی چلاتا اور موقعہ ملتے ہی گھر بھاگا آتا کہ شکیلہ کا ہاتھ بٹائے۔ اگر کبھی شاہد سو جاتا اور دونوں کو وقت ملتا تو انہیں سمجھ نہ آتا کہ آپس میں کیا بات کریں۔ کتنی ہی بار ہوا کہ ایک دوسرے سے چمٹے رویا کیے۔

قیامت پر قیامت تب آئی جب بقول ڈاکٹر مسلسل مشقت، فکر، اپنی خوراک اور آرام سے پہلو تہی نے شکیلہ کو فشار خون اور ذیابیطس کا مرض لاحق کر دیا۔ اپنے آپ سے لاپرواہی، دواؤں کے استعمال میں بے قاعدگی نے صورت حال بدتر کر دی۔ ذیابیطس نے حسب توقع دیگر اعضائے رئیسہ کو متاثر کرنا شروع کیا

اور بلند فشارِ خون نے ایک کمزور دماغی شریان پھاڑ کر شکیلہ کی مشکل آسان کر دی۔

عبداللہ رات کو دوکان بند کر کے گھر واپس آیا تو کئی بار کھٹکھٹانے پر بھی گھر کا دروازہ نہ کھلا۔ پڑوسیوں کی مدد سے دروازہ توڑ کر گھر میں گھسے تو برآمدے کے ایک نیم تاریک کونے میں ننگی زمین پر آڑی ترچھی پڑی شکیلہ دنیا کے غموں سے آزادی کا جشن منا رہی تھی۔ عبداللہ اپنا سر ماں کی ٹھنڈی چھاتیوں کے نرم سرہانے پر رکھے لیٹا ہنس رہا تھا۔

رونا دھونا، اڑوس پڑوس، عزیز رشتے داروں کا ہجوم، جنازہ، ختم، قُل اور......طویل روح فرسا سناٹا۔

اب عبداللہ دوکان پر جا کر دوکان کھولے اور سودا بیچ کر اپنے اور شاہد کی روزی روٹی، دوا دارو کا بندوبست کرے یا شکیلہ بن کر گھر کی صفائی، جھاڑ پونچھ، چولہا چوکا کرنے کے علاوہ سارا دن شاہد کے پیچھے پیچھے پھر کر اس کے کھانے، پہننے، پاخانہ پیشاب، تھوک جھاگ کا خیال کرے۔

کہتے ہیں کہ عورت اور مرد زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ یہ گاڑی ایسی ہے کہ بعض صورتوں میں ایک پہیہ غائب ہو جانے سے رُکتی نہیں، ایک پہیے پر گھسٹتی رہتی ہے، لیکن بعض صورتوں میں دوسرا پہیہ بدلنے سے لشٹم پشٹم چل پڑتی ہے۔ پھر یہ ایسی گاڑی ہے کہ کبھی اس کے دونوں پہیے مل کر ایک پہیے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ایک پہیہ اسے روانی سے چلاتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں آدھا پہیہ غائب ہو جانے سے باقی بچا آدھا پہیہ گاڑی گھسیٹنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ شکیلہ اور عبداللہ بھی گاڑی کے اکلوتے پہیے کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ جب پہیہ ادھورا ہوا تو گاڑی بالکل رک گئی۔ گھسٹنے سے بھی منکر ہو گئی۔

گاڑی کی بقاء کے لیے عزیز اقرباء اکٹھے ہوئے اور بہت مشوروں کے بعد ایک نیا پہیہ بنام ثریا مہیا کیا گیا کہ زندگی چلتی رہے۔ اس سبیل سے گاڑی چل تو نہ پائی ہاں گھسٹنے ضرور لگی اور یوں کچھ فاصلہ بمشکل طے کر کے پھر رک گئی۔ ادھورے پہیے نے نئے پہیے کو نہ تو بطور اپنا آدھا تسلیم کیا اور نہ دوسرا۔ عبداللہ کو محسوس ہوا کہ اُس کی زندگی کی گاڑی بس اُسی آدھے ادھورے یا دوسرے پہیے سے چل سکتی تھی جو اب تھا ہی نہیں۔

اُف! شکیلہ کیا گئی کہ زندگی کی ہر سبیل بھی ساتھ ہی چلی گئی۔ شکیلہ اور عبداللہ کی گاڑی کا بوجھ بہت بھاری تھا۔ اتنا بھاری کہ کوئی دوسرا اُسے سہار ہی نہیں سکتا تھا۔ اپنوں کا بوجھ بھاری بھی ہو تو ہلکا محسوس ہوتا ہے اور پرایا معمولی بوجھ بھی بہت بھاری لگتا ہے۔ شاہد شکیلہ اور عبداللہ کا اپنا بوجھ تھا۔ وہ اسے اٹھانے پر مائل بھی تھے اور مجبور بھی۔ موجودہ صورتحال میں تو بوجھ بھی معمولی بوجھ نہیں تھا بلکہ ایک پہاڑ تھا جسے سہار لینا، برداشت کرنا کسی بھی غیر کے لیے ناممکن ثابت ہو گیا تھا۔ ثریا خود ابھی اُس عمر میں تھی جب کچے خواب آنکھوں میں سمائے لڑکیاں شادی کے بعد کسی جادونگری کا دروازہ کھولنے کی منتظر ہوتی ہیں۔ یہاں ادھیڑ عمر

عبداللہ کی سنجیدہ بلکہ غمزدہ اور ماتمی باقی ماندہ زندگی اور شاہد کی صورت دن رات کی بھیا نک ذمہ داری ثریا کی منتظر تھی۔ رخصتی کے وقت ثریا کی بیوہ ماں نے لاکھ خاندانی روایات، شرافت، نجابت اور وفا شعاری کے سبق پڑھائے مگر سب بے سُود۔ ثریا میں نہ عبداللہ کو شکیلہ کی کوئی جھلک نظر آئی نہ شاہد کو ماں کا کوئی شائبہ محسوس ہوا۔ یہ بے کیف اور ملول زندگی بس چھ ماہ تک چل سکی۔

ثریا نے ایک دن عبداللہ کی عدم موجودگی میں شاہد کو گھر میں اکیلا چھوڑا اور باہر کے دروازہ کو تالا لگا کر اپنا اٹیچی کیس اُٹھا، ماں کے گھر جا پہنچی۔ ثریا نے صاف صاف بتا دیا کہ چاہو تو مجھے زہر دے دو لیکن اب عبداللہ کا میرے سامنے نام بھی نہ لینا۔ اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ طلاق یا خلع بھی ملے یا نہ ملے، چاہے باقی کی ساری زندگی ماں کے گھر پڑی پڑی سڑ جاؤں اب عبداللہ کے ہاں نہیں جاؤں گی۔ یہ بوجھ اب مجھ سے نہیں اُٹھایا جاتا۔

عبداللہ اور شاہد پھر اکیلے رہ گئے۔ عبداللہ کے لئے ہر وقت شاہد کے ساتھ ساتھ رہنا، اُس کی غُوں غاں کا جواب دینا، اُس کے پاخانہ پیشاب کا خیال کرنا، کھانا پلانا، سلانا نہلانا، کچھ بار نہ تھا۔ اُسے لگتا کہ شاہد اُس کے جسم اور روح کا حصّہ اور اُسی کی ہستی کا جزو ہے۔ اگر عبداللہ کے پاس وسائل ہوتے تو وہ شاہد کے کھانے پینے، رہنے سہنے اور بہلانے پھسلانے میں باقی ماندہ زندگی گزار دیتا۔ مسئلہ تو یہ تھا کہ عبداللہ کو گھر کا خرچ چلانے کے لیے کام بھی کرنا تھا۔ دونوں کو بھوک لگتی تھی۔ کپڑے چاہئیں تھے۔ گھر کی بجلی، گیس کے بل آتے تھے۔ دو جانوں کے لیے زندگی جو بھی مانگتی تھی عبداللہ کو مہیا کرنا تھا۔ پس انداز نہ ہونے کے برابر تھا جو جلد ٹھکانے لگ گیا۔ یار، رشتہ داروں نے کچھ مدد امداد کی لیکن جلد ہاتھ کھینچ لیا۔ اب نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ عبداللہ کے لیے زندگی کے راستے بند ہوتے چلے جا رہے تھے۔

شاہد اپنی دیوانگی اور ذہنی پس ماندگی کے باوجود عبداللہ کو بہت پیار کرتا۔ اُس کا سر چومتا اور اُس کی چھاتی پر سر رکھ کر سوتا۔ کئی بار شاہد اپنی ماں کے پرانے کپڑے نکال لاتا اور انہیں اوڑھتا۔ یوں لگتا کہ کپڑوں سے آتی شکیلہ کی بچی کھچی خوشبو اُسے کسی اور دنیا میں لے جاتی اور وہ آنکھیں بند کر کے مست ہو جاتا۔ عبداللہ یہ دیکھ کر اور زیادہ دکھی ہوتا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ عبداللہ کو زندگی نے اتنا اکیلا کر دیا کہ شاہد کے علاوہ کوئی اس کا پرسانِ حال نہ رہ گیا۔

ایک رات سوچوں نے اسے اتنا مغلوب کیا کہ رات بھر سو نہ سکا۔ فجر کی اذان کے قریب اس کی آنکھ لگی۔ آنگن کی دھوپ نے جب اُسے جگا دیا تو اس نے دیکھا کہ شاہد ویران باورچی خانہ میں گیس کے خالی سلنڈر سے جڑے سرد چولہے کے پاس پڑے دھونے والے برتن چاٹ چاٹ کر اپنی بھوک مٹانے کی

کوشش کرر ہا تھا۔اسے وہ وقت یاد آ گیا جب شکیلہ صبح ہی صبح اس کے لیے دیسی گھی کے پراٹھے تلا کرتی تھی۔ اس کو بہت رونا آیا۔کچھ سوچ کر وہ اٹھا اور شاہد کا ہاتھ پکڑ کر اسے باورچی خانہ سے باہر لے آیا۔اب اسے زندگی ناممکن دکھائی دی۔اس نے بہت سوچا کہ کوئی صورت زندگی کی گاڑی آگے دھکیلنے کی سوجھ جائے لیکن امید کی کوئی کرن تک دکھائی نہ دی۔اسے اپنا ذہن ماؤف ہوتا محسوس ہوا۔دم گھٹنے لگا۔سانس سینے میں اٹک گیا۔وہ گھبرا کر اٹھا۔اس نے شاہد کو گلے لگا کر زور سے بھینچا جیسے خود میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔پھر آہستگی سے شاہد کی ایک ٹانگ گھٹنے کے قریب سے رسی کے ساتھ باندھی،اس کا دوسرا سرا بڑے کمرے کی دہلیز پر لگے آہنی کنڈے کی ہک میں سے گزار کر زور سے باندھا اور کھینچ کر چیک کیا۔

پیچھے دیکھے بغیر عبداللہ نے بیرونی دہلیز پار کر کے باہر کے دروازے کو زنجیر لگائی اور بھاگ پڑا۔گرتا پڑتا بھاگتا بھاگتا وہ قبرستان پہنچا اور شاہد کی ماں کی قبر پر جا گرا۔کچی بھُر بھری مٹی سے مٹھّیاں بھر کر اس نے تھوڑی تھوڑی کر کے مٹی دوبارہ قبر پر گرا دی۔پھر وہ قبر پر لیٹ گیا۔کافی دیر ایسے ہی پڑا رہا۔اس کی زندگی کی گاڑی کا آدھا پہیہ اس سنسان اور خاموش نگری میں ہر چیز سے بے نیاز مٹی کے ساتھ مٹی ہو رہا تھا۔ اسے اپنا ذہن ماؤف اور جسم بے حس ہوتا محسوس ہوا۔بہت سی ہمت جمع کر کے وہ ادھر سے اٹھا۔قبر سے کچھ مٹی اٹھائی اور اپنے چہرے اور سر پر مل لی۔ادھر سے بمشکل اٹھ کر اپنے باپ کی پرانی قبر کے پاس سے گزر کر وہ اپنی ماں کی قبر پر جا بیٹھا۔اس نے اپنے دونوں ننگے ہاتھ اور کہنیوں تک گردآلود بازو ماں کی قبر پر پھیلی لمبی نوکیلی جنگلی گھاس میں پوری قوت سے گھسیڑ دیئے جیسے وہ اس کی ماں کے مہربان جسم کی گداز نرماہٹ کو جا چھوئیں گے۔قبر پر تقریباً نیم دراز ہوتے ہوئے اپنا جھاڑ جھنکاڑ سر اور سرکنڈے جیسے بے ترتیب دور نکلے بالوں سے بھرا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور پوری کھلی،زردی مائل مردہ آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف عجب خالی پن سے دیکھا۔اس کا منہ پورا کھل گیا،کنپٹی کی رگیں تن گئیں اور اس کے منہ سے ایک مہیب غیر انسانی دھاڑ نکلی جو سناٹے کو چیرتی جانے کہاں کہاں پہنچی۔

”اماااااں ں ں ں......“

◀◀ ● ▶▶

11-D Mayo Gardens
Lahore - 54000 Pakistan
Mob: 0300 4404984

● حسن امام

تازہ ہوا کے شور میں

شام کا اندھیرا اٹھتے ہوئے غبار کی طرح آہستہ آہستہ آنگن میں اتر آیا تھا۔نیم کے پیڑ پر چڑیاں دیر ہوئی شور مچا کر خاموش ہو چکی تھیں۔لیکن نیچے کنویں پر سہ پہر کے رکھے ہوئے برتن اب تک پڑے تھے جنہیں کوؤں نے کچھ دانے کی تلاش میں کھینچ کھینچ کر ادھر ادھر پھیلا دیا تھا۔اب اندھیرے میں محض ان کے مدھم خاکے دکھائی دے رہے تھے۔رضیہ دالان میں چٹائی پر اوندھی پڑی،خالی خالی نظروں سے انہیں گھورے جا رہی تھی۔پاس ہی سوئی، دھاگہ اور ایک ادھ سلی قمیض رکھی تھی۔وہ سوچوں میں ایسی غرق تھی کہ اسے بتی جلانے کا خیال بھی نہ آیا۔ کمروں میں آنگن سے زیادہ اندھیرا تھا مگر اس سے بھی زیادہ اندھیرا اس کے دل میں تھا......دل............ جہاں خیالوں اور آرزوؤں کی ایک دنیا آباد تھی۔جہاں ہر طرف اداسی تھی، ویرانی تھی، تاریکی تھی۔دور دور تک نہ کوئی تارہ جھلملاتا تھا، نہ کوئی جگنو اڑتا تھا نہ کوئی آواز آتی تھی۔اندر سے ماں کی کمزور مگر زہر بھری آواز آئی ’’یا اللہ، اب مجھے اٹھا لے یا اس منحوس کو موت دے دے۔اندھیرا ہو گیا ہے مگر ابھی تک بتی نہیں جلائی۔ہائے رے قسمت۔‘‘

رضیہ ایک دم تلملا کر اٹھی، سیدھے باورچی خانے میں جا کر اس نے لالٹین جلائی اور ماں کے کمرے میں لکڑی کے صندوق پر رکھ دی۔ماں نے ناگواری سے اسے دیکھا اور ایسے ہی لہجے میں بولی۔’’اور وہ برتن کیا میرے انتظار میں رکھے ہیں؟‘‘ اور پھر ایک آہ کے ساتھ منہ دوسری طرف پھیر کر بولی ’’خوب جی بھر کے ستا لے، پھر یہ موقع نہیں ملے گا۔‘‘ وہ کمرے سے نکلتے نکلتے رک گئی، پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا۔ایک ہی لمحے میں نہ جانے کتنے شعلوں اور انگاروں بھرے جملے اس نے ضبط کی راکھ تلے دبا دیئے پھر بھی دو ایک چنگاریاں چیخ کر اڑ ہی گئیں۔

’’بس اماں بہت ہو چکی۔ابا کی گالی اور مار میں تمہاری ہمدردی کے سہارے برداشت کر لیتی تھی، لیکن اب تم بھی اس طرح طعنے دیا کرو گی تو تمہارا گھر چھوڑ کر کہیں اور نکل جاؤں گی۔بہت راستے ہیں......‘‘

’’ہاں کیوں نہیں؟‘‘ ماں بیچ میں ہی بول پڑی۔’’شوہر کو چھوڑنے والی اور کر بھی کیا سکتی ہے۔

یہ زہر بھرا تیر ایک دم اس کے کلیجے کے پار ہو گیا۔اس نے بڑی تیزی سے جواب دینے کے لیے منہ کھولا، لیکن گلے میں جیسے پھندا پڑ گیا۔آواز گھٹ گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔کچھ دیر تک وہ ماں کی پشت پر نظریں جمائے رہی، پھر بڑی بے بسی سے نظریں جھکائے ہوئے کنویں کی طرف چلی گئی۔

اب اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ برتنوں کے خاکے بھی اس میں گھل مل گئے تھے۔اس نے ٹٹول کر سارے برتن اکٹھے کیے اور اندھیرے میں ہی اسے دھونے بیٹھ گئی۔یکا یک اس کی آنکھوں میں وہ دن پھر گئے جب گاؤں کے تمام لڑکے اسے پیار اور حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتے۔ان میں سے کئی لڑکوں کو وہ پسند بھری نظروں سے دیکھتی ،پھر بھی اس نے اپنی قسمت ماں باپ کے ہاتھوں میں چھوڑ دی تھی۔اسے بڑے یقین کے ساتھ انتظار تھا کہ ان میں سے کسی کا رشتہ ضرور آئے گا۔وہ گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی اور اسے اس بات کا احساس بھی تھا۔لیکن جب کافی عرصہ گزر گیا اور کہیں سے پیغام نہیں آیا تو اسے الجھن ہونے لگی۔کچھ اور وقت گزرا تو یہ الجھن شدید بے چینی میں بدل گئی......پھر ایک طویل عرصہ گزر گیا۔وہ اس انتظار سے اکتا چکی تھی۔تنہائی میں بیٹھی گھنٹوں سوچا کرتی۔وہ گاؤں کے اُن لڑکوں کے بارے میں سوچتی جو اسے اچھے لگتے تھے۔وہ تصور میں انہیں اپنے قریب لاتی،اتنے قریب کہ ان کے چہرے دھندلا جاتے اور جسم اجاگر ہو جاتے۔کچھ اور عرصہ گزرا تو اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر ایک کمان ہے جو کھنچتی رہتی ہے،اس کا جی چاہتا کوئی اس کمان کو اتنا جھکائے کہ یہ پٹ سے ٹوٹ کر رہ جائے۔

آخر کار اس کے لیے ایک رشتہ آ ہی گیا،بات پکی ہوگئی اور چند مہینوں کے بعد شادی بھی ہو گئی۔ پہلی رات جب اس کے شوہر نے کمرے میں قدم رکھا اور اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو اس کا جی ایک دم سے کمرے سے نکل بھاگنے کو چاہا۔اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا،انہی دھڑکنوں کے درمیان اس نے گاؤں کے ایک ایک لڑکے کو یاد کیا۔گاؤں بھر میں کوئی بھی تو ایسا نہ تھا۔کچے کوئلے کی طرح رنگ،سیاہ گالوں پر ابھری ہوئی ہڈیاں،چپٹی ناک،اوپر کا ہونٹ آگے بڑھا ہوا اور اس کے نیچے پیلے دانت۔یہ سب تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔اس کا خیال تھا کہ کوئی قبول صورت آدمی ہوگا لیکن یہ تو سرے سے آدمی نہیں لگتا تھا۔اچانک اس کے دل میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا۔اس کے شوہر نے جب گھونگھٹ اٹھانا چاہا تو اس نے روک دیا،ہاتھ پکڑنا چاہا تو جھٹک دیا،بات کرنی چاہی تو کوئی جواب نہ دیا۔وہ خاموش بیٹھی اپنی قسمت اور اپنے ماں باپ کو کوستی رہی۔اس کا شوہر دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا پھر ایک طرف لیٹ گیا۔کچھ دیر بعد اس کے خراٹے گونجنے لگے۔اسے شک گزرا کہ کہیں یہ اسے آزمانے کی چال تو نہیں؟ لیکن جب اسے پوری طرح یقین ہو گیا کہ وہ گہری نیند سو چکا ہے تو وہ دبے پاؤں کمرے سے نکلی اور اپنے گھر آ گئی۔

دوسرے دن سارا گاؤں اس کے ماں باپ پر تھوکر رہا تھا۔اس کا باپ جو ایک مدت سے تائب تھا گالیاں بکتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور اسے بری طرح پیٹ کر رکھ دیا۔”کمینی،صورت شکل سے کیا لینا،اس جیسا شریف بندہ پورے گاؤں میں نہیں۔اگر وہ شریف نا ہوتا تو تو کبھی بھی نہیں بھاگ سکتی تھی۔“ وہ غصے سے چنگھاڑتا رہا۔لوگوں کا خیال تھا کہ اب اس کا شوہر کبھی بھی اسے لینے نہیں آئے گا،لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ چند روز بعد ہی بڑے

اطمینان سے اسے لینے آ پہنچا۔ اس کی پیشانی پر کوئی بل نہ تھا۔ اس نے سسرال والوں یا رضیہ کو ایک بھی سخت وسست بات نہ کہی۔ اس طرح خوش خوش لے گیا جیسے پہلے دن لے گیا تھا......مگر اگلی رات وہ پھر بھاگ آئی۔ اس طرح اس کا شوہر ایک بار اور اسے لے گیا مگر وہ بھاگ آئی۔ آخر کار وہ بھی تھک کر بیٹھ گیا اور اسے پھر کبھی لینے نہ آیا۔ اس بات کو کئی مہینے گزر گئے۔ رضیہ کی کوشش ہمیشہ یہی تھی کہ ماں باپ پر بوجھ نہ بنے۔ وہ سلائی میں ماہر تھی، اس سے وہ اتنا کما لیتی تھی کہ اس کے اخراجات پورے ہو جاتے۔ زندگی آسانی سے گزر رہی تھی، اگر کوئی تکلیف تھی تو یہ کہ اس کا باپ ہر روز شراب پینے لگا تھا۔ وہ نشے میں بری طرح گالیاں بکتا آتا اور اسے سارے گھر میں ڈھونڈتا پھرتا۔ پہلے پہل تو اس نے بہت مار کھائی لیکن پھر بچاؤ کی صورت نکال لی۔ وہ اس کی آہٹ پاتے ہی پڑوس میں اپنی واحد دوست نجمہ کے گھر چلی جاتی اور جب تک اس کا باپ جاگتا رہتا وہ گھر میں قدم نہ رکھتی۔ پہلے پہل اس کی ماں اس کے لیے بہت کڑھتی تھی۔ باپ مارنے دوڑتا تو وہ بیچ میں آ کر خود مار کھا لیتی۔ بیٹی کا دکھ اس سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ مگر وہ بھی کہاں تک اس کا ساتھ دیتی۔ باپ کا اٹھنے والا ہاتھ تو وہ پکڑ لیتی تھی، لیکن لوگوں کی چلتی ہوئی زبان وہ کیسے پکڑتی۔ ادھر کچھ دنوں سے ماں کے تیور بھی بدلنے لگے تھے اور اب تو وہ موقع بے موقع باتیں بھی سنانے لگی تھی۔ ماں کی باتیں سن کر اس کا کسی کام میں دل نہ لگتا۔ وہ سوچتی رہی کہ وہ زمین کے سینے پر بوجھ بن گئی ہے۔ اب کیوں نہ اس بوجھ کو ہلکا کر دے۔ لیکن برتن دھوتے دھوتے اس کا خیال بدل گیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ گھر چھوڑ کر چپ چاپ کہیں چلی جائے گی اور محنت مزدوری کر کے اپنی زندگی گزارے گی۔ ابھی وہ دھلے ہوئے برتن رکھ بھی نہ پائی تھی کہ اسے اپنے باپ کی گالیاں سنائی دیں۔ وہ ایک دم برتن پٹخ کر گھر سے نکلی اور لپک کر نجمہ کے گھر میں جا گھسی۔

نجمہ کے گھر میں خلاف معمول بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے بڑے بھائی دو ماہ سے بیمار تھے۔ عجیب بیماری تھی۔ سارا جسم سوج گیا تھا اور چہرہ ایسا بھیانک لگتا تھا جیسے کسی گنہگار کی لاش ہو۔ بھابھی پٹی سے لگی شوہر کا چہرہ تکے جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''آج بھیا کی طبیعت بہت خراب ہے رضیہ۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اب دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔'' نجمہ یہ کہہ کر رونے لگی۔ رضیہ نے اسے گلے سے لگا لیا اور اس کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر دونوں قریب ہی بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئیں۔ کمرے کی بوجھل خاموشی رضیہ کو اپنے گرد بڑی موٹی دیوار کی طرح کھڑی معلوم ہو رہی تھی اور ان دیواروں کے پار اسے اپنے باپ کی گالیاں دور کی آواز کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ اب وہ کافی وقفے کے بعد ایک آدھ گالی یوں بک دیتا جیسے نیند میں بول رہا ہو۔ ماحول کی خاموشی بڑی پر اسرار ہو گئی تھی اور اس پر اسرار خاموشی میں ایک پھولی ہوئی زندہ لاش......یا شاید بے جان......اسے یوں لگا جیسے آس پاس کوئی غیر مرئی مخلوق چل پھر رہی ہے۔

اس پر نیند طاری ہونے لگی۔ ابھی ہلکی سی آنکھ ہی لگی تھی کہ ایک دل دہلا دینے والی چیخ سنائی دی۔ اس نے چونک کر دیکھا نجمہ کی بھابھی اپنے شوہر کے پھولے ہوئے جسم سے لپٹ کر دھاڑیں مار رہی تھی۔ نجمہ بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ وہ پوری قوت سے چلاّئی ''بھیا'' اور بے ہوش ہوگئی۔ تب تک کمرہ پاس پڑوس کی عورتوں سے بھر گیا۔ انہوں نے نجمہ کی بھابھی کو بڑی مشکل سے لاش سے الگ کیا لیکن وہ پھر بھی پچھاڑیں کھاتی ہوئی لاش سے چمٹ گئی۔ ''کہتے تھے تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا......اب کیوں چلے گئے چھوڑ کر؟......بولو......بولو'' وہ ہولے ہولے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ یکا یک وہ اس کے سوجے ہوئے چہرے کو دیوانہ وار چومنے لگی۔ رضیہ کو لگا جیسے اس کا دل کسی بہت بھاری بوجھ تلے کچلا جا رہا ہو۔ ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ پھر اچانک وہ پُر سکون ہو گئی جیسے ذہن سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہو۔ تازہ ہوا کے شور میں وہ نجمہ کی طرف متوجہ ہوئی اور روتی سسکتی نجمہ کو زور سے بھینچ لیا۔ اس کے ہونٹ خود بخود دانتوں تلے دب گئے اور آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلا۔

دوسرے دن گاؤں بھر میں مرحوم کے تذکرے ہوتے رہے، صبح سے شام تک کسی کو کوئی اور بات نہ سوجھی تھی، حتیٰ کہ اس دن رضیہ کے باپ کو بھی لوگوں نے گالیاں بکتے نہ سنا، لیکن تیسرے دن مرحوم کے تذکرے ایک دم سے سرگوشیانہ بھنبھناہٹ میں گم ہو گئے جو گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تیزی سے گشت کر رہے تھے۔ ہر گلی اور ہر گھر میں کچھ اس طرح کی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔

''سنا تم نے! رضیہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کے باپ نے زہر کھا لیا......وہ تو حکیم جی کا اللہ بھلا کرے......آدمی برا سہی، پر بے غیرت نہ تھا......خدا کرے بچ جائے......''

حکیم جی کیا کہتے ہیں؟

''کہا تو ہے کہ بچ جائے گا......مگر بچ جائے تو سمجھو......''

جھٹپٹا ہو چلا تھا، رضیہ کے باپ کا قریبی دوست سلامت اس کی مزاج پرسی کے بعد اس کے گھر سے نکل رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ جب اس نے پہچانا تو حیران رہ گیا، وہ رضیہ کا شوہر تھا۔ کیا وہ اپنی بیوی کو لینے آیا تھا؟ اب اسے کیا جواب دیا جائے؟ ابھی سلامت کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر اس کے پیچھے کھڑی ہوئی ایک لڑکی پر پڑی جو سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی کھڑی تھی صرف چہرہ آدھا کھلا ہوا تھا......اس نے لڑکی کو ذرا غور سے دیکھا، اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

◀◀ ● ▶▶

B-75, Block 15 Gulistan e Jauher Karachi
Cell no . 0300 8245948

● ذکیہ مشہدی

کووڈ کے ماتم دار

پھول سنگھ عرف پھولن گھر لوٹا تو ہاتھ میں آٹا، دال، چاول جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ البتہ مار کھا کے آیا تھا۔

''ارے کیا ہوا کا جل کے پاپا۔'' بیوی گھبرا گئی۔

پھولن نے پولیس والوں کو فراٹے سے گالیاں دیں۔ کہتے تھے کرفیو ہے۔ جانتا نہیں۔ ہم نے کہا کہ گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے۔ آٹا دال لینے جا رہے ہیں وہ بھی اُدھار۔ دوکان کھلنے کا تو حکم ہے تو انہوں نے ڈنڈے مارے اور کہا پانچ بجے دوکان بند کر دینے کا حکم ہے۔

''چھ بجے ہر کوئی بول رہا ہے۔ پانچ بجے کیسے؟'' بیوی بولی۔

سو تو ہم نے بھی کہا تو ہم کو اور ڈنڈے مارے کہا سالے تُو کہیں سے پینے کا جگاڑ کرنے جا رہا تھا۔ ہم نے کہا ماں قسم چار دن سے گلا سوکھا پڑا ہے۔ ایک بوند جو ملی ہو۔ دو ڈنڈے اور مارے۔ تین دن پہلے پی رہا تھا۔ کہاں سے لا رہا تھا؟ راجیہ میں نشہ بندی تو اس سالے کرونا سے بہت پہلے سے ہے۔ ہم تو بول کے پھنس گئے ری سونا۔ ڈر گئے تھے کہیں ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو چار پیسے بھی کہاں سے لائیں گے؟''

''چلو اتنے پر ہی چھوڑ دیا اور جو کہیں بند کر دیتے ماں کے یار اور کہتے بتا شراب کہاں مل رہی ہے تو؟ ہم سے زیادہ تو یہ پیتے ہیں۔''

سونا کو خوب یاد تھا۔ بڑا ہنس ہنس کے محلے میں چرچا ہوا تھا۔ صوبے میں شراب بندی ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ پولیس والوں نے ایک ٹرک پکڑا۔ اس پر تہہ کیے ہوئے دفتی کے کارٹن تھے۔ اتنے کہ ٹرک بوجھ سے ڈگمگا رہا تھا۔ چنگی پر کچھ تکرار ہوئی۔ لو، ان کی تو قسمت کھل گئی۔ دفتی کے تہہ کیے ہوئے بکسوں کی تہوں میں شراب کے کارٹن چھپے ہوئے تھے۔ بس ٹرک ضبط، دارو ضبط، خلاصی، ڈرائیور، مالک سب ضبط۔۔ پھر وہ دارو سے بھرے بکس تھانے سے غائب ہو گئے۔ اخبار والوں نے شور مچایا۔ کچھ پولیس والوں کا انٹرویو لیا۔ پولیس والوں نے کہا تھانے میں چوہے بہت ہیں وہ ساری شراب پی گئے۔ چوہے اور بوتلوں میں بند شراب پی گئے۔ وہ بھی اتنی ساری۔ ارے جھوٹ بولو تو جھوٹ جیسا بھی تو لگے۔ یہ تو جس کے سر پر

تاپ(۱) چڑھ جائے وہ ایسا پرلاپ (۲) کرتا ہے۔ محلے میں کئی گھروں میں ہندی اخبار آتا تھا۔ لونڈے پڑھتے اور ٹھی ٹھی ٹھی کر کے ہنستے۔ سونا بھی لوٹ لوٹ کے ہنسی تھی۔ اس وقت اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ لوٹ لوٹ کے ہنسنے کا تو زمانہ ہی تھا لیکن ابھی اسے پھر ہنسی آ گئی۔ کیوں کہ بات بہت پرانی نہیں تھی۔ وہ ہنسنے لگی ہاہاہا، ہوہوہو، چوہا سب دارو پی گیا۔ دارو پی کے کیا کیا ہوگا۔ دُم پہ کھڑا ہو کے ناچا ہوگا۔ ایک مضحکہ خیز منظر نے اس کے ذہن میں اُبھر کر اس کی فوری پریشانی جذب کر لی۔ ہزاروں چوہے دُم پہ کھڑے ہو کر ناچنے لگے۔ ہو ہو ہو...... ہے بھگوان۔ ہو ہو ہو۔ پھولن نے پاس پڑی لکڑی اٹھا کر بیوی کو رسید کی۔ ہم ڈنڈے کھا کے آرہے ہیں اور حرام زادی ہنس رہی ہے۔ اس کی ہنسی میں بریک لگ گیا۔ ادھر تین سالہ بچی نے چلاّ چلاّ کر رونا شروع کر دیا۔

پھولن محبت کرنے والا انسان تھا، بس کبھی کبھار ہاتھ اٹھا لیتا تھا لیکن ڈنڈا، جوتا وغیرہ اس نے کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ پھر وہ سارے گھونسے لاتیں یا تھپڑ، سب متوقع ہوتے تھے۔ سونا پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا اس لیے آج جو یہ غیر متوقع ڈنڈا پڑا اس کی چوٹ بہت تیکھی تھی۔

''کیوں رے نامردے۔ پولیس کے تو ڈنڈے کھا آیا، یہاں ہم پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ کیا کیا ہم نے؟ بڑا مرد بنتا ہے! پولیس سے ڈنڈا چھین کر انھیں کو مارتا تب جانتے بڑا مرد ہے۔'' ایک تو نامرد کا خطاب اس پر یہ چیلنج۔ پولیس سے ڈنڈا چھیننے اور پھر اسی ڈنڈے سے پیٹنے کی جرأت کا نتیجہ جاہل سے جاہل آدمی جانتا ہے۔ یہاں تک کہ عورت کو بھی جاننا چاہیے جس کو عقل دینے میں، دینے والے نے بڑی کنجوسی سے کام لیا۔ اس نے دو ڈنڈے اور مارے۔ ''پولیس پہ ہاتھ اٹھاتے تو ہمارا منھ دیکھتی؟ ماتھے سے سندور پونچھ دیا جاتا جو ناک تک لگا لگا کے گھومتی ہے۔ چل جا، دیکھ ٹینا (۳)، وِینا ٹٹول کے۔ کچھ ہو تو بنا۔ بٹی جَن کے بیٹھی ہے اور مہارانی بنی پھرتی ہے۔ سونا ابھی تک حیرت اور اہانت کے دوہرے احساس سے باہر نہیں آ سکی تھی۔ رونا گناہ، مائیکے جانا گناہ، زیادہ ساج سنگار کرنا گناہ، اب ہنسنا بھی گناہ ہو گیا۔ ہم اور ہنسیں گے۔ چل مار آ کے۔

اس نے مصنوعی قہقہہ لگایا ہاہاہا، ہوہوہو...... چل مار'' پھولن نے مزید پیٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ قہر آلود نظروں سے گھورتا اپنی چوٹیں سہلاتا، اوسارے میں جا کر بیٹھ گیا اور وہیں سے پکار کر بولا جا۔ جا۔ بنا کچھ۔ ضرور کچھ جگاڑ کر کے رکھے ہوگی۔

''ہاں سب جگاڑ تو ہمیں کو کرنا ہوتا ہے۔ مَوگا (۴)......'' ''تو کچھ کرے گا نہیں۔'' سونا بڑبڑائی۔ اس نے کچھ چاول بچا کر رکھے تھے۔ نمک مرچ بھی تھا اور تھوڑا سا کڑوا تیل بھی۔ ابھی کم از کم دو دن کا انتظام تھا کہ وہ بھوکے نہ سوئیں۔ ہاں یہ کہ صرف بھات اور بھونی مرچ کھانی ہوگی۔ لیکن وہ وہیں پھیل

کر بیٹھ گئی اور تبھی اٹھی جب کا جل نے پکار لگائی۔ بھات دے نامی۔

''اب تو اٹھے گی کہ اب بھی نہ اٹھے گی۔'' پھول سنگھ نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

سونا نے بچی کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا، ایک منھ والے گیس کے اسٹوو پر اَدہن چڑھایا اور چاول دھونے باہرنل پر چلی گئی۔ پولیس والے ڈنڈے ونڈے چلا کے، دوکانیں بڑھوا کے، ٹھیلے والوں کو بھی بھگا کے، کسی سے کچھ پیسے، کسی سے کچھ سبزی۔ پھل وغیرہ وصول کر کے جا چکے تھے۔ سڑک بالکل سونی تھی۔ اس نچلے اور نچلے متوسط طبقے کے علاقے میں گھنی اداسی اُتر آئی تھی جو آج کل ہر شام اندھیرے کے ساتھ اترنے لگی تھی۔ بچے جو پہلے شام ڈھلے باہر سڑک پر آ کر رات تک شور مچا مچا کر کھیلتے رہتے تھے، اب گھروں میں بند تھے۔ پہلے شام تو روز اُترا کرتی تھی، یہ موت کا سناٹا نہیں۔ اس نے لگے ہاتھ المونیم کے برتن میں پینے کا پانی بھی بھرلیا۔ واپس آئی تو اَدہن کھول چکا تھا۔ اس نے جلدی سے چاول ڈالے۔ پک گئے تو پسا کر ان کی گاڑھی ماڑ (۵) ایک بڑے سے کٹورے میں نکالی۔ پھر کر چھل میں تھوڑا سا کڑوا تیل ڈال کر کچھ سرخ مرچیں تلیں۔ پھر اس نے پہلے پھول سنگھ کی تھالی تیار کی۔ بھات نکال کر ایک طرف نمک رکھا، ایک طرف تلی ہوئی مرچیں۔ ایک پیالے میں چاول سے نکلا ہوا ماڑ۔ پھر اس نے بچی کے لیے چاول نکالے۔ ان کے اوپر نمک چھڑکا، تھوڑا سا کڑوا تیل اور دو چمچ ماڑ ڈال کر نوالے بنا بنا کر اس کے منھ میں ڈالے۔ آج کل اسے اور کچھ نہیں مل رہا تھا۔ نہ بسکٹ، نہ کوئی پھل۔ دودھ کی کون کہے اس لیے کھانے بیٹھتی تو چھوٹی تھالی بھر کر بھات ختم کر لیتی۔ سونا کو محسوس ہوا کہ بچی کو کھلانے کے بعد وہ خود کچھ بھوکی رہ گئی ہے۔ اس نے دو گھونٹ بچی ہوئی ماڑ نمک ڈال کر پی اور پتیلی میں جو بچا کھچا چاول تھا وہ شوہر کی تھالی میں ہی ڈال دیا۔ غصے کے باوجود اسے بہت ترس آیا۔ لمبا، چوڑا ہٹا کٹا جوان اور کھانے کو کیا مل رہا ہے۔ بھات اور بھونی مرچ۔ وہ معمولی حیثیت کے لوگ تھے لیکن اس طرح کا کھانا انھوں نے کبھی نہیں کھایا تھا۔ دال، ایک ترکاری اور روٹی چاول۔ ساتھ میں چٹنی۔ اتوار کو پھول سنگھ کی چھٹی ہوتی۔ اس دن ضرور مرغا، مچھلی یا بکرے کا گوشت پکتا۔ جب کبھی ماں کے گھر سے گھی آ جاتا، سونا بیسن کے لڈو بنا لیتی تھی۔ یوں بھی پھولن بچی کے بہانے کوئی نہ کوئی مٹھائی یا چاکلیٹ لیے چلا آتا تھا۔ تیج تہوار پر پوریاں تلی جاتیں، پوے پکتے۔

کا جل پیدا ہوئی تو پھول سنگھ کے ایک ہم کار نے گاؤں سے ایک بکری کا بچہ تحفے میں لا کر دیا تھا۔ اس کے سسرال میں بکریاں پالی جاتی تھیں۔ اس نے بتایا کہ لمبے کانوں والی یہ جمنا پاری بکری بچے کو پلانے کے بعد سیر۔ ڈیڑھ سیر دودھ دے گی۔ بکری کا دودھ بہت مفید ہوتا ہے۔ اور دودھ دے گی کب؟ پھول سنگھ اس انوکھے تحفے پر حیران ہوا۔

''ارے بے وقوف۔ یہ پانچ مہینے کی ہے۔ سال بھر عمر ہوتے ہوتے بکری گابھن ہوتی اور بچے دیتی ہے۔ جاؤ رکھو۔'' سونا کو یہ تحفہ بہت پسند آیا۔ کم خرچ بالا نشین۔ پاس میں پیپل کا درخت تھا۔ وہاں سے پتّے آ جاتے۔ سبزی مارکٹ سے بہت سے پتّے مل جاتے، جو سبزیاں خراب ہوتیں، مل جاتیں۔ باہر بندھی رہتی۔ کوئی جھنجھٹ نہیں تھا۔

بکری نکل گئی بھلا(۲) پھر بھی اس کا ایک فائدہ تھا۔ بچی جب گرد وپیش پہچاننے لگی تو بکری کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی۔ چلنے لگی تو اس کے پاس خود پہنچ جاتی، لمبے لمبے کان پکڑ کر کھینچتی۔ جانور عموماً بچوں کو کچھ نہیں کہتے۔ بکری بڑے آرام سے کان کھنچواتی۔ بیٹھی ہوتی تو کاجل کو پیٹھ پر سوار ہونے دیتی اور اپنی جگالی جاری رکھتی۔ کاجل کھلکھلا کھلکھلا کر ہنستی تو بکری کے گابھن نہ ہونے کا قلق جاتا رہتا۔ جس ''بکری ایکسپرٹ'' نے لا کر دی تھی، اس نے کہا کہ عورتوں کی طرح کچھ بکریاں بھی دیر سے بچہ جنتی ہیں۔ ایک سال نہیں دو، دو نہیں تین۔ منگری گھر کی فرد بن گئی۔

پھول سنگھ ایک پرائیویٹ پریس میں کام کرتا تھا۔ بڑا کارخانہ تھا۔ وہ مشین آپریٹر تھا۔ اتنی تنخواہ مل جاتی تھی کہ آرام سے گزارا ہو جاتا تھا۔ گزشتہ سال مارچ میں پہلی مکمل تالہ بندی ہوئی تو پریس بند ہو گیا۔ دو تین مہینے مالکوں نے تنخواہ دی، پھر ہاتھ روک لیا۔ جب آمدنی ہی نہیں ہے تو ہم کہاں سے لائیں۔ ہمیں تو خود اپنے گھر کے خرچ کم کرنے پڑ رہے ہیں۔ بے شک ان کی عورتوں نے زیور بنوانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اور مردوں نے نئی گاڑی خریدنے کا۔ درمیان میں تالہ بندی میں تخفیف ہوئی، پھر کافی حد تک حالات نارمل ہو گئے لیکن پریس والوں نے تنخواہ میں تیس فی صد کٹوتی کر دی۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کے یہاں کام پہلے کی طرح نہیں آ رہا تھا۔ دعوت نامے، وزیٹنگ کارڈ، لیٹر پیڈ چھپنے تو بالکل ہی بند تھے۔ ہر شخص ان ضروریات کو ملتوی کر رہا تھا یا بالکل ہی ختم کر رہا تھا جو 'ضروریات' کی صف سے نکالی جا سکتی تھیں۔ تبھی وبا کی دوسری لہر نے کرفیو اور پھر مکمل تالہ بندی ایک بار پھر کرا دی۔

پہلے لاک ڈاون میں کاجل کے اسّی فی صد زیور بک چکے تھے۔ وہ سب چاندی کے تھے لیکن بھاری۔ ماں نے شادی پہ دیے تھے۔ چاندی کا بھاو بھی سونے کی طرح کافی بڑھا ہوا تھا اس لیے ان سے کافی دن کٹ گئے۔ بے شک انھیں بھی، اپنا جو بھی معیار تھا، اس سے نیچے اُترنا پڑا تھا۔ سونے کے دو زیور اس دوسری لہر میں بک گئے۔ یہ اسے جان سے زیادہ عزیز تھے۔ ایک انگوٹھی اور ایک جوڑی ٹاپس۔ کہا جاتا ہے سہاگن کے جسم پر تھوڑا سونا ضرور رہنا چاہیے۔ اس نے ناک کی کیل خرید لی تھی تاکہ شگن پورا ہو۔

''اب کیا برتن بھانڈے بیچیں؟ پکائیں کھائیں گے کس میں؟''

''ایک مہینہ اور۔ پھر پریس کھل جائے گا۔''

''ہاں لیکن ایک مہینہ......''

پھول سنگھ، سکندر کو بلا لایا۔ سکندر کی مٹن کی دوکان تھی۔ بکری کم ہوگئی تھی لیکن لشٹم پشٹم کھانے کا جگاڑ ہو جاتا تھا۔

''بکری کا گوشت سستا بکتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''بہلا ہے۔ بچہ ہونے سے بکری خراب ہوتی ہے۔ خصی جیسا گوشت ہوگا۔''

''اب یہ ہم کیسے سمجھائیں گے؟'' سکندر کی دلیل معقول تھی۔

''ٹھیک ہے جو دے دے۔'' پھول سنگھ نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔

بکری تنومند تھی۔ اور تین برس کی ہو چکی تھی۔ انسانوں کے لحاظ سے پچیس سال کی بھری جوانی۔ سکندر چار ہزار دینے کو راضی ہو گیا اور آدھا کلو گوشت۔

سکندر نے آ کر رسّی کھولی تو کاجل نے بڑا ہنگامہ کیا۔ نہیں لے جاؤ، نہیں لے جاؤ۔ سونا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ غلطی ہوگئی۔ خود پھول سنگھ پہنچا آتا تو کاجل سمجھتی نہیں کہ بکری کسی اور کے یہاں جا رہی ہے۔ وہ آ کر اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔ بکری بھی کچھ سمجھ رہی تھی۔ اس نے زور زور سے ممیانا شروع کیا۔ کاجل کی پکڑ ایسی مضبوط تھی کہ سکندر پریشان ہو گیا۔ چھوٹی بچی، چوٹ نہ لگ جائے۔ ادھر کاجل نے گلا پھاڑ پھاڑ کے رونا بھی شروع کر دیا۔

آخر پھولن اٹھا، دو تھپڑ کھینچ کر رسید ھے اس کے چہرے پر رسید کیے پھر اسے گھسیٹ کر تقریباً پٹخ دیا اور سونا پہ چلّایا۔

''ہٹا اسے یہاں سے۔'' بچی سکتے میں آ گئی۔ اسے کبھی مار نہیں پڑی تھی۔ اور یہ۔ یہ تو حد تھی پھول سے جسم کے لیے۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور زبان گنگ ہوگئی۔

اور تب۔ تب لانبے چوڑے ہٹے کٹے پھول سنگھ نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔

☆☆☆

۱۔ تیز بخار......۲۔ ہذیان......۳۔ ٹین......۴۔ زنخہ......۵۔ چاولوں میں زائد پانی ڈال کر نکالا جانے والا اسٹارچ، پیچ۔

۶۔ بانجھ جانوروں کے لیے مستعمل لفظ۔

◄◄ ● ►►

F-1 Grand Pallavi Court
Judges Court Road
Patna-800004

● ھما فلک

ادھورے

اس بہت بڑے میدان میں وہ سب جمع تھے۔ دور دور تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے ان سب نے ہاتھوں میں کتابچے تھام رکھے تھے کچھ کے ہاتھوں میں سیاہ اور کچھ کے ہاتھوں میں سفید رنگ کے کتابچے تھے۔ خال خال ایسے بھی تھے جن کے ہاتھوں میں سنہری کتابچے پکڑے ہوئے تھے۔

سیاہ اور سفید کتابچے تھامے ہوئے لوگوں کے چہروں پر خوف اور ندامت کے آثار صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ منبر کی طرف سے آنے والی آواز کے منتظر امید و بیم کی کیفیت میں کھوئے ہوئے ان چہروں پر ایسی بے چینی مترشح تھی جیسے وہ چاہ رہے ہوں کہ جو ہونا ہے اب ہو ہی جائے، یا ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو سوچ رہے تھے وقت تھوڑا اور رک جائے تھوڑی مہلت اور مل جائے۔

ایک گونجدار آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ پہلا شخص اپنے ہاتھ میں پکڑے کتابچے کو لے کر آگے بڑھا۔ ایک ہرکارے نے اس سے وہ کتابچہ لیا...... اور منبر سے اسے پڑھ کر سنائے جانے کا حکم جاری ہوا۔ کتابچہ پورا پڑھ لیا گیا تو ایک ترازو میں اسے رکھ دیا گیا۔ جس کا کتابچہ سیاہ تھا اس کے چہرے پر مایوسی اور بے اطمینانی کی لہریں صاف نظر آ رہی تھیں۔ کچھ کاغذ کے پرزے لا کر ترازو کے دوسرے پلڑے میں ڈال دیئے گئے جن کے رکھتے ہی وہ کتابچہ اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اسے دائیں طرف ہو کر کھڑے ہو جانے کو کہا گیا۔ اب دوسرے کی باری تھی، پھر تیسرے چوتھے پانچویں کی اور ایک ایک کر کے سب کی باری آ گئی۔ کتابچے پڑھے جاتے رہے اور کسی کو دائیں تو کسی کو بائیں طرف ہو کر کھڑے ہونے کا حکم ملتا رہا۔

ان میں سب طرح کے لوگ تھے۔ تنی ہوئی گردنوں والے، جھکے ہوئے سروں والے طاقتور و توانا۔ مجبور و مجہول چہروں پر اطمینان لئے ہوئے بھی اور بے انتہا بے چین بھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کو مکمل یقین تھا کہ انہیں کس طرف جانے کو کہا جائے گا اس لئے وہ بے پروا نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں کی الگ الگ کیفیات کے باوجود ان سب میں ایک بات مشترک تھی وہ سب 'پورے' تھے۔ سر تا پا مکمل! کسی بھی قسم کی کمی یا خامی سے پاک! امید و بیم اور یقین کی یکساں کیفیات چہروں پر سجائے فیصلوں کے منتظر!

مگر اس میدان میں کئی فیصلے ان کی توقع کے خلاف ہوئے اور کئی ایسے چہرے جو پہلے تو مکمل

لا پرواہ اور پریقین تھے اس وقت حیرت اور غصے کا شکار نظر آرہے تھے۔

''ایسا کیسے ممکن ہے؟''

ایک ہی سوچ اب سب سوچوں پر حاوی ہو چکی تھی۔ بالخصوص وہ جن کے ہاتھوں میں سفید کتابچے تھے لیکن ان کو بائیں طرف جانے کا حکم ملا۔

اب وہ سب دائیں اور بائیں کے دو حصوں میں بٹ چکے تھے۔ دائیں طرف والے شاداں و فرحاں آنے والے وقت کے سرور میں کھوئے ہوئے ستر حوروں کے جلوے کے لئے بے چین شراب اور طہور کا ذائقہ چکھنے کے لئے بے تاب نظر آنے لگے تھے۔

یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ وہ پیچھے مڑ کر یا بائیں طرف والوں کو دیکھتے۔ اس وقت وہ رحم یا تکبر کی ہر کیفیت فراموش کر کے جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے اس کی انہیں پروا نہیں رہی تھی۔ نہ وہ کسی کو جانتے تھے نہ پہچانتے! اس وقت ہر کوئی صرف اپنی خوشی میں مگن تھا۔

بائیں طرف والوں کے ہاتھ میں پکڑے کتابچے ان کے لئے انگارے بن چکے تھے، جنہیں چاہ کر بھی وہ اپنے ہاتھوں سے چھوڑ نہیں پا رہے تھے۔

اپنے انجام کی فکر اور اس سے باخبر ہونے کے باوجود کوئی بھی اپنی جگہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ہر ایک شخص پر ایک ایک ہرکارہ مقرر کر دیا گیا، جو اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے دوسری طرف لے جانے لگا۔ وہ حسرت بھری نظروں سے ان ناچتے گاتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے یہی رقص و سرور تو تھا جس کی پاداش میں ہمیں اب بائیں طرف والا قرار دیا گیا ہے۔ اب بھی تو ان کے چہروں پر وہی خوشی اور خود غرضی ہے جسے عارضی طور پر اپنانے کی مستقل سزا ہمیں سنا دی گئی ہے، اب اسی عارضی ترک پر ان کو مستقل انعام سے کیونکر نوازا جا رہا ہے؟ اور وہ ہرکارے جن سے بہتر اور اشرف ان کو قرار دیا گیا تھا اب ان کو ہی ان کی سزا پر مامور کر دیا گیا ہے۔

لیکن بہت سوچنے کی مہلت دیئے بغیر ان کو وہاں سے لے جایا گیا جبکہ دائیں طرف والے تو ناچتے گاتے پہلے سے ہی وہاں سے جا چکے تھے۔

تاہم ......اب بھی میدان خالی نہیں ہوا تھا۔ وہاں ابھی تیسری قسم کے لوگ باقی تھے۔ جن کے ہاتھوں میں پکڑے کتابچے سنہری رنگ کے تھے۔

مگر وہ سب کے سب 'ادھورے' تھے۔ ان کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ یا تو سرے سے موجود ہی نہیں تھا یا نامکمل تھا۔ کئی ایسے بھی تھے جو ذہنی طور پر پس ماندہ تھے اور کئی ایسے، جو یوں تو مکمل انسان تھے، بظاہر ان

میں کوئی جسمانی کمی یا خامی نہیں تھی، مگر انہوں نے تمام عمر اپنی ذات کے صحراؤں میں بھٹکتے گزاری تھی۔

وہ خود کو کس نام سے پکاریں اور کوئی ان کو کس طرح بلائے ہمیشہ اسی شش و پنج کا شکار رہے۔

ٹٹولتے لنگڑاتے ہوئے اپنے ہاتھوں پیروں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے، ایک دوسرے کی آواز کو ترستے ہوئے اپنی بات کہنے کی حسرت میں بے زبانی کی عمر کاٹے ہوئے ایک دوسرے کے سہارے وہ آگے بڑھ آئے تھے۔

''بے شک تم لوگوں کے ہاتھوں میں سنہری کتابچے ہیں اور یہ کیوں ہیں یہ تم لوگ بھی جانتے ہو۔ تم لوگوں سے کچھ بھی پوچھا یا کہا نہیں جائے گا اور تم لوگ سیدھے دائیں طرف والے لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے، کیونکہ تم لوگ اپنی سزا کاٹ چکے ہو۔''

بے آنکھوں والے اب ایک دوسرے کے چہرے دیکھ پا رہے تھے، بہرے سب آوازیں سن کر حیران تھے، گونگے کچھ نہ کچھ کہہ کر جلدی سے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی لذت سے آشنا، جبکہ لنگڑے بھاگنے دوڑنے اور کسی سہارے کے بغیر چلنے کا لطف اٹھانا چاہ رہے تھے۔

وہ جو اپنی ذات کی شناخت کے لئے بے چین رہتے تھے، انہیں ان کے حلئے کے حساب سے شناخت مل چکی تھی۔ یوم حساب تمام ہو چکا تھا کسی کا اب کچھ بھی بقایا کسی پر نہیں تھا۔ میدان خالی ہونے جا رہا تھا۔ سرخروئی پر سب خوش اور سیاہ روئی پر نادم اپنی اپنی جگہ پہنچ چکے تھے۔ ادھورے بھی اپنی تکمیل کے جوش میں قدم اٹھانے ہی لگے تھے کہ وہ جو تیسرے تھے ان میں سے ایک گونجدار آواز میں بول اٹھا۔

''سب ٹھہر جاؤ! ابھی حساب مکمل نہیں ہوا۔ میں جانتی ہوں ہم سے کچھ پوچھا نہیں گیا ہے اور وہ سزا جو ہم کاٹ چکے اس کا انعام بھی ہمیں مل چکا ہے مگر حساب تو ابھی باقی ہے۔ سوال بھی باقی ہے۔ یہ حساب اب ہم کریں گے۔ ہمیں بتایا جائے کس جرم کس گناہ کے تحت ہمیں یہ پیشگی سزا دی گئی؟ اگر ہمارے ماں باپ میں سے کوئی گناہگار تھا تو سزا اسے دی جاتی ہمیں کیوں ملی؟

اور اگر یہ تمہاری مرضی ہی تھی تو تمہاری یہ مرضی کیوں تھی؟ اگر ایسی ہی مرضی تھی ہمیں ادھورے ہی رکھنا تھا تو وہ جن کو تو نے دائیں طرف بھیجا ہے ان کے دلوں میں ہمارے لئے رحم ہی ڈالا ہوتا وہ تمام عمر ہمارے ساتھ بدسلوکی کرتے رہے۔ ہم اپنی زندگیوں کا بوجھ ہی مشکل سے ڈھوتے تھے، انہوں نے تو ہمیں اپنے جنازے اٹھائے بھٹکنے پر مجبور کر دیا تھا اور تو اور ہم پر تو تمہارے گھر کے دروازے بھی بند رہے ایسے جیسے کہ گھر تمہارا تھا مگر اس پر اختیار ان لوگوں کا تھا جو اب دائیں طرف والوں میں فخر سے شامل ہیں۔

''تم لوگ بھی میرے سامنے موجود ہو اور ہاتھ میں سنہری کتابچے ہیں جو ان کے پاس نہیں

ہیں کیا یہ کافی نہیں؟''

''نہیں! یہ کافی نہیں، تم نے ادھورے ہونے کی اذیت سہی ہے؟ ایک ادھوراپن اس پر ان کے یہ ظلم جن کو بچانے کے لئے یہ دائیں طرف والے راستے بتاتے رہے، یہ پڑھ لینا، یہ کر لینا، معافی ہو جائے گی۔ اس پر محض ایک تیرا نام لے لینے پر عام معافی کا اعلان! یہ دیکھو یہ جس نے تمام عمر بیساکھیوں کے سہارے گزاری ہے اس کی بیساکھیاں چھین کر بھاگ جانے والوں کو تو نے دیکھا؟ اور وہ اندھے جن کو راستہ دکھانے کا کہہ کر کھلے منہ والے گٹر کے کنارے چھوڑ دیا جاتا تھا، اور وہ خود سے بے خبر لوگ جن کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنا کر لذت لی جاتی اور ہوس کا شکار کیا گیا؟''

''سب کو ان کے کئے کی سزا دی گئی ہے اور تم سب کو انعام بھی مل چکا ہے۔ اب اور کیا چاہتے ہو۔ تیسرا چلایا یہ چکر کچھ سمجھ نہیں آیا! وہ جن کو تو نے مکمل رکھا ان کو تو ان کے کئے کا اچھا برا پھل تو نے تھما دیا، ہم نے کیا کیا تھا کہ ہمیں ادھورا رکھ کر دنیا کے جہنم کی سزا دی اور اب یہ انعام دے کر چاہتے ہو کہ وہ زندگی جو ہم گزار آئے ہیں اسے بھول جائیں۔ مگر اب بھی وہ جو اپنے جسموں کے صحراؤں میں اپنے ہی آپ کو تلاش کرتے بھٹک رہے ہیں کیا تم ان کو آنے والی بخشش کا کہہ کر مطمئن کر سکتے ہو؟

تو نے یہ ادھورے بنانے ہی تھے تو اپنے پوروں کے دلوں میں کچھ رحم۔ ہی ڈالا ہوتا۔ اور وہ جنہوں نے ان کے لئے کچھ کیا انہیں تو نے بائیں طرف ہی رکھا انہیں دائیں طرف کا حقدار ہی نہیں سمجھا کہ وہ تیرا نام نہیں لیتے تھے، تجھے نہیں مانتے تھے، تو تو خود کو کامل کہتا ہے، پھر یہ ادھورے؟''

◀◀ ● ▶▶

Straße 32 ,63071 Offenbach am
Main Germany
Mob: 0049 1739054897

محبِّ اردو حمید انور اور بک امپوریم

مصنف	:	ڈاکٹر ممتاز فرح	سن اشاعت	:	۲۰۲۲ء
قیمت	:	۳۵۰ روپے	صفحات	:	۳۳۶

ملنے کا پتہ

بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

● شاہین کاظمی

کھیپ

رات ڈھلے جب اس کے سیمیں بدن کی چاندنی چٹکی تو، بکھری ہوئی اشیاء کھانے کے خالی ڈبوں، گندے کپڑوں اور جوتوں کے باوجود دو کمروں کا وہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ مجھے فردوسِ بریں لگنے لگا۔ میں نے جلدی سے صوفے پر پڑی چیزیں سمیٹ کر اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی، الماری سے گلاس اور قدیم شراب کی پرانی بوتل نکال کر میز پر رکھی اور بتی گُل کر دی۔ چاند سامنے والے گھنے درخت کی پھننگ ہر اٹکا ہوا تھا، دھڑکنیں اچھل پتھل ہونے لگیں۔ میں اِس حاصلِ زندگی لمحے کی عطا سمیٹے زیرِلب وقت کے تھمنے کی مناجات میں مشغول تھا کہ اچانک تیز روشنی کا جھماکا سا ہوا۔

رکیں! شاید مجھے پوری بات سمجھانے کے لیے وقت کی چند پرتیں کھولنا ہوں گی۔ کچھ فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں، کچھ فیصلے واقعی کہیں اور ہوتے ہیں۔ لیکن محبت کا فیصلہ میرا اپنا تھا اور اِس پتھریلی شاہراہ پر اِس تیز گام سفر میں تنہائی کا بھی۔ میں نے یہ جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ کہاں تک میری ہمرکاب ہے، میں تو بس سرپٹ بھاگے جا رہا تھا۔

ہوش وحواس سے بیگانہ۔

شاید میرا شمار عارفین میں ہونے لگا تھا میں سلوک کی اس منزل پر تھا جہاں سارے حجاب اٹھا دیئے جاتے ہیں، تیرگی چھٹنے لگتی ہے، عشق جادے کا ہر ذرہ مشعل بردار نظر آتا ہے۔

میں اس کی محبت میں کہیں بہت دور نکل آیا تھا، اتنا کہ خود اپنے آپ کو پیچھے چھوڑ دیا، اپنی ذات کہیں رکھ کر بھول گیا، میں نے اسے اوڑھ لیا، اُس کی سانسیں پہن لیں، دھڑکنیں، دھڑکنوں میں پرو لیں، اس کی ہلکی نیلی آنکھوں سے چھلکتی حیرت مجھے سرشار کر دیتی۔

''محبت میں ''من تو شدم'' کا مقام خاص عطا ہے..................''

''عطا؟''

''ہاں......وصل کی رت ہو اور کستوری مہکے نہیں، چاند جوبن پر ہو اور سمندر کا سینہ بیتاب نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے، محبت کو اگر محبوب کی روح تک رسائی نہ ہو تو یوں سمجھو دمکتے سورج کو سیاہ بادلوں نے ڈھانپ

لیا ہے۔''

''اتنا مشکل کیوں بولتے ہو؟''

''عشق کا اصل جو ہر حسن ہے جو روح پر وار کر کے گھائل کر دیتا ہے اور لہولہان روح محبت کی دہلیز پر آن گرتی ہے۔''

''مگر حسن فانی ہے۔''

''ہاں ہے تو، مگر میں نے فنا کی بات کب کی؟''

''تو پھر حسن کا پیمانہ کیا ہے؟''

''روح..........محبت فنا کی اسیر نہیں ہوتی۔''

''لیکن فطرت سے بغاوت ممکن ہے نہ فرار۔''

''کیا تکمیلیت فقط فطرت کو سرنگوں کرنے میں ہے؟''

''بھوک آداب بھلا دیتی ہے۔''

''میں راہب نہیں ہوں یہ تم بھی جانتی ہو۔''

میرا عشق زمانے سے ماوراء تھا، لگے بندھے بے وجہ اصولوں سے ہٹ کر، اوّلین محبت ہوتی ہی ایسی بلا خیز ہے، رگوں میں لہو کے ساتھ بہتی ہوئی، آتی جاتی سانسوں میں رچی ہوئی، طلب سے بے نیاز۔

جب پہلی بار میں نے اُسے دیکھا تو کائنات جیسے ساکت ہونے لگی، میں شاید سانس لینا بھول گیا، وہ تھی ہی ایسی، کسی جادوئی سمفنی کے نرم سروں کی طرح سجل، کومل۔

کسی گھائل آہو کی آنکھ میں پھیلتی درد کی لہر کی طرح روح میں چھید کرتی ہوئی۔

نارسائی کی آگ میں جلتے کسی شاعر کی مکمل رباعی جیسی۔

دھندلی سرد رُتوں میں لمحے بھر کی سنہری دھوپ کی مانند۔

سائیکل کے پیڈلز کے ساتھ تیزی سے حرکت کرتے اُس کے دودھیا پاؤں۔

سرد پانیوں کی خنکی لیے اطراف میں بہتی ہوا بہت نرمی سے اُس کی زلفوں کے بل کھول رہی تھی..........میرا دل ہمکنے لگا۔

''کاش وقت اپنی طنابیں کھینچ لے۔''

آج کا دن بھی ہمیشہ کی طرح ایک عام سا دن تھا۔ پیڑوں کے جھنڈ میں چھپی دھند راستوں پر بچھنے لگی تو خنکی کا احساس بڑھ گیا۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا، ایک حسرتِ خام میں پگھلتا وجود لئے

میں نہ جانے کب سے وہیں راستے کی دھول پھانک رہا تھا۔''

بے سدھ اور اردگرد سے بیگانہ۔

قدرے خفت بھرے انداز میں سر جھٹکا کر میں اپنے اپارٹمنٹ کی طرف چل دیا۔

میں یہاں نیا آیا تھا، میری فارماسیوٹیکل کمپنی اِس قصبے کے مضافات میں بنجر زمین پر ایک نیا تحقیقی مرکز تعمیر کرنے کی خواہش مند تھی۔ کم عمر اور ناتجربہ کار ہونے کے باوجود میرا انتخاب کیا جانا ایک طرح سے میری اُن خفیہ صلاحیتوں کا اعتراف تھا جن سے میں خود بھی ناواقف تھا۔ یہ ایک طویل المدتی منصوبہ تھا، اور میں اپنے کام سے پوری طرح آگاہ، اسی لئے بہت آسانی سے قصبے کے ماحول میں ڈھل گیا۔

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔

خاموش اور اُونگتا ہوا۔

اس کے درودیوار سے ٹپکتی کہنگی، مشینی انداز میں اپنے اپنے کاموں میں جُتے لوگ، عجیب سے ٹھس اور بے حس، کبھی کبھی مجھے ان پر روبوٹس کا گمان ہونے لگتا۔ اکثر ان سب کی شکلیں بھی ایک ہی جیسی لگتیں۔ مجھے یہاں آئے کئی ہفتے گزر چکے تھے لیکن اِن لوگوں سے میری واقفیت بس صبح وشام کے سلام تک محدود تھی۔

دن بھر کی ریسرچ کے بعد میں اپنا پیپر ورک مکمل کر رہا تھا کہ اچانک وہی معطر جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا، وہ کہیں آس پاس تھی، باہر سے آتی بھیگی ہوا اس کی مہک چرا لائی تھی۔ میں نے کھڑکی پوری طرح کھول کر ایک گہری سانس لی۔ سامنے والی بلند عمارت کی اوٹ سے طلوع ہوتا چاند۔

قریبی نہر کے سرد پانیوں کو چھو کر آتی خنک ہوا۔

ہلکی سے ''ٹن'' کی آواز مجھے چونکا گئی میرے قدم مجھے جانے کب راستے پر گھسیٹ لائے تھے، اپنی تمام تر دلربائی کے ساتھ وہ میرے سامنے تھی، میری نگاہیں اُٹھیں اور پلٹنا بھول گئیں۔

میں..................

میں عشق کے مراتب سے کب آگاہ تھا حضورِ یار میں حاضری کے آداب سے کب واقفیت تھی مجھے۔

کائناتی بربط سے پھوٹتی اس عشق راگنی پر میرے قدم تو محض دھول اڑا رہے تھے۔

لیکن اس راہ سے پلٹنے کا یارا بھی کب تھا۔

''ٹن......ٹن'' گھنٹی پھر سے بجی تو میں نے بوکھلا کر راستہ چھوڑ دیا وہ دھیمے سے مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

ایک دن اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ اس قصبے میں بہت کم لوگ رہتے ہیں، بڑے شہروں میں

بھی آبادی عمومی طور پر کم ہی تھی لیکن یہ قصبہ تو مجھے کسی آسیبی جگہ کی طرح لگنے لگا تھا۔ گنتی کے چند گنے چُنے گھر اوران کے آدم بیزار مکین۔ ان کی سنجیدگی اور آدم بیزاری میری سمجھ سے باہر تھی۔

''آدم بیزاری'' کا لفظ میں نے اپنے ایک استاد کی زبانی سنا تھا، مطلب نہ سمجھنے کے باوجود مجھے یہ لفظ بہت دلچسپ لگا۔ وہ عمرانیات کے پروفیسر تھے قدیم زبانوں اور اساطیر پر اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔

دل آنگن میں جڑ پکڑنے والی اِس بیل نے میرے وجود کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا تھا، میں تو اس جذبے سے نا آشنا تھا۔

اب ایکا ایکی اس نے مجھے چاروں شانے چت کر ڈالا۔

تمنائیں بھبھوت ملے مجھے ڈرانے لگیں۔

مگر وصل کا کاسہ بھیک کو ترستا رہا۔

ہر دن کا اگتا سورج آشاؤں کے سنہری پیڑ پر چند نئی کونپلیں پھوٹتی دیکھتا اور سمے کے اندھے ساگر میں جا گرتا۔

روح پریم مرلیا پر کسی جوگن کی طرح یوں تھرکتی کہ کائنات بھی وجد میں آتی محسوس ہوتی۔

پیروں سے اٹھتی دھول آسمان چھونے لگتی، وسوسے سوالوں کا روپ دھارے کسی بھکاری کی طرح در پر آن کھڑے ہوتے......کیا راستہ کبھی ہموار ہوگا؟......سوال جواب تلاشتے رہتے......اور میں اسے۔

جس دنیا سے میں تعلق رکھتا تھا وہاں ایسی سطحی سوچوں کی کوئی گنجائش نہ تھی، ہم لوگ تو بس دو اور دو چار کرنے کے قائل تھے، یہ عشق نہ جانے کیسے میرا بَیری ہو گیا تھا۔ ورنہ ایسی محبت تو اب صرف اساطیر میں ہی زندہ تھی۔ اگر کسی کو اِس معاملے کی بھنک بھی پڑ جاتی تو یقیناً ''مجھے مصلوب کر دیا جاتا۔''

مگر عشق سولی سیکب ڈرتا ہے......وہ تو......تن پامال ہو بھی جائے تو بھی نوکِ سناں پر معشوق کی ثنا ترک نہیں کرتا...........

میرا تحقیقی کام ساتھ ساتھ جاری تھا۔ اصل میں مجھے نئی فیکٹری کے ساتھ ساتھ نہر کے اُس پار بنجر زمینوں کو آباد کرنے اور وہاں ایک خاص قسم کی فصل کی کاشت کے بارے میں بھی تحقیق کرنی تھی۔ اُس دن میں نے اُس پار جانے کا سوچا، نہر کے یخ بستہ پانی کو چھو کر آتی ہوا میں نئے موسموں کی باس تھی، نئی رتوں کا سندیس تھا، سیب کے پیڑوں پر اُگے نئے شگوفوں کی مہک تھی.............. کیا وصل رُت آنے کو ہے؟

میں نے مختلف جگہوں سے لیے گئے مٹی کے نمونے چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں بند کر کے بیگ میں رکھے اور جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ وہی معطر جھونکا میرے مشامِ جاں کو مہکا گیا۔ وہ اِسی طرف چلی آ رہی تھی۔

میری سانسوں میں ہیجان برپا ہونے لگا ہمیشہ کی طرح ہوا کی نادیدہ انگلیاں اُس کے بالوں میں اٹکی ہوئی تھیں۔ اچانک میرے ہاتھ پر اُس کی سرد انگلیوں کا لمس جاگ اُٹھا، صدیوں سے پیاسی زمین پر گرنے والی پہلی بوند کی طرح روح پہلا لمس پا کر بے خود ہونے لگی............ عشق جادے کا ہر ذرہ دھمال میں تھا، اندر اُترتا سیرابی کا احساس، نشہ دو آتشہ ہونے لگا،............ آگ بھڑک اٹھی، طور جل رہا تھا...... میں بے اختیار ماتھے کے بل زمین پر گر گیا، میں نہیں جانتا تھا میں کیا کر رہا ہوں، کیوں کر رہا ہوں...... لیکن ایسا ہو رہا تھا............ مجھے اپنے رخساروں پر نمی کا احساس ہوا............ میری روح پگھل رہی تھی، اُس کی نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں، سرخ بھیگے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ لیے وہ بہت اشتیاق سے مجھے دیکھ رہی تھی اندر جلتی آگ یکدم بھڑک کر شعلہ بن گئی۔

''تم یہاں نئے آئے ہو؟'' اُس کی آواز میں سنگی فرش پر بکھرتے موتیوں کا سا ترنم تھا۔

''نہیں............ ہاں............ بس کچھ ہفتے ہی ہوئے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے۔'' میں اپنی اِس لمحہ بہ لمحہ بدلتی کیفیت پر حیران تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' پھر سے موتی بکھیرتی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

''سالار...... میرا نام سالار ہے۔ اور تم؟''

''میں احیاء ہوں۔''

''تم یہیں رہتی ہو؟''

''نہیں میں یہاں مہمان ہوں۔'' اُس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا، اور میں دم بخود...... کسی معمول کی طرح...... یہ سب سمجھنے کی کوشش میں لگا ہوا......................۔

''یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' میں کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔

''شاید میں بغاوت پر اتر آیا تھا، لیکن بغاوت کیسی؟''

اچانک مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی............

''کیا میں ارتقاء کے کسی نئے دور میں داخل ہو رہا تھا؟''

''کیا زندگی دائرۂ اوّل کی طرف گامزن تھی؟''

میں اپنے پروفیسر سے اِس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ میرا اِس وقت اُن سے رابطہ میرے مسائل بڑھا سکتا ہے۔

میں نے قدیم کتابوں میں بہت کچھ پڑھا تھا ایک حساس ادارے میں کام کرنے کی وجہ سے

میری رسائی اُن کتابوں تک ممکن ہوسکی تھی۔ یہ سب کتابیں قدیم لائبریری کے ایک مخصوص شعبے کا حصہ اور عام شہریوں کی دسترس سے دور تھیں۔ اُمید وبیم کی کیفیت سے گزرتے ہوئے میں خود کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔سورج ڈھلنے کو تھا، خنکی بڑھنے لگی۔

رات ڈھلے جب اس کے سیمیں بدن کی چاندنی چٹکی تو ، بکھری ہوئی اشیاء، کھانے کے خالی ڈبوں، گندے کپڑوں اور جوتوں کے باوجود دو کمروں کا وہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ مجھے فردوسِ بریں لگنے لگا۔ میں نے جلدی سے صوفے پر پڑی چیزیں سمیٹ کر اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی، الماری سے گلاس اور قدیم شراب کی پرانی بوتل نکال کر میز پر رکھی اور بتی گُل کردی، چاند سامنے والے گھنے درخت کی پھننگ ہر اٹکا ہوا تھا۔میری دھڑکنیں اتھل پتھل ہونے لگیں۔ میں اُس حاصلِ زندگی لمحے کی عطا سمیٹے زیرلب وقت کے تھمنے کی مناجات میں مشغول تھا کہ اچانک تیز روشنی کا جھماکا سا ہوا۔

”کسی نامعلوم وائرس کی وجہ نئی کلون کھیپ میں معدوم شدہ قدیم انسانی خصوصیات پائی گئی ہیں، اگلی کھیپ تیار کرنے سے پہلے ڈی این اے پر مزید تحقیق ضروری ہے،آؤٹر کور......آٹینشن......دراندازی کے آثار بھی ملے ہیں،آپریشن کلین اَپ شروع کیا جاچکا ہے۔“

ریجنل ڈائریکٹر ہیڈ کوارٹر پیغام بھیجنے کے بعد تیزی سے پلٹا اور کمرے سے باہر نکل گیا، تپائی پر پڑے گلاسوں سے چھن کر آتی سنہری دھوپ زمین پر عجیب زاویئے بنا رہی تھی۔

◀◀ ● ▶▶

Storchen street 1
9008 St. Gallen
Switzerland
0041 791284275

ذکر تیرا بعد تیرے

ترتیب وپیش کش : نزہت جہاں قیصر، محمد خورشید اکرم سوز

سن اشاعت : ۲۰۲۳ء

صفحات : ۳۵۲

ملنے کا پتہ

دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، شوکت علی ہاؤس، پرانی منصفی دربھنگہ

● اقبال حسن آزاد

رکشہ والا

ابھی رات کا ملگجا باقی تھا کہ شرفو کی آنکھ کھل گئی۔کچھ دیر تک تو وہ یونہی اپنی چارپائی پر پڑا پلکیں جھپکاتا رہا۔پھر اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلا اور مٹّی کے آنگن کو عبور کرتے ہوئے پیشاب خانے کی طرف چلا گیا۔رکشے والوں کی اس بستی میں زیادہ تر مکانات مٹّی کے تھے۔ہر مکان میں ایک آنگن ضرور ہوتا تھا۔یہ لوگ مرغیاں اور بکریاں بھی پالتے تھے اور تھوڑی بہت سبزیاں بھی اُگا لیتے تھے۔بکریاں اس وقت سو رہی تھیں لیکن مرغیوں کے کُڑ کُڑانے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس آیا۔اس کی بیوی اور بچے ابھی تک سو رہے تھے۔وہ دوبارہ پلنگ پر لیٹ رہا۔تھوڑی دیر بعد پاس والی مسجد سے اذان کی آواز ابھری تو اس نے چارپائی چھوڑ دی۔وہ نماز کا پابند نہیں تھا مگر جب کبھی اسے خدا یاد آتا تو وہ خدا کے دربار میں حاضر ہو جاتا۔آج بھی وہ وضو کر کے مسجد کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

نماز پڑھ کر واپس آیا تو اس کی بیوی بیدار ہو چکی تھی۔اس نے رات کی بچی ہوئی روٹی اور گڑ کا ایک ڈھیلا تام چینی کی رکابی میں رکھ کر اس کے آگے کر دیا۔اس نے پانی اور گڑ کے ساتھ روٹی کھائی اور رکشہ لے کر کھلی سڑک پر نکل آیا۔

یہ ایک چھوٹا سا نیم خوابیدہ شہر تھا۔یہاں رات کے ہنگامے نہیں ہوتے تھے لیکن صبح صادق سے ہی سڑکوں پر چہل پہل شروع ہو جاتی تھی۔بڑی سڑک پر پہنچ کر اس نے اپنا رکشہ ایک کنارے لگایا اور سامنے والے چائے خانے میں جا کر چائے پی۔اور پھر کسی سواری کا انتظار کرنے لگا۔

سڑک کی دونوں طرف دکانیں تھیں۔پاس کے محلے میں رہنے والے وہاں اپنا روزگار چلاتے تھے۔جب ٹیلیفون عام ہوا اور جگہ جگہ پی سی او کھلنے لگے تو سرفراز نام کے ایک نوجوان نے بھی ایک دکان لے لی۔دوسری جانب کی دکانوں کے آخری سرے پر ایک شخص کے مکان کی باہری دیوار تھی۔اسی دیوار کے سہارے فضلو میاں کی چائے کی دکان تھی۔دکان کیا تھی بس لکڑیوں کو جوڑ کر پٹرا سا بنا لیا گیا تھا۔مکان مالک سنتوشی کب کا مر چکا تھا۔فضلو میاں نے اسی سے بات کی تھی اور کچھ کرایہ بھی طے ہوا تھا۔سنتوشی کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے نے وہ جگہ خالی کروانی چاہی مگر وہ دکان تو ان کی روزی روٹی کا واحد ذریعہ تھی،خالی کیسے

کر دیتے۔ پچاس برس کے فضلو میاں رنڈوے تھے۔ چھوٹا قد، سیاہ رنگ اور دبلی پتلی کایا۔ اکثر دکان کے کنارے اپنی کھٹیا بچھا کر سو رہتے تھے۔

وہ ساٹھ کے لپیٹے میں ایک ایسا شخص تھا جس کی زندگی کا بیشتر حصہ رکشہ کھینچتے گزرا تھا۔ پہلے اس کا باپ یہ کام کرتا تھا لیکن جب اس کی عمر بیس سال کی تھی تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی بہن پندرہ سال کی تھی اور چھوٹا بھائی راجو دس برس کا۔ اس زمانے وہ ایک دبلا پتلا چھریرے جسم کا سانولا سا نوجوان ہوا کرتا تھا۔ اسے تاش کے پتّوں سے دل بہلانے، سینما دیکھنے اور مٹر گشتی کرنے کا بہت شوق تھا۔ مگر جب اس نے ماں کی آنکھوں کی ویرانی دیکھی تو آنگن میں کھڑے رکشے کو نکال کر سڑک پر آ گیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی رکشہ نہیں چلایا تھا۔ ہاں، کبھی کبھی شوقیہ دو چار پیڈل مار لیا کرتا تھا۔ پہلے دن اس نے اتنے پیسے کما لیے تھے کہ گھر کا چولہا جل سکے۔

رکشے کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے جب وہ تھک گیا تو نیچے اتر کر سڑک پر ٹہلنے لگا۔ اسی سڑک پر آگے جا کر ایک سینما ہال تھا۔ اسے یاد آیا کہ اب سے چالیس سال قبل سینما ہال آباد تھے اور پہلا دن، پہلا شو کا کریز نوجوانوں میں عام تھا۔ شہر میں پہلے تین سینما ہال تھے۔ بعد میں دو اور کھل گئے۔ کسی نہ کسی میں کوئی کامیاب فلم لگی ہوتی۔ وہاں تماش بینوں کی بھیڑ ہوتی۔ رکشے والے شو ٹوٹنے سے پہلے وہاں اپنے رکشے لگا دیتے۔ اگر رش زیادہ ہوتا اور مسافر دور کا ہوتا تو منہ مانگا کرایہ بھی مل جاتا۔

دس بج چکے تھے مگر ابھی تک کسی سواری کا پتا نہ تھا۔ وہ سڑک کے کنارے اکڑوں بیٹھ گیا اور پرانی یادوں میں کھو گیا۔

یادیں خواہ صاحبِ زر کی ہوں یا کسی غریب کی، وہ اس کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ انسان کی عمر جب ڈھلان پر ہوتی ہے اور اس کے آس پاس کی دنیا بدلنے لگتی ہے، نئی چیزیں اس کی آنکھوں میں اجنبیت پیدا کرنے لگتی ہیں تو یہی پرانی یادیں اس کے جینے کا سہارا بنتی ہیں۔ وقت کو گزرنا ہوتا ہے، گزر جاتا ہے اور گزرتا ہوا وقت یادوں کی فصل اگاتا ہے۔

اس کا بھائی اور بہن جوان ہوتے گئے اور ماں بوڑھی ہوتی چلی گئی۔ پھر اس کی بہن کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔ چھوٹا بھائی راجو بھی رکشہ چلانے لگا۔ اب اس کی ماں نے اس پر شادی کر لینے کا زور ڈالنا شروع کیا۔ پہلے پہل تو وہ ٹالتا رہا لیکن جب راتوں کی تنہائی میں خون کی روانی سے اس کا جسم سخت اور اس کی بے چین کروٹوں سے پلنگ کی بان ڈھیلی ہونے لگی تو اس نے ماں کی بات مان لی اور اس طرح گھر میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا۔

جس طرح دھوپ، ہوا اور پانی پیڑ پودوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح یہ چیزیں انسانوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ شرفو کی ماں کی ہڈیاں دن بدن کمزور ہوتی گئیں اور چھوٹے بھائی راجو کا بدن روز بروز مضبوط ہوتا گیا۔ اب وہ بھی شادی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ شرفو کے بعد دیگرے دو بچوں کا باپ بن گیا اور گھر میں جانوروں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ بچوں کا شور بھی شامل ہو گیا۔

پھر ایک روز راجو کے سر پر بھی سہرا بندھ گیا۔ لیکن ابھی سہرے کی کلیاں پوری طرح مرجھائی بھی نہیں تھیں کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور جیسا کہ زمانے کا دستور ہے والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد دلوں کا بٹوارہ ہو جاتا ہے سو شرفو اور راجو نے بھی اس چھوٹے سے گھر کا بٹوارہ کر لیا۔

وہ انہی خیالوں میں گم تھا کہ کوئی اس کے رکشے کے قریب آ کر رکا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنے گمچھے سے رکشے کی سیٹ صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے سواری کو رکشے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لیکن بیٹھنے سے پہلے اس نے پوچھا۔

''چوک بازار جانے کا کیا لوگے؟''

''چالیس روپے۔''

''نہیں یہ بہت زیادہ ہے۔ ای رکشہ والے تو دس روپے میں پہنچا دیتے ہیں۔''

اس کی جی آیا کہ کہہ دے کہ تو پھر اسی سے چلے جایئے لیکن پھر جب اسے خالی جیب کا خیال آیا تو بڑی لجاجت سے بولا۔

''اچھا، تیس روپے دے دیجیئے گا۔'' اس شخص نے ہلکے سے سر کو جنبش دی اور رکشے پر بیٹھ گیا۔ اسے یاد آیا کہ جس وقت اس نے رکشہ چلانا شروع کیا تھا، چوک ہو یا اسٹیشن، سنیما ہال ہو یا پارک...... ہر جگہ کا کرایہ ایک روپیہ تھا۔ اس وقت رکشے والوں کی بڑی شان تھی۔ سواری منتیں کر رہی ہے مگر آپ ہیں کہ اکڑے بیٹھے ہیں۔ ''ابھی ہمیں کہیں نہیں جانا، دھوپ بہت ہے۔ آپ کوئی اور رکشہ کر لیں۔'' اور اگر رکشہ پورب کی طرف جا رہا ہے تو کیا مجال کہ پچھّم جانے والوں کو بٹھالے۔ لیکن ای رکشہ جسے عرف عام میں ٹوٹو کہا جاتا تھا، نے آ کر رکشہ والوں کا سارا غرور مٹّی میں ملا دیا تھا۔ اس میں نہ پٹرول بھروانے کا جھنجھٹ تھا نہ ڈرائیونگ لائسنس کی حاجت۔ پچاس روپے میں ریچارج کرواؤ اور فی سواری دس روپے بٹھاؤ۔ ایک روپے سے شروع ہو کر رکشے کا کرایہ ایک سے دو، دو سے چار، آٹھ، دس، بیس اور پچاس روپئے تک جا پہنچا تھا۔ اب سواریاں دس کی جگہ پچاس کیوں خرچ کریں۔ اب تو یہ حالت تھی کہ کوئی سائکل رکشہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

مگر اب وہ دن بس یاد بن کر رہ گئے تھے۔

اسے یاد آیا کہ یہاں کے انگلش میڈیم اسکولوں کی اپنی کوئی بس سروس نہیں تھی چنانچہ وہاں پڑھنے والے بچے ان ہی رکشوں پر سوار ہو کر اسکول جایا کرتے تھے۔ ایک رکشے پر چھ سات بچے ہوتے تھے۔ تین چار بچے سیٹ پر اور باقی لکڑی کے بنچ پر جو رکشے کے پائیدان پر رکھ دی جاتی تھی۔ بچوں کو اسکول پہنچانے کے بعد بنچ اتار کر رکھ دی جاتی اور عام سواریاں ڈھوئی جاتیں۔ بچوں سے ماہانہ کرایہ طے کر لیا جاتا تھا۔ انگلش میڈیم کے اسکول میں رکشہ والوں کے بچوں کو پڑھانے کے لیے الگ سے انتظام تھا۔ ان سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ زیادہ تر رکشہ والوں نے اپنے بچوں کا داخلہ وہاں کروا رکھا تھا۔ شرفو بھی ان ہی لوگوں میں سے تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بچے بڑے ہو کر اس باپ دادا کی طرح رکشہ چلائیں۔

سواری کو بازار میں اتار کر وہ کسی دوسری سواری کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی مشکل سے پانچ منٹ گزرے تھے کہ ایک سپاہی نے اس کے رکشے پر اپنا ڈنڈا بجایا اور نہایت کھردرے لہجے میں اسے وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے سپاہی کی جانب دیکھا اور رکشے کو آگے بڑھا دیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ پھر اپنے علاقے کی طرف پلٹ پڑا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اسے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے رکشہ گھر کی جانب موڑ لیا۔ گھر پہنچ کر اس نے کمائی کے تیس روپے بیوی کے حوالے کیے اور ہاتھ منہ دھو کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ بیوی نے ایک رکابی میں چاول، دال، سبزی اور آم کا اچار رکھ دیا۔ اس نے بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور مزے لے لے کر کھانا کھانے لگا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد اس پر غنودگی سی چھانے لگی اور وہ اسی پلنگ پر لیٹ رہا۔ تھوڑی دیر ہی میں وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

عصر کی اذان سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔ اب اس کے پاس سوائے آدمیوں کو ڈھونے کے کوئی اور کام نہ تھا۔ پہلے رکشے والوں کا ایک کام گیس سلنڈر رلانا بھی تھا۔ وہ ایک ساتھ کئی خالی سلنڈر لے کر جاتے اور بھرے سلنڈر لے کر آتے اور فی سلنڈر پچاس روپے کماتے۔ مگر اب وقت بدل چکا تھا اور جب وقت بدلتا ہے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔

کیا سے کیا ہو گیا دیکھتے دیکھتے۔

گرمیوں کے موسم میں ایک روز فضلو میاں مچھر دانی تان کر سوئے تھے کہ ان کی کھٹیا میں آگ لگ گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ سب لوگ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ جب تک ہلّہ ہوتا اور جاگ پڑتی فضلو میاں جل کر خاک ہو چکے تھے۔ پولس نے تفتیش شروع کی۔ شک کی بناء پر سنتوشی کے بیٹے کو گرفتار کیا گیا مگر وہ جلد ہی چھوٹ کر باہر آ گیا اور جہاں پر فضلو میاں کی دکان تھی وہاں پر اب دُکھن کی دکان تھی۔ جو رکشے

والے پہلے شرفو کی چائے پیتے تھے اب دُکھن کی پینے لگے تھے۔

کیا سے کیا ہو گیا دیکھتے دیکھتے۔

صرف انسان ہی نہیں مرتے، تہذیبیں اور زبانیں بھی مرتی ہیں اور پیشے اور روزگار بھی۔ پہلے سرفراز کے پی۔سو۔او۔ میں فون کرنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ہر چھوٹا بڑا کسی نہ کسی کام سے فون کرنے کے لیے آتا لیکن پھر دھیرے دھیرے فون کی جگہ موبائل نے لے لی اور فون وہاں سے ہٹ گیا۔ اب آس پاس کے لوگ وہاں اپنا موبائل ریچارچ کرنے کے لیے آنے لگے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ 'ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں' تو جب لوگوں کو گھر بیٹھے ریچارچ کرنے کی سہولت حاصل ہوگئی تو یہ سلسلہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ سرفراز نے اب فوٹو اسٹیٹ مشین لے لی تھی اور اب یہی اس کا روزگار تھا۔ مگر شرفو اپنا روزگار کیسے بدلے؟ کئی رکشے والوں دوسرے کام دھندے اپنا لیے تھے۔ چند ایک سبزیاں اور پھل بیچنے لگے تھے۔ کچھ محنت مزدوری کرنے لگے تھے اور دو رکشہ والے تو اچھے خاصے باورچی بن گئے تھے اور شادیوں اور تقریبوں میں پلاؤ، بریانی، قلیہ اور قورمہ بنانے لگ گئے تھے۔ مگر شرفو کو اپنے رکشے سے پیار تھا۔ پہلے وہ اپنے رکشے کو دولہے کی طرح سجا سنوار کر رکھتا تھا۔ خوشنما جھالر اور گھنٹیاں اس کے رکشے کی خاص پہچان تھیں۔ جب وہ دھیرے دھیرے رکشہ چلاتا تو ایسا لگتا جیسے فضاؤں میں کوئی مدھر نغمہ گونج رہا ہو اور جب کبھی اس کے رکشے پر جوان زنانیاں سوار ہوتیں تو وہ ہوا سے باتیں کرنے لگتا۔ ایسے میں گھنٹیوں کی تیز آوازیں اور دبی دبی نسوانی چیخیں اسے ایک خاص لطف و سرور عطا کرتیں۔ مگر اب اس کا رکشہ ایک ایسے خزاں رسیدہ درخت کی طرح ہو چکا تھا جس کے سارے پتّے جھڑ چکے تھے اور زنانیاں اب لیڈیز بن کر آٹو اور ٹوٹو کو رونق بخش رہی تھیں۔ مگر پھر بھی اسے اپنا رکشہ پیارا تھا۔ وہ اسے کیسے چھوڑ دیتا۔ کیا ماں باپ کے بوڑھے ہو جانے پر انہیں چھوڑ دینا چاہیے؟

گزرتے وقت کے ساتھ اس کی آمدنی بہت محدود ہوگئی تھی کیونکہ اب ہر گھر میں ٹی وی آ گیا تھا اور سارے سنیما ہال بند ہو چکے تھے۔ شہر میں دیکھتے ہی دیکھتے اسکول کے لیے پرائیویٹ وین چلنی شروع ہوگئی تھی۔ یہ سستی اور محفوظ سواری تھی۔ اب بچے رکشوں کی جگہ وین سے اسکول جانے لگے تھے۔ دھیرے دھیرے گیس ایجنسیوں نے ہوم ڈیلیوری شروع کر دی اور آمدنی کا یہ راستہ بھی مسدود ہو گیا۔

اس کے چھوٹے بھائی راجو نے اپنا رکشہ بیچ دیا اور بینک سے قرض لے کر ای رکشہ خرید لیا۔ اس کی بیوی نے اسے بھی ایسا ہی کرنے کا مشورہ دیا مگر اسے یہ نئی سواری ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ رکشہ چلاتے وقت وہ خود کو بلندی پر محسوس کرتا اور جب جب بھیڑ میں سے گزرتے وقت تیز تیز گھنٹیاں بجاتا تو اسے خوب مزہ آتا۔ مگر اس سواری پر تو ڈرائیور کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے پہیوں کے ساتھ زمین سے

لگا ہوا لوہے کا ڈبہ۔ اسے دن بھر میں چار پانچ سواریاں بھی مل جاتیں تو وہ خوش ہو جاتا۔ اب نہ تاڑی پینے کی لت باقی تھی اور نہ ہی سنیما دیکھنے کا شوق۔ ایک روز اس کے دوست جمّن نے اپنا ای رکشہ سیکھنے کی غرض سے اس کے حوالے کیا۔ پہلے تو اس نے انکار کیا لیکن جمّن کے بہت زور دینے پر وہ راضی ہو گیا۔ مگر ہائے رے قسمت! ابھی وہ کچھ ہی دور چلا تھا کہ ایکسیڈنٹ کر بیٹھا۔ رکشے کو جو نقصان ہوا سو ہوا، اسے اور جمّن کو بھی بھی چوٹیں آئیں۔ اس کے بعد سے اس نے ای رکشہ کو ہاتھ لگانے سے توبہ کر لی۔

شرفو کو رکشے پر بیٹھے بیٹھے اونگھ آ گئی تھی۔ اچانک کوئی ای رکشہ ایک جھٹکے سے اس کے رکشے کے قریب رکا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا چھوٹا بھائی سواریوں سے پیسے وصول کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر محنت کا پسینہ چمک رہا تھا اور پیسوں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے شرفو پر ایک اچٹتی سی نظر بھی نہ ڈالی اور اپنا ٹوٹو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔

شہر میں رات اتر آئی تھی۔ بجلی گل تھی۔ سڑک پر ٹریفک کم ہو گیا تھا۔ اب کسی سواری کے ملنے کی اُمید نہیں تھی۔ وہ کسلمندی کے ساتھ رکشے سے اُتر پڑا۔ دونوں ہاتھ کو اوپر کر کے اس نے دو تین جمائیاں لیں اور رکشے اپنے گھر کی سمت موڑ دیا۔ آس پاس کی دکانوں سے بیٹری سے جلنے والے بلب اپنی ناکافی روشنی سے رات کی قسمت کا اندھیرا چیرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ شرفو کی کمزور ٹانگیں پیڈل کو گھما رہی تھیں اور رکشے سے ریں ریں کی آواز بلند ہو کر فضاء میں گونج رہی تھی۔

◄◄ ● ►►

Shah Colony
Shah Zubair Road
Munger-811201
Mob: 8210498674

ہارا ہوا ملاح (افسانچے)

مصنف	:	سرور غزالی	سن اشاعت	:	۲۰۲۳ء
قیمت	:	۲۰۰ روپے	صفحات	:	۱۳۲

ملنے کا پتہ

ڈاکٹر سید شاہد اقبال، آستانہ حق روڈ نمبر ۱۰ ویسٹ بلاک، نیو کریم گنج، گیا (بہار)

● سید کامی شاہ

افسانہ ہائے خواب

سڑک پر دوڑتی، بھاگتی، ہانپتی، کھانستی گاڑیوں موٹر سائیکلوں، اور رکشوں کو پار کر کے وہ جیسے ہی گلی میں داخل ہوا اسے لگا کہ اس کا کچھ کہیں رہ گیا ہے۔ وہ رکا، اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ وہاں سناٹا تھا اور سب کچھ ایک خالی پن سے بھرا تھا۔ اور دن اور شام کے درمیان کی کوئی ملگجی سی کیفیت تھی۔ یہ وہ سڑک نہیں تھی وہ جس سے گزر کر آیا تھا۔ وہ بے وقت کی نیند سے جاگا تھا۔ اور باتھ روم میں منہ دھوتے وقت اپنی زیادہ سونے کی عادت پر بیوی کا بے لاگ تبصرہ بھی سنتا رہا تھا۔ تولیے سے منہ ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر آیا تو چھوٹے بیٹے کو سامنے پایا۔

''پھر کوئی نیا سپنا دیکھا بابا؟'' بیٹے نے چمکتی ہوئی پُر تجسس آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''ہاں!'' اس نے کہا اور منہ ہاتھ پونچھ کر تولیہ آئرن اسٹینڈ پر ڈال دیا۔

''گودی لو مجھے......!'' بیٹے نے کہا اور وہ اسے گود میں لئے کچن تک چلا آیا۔

بیوی آستینیں چڑھائے برتن دھو رہی تھی ساتھ ہی اس نے چولہے پر بھی پکنے کو کوئی شے چڑھا رکھی تھی۔ اس نے بیٹے کو نیچے اتارا اور ریفریجریٹر سے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگا لی۔

''گلاس لے لیں......!'' بیوی نے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کتنی بار کہا ہے بوتلوں کو منہ لگا کر پانی مت پیا کریں باقی سب کو بھی پینا ہوتا ہے۔''

''تو دوسری بوتل سے پی لیں......!'' وہ کہنا چاہتا تھا مگر چپ رہا اور بوتل کا ڈھکن لگا کر دوبارہ اسے فریج میں رکھ دیا۔ بڑا بیٹا اپنے پینسل باکس کو کھولے بیٹھا تھا اور ٹوٹی پھوٹی گھسی ہوئی پینسلوں کو صحیح سلامت پینسلوں سے الگ کر رہا تھا۔

''اب دوبارہ تو نہیں سونا بابا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، اب تو نہیں۔'' وہ مسکرایا

''بابا سونے کی مشین!!'' چھوٹے بیٹے نے ننھا سا نقرئی قہقہہ لگایا۔

''سونا مطلب گولڈ۔'' اس نے آگے بڑھ کر اسے گدگدایا۔

''کاش کہ ایسا ہوتا۔'' سنک میں برتن مانجھتی بیوی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اور صابن لگے ڈونگے کواورزور سے گھسنے لگی۔

''بیٹوں کے لیےتو بابا گولڈ ہی ہوتے ہیں، کیوں منا؟''اس نے بڑے بیٹے کومخاطب کیا۔

''میرے بابا سب سے اچھے ہیں۔'' چھوٹا اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''میرے بابا مجھے پلے اسٹیشن بھی دلائیں گے۔''اس نے کئی بار کا کہا ہوا جملہ پھر سے کہا جیسے وہ خودکو یقین دہانی کرا رہا ہو۔

''فرسٹ آنے پر بچو!'' بڑے نے قریب آ کر چھوٹے کے گال پر چٹکی لی۔

''بابا تھرڈ آنے پر بھی دلا دیں گے ناں؟'' چھوٹے نے لاڈ سے کہا۔

''فرسٹ کیوں نہیں منا؟''اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا؟

''بابا میری کلاس میں دولڑکے بڑے تیز ہیں وہی آتے ہیں فرسٹ سیکنڈ۔''اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''ارے تو آپ بھی محنت کرو، لکھنے پڑھنے میں دل لگاؤ تو آپ بھی فرسٹ آ جاؤ گے۔'' وہ کچھ کہے بغیر کمرے میں چلا گیا اور بستہ کھول کر کتابیں نکالنے لگا۔

اسے پتہ تھا کہ چھوٹے کا لکھنے پڑھنے میں دل نہیں لگتا تھا وہ کچھ اور کرنا چاہتا تھا۔ دوڑنے بھاگنے اور کھیلنے کودنے والے کاموں میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا۔ جیسے اسے سونا پسند تھا اور خواب دیکھنا۔ دنیا کے بہت سارے کام جو وہ کر رہا تھا ان میں سے کئی ایسے تھے جو وہ سرے سے کرنا ہی نہیں چاہتا تھا مگر دنیا داری کی خاطر کرنا پڑتے تھے۔ اور جو وہ کرنا چاہتا تھا اس کی فہرست طویل تھی، کئی باتیں اور خواہشیں وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی اور جگہ کسی اور زندگی میں ہونا چاہتا تھا، جبھی تو اسے دوسری دنیاؤں کے خواب آتے تھے جہاں وہ کچھ اور ہو جاتا تھا۔ مگر ہر بار اس کی پسند کی چیزیں نہیں ہوتی تھیں کبھی اسے لگتا وہ کسی غلط جگہ آ گیا ہے یا کہیں کھو گیا ہے۔ گھر گلیاں اور راستے آپس میں مدغم ہو جاتے، کہیں کا راستہ کہیں اور نکل جاتا، گلیاں سڑکوں کو نگل لیتیں اور کردار اپنی جگہیں تبدیل کر لیتے۔ لوگوں کے ہاتھوں میں جلتے بجھتے ٹھیکرے تھے جن میں محبت، نفرت اور لذت کی ایک انوکھی دنیا تھی، تصویروں اور آوازوں کا ایک الگ جہان تھا جو توجہ کا منتظر تھا۔ خبر کی دنیا میں موضوعات بدل چکے تھے اور بستیوں سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ اب نہ عمر کا لحاظ تھا اور نہ صنف کا۔ اور وہ ایک عجیب بے چینی اور بے اعتباری کا موسم تھا۔

''میری بات سن رہے ہیں یا ابھی بھی نیند میں ہیں؟'' بیوی نے جب تیسری بار اسے اشیائے ضروریہ کی فہرست سنانا شروع کی تو چھوٹا بیٹا اپنی مخصوص شرارتی ہنسی ہنسا۔

''بابا کی کلاس ہو رہی ہے۔''
''کھی کھی کھی کھی کھی کھی کھی......'' بڑے نے بھی اپنی لمبی پلکوں والی روشن آنکھیں مٹکائی تھیں۔اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
''چلیں بابا!'' واپس آکے مجھے سپنا سنانا۔پھر میں بھی آپ کو ایک سپنا سناؤں گا۔'' چھوٹے نے کہا۔
''ارے آپ نے کب دیکھا سپنا، آپ سوئے تھے کیا دن میں؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں، سویا تو نہیں۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔
''اسکول میں ہیڈ ڈاؤن کرا دیا تھا ٹیچر نے۔''
ایک وہی تھا جسے اس کے خوابوں میں دلچسپی تھی۔ وہ ہر بار اس کے جاگنے پر پوچھا کرتا تھا سپنے میں کیا دیکھا بابا؟ اور وہ اسے بتاتا تھا ''پروں والی بلی۔''
''پروں والی بلی؟'' وہ حیرت اور تجسس سے آنکھیں مٹکاتا۔
''کالی ہو گی؟''
''اوں ں ں......'' وہ سوچ میں پڑ جاتا۔
''کالی......نہیں......سرمئی......یا کتھئی......یا نیلی......!!!''
''نیلی؟'' وہ ہنستا۔ننھی سی نقرئی کھنکتی ہوئی ہنسی، جیسے کہیں چاندی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریاں بج رہی ہوں۔
''نیلی بلی کیسے ہو سکتی ہے بابا؟''
''ہاں، کبھی ہوتی تو نہیں......مگر خواب تو خواب ہیں ناں منو، خوابوں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے!!!''
''ہاں۔میں بھی اُڑ گیا تھا اک دن سپنے میں بابا!''
وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتا۔
''آپ مجھے ایسے ہوا میں اڑا رہے تھے، پھر میں سچ مچ اُڑ گیا......یوں اوپر......بادلوں میں!'' اس نے ننھے ننھے ہاتھ ہوا میں چلائے۔
''پھر آپ اُڑ کر کہاں چلے گئے؟'' اُس نے اس کے گال کو سہلایا۔
''پھر میں سو گیا، اوپر بادلوں میں......!!!'' اس نے کہا اور اپنی وہی مخصوص شرارتی اور بامعنی ہنسی ہنسنے لگا۔جس میں لاکھوں بھید چھپے تھے۔
اسے یاد آنے لگا۔وہ ایک ٹیڑھی سی گلی تھی جس میں تکونے اور ترچھے مکان بنے ہوئے تھے اور گلیاں سہ راہوں پر ختم ہوتی تھیں جہاں سے نئے راستے نکلتے تھے۔نیم تاریکی میں اکا دکا سائے ادھر ادھر

بے گانگی سے آتے جاتے دکھائی دیتے مگر کوئی کسی سے کچھ کہتا نہیں تھا۔

''میرے ہاتھ گیلے ہیں، پیسے ٹیبل پر رکھے ہیں، یاد سے لے جائیے گا۔'' بیوی بار بار اسی ایک پلیٹ کو مانجھے جا رہی تھی جو کسی بھی طور گندی نہیں لگ رہی تھی۔

باہر سڑک تھی جس پر بہت سی گاڑیاں تھیں اور لوگ تھے جو عجلت کا شکار تھے اور گول لمبوترے اور چوڑے ڈبے تھے جو دو تین اور چار پہیوں پر بھاگتے تھے اور بے ہنگم سا شور تھا اور ایک بے مزہ سا ذائقہ تھا جو سارے میں پھیلا تھا۔ کم اور تیز رفتار سے چلتی گاڑیاں رکشے اور لوگ جو اجنبی تھے اور کہیں پہنچنے کی عجلت کا شکار تھے۔

کہاں جانا ہے ان کو، کیا کرنا ہے جس کی جلدی پڑی ہے؟ اسے یونہی ایک خیال سوجھا۔ گھر، دفتر، نوکری، دوست اور پیسے......!!!

پیسوں سے اسے یاد آیا، درکار اشیا کی فہرست گنواتے ہوئے بیوی نے گیلے سنک پر جو پیسے رکھے تھے وہ انہیں اٹھانا بھول گیا تھا۔ اس نے اپنے لباس کو اس جگہ سے ٹٹولا جہاں عموماً جیبیں ہوتی ہیں مگر اس کے لباس میں کسی جگہ کوئی جیب نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور ذہن میں بیوی کی بتائی ہوئی اشیا کی فہرست چل رہی تھی۔

بازار شروع ہوتے ہی سب سے پہلے کتابوں کی دکان تھی جہاں سے اس بیٹے کے لیے رنگین پنسلیں خریدنی تھیں، اس کے بعد اشیائے ضروریہ کی دیگر دکانیں تھیں اور ٹھیلے تھے جن پر مختلف رنگوں کے پھل رکھے تھے۔ اور لوگ تھے آہستہ اور تیز رفتار سے چلتے اور برقعوں میں لپٹے چھوٹے بڑے نسوانی جسم۔ خود کو ڈھانپنے اور چھپانے کی کوشش میں مزید نمایاں اور کشش انگیز ہوتے ہوئے۔ اسے وہ یاد آنے لگی جو ہمیشہ برقعہ پہن کر آتی تھی اور برقعے سے باہر آتے ہی کچھ اور ہو جایا کرتی تھی۔

عورت کھلنا چاہتی ہے، اپنے اندر کی دنیا کو عیاں کرنا چاہتی ہے مگر صرف اس پر جسے وہ پسند کرتی ہو، ہر ایرے غیرے پر نہیں۔ وہ اس کے سینے کے بالوں سے کھیلتی تھی۔

''تو تم مجھے پسند کرتی ہو۔ اسی لیے میرے سامنے کھلتی ہو؟''

''ہاں!''

''تو کیا میں کہہ سکتا ہوں کہ میں تمہیں سارا دیکھ چکا ہوں؟''

ہاں تو اور کیا، سب کچھ تو دیکھ چکے ہو۔'' وہ خود کو دیکھتی تھی اور بھیدوں بھری ہنسی ہنستی تھی۔

وہ اس وقت بے لباسی کی حالت میں تھے اور وہ لذت و راحت کی کوئی دنیا تھی۔ وہ ہنستی تھی اور فضا میں نقرئی اور کاسنی بھیدوں بھرے رنگ بکھرتے تھے۔

''تو کیا تم اتنی ہی ہو جتنی مجھے نظر آتی ہو؟''

''تو کیا کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ عورت کو پورا دیکھ چکا ہے؟ اور عورت اتنی ہی ہوتی ہے جتنی وہ نظر آتی ہے۔

''اس طرح جیسے تم اس وقت ہو؟'' اس کے پاس سوال بہت تھے۔

وہ سوچ میں پڑ جاتی تھی۔

''بہت مشکل باتیں کرتے ہو تم!!!''

''اس میں مشکل کیا ہے، بتاؤ ناں، تم اتنی ہی ہو جتنی دکھائی دیتی ہو؟'' وہ جاننا چاہتا تھا۔

''مجھے نئیں پتہ۔'' وہ اس کے سینے پر ناک رگڑتی اور اس کے اندر چھپتی چلی جاتی۔

''چلیں بابا......!''؟ بیٹے نے اس کا ہاتھ ہلایا تو اسے یاد آیا۔ ٹریفک سگنل بند ہو چکا تھا اور سامنے کا رستہ کھل چکا تھا۔ دوسری جانب سڑک پر گاڑیوں کی قطار لگی تھی اور سگنل کھلنے کے انتظار میں تھی۔ گھر سے ان دکانوں کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ تقریباً سبھی دکاندار اور ٹھیلے پتھارے والے اسے جانتے تھے۔ مگر سڑک پار کرتے ہی اسے لگا کہ وہ کسی اجنبی دنیا میں آ گیا ہے ہر طرف ایک بے گانگی پھیلی تھی اور کہیں کوئی شناسائی نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے دکاندار سے اپنی مطلوبہ اشیا مانگیں جو اس نے ایک کے بعد ایک شاپر میں ڈال کر اس کی طرف بڑھائیں اور بے نیازی سے کسی اور کام میں لگ گیا۔

گلی میں داخل ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ بیٹا اس کے ساتھ نہیں ہے۔

ریفریجریٹر میں پانی کی بوتلیں رکھتے ہوئے وہ جھکی ہوئی تھی اور اسے مسلسل ہدایات دیئے جا رہی تھی۔

''سیون اپ نہ ملے تو سپرائٹ لے آنا......اور ہاں صبح ناشتے کے لیے......اور وہ مچھر مار اسپرے، رات حرام کر دیتے ہیں کم بخت......!''

اس کے دماغ میں نیلگوں دھواں بھرنے لگا۔ ایک سڑک بدلنے سے سب کچھ کتنا بدل گیا تھا۔

''ارے، کہاں گیا، ابھی تو یہیں تھا!'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا کہاں گیا؟''

''آپ بھی ناں حد کرتے ہیں، یہ رکھا ہوا تو ہے یہاں......!'' بیوی نے سائیڈ ٹیبل پر دھرا چشمہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے چشمہ اس کے ہاتھ سے لیا اور بغیر کچھ کہے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ابھی واش روم سے ہو کے آتی ہوں۔'' بیوی نے کہا اور بیڈ سے نیچے اتر کر واش روم کی طرف جانے لگی۔ وہ اس کی پشت کو دیکھنے لگا۔ بھری بھری گوری اور گداز پشت تھی جس پر اس وقت کوئی پردا نہیں تھا۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی واش روم کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اسے مختلف طرح کے ملبوسات میں بھی دیکھ چکا تھا مگر وہ ہر بار لباس سے آزاد ہونے کے بعد ایک نئی طرح کی دلکشی کے ساتھ دکھائی دیتی تھی۔ وہ اس کی پشت کو دیکھتا رہا، بھری بھری گداز اور دلکش۔ اس وقت وہ

اسے کوئی اور عورت لگی۔اس کا پورا بدن برقعے میں چھپا تھا اور وہ سبک روی سے اس کے آگے آگے چلتی جا رہی تھی۔ وہ چور نگاہوں سے اسے دیکھتا اور کبھی اپنے ساتھ چلتے بیٹے کو۔ اگر بیٹے کو پتہ چل گیا کہ میں اس عورت کی پشت کو دیکھ رہا ہوں تو وہ کیا سوچے گا؟ مگر اتنے سے بچے کو کیا معلوم؟ اس نے سر کو جھٹکا اور تیز تیز چلتا ہوا اس سے آگے نکل گیا۔ جس عورت کی پشت حسین ہو اس کا چہرہ دیکھنے کو کیوں جی چاہتا ہے؟ اس نے گردن کھجانے کے بہانے مڑ کر اس طرح اسے دیکھا کہ بیٹے کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ پیچھے آتی عورت کو دیکھ رہا ہے۔ وہ ایک پختہ عمر کی بدصورت اور کرخت سی عورت تھی، جس کی چھاتیاں بڑی تھیں اور اس کے چلنے سے ہلتی تھیں، جیسے اس کے بھرے بھرے کولہے ہلتے تھے، برقعے میں چھپے ہوئے مگر اپنی موجودگی کا اعلان کرتے ہوئے۔ وہ بیٹے کا ہاتھ تھامے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ قریب سے چست پتلون پہنے ایک مرد گزرا اور تیز تیز چلتا ہوا ان سے آگے بڑھ گیا اس نے اس کی پشت پر نگاہ کی اور سوچنے لگا اسے کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگا......اس کی جگہ کوئی عورت ہوتی تو......اسی طرح کی چست پتلون پہنے کولہے مٹکا کر چلتی ہوئی تو کیا وہ اسی بے نیازی سے اسے دیکھتا؟

''کون کہتا ہے پٹھان بے وقوف ہوتے ہیں؟'' اسے بڑے لڑکے کی آواز سنائی دی۔

''سارا دن لکڑی کی گاڑی میں آگ جلا کر گھومتے رہتے ہیں۔''

وہ حیران ہو کر سوچنے لگا۔ اس رخ سے تو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا، لکڑی کی گاڑی میں جلتی آگ روزی کا بندوبست کرتی تھی اور اسی آگ پر روٹی پکتی تھی۔ آدمی بھی تو کاٹھ کا پتلا ہے جس میں آگ جلتی ہے اور ہر تگ و دو بالآخر روٹی پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ مگر آدمی میں صرف روٹی اور آگ ہی تو نہیں ہے ناں......آدمی کے اندر تو اور بھی کئی کائناتیں ہیں۔ جیسے رحمان شیطان نہیں ہو سکتا اور شیطان رحمان نہیں ہو سکتا مگر انسان کے اندر دونوں بڑے ٹھاٹ سے رہتے ہیں اور وہ ان دونوں کے بیچ اپنے اصل کے تعین میں عمر گزار دیتا ہے۔ دل اور دماغ کے بیچ نیلگوں دھواں بھرا ہوا تھا۔ وہ اس لمبے قد کے مضبوط جسامت والے پٹھان کو دیکھنے لگا جس کی لکڑی کی گاڑی میں ایک چھوٹا سا الاؤ جلتا تھا اور اوپر گرم ریت میں مکئی کے سفید اور پیلے دانے بھنتے تھے۔ اس کے قریب اس کے بڑے بیٹے کی عمر اور قامت کا ایک لڑکا کھڑا تھا جس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''کیا کر رہے ہیں انکل؟'' لڑکے نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور خود کو اس سے چند قدم دور کر لیا۔ یہ اس کا بیٹا نہیں تھا۔ وہ خجل سا ہو گیا۔ لکڑی کی گاڑی میں جلتے الاؤ میں پٹھان کا چہرہ بڑا مشکوک دکھائی دیتا تھا۔

''جلدی گھر جاؤ۔'' اس نے لڑکے سے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھتا گیا۔

''تمہیں اس سے کیا، میں جلدی گھر جاؤں یا دیر سے؟'' اسے اپنے پیچھے اس کی غصیلی آواز سنائی

دی۔ وہ خالی خالی سا، کندھے لٹکائے کھڑا رہا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں چھوٹے بڑے کچھ تھیلے اور تھیلیاں تھیں جن میں سودا سلف اور کچھ دیگر ضرورت کا سامان بندھا تھا۔ مشکوک صورت پٹھان، اور لکڑی کی گاڑی میں جلتی آگ اور نوعمر لڑکا کہیں غائب ہو چکا تھا اور سامنے لمبوتری عمارتوں کا ہجوم تھا۔ لال اور نیلی روشنیوں کے درمیان ایک ناگوار قسم کا شور تھا جو سماعت سے ٹکراتا تھا اور ذہن کے پردے پر نامانوس تصویریں بناتا تھا۔

اسے یاد آنے لگا وہ جب گھر سے چلا تھا تو بڑا بیٹا اس کے ساتھ تھا اور اسے بار بار اپنی رنگین پنسلیں اور دیگر ضرورت کی چھوٹی چھوٹی چیزیں یاد دلاتا تھا۔ مگر سڑک پار کر کے گلی میں داخل ہوتے ہی اسے خیال آیا کہ مطلوبہ سامان تو ان چھوٹے بڑے شاپروں میں موجود تھا مگر اس کے ساتھ چلنے والا بڑا بیٹا اب ساتھ نہیں تھا۔

وہ کہاں رہ گیا؟ وہ کھڑے کھڑے اپنی پیشانی مسلنے لگا۔ اس کی کنپٹیوں پر پسینہ بہ رہا تھا اور فضا میں عجیب سی خنکی چھائی ہوئی تھی۔ خوف اور تشویش کی ملی جلی سی لہر اس کی پشت پر رینگتی تھی اور وہ جبڑے بھینچ کر خود کو متعدل رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ گلی نیم تاریک تھی اور ہر طرف ایک ملگجی سی اداسی چھائی ہوئی تھی، وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ترچھے اور تکونے مکانوں کے سامنے کیاریاں تھیں جن میں چھوٹی چھوٹی انسانی شکلوں والے پھول کھلے تھے اور حیرت سے اسے دیکھتے تھے۔

''میاں وَں!'' اسے قریب ہی سے کسی بلی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک گیا۔ اس کے قدموں کے قریب سے وہ گزری تھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی تھوڑی دور جا کر اُڑ گئی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ گھروں کے سامنے بنی کیاریوں کے اوپر رسیاں بندھی تھیں جن پر چھوٹے بڑے رنگین اور ریشمی کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر ان پر ہاتھ پھیرا وہ سارے نسوانی ملبوسات تھے اور ہوا میں پھڑ پھڑاتے تھے۔

اگر ہوا اتنی تیز ہے تو گلی میں اتنا حبس کیوں ہے؟ وہ اپنے گلے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے اچانک شدید پیاس کا احساس ہوا تھا۔ اس کے سر میں برف سی جمی تھی اور حلق میں سانس چبھ رہی تھی۔ اسے اپنا بیٹا یاد آنے لگا جو بادلوں میں شیر، بھالو اور جنگل بناتا تھا اور کھی کھی کر کے وہی نقرئی ہنسی ہنستا تھا جس میں لاکھوں بھید چھپے تھے۔

دونوں ہاتھوں میں سامان اٹھائے اٹھائے اس کے بازو تھک چکے تھے اور وہ جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر اپنے اردگرد دیکھتا تھا اور بے سمت چلتا جاتا تھا۔ گلی پار کرتے ہی اسے ایک عورت اور مرد جاتے دکھائی دیئے۔ عورت نے گود میں ایک بچی کو اٹھا رکھا تھا جس کا چہرہ اس کے بالکل سامنے تھا اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے سے عجیب بھید بھرے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ عورت کے کندھوں سے اوپر بچی کے جسم کا جتنا حصہ نظر آتا تھا وہ برہنہ تھا۔

''اسے سردی لگ رہی ہوگی۔'' وہ اس کے چھوٹے چھوٹے ننگے کندھوں کو دیکھ کر سوچنے لگا اگر

پچھلی گلی میں رسی پر لٹکے کپڑوں میں سے وہ کوئی کپڑے اتار لیتا تو یقیناً اس بچی کو پورے آجاتے۔اس کے دماغ میں جمی برف کا ایک قطرہ پگھل کر اس کی آنکھ میں آپڑا۔

''یہ لوگ اس ننگی بچی کو کہاں لئے جارہے ہیں؟'' وہ اپنے لڑکے کو بھول کر اس بچی کی فکر میں پڑ گیا۔ اور تیز تیز چلنے لگا۔مگر اسے حیرت ہوئی کہ وہ جتنا تیز چلتا وہ لوگ اس سے اتنے ہی فاصلے پر رہتے۔جیسے فلم کے کسی منظر میں دو سین ایک ساتھ چل رہے ہوں۔ایک ساتھ مگر ایک مخصوص دوری پر۔بھاگنے کی حد تک تیز چلنے کے باوجود فاصلہ اپنی جگہ موجود تھا وہ تمام تر کوشش کے بعد بھی ان کے قریب نہ پہنچ سکا۔عورت کے کندھے سے لگی بچی مسلسل اسی کو دیکھے جارہی تھی۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں کوئی کاسنی رنگ کا بھید بھرا تھا۔دونوں ہاتھوں میں سامان سے بھرے تھیلے اٹھا کر بھاگتے بھاگتے وہ تھکنے لگا۔فاصلہ کسی طرح کم نہیں ہورہا تھا اور نہ گلی ہی ختم ہوتی تھی۔وہ ایک جگہ رک کر سانس درست کرنے لگا۔اس کے کپڑے پسینے بھیگ چکے تھے اور وہ انہیں اتار دینا چاہتا تھا۔اس نے سامان کے تھیلے نیچے رکھ کر قمیض اتاری اور اسے اپنا چہرہ اور جسم پونچھنے لگا۔ اس کا پوارا بدن پسینے میں شرابور ہورہا تھا۔دور جاتی عورت کے کندھے سے لگی بچی مسلسل اسے دیکھتی اور ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی تھی۔وہ قمیض وہیں پھینک کر ایک بار پھر اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔

''غااااؤووووں ں ں ں......اس کے پاؤں کے نیچے آکر کوئی شے چلائی تھی اور وہ گھبرا کر گرتے گرتے بچا تھا۔بلی کے سائے سی کوئی چیز اس سے دور بھاگی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں اُڑ گئی۔وہ ڈر گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔عورت نے بچی کو زمین پر لٹا دیا تھا اور مرد اپنے تھیلے میں سے ایک لمبا اور چمکتا ہوا خنجر نکال کر اس کی دھار پر انگلی پھیرنے لگا۔اس کے حلق میں آواز بند ہو چکی تھی اور سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔کنپٹیوں پر جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا تھا۔وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔بچی اسے اسی اپنائیت سے دیکھ رہی تھی۔

عورت نے بچی کو سیدھا کر کے لٹایا اور مرد نے چمکتا ہوا خنجر اس کی گردن پر رکھ کر چلا دیا۔گرم گرم خون کا فوارہ چھوٹا اور ایک تیز دھار اس کے چہرے پر آپڑی۔اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے۔

''کھی کھی کھی کھی کھی کھی کھی......بارش ہوگئی......بابا پر بارش ہوگئی!!''

''آنکھیں کھول کر دیکھا تو دونوں بیٹے ہاتھوں میں پانی والی پستولیں لیے کھڑے تھے اور ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔سامنے میز پر چائے کی پیالی دھری تھی جس میں سے گرم گرم بھاپ اُٹھ رہی تھی۔

◄◄ ● ►►

Carier of Express Midia Group House,
5 off Way Corangi Road, Near Salma Super Market
Qayummabad Chorangi Keranchi Pakistan

● سبین علی

سرنگ کے راستے

برقی قمقمے جل بجھ رہے تھے اور آنکھوں کے آگے مٹیالی سی دھند چھائی تھی جیسے در و دیوار پر مٹی اڑ رہی ہو۔ لیکن ہوا بالکل ساکن تھی۔ چاروں طرف ایک ہو کا عالم طاری تھا۔ میں غیر معروف راستے پر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی کچھ دور جا کر غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ برقی قمقمے نہیں بلکہ مشعلیں تھیں جو مٹیالے راستے کے دونوں جانب نصب تھیں۔ میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا! وہ ایک طویل سرنگ تھی جو بہت کھلی، ہوادار اور روشن تھی۔ ہر دس پندرہ گز کے فاصلے پر سرنگ کے دونوں جانب مومی مشعلیں روشن تھیں۔ وہ مشعلیں بہت دور تلک روشن نظر آ رہی تھیں یہاں تک کہ سرنگ کے اگلے سروں پر ان کی روشنی جھلملاتے نقطوں کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ میرے حواس کو گہری رات کا ادراک ہوا لیکن وہ رات کا کون سا پہر تھا اس کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

کیا وقت ٹھہر گیا ہے یا اس کا پہیہ الٹا گھوم چکا ہے۔ یہ سرنگ ہے یا کوئی ٹائم مشین؟ میں تاریک ماضی کے کسی عہد پہنچ چکی ہوں یا مستقبل پیچھے رہ گیا ہے؟

اس تذبذب میں مجھ سے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا جا رہا تھا۔ میرے اردگرد کئی لوگ خاموشی سے چل رہے تھے جن کی شناخت اجنبی ہونے کے باوجود ان سے نامعلوم سی شناسائی محسوس ہو رہی تھی اور میں ان سب لوگوں سے عدم واقفیت کے باوجود ایک ورطہ حیرت میں مبتلا قدم سے قدم ملاتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ راستہ انجان ہو کر بھی شناسا سا لگ رہا تھا۔ وہ ہمراہی اجنبی ہو کر بھی ہم سفر تھے۔ جانے کسے کہاں آگے بڑھ جانا یا پیچھے رہ جانا تھا؟

ہر دو مشعلوں کے بیچ میں سرنگ کے دونوں جانب داخل ہونے یا باہر نکلنے کے لیے بلند دروازہ نما راستے موجود تھے۔ وہ در بھی مٹیالے رنگ کے تھے اور کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ان دروں سے پہیلیوں کی مانند راستہ گھوم کر کہاں جاتا ہے سرنگ کی چھت نسبتاً بلندی پر اور متوازی تھی نیچے مٹی کی لیکن پختہ اور جمی ہوئی راہگزر بچھی تھی۔ اس طویل سرنگ میں کسی در سے کوئی شامل ہو رہا تھا یا بچھڑ رہا تھا اس بات سے قطعی لاعلم میری نظریں سامنے سرنگ کے آخری سرے پر جمی تھیں، جہاں حد نظر تک ٹمٹماتے جگنوؤں کی مانند روشن مشعلیں لامتناہی راہگزر کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ اس روشن اور مٹیالے راستے میں خشک مٹی کی عجیب سی مہک گھلی ہوئی تھی۔ جس کی کشش مجھے ہوا میں اڑتے زروں کی مانند رواں رکھے تھی۔

میں کون ہوں؟ کس عہد میں ہوں؟

اگر میں وہی ہوں جو خود کو پہچان پا رہی ہوں تو یہاں موجود سب لوگ موہوم شناخت کے حامل کیوں ہیں؟ میرے اردگرد مناظر تیزی سے تبدیل ہوتے جا رہے ہیں کہیں سب لوگ بچھڑ جاتے ہیں اور کہیں اچانک پھر سے کئی قدموں کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔۔ یہ سرنگ کس بستی میں جا نکلے گی۔ ابھی کوئی درا ایسا نہیں آیا جہاں مجھے محسوس ہو کہ اب مجھے باہر نکلنا ہے۔ ہاں تب تک مجھے اس سفر میں رہنا ہے۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں۔ میرے کئی بہت پیارے چہرے جدا ہو چکے ہیں لیکن ان کے وجود کی خوشبو میرے اردگرد پاسبانوں کی مانند ہمرکاب ہے۔ ان مناظر میں منجمد کئی لمحے اس طرح ساکت و ساکن ہو چکے ہیں کہ سامنے موجود ہونے کے باوجود میں ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکتی۔ بالکل میری نظروں کے سامنے لیکن دوری اتنی گہری کہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہوں تو بھی چھو نہ سکوں اور قریب اتنے کہ مشام جاں میں رگوں کے تانے بانے میں پروئے ہوئے ہیں۔ اختیار اتنا کہ سوچ انہیں مقید کر دے اور دل کے اندر اٹھتی کوئی لہر انہیں بہالے جائے مگر بے اختیاری اتنی کہ ایک لفظ ان کی سماعت تک نہیں پہنچا سکتی۔

اختیار اور بے اختیاری کی کشمکش ایسی ہے جیسے تنگ راہ گزر میں کھائی کے ساتھ چلتا مسافر یا ایک تنے رستے پر چلتا مداری جو منزل تک پہنچ جائے گا یا کہیں بیچ راہ محض ورق گم گشتہ بن جائے گا۔

خود کلامی کے ایک طویل وقفے کے بعد بے خبری اور تجسس کے عالم میں میں نے ایک عورت سے کہا جس کے قدم گرد آلود تھے اور اس کے وجود میں تپتی مٹی اور کی کر کے پھولوں کی مہک تھی، لیکن چہرہ واضح نہیں تھا۔ سوال کیا! تم کون ہو؟

مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔ کبھی میری مٹی میں میری ایک شناخت تھی لیکن پھر میں اسے قائم نہ رکھ پائی۔ یا یوں سمجھو کہ تیاگ دی۔ جیسے کئی بستیوں میں عورتیں صدیوں سے ستی ہوتی آ رہی ہیں میں نے اپنی ذات، اپنی شناخت، زبان رسم و رواج سب اپنی منشا سے یا شاید ایک بے اختیاری میں تیاگ دیے۔

کیوں اور کس کے لیے تیاگ دیے؟ میں نے سوال کیا۔

میری مٹی میں نرمی محبت اور وفا کا خمیر تھا۔ مگر مزاج میں الہڑ پن تھا اور بے نیازی بھی۔ ایک دن یہ دونوں اطوار مد مقابل ہو گئے۔ دور دیس سے ہوا کے رتھ پر ایک سوار آیا تھا جس کا لباس سفید اور بے شکن تھا۔ اس کی قوم نے ہماری بستیاں تاراج کیں اور محلوں پر قبضے جما لیے۔ راجاؤں کے بنائے زندان کھولے گیے، قیدی آزاد ہوئے کئی امراء پابند سلاسل کیے گئے اور کچھ مارے گئے۔ داسیوں کی کیا زندگی ہوتی ہے اور ہماری بستی میں عورت داسی ہی رہتی ہے۔ خواہ راج محل کی ہو یا کھیت کھلیانوں میں کام کرنے والی، لیکن اس اجنبی نے مجھے من کے سنگھاسن پر بٹھایا تھا۔ محبت کی ریشمی ڈور ایسی بندھی کہ سانسوں کا بندھن تو ٹوٹے مگر ڈور نہ ٹوٹ پائے۔ اس کا دیس، قبیلہ، زبان اور دھرم سب اجنبی تھے اور میں سفید کپاس کا پھول تھی جس کے

ریشوں پر کوئی بھی رنگ ہو چوکھا چڑھ جاتا ہے۔اس دور دیس سے آئے اجنبی نے میری ذات کو پریم کا ایسا رنگ چڑھایا کہ چاہ کر بھی کورا رنگ واپس نہ لا سکی۔ وہ واپس جانے لگا تو سمجھ نہ آئی کہ یہاں اس کے رنگ میں رنگی جوگ لوں یا اس کے ساتھ ہولوں۔ ساتھ ہولوں تو اپنی مٹی سے کیسے کٹوں۔ کیا پودا زمین سے جدا ہو کر جی سکتا ہے؟......نہیں......اگر ساتھ نہیں چلتی تو کیا اس کے بغیر رہا جائے گا؟

کیا اس بدلی رنگت کو میری اپنی مٹی سہہ پائے گی؟ بس تب سے اب تک اس سرنگ میں معلق ذرات کی مانند محو سفر ہوں کہ کبھی تو اس سوال کا جواب ملے گا یا پھر میرا وجود کسی نئے سانچے میں ڈھل جائے گا۔

سرنگ کے اندر ساکن ہوا میں ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہوئی پھر جانے وہ عورت راستے میں مجھ سے آگے بڑھ گئی پیچھے رہ گئی یا کسی در سے باہر نکل گئی...... مجھے کچھ علم نہ ہوا۔ مجھے لگا کہ میں اساطیری دور میں پہنچ چکی ہوں لیکن کچھ مزید سفر کے بعد میرا خیال پھر سے تبدیل ہو گیا۔جس مقام پر مٹی میں گھلی تیرگی کی مہک فسوں تر ہو چکی تھی۔ٹمٹماتی مشعلوں کی ضوافشانیاں آنکھوں کے آگے کئی دائرے بناتی چلی جا رہی تھیں۔ایک اور دھیمی مہک مجھے اپنائیت کا احساس دلا رہی تھی۔اس کی رنگت سرخی مائل سیاہ اور چمکیلی تھی۔ جیسے لکڑی دہک کر کوئلہ ہو رہی ہو۔ پھٹے ہوئے پاؤں ننگے اور چپٹے تھے۔اس کے ساتھ کئی بچے بڑے اور بوڑھے ہیولوں کی مانند چل رہے تھے اس کے جسم پر کا کاو، کپڑے اور غلامی کی دھول جمی تھی اس کے کانوں میں پگھلا سیسہ ڈلا تھا اور لب سلے ہوئے تھے اور چہرے کے نقوش مدھم تھے۔قبل اس کے کہ میں اس سے کوئی سوال جواب کرتی وہ بچھڑتی ہوئی بہت پیچھے رہ گئی۔لیکن کا کاو کی خوشبوئی بار مجھے اپنے بالکل قریب ہی محسوس ہوتی رہی۔

ایک طویل قامت اور سبک رفتار لڑکی میرے قریب پہنچ چکی تھی۔اس نے چست مغربی لباس زیب تن کر رکھا تھا موی مشعلوں میں اس کا حسن دہک رہا تھا۔لیکن وجود پر سخت محنت اور مسکان تلے تکان واضح تھی۔

روپ رون تے کرم کھان۔ میں نے بڑی حسین لڑکیوں کو شاپنگ مالز میں صابن، شیمپو نوڈلز اور واش روم کلینزز کی پروموشن کرتے دیکھا ہے۔ پارکنگ کے ٹکٹ کاٹتے بسوں میں دھکے کھاتے، ریسپشنسٹ کے کاؤنٹر پر گھنٹوں کھڑی لڑکیاں......کیا حسن اتنا ارزاں ہوتا ہے یا چند سکے اتنے گراں مایہ؟ یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔شاید یہ اپنی معصومیت بھری خوبصورتی میں کسی حسینہ عالم کو بھی شرما دے۔لیکن ایک ویٹرس! میں نے تاسف سے سوچا۔

میری سوچ کا ادراک کرتے ہوئے وہ بے اختیار ہنسنے لگی لگی ....لوگ مجھے ایک خوب رو ویٹرس مگر ایک کمتر انسان سمجھتے ہیں۔ جو محض ریسٹورینٹ میں پڑی دیگر سجاوٹی اشیاء کی مانند ہی ہے لیکن سخت مشقت کی بھٹی میں جلتا جسم اور آزردہ روح ان سب کی نظروں سے اوجھل ہی رہتی ہے۔

اونچی ایڑھی کے سینڈل کی ٹک ٹک......مشاطہ کی انگلیاں......رنگ و بو کا سیل رواں ......مزدور...... طوائف......قیمتی سینٹ کی خوشبوئیں جن کے عطر شوگر کین کی زمینوں سے کشید تھے......ان خوشبوؤں کی تہہ میں خون

اور پسینے کی مہک بھی شامل تھے لیکن سبھی بے چہرہ اور موہوم کسی چہرے کا عکس برانڈ ڈ خوشبو کی شیشی جیسا واضح نہ تھا۔

ہاں میں اسے کچھ کچھ پہچان پا رہی ہوں۔ میرے دائیں جانب چلنے والی شاید فریال ہے۔ وہی فریال جس نے انجینئرنگ کالج میں بہترین تعلیمی کارکردگی کا پچاس سالہ ریکارڈ توڑا تھا۔ ہر جونیئر لڑکی کی آئیڈیل فریال......متوسط گھرانے کی وہ لڑکی جس کی مٹی میں ذہانت، انتھک محنت اور اعلی اقدار شامل تھیں۔ لیکن خمیر وہی محبت سے گندھا جو ہر عورت کی فطرت میں ودیعت ہوا۔ ہاں یہ وہی ہے جو دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی چلی جا رہی ہے۔

اس کے کالج میں پڑھنے والا کسی امیر گھرانے کا لڑکا اس کی چاہت میں گرفتار ہوا اور فریال محبت میں۔ پسند کی شادی کے بعد اسے گھر داری بچوں اور سسرال کے ساتھ اعلی اقدار نبھاتے یہ بھول ہی گیا کہ کامیاب بزنس مین اور انجینئر کی بیوی فریال خود بھی ایک انجینئر تھی۔

فریال بھی کسی دروازے سے جدا ہو چکی تھی۔ میرے قدم گرد آلود تھے اور مدھم مومی روشنیوں میں مقید کئی مناظر آنکھوں کے آگے نوحہ کناں تھے۔ بستی سے دور جنگل بیلوں میں کچھ دیوانے دھونی رما کر جوگ لیے بیٹھے تھے۔ فرزانوں نے ان دیوانوں کو دیس نکالا دے ڈالا تھا اور خود بستیوں عورتوں زمینوں پر قابض ہوئے تھے۔ ان سب کے عقب سے ہو کر روشنی کی نرم لہریں زمانوں کی مسافت کو طے کر رہی تھیں۔ مجھے بھی کسی در سے باہر نکل جانا ہے جانے باہر کیا ہوگا وہ بستی جہاں سے میں نے سفر کا آغاز کیا یا کوئی اور زمان و مکاں مجھے گھیرے میں لے لیں گے۔

دن کا پہلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ راستوں پر صبح دم کی بارش کے آثار تھے سڑکیں، گلیاں اور عمارتیں سب بھیگی ہوئی تھیں۔ میرے قدموں پر دھول کے کوئی نشان نہیں تھے مگر جسم طویل مسافت کی تھکن کا شکار تھا۔

پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی یا شاید آنکھ لگ گئی۔ کیونکہ میں پھر سے اسی سرنگ میں موجود تھی۔ میرے اردگرد کیکر، خشک مٹی، کاکا ؤیا سمین کے پھولوں کی خوشبو تھی۔ محنت کشوں کے پسینے کی بو کے بھبھکے تھے اور قحط زدہ زمینوں پر پہلی بارش کی مہک تھی۔

اونچی ایڑی کے سینڈل، پھٹے پاؤں، تھکی ماندی مگر حسین و جمیل لڑکیاں، سیاہ رات جیسی تاریک اور دودھ کی مانند اجلی صورتیں، دیوانے، فرزانے پھر سے اسی سرنگ میں کبھی میرے آگے اور کبھی مجھ سے پیچھے ہیولوں کی مانند گزر رہے تھے۔ میں نے ایک ثانیے کے لیے باہر نکلنے والے در کو غور سے دیکھا وہ راستہ لہریے سانپ کی مانند گھوم کر اسی سرنگ میں دوبارہ شامل ہو رہا تھا۔

◄◄ ● ►►

Lahore Pakistan
Mob: 03217070662
E.mail : Sabnali77@gmail.com

● دلشاد نسیم

اندھیرے میں

سڑک بہت ویران نہیں تھی۔ اِکا دُکا سواریاں آ جا رہی تھیں۔ سٹریٹ لائٹس آن تھیں۔ کمرشل ایریا میں ڈھابے والوں کا رش مدھم پڑ چکا تھا جبکہ بڑے ریسٹورینٹس ابھی کچھ کچھ آباد تھے۔ ایک بجنے والا تھا۔ عموماً رات بارہ بجے کے بعد شہر کے وضع دار لوگ اپنا روزگار اٹھا لیتے ہیں یا پھر ان پر شٹر گرا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور قسم کے لوگ جاگتے ہیں۔ ان کا روزگار شروع ہوتا ہے۔ اُن ہی میں سے ایک لڑکی بینا تھی۔ جس کی عمر اٹھائیس سال...... قد نکلتا ہوا...... آنکھیں ہرنی جیسی...... ستواں ناک...... محرابی ماتھا اور جسم...... جسم کی کیا بات کی جائے...... بس وہ لڑکی تھی۔ جوان خوبرو لڑکی جس کا اصل نام سبین تھا۔ مگر ایک حادثے نے اس کی یہ پہچان پیروں تلے روند دی۔

بینا نے ہلکے برانڈ کی سگریٹ سلگائی اور سڑک کے کنارے چلتی چلتی اس جگہ پر پہنچ گئی جہاں وہ روز کھڑی ہوتی تھی۔

اسی وقت تین لڑکوں کا ایک گروپ پاس ہی آ کر کھڑا ہو گیا۔ انسان آئینے کی طرح ہوتا ہے وہ اپنے جیسے لوگوں کو پہلی نظر میں پہچان لیتا ہے۔ لڑکوں نے بینا کی اوقات پہچان لی۔ جیب سے سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ بینا نے سگریٹ کے دھوئیں میں ان تینوں کو باری باری دیکھا اور رخ موڑ لیا۔

''کسی تگڑی آسامی کا انتظار ہے۔''

ایک لڑکے نے مضحکہ اڑایا۔

کوئی اور وقت ہوتا...... کوئی اور وقت کیوں چند ماہ پہلے کی بات ہوتی تو شاید سبین کا ہاتھ اٹھ جاتا...... مگر...... وقت آزماتا ہے۔ اور وہ آزما رہا تھا۔ بینا...... امتحان کے عملی پرچے حل کیے جا رہی تھی۔

''دیکھ میں جانتا ہوں تو سو روپے میں پٹنے والی نہیں ہے پر۔ اگلی بار ہم تینوں مل کر زیادہ کا بندوبست کر لیں گے۔''

''اگلی بار......؟ اگلی بار کس نے دیکھی ہے۔ ہمارے کام میں ادھار نہیں چلتا۔''

''کام؟'''' قہقہہ لگا...... آگ اگلتا قہقہہ بے غیرتی سے بھرپور قہقہہ۔

ایک گاڑی رکی اور بینا نے سگریٹ زمین پہ پھینکی اور جوتے تلے مسلی اور دروازہ کھول لیا۔

''دیکھا...... دیکھا'' دوسرا لڑکا چیخا۔ ''سالی کو اپنی ورتھ کا اندازہ ہے۔ ہم جیسے فقیروں کے ہاتھ میں کیسے آسکتی تھی وہ۔''

لڑکوں کا دل تو بہت کچھ کہنے کا تھا۔ لیکن گاڑی اور اس کی سرخ بتیاں تک اندھیرے میں گم ہو چکی تھیں۔

''سلمان......''

گاڑی والے نے اپنا تعارف کرایا۔

''دیر ہو گئی معذرت۔''

''کوئی بات نہیں۔'' بینا نے عام سے لہجے میں کہا۔ گاڑی ایک گھر کے سامنے رک گئی۔ سلمان نے گاڑی بند کی۔ بینا کار سے اتر چکی تھی۔ اس نے خود کو کالی سیاہ چادر میں اچھی طرح سے ڈھکا ہوا تھا۔ جانے اس کو اپنی شناخت چھپانی مقصود تھی یا اس کی جو اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

گیٹ کے اندر ایک الگ ہی دنیا تھی۔ ایک سادا سے گیٹ میں اندر بہت ہلچل مچی ہوئی تھی۔ روم پہلے سے بک تھا ایک بیرہ رہنمائی کے لئے موجود تھا۔ پہلی منزل پر دائیں طرف تیسرا کمرہ۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بینا کا ذہن خالی تھا۔ وہ جب بھی کسی کے ساتھ ہوتی۔ (کہیں بھی) اس کے ذہن میں کچھ بھی نہ ہوتا سوائے ان ضرورتوں کے جو کبھی بھی پوری نہیں ہوئیں۔

سادہ سا کمرہ...... ڈبل بیڈ...... دو کرسیاں...... ایک بڑا سا آئینہ...... کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے آئینے کو دیکھا اس نے نظریں چرا لیں۔ اتنا بھاری میک اپ تھا۔ وہ خود کو بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''آؤ بیٹھو......'' سلمان نے نرمی سے کہا۔

بینا اطمینان سے بیٹھ گئی۔ وہ ظاہر یہی کر رہی تھی کہ وہ بہت مطمئن ہے۔ حالانکہ اس کا چہرہ اس بات کا چغلی کھا رہا تھا کہ وہ بے حد بے چین تھی اور وہ ہمیشہ ہوتی۔ اس کو عجلت ہوتی کہ کب گھر جائے گی لیکن ''گاہک'' کو اس سے کیا مطلب۔

''پریشان ہو؟''

''نہیں۔''

''کھانا کھائیں۔''

''نہیں۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''بھوک نہیں لگ رہی؟''

بینا نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ ''بھوک کا کیا ہے۔''

''سب تقاضے بھوک ہی کے تو ہیں۔'' کہتے کہتے اس نے بریانی آڈر کی۔

''دیر ہو جائے گی۔''

سلمان نے بلا حجت جیب سے پانچ ہزار کے دو نوٹ نکالے جس کو بلا تامّل بینا نے پکڑ لیے۔

''کیوں کرتی ہو یہ کام؟''

''کام......؟''

''کیونکہ دھندہ کہنا اچھا نہیں لگتا۔''

''سب...... کہتے تو یہی ہیں۔'' مسکرا کے بینا نے کہا۔ مگر اس کے لہجے میں نمی تھی۔

''ایک بات پوچھوں......؟''

بینا نے سلمان کو دیکھا گویا عندیہ دے دیا ہو۔

''تم بغیر محبت کے کیسے اپنا آپ کسی غیر کو سونپ دیتی ہو۔''

''کئی لوگ دنیا میں اس طرح رہ رہے ہیں...... بنا محبت......''

''وہ اور بات ہے، ہمارے سماج......اور معاشرے کے کچھ تقاضے ہیں۔'' بینا لمبا سانس لیتی ہے۔

''بات تو واقعی یہ اور ہے۔ اگر میں یہ کیوں کہ معاشرے نے ہی مجھے باہر نکلنے پر مجبور کیا ہے تو......؟''

سلمان کا دل چاہا اس سے پوچھے کہ کیوں مجبور کیا ہے۔ مگر کئی سوال اور تھے جو ابھی پوچھنے تھے کہ کھانا آ گیا۔

(سلمان نے ایک ڈسپوزبل بریانی بینا کی طرف بڑھائی اور دوسری شاپر ہی میں رہنے دی۔)

''اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' سلمان نے دلچسپی سے اس کو دیکھا۔ بینا کی آنکھوں کی اداسی سلمان کو کسی بھی پیش رفت سے روک رہی تھی۔

''آپ نے میرے حالات سننے کے لیے پیسے نہیں دیے سلمان صاحب یوں بھی ہمارے دھندے کا یہ اصول نہیں۔'' اس نے دھندے پر زور دے کر کہا واضح کرنا چاہا تھا۔

''کھانا......''

سلمان نے نرمی سے کہا۔ مگر بینا کو غصہ آ گیا وہ کیوں ہمدردیاں جتا رہا ہے۔

''کہا ناں مجھے بھوک نہیں ہے......!''

''وہ کیا کہتے ہیں پہلے طعام پھر......'' سلمان بھی ڈھیٹ تھا۔

''سلمان صاحب! ہم اس دو گھنٹے کی ملاقات کو اپنے اپنے مقصد کی حد تک رکھیں تو بہتر ہوگا۔'' سلمان نے ڈرنک کے دو گلاس تیار کیے ایک بینا کی طرف بڑھایا۔

''پیتی ہو؟'' بینا نے گلاس سلمان کے ہاتھ سے لیا اور ایک ہی گھونٹ میں سارا محلول پی گئی۔

''پیتی ہوں'' اس نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

''آپ جیسوں کو برداشت بھی تو کرنا ہوتا ہے۔''

اچانک دروازہ بجتا ہے۔ سلمان نے دروازہ کھولا وہی بیرہ جس نے ان کو کمرے کا راستہ دکھایا تھا چیخا۔

''چھاپہ پڑ گیا ہے کسی نے مخبری کر دی ہے شاید۔ جلدی سے بھاگ جاؤ۔ کسی بھی وقت پولیس آ جائے گی۔''

بینا کا رنگ فق ہو گیا۔

''اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا۔ میرے ساتھ آؤ۔''

بینا نے سیاہ چادر سے جسم ہی نہیں چہرہ بھی ڈھانپ لیا۔ سلمان نے کھانے کا شاپر بینا کو تھمایا۔

جیسے ہی دونوں باہر نکلے۔ پولیس مین نے بینا کو سر سے پیر تک مکروہ نظروں سے دیکھا۔

''مجھ سے بات کریں۔''

سلمان نے پولیس مین کو اس طرح دیکھتے دیکھا تو ٹوک دیا۔

بینا کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ بھاگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ رحم طلب نظروں سے سلمان کو دیکھے جا رہی تھی۔

''تم سے تو میں بعد میں بات کروں گا۔ پہلے اس سے تو نمٹ لوں۔'' پولیس مین ایک قدم آگے بڑھا۔ بینا دو قدم پیچھے ہٹی۔ اسی میں اس کے چہرے سے نقاب ہٹ گیا۔ کیمرہ مین، ٹی وی رپورٹر، اخبار رپورٹرز سب موجود تھے۔ اس کی تصویر اتار لی گئی۔ اور تصویر ہی نہیں تصاویر اتار لی گئیں۔ اس کا جی چاہا زمین پھٹ جائے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پولیس مین نے ہاتھ میں پکڑی پسٹل کی مدد سے بینا کی چادر کو ٹٹولا۔

''ہاتھ میں کیا ہے۔''

سلمان نے جیب سے کچھ پیسے نکالے۔

''اس کو جانے دیں۔''

’’یہ کیا لگتی ہے تیری......؟‘‘

سلمان کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ پولیس والے نے بینا کی چادر گھسیٹی۔ ڈسپوزل پیکٹ زمین پر گر گیا۔ بریانی کے چاول زمین پر رنگ برنگی شکلوں میں بینا کا مذاق اڑانے لگے۔ سلمان نے دانت پیس کر کہا۔

’’انہیں جانے دیں۔‘‘

’’تم خاموش رہو تو بہتر ہو گا۔‘‘

اور پھر......جس بات کا بینا نے کبھی سوچا نہیں تھا وہ ہوا......اس کو تھانے جانا پڑا۔

پولیس وین میں ہر طرح کی عورت تھی۔ مگر اس جیسی کوئی نہیں ہو گی...... بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے جس کو پلکیں جھپک جھپک کر سینے میں اتار رہی تھی۔

’’حسان انتظار کر رہا ہو گا۔‘‘

اس کو بے یار و مددگار بستر پر پڑا احسان یاد آ گیا۔

’’کیا سوچ رہا ہو گا؟‘‘

اس نے سوچا۔ پھر یکدم اس کو خیال آیا۔ ’’کیا واقعی وہ کچھ سوچ رہا ہو گا؟ سوچنے کی صلاحیت ہے اس میں؟‘‘

سپیڈ بریکر نے اس کے خیالات کا شیرازہ بکھیر دیا۔ وین میں دس کے قریب لڑکیاں تھیں۔

’’لڑکیاں‘‘ بینا نے اپنا مذاق خود اڑایا۔

’’نہ یہ لڑکیاں تھیں نہ عورتیں...... یہ سب گالیاں ہیں......مجھ سمیت۔‘‘ بینا نے نمکین سے آنسوؤں کے گولے کو سینے میں اٹکا ہوا سا محسوس کیا۔

تھانے کے سامنے گاڑی رک گئی۔ سلمان کہیں نظر نہ آیا۔ پتہ نہیں وہ کون تھا۔ ہمدرد تھا یا وہ بھی لٹیرا تھا؟ نہیں......وہ لٹیرا نہیں تھا۔ تھا بھی تو اوروں سے بہت مختلف تھا۔ اس کے دس ہزار روپے پرس میں تھے اور پرس اس نے اس مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا کہ جیسے کسی معصوم کے ہاتھ آئی چڑیا ہو...... چڑیا کے اڑ جانے کا خوف اس کے دل کو چڑیا سے بھی کہیں زیادہ بے وزن کر رہا تھا۔ سب کے چہروں پر نقاب تھے۔ سیاہ و سفید نقاب۔ کوئی کم عمر تھی......کوئی اس جیسی......اور کوئی۔ بینا آگے سوچنا چاہتی تھی لیکن کسی نے بڑے گھٹیا سے انداز میں اس کے نام کو پکارا۔

’’اوئے تم میں بینا کون ہے؟‘‘

بینا بے ساختہ آگے ہوئی۔ پھر گھبرا کے واپس لائن میں کھڑی ہو گئی۔

''یہ سلمان تیرا کیا لگتا ہے۔''

''بینا کیا بتاتی......گاہک؟'' خاموشی بہتر تھی۔

''تیری ضمانت ہوگئی ہے۔ پرانا یارانہ لگتا ہے......پکا کسٹمر۔''

لائن سے کھڑی ساری گالیوں نے اس کو ستائش اور عزت کی نظر سے دیکھا۔

''یہاں انگوٹھا لگا آ کے۔''

پولیس کی وردی میں وہ جو کوئی بھی تھا۔ اس کی زبان ایسی تھی کہ اس پر تھوکنے کا بھی دل نہ کرے لیکن اس وقت جس مقام پر بینا کھڑی تھی۔ اس پر دنیا خود تھوک رہی تھی۔

بینا انگوٹھا لگانے لگی۔ اس کے سفید مومی انگلیوں میں دھنسی واحد منہ دکھائی کی انگوٹھی جگمگائی۔ پولیس والے کی رال بہنے لگی۔

''سونے کی ہے؟'' اس نے انگوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

''نن......نہیں جی۔''

بینا نے لمحے بھر میں ہی سوچ لیا وہ کون سی ایسی پاک زندگی گزار رہی ہے کہ جھوٹ بولے گی تو گناہ ہو جائے گا۔

''اتارو......'' بینا نے گھبرا کے پولیس والے کو دیکھا۔

لمبی آہ بھری جیسے آخری سانس لے رہی ہو پرس میز پر رکھا اور انگوٹھی اتارنے لگی۔ وہ یہ بھول گئی کہ عقابی نظریں اس کے گرد حصار باندھے بیٹھی ہیں۔ پولیس والے نے انگوٹھی سے نظر ہٹا کر پرس کو دیکھا اور پرس کھول کر ایسے الٹا کیا جیسے بینا پر ہیروئن کی برآمدگی کا الزام ہو...... پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ اور پچاس پچاس کے دو نوٹ بکھر گئے۔ میلے کچیلے ٹشو پیپر اور ایک پرانی لپ سٹک اور دوائیوں کے خالی پتوں کے سوا تھا ہی کیا اس کے پرس میں۔ سب کچھ گر گیا۔

پولیس والے نے کمال چابک دستی سے نوٹ اٹھا لیے اور جیب میں رکھتے رکھتے لاپروائی سے ایسے کہا جیسے اندھا ہو۔ اس کو بینا کا غم زدہ چہرہ دکھائی ہی نہ دے رہا ہو۔

''کیس بند بھی تو کرنا ہے ناں۔''

اور کیس بند ہو گیا۔

بینا کا دل اُسی کیس میں جیسے بند ہو گیا تھا......کچن کے خالی برتن......حسان کے سائیڈ ٹیبل پر پڑی دوائیوں کی خالی ریپرز......ایک لمحے میں سب کا سب یاد آ گیا۔ پیر اٹھتے نہیں تھے۔ مگر وہ اٹھانے پر

مجبور تھی۔ سیاہ چادر کا ایک کونہ زمین پر اس طرح گھسٹ رہا تھا۔ جیسے وہ زندگی کو گھسیٹ رہی تھی۔ گھر تک کا راستہ بہت لمبا نہیں تھا مگر خالی پیٹ سیاہ رات میں اپنے وجود کو گھسیٹنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

مگر وہ بھاگ رہی تھی جیسے کوئی تعاقب کرتے دشمن سے بھاگتا ہے...... جیسے کوئی کسی آسیب سے ڈر کے بھاگتا ہے۔ وہ بھاگ رہی تھی لیکن راستہ جتنا کم ہو رہا تھا ہمت اس سے بھی زیادہ کم ہوتی جارہی تھی۔

فجر کا وقت ہو چکا تھا۔ مساجد میں سپیکرز کی ابتدائی آوازیں آنا شروع ہو چکی تھیں۔ اس کی کالونی سے نکلتے کچھ مردوں نے اس پر نفرت کی نگاہ ڈالی کچھ ایک کی نگاہوں میں رحم بھی تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اسے اس وقت سے جانتے تھے جب وہ اس کالونی میں آئی تھی۔ مگر یہ رحم دل بزدل تھے سب کے سامنے کبھی بینا سے اظہارِ ہمدردی نہ کر سکے۔ البتہ سب سے نظر چرا کے ہمدردی کے دو ایک بول یا پھر ہمدرد نظر سے دیکھ لیا کرتے تھے۔

وہ مرے مرے قدموں سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا۔ روئے اور پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ لیکن آنسو آنکھوں تک آ کے پلٹ جاتے تھے۔ اس نے کبھی سنا تھا خالی پیٹ تو رویا بھی نہیں جاتا۔ وہ یہ سن کر کتنا ہنسی تھی۔ آج اس سے واقعی رویا نہیں جا رہا تھا۔ معدے سے آنسو کا اتنا گہرا تعلق ہے؟ اسے سمجھ آ چکا تھا۔

فلیٹ کا دروازہ کھول کر اس نے فلیٹ کے چھوٹے سے لاؤنج میں رکھے درمیانی میز سے پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں پی لیا۔ خالی معدے میں پانی زہر کی طرح چبھا۔ دو کمروں کا یہ فلیٹ اس کی پناہ گاہ تھا۔ دو کمروں کے سامنے ایک چھوٹا سا لاؤنج۔ گویا 80 گز کا یہ فلیٹ اس کی جنت بھی تھا اور دوزخ بھی۔ اس کو یقین تھا حسان روز کی طرح اس کا منتظر ہوگا۔ وہ تکیے پر سر رکھے لیٹا اس کی راہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ مگر آج ایسا نہ ہوا بینا ہکا بکا رہ گئی حسان اوندھے منہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ چھ فٹ کا حسان۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو چکا تھا۔ مگر ہڈیوں کا بھی وزن ہوتا ہے۔

''حسان۔'' وہ بے تابی سے اس پر جھکی۔

''حسان۔'' حسان کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر سانس چل رہی تھی۔

بینا نے وہیں زمین پر ہی اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور بے تابی سے اسے پکارے گئی اور ساتھ ساتھ روئے جا رہی تھی۔

''حسان......حسان۔''

بینا کی آواز میں وہ درد...... وہ پکار تھی کہ جس کو سن کر اللہ تعالیٰ نے رحم کی، کرم کی نظر کر دی اور حسان نے بینا کو دیکھا۔ بے چارگی۔ خود ترسی۔ دکھ اور ڈھیر سارے آنسو۔ جن کے جواب میں بینا کی

آنکھوں میں صرف تشکر تھا۔ وہ بے ساختہ حسان کے چہرے پر پیار کیے جا رہی تھی۔

''تم کیا جانو۔ حسان تم میرے لیے کیا ہو۔''

وہ واقعی نہیں جانتا تھا کہ وہ سب کے لیے کیا ہے۔ ایک بے جان...... زندہ لاش...... ایک بوجھ......اور کیا ہے وہ۔

لیکن حسان بینا کا شوہر تھا۔ اس کا سہارا کمزور سہی۔ ایک آس ضرور تھی کہ ایک دن وہ ضرور ٹھیک ہو جائے گا۔

ایک کڑی آزمائش کے بعد اس نے حسان کو بیڈ پر لٹایا اور اُس کے ماتھے پر پڑ جانے والے گومڑ کو کتنی دیر تک دوپٹے کے گولے سے پھونک مار مار کے سینکتی رہی۔ کچھ لمحوں بعد خاموشی سے اٹھی اور کچن میں آ کر پہلے بہت دیر تک بے آواز روتی رہی۔ خوب رو چکی تو پانی کے چھینٹے چہرے پہ مار کے چائے بنانے لگی چائے بنا کر دروازے پر رس والا پیکٹ نکالا ایک رس چائے میں ڈبو کر اس کو نرم کیا تب بھی بہت ساری خوش گوار یادوں نے آنکھوں میں نمکین پانی کا سیلاب بھر دیا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ کبھی اتنا روئی ہو۔ لیکن اب تو آنسوؤں کو موقع چاہیے ہوتا ہے۔

چھوٹی چمچ سے چائے رس کھلاتے کھلاتے اتنی دیر ہو گئی کہ صبح کی روشنی پھوٹ پڑی۔

''نماز کا وقت نکل گیا حسان۔ میں دو رکعت فرض پڑھ لوں پھر آتی ہوں۔''

حسان نے پلکوں کی جنبش سے اس کو جانے کی اجازت دی۔ بینا نے حسان کے ماتھے پر پیار کیا اور واش روم میں بھی گئی۔

نماز پڑھ کے سادہ چائے کا کپ لے کر وہ بالکنی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ کبھی کبھی اس کو وحشت ہوتی۔ حسان کی طبیعت سے نہیں۔ اُن لوگوں سے جو اپنی انا کو پوجے جا رہے تھے۔ ان میں اس کے اپنے ماں باپ کا نام بھی آتا تھا۔

بالکنی سے سڑک صاف دکھائی دیتی تھی۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ کبھی اس کے پاس بھی آرام دہ خوبصورت کار تھی کبھی وہ بھی رانی بن کر اس میں گھوما کرتی تھی۔ حسان اور اس کے تین سالہ محبت کے دن ......جیسے کوئی حسین خواب تھا۔

اس نے کتنی منت کی تھی مگر امی ابو حسان کے لیے نہیں مانے......ذات پات برادری......لوگ کیا کہیں گے؟ وغیرہ......وغیرہ......

مگر حسان کہاں ماننے والا تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ شادی کرے گا تو صرف سبین احمد سے۔

حسان کے والدین تھے نہیں......سو دونوں نے کورٹ میرج کا فیصلہ کرلیا۔

''تم دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' حسان اس کو ہمیشہ یہی کہتا۔لیکن کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکا۔

سبین نے کئی بار والدین کو منانے کی کوشش کی مگر بے سود۔

ابھی جب وہ چھوٹے چمچ کے ساتھ حسان کو چائے رس کھلا رہی تھی اس کو یاد آ رہا تھا۔شادی کے بعد شاید ہی وہ دونوں گھر پر ناشتہ کرتے ہوں۔حسان کو اٹالین بریک فاسٹ پسند تھا اور اس کو گھر کا انڈہ پراٹھا۔حسان اس کا خوب مذاق اڑاتا اور وہ اس مذاق کو جی بھر کے انجوائے کرتی۔ہنی مون کے لیے وہ دونوں سنگاپور گئے تھے۔سبین نے جان بوجھ کے روز سوشل میڈیا پر تصویریں اپ لوڈ کرتی وہ چاہتی تھی تا کہ اس کی شادی میں روڑے اٹکانے والے جان لیں کہ وہ کتنی خوش ہے اور خوش قسمت بھی۔

حسان خوش تھا۔اور بینا، حسان کے ساتھ پا کر گویا خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتی۔ماں باپ کا نہ ماننا دکھ کا باعث ضرور تھا۔مگر ابھی تو شادی کو چھ ماہ ہی ہوئے تھے۔حسان اس کو یقین دلاتا کہ تھا وہ دن آئے گا جب امی ابو خود سبین کو لینے آئیں گے۔

اس دن سبین کی چھبیسویں سالگرہ تھی۔وہ سارا دن ہی امی کی کال کے انتظار میں گزر گیا۔حسان کو احساس تھا کہ یہ خاص دن ماں باپ کی دعاؤں کے بغیر ادھورا ہے لیکن اس کے پاس تسلی کے لفظوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ دونوں کھانے کے بعد لانگ ڈرائیو پر نکل گئے۔

''شاید میں تھوڑے پرانے خیالات کی ہوں، مجھے لگتا ہے پیرنٹس کی دعاؤں کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں۔'' حسان ہنس دیا۔

''اوہ کم آن......کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''سچ کہہ رہی ہوں۔خود کو دھوکا دینے سے کیا حاصل؟ حسان آج کے دن صبح اٹھتے ہی امی گلے سے لگا کے پیار کرتیں۔دعائیں دیتیں۔ابو شاندار کیک لاتے۔'' حسان سنجیدہ ہو گیا۔

''میری محبت میں کمی دیکھی کوئی؟''

''نہیں......لیکن محبت کا وہ خانہ خالی ہے۔جو......''

سبین کے لفظ ادھورے ہی رہ گئے۔سامنے سے آنے والے ٹرک کی تیز روشنی نے آنے والے دنوں کے سارے چراغ گل کر دیے۔

حسان کے دماغ میں چوٹ لگی تھی۔باقی زخم تو بھر گئے لیکن دماغ والی چوٹ نے اس کو پیرالائز کر دیا۔وہ زندہ لاش بن گیا۔بنا سہارے نہ اٹھ سکتا تھا۔نہ بیٹھ سکتا تھا۔کھانے کے لیے بھی اس کو بچوں کی

طرح ہلکی نرم غذا چاہیے اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے لقموں کی صورت۔اس نے امی کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ابو سے معافی مانگی۔گڑگڑائی کہ مجھے سہارے کی ضرورت ہے۔مگر جو انا کو پوجتے ہیں ان کو کوئی آواز نہیں آتی۔وہ چاہے ماں ہو، باپ یا بہن بھائی۔

ماں نے کہا۔اگر آج تمہیں معاف کر دیا تو تمہاری باقی دونوں بہنیں اس طرح روایات کا گلا گھونٹ کر کورٹ میرج کریں گی۔ابو نے کہا۔جو لڑکیاں بغاوت کرتی ہیں ان کی مشکلیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔

ابو نے صحیح کہا تھا۔آپریشن کے لیے خاصی رقم چاہیے تھی۔اس نے بڑا گھر بیچ کر یہ چھوٹا سا فلیٹ لے لیا۔بس یہی ایک اچھا کام ہوسکا تھا اس میں وہ جانتی تھی ایسی صورت میں وہ کرایے کا مکان کیسے افورڈ کرے گی۔آپریشن ہوا مگر نا کام۔سارے پیسے ختم ہوگئے۔گاڑی پہلے ہی تباہ ہو چکی تھی اونے پونے بک گئی۔ پہلے زیور بکا۔پھر گھر کی ضروری چیزیں جو قطعی غیر ضروری ہو چکی تھیں۔حتیٰ کہ اس نے اپنے نئے کپڑے تک بیچ دیے۔اب وہ مشکلوں میں رہنا سیکھ چکی تھی۔

یہ اس دن کی بات تھی جس دن اس نے گھر کا صوفہ سیٹ بیچا۔حسان کی دوا کا بندوبست ہو گیا۔ اس نے سکون کا سانس لیا اور کئی جگہوں پر جاب کی درخواست دے ڈالی مگر ادھوری تعلیم اور غربت کی منہ بولتی تصویر کو کون نوکری دیتا۔نہ کوئی ہنر......نہ کوئی اسباب......نہ رشوت نہ کوئی سورس۔جو تجربے کے بغیر نوکری دیتے......اس کے بدلے میں وہ سب کچھ چاہتے جس کو دینے کے لیے وہ تیار نہ تھی۔

دوائیاں ختم ہوگئیں۔راشن بھی......اور......شاید ہمت بھی۔سبین رات کی سیاہی میں سیاہ چادر اوڑھے فلیٹ کو تالا لگا کر نکل آئی۔

اس نے سوچا......جب لٹنا ہی ٹھہرا تو......اپنی مرضی سے کیوں نہ لٹا جائے......اور رفتہ رفتہ اس نے خود کو بری بھلی تسلیاں دے کر سمجھا لیا تھا کہ جب بات پیٹ کے دوزخ تک آپہنچے تو حرام حلال ایک ہو جاتے ہیں۔جہاں بیمار کی دوا کے لئے پیسہ نہ ہو......کھانے کے لئے کچھ نہ ہو تب وہ کیا کرے؟

ابھی جانے وہ اور کتنا سوچتی کہ فون کی گھنٹی نے اس کا انہماک توڑا۔اس نے حیرت سے فون پر چمکنے والے نمبر کو دیکھا۔اور دل میں دھڑ دھڑایا۔''امی کی کال۔''اس نے گہرا سانس لیا۔''شاید امی کو مجھ پر رحم آگیا ہے؟''

''السلام علیکم امی۔''اس کی آواز آپ ہی آپ رندھ گئی۔

''مت کہو مجھے امی۔''امی کی غصے سے بھرپور آواز گونجی۔

''تمہیں یہ حق نہیں ہے کہ تم مجھے ماں کہو۔''سبین سانس روکے سن رہی تھی۔

''اور آج سے یہ بھی سمجھ لو کہ میں تمہارے لیے اور تم میرے لیے مرگئی۔'' بینا نے آنسو بہنے دیے۔

''آج ایسا کیا ہو گیا کہ آپ نے پیروں کے نیچے سے زمین اور سر سے آسمان چھین لیا۔'' امی کا بس چلتا تو فون سے نکل کے تھپڑ مارتیں۔

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ کیا ہوا ہے؟ یہ بتاؤ تمہیں آج کل کیا ہو گیا ہے۔ کن عیاشیوں میں گم رہتی ہو۔ میاں کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے لیکن وہ زندہ ہے ناں۔ نہ کہ تم اس کا خیال رکھو......اس کی خدمت کرو۔ تم نے گناہ کا راستہ اپنالیا۔

''آپ کو میرے میاں سے کیوں ہمدردی آ رہی ہے؟''

''اس سے ہمدردی نہیں تم سے نفرت ہو رہی ہے۔ تم نے خود کو کس گند میں گرا دیا ہے۔ چھی چھی۔ مجھے تو یہ سوچ کے ہی شرم آ رہی ہے کہ میں نے تم جیسی آوارہ، بدکردار کو اپنی کوکھ کی چھاؤں میں رکھا۔ تم جیسی بے حیا کو جو راتوں کو اپنی جوانی کالی چادر میں چھپا کر اسے بیچنے کے لیے نکل جاتی ہیں۔''

سبین نے بمشکل اپنے آنسو روکے۔ ضبط کیا اور سپاٹ لہجے میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

''جی امی......کیونکہ اب گھر میں میری جوانی کے علاوہ بیچنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا......''

امی شاید ابھی اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر سبین سننا نہیں چاہتی تھی۔ کوکھ میں رکھنے کا احسان اپنی جگہ مگر رات کی تاریکی میں جو سیاہی وہ اپنے دامن پر خود ملتی ہے اس کا دکھ اپنی جگہ۔

لمبی گہری سانس لے کر ٹھنڈی چائے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اتار کے وہ کمرے میں آ گئی...... جہاں اس کا بے جان سہارا مسکرا کے اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

Khazeena House #63Block
BStreet 4 State life housing society
Lahore03018497006

ماہنامہ الفاظ ہند (جنوری۔ فروری ۲۳)

مدیر	:	ریحان کوثر	نائب مدیر	:	ریاض احمد امروہی
قیمت	:	۵۰ روپے	صفحات	:	۱۰۰

ملنے کا پتہ

دفتر ماہنامہ الفاظ ہند، کاشانۂ کوثر، ڈاکٹر شیخ بنکر کالونی، کامٹی، ناگپور (مہاراشٹرا)

● شاکر انور

ایک دوپہر

''آپ زین انکل ہیں؟''

ایک پانچ سالہ گوری چٹی سنہری آنکھوں والی بچی نے خالص انگریزی لہجے میں پوچھا۔ میں نے گستاوے فلوبرٹ کے ناول ''مادام بواری'' کو پڑھتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں!'' اچانک ہی وہ دور بھیڑ میں گم ہوتی نظر آئی۔ صرف اس کے سرخ رنگ کا لیدر جیکٹ نظر آ رہا تھا۔ میں دیر تک تذبذب اور ایک انجانی سی خوشی کے زیرِ اثر اپنی آنکھوں میں اس کا عکس لیے بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ایک جوان اور خوبصورت عورت مسکراتے ہوئے میرے قریب آئی۔

''شگفتہ بھابی!'' میں نے فوراً پہچان لیا اور اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔ میں ہمیشہ گھبراہٹ یا خوشی کے اظہار کے لیے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ پتہ نہیں اس لمحے کون سا احساس مجھے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

''مجھے تو دیر لگی تھی تمہیں پہچاننے میں۔ دور سے کئی بار دیکھا۔ پھر قریب آ کر دیکھا۔ پھر بھی تھوڑا سا شبہ اور آدھا یقین ہوا۔ پھر میں نے روزینہ کو بھیجا۔ بالکل بدل گئے ہو۔ پہلے دبلے ہوتے تھے اب......''

''ہاں بھابی آدمی دور جا کر دور ہی ہو جاتا ہے۔ قصور اس کا نہیں ہوتا۔ موسم، حالات اور ترجیحات کے چنگل میں پھنس کر بے بس ہو جاتا ہے۔ پھر ہم دونوں کے بیچ بہت سارے سالوں کا سونا اور لمبا فاصلہ بھی تو رہا۔ ایک عرصہ تک ہم دونوں فاصلے کے دوسرے سرے پر کھڑے رہے...... ہے نا شگوفہ بھابی!''

''ارے! تم نے یہ کیا یاد دلا دیا۔ 'شگوفہ!' یہ تو علی کہا کرتے تھے پلیز! آئندہ اس نام سے مت پکارنا۔''

''سوری! بھابی مجھے کہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔'' میں شرمسار ہو کر نیچے اپنے سامان کی جانب دیکھنے لگا۔ میرے لہجے میں تھوڑی سی تلخی تھی۔

''ممی بات نہیں کرنا چاہتیں۔'' سعد کا واٹس ایپ بار بار لپکتا ہوا میرے ذہن کو کچوکے لگاتا رہا۔

''آپ کو کچھ پتہ چلا؟''

''ہاں!'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''کیسے؟''

''میں ہمیشہ آپ لوگوں کے قریب ہی رہا۔آپ سے دوری کے باوجود بھی۔''

''آپ لوگوں کے یا میرے۔''

''بات تو ایک ہی ہے۔''

''نہیں، بات ایک نہیں زین! میری اپنی ایک شخصیت ہے۔ایک الگ دنیا ہے۔''

''ہم کسی سکون کی جگہ پر چل کر بیٹھیں۔روزینہ بھی اکیلی ہوگی۔''میں جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سے اسکلیٹر کا ایک سرا ختم ہوجاتا تھا اور دوسرا شروع ہوجاتا۔اس لیے مسافروں کا آنا جانا لگا تھا۔

میں نے اپنے ہینڈ کیری کو اٹھالیا۔وہ آگے چلنے لگیں۔مجھے لگا وہ مجھ سے بہت آگے ہیں۔ میں ان کے سائے کو بھی نہیں چھوسکتا۔کبھی کبھی آسمان پر اڑتے ہوئے کسی بادل کے ٹکڑے کو اپنی مٹھی میں بند کرنے کی ادھوری سی خواہش جیسی۔

ہم دونوں روزینہ کے قریب بیٹھ گئے۔وہاں پر سرمئی اندھیرے کی باریک سی پرچھائیاں تھیں۔سامنے ڈیوٹی فری شاپس میں سجی مصنوعات تیز روشنی میں منعکس ہورہی تھیں۔روزینہ نے مجھے دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہیلو کہا اور اپنے موبائل پر جھک گئی۔

''پاکستان کیسے یاد آگیا؟ سنا تھا کہ ہمیشہ کے لیے آپ نے رابطہ ختم کردیا تھا۔''

''ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔''وہ چپ ہوگئیں۔دیر تک ان کی آواز ہوا میں جیسے لٹکی رہی۔

''اور تم!''

''بیٹی کے پاس سے آرہا ہوں۔وہ عجمان میں رہتی ہے۔''

میں نے سامنے والے اسٹال سے ڈونٹس اور آئسکریم خرید کر دونوں کے سامنے رکھ دیئے۔

''پزا بھی مل رہا ہے۔لاؤں؟''

''تم کو اب تک میری پسند ناپسند یاد ہے۔خاص کر پزا!''

ان کی آنکھوں میں ڈھلی ڈھلی سی روشنی اچانک چمک اٹھی۔میں اس روشنی کے تعاقب میں بھاگنا چاہتا تھا جیسے کوئی معصوم ننھا سا بچہ تتلی کو دیکھ کر......مگر وہ روشنی ایک نور کی طرح چمکنے لگی۔میرے بچپن کی دوستی جن میں عزت اور احترام کی خوشبو تھی۔ایک وعدہ تھا جو ہم دونوں دوستوں کے درمیان تھا۔ روزینہ ڈونٹ (DONUT) کھانے میں محو تھی۔اور دوسرے ہاتھ میں آئسکریم تھی۔

''اسے ڈونٹ بہت پسند ہیں۔''بھابی نے صرف مسکرا کر کہا۔

''یہ بچی؟''

میں پوچھنا نہیں چاہتا تھا مگر جانے کیوں اور کیسے منہ سے الفاظ پھسل پڑے۔

''علی کی انگریز بیوی کی بیٹی ہے۔ ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ علی کے بعد وہ بالکل تنہا تھی۔ میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ صرف انگریزی ہی بول سکتی ہے اردو تھوڑا بہت سمجھ لیتی ہے۔''

''کیا ہوا تھا علی کو؟'' میں نے ایک چاکلیٹ نکال کر روزینہ کی طرف بڑھایا۔ وہ مسکرائی۔

''تھینکس ......'' اس کی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''موت تو دور تھی۔ وہ خود ہی اُس کے قریب چلے گئے۔''

بھابی کے چہرے پر کوئی اداسی کا سایہ بھی نظر نہیں آیا جیسے وہ ایک بہت معمولی بات کا ذکر کر رہی ہوں۔

''ویسے وہ ہمیشہ تمہارا تذکرہ کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ زین میری غربت کا ساتھی ہے۔ ان کے سعودیہ جانے کے بعد جس طرح تم نے ہم لوگوں کی دیکھ بھال کی وہ بہت ممنون تھے۔ وہ سعودیہ میں کئی میڈیکل اسٹورز کے مالک ہوگئے تھے پھر نہ جانے کیوں کینیڈا کے لیے ذہن بدل گیا۔ ساری چیزیں فروخت کر کے وہ وہاں پہنچ گے۔ نیا شہر، نیا ماحول، پہلے کچھ تو اچنبھا سا رہا پھر خرابیاں نظر آنے لگی، ہر نئے شہر میں ایسا ہی لگتا ہے۔ اس کے بعد بیحد اچھا لگنے لگا۔ نئے لوگوں سے تعلقات نے نئی ڈگر پر ڈال دیا دیر سے گھر آتے۔ کام کا بوجھ زیادہ تھا......مگر نہیں۔ عورت کا بوجھ تھا جب باپ کے قدم ڈگمگا جائیں تو بچوں کو کون روک سکتا ہے۔ بیٹا، بیٹی دونوں ڈیٹس (Dates) پر جانے لگے۔ ایک رات علی جب گھر آئے تو ان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ سیدھا بستر پر جا کر لیٹ گئے۔ میں بھی بے نیند سونے کی کوشش کرنے لگی کہ اچانک دوسرے کمرے میں کھٹکا سا ہوا، دل کسی چمگادڑ کی طرح اندھیرے میں پھڑ پھڑایا۔ سونی کے کمرے سے ایک سایہ باہر نکل رہا تھا۔ میں نے علی کو جگانے کی کوشش کی اس کے جسم کو چھوا، پھر ٹٹولا ہر کونے کو...... میرے ہاتھ خالی کے خالی رہے۔ اس کے جسم پر کسی دوسری عورت کی بہت ساری نشانیاں تھیں۔ شاید میرینا کے، جو بعد میں اس کی داشتہ بن کر رہی۔ اس کے بعد سے میں اس سے بہت دور، بہت دور ہوتی چلی گئی۔ لیکن پھر بھی عورت تو بچوں کی خاطر اپنے مرد سے جڑی رہتی ہے۔ جب میرے بچے میرے نہ رہے تو میں کیوں؟ شراب اور شوگر نے اسے مار دیا۔ آدمی کبھی اکیلا نہیں مرتا زین! وہ اپنے ساتھ اپنے سارے خواب اور دوسروں کی خوشیوں کو لے کر مرتا ہے یا مار دیتا ہے۔'' وہ ہانپنے لگیں۔

''مرتے مرتے بھی علی نے جو کچوکے دیئے میں ان سے زخمی ہوگئی ہوں۔ وہ بھی تمہارے ساتھ بہتان لگا کر۔''

''میرے ساتھ!'' میں حیران ہوا۔

''ہاں! تمہیں خزاں کی وہ دوپہر یاد ہے؟ میں حیدری سے 2K میں بیٹھ کر پاپوش جارہی تھی۔ سعودیہ جانے میں چند دن باقی تھی مجھے بہت ساری شاپنگ کرنا تھی، اچانک ہی مجھے مائیگرین کی دھمک محسوس ہوئی۔ یہ درد آنے سے پہلے خبردار کردیتا ہے، پھر خوفزدہ کر کے پوری قوت سے سر کے آدھے حصے کو اپنے شکنجے میں کس لیتا ہے۔ یہ درد بھی عجیب سا ہوتا ہے۔ مارتا ہے، مرتا ہے اور نہ مرنے دیتا ہے بس! آدھے سر میں غراتا رہتا ہے...... میں درد سے خوفزدہ ہوگئی اور پاپوش میں اتر کر ڈگمگاتے قدموں سے سر پکڑ کر تمہارے گھر چلی گئی۔ باہر تیز جھلسا دینے والی گرم ہواؤں کا پاگل پن تھا۔

''یاد ہے نازین!'' وہ کچھ دیر رکیں۔

''تم مجھے دوپہر کے سناٹے میں دیکھ کر حیران اور کچھ خوفزدہ سے ہوگئے اس وقت تم کوئی افسانہ لکھ رہے تھے۔ میں تمہیں اپنی کیفیت بتاتے ہوئے دھڑام سے تمہارے بستر پر گر پڑی۔ بھابی گھر میں نہیں تھیں۔ تم اکیلے تھے۔ اف وہ خوبصورت اندھیرا، ہلکی ہلکی پنکھے سے آتی ٹھنڈک اور خاموشی جو مجھے سکون دے رہی تھی۔ میں کب تک سوتی رہی۔ یاد نہیں، کب جاگی یہ بھی یاد نہیں۔ بس! بھابی کا زرد خوفزدہ چہرہ ابھی تک یاد ہے جب انہوں نے مجھے اپنے بستر پر لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔'' وہ کچھ دیر رکیں۔

''تمہیں کچھ یاد آیا زین؟'' ان کی آنکھوں پر ایک چھوٹا سا بادل تیرنے لگا۔

''ہاں! وہ دوپہر...... وہی دوپہر جس نے مجھے بھی تباہی کے دہانے کھڑا کردیا تھا۔''

میں اپنے ماضی کو کریدنا نہیں چاہتا تھا لیکن ایسا نہ کرسکا۔ میرا ماضی، وہ دوپہر سب کچھ جیتا جاتا میرے سامنے آ گیا، منہ کھولے۔ میری بیوی روتی، چیختی میری بے وفائی کی دہائیاں دے رہی تھی۔ مجھ پر اسے کبھی اعتبار نہیں تھا۔ اور آج اس نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ آخر کار وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ بیٹی کو میرے پاس چھوڑ کر۔ میرا دکھ ایک جگہ سے مڑ کر دوسری طرف کروٹ لینے لگا۔ بیٹی کا پالنا، ایک تنہا مرد کے لیے ویسے ہی ہے جیسے صحرا میں تتلی کو تلاش کرنا۔

بھابی کو میں نے کچھ نہیں بتایا کہ میں بھی اسی زرد دوپہر کا ڈسا ہوا ہوں۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ سر جھکائے۔ اپنے ماضی کے خیالوں میں گم۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہیں۔ نظروں کی ایک غیر مرئی قوت سے جو مجھے بدحواس کرنے کے لیے کافی تھی۔

''تم کو کیسے معلوم ہوا؟'' انہوں نے پوچھا۔ وہی سوال وہ جو کر چکی تھیں۔ کبھی کبھی ایک ہی سوال بار بار کرنے کے باوجود بھی اطمینان نہیں ہوتا۔

''فیس بک سے، میں نے سعد کا نمبر ڈھونڈ کر اسے فون کیا مگر جواب نہیں آیا پھر واٹس اپ پر میسیج کیا۔کافی دنوں سے آپ سبھوں کا کوئی حال معلوم نہیں تھا۔پانچ سال قبل ابو کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کا روکھا سا جواب آیا۔اور تم لوگ کیسے ہو کینیڈا میں کہاں ہو۔میں نے پھر پیغام بھیجا۔

کوئی جواب نہیں آیا۔میں نے ایک پیغام مزید بھیجا۔

ممی سے بات کرادو۔

''ممی بات نہیں کرنا چاہتیں،اس کے اس جواب سے میں مایوس ہو گیا۔میں نصف مایوس مگر نصف پر اعتماد تھا پھر اسے بلاک کر دیا۔''

''او خدا!'' بھابھی کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

''مجھے یقین نہیں ہوا۔میں آپ کو جانتا ہوں۔شاید بہت اچھی طرح۔''

''مجھے کچھ نہیں معلوم کہ سعد سے تمہارا رابطہ کب ہوا؟اس سے تو ہمارا رابطہ بھی نہیں۔وہ برسوں سے ایک انگریز لڑکی کے ساتھ دوسرے شہر میں رہتا ہے۔''

''کافی لاتا ہوں'' میں اٹھ کر آگے بڑھا۔سامنے کاؤنٹر سے کافی اور اپنے لیے چائے لے کر آیا اور ان کی طرف بڑھایا۔

''تمہیں اب تک یاد ہے کہ مجھے کافی پسند ہے۔'' بھابی نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں!اور شکر صرف ایک چمچہ۔''

''یاد رکھنا اپنے بس کی بات نہیں ہوتی بھابی، یاد تو آسمان پر پورے چاند کی طرح ہوتی ہے جہاں بھی جاؤ،ساتھ ساتھ رہتی ہے۔''

''ہاں!'' وہ ہنسیں۔ان کی دھیمی سی گنگناتی ہوئی ہنسی پر میں حیران رہ گیا۔وہ تو ہمیشہ زوردار قہقہے کے ساتھ ہنستی تھیں۔عریاں سی بے باک مردانہ ہنسی، جو دوسروں کو پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی۔ مجھے ان کی ہنسی بری لگتی تھی، میرا دل چاہتا کہ ہنستے وقت ان کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دوں۔

میں نے روزینہ کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں پر تکان کا سایہ سا نظر آیا۔وہ مسافروں کو دیکھتی رہی پھر ایک طویل انگڑائی لے کر جمائیاں لیتے ہوئے کانوں سے ائیرفون نکال کر بھابی کے شانے پر سر رکھ کر اپنی آنکھیں موند لیں۔

''بہت پیاری سی بچی ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھابی سے کہا۔

''ہاں واقعی کون کہتا ہے کہ اولاد کی محبت کبھی مرتی نہیں۔اسے دیکھو! مجھے اس سے بیحد محبت

ہے۔اپنی اولاد کی طرح۔شاید اس سے زیادہ۔اس لیے اسے پاکستان لے جا رہی ہوں ہوں درندوں کے شہر سے دور۔''

''درندے تو ہر جگہ ہوتے ہیں!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ایسا نہیں ہے زین! کچھ لوگ اکیلے کمرے کی تنہائی میں سوئی ہوئی عورت کی بھی حفاظت کرتے ہیں۔'' ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کا بھنور سا ابھرا۔

''شاید بے وقوف ہوتے ہیں وہ۔'' پہلی بار ان کی آنکھیں اندھیرے میں پانی کی طرح چمک اٹھیں۔

''کیوں زین؟'' مجھے چھیڑا۔

''نہیں۔نہیں میں مذاق کر رہی تھی۔وہ تو پیغمبروں کی طرح ہوتے ہیں۔''

میری طرف دیکھتے ہوئے وہ جھک سی گئیں۔میرے اندر ایک عجیب سی ٹھنڈی تھرتھراہٹ سمٹ کر میری بے قراری میں بدلنے لگی۔جیسے میں کچھ اور بھی ان کے منہ سے سننا چاہتا ہوں میں دوسری طرف سے آنے والے مسافروں کو دیکھنے لگا مگر دھیان ان کی طرف لگا ہوا تھا ان کے ہونٹوں پر اب تک وہ لاپرواسی مسکراہٹ کا نرم سایہ سا پھیلا ہوا تھا۔

''ویسے زین!'' وہ خاموشی سے کچھ کہنے کے لیے الفاظ اور ہمت کو اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ساتھ ہی اپنی انگلیوں کی نیل پالش کو بے دھیانی میں کھرچتی جا رہی تھیں۔

''ویسے زین!'' ایک بار وہ الفاظ پھر ان کے ہونٹوں پر آئے جیسے وہ الفاظ کوئی وزنی پتھر ہوں جسے وہ اپنی شہادت کی انگلیوں سے کھسکانا چاہتی ہوں۔پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''اسی دوپہر نے مجھے ذلیل کر دیا حالانکہ ہم دونوں جانتے ہیں کہ ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں تھا۔وہ میرے بیحد قریب آ کر کہنے لگیں۔

اس دوپہر کی بات میں نے اپنی سادگی میں ایک بار علی کو بتادی۔کبھی کبھی پیار کا نشہ شراب سے زیادہ مدہوش کن ہوتا ہے۔اس رات میں اسی پیار کے نشے میں اس کی بانہوں میں لیٹی ہوئی تھی۔سب کچھ اسے بتادیا۔مجھے کیا پتہ کہ وہ اتنا سیریس ہو جائے گا تم پر جو اسے دوستی کا ناز تھا چکنا چور ہو جائے گا،اس دن کے بعد سے اس نے تمہارا نام بھی نہیں لیا اور پھر ایک رات نشے میں اس نے بد چلنی کا الزام لگا کر مجھے طلاق دے دی۔

آج اتنے برسوں بعد ملے ہو دل چاہتا ہے کہ اپنے آنسوؤں سے خود کو ہلاک کر ڈالوں۔'' وہ کھسک کر میرے بہت قریب آ گئیں۔وہ جھکی ہوئی اپنے آنسوؤں کو قالین پر جذب ہوتے دیکھتی رہیں۔

میرا دل چاہا کہ ان آنسوؤں کو ان کے خوبصورت رخسار سے پونچھ ڈالوں۔ہاتھ آگے بڑھایا ان کے

گالوں کے بیحد قریب مگر پھروہی ہاتھ بے خیالی میں روزینہ کے بالوں تک جا پہنچے۔میں پیغمبروں کی طرح جو تھا۔

''طلاق کا صدمہ میرے لیے اتنا بڑا نہیں تھا۔ جو مجھے اس کے ساتھ رہتے ہوئے شراب کے نشے میں اس کی ہوس کو ہر رات پورا کرنا تھا۔ میں پہاڑ جیسے گناہ کے بوجھ تلے ہر رات مرتی اور اس کے لیے موت کی دعا کرتی۔ قدرت نے میری سن لی۔'' انہوں نے ایک طویل سانس لی۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئیں جیسے وہ ادا کیے ہوئے الفاظ سے خود خوفزدہ ہوں ''کسی بھی عورت نے اپنے شوہر کی موت کے لیے دعا نہیں مانگی ہو گی۔ میں وہ بدقسمت ہوں۔''

ارے! میں تو مسلسل اپنی ہی کہتی گئی تمہارے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔

''اتنے عرصے کہاں رہے۔ بھابی اور بیٹی سائرہ اور پھر تمہاری کہانیاں تو خوب شائع ہو رہی ہوں گی کتنی کتابیں آ گئیں بہت مشہور ہو گئے ہو گے۔ ہیں نا!''

''میں نے شہرت کے لیے کبھی نہیں لکھا، جینے کے لیے لکھتا ہوں۔ میری بیوی تو اسی دوپہر کے بعد مر گئی تھی۔ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔ آپ کے ساتھ گذارے لمحات کو الزام بنا کر۔''

میں خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں شاید ایک ساتھ طوفان کے ایک بہاؤ میں بہتے چلے گئے۔

''اف خدایا! یہ کیسی دوپہر تھی جس نے ہم دونوں کو یکساں جلا ڈالا۔'' وہ یک دم سنجیدہ ہو گئیں چہرے پر زرد کرب صاف نمایاں ہو گیا تھا۔ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ خاموشی تھی جو ہم دونوں کو کبھی قریب لے آتی اور کبھی دور کر دیتی۔ روزینہ بدحواس سی تھکن سے چور تھی۔

''انکل سے شیک ہینڈ تو کرو، وہ سمجھیں گے کہ تم غیر مہذب ہو۔'' بھابی کی بہترین انگریزی نے مجھے چونکا دیا۔ وہ پھر بھی خاموش رہی صرف آنکھیں جھپکا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ نرم گلابی، پھول سے ہاتھ۔ جیسے گلاب کی چند پنکھڑیاں میرے ہاتھ کی شاخ پر ٹکی رہ گئی ہوں۔ اچانک کچھ دیر بعد مجھے پتہ چلا کہ اس کا ہاتھ تو اب تک میرے ہاتھ میں ہے، اس نے چھڑایا اور نہ میں نے چھوڑا۔ ایک شرمندگی نے مجھے مرجھا دیا۔

''ٹورنٹو سے بیس گھنٹے کے سفر نے اس بچی کو ہلکان کر دیا اور پھر کراچی کی فلائیٹ کا دو گھنٹے لیٹ ہو جانا۔''

''لیکن آپ تو فریش لگ رہی ہیں۔'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ظاہر ہمیشہ انسان کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ اندر جھانکو گے تو صرف کھوکھلا پن ملے گا زین۔ اچھا۔ ایک بات پوچھوں!''

''جی!''

''سگریٹ پینا کب سے چھوڑ دیا۔ چائے کے بعد بھی نہیں۔''

''بہت عرصہ ہوا۔ کسی کو پسند نہیں تھا۔''میں نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور آپ کا زوردار قہقہہ؟''

''بڑی مشکلوں سے اپنی عادت بدلی ہے زین۔ سچ مچ بڑی مشکلوں سے! کسی کو پسند نہیں تھی۔ میری ہنسی۔''ہم دونوں ایک ساتھ ہی مسکرا رہے تھے۔

ایکسکیوزمی! کہہ کر بھابی سامنے Travelex نئی ایکسچینج کے کاؤنٹر پر آ گئیں اور چند ہی منٹ بعد نوٹوں کو تبدیل کرا کر واپس آ گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں ڈھیر سارے پاکستان کرنسی تھے۔ ڈالر کے مقابلے میں کم تر......وہ خوش تھیں مگر مجھے صدمہ سا تھا۔

''کراچی جانے والے مسافر گیٹ نمبر تین سے جہاز میں داخل ہوں۔ جہاز روانگی کے لیے تیار ہے۔''اناؤنسمنٹ ہوا۔ مسافروں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی مگر پہلے بزنس کلاس والوں کو اندر جانے کی اجازت ملی۔ بھابی نے بیتابی سے اپنا سامان اٹھایا۔ میں نے ان کی مدد کی خواہش ظاہر کی۔

''زین! میں اپنا بوجھ خود اٹھانے کی عادی ہو چکی ہوں۔''کہتی ہوئی وہ روزینہ کے ساتھ اندر چلی گئیں۔ آگے جا کر مجھے پلٹ کر ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ میرا ہاتھ ہوا میں ہی رہا۔ کچھ کہہ نہیں سکا۔ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ انہوں نے فون نمبر، پتہ، کچھ بھی نہیں دیا اور نہ مجھ سے مانگا۔

بیٹھے بیٹھے خوف میں گندھا ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔''ممی آپ سے بات کرنا نہیں چاہتیں۔''

''نہیں......ایسا نہیں۔''

میں اپنی سیٹ پر بیٹھا ایک تشویش بھری مسکراہٹ کے ساتھ دور آسمان کے اجالے کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کے ساتھ گذارے لمحوں کو یاد کرنے لگا۔ میرے ساتھ موٹر سائیکل پر کبھی حیدری اور کبھی طارق روڈ جاتے ہوئے۔ ایک دن اچانک بریک لگ جانے سے وہ مجھ سے بیحد قریب ہو گئیں۔

''کیا کر رہے ہو؟''مصنوعی غصے سے پوچھا۔

''جان بوجھ کر بریک لگائی تم نے۔''

''اسپیڈ بریکر۔''میں نے بھی کچھ شوخی، کچھ بیبا کی سے کہا، پھر میرا ٹرانسفر جدہ ہو گیا۔ سب سے زیادہ خوش علی تھے۔

''زین! اب تم اپنی بھابی اور بچوں کو سنبھالو! مجھے نوٹ کمانے دو۔''

جدہ کے مشہور کبابش میں کھانے کی میز پر علی نے مجھ سے کہا تھا۔ان کی آنکھوں میں میرے لیے اعتبار کا روشن چراغ تھا۔اوپر مدھم روشنی کا سائبان تھا۔

ایک شام شاہراہِ مدینہ کی کشادہ سڑک پر کورونیش جاتے ہوئے بھابی نے مجھ سے دھیرے سے سرگوشی میں کہا۔

اب تو پیچھا چھوڑ دو۔میں صرف مسکرا سکا اور خاموش رہا۔بچوں نے کچھ نہیں سنا۔

قدرت کا یہ انوکھا کھیل تھا۔وہ بار بار میرے قریب آجاتیں یا شاید میں ان کے نزدیک۔یا شاید ہم دونوں ایک ساتھ۔سوچنے میں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

خیالات تو بادل کی طرح ہوتے ہیں کبھی مشرق،کبھی مغرب کے انتہا تک اور پھر واپس لوٹ آتے ہیں۔

اچانک جہاز کی روشنی کم ہوگئی۔ائیر ہوسٹس نے آکر سیٹ بیلٹ باندھنے کی تلقین کی۔پھر سامنے کھڑی ہوکر جہاز کے ایمرجنسی اگزٹ اور دوسری معلومات کا ہاتھوں کے اشاروں سے ڈیمو دیا۔ میں نے سامنے والی سیٹ کے عقب میں لگے اسکرین کو دبا کر فلم Life of pi دیکھنے لگا۔جہاز ۳۲ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا رہا۔

''ایکسکیوزمی''

''میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔''بھابی کی خوبصورت مترنم آواز نے مجھے چونکا دیا۔وہ کھڑکی والی سیٹ جس پر میں بیٹھا تھا،اشارے کررہی تھیں۔

''......اب تو پیچھا چھوڑ دو۔''میں نے ان کو جگہ دیتے ہوئے کہا۔اچانک ہی وہ اس پرانی زوردار ہنسی کو نہیں روک سکیں اور قہقہے لگانے لگیں۔

''باہر تو صرف اندھیرا ہے بھابھی!''میں نے ان پر جھکتے ہوئے کھڑکی سے باہر اشارے کیے۔

''کوئی نہ کوئی کرن تو ڈھونڈ ہی لوں گی۔تم فکر مت کرو۔''

ان کے بدن سے آتی Givenchy Eude کی خوشبو میرے پاس آکر ٹھہر گئی۔پھر اپنے ریشمی پروں میں لپیٹ کر سرور کی ایسی بلندی پر پہنچا دیا جہاں سے میں گہری خود فراموشی میں ڈوبتا چلا گیا۔

◀◀ ● ▶▶

C1-255 Haroon Royal City Phase1
Gulistan Johar Block 17 Karachi
Tel 92 3003507014 923332908834

● احسان قاسمی

تم

''تم ملی تو تھیں......!''

''ایڑی، دوڑی، تلّی، چوڑی، چمپا، ڈھیک، ستلا......''

''کھٹاک......!''

''اوماں......!!'' زناٹے کے ساتھ اُڑتی گلّی تمہاری کمر پر جا لگی تھی۔ میں نے تمہیں کچّی سڑک کے بیچ ایک کراہ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں تمہاری جانب دوڑ پڑا تھا۔ تمہارے داہنے ہاتھ میں تھما جھولا سڑک پر گر پڑا تھا۔ مجھے دیکھ تم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تمہارے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے سرسوں تیل کی شیشی جوٹ کی بنی رسی سے بندھی یوں جھول رہی تھی گویا کسی مجرم کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا ہو۔ میں نے سڑک پر گرا جھولا اٹھا کر تمہیں تھمایا تو اس کے بوجھ سے تمہاری پتلی گردن تن کر کچھ اور لمبی ہوگئی تھی جیسے للّو پنڈت کی بنائی صراحی کی پتلی اور لمبی گردن، گرمیوں کے دن جس سے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے قل قل کی صدا آیا کرتی تھی۔ لیکن تمہارے منھ سے کوئی آواز نہ نکلی بس تم ٹکر ٹکر میرا منھ تکے جا رہی تھیں۔ تمہاری نگاہوں میں دیئے سے جھلملا رہے تھے۔ میں ان روشن دیوں کی تاب نہ لا سکا اور میرا سر خم ہوگیا تھا۔ پھر تم آہستہ خرامی کے ساتھ اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگئی تھیں۔

تمام دوست دور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے اور اس بات سے خوفزدہ تھے کہ تم گھر جا کر اس واقعے کا ذکر اپنے باپ سے ضرور کروگی اور للّو پنڈت اپنا سونٹا جس سے وہ خشک مٹی کے ڈھیلوں کو پیٹ پیٹ کر برادے کی شکل عطا کیا کرتا تھا، ہاتھ میں تھامے ہماری خیریت دریافت کرنے ضرور پہنچ جائے گا، لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔

للّو پنڈت واقعی بڑا فنکار تھا۔ اس کے ہاتھوں بنائے گئے دیئے دیوالی کی شب گاؤں کے ہر گھر کی دہلیز، آنگن اور کھلیان میں روشن ہوا کرتے تھے لیکن تمہاری آنکھوں کے روشن دیوں نے مجھے محصور کر لیا تھا۔ ایک عجیب سی مقناطیسی کشش جس نے میرے وجود کے چاروں طرف اپنا گھیرا ڈال دیا تھا۔

وقت کا چاک تمہارے سراپا کو ہر دن نئی نئی رعنائیاں عطا کر رہا تھا جیسے للّو پنڈت کچی مٹی کی لوئی کو اپنی فنکارانہ چابکدستی سے دیدہ زیبی عطا کیا کرتا تھا۔

لڑکیاں ذرا عجلت میں رہا کرتی ہیں۔ ایک دن ہم تمام دوست اسی کچی سڑک کے کنارے اشوک

کے پیڑ پر چڑھ کر ڈول پتہ کھیل رہے تھے کہ یکا یک چمڑیا ڈھول کی ڈم ڈم اور شہنائیوں کی گونج کانوں میں آئی ۔دیکھا تو آگے آگے ڈولی لئے کہار، درمیان میں بیس بائیس لوگ زرد رنگ سے رنگی دھوتیاں اور گلابی چھینٹوں سے پر سفید کرتے پہنے اور گردنوں پر نئے مدراسی گمچھے ڈالے چلے آرہے ہیں اور ان سب کے پیچھے پانچ سات افراد ڈھول، تاشے اور شہنائیاں لئے ....لیکن میں تو حیرت زدہ سا صرف ڈولی کی جانب تک رہا تھا جہاں نائلان کے گلابی پردوں کی اوٹ سے دو مضطرب آنکھیں باہر جھانک رہی تھیں۔لیکن ان آنکھوں کے دیوں کا تیل شاید چک گیا تھا اور سلگتی باتیوں سے کثیف دھواں اٹھ رہا تھا۔سارا منظر دھندلا چکا تھا۔

''تم ملی تو تھیں.......................!''

ضلع ہائی اسکول گراؤنڈ میں ایک دن فٹ بال کھیلتے ہوئے مجھے منڈل سر نے دیکھا تھا۔وہ میرے کھیلنے کے انداز سے متاثر ہوئے۔انہوں نے میری کوچنگ شروع کی تھی۔ان کی کاوشوں سے ٹاؤن کلب فٹبال کی ٹیم میں میری شمولیت ہو پائی تھی جو مجھ جیسے کم عمر کھلاڑی کے لئے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ڈسٹرکٹ اسپورٹس ایسوسی ایشن کے سکریٹری اور مایہ ناز فٹبال کھلاڑی شری امل مجمدار عرف نپو دا نے میری آبیاری کی ۔رفتہ رفتہ میرے کھیل کا چرچا ہر خاص وعام کی زبان پر جاری ہو گیا۔میں نے بچپن سے ہی عبدالصمد صاحب کا نام سن رکھا تھا۔وہ ہمارے ہی شہر کے رہنے والے اور ضلع ہائی اسکول کے طالب علم رہ چکے تھے۔منڈل سر اور نپو دا نے ان کے بارے میں جو تفصیلات بیان کیں انہوں نے مجھے ان کا دیوانہ بنا دیا۔ وہ دنیائے فٹبال کے عظیم ترین کھلاڑی تھے ۔دنیا آج بھی انہیں 'فٹبال کا جادوگر' کے نام سے یاد کرتی ہے۔موہن بگان رتن ایوارڈ یافتہ مشہور فٹبالر شری اوما پتی کمار نے، جب ۷۷ء میں مہان فٹبالر پیلے ایک دوستانہ میچ کھیلنے کے سلسلے میں کلکتہ تشریف لائے تھے، صمد صاحب کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا کہ'' آج پوری دنیا پیلے کے کھیل کی دیوانی ہو رہی ہے مگر یہ بدقسمتی ہے کہ لوگوں نے صمد کا کھیل نہیں دیکھا۔وہ ایک پیدائشی کھلاڑی تھے اور گیند کے ساتھ کوئی بھی کارنامہ انجام دے سکتے تھے۔''

منڈل سر نے بتایا کہ طالب علمی کے زمانے میں صمد صاحب اپنے گھر سے اسکول آتے اور جاتے وقت گیند لے کر ہی چلا کرتے تھے۔لگاتار پریکٹس سے ان کے اندر ایسی استعداد پیدا ہو گئی تھی کہ گیند ان کی دونوں ٹانگوں کے درمیان سے باہر نکل ہی نہیں پاتی تھی گویا کہ ٹانگوں کے ساتھ چپکی ہوئی ہو۔آسٹریلیا میں ایک میچ کے اختتام پر میدان میں ہی کئی خواتین نے ان کی پنڈلیوں کو چھو چھو کر اس بات کا اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان کی پنڈلیوں میں مبادا کوئی گوند جیسی شئے تو نہیں لگی ہے؟

صمد صاحب کے بہت سارے قصے آج بھی مشہور ہیں ۔۱۹۵۲ء میں چین کے شہر پیکنگ میں انہوں نے ہاری ہوئی بازی آخری پندرہ منٹوں میں اکیلے متواتر چار گول داغ کر پلٹ دی تھی جبکہ وہ زخمی

حالت میں تھے اور اسی لئے کوچ نے انہیں شروع میں کھیلنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ایسے بھی کئی واقعات ہیں کہ ان کا شاٹ گول پوسٹ سے ٹکرا کر واپس آ گیا یا کارنر شاٹ گول میں تبدیل نہیں ہو پایا تو انہوں نے چیلنج کیا کہ گول پوسٹ کی ماپ درست نہیں ہے اور ماپنے کے بعد ان کی بات درست ثابت ہوئی۔

صمد صاحب نے انگلستان میں وہاں کی روائل ٹیم کے خلاف پانچ عدد گول داغ کر اسے شکست فاش دی تھی۔ ایک غلام کی اتنی جرأت؟ انگریز تلملا اٹھے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ ان کے ساتھ کوئی انہونی گھٹ جاتی لیکن ان کے بہی خواہ چند انگریز کھلاڑی انہیں لے کر میدان سے فرار ہو گئے تھے۔

آزادی کے بعد صمد صاحب مشرقی پاکستان میں جا بسے اور ہمارے شہر کے لوگ انہیں بھول گئے۔ حکومت نے بھی ان کی خدمات کو فراموش کر ڈالا اور بعد ازاں جو اسٹیڈیم صمد صاحب کے نام سے تعمیر ہونا چاہیے تھا وہ اُس وقت کی وزیر اعظم کے نام سے منسوب ہوا۔ یہ سیاست داں بھی کتنی صفائی کے ساتھ ہر میدان اپنے نام منسوب کر لیتے ہیں۔

صمد صاحب کے یہ قصے سن کر مجھ پر صمد ثانی بننے کا پاگل پن سوار ہو چکا تھا۔ جب میں مخالف ٹیم کے خلاف گول داغتا اور ناظرین کی تالیوں کی گڑگڑاہٹ میرے کانوں تک پہنچتی میری چھاتی چوڑی ہو جاتی اور مجھے یوں محسوس ہوتا گویا تالیوں کی اس گڑگڑاہٹ کے درمیان صمد صاحب کی تالیاں بھی موجود ہوں۔

انٹر اسٹیٹ ٹورنامنٹ کھیلنے کے لئے ہماری ٹیم ایک دوسرے شہر کو گئی تھی۔ میری کاوشوں اور بہتر کھیل کے مظاہرے کی وجہ سے ہماری ٹیم نے ٹورنامنٹ کی چمپئن ٹیم کا خطاب اپنے نام کیا۔ مجھے مین آف دی ٹورنامنٹ کے اعزاز سے نوازا گیا۔ ٹورنامنٹ کے خاتمے کے بعد میں اسی شہر میں قیام پذیر اپنے ماموں جان کے گھر دو تین دنوں کے لئے چلا گیا کیونکہ ان کا کافی اصرار تھا۔ واپسی کے سفر کے دوران بس حادثے کا شکار ہو گئی۔ کئی افراد جاں بحق ہو گئے۔ میری جان بچ تو گئی مگر جانگھ کی ہڈی کئی حصوں میں منقسم ہو گئی۔ کافی علاج کے باوجود حسب سابق نہ ہو سکی۔ صمد ثانی بننے کا میرا سپنا چور چور ہو گیا۔ مجھے لگا تم مجھ سے روٹھ گئی ہو اور اب میرے چاروں طرف فقط اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

''تم ملی تو تھیں.........!''

ہمارے شہر کو امسال نیشنل اسکول گیمس (فٹبال اور والی بال) کی میز بانی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ میں ان دنوں بمشکل چل پھر پاتا تھا لیکن دوستوں کی حوصلہ افزائی کی خاطر کسی نہ کسی طرح میدان میں ضرور حاضر ہوا کرتا تھا۔ لڑکیوں کے فٹبال سیمی فائنل میچ کے دوران میں نے پہلی دفعہ تمہیں دیکھا تھا۔ واقف کار دوستوں نے بتایا کہ تمہارا نام آشامنی ہیم برم ہے اور تم مقامی گرلس ہائی اسکول کی طالبہ ہو۔

میرے خدا! کیا کمال کی فٹنس پائی تھی تم نے۔ جس وقت تم رائٹ ونگ اسٹرائکر کے روپ میں فٹبال لئے مخالف ٹیم کے گول پوسٹ کی جانب تیزی سے دوڑ لگاتیں میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو

جاتے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا گویا سنتھال پرگنہ کی سیہ فام پہاڑیوں اور گھنے جنگلات سے پُر کسی گمنام وادی میں کوئی مادہ چیتا برق رفتاری کے ساتھ اپنے شکار کا تعاقب کر رہی ہو۔ کسی کھلاڑی میں یہ دم نہ تھا کہ وہ تمہاری راہ مسدود کر پائے۔ تم نے تنہا مخالف ٹیم کے ڈیفینس کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔

حالانکہ فائنل میچ منی پور کی ٹیم نے کانٹے کی ٹکر کے بعد چار کے مقابلے پانچ گولس سے جیت لیا تھا لیکن ہر شخص کی زبان پر تمہارا چرچا تھا اور تمہارے کھیل کی ہی تعریف تھی۔

کالج کے پہلے دن ہی انگلش زبان کے کلاس میں تم نظر آ گئی تھیں اور میں حیرت انگیز مسرت سے دوچار ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ ہمارے درمیان بات چیت کا سلسلہ دراز ہوا۔ میرا فٹبال کھیلنا منقطع ہو چکا تھا لیکن دلچسپی بہرحال برقرار تھی۔ میں نے تمہیں چند کارآمد ٹپس بھی دیئے تھے۔ گفتگو کے دوران ایک دن تم نے خود کے بارے میں بتایا کہ تمہارا آبائی وطن سنتھال پرگنہ کا جرمُنڈی قصبہ ہے۔ برسوں قبل تمہارا باپ اپنے چند رشتہ داروں کے ساتھ یہاں آ کر سنتھال ٹولہ میں بس گیا تھا۔ یہاں اس نے مہوا کی شراب اور ہڑیا (چاول کی شراب) بنانے کا دھندا شروع کیا جس سے اچھی خاصی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ تقریباً چار سال قبل اس نے چند لوگوں کے بہکاوے میں آ کر شراب کو مزید نشہ آور بنانے کی غرض سے اس میں دھتورے کی آمیزش کر دی تھی۔ اس زہریلی شراب کے استعمال سے چودہ افراد کی موت واقع ہو گئی جن میں اس کا باپ بھی شامل تھا۔ اس حادثے کے بعد اس کی ماں شہر کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں صفائی کرمچاری کی حیثیت سے کام کرنے لگی۔ اسی محدود آمدنی میں دونوں ماں بیٹیوں اور دو چھوٹے بھائیوں کا گزارہ ہو رہا تھا۔

سیکنڈ ایئر تک آتے آتے تمہاری شہرت آسمان کی بلندیاں چھونے لگی تھی۔ یونیورسٹی کی ٹیم کے علاوہ خواتین کی صوبائی فٹبال ٹیم میں بھی تمہاری شمولیت ہو چکی تھی۔ میری مسرت کی انتہا نہ تھی۔ میں اپنی محرومیاں بھولتا جا رہا تھا اور تمہارے اندر مجھے اپنا عکس نظر آنے لگا تھا۔ پھر یکایک تمہارا کالج آنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے سوچا شاید علالت یا کسی اور وجہ سے چند دنوں کے لئے یہ غیر حاضری ہے لیکن میری یہ سوچ غلط تھی کیونکہ تم پھر کبھی کالج میں نظر نہ آئیں۔

تقریباً ایک سال بعد ایک مشہور اخبار میں ایک خبر پر میری نظر پڑی۔ خبر کے ساتھ تمہاری تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ نامہ نگار نے لکھا تھا۔ ''فٹبال کی ایک ابھرتی ہوئی کھلاڑی جو حالات کے ہاتھوں ہار گئی اور اسے سہارا دینے والا کوئی آگے نہ آیا۔''

اس آرٹیکل میں تمہارے حالات بیان کئے گئے تھے جس سے معلوم ہوا کہ کسی موذی مرض میں مبتلا ہو کر تمہاری ماں بھی چل بسی تھی اور مجبور ہو کر تمہیں اسی پرائیویٹ اسپتال میں ماں کی جگہ پر ملازمت کرنی پڑ رہی تھی۔

تصویر میں تم اسپتال کی نیلی وردی میں ملبوس مسکرا رہی تھیں اور تمہارے ہاتھ میں ٹرافی کی جگہ وائپر تھا۔ تمہاری

مسکراہٹ نے میرے دل پرایک گھونسا ساجڑ دیا تھا۔اس دن میں پھوٹ پھوٹ کررویا تھا۔ہم آخرکس طرح کے سسٹم میں جی رہے ہیں؟ایک ہونہار کھلاڑی کی کھوج خبر لینے والا کوئی نہیں......نہ میں،نہ کالج،نہ یونیورسٹی اورنہ حکومت۔

''تم ملی تو تھیں.........................!''

میرے ذہن میں گونجتے سوالات کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ ہمارے پاس ایسا سسٹم کیوں نہیں ہے کہ حقدار کواس کا حق ملے اور پرتبھا کوسمّان حاصل ہو؟

پھرایک دن، داس کیپیٹل ، نامی کتاب میرے ہاتھ لگی۔ میں معاشیات کا طالب علم تھا لیکن اب تک میں نے جو کچھ پڑھا تھا یا مجھے پڑھایا گیا تھا یہ کتاب اس کے بالکل برعکس تھی۔ میں جوں جوں اس کتاب کا مطالعہ کرتا گیا حقائق پرت درپرت میرے سامنے کھلتے گئے اور میں نے محسوس کیا کہ کارل مارکس نے اپنی اس کتاب کا نام گرچہ جرمن زبان میں 'داس کیپیٹل' رکھا ہے لیکن ہماری اپنی زبان میں بھی اگر ہم غور کریں تو حقیقتاً آج کے دور میں ہم انسان کیپیٹل یعنی سرمایہ یا سرمایہ داروں کے داس بن چکے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام جوایک غیر ذی روح یعنی پونجی کے گرد طواف کرتی ہے، یہاں انسان کی کوئی وقعت نہیں بلکہ قیمت ہے بازار کی۔اس کے مرکز میں ذی روح انسان نہیں، لہذا یہاں کسی طرح کے humanism or ethics کے اصولوں کا تصور بھی نہیں۔اس نظام کے آگے آشامنی ہیم برم کی کیا اوقات؟؟

داس کیپیٹل میرااوڑھنا بچھونا بن چکی تھی۔میرے دل ودماغ،خیالات ونظریات پراس نے قبضہ جمالیا تھا ۔مزید تعلیم کے لئے میں نے ایسی یونیورسٹی کاانتخاب کیا جواشتراکی نظریہ کا گڑھ مانا جاتا تھا۔ڈاکٹریٹ کی سند حاصل ہونے کے بعد مجھےاسی یونیورسٹی میں لیکچررشپ بھی حاصل ہوگئی۔میرے مضامین لگاتار دیش بدیش کے اخبارات و جرنلز میں شائع ہونے لگے جس کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر میرے کام کے چرچے ہونے لگے۔میرے سروے رپورٹس حقیقت کے قریب تر ہوا کرتے تھے اور بینک ریٹ،ایس ایل آر،سی آرآر،ریپوریٹ،انفلیشن،اوپن مارکیٹ آپریشنز یاجی ڈی پی وغیرہ سے متعلق میرے اندازے بھی۔جوکام سرکار کی پوری ٹیم کیا کرتی،میں تنہا کیا کرتا تھا۔

''تم ملی تو تھیں.....................!''

جب میں نے تمہارا گھونگھٹ اٹھایا توماں کے حسنِ انتخاب کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔میری راہوں میں ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے تھے۔تمہاری محبت میں سرشار دن ورات،ماہ وسال کیسے گزرے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔

''تم ملی تو تھیں...................!''

نرسنگ ہوم میں جب تم نے پہلی بار چمکتی نگاہوں سے مجھے دیکھا......گلاب کی تازہ پتیوں جیسے تمہارے نرم ونازک ہونٹوں پرایک سبک سی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ماں نے جب تمہارے نرم ونازک وجود کواٹھا کر میری گود میں

ڈالا یقین جانو میں بہت ڈر رہا تھا۔لیکن پھر تو میں نہال ہو اٹھا تھا۔چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں،نور ہی نور...... !

وقت پنکھ لگائے اڑتا رہا۔تمہاری شادی دھوم دھام سے کروائی اور میں نانا بھی بنا۔

’’تم ملی تو تھیں..............................!‘‘

مجھے کئی نیشنل اور انٹرنیشنل ایوارڈز حاصل ہو چکے تھے لیکن حکومتِ وقت میرے افکار و نظریات سے مطمئن نہ تھی۔مجھ پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ میں شہری نکسلی (NaxalsUrban) پیدا کر رہا ہوں اور میرا وجود اس پونجی وادی سماج کے لئے ایک بڑا خطرہ ہے۔مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔

کئی سال بعد ضمانت پر لوٹ کر آیا ہوں اور ساتھ میں کورونا بھی لے آیا ہوں۔یوں تو میں ساری زندگی پونجی وادی،سیاسی،مذہبی اور فرقہ وارانہ جنون کے وائرس سے نبرد آزما رہا ہوں لیکن غالباً کورونا وائرس میرے دفاعی نظام پر بھاری پڑ رہا ہے۔شاید یہی خالقِ حقیقی کی مرضی ہے۔آخر نئی نسل کو بھی تو اسی دھرتی پر پھولنا پھلنا ہے۔جب نئی کلیاں نکلتی ہیں تو پرانے پھولوں کو بکھرنا ہی پڑتا ہے۔

میں جانتا ہوں تم جا رہی ہو۔ڈاکٹر بتا رہے تھے ساٹھ فیصد پھیپھڑے جواب دے چکے ہیں،آکسیجن سلنڈر جلدی جلدی خالی ہو رہے ہیں۔ان کی فراہمی میرے افراد خاندان کے لئے ایک پریشان کن مسئلہ ہے۔

جاؤ......جاؤ......ضرور جاؤ لیکن میری ایک بات سنتی جاؤ۔تمہیں وہ کچی سڑک یاد ہے نا؟ارے وہی......جس پر بچے سائیکل کی پرانی ٹائر لئے تیزی سے دوڑا کرتے تھے اور وہ بچے بھی جو بیلچہ چھاپ دھاگے پر مانجھا چڑھایا کرتے تھے،پتنگ بازی ان کا شوق تھا۔مانجھے والے دھاگے سے ان کی نرم و نازک انگلیاں جب زخمی ہو جایا کرتی تھیں تو ان کی مائیں اپنے ہاتھوں سے انھیں کھانا کھلایا کرتی تھیں۔ہاں ہاں......وہی لڑکے جو پتھر پر لٹو کی گونج تیز کیا کرتے تھے اور ریٹھا کے بیج پکے فرش پر رگڑ کر اپنے ساتھیوں کی کلائیاں داغا کرتے تھے اور اکھاڑے میں کشتیاں لڑا کرتے تھے اور کچے امرود کے ٹکڑے کرنے کیلئے دروازے کی چوکھٹ اور پلّوں کے درمیان رکھ کر پلّے کو پوری قوت سے دبایا کرتے تھے اور......اور جو امرود کی وائی شیپ ٹہنی کاٹ کر غلیل بنایا کرتے تھے اور......اور جو آندھی آتے ہی جھولے لے کر آم کے باغ کی جانب دوڑ پڑتے تھے......جاؤ......ضرور جاؤ......لیکن اب وہ بچے تمہیں وہاں نہیں ملیں گے......تمہیں......تمہیں تو موٹے،بدوضع اور سُست بچے ہی ملیں گے جو شام کے وقت کسی پارک کی آہنی بینچ پر ایک دوسرے سے لاتعلق،خاموش اور سر جھکائے بیٹھے ہوں گے......فقط ان کی انگلیاں حرکت میں ہوں گی اور وہ ایک ورچوئل ورلڈ میں کھوئے ہوئے ہوں گے۔

◀◀ ● ▶▶

Noori Nagar, Khanchi Haat, Purnia
Mob: 9304397482

● عشرت ظہیر

درپردہ

اس نے نیم پلیٹ کو غور سے دیکھا۔ کندہ تھا۔ڈاکٹر ایم۔ ڈبلیو خان ایم بی بی ایس، ایم ڈی (سائیکی ٹرسٹ) پھر وہ، کلینک میں داخل ہوگئی۔ ریسپشن کاؤنٹر پر پہنچ کر اپوائنٹمنٹ کے لیے ضروری معلومات درج کرائی۔ اسے ڈھائی گھنٹے بعد کا وقت ملا تھا۔ یہ وقت اسے ویٹنگ ہال میں گزارنا تھا۔ وہ ایک چیئر پر بیٹھ گئی اور موبائل میں مشغول ہوگئی۔ وقت تو گزر رہی جاتا ہے، سو یہ وقت بھی گزر گیا، اور اس کی باری آ گئی۔

وہ ڈاکٹر کے چیمبر میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا، اور معاً اس کے حلق سے حیرت آمیز چیخ نکل گئی۔

’’غزالہ......‘‘

’’غزالہ؟ نہیں میں فائزہ ہوں۔‘‘ اس نے کہا ’’غزالہ میری ممّا کا نام ہے۔‘‘

’’اوہ......بیٹھو۔‘‘

’’آپ میری ممّا کو جانتے ہیں؟ میں ممّا کی طرح دکھتی ہوں نا؟‘‘

’’تمہاری ممّا کو......نہیں......میں نہیں جانتا۔‘‘

’’پھر آپ نے ان کا نام کیوں لیا؟‘‘

’’میں نے ان کا نام نہیں لیا۔ تمہاری آنکھیں ہرن کی آنکھوں جیسی، روشن اور پرکشش ہیں...... اس لیے......‘‘ پھر کئی تکلیف دہ اور خاموش لمحے دونوں کے درمیان حائل رہے۔

بسا اوقات انسان اپنی زندگی میں رونما ہونے والے غیر ارادی اور غیر متوقع واقعے کو کوئی معنی نہیں دے پاتا لیکن ایسے لمحے، دیر تک اور دور تک اپنی اثر انگیزی کے باعث چبھتے ہیں۔ بالآخر پشیمانی اور خجالت کے غبار سے باہر آتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔

’’تو......مس فائزہ......بتایئے آپ کو کیا تکلیف ہے۔‘‘

’’مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ ہاں کچھ الجھنیں ہیں، جو مجھے پریشان کرتی ہیں۔‘‘

’’ذرا تفصیل سے بتائیں، آپ کس شہر سے ہیں، اور کیا آپ تنہا آئی ہیں؟‘‘

’’جی،......میں میرٹھ سے ہوں اور یہاں تنہا آئی ہوں۔‘‘

’’تنہا! لیکن کیوں؟‘‘

’’میرا ایسا کوئی نہیں، جس کا ساتھ رہے......اور، میں آپ سے اپنی الجھنیں توڈِسکس کرنا چاہتی ہی ہوں، لیکن یہاں مجھے میرے پاپا کو تلاش کرنا ہے......‘‘

’’پاپا کو تلاش کرنا ہے......کیا مطلب ہوا، میں کچھ سمجھا نہیں۔‘‘

’’میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ میں انھیں نہیں جانتی......میں انھیں بہت مس کرتی ہوں......‘‘

’’کیسے تلاش کریں گی آپ انھیں، ان کا کیا نام ہے؟‘‘

’’وقار......وقار نام ہے، ان کا۔ مجھے پتہ نہیں، میں انھیں کیسے تلاش کروں گی۔‘‘

’’اور آپ کی ممی؟‘‘

’’انھیں فرصت نہیں ہوتی۔ بہت کام کرتی ہیں۔ سماج سیوا۔ بیواؤں کے لیے۔ شوہر کی زیادتی کی شکار خواتین کے لیے، طلاق شدہ عورتوں کے لیے، اور جانے کیا کیا۔ ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا ہے، اس وقت میں یہاں اپنے شہر سے سینکڑوں کلومیٹر دور، آپ کے سامنے ہوں...... پتہ نہیں ممّا میرٹھ میں ہیں یا کسی دوسرے شہر میں کسی فنکشن کی صدارت کر رہی ہیں یا کوئی پارٹی اٹینڈ کر رہی ہیں......‘‘

’’تو آپ تنہا رہتی ہیں؟‘‘

’’نہیں تنہا نہیں رہتی، مگر تنہا ہوں۔‘‘ پھر ڈاکٹر نے، اس کی حالت زار کو سمجھنے کے لیے، اس کے ذہنی رویے، اور دوسروں کے ساتھ اس کے بی ہیویئر کو جاننے کے لیے کئی سوالات کیے۔ فائزہ ڈاکٹر کے استفسار پر اپنی تخلیق کردہ خیالی دنیا میں لوٹ گئی۔

فائزہ کی اسکول، کالج اور اب یونیورسٹی میں بھی کوئی دوست، کوئی ہم نوا نہیں تھی۔ اس کی کسی سے بنتی ہی نہیں تھی۔ بس ایک نائلہ تھی۔ اس کے پاپا نہیں تھے، اور وہ کم گو، الگ تھلگ رہنے والی لڑکی تھی۔ فائزہ اور نائلہ دونوں بیسٹ فرینڈ تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے درد کی شریک تھیں۔ فائزہ دوسری کلاس میٹ سے چڑتی تھی۔ ایک دفعہ اسے ایک کتاب کی اشد ضرورت تھی، وہ کتاب اسے دستیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس کی ایک کلاس میٹ نے اپنے پاپا سے کہہ کر اس کے لیے وہ بک منگوا دی۔

’’فائزہ۔ یہ بک لو۔ میں نے پاپا سے کہہ کر تمہارے لیے منگوائی ہے۔‘‘ اس کی کلاس میٹ شگفتہ نے کہا۔ فائزہ نے اس کے ہاتھ سے بک جھٹک کر دور پھینک دیا، اور برہمی کے ساتھ بولی۔

’’تم......تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو، مجھ پر احسان کرنے کا شوق چرایا ہے، اور تمہارے پاپا کو مجھ

سے ہمدردی جتانے کی، ترس کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے ہمدردی کرنے والوں سے نفرت ہے۔‘‘

اسکول کے زمانے میں پیرینٹس ڈے ہوتا، یا اب کالج یونیورسٹی میں کوئی فنکشن ہوتا۔ وہ کھوئی کھوئی اداس اور متفکر رہتی۔ فنکشن میں شریک بھی نہیں ہوتی۔

اکثر رات نیند میں ڈر جاتی۔ چیخ کر بیدار ہوتی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ وہ خواب دیکھتی، وہ ایک چھوٹی سی بچی ہے...... لمبا چوڑا صحن والا اس کا مکان ہے۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں سے آنگن میں کھیل رہی ہے۔ اس کے پاپا، اس کے ساتھ ساتھ، اس کی محافظت میں چل رہے ہیں کہ کہیں وہ ڈگمگا کر گر نہ جائے، اسے چوٹ نہ آجائے۔ پھر وہ دیکھتی ہے...... اس کے سامنے کھلونوں کا ڈھیر لگا ہے...... کچن سیٹ، فروٹس، اور طرح طرح کے جانور...... بکری، چیتا، شیر اور...... اور ڈائناسور...... وہ ان سے کھیل رہی ہے۔ اچانک ڈائناسور، پھیلنے لگتا ہے...... بڑا ہونے لگتا ہے...... اس کی شبیہہ بھیانک ہوجاتی ہے...... اور وہ زندہ ہوکر اس کی طرف جارحانہ تیور کے ساتھ بڑھنے لگتا ہے...... وہ مڑ کر دیکھتی ہے۔ اس کے آس پاس کوئی نہیں۔ اس کے پاپا بھی نہیں...... وہ چیخ پڑتی ہے، اور اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور ہوتا ہے، وہ متوحش اور سراسیمہ چاروں طرف دیکھ رہی ہوتی ہے۔

اس کی چیخ سن کر ممّا آتی ہیں۔ اُسے بہلاتی ہیں، تسلی دیتی ہیں۔ پھر تنبیہہ کے طور پر کہتی ہیں۔

’’تم سینے پر ہاتھ باندھ کر سوتی ہو، اس لیے ایسے ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔‘‘

لیکن ممّا کی دلجوئی دیرپا نہیں ہوتی، محض چند وقفے وہ اس کے پاس رہ کر تسلی کی باتیں کرتی ہیں اور پھر...... وہی ازلی وابدی میلوں سناٹا اور صدیوں کی خاموشی......

ایک دن...... ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ کرتے ہوئے، اس نے اپنی ممّا سے دھیرے سے کہا۔

’’ممّا مجھے یہ تارا آنٹی بالکل نہیں بھاتی...... آپ کوئی دوسری آیا رکھ لیں۔‘‘

’’کیوں۔ انھوں نے ایسا کیا کیا ہے۔‘‘

’’کیا کچھ نہیں۔ مگر مجھے انھیں دیکھ کر لگتا ہے۔ یہ زندہ نہیں ہیں۔ یہ مری ہوئی ہیں۔ ان کا چہرہ لاش کی طرح سُتا ہوا...... بے رونق...... زندگی کی کوئی رمق نہیں۔‘‘

’’اف...... او...... فائزہ۔ تمھیں کیا ہوگیا ہے۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو۔ توبہ...... نہیں، بیٹی، کسی کے بارے میں ایسا نہیں کہتے۔ کیوں تم نگیٹیو سوچتی ہو۔‘‘

چند دن بعد، تارا ان کے گھر سے کچھ نقد رقم اور چند زیورات لے کر فرار ہوگئی۔ فائزہ کی ممّا تارا کی حرکت سے ششدر رہ گئیں۔ لیکن فائزہ کے لیے یہ سکون اور راحت کا سبب تھا۔

ڈاکٹر نے فائزہ کو کچھ ہدایات دیں اور صرف ایک کیپسول، دن میں ایک بار لینے کے لیے، یا بے چینی اور اضطراب کی کیفیت طاری ہونے پر مزید ایک اور ڈوز استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔

فائزہ کلینک سے نکلتے وقت کسی قدر پرسکون تھی۔

چند روز بعد نیشنل پارک میں ڈاکٹر نے جاگنگ کے دوران دیکھا، فائزہ متانت کے ساتھ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کی طرف آ رہی ہے۔

''تم...... تم...... یہاں۔''

''جی — میں اکثر مارننگ واک کے لیے نکل پڑتی ہوں۔''

''اچھا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ اور اس کے بہت قریب ہو کر شفقت کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا، اور اسے ساتھ لیتے ہوئے، دھیرے دھیرے سامنے پتھر کے بینچ کی طرف بڑھا۔

فائزہ نے محسوس کیا، وہ ایک چھوٹی سی بچی ہے، اور ابھی قدم قدم چلنا سیکھ رہی ہے، وہ گر نہ جائے، چوٹ نہ لگے، اس خدشے سے اس کے پاپا بھی محافظت میں اس کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہے ہیں! سنگی بنچ پر بیٹھنے کے بعد، ڈاکٹر نے اطمینان کے ساتھ پوچھا۔

''بتاؤ، کیا حال ہے تمہارا۔''

''اچھی ہوں۔ پہلے والی حالت تو مستحکم نہیں۔ لیکن وقفے وقفے سے خیالوں کی یورش کے دائرے بڑھنے اور پھیلنے لگتے ہیں۔''

''فائزہ...... تم اپنی مدد خود کر سکتی ہو۔ پینٹنگ بناؤ، سنگنگ میں دلچسپی لینا شروع کرو، یا لائٹ لٹریچر...... تفریحی اور مزاحیہ کتابوں کے مطالعے کی عادت اپناؤ......''

''کوشش کرتی ہوں، لیکن کیا کوئی اور میڈیسین نہیں تجویز کریں گے۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے ایک کیپسول دیا ہے۔ وہ بھی محض قلب کو راحت دینے والی ہے، مسکن ہے۔ تم اچھی ہو، اور نارمل ہو...... بس اپنی سوچ، اپنی فکر کو قابو میں کرنے کے لیے، تھوڑی توجہ دینی ہے۔ اپنی مدد آپ کرنی ہے۔''

دو دن بعد، وہ پھر اسی سنگی بنچ پر بیٹھے نظر آئے۔

فائزہ کہہ رہی تھی۔

''میں کوشش کرتی ہوں۔ میں نے یوٹیوب سے کچھ لٹریچر منتخب کیے ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی کیا مگر اکثر مقامات پر مجھے جھٹکے لگتے ہیں۔ میں بعض رویے کو کسی طور قبول نہیں کر پاتی ہوں۔ ان کتابوں میں ہوس کو محبت کہتے

ہیں۔ لوگ محبت کو نہیں سمجھتے، ہمدردی الگ شے ہے، کسی کی حالت زار پر اظہار تاسف، جذبۂ محبت نہیں۔ محبت......یہ تو......نہایت لطیف......اور نازک احساس ہے...... یہ ہمدردی کی ملاوٹ اور دلجوئی کی کثافت سے بوجھل ہو جاتی ہے......اسے خالص رکھنے کے لیے، بے غرض ہونا پڑتا ہے۔ جس سے محبت کی جائے، اس کی خوشی کا خیال رہے، اس پر کوئی دباؤ نہ بنائیں......اور، اس محبت، اس جذبے کے عوض کوئی مطالبہ کوئی بدلے کی چاہ نہ ہو......ایسی خالص محبت کہاں؟ مجھے ممّا کی محبت میں بھی ملاوٹ دکھتی ہے۔ وہ مثبت جذبے سے عاری ناموری، کی چاہ میں سرگرداں ہیں......اکثر ان کا چہرہ بھی مجھے پژمردہ، بے رونق اور زندگی کی رمق سے یکسر خالی نظر آتا ہے......

ڈاکٹر نے محسوس کیا، وہ اپنے بندھے ٹکے، جارحانہ خیالات کے حصار میں قید ہے۔ حالانکہ اکثر موقعوں پر لگتا ہے وہ کمپرمائزنگ رویّے کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے۔

ایک دن اس نے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے۔ یہ لڑکا، یہ مردہ چہرے والا لڑکا، سیٹی بجا کر مجھے تنگ کرتا ہے۔ مجھے ٹارچر کرتا ہے۔ اس کا تعفن زدہ وجود، مجھے بے پناہ کیسے ہے۔'' ڈاکٹر نے محسوس کیا، وہ پریشان ہے، اور ڈپریشن کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ڈاکٹر نے کچھ کہا نہیں۔ ذہن کی بدلتی کیفیتوں، اور اتھل پتھل سے، وہ خوب واقف تھا۔ تاہم پرتشویش انداز میں اس نے فائزہ کی طرف گہری نظر ڈالی اور پھر اس کے شانے کو نرمیت سے پکڑ کر اسے اپنے قریب کر لیا، اور دھیرے دھیرے اس کی پیٹھ پر تھپکی دینے لگا۔ اس کے بعد......اگلے چار دنوں تک فائزہ کا اَتہ پتہ نہ رہا۔ پھر اچانک موبائل میسنجر پر اس کا میسیج آیا۔

''میں آپ کے مشوروں پر عمل کرنا چاہتی ہوں۔ بہت حد تک عمل کر بھی رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں ایک پینٹنگ بناؤں جسے دیکھ کر لوگ تعریف کریں۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ اپنے بچوں کی پہلی پینٹنگ پر محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی سوچتی ہوں، کوئی ہو جو، میری پینٹنگ کو فیس بک پر توصیفی نوٹ کے ساتھ پوسٹ کرے......مگر شاید اب یہ ممکن نہیں......دو دن سے میں سیٹی ہاسپٹل میں ہوں۔ میری کووڈ رپورٹ پوزیٹیو آئی ہے۔ اس وقت میں کووڈ ہال، بڈ نمبر 3 پر......زیر علاج ہوں۔ بخار بہت تیز تو نہیں، لیکن سردی کھانسی سے پریشان ہوں۔''

ڈاکٹر نے سوچا، عیادت کے لیے جانا چاہیے۔ مگر پھر خیال آیا، ممکن ہے وہ میرے اس اقدام کو اپنے لیے میرا جذبۂ ترحم سمجھے، اور دل میں میری طرف سے بھی ایک گرہ بٹھالے۔ اگلے دن پھر ایک میسیج ریسو ہوا۔

''مجھے کچھ راحت محسوس ہو رہی ہے۔ میڈیکل اسٹاف بہت اچھے ہیں۔ یہ پوری توجہ کے ساتھ میری نگہداشت کرتے ہیں۔ میرے بڈ کے سرہانے ایک بڑی سی کھڑکی ہے جس سے باہر کی تازہ ہوا آتی

ہے۔ وہاں نیم کا ایک گھنا پیڑ ہے، جس کی ڈالیوں پر پرندے بیٹھے چہچہاتے رہتے ہیں۔ جس سے اس ہال کا ماحول جاں فزا اور فرحت بخش ہے۔''

اگلے دن اس کا میسیج تھا۔

''میری داہنی جانب بڈ پر ایک بزرگ پیشنٹ ہیں۔ یہ خوب باتیں کرتے ہیں......خوش کن، حیات افزا اور محبت آمیز باتیں...... مجھے ان سے گفتگو کر کے تازگی اور انبساط کا احساس ہوتا ہے۔لیکن آج مجھے کچھ تکلیف سوا ہے۔ سینے میں گھٹن کا احساس ہو رہا ہے......لگتا ہے گویا سانسوں کی آمد و شد تھم رہی ہے.....

ڈاکٹر نے میسیج پڑھنے کے بعد فیصلہ کیا، آج ہاسپٹل ضرور جاؤں گا۔ ڈاکٹر جس وقت ہاسپٹل پہنچا، کووڈ ہال بڈ نمبر ۳ خالی تھا۔ اس نے بغل کے بیڈ کی طرف دیکھا، وہ بھی خالی تھا۔ اس نے پاس کھڑی نرس سے پوچھا۔

''اس بڈ پر ایک بوڑھے شخص تھے وہ کہاں ہیں؟''

''نہیں۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ تو خالی ہی تھا۔''

پھر اس نے غور کیا، ہال میں کہیں ایسی کھڑکی نہیں تھی جس سے باہر کا منظر......پیڑ اور پرندوں کی چہچہاہٹ آتی ہو......تو کیا......تو کیا......اس کے میسیج کی باتیں، اس کی بے لوث اور خالص محبت کے نشان تھے۔ اسے لگا، وہ کہہ رہی ہو، محبت میں تقاضائے محبت ضروری نہیں......جس سے محبت کرو، اس کے آرام، اس کی سہولت کا خیال کرو، اسے ہر کلفت اور پریشانی سے بچائے رکھو......

ڈاکٹر نے قریب کھڑی نرس سے پھر پوچھا۔

''اور اس بڈ نمبر ۳ پر، جو لڑکی تھی، وہ......وہ کہاں ہے؟''

اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے اسے آئی۔ سی۔ یو میں ٹرانسفر کیا گیا ہے......وہ وینٹیلیٹر پر ہے، آکسیجن بھی لگا ہے......

اچانک ڈاکٹر کے قدم لڑکھڑائے، اُسے گہری سناٹگی کا احساس ہوا۔ نرس نے ڈاکٹر کی کیفیت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا وہ آپ کی بیٹی ہے؟''

نہیں۔ میں اسے نہیں جانتا، لیکن.....

◀◀ ● ▶▶

House No: 370A 4th Floor
Gali No:6A Zakir Nagar(Near Arif Cement)
New Delhi-110025 Mob:9801527481

● شفقت محمود

عکس بر عکس

میرا نام اشفاق احمد شہاب ہے۔معصومہ ابتسام سے میرا پہلا تعارف چند سال پہلے فیس بُک پر ہوا۔میری طرح وہ بھی ایک افسانہ نگار تھی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ فیس بُک کی دنیا میں دوستی کا سلسلہ تارِ عنکبوت کی طرح دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔مکڑے اور مکوڑے،مکھیاں اور مکڑیاں سب اسی تارِ عنکبوت سے بندھے نظر آتے ہیں۔گوشۂ ادب میں بَنے اور بُنے ہوئے ایسے ہی تارِ عنکبوت پر میری طرح وہ بھی موجود تھی۔وہ محض موجود نہیں بلکہ سرگرم وسرگرداں بھی تھی۔ ہر دم لگتا تھا کہ وہ اس جالے کو دراز سے دراز تر کرتی جارہی ہے۔اس کی بیباکیاں اور بیتابیاں اس کے اسٹیٹس کی کھڑکی سے جھانکتی اور تاکتی نظر آتی تھیں۔میرے دیکھتے ہی دیکھتے غالباً اسی تاک جھانک کے نتیجے میں رہ گزاروں کے علاوہ اس کے اطراف ایک ''حلقۂ شوق'' قائم ہو گیا تھا جن میں سے ہر فرد آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا۔وہ ظالم مگر بلا کی افسانہ نگار تھی۔ممنوعہ اور متنازعہ موضوعات کا چناؤ اور پھر سنگین اور رنگین اندازِ بیاں اس کے افسانوں کا طرۂ امتیاز تھے۔کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم کی ارواح اس کی ذات میں حلول کر گئی ہیں۔یقیناً اس کے افسانوں میں بیہودگیاں باہیں کھولے قاری کی منتظر ہوتی تھیں۔

(۲)

یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے کہ معصومہ ابتسام مجھ جیسے محتاط شخص کی فرینڈز لسٹ میں کیسے شامل ہوئی؟ میں بآسانی نہ تو کوئی نیا تعلق جوڑتا ہوں اور نہ کسی جڑے ہوئے تعلق کو توڑتا ہوں۔ جب اس کی فرینڈ ریکوئسٹ آئی تو فوراً قبول کرنے سے احتراز برتتے ہوئے حسبِ عادت میں نے اس کی وال پر پہنچ کر اپنی ''تفتیش'' شروع کی۔ابتدائی اندازے کے مطابق اس کی آئی ڈی فیک لگی کیونکہ وہ ڈی پی میں اپنی تصویر لگانے کے بجائے کبھی عصمت چغتائی اور کبھی واجدہ تبسم کی تصاویر لگاتی تھی۔لیکن دوسری طرف وہ جینوئن بھی لگتی تھی۔میرا مشاہدہ ہے کہ فیک آئی ڈیز والے افراد عموماً اِدھر اُدھر سے چیزوں کو شئیر کرتے رہتے ہیں۔لیکن اس کی وال پر بہت سی تحریریں طبع زاد لگتی تھیں،اور مشترکہ دوستوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔یہی وجہ تھی کہ میں نے اس کی فرینڈ ریکوئسٹ پر کوئی بھی فیصلہ مؤخر کر دیا،مگر کب تک؟ میری پبلک پوسٹس پر اس

کے کمنٹس ،مشترکہ فورَمز اور مشترکہ دوستوں کی تعداد میں اضافہ، فیس بک کی آئے دن یاددہانیاں۔ بالآخر میں نے اس کی پینڈِنگ ریکوئسٹ قبول کرلی۔ اس نے انباکس آکر میرا خصوصی شکریہ ادا کیا؛ میں نے ایک رسمی سا جواب دے دیا، لیکن آنے والے دنوں میں اس کے افسانوں میں حدتیں اور میری سردمہری میں شدتیں بڑھتی چلی گئیں۔ میں اسے مسلسل نظرانداز کررہا تھا۔

(۳)

پھر یوں ہوا کہ میرے لیے اسے نظرانداز کرنا ممکن نہ رہا۔ ایک مشترکہ دوست نے اپنے فورَم پر لگنے والے معصومہ ابتسام کے نئے افسانے پر مجھے مینشن کرتے ہوئے میری رائے مانگ لی تھی۔ ایک اور بیباک افسانہ میری رائے کا منتظر تھا۔ میں نے شدید تنقید کرتے ہوئے لکھا۔

’’اس افسانے کو پڑھ کر مجھے بیحد مایوسی ہوئی۔ بیبا کیوں اور بیہودگیوں کے جو پھول مصنفہ نے کِھلائے ہیں ان سے دنیائے ادب کی فضا عطر بیز تو نہیں ہوسکتی، تعفن انگیز ضرور ہوسکتی ہے۔ بیبا کی کے اس مظاہرے کے باوجود بھی وہ نہ عصمت چغتائی بن سکتی ہیں اور نہ واجدہ تبسم؛ محض معصومہ ابتسام ہی رہیں گی۔‘‘

حقیقت یہ ہے کہ معصومہ کی بیبا کی کی مذمت کرتے ہوئے میں خود کچھ بیباک ہوگیا تھا۔ ادب کے قرینے بھول کرتا دیب پر اتر آنا ،یقیناً یہ اپنے حق سے تجاوز تھا۔ اب اس جر ؟ تِ رندانہ پر خود ہی حیران و پریشان تھا کہ جانے اب معصومہ کی جانب سے کیا جواب آئے۔ بعد میں پتا چلا کہ میرا خدشہ فضول تھا کیونکہ فورَم کے اصول کے مطابق وہ صرف شکریہ ادا کرنے کی مجاز تھی اور بس!

(۴)

مجھے یہ خوش فہمی نہ تب تھی نہ اب ہے کہ میں کوئی چھوٹا موٹا دانشور ہوں لیکن اُن دنوں کبھی کبھار اپنا ہی کوئی قول اپنے اسٹیٹس پر لگالیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اسٹیٹس لگایا۔

’’بدقسمتی مجرّد حقیقت نہیں تصور بھی ہے۔ بدقسمت ہے وہ شخص جو اپنے آپ کو خوش قسمت نہیں سمجھتا۔‘‘

دوسرے دن صبح کسی دوست نے انباکس توجہ دلائی کہ تقریباً ایسا ہی اسٹیٹس کسی اور کی وال پر اس نے دیکھا ہے۔ دوست نے مجھ پر طنز بھی کیا تھا کہ کیا آج کل مانگے کی روشنی پر گزارہ ہے؟ اپنے غم و غصے پر قابو پاتے ہوئے اس دوست کو جواب دیا۔

’’میرے بھائی! یقین جانیے یہ تو میرے گھر کے طاق پر دھرے چراغ کی روشنی ہے جو میری دیوار سے منعکس ہوئی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے برعکس کچھ ہوا ہے تو مجھے بھی جاننے میں مدد دیجیے کہ یہ حادثہ کب اور کہاں ہوا؟‘‘

اس دوست نے تھوڑی دیر بعد ایک لنک بھیج دیا۔ یہ لنک معصومہ کی فیس بک وال کا تھا۔اس کا اسٹیٹس کھلم کھلا میرا منہ چڑا رہا تھا۔

''وہی انسان خوش ہے اور وہی خوش قسمت بھی جو اپنے آپ کو بدقسمت نہیں سمجھتا۔''

یقیناً ہم دونوں کے اسٹیٹس میں بڑی مماثلت تھی۔ میں اس سوئے اتفاق پر شرمندہ ہو رہا تھا کہ اچانک میری نظر اسٹیٹس کی ٹائمنگ پر پڑ گئی۔اسٹیٹس آج ہی کے دن پانچ گھنٹے قبل کا تھا۔جبکہ میرا اسٹیٹس تو کل رات دس بج کر تیرہ منٹ کا تھا۔دل کو یک گونہ اطمینان ہوا۔شرمندگی کوچ کر گئی، جاتے جاتے غصہ چھوڑ گئی۔ میں نے فوراً سے پیشتر دونوں اسٹیٹس کے اسنیپ شاٹس کے اوقات کو ہائی لائٹ کر کے اپنے کرم فرما کو بھیج دیے،لیکن پھر بھی میں تادیر اپنے ہی غصے سے الجھتا رہا۔آخرش بڑی مشکل سے دلِ ناشاد کو سمجھایا کہ فیس بک کی دنیا میں تو ایسا چلتا ہی رہتا ہے۔

چند دنوں بعد میں نے ایک بار پھر اپنا ایک نیا ''قولِ سادہ'' لگایا۔

''زندگی کا دریا دو کناروں کے درمیان بہتا رہتا ہے۔ایک کنارہ جھوٹا سچ اور دوسرا سچا جھوٹ،ان دو کناروں کے درمیان عمر گزرتی رہتی ہے، یہاں تک کہ ایک دن یہ دریا سچ ساگر سے جاملتا ہے۔''

کئی بار معصومہ کا اسٹیٹس جا کر دیکھا،تھوڑا اطمینان ہوا کہ اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔اگلی صبح مگر میری یہ خوش فہمی تار تار ہوگئی۔فیس بک پر معصومہ کا نیا اسٹیٹس سامنے تھا جو ایک بار پھر چند گھنٹے قبل کا تھا۔

''زندگی کا دریا دو کناروں کے درمیان بہتا رہتا ہے۔ایک کنارہ جھوٹا سچ اور دوسرا سچا جھوٹ،انہی کے درمیان عمر گزرتی رہتی ہے۔افسانہ بھی زندگی کے اس دریا سے حاصل کیے گئے پانی کا نام ہے جو تشنگانِ ادب کی پیاس بجھاتا ہے۔اس میں جھوٹ اور سچ کی آمیزش ہوتی ہے۔اگر بات کی جائے کہ کتنا جھوٹ اور کتنا سچ؟ تو یہ اس امر پر منحصر ہے کہ افسانہ نگار نے اپنا مشکیزہ بھرنے کے لیے دریا کے کس کنارے کا انتخاب کیا ہے۔''

اب وہ کیفیت یاد آتی ہے تو اپنی بچگانہ سوچ پر متاسف ہوتا ہوں۔زیادہ سے زیادہ یہ ایک بار پھر اسٹیٹس کی چوری ہی تھی نا! بلکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ محض سرقہ نہ تھا۔اس دفعہ اس نے ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی خوبی سے ''گرہ'' لگائی تھی لیکن خوبی سے بڑھ کر خرابی یہ ہوئی کہ اس گرہ سے کہیں بڑی ''گرہ'' میرے دل میں پڑ چکی تھی۔اس وقت میں جلا بھنا بیٹھا تھا۔مزید طرّہ یہ ہوا کہ جلتی پر گویا تیل ڈالا گیا ہو،مگر قصور میرا ہی تھا۔بات اتنی سی تھی کہ جب میری پوسٹ پر پسند کرنے والوں کی تعداد اکیس اور کمنٹ کرنے والوں کی تعداد نو ہوئی تو نجانے کیوں میں نے معصومہ کی وال بھی جا دیکھی۔معصومہ کی پوسٹ پر لائک کرنے والے لوگوں کی تعداد دو سو گیارہ تھی اور کمنٹس بھی چورانوے تھے۔دو گھنٹے بعد جب میری پوسٹ کی لائکس تیس

پر پہنچیں تو معصومہ ابتسام کی پوسٹ کی لائکس پانچ سو سے متجاوز ہو چکی تھیں۔

اس تقابلی چکر میں پھنس کر جب غصہ مسلسل بڑھتا چلا گیا تو میں نے سارا حساب مع سود چکانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے اس کے اسٹیٹس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

''حسنِ اتفاق ہے کہ ہم دونوں کے خیالات کتنے ملتے جلتے ہیں۔ ایسے ہی کسی توارد پر کسی بڑے شاعر نے کسی چھوٹے لکھاری کی خبر لیتے ہوئے کہا تھا کہ ہوائی جہاز اور سائیکل میں ٹکر نہیں ہوتی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ٹکر ہوگئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چند دنوں کے اندر یہ دوسرا ملتا جلتا حادثہ ہے۔ ایک بار پھر آپ کے ارفع خیالات کے جہاز نے نجانے کیوں نوز ڈائیونگ [nosediving] کرتے ہوئے میری معمولی سائیکل کو ٹکر ماری ہے۔ یہ اور بات کہ حسبِ سابق اس بار بھی میری سائیکل آپ کے جہاز کے ٹکرانے سے کئی گھنٹے قبل ہی اس جگہ پہنچ کر ٹھہری ہوئی تھی جہاں یہ حادثہ وقوع پزیر ہوا۔''

یہ لکھ کر دونوں اسٹیٹس کے سابقہ اور موجودہ اسنیپ شاٹس میں نے اپنے کمنٹ کے ساتھ بھیج دیے۔ اب مجھے معصومہ کے جواب کا انتظار تھا؛ اس انتظار میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شدت آ رہی تھی۔ لیکن اس دن اس کا جواب نہ آیا۔

(۵)

اگلا دن میرے لیے مزید اور شدید حیرتیں لے کر آیا۔ مجھے ملنے والی لائکس کی نصف سینچری ہو چکی تھی مگر معصومہ کی لائکس کی تعداد پانچ ہزار سات سو سے بھی اوپر ہو چکی تھی۔ اس سے بھی بڑی حیرت اس کے جواب سے ہوئی۔

''محترم، تسلیمات! یہ لفظ 'محترم' محض روایتی طور پر میں نے استعمال نہیں کیا، واقعی آپ میرے لیے محترم ہیں۔ آپ کی تحریروں سے میں بہت متاثر ہوں لیکن یقین جانیے کہ یہ میرا اپنا اسلوب ہے۔ جس توارد کے بارے میں آپ نے طنزیہ نشان دہی کی ہے اس پر مجھے بھی حیرت ہے۔ شاید کسی دن یہ راز کُھل جائے کہ ایسی اور اتنی مماثلت کیسے در آتی ہے؟ ہوسکتا ہے کہ ہماری فریکوئنسی اور ویولینتھ سنکرونائزڈ ہوں۔ آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ میں نے وہ سوال آپ کو انباکس میں بھیج دیا ہے۔ امید ہے کہ جواب دیں گے۔''

فطری تجسس کے باعث اس کے کمنٹ پر کچھ لکھنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے میں نے پہلے انباکس میں جھانکا، اس نے لکھا تھا۔

''محترم! چند ماہ پہلے آپ نے میرے افسانے پر خاصا سخت تبصرہ کیا تھا۔ اس تبصرے کے بعد

سے میں آپ کو فالو کر رہی ہوں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میرے افسانے پر آپ کا تبصرہ کسی ذاتی مخاصمت پر مبنی تھا، لیکن میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جب مرد افسانہ نگار بیبا کی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو آپ ان پر نکتہ چینی نہیں کرتے، بلکہ اکثر سراہتے ہیں۔ مثلاً ابھی یہ تین دن پیشتر کی بات ہے کہ نون جیم دانش کے افسانے ''دو پیسے کی عورت'' میں انتہائی بیہودہ الفاظ استعمال کرتے ہوئے خواتین کی تذلیل کی گئی۔ آپ نے افسانے کی تعریف کی لیکن اس بیہودگی کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہا جو افسانے میں ہر طرف بکھری پڑی تھی جبکہ یہ بھی میرے مشاہدے کا حصہ ہے کہ خواتین کے افسانوں میں اگر ایسی کوئی بات ہو تو آپ عموماً تبصرہ ہی نہیں کرتے یا اگر کرتے بھی ہیں تو پھر شدید مذمت ہی کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ صنفی تفریق صرف میرا تاثر ہے یا حقیقت؟ سوال یہ بھی ہے کہ اگر یہ حقیقت ہے تو کیا آپ کا یہ رویّہ میل شَیوِنزم Male Chauvinism] کا مظہر نہیں؟ نوٹ: آپ سنجیدہ اور نفیس انسان ہیں۔ امید ہے کہ سوالات پوچھنے کی اس جسارت پر آپ برا نہیں مانیں گے۔''

(۶)

آنے والے دنوں میں ہمارے تعلقات میں یوں ہی اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ ایک بات البتّہ میں نے محسوس کی کہ میری ہر تُرش روئی کے جواب میں معصومہ کا انداز بہت متوازن اور الفاظ بہت معتدل ہوتے تھے۔ یہی ادا میرے دل میں گھر کرتی چلی گئی۔ بالآخر میں نے خود احتسابی کا فیصلہ کیا۔ پہلی بار میں نے میل شَیوِنزم کے الزام کو پرکھنے کی کوشش کی۔ دل و دماغ میں ایک جنگ سی برپا ہوگئی۔ دل نے کہا، مسئلہ میل شَیوِنزم کا نہیں۔ میں عورت کو کسی نہ کسی مقدس رشتے کے حوالے سے دیکھتا ہوں، ماں، بہن، بیوی اور بیٹی۔ دماغ نے چیلنج کیا، تمہیں یہ حق کس نے دے دیا کہ تم تقدیس کے نام پر تحدید کرو، اور ادب کے نام پر تادیب؟ انسانی آزادی اور مساوات کی قدر کرنا سیکھو۔ اپنی ذات کی حد تک تمہیں ''نیک پرویز'' بننے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن کسی اور کو نیک پروین بنانے کی ذمہ داری تمہاری نہیں۔ دل نے ہلکا سا احتجاج کیا۔ مگر......؟ دماغ نے احتجاج نظر انداز کرتے ہوئے حکم لگایا۔ اگر مگر کچھ نہیں، تمہیں معصومہ ابتسام سے معذرت کرنی چاہیے۔

اب میرے پاس معذرت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن عملاً ایسا کرنا کہیں زیادہ دشوار تھا۔ اپنے اندر برسوں سے چھپے بابا نصیحتے کو خود سے جدا کرنا ضروری تھا۔

(۷)

اگلے روز معصومہ کا جواب آ گیا اس نے میری معذرت کو کھلے دل سے قبول کیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ

اس نے اپنا تازہ افسانہ بھی بھیجا تھا۔ افسانے کا عنوان ''پارسائی'' تھا جس کی کہانی ایک ایسی عورت کی زندگی کے گرد بُنی گئی تھی جسے اس کی تیزی وطرّاری کے باعث غلط سمجھا گیا تھا۔ اس افسانے کی خاص بات یہ تھی کہ معصومہ کے گزشتہ افسانوں سے بہت مختلف تھا، اور انجام بہت دل گداز! اختتامیہ کچھ یوں تھا۔

''......مگر وجود سے عدم کی منزل کی طرف تیزی سے گامزن اس لڑکی نے یہ شکوہ بھی آنکھوں کی پھیلتی ہوئی پتلیوں پر سجا رکھا تھا۔

یا رب، زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہُوں میں

افسانے کا موضوع قدرے پامال تھا، مگر اس کی ٹریٹمنٹ بہت عمدہ تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ محض ایک فکشن ہے نجانے کیوں میری آنکھیں بھر آئیں؟ شاید اس لیے کہ پہلے میں مصنفہ کا یہی روپ دیکھنے کا خواہشمند تھا، لیکن جب اس نے یہ روپ اپنایا تو میں خود بدل چکا تھا۔ میری اداسی کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ افسانہ ایک ایسی لڑکی کا المیہ تھا جس کا فرسٹ امپریشن اس کی ذراسی غلطی سے ویسا بن گیا تھا جیسی وہ تھی ہی نہیں۔ پھر اس نے اپنی ساری عمر اس امپریشن کو مٹانے اور اپنی پارسائی ثابت کرنے کی کوشش میں لٹا دی۔ کیا یہ معصومہ کی اپنی زندگی کی پرچھائیاں تھیں؟ میں فیصلہ نہ کرسکا لیکن پہلی بار میں نے دل کھول کر اس کی تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ چاہے پرانا ہو یا نیا، وہ کسی رنگ میں لکھے اس کی تحریروں کا بانکپن مجھے بہت پسند ہے۔

(۸)

اب ہم میں انباکس بات چیت شروع ہوئی تو گویا ایک دبستان کھل گیا۔ ایک دوسرے کے افسانوں پر تبادلۂ خیال سے شروع ہونے والا سلسلہ جلد ہی اردو ادب اور عالمی ادب کی طرف مڑ گیا۔ منٹو، عصمت چغتائی، غلام عباس، ابنِ انشا، بیدی، شوکت صدیقی، اسد محمد خان، اشفاق احمد، قاسمی، انتظار حسین، ٹالسٹائی، جارج ایلیئٹ، چیخوف، کافکا، گورکی، چارلس ڈکنز، گارشیا، جیمز جوئس، ورجینیا وولف، جین آسٹن......مہینوں ہم یہی باتیں کرتے رہے۔

ہم دونوں کے درمیان وہ تعلق جس کا آغاز ہی یک گونہ ''لاتعلقی'' سے ہوا تھا، اور جلد ہی جو ایک ''لاگ'' میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اب ایک بار پھر بتدریج اس کی ٹرانسفارمیشن جاری تھی۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب یہی لاگ ''لگاؤ'' میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میری موجودہ رائے ابتدائی رائے سے 180° کا زاویہ بنا رہی تھی۔ جی ہاں سب کچھ بدل چکا تھا۔ میں اس کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا، مگر یہ معاملہ شاید یک طرفہ نہ تھا۔ تکلف کی دیوار گرا کر اب وہ مجھے ''تم'' کہہ کر مخاطب کرتی تھی اور مجھے یہ طرزِ تخاطب اچھا محسوس ہونے لگا تھا۔ اسی دوران فیس بک کی دنیا سے ہم دونوں کا تعلق کم سے کم ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنے حلقۂ احباب میں کیا

جواب دیتی تھی وہی جانتی تھی۔ میں اپنے فیس بک کے دوستوں سے کام کا بہانہ کر لیتا تھا۔مگر بہانہ کیسا؟عشق کے معاملات کام ہی تو ہیں۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ لاگ سے لگاؤ کی طرف اس سفر کے دوران کئی بار خدشات لاحق ہوئے۔ پاسبانِ عقل نے دلِ ناداں کو کئی بار اس آزارِ عشق سے بچانے کی کوشش کی لیکن وہ ناداں ہی کیا جو عقل کی بات پر کان دھرے، یوں ہر دلیل، ذلیل ہوگئی۔اب یہ عالم تھا کہ اس سے باتیں کیے بِنا چین نہیں ملتا تھا اور باتیں تھیں کہ regular irregularly یعنی بے قاعدگی کے ساتھ باقاعدہ۔ جب بھی انباکس میں،کوئی بات مَیں کہتا تو ایسا نہیں تھا کہ جواب نہ ملے، جواب ملتا ضرور تھا لیکن گھنٹوں انتظار کے بعد۔اور یہ انتظار اب مجھے کھلنے لگا تھا۔کبھی کبھی مجھے لگتا کہ وہ جان بوجھ کر مجھے تڑپاتی ہے۔میں شکایت کرتا تو جواباً اتنے پیار سے بات کرتی کہ سارا غصہ ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔

(۹)

ایک دن میں نے اس سے اپنا حالِ دل بیان کرنا چاہا لیکن اتنی اچھی دوستی کو متاثر کرنے سے بھی ڈرتا تھا چنانچہ میں نے براہِ راست اظہار سے گریز کرتے ہوئے لکھا۔

’’پیاری معصومہ! آج مجھے ایک افسانہ لکھنا ہے،جس کے لیے تمہارا مشورہ چاہیے۔مشورہ سوچ سمجھ کر دینا۔افسانہ دو کرداروں کے گرد گھومتا ہے۔دونوں کردار روایتی ہیں۔ایک لڑکی اور ایک لڑکا، جو اچھے دوست ہیں۔ میں بحیثیت مصنف ان روایتی کرداروں سے کچھ غیر روایتی کام لینا چاہتا ہوں۔اب فرض کرو کہ اس افسانے کی لڑکی، جس سے وہ لڑکا محبت کرتا ہے، بالکل تمہاری جیسی ہے اور وہ لڑکا بہت شدید محبت کے باوجود اظہارِ محبت کرتے ہوئے گھبراتا ہے کہ کہیں لڑکی برا نہ مان جائے۔مشورہ دو کہ لڑکے کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا خوف پر قابو پاتے ہوئے محبت کا اظہار کر دینا چاہیے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوستی بھی ختم ہو جائے۔یا اظہارِ محبت سے پہلے محبوبہ کو دیکھنے کی فرمائش کرنی چاہیے؟؟ کیا ایسی فرمائش پر وہ برا مان سکتی ہے؟؟؟ کیا تصویر دیکھنا کافی ہے یا بالمشافہ ملاقات کی بات ہو؟؟؟؟‘‘

تقریباً ڈیڑھ دن کے بعد اس کا جواب آیا جو خاصا دلچسپ تھا۔

’’شکریہ شہاب! تم نے مجھے مشورے کے قابل سمجھا۔تمہارے اٹھائے گئے سوالات سے چار ممکنہ صورتیں سامنے آتی ہیں۔پہلی صورت یہ کہ تم حقیقتاً ایک افسانہ لکھ رہے ہو اور بحیثیت ایک معاصر افسانہ نگار مجھ سے مشورہ مانگ رہے ہو۔اس صورت میں میرا مشورہ ہے کہ یہ کلّی طور پر افسانہ لکھنے والے کا اپنا استحقاق ہوتا ہے۔ ہر افسانہ نگار اپنے افسانے کا خدا ہوتا ہے۔وہی اپنے کرداروں کو کبھی جِلا بخشتا ہے اور کبھی جَلا ڈالتا ہے۔اس کا حسنِ کرشمہ ساز کچھ بھی کر سکتا ہے۔لیکن اچھا ہو کہ وہ عدل کرے۔عدل کا مطلب رحم

کرنا نہیں بلکہ ایسا سلوک کرنا ہے کردار جس کا مستحق ہو۔ دوسری صورت یہ کہ تم حقیقتاً ایک افسانہ لکھ رہے ہو اور مجھے یعنی ایک افسانہ نگار کو اپنے افسانے کا ایک کردار بنانا چاہتے ہو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو مجھے خوشی ہوگی لیکن اصل معاملہ یہ ہے کہ ابھی محض مفروضہ باندھ کر کوئی بات نہیں کی جاسکتی۔ تیسری صورت یہ کہ افسانہ تمہارا مطلوب نہیں۔ لگتا یہ ہے کہ تم مفروضے کی بندوق میرے کاندھے پر رکھ کر اظہارِ محبت کی گولی داغ رہے ہو۔ نشانہ کوئی اور نہیں میں ہوں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ بھی جاننا چاہتے ہو کہ گولی ہدف پر لگی یا نہیں؟ اگر تم اظہارِ محبت کر رہے ہو اور میرا جواب چاہتے ہو تو ان تکلفات کی ضرورت نہیں۔ میں ملفوف گفتگو کی قائل نہیں، اور جیسا کہ پہلے لکھا ہے محض مفروضے کی بنیاد پر کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ جب سوال براہِ راست ہوگا تو جواب بھی براہِ راست ملے گا چاہے جیسا بھی ہو۔ چوتھی اور آخری بات یہ کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ تم میری شخصیت کے متعلق تشکیک کا شکار ہو۔ اب اپنے شک وشبہ کی تصدیق یا تردید چاہتے ہو۔ لیکن کہتے ہوئے ڈرتے بھی ہو۔ اگر تم تشکیک میں مبتلا ہو تو اپنی، اپنی مرضی سے سوال پوچھنا اور جواب دینا ہم دونوں کا حق ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے حق کا احترام کرنا چاہیے۔ یاد رکھو'ان دیکھے' پر یقین، یقین کی معراج ہے اور'ان دیکھے' کی محبت، محبت کی انتہا۔ تمہارے رویّوں سے مجھے یہ خوش فہمی ہوگئی تھی کہ تم ان بلندیوں تک پہنچے ہوئے ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی تم مجھے عزیز ہو۔ مگر ہاں جواب مانگنے کے لیے تمہیں مفروضے کے اس گھن چکر سے باہر آنا ہوگا۔

(۱۰)

گھن چکر سے باہر آنے کی دعوت؟ یہ کیا بات ہوئی؟؟ کیا وہ میری طرف سے واضح اقرار کی منتظر تھی؟؟؟ مجھے ایسا ہی لگا اور میں نے واضح اقرار کا فیصلہ کرلیا۔

''جانِ جاں! معلوم نہیں یہ لقب تمہیں کیسا لگے؟ برا لگے تو بتا دینا۔ لیکن تم ہی نے تو کہا ہے تم ملفوف گفتگو کی قائل نہیں۔ سو جو اندرونِ دل ہے وہی میرے لب پر، اور وہی نوکِ قلم پر بھی۔ تم میرے لیے افسانہ نہیں حقیقت ہو۔ اگر تم ''حقیقتِ منتظر'' بھی ہوتی تو میں تم سے لباسِ مجاز میں ملنے کی خواہش کرتا، چاہے دل کا طور راکھ اور خاک ہو جاتا۔ میں تو ایک انسان ہوں، فرشتوں والا صبر کہاں سے لاؤں؟ اچھا ہوا کہ تمہاری خوش فہمی دور ہوگئی؛ مزید اچھا یہ ہوا کہ تم پھر بھی مجھے عزیز رکھتی ہو۔ تمہاری اسی بات نے حوصلہ دیا ہے کہ میں اقرار کروں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم سے محبت تو کئی ماہ پہلے ہوگئی تھی جب ہم گریٹ ایکسپیکٹیشنز کے کرداروں ایسٹیلا اور پپ پر باتیں کررہے تھے۔ میں پپ کی سادگی کی تعریف کررہا تھا اور تم ایسٹیلا کے سرد رویّے کی وکالت کررہی تھی۔ کئی دنوں پر محیط اس گفتگو میں پہلی بار مجھے دو اندازے

ہوئے۔ پہلا یہ کہ میں پپ کی طرح تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور دوسرا یہ کہ تم ایسٹیلا کی طرح سرد مہر ہوسکتی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مِس ہویِشیم کا تم پر بھی سایہ ہو۔ اسی اندیشے کے باعث میں اقرارِ محبت سے ڈرنے لگا تھا۔لیکن پھر اس عرصے میں کیا ہوا؟ گریز کی ہر کوشش ناکام ہوتی چلی گئی۔ اور تم محبت سے کہیں بڑھ کر میری ضرورت بنتی چلی گئی۔ میری مہرباں! ہمیشہ جواب دینے میں اتنی تاخیر کیوں کر دیتی ہو؟۔ سچ پوچھو تو یہ دیر مجھے تادیر پریشان کیے رکھتی ہے اور وسوسوں میں مبتلا کرتی ہے۔سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟

میری جاناں! میں تم کو دیکھنا چاہتا ہوں، ملنا چاہتا ہوں، چھونا چاہتا ہوں، اپنانا چاہتا ہوں۔ کہاں اتنی ساری خواہشات اور کہاں ہماری یہ اوقات کہ ''اوقات'' ہی نہیں ملتے۔صورتِ حال بالکل ویسی ہے جس میں انشاء جی گرفتار تھے۔

دل ہجر کے درد سے بوجھل ہے اب آن ملو تو بہتر ہو اس بات سے ہم کو کیا مطلب یہ کیسے ہو یہ کیوں کر ہو
ہم سانجھ سمے کی چھایا ہیں تم چڑھتی رات کے چندرماں ہم جاتے ہیں تم آتے ہو پھر میل کی صورت کیوں کر ہو

انشاء جی نے اپنے محبوب کو چندرَ ماں کہا تھا اور میں تمہیں کہتا ہوں چندرَ ماں، کہ یہ تعریفِ حسن، اعترافِ محبت اور کیفیتِ ہجر تینوں کا مُرَقّع ہے۔

(۱۱)

تین دن بعد اس کا جواب آیا۔اس نے لکھا تھا۔

''پیارے شہاب! تم نے مجھے چندرَ ماں لکھا ہے؛ اچھا لگا لیکن ہر بات جو اچھی لگے، حقیقت نہیں ہوتی۔ میں چندر ماں نہیں، بلکہ تم میرے چندر ہو، اگر خود سے کوئی نسبت دینی ہے تو چندر مکھی کہو، گل مہتاب پکارو۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں تو محض بدن دریدہ پچھلا پہر ہوں یا پھر شب گزیدہ سحر ہوں۔

میرے شہاب!!

یقین جانو کہ میں بھی تم سے ملنا چاہتی ہوں، لیکن ڈرتی ہوں کہ مبادہ تم خود سے بچھڑ نہ جاؤ۔ شہاب سے شہابِ ثاقب نہ بن جاؤ۔ خیر یہ بھی ممکن ہے کہ ہم کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ملیں۔ اور یہ بھی یقین جانو، جتنی جلدی جواب دینا ممکن ہوتا ہے، وہ میں دیتی ہوں۔ اس کے باوجود اگر تاخیر ہوتی ہے تو اس پر معذرت چاہتی ہوں۔ وساوس کو ذہن میں نہ آنے دو۔ یہ انسان کو بھٹکا دیتے ہیں۔ ہنا بہت کچھ چاہتی ہوں۔ دل پر ایک بوجھ سا ہے اور طبیعت بھی اچھی نہیں۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ اپنا خیال رکھو۔ میں خود تم سے رابطہ کروں گی۔ اور ہاں ہوسکتا ہے کہ کوئی خوش خبری سنا پاؤں۔''

خرابیٔ طبیعت اور خوش خبری یہ دونوں باتیں دماغ کو اتھل پتھل کرنے کے لیے کافی تھیں سو تادیر اتھل پتھل

کا یہی سلسلہ جاری رہا۔ بے چارگی کے دکھ نے سارے وجود کا احاطہ کرلیا تھا۔ آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ نجانے کب تک جاگتا رہا۔ عجیب بے بسی تھی۔ نہ انتظار کا یارا تھا اور نہ بِنا انتظار چارہ!

(۱۲)

اب کے جواب ایک ہفتہ بعد آیا۔ معصومہ ابتسام نے ملنے کی نوید دیتے ہوئے جو پتا بتایا تھا، اس نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ میری نظریں بار بار اس گھر کی طرف اٹھ رہی تھیں جس کا مین گیٹ سکستھ اسٹریٹ کی طرف کھلتا تھا مگر بیک یارڈ ففتھ اسٹریٹ پر واقع میرے گھر کے بیک یارڈ کے ساتھ پشت سے پشت ملائے یوں موجود تھا جیسے دو روٹھے ہوئے دوست مخالف سمتوں میں دیکھ رہے ہوں۔ اس گھر کے تقریباً وسط میں سبز رنگ کی مستطیل یک منزلہ عمارت تھی جو زیادہ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ بیک یارڈ میں ایک سفید سہ منزلہ عمارت بھی موجود تھی جو بہت کم رقبے کے باوجود کسی بلند و بالا مینار کی طرح ایستادہ تھی۔ یہی میری منزل تھی۔ یہی معصومہ کا مسکن تھا۔ ہائے! اتنے قریب رہتی تھی میری معصومہ مگر پھر بھی کتنی دور تھی۔ تقدیر کے کھیل واقعی نرالے ہوتے ہیں۔ معصومہ نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ برسوں پہلے یہ دونوں کمپاؤنڈز جڑے ہوئے تھے۔ اور اب بھی دونوں کو ملانے والا ایک خفیہ راستہ موجود تھا۔ معصومہ کے ہر نئے انکشاف کے ساتھ مجھ پر حیرت کدے کا ایک نیا در وا ہوتا جا رہا تھا۔ انکشافات حیران کن ضرور تھے لیکن اپنی ناواقفیت پر میں حیران نہیں تھا۔ جس گھر کا دروازہ ہی کسی اور گلی میں کھلتا ہو، اس کے اسرار مجھ جیسے داخلیت پسند یا انٹروورٹ پر کیوں کر کھلتے؟ کتابیں، لیپ ٹاپ، آن لائن ورک، یہی تھی میری دنیا۔ مگر اب دنیا ہی بدل گئی تھی۔ نظریں ''طوافِ کوئے محبت'' کے شوق میں مبتلا ہو کر بار بار ادھر ہی اٹھ جاتی تھیں۔ میرے بس میں ہوتا تو اڑ کر اس تک پہنچ جاتا، لیکن اس نے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ وقتِ مقررہ پر ہی پہنچوں، نہ پہلے نہ بعد میں۔ نجانے کتنی بار میں اس کا میسیج پڑھ چکا تھا مگر بیتابی اور بےچینی کی کیفیت میں ایک بار پھر وہی میسیج پڑھنے لگا۔

"میرے چندر ما! مجھے اندازہ ہے کہ تم میرے میسیج کا انتظار کر رہے ہو گے، مگر گزشتہ دنوں میری طبیعت کافی خراب رہی۔ بخار جیسی کیفیت تھی جو پہلے چار دنوں تک رہی۔ بخار اترا تو کمزوری اتنی چھا گئی کہ آنکھ کھلنے کے باوجود بستر سے اترنا محال تھا۔ خیر اب بیماری میں کچھ افاقہ ہے۔

میرے ماہِ تمام!!

کل چودھویں کی رات ہے۔ ماہِ تمام اور گلِ ماہ تاب کی رات! چندر اور چندر مکھی کی ملاقات کی رات!! ہاں ملاقات ممکن ہے۔ اس موقع پر ہم ملنے کی ایک کوشش کر سکتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آنے والی ساعتوں میں ہمارے لیے کیا لکھا ہے۔ لیکن اتنا جانتی ہوں کہ اگر ملنے کا کوئی امکان ہے تو ان ہی ساعتوں

میں ہے۔ ہوسکتا ہے ہم مل کر مکمل ہو جائیں یا پھر ہماری کہانی ہی مُک جائے۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی جان کو شدید خطرہ ہے لیکن یہ رسک تو لینا ہی ہوگا۔ ہاں اگر تمہیں زندگی عزیز ہے تو مت آنا۔ آ ؤ یا نہ آ ؤ تمہاری مرضی مگر کسی اور سے اس کا تذکرہ نہ کرنا، ورنہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دو گے۔''

معصومہ نے پھر بڑی تفصیل سے بتایا تھا کہ کیسے یہ مہم سر کی جاسکتی ہے، کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ میرے لیئے یہ ساری پابندیاں کچھ عجیب سی تھیں۔ اس کا سارا وجود ایک طلسم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مگر میں اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔

(۱۳)

معصومہ کے بتائے ہوئے وقت پر میں اپنے کمرے سے نکلا۔ میرے گھر کے بیک یارڈ میں سورج مکھی اور چندر مکھی کے پودے ساتھ ساتھ ہی لگے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان ٹارچ کی روشنی میں مجھے چورَس سبز رنگ کا وہ ڈھکنا نظر آ گیا جس کے بارے میں معصومہ نے بریف کیا تھا۔ ڈھکنا اٹھایا تو سیڑھیاں نیچے جاتی نظر آ گئیں۔ دسویں سیڑھی کے اختتام پر کوئی تیس فٹ لمبی ایک راہ داری تھی جو دونوں گھروں کو ملاتی تھی۔ اس کے اختتام پر پھر سیڑھیاں تھیں جو اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ انہیں طے کر کے میں اس گھر تک پہنچ گیا تھا جہاں چاندنی رات میں نہائی ہوئی دونوں عمارتیں موجود تھیں جنہیں اپنے گھر سے پچھلے چند گھنٹوں میں سینکڑوں بار دیکھ چکا تھا۔ مرکزی عمارت تو ذرا دور تھی لیکن دائیں جانب تھوڑے فاصلے پر وہ سہ منزلہ مینار نما عمارت تھی جہاں مجھے جانا تھا۔ منزل کو اتنے قریب پا کر دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے اور اتنا ہی وقت میرے پاس تھا۔ مجھے اس عمارت کی چھت پر پہنچنا تھا جہاں ایک اٹاری نما کمرہ یا attic بنا ہوا تھا۔ اب تک سارے مراحل بہت آسانی سے طے ہو گئے تھے لہٰذا اگلے مرحلے بھی مشکل نہیں لگ رہے تھے۔ ایک جوش تھا جو کشاں کشاں مجھے جانبِ منزل لیے جا رہا تھا۔ اُف! یہ کیا؟...... ایک کتا مرکزی عمارت کی طرف سے نمودار ہوا اور اب بھاگتا اور بھونکتا میری طرف چلا آ رہا تھا۔ اس نے یقیناً مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ جو ہدایات مجھے ملی تھیں ان میں ایک ہڈی لانے کا مشورہ بھی شامل تھا۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا؟ میں درختوں کی آڑ لے کر ایک نسبتاً تاریک گوشے کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ دوسری طرف سے کوئی عورت آواز دے رہی تھی۔ ''موتی، موتی'' آواز سنتے ہی موتی کسی شریف بچے کی طرح واپس لوٹ گیا۔ وہ بوڑھی عورت میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آ گئی تھی جس کے پاس پہنچ کر موتی اب دم ہلا رہا تھا۔ عورت جیسے ہی کتے کی طرف متوجہ ہوئی میں تیزی سے مینار نما عمارت کے دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی گول زینہ تھا جو کسی ڈبل ہیلِکس

[helix] کی طرح گھومتا اوپر جا رہا تھا۔ کتے نے کافی وقت ضائع کر دیا تھا۔ میں تیز رفتاری سیسیڑھیاں چڑھنے لگا۔ باہر خاموشی چھا گئی تھی؛ اندر بھی خاموشی ہی تھی۔ صرف میری ذات میں ایک شور بپا تھا۔ دل دھڑکنے کی گونج دماغ تک پہنچ رہی تھی۔ میں جب ہانپتا کانپتا چھت پر پہنچا تو نیلے رنگ کی اٹاری سامنے تھی۔ اندر شاید اندھیرا تھا؛ لیکن صحیح اندازہ اندر جا کر ہی ہوسکتا تھا کیونکہ کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھولا۔ اندر اندھیرا تھا، لیکن خوشبو آ رہی تھی، کوئی انجانی خوشبو...... دل نے تصدیق کر دی۔ ہاں یہ اسی کی خوشبو ہے...... گلِ مہتاب...... چندر مکھی! ایک سرشاری سی مجھ پر چھانے لگی۔ میں نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور سیل فون کی لائٹ جلا لی۔ ٹارچ میرے پاس تھی لیکن اس کی تیز روشنی کا رسک نہیں لے سکتا تھا لہٰذا سیل فون کی کسٹمائزڈ روشنی بہترین حل تھا۔ گھڑی پر نظر پڑی تو بارہ بج کر دو منٹ ہو چکے تھے۔ میری نظریں چاروں طرف اسے تلاش کر رہی تھیں۔ سب کچھ میرے سامنے تھا۔ بائیں طرف موجود ڈریسر، دائیں طرف کی رائٹنگ ٹیبل، ٹیبل سے اوپر بک شیلف، ساتھ رکھی کرسی، دوسری طرف ایک سنگل بیڈ جس کی بے شکن چادر، سب کے سب اس نیم تاریکی میں بھی نظر آ رہے تھے؛ بس ایک وہ ہی نہیں تھی۔ صرف دو منٹ کی تاخیر کیا قیامت ڈھا گئی تھی! دل شدتِ غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ معصومہ تم تو کئی کئی دن کی تاخیر کر دیتی تھی۔ دو منٹ کی تاخیر برداشت نہ کر سکی۔ ایک بار پھر اس کی بات یاد آئی۔

''......ہوسکتا ہے مل کر مکمل ہو جائیں یا پھر ہماری کہانی ہی مُک جائے۔''

کیا کہانی مُک چکی تھی؟

چندر مکھی کی خوشبو متواتر آ رہی تھی۔ میں تلاشنے لگا۔ جلد ہی مجھے وہ سفید چندر مکھی میز کے نیچے ہی مل گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ چندر منڈل کا ایک ہالۂ نور اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میں نے بڑے احترام سے اسے اٹھایا اور میز پر رکھ دیا۔ میز پر ہی ایک نوٹ بک مل گئی۔

پہلے صفحے پر صرف تین دائرے تھے اور ان دائروں میں تین الفاظ۔ اِڈ، ایگو، سُپر ایگو۔ دوسرے صفحے پر بھی تین دائرے تھے اور ان دائروں میں بھی تین ہی الفاظ۔ کونشیئس، پری کونشیئس، اَن کونشیئس تیسرے صفحے پر دو دو الفاظ کے چھ جوڑے بنے ہوئے تھے۔ اِٹ......ٹرانزِٹ......ایکشن......ٹرانزیکشن......پلانٹ......ٹرانس پلانٹ......مشن......ٹرانس مشن......جینڈر......ٹرانس جینڈر......فارمیشن......ٹرانس فارمیشن......

اب میرا سر بھاری ہونے لگا۔ میں تھک ہار کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ بازوؤں کا حصار بنا کر میں نے بند آنکھوں پر رکھ لیا۔ مجھے نیند آنے لگی؛ جاگنے کی ساری کوششیں ناکام ہوئیں۔ گزشتہ دنوں مسلط ہو جانے والی بیخوابی کے سوا، سدا سے میرا یہی حال تھا۔

(۱۴)

جب آنکھ کھلی تو مجھے اپنا وجود تازہ دم محسوس ہوا۔ نجانے کتنی دیر نیند مجھ پر مسلط رہی۔ ابھی بہت کام کرنا تھا۔ پہلے تو میں نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکایا اور چاند کی طرف دیکھا۔ چودھویں کا چاند بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ واپس آ کر اپنی نشست سنبھالی، سیل فون کی مدھم روشنی میں میز کا سرسری جائزہ لیا۔ ٹیبل لیمپ آن کیا۔ اب مجھے سیل فون کی روشنی کی ضرورت نہ تھی۔ ٹیبل لیمپ کی محدود روشنی میں نوٹ بک اٹھا کر دائیں جانب سے کھولی۔ آخری صفحہ سامنے تھا۔ یہ ایک افسانہ تھا جس پر گزشتہ کل کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ ۱۳/ربیع الاوّل ۱۴۴۰ھ بروز جمعرات۔

افسانہ: عکسِ برعکس

میرا نام معصومہ ابتسام ہے۔ اشفاق احمد شہاب سے میرا پہلا تعارف چند سال پہلے فیس بُک پر ہوا۔ میری طرح وہ بھی ایک افسانہ نگار تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ فیس بُک کی دنیا میں دوستی کا سلسلہ تارِ عنکبوت کی طرح دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ مکڑے اور مکوڑے، مکھیاں اور مکڑیاں سب اسی تارِ عنکبوت سے بندھے نظر آتے ہیں۔ گوشۂ ادب میں بَنے اور بُنے ہوئے ایسے ہی تارِ عنکبوت پر میری طرح وہ بھی موجود تھا۔ وہ محض موجود نہیں بلکہ سرگرم و سرگرداں بھی تھا۔ ہر دم لگتا تھا کہ وہ اس جالے کو دراز سے دراز تر کرتا جا رہا ہے۔ اس کی نصیحتیں اور ہدایتیں اس کے اسٹیٹس کی کھڑکی سے جھانکتی اور تاکتی رہتی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غالباً ان ہی نصیحتوں اور ہدایتوں کے نتیجے میں اس کے اطراف ایک ''حلقۂ عقیدت'' قائم ہو گیا تھا جس کا ہر فرد آگے بڑھ کر اس ''بابا نصیحتے'' سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا جس نے از خود ہی پورے معاشرے کے سدھار کا ٹھیکہ لے رکھا تھا......

آگے کہانی نامکمل تھی......

میں نے میز سے چند مکھی کو اٹھا کر بالوں میں لگایا، دراز سے سرخ لپ اسٹک نکال کر لگائی اور ایک مسکان کے ساتھ لکھنے کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

۱۴/ربیع الاوّل ۱۴۴۰ھ بروز جمعہ

......کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اشفاق احمد اور قدرت اللہ شہاب کی روحیں اس میں حلول کر گئی ہیں۔

[افسانہ ختم ہو......کہانی جاری ہے]

◀◀ ● ▶▶

Shafqat Mahmood A-1/44
Block 4 Rd,Gulshan-e-Iqbal
Karachi Cell# 03002179235

● محمد شاھد محمود

مقدس سکہ

’’ماہرینِ جغرافیہ کے مطابق یہاں، کبھی ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہوا کرتا تھا۔‘‘ سیمتھا نے شؤن کی معلومات میں اضافہ کیا۔

’’اب تو صرف ریت اور جا بجا خوبصورت نخلستان نظر آ رہے ہیں۔‘‘ شؤن نے سنجوگ کا لطف اٹھا کر جواب دیا۔

’’یہ کیا ہے؟ اس پر دو تکونی نشان بنا ہے۔‘‘ سیمتھا نے ایک ہاتھ سے، ریت میں دھنسا سکہ اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے اپنے سنہری بال سلجھائے۔

سورج کی تمازت دبیز کالے بادلوں کی تہہ چیرتے ہوئے، زمین تک رسائی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر رہی تھی اور خنک ہواؤں سے بھرے سر سبز و شاداب زمین کو حرارت پہنچا کر، یخ بستہ ہونے سے روکنے میں مصروفِ عمل تھی۔ پتھروں سے بنے مضبوط گھر میں مشعلیں جلا کر دن دہاڑے چھائے اندھیرے کو مات دی گئی تھی۔ زرہ پوش مستعد حفاظتی دستے گھر کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں نیزے تھامے بت بنے ساکت کھڑے تھے۔ گھر کے وسطی کمرے میں قبیلے کا سردار ہاکوشا اپنی مسندِ اقتدار پر نیم دراز تھا۔ سردار کے سامنے اس کی بیوی شنیزہ، صندلی فرش پر بچھی ریچھ کی نرم کھال پر براجمان، اپنے سنہرے بال سلجھانے میں مصروف نظر آ رہی تھی، جبکہ خدمت گار سینے پر ہاتھ باندھے خاموش کھڑے تھے۔

’’مجھے مقدس سکے کے بارے میں جاننا ہے۔ کیا یہ ٹیری سیاس کی ملکیت تھا؟ کیا ٹیری سیاس یونانی دیوتا تھا؟ اور یہ مقدس سکہ ہم تک کیسے پہنچا؟‘‘ شنیزہ نے بالوں سے فراغت پا کر خاموشی توڑی اور ایک ہی سانس میں تین سوالات کر ڈالے۔

’’نہیں میری پیاری بیوی، ٹیری سیاس دیوتا نہیں تھا، لیکن یونانی دیوتا اپالو نے اسے اپنا نائب مقرر کر رکھا تھا۔ وہ پراسرار طاقتوں کا مالک، ایک اندھا غائب دان تھا۔ مقدس سکہ ہزاروں سال قبل مصر کے ایک فرعون نے سونا اور چاندی پگھلا کر بنایا تھا۔ سکہ ڈھالتے وقت دس ہزار انسانوں کی قربانی دی گئی تھی۔ ہمارے آباؤ اجداد کو یہ سکہ کوہ کلی منجارو کی چوٹی پر واقع ایک قلعے کے کھنڈرات سے ملا تھا اور اب یہ میرے

پاس محفوظ ہے۔ یہ سکہ ٹیری سیاس کے ہاتھ لگا! یہ محضر نامہ محض قیاس آرائی پر مشتمل ہے۔'' ہاکوشا کا محبت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

''تو کیا وہ قلعہ ٹیری سیاس کا نہیں تھا؟'' شنیز ہ نے متجسس لہجے میں پھر سوال کیا۔

''قلعے کے اندر ایک اہرام تعمیر کیا گیا تھا۔ مقدس سکہ اہرام میں بنے ایک بڑے چبوترے پر رکھا گیا تھا اور اسی جگہ اندرونی دیواروں پر قدیم مصری زبان میں یہ ساری معلومات کندہ تھیں۔ قلعہ کس کی ملکیت تھا؟ اس بارے میں کہیں بھی کچھ درج نہیں تھا۔ قدیم مصری زبان جاننے والے اب صرف دو افراد ہی رہ گئے ہیں، یعنی میں اور میرا دوست ہشنو کا۔ مگر ہم نے یہ عہد کیا ہے، ہم یہ زبان کسی کو نہیں سکھائیں گے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بعد آنے والی تہذیبیں صرف ہمارے بارے میں جان سکیں۔ اس لئے قدیم مصری زبان قبطی کا خاتمہ ضروری ہے۔'' ہاکوشا کا نے جواب دیا۔

''کیا قدیم مصری زبان قبطی، عبرانی زبان سے بھی زیادہ پرانی ہے؟'' شنیز ہ نے پھر سوال داغا۔

''ہاں میری ملکہ قبطی قدیم ترین زبان ہے۔'' ہاکوشا کا اس کے تجسس سے لطف اندوز ہوا۔

شنیز ہ نے خدمت گاروں کی جانب ایک نظر دیکھا اور سردار کی جانب متوجہ ہوئی۔ سردار سمجھ گیا کہ وہ رازداری سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔

''کیا میں مقدس سکہ دیکھ سکتی ہوں؟ آپ نے کہاں رکھا ہے؟'' شنیز ہ بنا بولے اپنے شوہر سے ہم کلام ہوئی۔

''ہاں دیکھ لینا، مقدس سکہ اسی کمرے میں ہے۔'' سردار نے بھی بنا بولے جواب دیا۔ گھنٹوں بیت گئے۔ دونوں بنا بولے گفتگو کرتے رہے۔

''میں سمجھ گئی۔'' شنیز ہ نے خوشی سے با آوازِ بلند بول کر خاموش گفتگو انجام پذیر کی۔ چند لمحات ماحول پر سکوت طاری رہا۔

''کھانا کھا کر سو جانا چاہیے۔'' سردار نے جمائی لے کر لب بستگی توڑی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں تھوڑی ہی دیر میں کام نمٹا کر آتی ہوں۔'' شنیز ہ نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے، قریب رکھی بھیڑیئے کی کھال کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔ خشک کھال پر لکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ عبرانی زبان سیکھ رہی تھی اور اپنی تہذیب کی یوکاٹک میان زبان پر عبور رکھتی تھی۔

موبائل فون الارم نے مدھر سُر دھیمے سے بکھیر کر نئی صبح کی نوید سنائی۔ ہاشم نے غنودگی کے عالم میں پلنگ کے ساتھ رکھے میز کی جانب ہاتھ بڑھا کر موبائل فون اٹھایا اور پلٹ کر دیکھا، تو سمیرہ کو بستر پر نہیں

پایا۔الارم بند کر کے موبائل فون نرم بستر پر پٹخا، آنکھیں ملتا قالین پر ننگے پاؤں خراماں چلتے کمرے سے باہر نکل آیا۔سمیرہ کو رات والی جگہ جوں کا توں قالین پر اکڑوں بیٹھا دیکھ کر چونک گیا۔

''تم نے تو کہا تھا تھوڑی ہی دیر میں کام نمٹا کر آتی ہوں۔کیا رات بھر جاگتی رہی ہو؟'' ہاشم نے جمائی لیتے ہوئے حیرانی کا اظہار کیا۔

''ہاں بس کام کرتے کرتے، وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔'' سمیرہ کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔وہ مسکرا رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''بہت خوش نظر آ رہی ہو، کیا معرکہ مارا ہے؟'' ہاشم نے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھتے ہوئے،خوش دلی سے پوچھا۔

''یہ رسم الخط قدیم یوکاٹک میان زبان کا ہے۔جدید رسم الخط کے تحت ماہرینِ لسانیات نے، اسے یوکاٹک مایا زبان کا نام دیا ہے۔یوکاٹک مایا زبان آج بھی بولی جاتی ہے،جبکہ یوکاٹک میان زبان زمانہ قدیم کی مایا تہذیب میں رائج تھی، جو لسانی درجہ بندی بھی ظاہر کرتی ہے۔میں نے تقریباً ساری تصاویر ڈی کوڈ کر لی ہیں۔بس اس تصویر کی عبارتیں ڈی کوڈ نہیں کر پا رہی۔'' اس نے لیپ ٹاپ کی سکرین پر انگلی رکھ کر پر جوش انداز میں کہا۔

''یہ شاید جانور کی کھال پر لکھی گئی ہے!'' ہاشم نے قالین پر بیٹھ کر،تصویر کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں، پتھروں پر بھی کندہ کاری کے ذریعے لکھا گیا ہے۔یہ دو تکونی نشان دیکھ رہے ہو؟ ان لوگوں کے پاس اس دو تکونی نشان والا سکہ تھا۔ان کا عقیدہ تھا کہ یہ سکہ ہر قسم کی بیماری اور مصیبت سے نجات دلانے کا ذریعہ ہے،مقدس ہے۔'' سمیرہ نے ہاشم کو دیگر تصاویر دکھائیں۔

''تو تم افریقہ جا رہی ہو؟'' ہاشم نے لیپ ٹاپ سکرین سے نظریں ہٹا کر سوال کیا۔

''بین الاقوامی آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ نے بطور انچارج مدعو کیا ہے۔میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔جانا تو پڑے گا۔'' اس نے چہکتے ہوئے کہا۔

''تمہیں ماہرِ آثارِ قدیمہ ہی بننا تھا، کچھ اور نہیں بن سکتی تھی؟'' ہاشم نے مصنوعی بیزاری سے کہا۔

''میں نے جو نوے فیصد حصہ ڈی کوڈ کیا ہے، سارا مواد آج ہی ای میل کرنا ہے۔تم پروف ریڈنگ کر دو۔میں اتنے میں ناشتہ بنا کر لاتی ہوں۔''

اس نے لیپ ٹاپ ہاشم کی جانب سرکایا اور سنہرے بال سلجھاتے ہوئے باورچی خانے کا رخ

کیا۔تھوڑی دیر بعد دونوں بیٹھے ناشتے پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔

’’تم نے لکھا ہے کہ یہ تہذیب غیبی لہروں پر یقین رکھتی تھی اور یہ لوگ بنا بولے گفتگو کر لیا کرتے تھے۔کتابت،املا یا گرائمر کی غلطی تو کوئی نہیں ملی البتہ تم مقدس سکے کے بارے میں لکھنا بھول گئی ہو،بس اس بارے میں لکھ دینا۔ویسے کیا تم ان باتوں پر یقین رکھتی ہو؟‘‘ہاشم نے چائے کی چسکی لے کر رائے طلب کی۔

’’او ہو، میں نے جان بوجھ کر مقدس سکے کا ذکر نہیں کیا، کچھ باتیں خفیہ رکھی جاتی ہیں۔میں انچارج ہوں بھئی،کھدائی کے دوران اگر کسی کو مل گیا تو؟ سکہ غائب بھی ہوسکتا ہے۔ہاں البتہ سکہ مل جانے پر بتا دوں گی یا کھدائی کا کام ختم ہو جانے تک نہ ملا تب بھی بتا دوں گی۔ڈی کوڈنگ کی ساری ذمہ داری میری ہے۔اس لئے کسی اور کو علم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔‘‘سمیرہ نے بچگانہ انداز میں سرگوشی کی۔

’’لیکن یہ درست طرزِ عمل نہیں ہے۔‘‘ہاشم نے اس کی ادا نظر انداز کر کے سمجھانے کی کوشش کی۔

’’جس کا کام اسی کو ساجھے،تم نہیں سمجھو گے۔اچھا تم پوچھ رہے تھے،کیا میں نادیدہ لہروں پر یقین رکھتی ہوں؟ تو جناب میں سو فیصد یقین رکھتی ہوں۔اب تو جدید سائنس بھی ثابت کرتی ہے کہ اگر ہم مثبت پہلوؤں پر سوچیں گے تو ہماری زندگیوں میں مثبت تبدیلیاں رونما ہوں گی اور اگر ہم منفی سوچ کے حامل ہوں گے تو ہماری زندگیوں پر بھی منفی اثرات مرتب ہوں گے۔یہ لوگ انہیں مثبت اور منفی لہروں پر یقین رکھتے تھے۔دشمن کو زیر کرنے یا اپنے لئے آسانیاں پیدا کرنے کے لیے ان لہروں کو سوچ کے تابع بنانے کی باقاعدہ مشق کیا کرتے تھے۔آج آگاہی مہم چلا کر،معاشرے کے ہر فرد کو مثبت سوچ کا حامل بننے میں مدد کی جائے، تو یہ ایک بہترین اصلاحی تحریک چلانے کے مترادف ہے۔دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔‘‘سمیرہ نے اصل مدعا دبانے کی خاطر جھٹ پٹ چھوٹی سی تقریر کر ڈالی۔

’’میں بنا بولے گفتگو کرنے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔‘‘ہاشم نے منہ بنا کر کہا۔

’’تمام ایجادات کے فارمولے پہلے دن سے ہی کرہ ارض پر موجود ہیں۔ہم نے موبائل فون ایجاد کر لیا، پھر ہم بنا بولے گفتگو کرنے لگے،مگر چار کھرب پانچ سو بائیس سال لگ گئے۔ان لوگوں نے شاید بنا کسی ریسیور یا آلے کے دماغی قوت یا لہروں کے ذریعے فریکوئنسی سیٹ کرنے کا فارمولا دریافت کر لیا ہوگا۔چونکہ ہمارے طور طریقے قدیم تہذیبوں سے الگ ہیں۔اس لئے ہماری ایجادات بھی ان سے الگ ہیں۔طرزِ زندگی بھی تو بدل گیا ہے ناں! بادشاہوں، راجاؤں کو بھیرویں ٹھاٹھ سے صبح کا راگ بھیروں الاپ کر بیدار کیا جاتا تھا۔اب ہر کوئی بادشاہ اور مہاراجہ ہے۔بیداری کے لئے موبائل فون پر چاہے راگ ملہار سیٹ کرو جو راگ میگھ کا حصہ ہے، جسے خوشی کا راگ بھی کہتے ہیں یا چاہے رائل اوپیرا ہاؤس کا آرکسٹرا

سیٹ کرو۔'' سمیرہ جواب دے کر جلدی جلدی برتن سمیٹنے لگی۔

''تم برتن چھوڑو، ای میل بھیج کر سو جاؤ۔ رات بھر جاگتی رہی ہو، برتنوں سے میں نمٹ لوں گا۔'' وہ سمیرہ کے ہاتھ سے ٹرے لے کر خود برتن سمیٹنے گا۔

''تین چار روز میں کاغذی کارروائی مکمل ہو جائے گی۔ اگلے منگل رات دس بجے کی فلائٹ ہے"۔سمیرہ نے بتایا۔

سردار ہاکوشا کا کی طبیعت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔طبیبوں کی جماعت دن رات مختلف نسخے تجویز کر رہی تھی۔اس کی کمر میں پسلیوں کے نیچے دونوں اطراف میں شدید درد اور جسم پر ورم تھا۔سردار نے شنیرہ کے علاوہ، اشارے سے سب کو خواب گاہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔

''مجھے مقدس سکہ لا دو، مجھ سے دور ہے۔شاید اسی لئے بیماری میری جان نہیں چھوڑ رہی۔'' سردار نے اتنا کہہ کر نقاہت کے باعث آنکھیں موند لیں۔

شنیزہ چپ چاپ خواب گاہ سے نکلی، گھر کے وسطی کمرے میں داخل ہو کر کواڑ معمور کر دیا۔ دائیں جانب چھ قدم چل کر مڑی اور دیوار میں چنا پتھر ہتھیلی سے نو بار دبایا۔ پتھر پہلے پیچھے اور پھر نیچے دھنس گیا۔اس نے جوف میں رکھا مقدس سکہ احتیاط سے اٹھالیا۔شگاف پُر ہونے میں لحظہ بھر لگا، پتھر خودکار طریقے سے اپنی جگہ آ ٹکا۔

سمیرہ نے اطاق نما کھنڈر کا بغور مشاہدہ کیا۔دیواریں شکستہ حال تھیں۔مگر آثار بتا رہے تھے کہ اس کمرے میں کوئی دروازہ، کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔

''یہ استھان ہے۔آقاؤں کے مرنے کے بعد استھان ہی کو ان کا مقبرہ بنا دیا جاتا تھا۔ جہاں سے یہ کھال برآمد ہوئی ہے، اسی جگہ نیچے کی جانب کھدائی شروع کرنی چاہیے۔'' سمیرہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

سمیرہ کے کہنے پر عمل درآمد کرتے ہوئے، تین ہفتے سے نہایت احتیاط برتتے کھدائی جاری تھی۔ سمیرہ ماسک پہنے نرم برش کی مدد سے مٹی ہٹانے میں مصروف تھی۔ برش کے نرم ریشے، اچانک کھردری سطح سے ٹکرائے۔ دستانے پہنے ہاتھوں سے ٹٹول کر معاینہ کیا تو تھیلی نما چیز برآمد ہوئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور تھیلی پلاسٹک کے حفاظتی بیگ میں رکھ کر اپنی جیب میں چھپالی۔

وسطی کمرے میں، شنیزہ غمزدہ حالت میں اپنے شوہر کی لاش کے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جس سکے کو ڈھالتے وقت دس ہزار انسانوں کی بلی چڑھائی گئی ہو، وہ مقدس کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن وہ کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ آخری رسومات ادا کر دی گئی تھیں۔اب کمرے کا دروازہ اور روشندان پتھروں کی چنائی سے ہمیشہ کے لئے بند کر دینا باقی رہ گیا تھا۔اس نے سب کو کمرے سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ

سکے کو سردار کی حنوط شدہ لاش کے ساتھ ہی دفنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔سکہ تھیلی میں رکھ کر تھیلی سردار کے سینے پر رکھ دی، پھر تھیلی پر تیار شدہ گوندنما محلول انڈیل دیا۔اس نے دوخشک کھالیں طلب کیں۔ایک کھال پر کچھ لکھ کر اسی کمرے میں آویزاں کرنے کا حکم دیا۔دوسری کھال پر چالیس روز سوگ منانے کا پروانہ جاری کیا۔

حنوط شدہ، ممی میز پر رکھی تھی۔میگنیٹک ریزانینس امیجز موت کی وجہ، دونوں گردوں میں پتھریاں بتا رہے تھے۔تصدیق کے لئے اینڈوسکوپی آپریشن کا فیصلہ کیا گیا اور پتھریاں گردوں سے نکال دی گئیں۔

''ہزاروں سال بعد اس کی سنی گئی۔اب یہ بالکل تندرست ہے۔'' ایک ڈاکٹر نے مسکرا کر خوش طبعی کا مظاہرہ کیا۔سمیرہ سوچ رہی تھی کہ سکہ اس ممی کے سینے پر اس دور میں رکھا گیا تھا، جب ایم آر آئی، سٹی سکین اور اینڈوسکوپی جیسی طبی سہولیات کا تصور بھی ناممکن تھا۔کیا سکہ واقعی مقدس ہے؟

''یہ کھال والی تحریر میری سمجھ سے باہر ہے۔'' سمیرہ نے جیب سے کاغذ نکال کر لہرایا۔کاغذ پر انگریزی زبان میں کچھ نہ سمجھ آنے والے ڈی کوڈ کیئے گئے الفاظ پرنٹ تھے۔تمام ڈاکٹرز اور دیگر عملے نے باری باری کاغذ دیکھا۔

''واضح سمجھ آ رہی ہے۔یہ اہل کنعان کی عبرانی زبان ہے، جو رومن انگلش میں لکھی گئی ہے۔'' ایک یہودی ڈاکٹر نے چیخ کر نوید سنائی۔

''مطلب اُس دور میں یہ عبرانی تحریر، رومن یو کا ٹک میان میں لکھی گئی تھی۔جو ڈی کوڈنگ کے بعد اب ہمارے سامنے رومن انگلش کی صورت میں موجود ہے۔اس نقطہ نظر سے تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' سمیرہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ہاشم اور سمیرہ ہچکولے کھاتی موٹر بوٹ میں بیٹھے، تاحدِ نگاہ ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا نظارہ کرتے ہوئے، خوشگپیوں میں مشغول تھے۔

''تم نے بتایا نہیں!اس کھال پر کیا لکھا تھا؟'' ہاشم نے تجسس سے پوچھا۔

''لکھا تھا، سکہ مقدس نہیں ہے بلکہ میری مثبت سوچ مقدس اور طاقتور ہے، جو میرے شوہر کو کبھی نہ کبھی اس بیماری سے ضرور نجات دلائے گی۔''

سمیرہ نے اپنے دستی بیگ سے دریافت شدہ سکہ نکال کر ہاشم کو دکھایا اور سمندر کی جانب اچھال دیا۔

''یہ کیا، کیا تم نے؟'' ہاشم بھونچکا رہ گیا۔

''منفی سوچ سمندر برد کی ہے۔'' سمیرہ کا لہجہ طمانیت بھرا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

● فرحین جمال

میری دلاری

''اررى سنتى ہے کیا؟'' اماں کی جھتی اور کان پھاڑ دینے والی آواز کانوں سے ٹکرائی، تو میں چونک کر اپنے خیالوں سے باہر آ گئی۔ پر اماں کو کون چپ کروا سکتا ہے۔ لو جی ایک بار ان کا واعظ شروع ہو جائے تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

''کتنی بار کہا ہے! سفید کپڑوں کو سوموار کو دھو کر دیوار پر سوکھنے کے لئے ڈالا کرو۔''

''رنگیں کپڑے منگل کو دھو اور انہیں رسی پر سوکھنے کے لئے پھیلاؤ۔''

''ننگے سر تیز دھوپ میں باہر نہ نکلا کرو۔''

''آلو کے پکوڑے گرم میٹھے تیل میں تلے جاتے ہیں اری او نا سمجھ۔''

''زیر جامے کو اتارتے ہی فورا بھگو دیا کرو۔''

میری عمر پندرہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اماں نے مجھے گھر داری کے تمام اصول اور ٹو ٹکے سیکھانے کا پکا ارادہ کر لیا، کوئی دن نہیں جاتا تھا کہ اماں کا بھاشن میرے کانوں میں رس نہ گھولتا ہو۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بی جان کے مجرد نسخے اچھی طرح مجھے ذہن نشیں نہ کرا دیں۔ خیر اس میں اماں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے ایک انگریز کلکٹر کے گھر پر نانا ڈرائیور اور بی جان (نانی اماں) کچن میڈ تھیں۔ مسز ڈکسن اپنے گھر کو ایسے چلاتی تھیں جیسے انگریز بدیش میں اپنا راج۔ غلطی کی کوئی گنجائش نہ تھی ورنہ کھڑے کھڑے نوکری سے فارغ۔ بی جان ان کے گھر پو پھوٹتے ہی چلی جاتیں اور شام ڈھلے گھر واپس آتیں۔ غلامی میں اپنی مرضی کہاں چلتی ہے ویسے بھی مسز ڈکسن کی نظر میں یہ کالے ہندوستانی جاہل اور اجڈ ''ڈیم ایڈیٹ، بلڈی فولز'' تھے۔ سو بی جان کی تربیت انتہائی سخت نظم و ضبط کے تحت ہوئی، بے داغ کلف لگے اکڑے ہوئے ایپرن اور سفید ٹوپی، لباس بے شکن ورنہ میم صاحبہ کے ماتھے پر پڑے بل اور غضب ناک شعلہ برساتی آنکھیں ان کے منہ سے اردو زبان کے ٹوٹے پھوٹے نکلتے الفاظ کسی گولی سے کم نہیں تھے، اماں کو یہ سب وراثت میں ملا۔ اماں سمجھتی تھیں کہ اس طرح وہ دوسرے گھرانوں سے ممتاز ہیں اور ان کی اکلوتی بیٹی یہ سب سیکھ لے تو کسی اچھے گھر میں بیاہی جائے گی۔

’’تمھیں سمجھایا بھی ہے کہ جب بھی بازار جاؤ اور سوتی کپڑا (کاٹن) اپنا بلاؤز بنانے کے لئے خریدو تو اس بات کا ضرور خیال رکھنا کہ اس پر گوند نہ لگا ہوا ہو، کیونکہ دھلنے کے بعد وہ اپنی مضبوطی اور ساخت قائم نہیں رکھ سکے گا۔‘‘ لیجئے یہ رہے بازاری اصول۔

’’تمھیں علم نہیں کہ نمکین مچھلی کو پکانے سے پہلے رات بھر پانی میں بھیگو کر رکھا جاتا ہے۔‘‘

’’مچھلی کو کیسے پکڑا جاتا ہے، اور ایسی مچھلی جس کی تمھیں ضرورت نہ ہو اسے واپس پھینک دینا چاہیئے تاکہ تم پر کوئی مشکل نہ آن پڑے۔‘‘

’’ہوں جیسے میں مستقبل میں مچھیران بنوگی، اماں یہ تو بتاؤ کہ دریا یا جھیل پر جائے بنا مچھلی کیسے پکڑی جاسکتی ہے؟، ہر کام کو سر پر چڑھا لیتی ہو اماں۔‘‘لو یہ کون سا مشکل ہے، جا بالٹی میں پانی بھر لا، اور دیکھ اس لکڑی کے سرے پر لگے کانٹے میں روٹی یا کینچوا لگا کر پانی میں ڈال دے، مچھلی آسانی سے پھنس جاتی ہے۔‘‘

’’اور میں یہ کیا سن رہی ہوں؟ کہ تم اسکول میں فلمی گیت گاتی ہو؟‘‘

’’کیا یہ سچ ہے؟ ارری او عقل کی ماری تجھے اس لئے اسکول بھیجتی ہوں۔‘‘

اور میں جھنجھلا جاتی۔ زندگی کا کوئی پل ایسا نہیں تھا جس پر صرف میرا حق رہا ہو، دن رات بس یہ سبق ہی رٹنا پڑتا۔لڑکپن کے سندر سپنے، کیا ہوتے ہیں؟ وہ میری دسترس میں کبھی نہ رہے۔ جانے وہ کون سی لڑکیاں ہوتی ہیں جو نوجوانی میں کھلی آنکھوں سپنے بنتی ہیں، معصوم سی خواہشیں پالتی ہیں، بھیگے موسم تن من میں دھیمی دھیمی آگ سلگاتے ہیں، رنگیں چنریا ہوا میں لہراتی بادلوں کے سنگ اڑتی جاتی ہیں۔

کھانا کھانے بیٹھو تو دستر خوان پر بھی درس جاری رہتا۔

’’اے یہ کیا؟ تو چل میں آیا لگا رکھی ہے، ایسے کھانا کھاتے ہیں کیا؟ تجھے کھانے کے آداب نہیں آتے، ہمیشہ لقمے کو ایسے اٹھانا چاہیئے کہ کسی دوسرے کو تمھیں کھاتا دیکھ کر متلی نہ ہو۔‘‘ اکثر میرے حلق میں نوالہ اٹک جاتا اور اچھو لگ جاتا اس پر بھی اماں سے مزید صلواتیں سننا پڑتیں۔ بس ایک چھٹی کے دن گھر سے باہر جانے کی اجازت ملتی تھی۔

’’مجھے تیرے لچھن کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔‘‘یوں مٹک مٹک کر مت چلا کر چھٹی کے دن باہر نکلنے پر تیری چال کسی معزز اور مہذب خاتون جیسی ہونی چاہیئے نہ کہ کسی حرافہ جیسی جو تو بننے پر اڑی ہوئی ہے۔‘‘

اور سن! تجھے ہرگز ہرگز محلے کے لفنگے لپاڑے لڑکوں سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اور گھاٹ پر کام کرنے والے چوہے جیسے لڑکوں سے تو بالکل بھی نہیں کرنی چاہیئے، چاہے وہ کسی بہانے تجھے سے راستہ ہی پوچھ رہے ہوں۔‘‘

''اور ہاں سڑک پر چلتے پھرتے پھل مت کھایا کر،ایسا کرنے سے مکھیاں بھنبھناتی پیچھے آئیں گی۔''

''اففو اب گھر سے باہر بھی اماں کی ہدایات ذھن میں رکھوں،ایک دن تو آزادی کا ملتا ہے مجھے میں بے زاری سے سوچتی۔

''اسکول میں گیت مت گایا کر خاص کر اسلامیات کے پریڈ میں۔''لیکن میں اسکول میں بالکل بھی گیت نہیں گاتی،''میں چڑ کر جواب دیتی۔''

''دیکھ اور سیکھ! بٹن کو قمیص میں کس طرح لگایا جاتا ہے؟ اور کس طرح بٹن کے لئے کاج بنائے جاتے ہیں،قمیص کے کنارے کی اس طرح ترپائی کرتے ہیں جب تمیں لگے کہ اس کے کنارے نیچے ڈھلک رہے ہوں۔''

''میں دیکھ رہی ہوں کام پر دھیان نہیں تیرا۔میری باتیں کڑوی ضرور ہیں پر یہ تجھے حرافہ بننے سے روکنے کے لئے ہیں جو تو بنتی جا رہی ہے۔''

''اماں کسی وقت تو اپنی جلی کٹی سے باز آجایا کرو۔''میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔اس پر بھی اماں کہتیں کہ ''جھوٹے ٹسوے نہ بہا۔''

''چل جا اپنے باپ کی خاکی قمیص اور پتلوں کو اچھے سے استری کر کہیں کوئی سلوٹ نہ رہ جائے۔ کام چور نکمی۔''ابا کی یونیفارم پر استری ایسے کروائی جاتی جیسے وہ پولیس میں انسپکٹر جرنیل ہوں،ایک فیکٹری میں معمولی سے ملازم ہی تو ہیں۔میرے اعزازات میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔اماں کا بس چلتا تو مجھے چابی بھرے کھلونے میں تبدیل کر دیتیں۔

گھر کے صحن کے علاوہ کافی کچی زمین تھی جس میں موسم بہار کی آمد سے پہلے سبزیاں اگائی جاتیں۔اماں کی چیل جیسی نظر ہر پودے پر ہوتی خاص کر ٹماٹروں پر،گرمیوں کی دو پہروں میں میری یہ ہی کوشش ہوتی کہ یہاں اماں کی آنکھ لگے اور میں لال لال ٹماٹر توڑ کر اور نمک لگا کر چٹخارے لیکر کھاؤں، پر میری ایسی قسمت کہاں؟ ایسا لگتا تھا کہ دنیا کے تمام ہنر سیکھ کر ہی میں تہذیب یافتہ کہلاؤں گی۔

''بھنڈی کے پودے کو گھر سے دور لگاؤ، کیونکہ سرخ چونٹیاں اس میں اپنا ٹھکانہ بناتی ہیں۔اروی کا پودا لگاتے وقت اسے زیادہ سے زیادہ پانی دو ورنہ کھاتے وقت وہ حلق میں کھجلی کرے گا۔''

گھر کی صفائی ایک بڑا معرکہ ہوتی میرے لئے۔

''کونے،کھدروں میں بھی جھاڑو دیتے ہیں؟ کونے کھدروں کو کون صاف کرئے گا؟ پورے گھر میں کیسے صفائی کرنی ہے؟ یہ نہیں کہ بس سامنے سامنے سے لیپا پوتی کر لی،اور پچھواڑے میں کون جھاڑو دے گا؟''

اماں کے مزاج کی وجہ سے گھر میں مہمان کم کم ہی آتے اور جو آتے ان کے جانے کے بعد میری مزید شامت آجاتی۔

''اس دن مہمانوں کے سامنے تم کیوں اپنی بتیسی نکال رہی تھیں؟ اچھی لڑکیوں کے ایسے اطوار نہیں ہوتے۔''

''کوئی ایسا شخص جسے تم بالکل پسند نہیں کرتیں اسے دیکھ کر صرف دھیمے سے مسکرانا ہے، اور کسی ایسے شخص کو اپنی بھرپور مسکراہٹ دو جیسے تم پسند کرتی ہو۔''

''چائے کے لئے میز کو کیسے تیار کرنا ہے؟ اور رات کے کھانے کے لئے میز کیسے تیار کرنی ہے، خاص طور پر کھانے پر جب کوئی اہم مہمان مدعو ہو، دوپہر کے کھانے کی میز کیسے تیار کروگی اور ناشتے کے لئے کیسے؟ یہ سب ابھی سیکھ لو۔ گھر کے واحد چینی کے ٹی سیٹ اور کراکری کی نمائش کسی خاص مہمان کی آمد پر ہی ہوتی اور اماں ان کو میز پر برتنے کے طریقے سمجھاتی رہتیں، ایسے میں میرے ہاتھ کانپ کانپ جاتے کہ کہیں کوئی پرچ یا پیالی ہاتھ سے گر نہ پڑے۔ پرائے گھر جاؤ گی تو بہت کچھ سننا پڑے گا۔''

''مردوں کی موجودگی میں تمھیں کیسے پیش آنا ہے، جنہیں تم زیادہ نہیں جانتیں، ہمیشہ نظریں نیچی اور آواز دھیمی۔ اس طرح وہ فوراً یہ جان نہیں پائیں گے کہ تم شریف زادی ہو یا وہ حرافہ جس کے بارے میں تمھیں اکثر خبردار کرتی رہتی ہوں کہ نہ بنو۔'' مجھ بیچاری کی کمر پر نصیحتوں کی بھاری بھرکم بوری لاد بھی دو تو کون ہمارے جیسے مفلس کنگال گھرانے میں بیاہنے آئے گا۔ میں اکثر سوچتی۔

''روزانہ نہایا کرو۔ بدبودار بدن مرد کو نہیں بھاتا۔''

''زمین پر اکڑوں بیٹھ کر کانچے مت کھیلا کرو، تم لڑکا نہیں ہو، تمھیں پتا ہے۔'' کبھی کبھی میں چلا اٹھتی۔

''اماں بس بھی کردو تمہاری باتیں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔''

''لوگوں کے باغ سے پھول مت توڑا کرو کہیں کوئی مرض نہ لگ جائے۔ کالے کوئے کو پتھر نہ مارو کیا پتا وہ کالا کوا ہی نہ ہو۔''

''اے لو یہ بھی خوب کہی۔ کوا نہیں تو کیا کوئی پرنس چارمنگ ہوگا اماں؟ میں کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔''

''بریڈ کی پڈنگ اور سیاہ مرچ کا سالن بنانا کب سیکھے گی لڑکی؟''

''سن سردیاں آرہی ہیں ان سے بچاؤ کے لئے یہ خاندانی نسخے بھی سیکھ لے مجرد ہیں، تیرے کام آئیں گے۔''

ابھی میں سترہ کی تھی کہ میرے رشتے آنے لگے، اماں کو تو جیسے پر لگ گئے، بس پھر مجھے ازدواجی

زندگی کی اونچ نیچ اور گھر بسانے کے نسخے بتانے لگیں۔

کان ادھر کر اماں بڑی رازداری سے میرے قریب آ کر کان میں کھسر پسر کرتیں۔ ''اگر کچھ ایسا ویسا ہو جائے تو مؤثر دوا کیسے بناتے ہیں یہ بھی سیکھ اس سے پہلے کہ اس میں جان پڑ جائے۔'' اس وقت ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی عیارانہ چمک ہوتی۔

''مرد پر دھونس کیسے جمائی جاتی ہے؟ اس کو کس طرح زچ کیا جا سکتا ہے؟ یاد رکھو وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تمہاری پکڑ کرے گا، تمھیں بھی اس کی بلیک میلنگ سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''

''مرد سے محبت کرنے کے بھی چند اصول ہیں اور اگر وہ کارگر نہ ہوں تو اور بھی طریقے ہیں اسے رجھانے بہلانے کے، اور پھر بھی وہ تمہارے دام میں نہیں آتا تو آزردہ خاطر نہ ہونا، اور کبھی ہار مت ماننا۔''

''اپنی محدود آمدن میں گزارا کرنا سیکھو۔ بریڈ کو ہاتھ سے دبا کر اندازہ لگاؤ کہ وہ تازہ ہے یا نہیں۔''

''کیا کہا؟ بیکری کا مالک بریڈ کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔''

''تمہاری جوانی پر تف ہے، لڑکیوں کو ناز و انداز سیکھنے چاہیں، تمہارا مطلب ہے کہ تم حقیقت میں ایسی عورت بننے جا رہی ہو جسے بیکری والا بریڈ کے نزدیک بھی پھٹکنے نہ دے۔'' میں سوچتی کے اماں اتنی غصہ ور اور تلخ مزاج کیوں ہیں؟ شاید مفلسی اور تنگدستی نے انہیں ایسا بنا دیا۔

اٹھارہ برس میں چند جوڑوں اور اماں کی نصیتوں کی پوٹلی سنبھالے بیاہ کر خورشید کے گھر آ گئی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ تلخی کسے کہتے ہیں، ساس اور دو نندوں کا ساتھ، دن رات ہر ہر بات پر طنز و طعنے۔ خورشید اپنے نام کی طرح آگ برساتے، لہجے کی تمازت سے میرے دل کو جلاتے اور ہاتھ سے جسم کو سیکتیر ہے۔ نبھا کی تمام کوششیں ناکام ہوتے دیکھتی تو نئے سرے سے اماں کی باتوں کو ذھن میں دوہراتی اور میاں کو رام کرنے کی کوشش کرتی، لیکن ان کا سرد رویہ، کڑوی باتیں، میری ذات کی نفی ہر دفعہ مجھے مایوس کر دیتی۔ اپنی جان پر اذیت سہہ کر اپنی دونوں بچیوں کی پرورش کرتی لیکن، بیٹی پیدا کرنا میرا سب سے بڑا جرم تھا اور اس کی پاداشت میں روز سولی پر لٹکائی جاتی۔

شادی کے دس سال میں اماں کی پوٹلی کئی بار کھولی، لیکن اپنے نفسیاتی، اذیت پسند شوہر کو رام نہ کر سکی، اپنی دو بچیوں کی انگلی تھامے، طلاق کا طوق گلے میں لٹکائے اس خود پسند شخص کے گھر سے نکالی گئی تو سوچ رہی تھی کہ اماں نے نشست و برخاست اور گھر گھرستی کے تمام گر سکھائے لیکن زندگی جینے کا ہنر سکھانا بھول گئیں۔

◀◀ ● ▶▶

188-Rue de la Station
1410 Waterloo
Belgium

● اسرار گاندھی

مفاہمت کا عذاب

دفتر سے برآمد ہونے والا وہ آخری شخص تھا۔ یہ اس کا معمول تھا کہ وہ اپنا تمام کام روز کے روز پورا کرڈالے۔ جبکہ آفس کے دوسرے بہت سے لوگ معمولی معمولی کاموں کو ہفتوں ٹالتے رہتے۔ ہاں اگر انھیں کام کرنے کے پیسے ضرورت مند سے مل جاتے تو ان میں تیزی دیکھنے کے قابل ہوتی۔

آفس سے باہر نکل کر وہ جب سڑک پر آیا تو اسے شدید سردی کا احساس ہوا۔

آسمان پر گھرے بادل اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے تھے اور ہوا میں کانٹوں کی سی چبھن تھی جو اس کے وجود کو زخمی کررہی تھی۔ سڑک سنسان تھی، بس اکادکا راہگیر کبھی کبھی نظر آجاتے۔

اس نے اپنی موٹر بائک کی رفتار ذرا تیز کردی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سنسان راستے سے جلد از جلد نکل کر شہر کے بارونق علاقے میں پہنچ جائے۔

اس کا رخ سول لائنز کی طرف تھا۔

سول لائنز......شہر کا سب سے بارونق شاپنگ سینٹر۔ یہاں ہر چیز اپنی انتہا پر نظر آتی۔ وہ فیشن ہو، حسن ہو، مہنگائی ہو یا پھر لوگ۔ نوجوان زیادہ موجود ہوتے۔ وہ ہر طرف خوبصورت پرندوں کی طرح ادھر سے ادھر پھدکتے پھرتے۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی جینس اور سلیولیس ٹاپ میں اپنے پرانے جمال کو واپس دکھانے کی کوشش میں لگی ملتیں۔ خواتین کی اس بھیڑ میں اچانک کسی کسی وقت ایسے چہرے بھی روشن ہو جاتے جو دنوں تک حواس پر چھائے رہتے۔

یہ شاپنگ سینٹر اپنے مہنگائی کے لئے مشہور تھا۔ لیکن پھر بھی یہاں ہر وقت خریداروں کا مجمع اکٹھا رہتا۔ یہاں سے خریداری کرنا اسٹیٹس سمبل تھا۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو پنسلیں، کچھ سستی ٹافیاں اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں خرید لیتے باقی وقت ونڈو شاپنگ میں ہی گزار کر اپنا معیار ظاہر کرنے کی کوشش کرتے۔

اس نے سول لائنز پہنچ کر ایک جگہ اپنی بائک کھڑی کی اور ایک خوبصورت سی کافی شاپ کی طرف چل پڑا، جو اس کی پسندیدہ سچویشن تھی۔ خوبصورت سے ہال میں قرینے سے سجی ہوئی میزیں، کرسی پر بیٹھے ہوئے نفاست پسند لوگ، دھیمی دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے نظر آتے۔ بے حد پرکشش ماحول تھا

یہاں پر۔اس نے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھتے ہوئے ہال کا جائزہ لیا۔بہت سے جانے پہچانے چہرے اپنے خاص رویوں اور اداؤں کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔کئی لوگوں نے اسے وش کیا جس کا جواب اس نے اپنی گردن کو ہلکا سا خم کر کے دیا۔وہاں بیٹھے ہوئے اکثر لوگوں سے اس کی شناسائی پرانی تھی۔وہ سبھی سے بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

یہ سب لوگ تقریباً روزانہ بیٹھنے والوں میں سے تھے۔اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہاں بیٹھے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مقابل میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ کورٹ شپ کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔

یہیں اسے ریناشفرڈ ملی تھی۔

لیکن نہیں! ریناشفرڈ سے بھی کافی پہلے وہ اسی کافی شاپ میں شافعہ سے مل چکا تھا۔شافعہ اسے پہلی نظر میں ہی بھا گئی تھی۔

پھر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا اور ہر بار وہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے تھے۔

وہ تقریباً ہر شام اسی گوشے میں آ کر بیٹھ جاتا۔سڑک کی طرف کھلتی ہوئی کھڑکی میں لگے کلرڈ ونڈو پین کے اس پار اسے سب کچھ خواب جیسا محسوس ہوتا۔

سڑک پر پھسلتی ہوئی کاریں،نوجوانوں کی بھیڑ،ہاتھ میں ہاتھ،روشنی سے منور دوکانیں اور خرید وفروخت۔کیا کچھ یہاں سے نہیں دکھائی پڑتا تھا۔ہال کے ساؤنڈ پروف ہونے کی وجہ سے باہر کی آوازیں مداخلت نہیں کرتی تھیں۔سب کچھ خوابیدہ خوابیدہ سا لگتا اور اسی سحر زدہ ماحول کے بیچ سے جب شافعہ اسے کافی شاپ کی طرف آتی ہوئی دکھائی پڑتی تو اس کے چہرے پر مسرت بھری مسکراہٹ پھیل جاتی۔

شافعہ...... جو نہایت جاذب نظر تھی۔

شافعہ...... جس کے جلد پر نگاہیں ایسی ہی پھسلتیں جیسے اسکیٹنگ ہال میں اسکٹ کرنے والوں کے پیر پھسلتے۔

شافعہ...... جس کی نگاہیں کسی کو بھی گھائل کر دینے پر قادر تھیں۔

شافعہ...... جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتی تھی اور جس نے اپنے آپ کو رجعت پسندی کے بہت سے قید و بند سے آزاد کر لیا تھا۔

اس دن شافعہ کو کافی شاپ پہنچنے میں قدرے دیر ہو گئی تھی۔اس تاخیر سے وہ نہایت بے چین ہو گیا تھا۔

شافعہ جب آئی تو اس نے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

’’ویری ساری! مجھے ذرا دیر ہو گئی،میں آفس سے نکلنے والی ہی تھی کہ باس نے ضروری کام سے روک لیا۔ملٹی نیشنلز کا کلچر تو تم جانتے ہی ہو۔اپنا وقت کب اپنا وقت ہوتا ہے۔اس پر کمپنی کا اختیار ہو جاتا ہے۔ذرا بھی

پروٹسٹ کروتو نوکری سے باہراور باہرنوکری کا انتظار کرنے والوں کی ایک لمبی کیو۔'' وہ ایک جھٹکے میں اپنی باتیں کہتی چلی گئی۔ پھراس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کرمسکرائی۔ ایک دلفریب مسکراہٹ،اس کی جھنجھلاہٹ ہواہوگئی۔

''تم اپنے دیر سے آنے کی اطلاع تو دے ہی سکتی تھیں۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

''ہاں مجھ سے یہ غلطی ضرور ہوئی، آئندہ خیال رکھوں گی۔''

پھر وہ دیر تک سرگوشیوں میں گم رہے۔

ہال کے باہر کی دنیا اب بھی اسی طرح جوان تھی، خوابیدہ خوابیدہ سی۔ خوابوں میں چلتی پھرتی پرچھائیاں جیسی، ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے ہوئے جوڑے اور دو کانوں کی وہی چکا چوند۔

اچانک ہال میں ایک چھنا کا ہوا۔ شاید کوئی گلاس میز پر سے گر کر ٹوٹا تھا۔ چھناکے کی آواز سے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ اس طرح چونکے جیسے نیند سے اچانک جاگ پڑے ہوں۔ زیادہ تر نگاہیں اسی جانب اٹھ گئیں جس میز پر سے گلاس گرا تھا۔ اس جگہ پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر جھینپ نمایاں تھی۔

''چلو چلتے ہیں، آج کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی ہے۔'' شافعہ بولی۔

''چلو۔'' اس نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے وہ ابھی اور بیٹھنا چاہتا ہو،لیکن بادل ناخواستہ وہ اٹھ ہی گیا۔

پھر جلد ہی وہ وقت آیا جب کافی شاپ میں روز بیٹھنے والے اس کے واقف کار اسے مس کرنے لگے۔

شافعہ سے شادی کے بعد وہ ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔

کتنے خوبصورت تھے وہ دن۔ نرم گرم جذبات کی وادیوں میں بھٹکتے ہوئے۔ نہ ان کے لئے زمین سخت تھی اور نہ آسمان دور۔ دنیا کی تمام عیاریوں سے بے نیاز آزاد پرندے کی طرح ادھر سے ادھر پرواز کرتے ہوئے۔ پھر وہ اڑتے اڑتے تھک گئے اور اچانک انہیں زمین کی طرف ڈائیو مارنا پڑا۔

ان کا پہلا تصادم اس وقت ہوا جب ایک دن شافعہ نے اسے اپنی پرگنینسی کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ وہ اس مصیبت کو اپنی کوکھ میں نہیں رکھ سکتی۔ وہ ابارشن کرادے گی۔

''مگر کیوں؟'' اس نے شافعہ کو حیرت سے دیکھا۔

''آفس کی زندگی میں ان جھمیلوں کے لئے گنجائش کہاں نکل پاتی ہے۔ آفس میں کام کرنا پھر بچے بھی پالنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں نے تم سے احتیاط کرنے کو کہا تھا لیکن تم نے خیال نہیں کیا۔''

''تم چاہو تو سروس چھوڑ سکتی ہو، میری تنخواہ میں زندگی اطمینان سے گزر جائے گی۔''

اس کی بات سن کر شافعہ زور سے ہنسی پھر بڑے تیکھے لہجہ میں بولی۔

''تاکہ تم آسانی سے اپنی مرضی مجھ پر تھوپ سکو۔ کیسے کیسے خواب دیکھتے ہیں یہ بے چارے مرد۔''

وہ تلملا گیا۔ بات تلخ ہوگئی تھی لیکن شافعہ اپنے خیال پر جمی رہی پھر اس نے جلد ہی اپنی کوکھ میں موجود سانس لیتی ہوئی زندگی سے چھٹکارہ حاصل کرلیا۔

شافعہ سے اس کا دوسرا جھگڑا اس وقت ہوا، جب اس کے ماں باپ شافعہ کے مسلسل ردعمل سے بیزار ہوکر اپنے بڑے بیٹے کے یہاں چلے گئے۔

یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ انا کے ٹکراؤ نے دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار تعمیر کردی تھی۔ کافی شاپ میں اس کے واقف کار اسے مسلسل مس کررہے تھے۔

پھر ایک دن کافی شاپ میں بیٹھنے والے لوگوں نے اسے اپنی جگہ لیتے ہوئے دیکھا۔ لیکن چند ہی دنوں بعد اس کی کھوئی کھوئی آنکھوں، چہرے پر پھیلی ہوئی بے چینی اور اس کے عجیب سے رویے نے انھیں بتا دیا کہ اس کی زندگی کسی منجھدھار میں پھنس چکی ہے۔

انھیں اس کے ساتھ ہمدردی محسوس ہوئی۔ انھوں نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ گھر سے اس کا تعلق اب صرف اتنا ہی رہ گیا تھا کہ جب وہ صبح سو کر اٹھتا تو میز پر رکھا ہوا ٹھنڈا ناشتہ اس کا انتظار کرتا ہوتا اور رات گئے جب گھر واپس آتا تو کھانا میز پر رکھا ہوا ملتا۔

وہ اکثر سوچتا کہ اس سے کیا بھول ہوگئی۔ غالباً کئی برس چلنے والی کورٹ شپ کے درمیان اس نے اسے پوری طرح سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ شافعہ کے بانہوں کا سہارا لے کر صرف خواب دیکھتا رہا تھا۔

اسے اپنے بچپن کے دوست عابد قادری اور ان کی بیوی سائرہ یاد آئے۔ کتنی خوشگوار زندگی تھی ان کی، ایک دوسرے پر اعتماد اور اعتبار۔ عابد کے رومانٹک مزاج ہونے کے باوجود سائرہ کتنے خوبصورت طریقوں سے اسے اپنی زندگی میں ایڈجسٹ کرتی تھی۔

ایک بار اس نے عابد سے پوچھا تھا ''یار یہ بتاؤ کہ تم نے اپنی بیگم میں خوبصورتی کے علاوہ اور کیا کیا دیکھا تھا کہ تمہاری زندگی کا موسم کس قدر خوشگوار ہوگیا ہے۔''

عابد مسکرا کر بڑے سنجیدہ لہجہ میں بولا۔ ''میں نے پہلے ہی محسوس کرلیا تھا کہ سائرہ بڑی Submissive ہے اور وہ بہت اچھے طریقہ سے میری لائف اسٹائل میں ایڈجسٹ کرسکے گی۔ شادی کے بعد یہ بات سچ ثابت ہوئی، وہ میری باہر والی زندگی میں کبھی دخل نہیں دیتی، وہ جانتی ہے کہ میں جہاں بھی جاؤں گا واپس لوٹ کر اسی کے پاس آؤں گا۔ اسے مجھ جیسا چاکلیٹ کریم سولجر ہر صورت میں بے حد پسند ہے۔'' عابد ٹھہر کر مسکرایا اور پھر دوبارہ بولا۔

''حالانکہ وہ اپنے آفس میں ایک بڑی پوسٹ سنبھالے ہوئے ہے۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی اور عابد نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا تھا جیسے وہ اس ٹھنڈی سانس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کررہا ہو۔

عابد کے پاس سے لوٹتے وقت اس نے سوچا تھا کہ کاش اس نے شافعہ میں بھی سائرہ جیسی کچھ خوبیاں تلاش کرلی ہوتیں مگر یہاں تو صورت حال ہی برعکس تھی۔ اسے کئی باتیں یاد آئیں۔

''چلو اٹھو ذرا بازار چلنا ہے، کچھ خریداری کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں نہیں جاؤ گی؟''

'نہیں جاؤں گی، بس میرا موڈ نہیں ہے۔''

اسے وہ وقت بھی یاد آیا کہ جب اس کے کئی اچھے دوست آئے ہوئے تھے، اس نے شافعہ سے چائے بنانے کو کہا تھا، جواب میں شافعہ بولی تھی۔

''دوست آپ کے ہیں آپ خود بنا لیجئے، میں تھکی ہوں۔ یہ سب کام میں نہیں کروں گی۔''

وہ اس طرح کی باتوں پر کچکچا کے رہ جاتا، لیکن کیا کرتا کہ اس کی ازلی شرافت مانع آتی تھی۔

اچانک کسی نے اس کی پیٹھ پر دھپ جمائی۔ وہ چونک پڑا اور خیالوں کی دنیا سے باہر آگیا۔ مڑ کر دیکھا تو پیچھے اشوک گانگولی کھڑا تھا۔

''ارے کہاں کھوئے ہوئے ہو؟ میں دیر سے تمہارے پیچھے کھڑا تمہیں گم سم دیکھ رہا ہوں۔''

اشوک کی بات سن کر اسے دھیان آیا کہ وہ واقعی نہ جانے کب سے یادوں کے کٹیلے جنگل میں بھٹک رہا ہے۔

اشوک نے اس کے ساتھ ایک کپ کافی پی تھوڑی سی غپ لڑائی اور نکل گیا۔

اس نے رنگین شیشوں کے اس پار پھر دیکھا۔ بھیڑ چھٹ گئی تھی، دوکانوں کے شٹر گرائے جارہے تھے، بچے کھچے لوگ اور روڈ پر بھاگتی دوڑتی کاریں اب بھی اسے خوابناک پرچھائیاں ہی لگ رہی تھیں۔

اس نے گھڑی دیکھا۔ ۹ بج رہے تھے۔ لاشعوری ردعمل کے طور پر اس نے سوچا کہ گھر چلا جائے لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ وہ گھر جا کر کیا کرے گا؟ وہاں کون منتظر ہوگا؟ شافعہ سے بات چیت ٹوٹے ہوئے کئی مہینے بیت گئے ہیں۔ اب وہ ان چیزوں کا کتنا عادی ہوگیا ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بوجھل قدموں سے کافی شاپ کے باہر آگیا۔ باہر آتے ہی اسے احساس ہوا کہ سردی شدید ہے، اتنی ہی سردی کا احساس اسے اس رات بھی ہوا تھا جب وہ گھریلو انتشار کے عالم میں اسی شاپنگ سینٹر پر ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ پھر جب ٹہلتے ٹہلتے تھکان اس کے وجود کو نگلنے لگی تھی تو وہ اس

کافی کارنر پر کھڑا ہو گیا تھا جہاں اس کی ایک واقف کار خاتون کسی دوسری عورت کے ساتھ کھڑی کافی پی رہی تھیں اور بڑے منہمک انداز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے اپنی جان پہچان والی عورت کو وش کیا تو اس نے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔

''اکیلے کیوں کھڑے ہو، ہم لوگوں کے ساتھ ہی کافی پیو۔'' وہ عورت بولی۔

اس کے اشارے پر بیرا اسے بھی ایک کپ کافی دے گیا۔

''دیکھو یہ میری دوست رینا شیفرڈ ہیں۔ کالج میں انگریزی پڑھاتی ہیں اور تمہیں حیرت ہوگی کہ یہ اردو اچھی جانتی ہیں۔'' واقف کار خاتون نے رینا سے اس کا تعارف کرایا۔ متناسب ناک نقشے اور کھلتے سانولے رنگ والی یہ عورت اسے خاصی پر کشش معلوم ہوئی۔ اس نے بغیر سوچے ہوئے اپنا ہاتھ رینا کی طرف بڑھا دیا جو گرم جوشی سے قبول کر لیا گیا۔

''آپ؟'' رینا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں عامر ہوں اور ایک آفس میں جونیئر آفیسر۔'' وہ رک رک کر بولا۔

''خاصی انکم والی پوسٹ ہوگی؟'' رینا ہنستی ہوئی بولی۔

''ہے تو لیکن میں ایسی انکم پر خوش نہیں ہوتا۔''

دونوں نے ہی اسے حیران ہو کر دیکھا پھر وہ مسکرائیں جیسے انھیں اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

وہ دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

رینا سے اس پہلی ملاقات کے بعد ملنے کا سلسلہ بن گیا۔ اب رینا اس کے قریب آ گئی تھی۔ وہ اکثر اس کے فلیٹ کا رخ کرتا جو ایک بے حد پاش کالونی میں تھا۔ ایسی کالونی جہاں زندگیوں کا محور صرف اپنی ذات ہوتی ہے۔ رینا تنہا رہتی تھی۔

''تمہارے والدین کہاں ہیں۔'' ایک بار اس نے پوچھا۔

''وہ اس شہر میں نہیں رہتے۔ میں سروس کرنے کے لئے یہاں آ گئی ہوں۔'' رینا نے اسے بتایا۔

''اوہ اچھا۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا تھا۔

پھر یہ کبھی کبھی کی ملاقاتیں کچھ ہی دنوں میں روز روز کی قربتوں میں تبدیل ہو گئیں۔

وہ آفس سے نکل کر سیدھے رینا کے فلیٹ پر پہنچ جاتا اور دیر تک اس کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہوتا۔

وہ بڑی ہنس مکھ تھی۔ باتوں ہی باتوں میں چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی۔ لیکن اسے اس وقت بڑی گھٹن محسوس ہوتی جب ہنسنے ہنسانے کے دوران اسے چپ سی لگ جاتی۔

اس نے کئی بار اس خاموشی کی وجہ جاننے کی کوشش کی تھی۔لیکن رینا نے ہمیشہ ٹال دیا تھا۔ پھر بھی وہ اتنا تو سمجھ ہی گیا تھا کہ رینا کے ساتھ کوئی ایسی ٹریجڈی ہے جو اسے اپنے مرکز کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔

اس کی زندگی بے آواز بہنے والے دریا کی طرح رواں دواں تھی۔وہ تھا، رینا تھی، جذباتی لمحے تھے اور سکون۔وہ گھریلو زندگی کی اذیتوں سے بہت دور نکل آیا تھا۔یہ ایک طرح کا فرار تھا۔

اس کی خواہش تھی کہ رینا اس سے شادی کرلے لیکن وہ راضی نہیں ہوئی تھی۔

''دیکھو میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔میری اپنی آزادی ہے۔ہاں لیونگ ٹوگیدر کی طرح سے میرے یہاں آکر رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو۔''

رینا کے انویٹیشن کو اس نے محسوس کیا، لیکن وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوا۔اسے اپنے خاندانی وقار کا پاس تھا۔اسے اپنے والدین یاد آگئے کہ جنہیں شافعہ کی وجہ سے بیٹے کی خوشیاں میسر نہ ہوسکی تھیں۔یہ بات اس کو ہر وقت کچوکے لگاتی رہتی تھی۔رینا کے ساتھ رہ کر اپنے والدین کو مزید تکلیف دینا اس کے ضمیر کو گوارا نہ تھا۔

زندگی کی اس سطح پر اچانک ایک دن بھونچال سا آگیا۔

اس دن رینا کچھ زیادہ ہی خوش نظر آرہی تھی۔اس نے وجہ پوچھی تو رینا بے حد جذباتی انداز میں اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

''ڈیرسٹ میں پانچ برسوں کے لئے امریکہ جارہی ہوں مجھے وہاں بہت اچھی پوزیشن مل گئی ہے۔میں اس کے لئے کافی دنوں سے کوشش کررہی تھی۔''

''کیا؟ تم امریکہ جارہی ہو؟''

وہ ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں اور کیا ایسا چانس کہاں ملتا ہے۔''

''یہاں بھی تو تمہیں اچھی خاصی تنخواہ مل رہی ہے۔وہاں جاکر کیا کروگی؟''

''دیکھو انڈیا انڈیا ہے اور امریکہ امریکہ۔امریکہ ایک خواب ہے اور یہ خواب ہر روز لاکھوں لوگ دیکھتے ہیں۔میں بھی یہ خواب بہت دنوں سے دیکھ رہی تھی۔مگر یہ اب جاکر سچ ثابت ہوا۔'' وہ خوشی سے پھولی نہیں سمارہی تھی۔اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔اسے محسوس ہوا کہ جیسے چکر سا آرہا ہو۔

''کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' رینا نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی زردی کو دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں رینا۔'' وہ اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا بولا۔

''دیکھو عامر میں تمہاری ذہنی حالت سمجھ سکتی ہوں۔کسی نہ کسی دن تو یہ سلسلہ ٹوٹنا ہی تھا، تم میرے

ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔ میں امریکہ نہ جاتی تو بھی ہمارے راستے الگ الگ تھے۔'' رینا نے اپنی بات ایسے لہجے میں کہی جیسے وہ شاندار مستقبل کا خواب دیکھ رہی ہو۔ وہ کچھ بولا نہیں بس اسے ایک لخت دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے اس کا ذہن بلینک ہو گیا ہو۔ وہ پھر بولی۔

''عامر ہم دونوں نے جو لمحے ساتھ گزارے وہ بے حد خوبصورت تھے، میں تمہیں یا ان لمحوں کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ دراصل ہم دونوں زندگی کی سچائیوں سے بھاگ کر ایک دوسرے سے بلا سوچے سمجھے آ ملے تھے۔''

وہ اپنی کرسی پر سے اٹھ کر قوس وقزح کی مانند جھکی اور اس کی نم آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

ہوا کے ایک بے حد سرد جھونکے نے اس کی سوچ کو تار تار کر دیا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بہت دیر سے اپنی موٹر بائیک سے ٹکا ہوا کھڑا ہے۔

سول لائنز تقریباً سنسان ہو چکا تھا۔ اس نے سر پر ہیلمٹ جمائی اور اپنی بائیک کو کک لگانے لگا۔ بائیک بھی سردی کے زد میں تھی۔ وہ کئی ککوں کے بعد اسٹارٹ ہوئی۔ اچانک اسے رینا شفرڈ پھر یاد آ گئی۔ ایک خاص موقع پر اس نے کہا تھا۔ ''عامر مجھ میں اور تمہاری موٹر بائیک میں ایک بڑا فرق ہے، میں تمہاری موٹر بائیک نہیں ہوں۔'' رینا کا طنز اس کے دل میں چبھ گیا تھا۔

اِس یاد نے اس کے اندر ایک عجیب سا ہیجان پیدا کر دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اچانک جیسے سردی کم ہو گئی ہو اور اس کا جسم متحرک اور گرم ہو گیا ہو۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش میں بائیک کی رفتار تیز کر دی۔ یخ بستہ ہواؤں کے جھونکوں نے اسے جلد ہی نارمل کر دیا۔ اس کا گھر اب بھی کافی دور تھا۔

اس نے سوچا کہ شافعہ تو حسب معمول اب سو چکی ہو گی اور میز پر رکھا ہوا ٹھنڈا کھانا اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔ اس خیال سے اسے بڑی کوفت محسوس ہوئی۔ اسے رینا پھر یاد آ گئی۔ رینا کے ساتھ ہی اسے وہ لمحے بھی یاد آ گئے جب وہ اس کی نظروں سے نہ جانے کب تک کے لئے اوجھل ہونے والی تھی۔ اس نے جدائی کے آخری لمحوں میں اس سے کہا تھا۔

''عامر اگر ممکن ہو تو شافعہ کے ساتھ تعلقات ٹھیک کر لینا۔ کوفت بھری زندگی گزارنے سے کیا حاصل۔ اچھا ہے کہ انسان بہتری کا کوئی راستہ نکال لے۔ یہ زندگی دوبارہ نہیں ملتی۔''

رینا شفرڈ چلی گئی لیکن اس کے آخری جملے اسے بار بار جھنجھوڑتے رہتے۔

اس نے کئی بار کوشش کی تھی کہ شافعہ کے ساتھ مفاہمت کا کوئی راستہ نکل سکے، لیکن ان کوششوں کے بعد بھی شافعہ اس کے وجود کو منتشر کرنے لگتی اور وہ پھر بدک جاتا۔

اس کے خیال نے پلٹا کھایا اور اس نے سوچا کہ کیا ساری غلطی شافعہ کی ہی ہے؟ کیا عورت مرد کی

مخالفت میں جو کچھ بولتی ہے وہ اس کا عندیہ نہیں ہوتا؟اور کیا وہ خود بالکل فرشتہ ہے؟

کہیں اندر ہی اندر اسے احساس ہوا کہ یہ سچ نہیں ہے۔اس سے بھی نہ جانے کتنی بار سہو ہوئے ہیں ،کتنی بار اس نے معمولی معمولی باتوں کو بلاوجہ بڑھایا ہے۔ہر لمحہ اپنے مرد ہونے کے احساس نے کتنی بار حالات خراب کیے ہیں۔اس کی انا ہمیشہ سبک روی سے زندگی گزارنے میں آڑے آئی ہے۔اسے معلوم تھا کہ وہ بھی قصوروار ہے مگر مرد ہونے کا کامپلکس اسے ہر لمحہ اس کی سوچ سمجھ پر اثر انداز ہوتا۔

گھر پہنچا تو دروازہ حسب معمول کھلا ہوا تھا۔اس نے بائک کھڑی کی اور دروازہ بند کر کے بیڈ روم کی طرف آہستہ آہستہ سے بڑھا تو اسے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔شافعہ آج ابھی تک جاگ رہی تھی اور اس کی نظریں ٹیلی ویژن پر جمی ہوئی تھیں۔

اس نے ٹی.وی.کی طرف نظریں گھمائیں تو دیکھا کہ ایک جوڑا ایک نہایت ہی فحش قسم کے رقص میں مصروف ہے۔اس نے بیوی پر نظر ڈالی تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ کسی طرح کی بے چینی میں مبتلا ہو۔

وہ قریب رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ کر رقص دیکھنے لگا۔

رقص ختم ہوا تو اشتہار دکھائے جانے لگے۔پہلا اشتہار کنڈوم سے متعلق تھا۔اشتہار میں دکھایا گیا تھا کہ ایک بندر کیلے پر کنڈوم چڑھا رہا ہے۔اشتہار ختم ہونے کے بعد دونوں کی نظریں ملیں تو وہ ہنس دیئے۔

وہ کرسی پر سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں آ کر کپڑے بدلنے لگا۔جب وہ ڈائننگ ٹیبل پر پہنچا تو کھانا ندارد تھا۔وہ بیڈ روم میں واپس آ کر لیٹنے لگا تو شافعہ بولی۔

''ابھی نہ لیٹیے میں کھانا گرم کر کے میز پر لگائے دیتی ہوں۔''

''رہنے دو اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔میں ٹھنڈا کھانا ہی کھا لوں گا۔مجھے اس کی عادت پڑ چکی ہے۔''

''سیکڑوں تکلیفیں اٹھائی ہیں تو ایک اور سہی۔''شافعہ کے جواب میں بھی تیکھا پن تھا۔شافعہ کی بات سن کر اس کے چہرے پر کانٹوں بھری ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔وہ بیڈ پر سے اٹھا اور ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔

اس نے گرم کھانا میز پر چن دیا اور ایک کرسی پاس کھینچ کر بیٹھ گئی۔کھانا کھاتے کھاتے وہ اچانک بولا۔''تمہیں تلنا اور بھونناخوب آتا ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔لیکن کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ تلنے یا بھوننے سے پہلے ہی گرم تیل کی اڑتی ہوئی چھینٹیں میرے ہاتھوں پر آبلے بھی ڈال دیتی ہیں۔''وہ مسکرائی۔

اس نے گلاس اٹھایا اور دو گھونٹ پانی پی کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔

''آج خلاف معمول ابھی تک کیسے جاگ رہی ہو۔''اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہر دن ایک جیسا نہیں ہوتا۔ تمام راتیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔زندگی تبدیلیوں کا نام ہے۔''وہ بڑے نارمل لہجہ میں بولی۔

دونوں کی نگاہیں ملی اور وہ غیر ارادی طور پر مسکرا دیئے۔

''آج سردی بہت ہے۔''وہ جھرجھری لیتا ہوا بولا۔

''ہاں آج واقعی سردی بہت ہے۔''وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

وہ دونوں ایک ساتھ بیڈروم میں واپس آ گئے۔

ٹی۔وی۔چل رہا تھا۔شاید وہ بھولے سے چلتا ہی چھوڑ گئی تھی۔

دونوں کی نظریں ٹی.وی. پر پڑیں۔ بندر اور کیلے والا اشتہار پھر آ رہا تھا۔دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو وہ کسی قدر جھینپ گئی۔

یہاں مفاہمت کا ایک اور موقع میسر آ گیا تھا۔

پھر وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ان کی باتوں میں بلا کی شدت تھی، باتیں بہت دنوں کی اکٹھا تھیں اور بیان کے لئے بہت تھوڑا سا وقفہ تھا۔

جیسے ہی وال کلاک نے بارہ بجائے،اس نے ٹیوب لائٹ بند کر کے نائٹ بلب روشن کر دیا۔وہ سونے کی تیاری کرنے لگے۔کچھ دیر بعد اشتہار والے بندر کی روح اس کے اندر حلول کر گئی۔

اگلی ہی شام وہ سول لائنز کی کافی شاپ میں بیٹھا،آنکھیں بند کئے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ کبھی کبھی مفاہمت غیر شعوری اور لمحاتی ہوتی ہے۔کہیں یہ اسی طرح کی مفاہمت نہ رہی ہو،شاید انسانی فطرت اس کی قصوروار ہے۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ کلر ونڈو پین کے اس پار سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے۔ادھر سے ادھر دوڑتی ہوئی کاریں،نوجوان جوڑوں کی بھیڑ،اور اس بھیڑ کے چہروں پر پھیلی ہوئی مسرت، زرق برق دوکانوں پر خریداروں کا ہجوم۔سب کچھ وہی۔خوابوں میں بھاگتی دوڑتی اور غائب ہوتی پرچھائیوں کی طرح۔

اچانک وہ چونک پڑا،اس نے دیکھا کہ باہر پھیلے ہوئے کہرے کی گھنی چادر کو چیرتی ہوئی،شافعہ آہستہ آہستہ قدموں سے کافی شاپ کی طرف چلی آ رہی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

E18/ 11J/6D Karamat ki Chauki
Prayag Raj(Allahabad)- 211016
Mob:9795126200

● ڈاکٹر صادقہ نواب سحر

تحفوں کی تھیلی

نیشنل ہائی وے ۴۸ مہاراشٹر کی بھاری بھرکم ٹریفک سے باہر نکل کر جیسے ہی کرناٹک کی سرحد میں داخل ہوئے، بارش کے موٹے موٹے چھم چھم چھینٹوں نے ہمارا سواگت کیا۔ نِپّانی کے ایک بڑے احاطے والے ریستراں کی پارکنگ کی چھت کے نیچے گاڑی رکالی گئی۔ دیکھا، تیز ہواؤں نے کیریئر پر رکھے ہوئے سامان کو ڈھانکنے والی تاڑپتری کو دو جگہوں سے پھاڑ دیا تھا۔ اتر کر دیکھا تاڑپتری اوپری حصے میں بھی پھٹ چکی تھی۔ اسے کھول کر اِنوواکار کی پچھلی سیٹ فولڈ کر کے سامان اندر رکھ لیا۔ دوبارہ اسے بہتر طریقے سے باندھ کر چائے پینے لگے تھے کہ گھر سے فون آ گیا۔

’’تمہاری بھابی کو چکر آ رہے تھے۔ قے بھی ہو رہی تھی۔ اِس وقت آئی سی یو میں ہیں۔ اینجیو گرافی کروانے کے لیے کہا گیا ہے۔‘‘ بھائی بتا رہے تھے۔

’’کیا پریشانی ہے بھائی جان! کاش صبح گیارہ بجے تک پتہ چل گیا ہوتا تو شاید ہم بنگلور کے لیے نکلتے ہی نہیں۔‘‘

’’کوئی بات نہیں۔ کام تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ یہ بھی تو ضروری ہے۔ تم لوگ بنگلور چلے جاؤ۔‘‘ بھائی نے کہا۔

’’بھائی جان، ہم کل نکاح میں شریک ہوئے ہی تھے۔ کاش ہم اتنی دور نکل نہ آتے۔‘‘

’’اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ تم لوگ چلے جاؤ۔ بس دعا کرو۔ میں خود شہر میں نہیں ہوں۔‘‘

’’ہم ممبئی سے بہت دور آ گئے ہیں۔ دعا ہی کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو گا۔ اپ ڈیٹ لیتی رہوں گی۔‘‘

ہوا یوں تھا کہ جب ایک گھنٹے تک زوردار چکر آتے رہے اور تین چار بار کی قے نے رات کے کھانے سے پیٹ کو خالی کر دیا تو بیٹا بھابی کو لے کر سیدھے علاقے کے بڑے اسپتال کے کیجوالٹی پہنچ گیا۔

’’گھنٹہ بھر پہلے پریشانی تھی۔‘‘ رہائشی ڈاکٹر بلڈ پریشر چیک کرنے لگا تو بھابی نے ڈاکٹر کو بتایا،

''اب مجھے بالکل چکرنہیں آ رہے ہیں۔اب ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' پھر ڈاکٹر نے پاس کھڑے بیٹے سے کہا،''سب او کے ہے۔آبزرویشن کے لیے ایک رات وارڈ میں رکھ لیتے ہیں۔''

بیٹے نے کاؤنٹر پر چیک کیا۔روم خالی نہیں تھے لیکن عورتوں کے جنرل وارڈ میں جگہ تھی۔اس نے پیپر بنوا لیے۔ایڈوانس رقم بھر دی۔لوٹ کر ڈاکٹر سے ملا۔

''ہم نے سینئیر ڈاکٹر کو بلا لیا ہے۔وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ لڑکے کو سینئیر ڈاکٹر کے کیبن میں لے گیا۔

''پیشینٹ کے ہسبینڈ کہاں ہیں؟''

''ڈیڈی ٹور پر ہیں۔کل آجائیں گے۔کیوں کیا بات ہے؟''

''ای سی جی میں نیچے کا پی ایچ نارمل نہیں ہے۔کل ٹو ڈی ایکو کروائیں گے۔بارڈر لائن ہائر کیوں ہے، جانچ کریں گے۔میں نے مریض کی رپورٹ دیکھی۔ہارٹ اینزائم نارمل سے تھوڑا زیادہ ہے۔ہم انہیں آئی سی یو میں رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔''

''جیسے آپ کہیں۔'' بیٹے نے دھیمی آواز میں کہا۔

''آپ آئی سی یو کی فائل بنوا لیجئے۔''

رات میں دوبارہ ای سی جی کروایا گیا۔اب بھی پی ایچ ہلکا سا بڑھا ہوا تھا۔اگلی صبح ساڑھے گیارہ بجے بھابی کو ٹو ڈی ایکو کے لیے لے جایا گیا۔شام کو سینئیر ڈاکٹر وِزٹ کے لیے آئی۔سی۔یو۔میں آیا اور لڑکے کو اپنے کیبن میں لے جا کر بولا،''چکر کا جو ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔اچانک گردن گھمانے سے بھی ہو سکتا ہے۔گرمی کا موسم ہے۔اِن دنوں میں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔مجھے تو ہارٹ کا پرابلم دکھائی نہیں دیتا۔'' لڑکے نے سکون کی سانس لی۔مسکرا دیا۔

''مگر کیا ہے کہ ٹو ڈی ایکو میں ہارٹ کا ایک حصہ اسٹرین میں موو کرتا ہے۔دراصل ٹو ڈی ایکو میں پورا پکچر کلئیر؟؟؟نہیں ہوتا۔ضرورت پڑی تو اینجیو گرافی کر لیں گے۔او کے!''

اگلے دن جس وقت بھائی دورے سے لوٹے، اینجیو گرافی سیکشن کے باہر خاندان کے کئی افراد بیٹھے نتیجے کے منتظر تھے۔

''ہارٹ تو بالکل کلئیر آیا ہے۔نو بلاکس۔''سینئیر ڈاکٹر کی کیبن میں بیٹھے ہوئے باپ بیٹے نے سکون کی سانس لی۔ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

''لیکن..شاید ایک اور ٹیسٹ کروانا ہوگا۔''

''اب ڈسچارج دے دیجیے ڈاکٹر۔'' بھائی نے نرمی سے کہا۔

''ہاں ہاں، اِس وقت آپ ڈسچارج لے لیجیے۔ انشیورنس کے پیپرس داخل کروا لیجیے۔ اگلے ہفتے مجھے ملیے۔ ویسے میں چاہتا تھا ایک دن اور آبزروکر لیتے! کہیے کیا کہتے ہیں؟''

وہ بنگلور کی ہماری پہلی صبح تھی۔ بنگلور کے مضافات میں کورامنگل کی نیشنل گیمس ولیج کے 'بلڈرس کلب پارٹی ہال' میں ولیمہ تھا۔ ہم اُسی عمارت کی پہلی منزل پر بنے کشادہ کمروں میں ٹھہرائے گئے تھے۔ صبح صبح بچے کلب کے گارڈن میں کھیلنے چلے گئے۔ دوپہر تک ان کے خوب مزے رہے۔ ہمیں بھی کچھ سکون میسر آیا۔ دوپہر میں بھائی سے فون پر بات ہوئی۔ حالانکہ ابھی کئی ٹیسٹ کئے جانے تھے پھر بھی اینجیوگرافی کا نارمل نتیجہ آنے کی خبر ملی تو ہم سب نے سکون کی سانس لی۔ اور ہم سب کچھ بھول بھال کر شادی کی تقریبوں کے مزے لینے لگے۔

''امی یہ جھمکے بہت بھاری ہیں۔'' شام کو ولیمہ کی تیاری ہورہی تھی۔

''تھوڑی دیر بعد جھمکے ہاتھ میں پکڑا مت دینا۔ ہال میں کہاں لیے لیے پھروں گی! نہ چاہو تو یہیں چھوڑ دو۔ وہی چھوٹے بوندے پہن لو، جو پہنے ہوئے تھیں۔'' میں بیٹی کی عادت سے واقف تھی۔

''زیور کے بغیر شادی میں شرکت ہوسکتی ہے۔'' میں مسکائی، ''بس تیار ہوجاؤ بیٹا۔'' تبھی فون کی گھنٹی بجی۔

''میں ملیحہ ہوں۔ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ آنے کی پوری کوشش کررہی ہوں۔ آپ اکادمی کی نیشنل کمیٹی میں ہیں۔ زبانوں کا تو یہ حال ہے کہ اپنے پیسوں سے کتابیں چھپواؤ، تحفے میں دو۔ پھر بھی لوگ پڑھتے نہیں...... میری شاعری کی کتاب ہے 'سُر خاب'۔ نیشنل اکادمی میں بھجوادی ہے۔ اگر چھپائی کے لیے مالی تعاون مل جائے تو بڑی آسانی ہوگی۔'' پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں بھی اکادمی کی نیشنل کمیٹی کی ممبر ہوں۔

ولیمے کی تقریب سیدھی سادی لیکن کافی باوقار تھی۔ شان وشوکت تازہ پھولوں اور ہلکی بتّیوں سے تھی۔ شادی میں کچھ علمی ادبی شخصیتوں سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ ہم انھیں کے درمیان ایک گول میز پر بیٹھے ادب اور سیاست پر ہلکی پھلکی گفتگو میں مشغول تھے کہ ایک لڑکی میرے قریب آئی اور بولی، ''میں ملیحہ کی بیٹی ہوں۔'' میری چھوٹی بہن کی ڈلیوری ہوئی ہے۔ امی نہیں آپائیں۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' مجھ سے بات کرتے کرتے اس نے فوراً ماں کو فون ملا لیا اور مجھ سے بات کروادی۔

''میں آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ لیکن یہاں ذرا پرابلم تھی۔ کل آپ کتنے بجے تک ہیں؟ کہاں ٹھہرے ہیں۔ میں ملنے آجاؤں گی۔''

''یہیں شادی ہال کے اوپر کے منزلے میں۔ لیکن ہمیں صبح ناشتے کے بعد نکلنا ہے۔ ناشتے کا

وقت ساڑھے آٹھ بجے کا ہے۔ مشکل ہے۔''

''میں آٹھ بجے آجاؤں گی۔''

''آپ فون کر کے آیئے گا۔''

شادی کے ہنگاموں کے درمیان کسی نے مجھے آواز دی اور میں نے خدا حافظ کہہ کر ملیحہ کی بیٹی کو فون لوٹا دیا۔

رات کافی دیر تک کمرے میں بچے ہنگامہ کرتے رہے۔ ہمارے تابع میں دو کمرے تھے۔ کبھی وہ اِس کمرے میں گھنٹی بجا کر آجاتے، کبھی اُس کمرے میں چلے جاتے۔ دیر سے سوئے۔ صبح الارم سے اٹھ کر نماز ادا کر کے دوبارہ لیٹی کہ آنکھ لگ گئی۔ صبح آٹھ بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''ملیحہ ہوں۔ ساری! شاید آپ سو رہی تھیں، جگا دیا۔'' خاتون نے کہا۔

''نہیں ٹھیک ہے ملیحہ صاحبہ! لیکن ساڑھے آٹھ بجے ناشتے کے بعد ہمیں روم چھوڑنا ہوگا۔''

''نہیں نہیں۔ آپ یہاں شام چار بجے تک رہ سکتی ہیں۔''

''آپ کو کیسے پتہ!''

''میں نیچے ریسپشن میں بیٹھی ہوں۔''

''اچھا! تو آپ آچکی ہیں!!''

''جی'' میں حیرت میں تھی۔ کچھ لمحے خاموشی سے گزر گئے۔

''آپ مجھے پانچ منٹ کا وقت دیجئے، میں نیچے رِسپشن میں آتی ہوں۔'' میں نے بادلِ ناخواستہ کہا اور بستر سے نکل گئی۔

دس منٹ بعد جب میں کپڑے تبدیل کر کے نیچے رسپشن میں اتری، میرے سامنے ایک فربہ مائل جسم، معمولی نین نقش والی، کم قد کی خاتون کھڑی تھیں۔ نیوی بلیو کرتے اور سفید شلوار دوپٹے میں اسے دیکھ کر ایک خیال ذہن سے گزر گیا، 'نوجوانی میں ضرور پرکشش رہی ہوگی۔ اب بھی باوقار ہے۔' وہ بڑے تپاک سے مجھ سے ملیں۔ صوفے پر بیٹھتے ہی مجھے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ، مٹھائی کا ایک چھوٹا سا ڈبہ اور ایک ساڑی تحفتاً پیش کر دی۔

''آپ کو بھی جلدی ہے۔ میں چلتی ہوں۔'' اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

تبھی ویٹر ناشتے کی پلیٹیں لے کر کینٹین سے نکلے اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

''لیجئے، ابھی آٹھ بج کر بیس منٹ ہی ہوئے ہیں، ناشتہ شروع بھی ہو گیا۔'' میں نے کہا، ''آپ

ناشتہ کریں گی؟''

''مجھے خوشی ہوگی اگر آپ میرے گھر آئیں۔''ملیحہ نے کہا'' چار بجے تک تو وقت ہے آپ کے پاس!''

''نہیں نہیں! سترہ سے رمضان شروع ہوگا۔ آج تیرہ ہے۔ بس آج اور کل دو ہی دن تو ہیں ہمارے پاس۔ پندرہ کو تو گھر کے لیے نکلنا ہی ہوگا۔ میسور سے ممبئی اٹھارہ گھنٹوں کا سفر ہے۔ بچوں کو کم سے کم میسور دکھایا جائے۔ ورنہ ہنگامہ کریں گے۔ ہم کسی رشتہ دار کے گھر بھی نہیں جائیں گے۔''میں اس کے ساتھ کھڑی تھی۔

''کچھ دیر بیٹھئے۔''میں نے ملیحہ سے کہا۔ تحفے قبول کرنے کے بعد فوراً خدا حافظ کہنا مجھے ٹھیک نہیں لگا۔ اس نے تحفے کی مٹھائی، کتابیں اور ساڑی ایک خوبصورت سی کیری بیگ میں ڈال کر بیگ کو تپائی پر پڑے کنڑ اخبار پر رکھ دیا۔

''آپ کا ناشتہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔ اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔''ہم صوفے پر بیٹھ گئے۔

''میں ڈگری کالج میں پرنسپل کے عہدے سے تین سال ہوئے ریٹائر ہوئی ہوں۔ دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔ بیٹا ائیر فورس میں ہے۔''

''اور آپ کے شوہر؟''

''وہ جنرل میڈیسن میں ایم ڈی فزیشین ہیں۔ تیس سال گورنمنٹ سروس میں کام کرتے ہوئے سِول سرجن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ کولار گولڈ فیلڈ میں تھے۔''

''اچھا!''

''''ڈاکٹر صاحب کو ریٹائر ہو کر گھر بیٹھنا پسند نہیں تھا۔ ڈیوٹی پر تھے تو ہر تین سال پر کرناٹک کے مختلف علاقوں میں تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ اب یہیں بنگلور میں ایک بڑے نامی اسپتال 'سووی نئیر' میں سروس مل گئی۔''

''اچھی بات ہے نا! زندگی بھر جد و جہد رہی ہوگی!''

''ہاں، بہت۔ وہ ہفتے میں ایک بار گھر آتے تھے اور میں چھٹیوں میں ان کے علاقے میں جاتی اور وہ گھر بھی سنبھالتی۔''

''اور اب ساتھ ساتھ...!...سکون؟''میں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں ساتھ رہنے کے الگ مسائل!''وہ بھی مسکرا دی۔

''اچھا!! وہ کیا!!''

''جی.... پھر کبھی بتاؤں گی۔''، وہ مسکرائی اور بات گول کر گئی،''آپ میسور جا رہے ہیں نا! کل میری جس بیٹی سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی، وہ بایولوجی میں پی ایچ ڈی کر رہی ہے۔ وہ میسور اور اُوٹی کے قریب گُنڈل پیٹھ میں رہتی ہے۔ آپ میسور سے پندرہ کلومیٹر پہلے سری رنگ پٹّنا کا ٹیپو سلطان کا محل ضرور دیکھئے۔ آج ہماری یہ بیٹی بھی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ وہیں گھومنے گئی ہے۔''

''ہم آج دیر شام میسور پہنچ پائیں گے۔ ٹیپو سلطان کا محل تو بند ہو چکا ہوگا۔ آج تو بس برندابن گارڈن میں روشنی اور آوازوں کا فواروں کا شو دیکھ پائیں گے۔ کل راجہ وڈیار کا 'اَمبا وِلاس محل' اور زُو... اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو پائے گا۔''

''چڑیا گھر تو دیکھنے کے لائق ہے۔ صحتمند، خوبصورت پرندے، جانور... آج کل ان کے گود لینے کا رجحان زوروں پر جو ہے۔ ضرور دیکھئے گا۔'' ملیحہ کی آنکھوں میں اپنے علاقے کے شاندار قابلِ دید جگہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے چمک آ گئی تھی۔

''جی ضرور... پرسوں سویرے ہوٹل چھوڑنا ہی ہوگا۔ رمضان سے ایک روز پہلے پہنچ جائیں تو آرام ملے گا۔ ورنہ مارے تھکن کے پہلا روزہ بھاری پڑے گا۔ اگلے دن کی سحری کی تیاری بھی تو کرنی ہوگی۔''

''ملیحہ صاحبہ، ہماری ایک دوست کو لبلبے کی تکلیف ہے۔''، اچانک مجھے اپنی سہیلی یاد آ گئی،''حال ہی میں ان کا ٹرانسفر بنگلور ہوا ہے۔ یہاں علاج چل رہا ہے۔ میں نے انھیں رائے دے دوں کہ 'سوَوی نئیر اسپتال' چلی جائیں؟ ڈاکٹر صاحب صحیح رہنمائی کر سکیں گے؟''

''نہیں۔'' ملیحہ کی 'نہیں' نے ایک اداس خاموش فضا کو جنم دیا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''دراصل پرسوں اسپتال کے ڈائریکٹر نے انھیں بلا کر پوچھا تھا،'' لگتا ہے آپ کو اس جاب میں کوئی دلچسپی نہیں۔''

''کیوں! کسی مریض نے شکایت کی!'' میرے شوہر کو تعجب ہوا تھا۔

''نہیں۔''

''پھر آپ کو کس بات سے لگا کہ مجھے دلچسپی نہیں ہے؟''

''آپ نے شاید دھیان سے نہیں پڑھا تھا۔ کانٹریکٹ لیٹر میں سیلیری ڈیڑھ لاکھ ہے۔''

''جانتا ہوں۔''

''لیکن آپ زبانی کانٹریکٹ کو بھول گئے!! آپ سے ایچ.آر. والوں نے کہا تو تھا، اسپتال کا ساڑھے تین چار لاکھ روپئے مہینے کا فائدہ کروانا ہوگا۔ لیکن آپ تو کسی مریض کو کسی بڑے ٹیسٹ کے لئے

بھیجتے ہی نہیں!''

''کسی کو ضرورت ہی نہیں پڑی۔ آسان سے کیس تھے۔ کچھ الجھے ہوئے بھی تھے۔ لیکن سلجھ گئے۔ بڑے ٹیسٹوں کی بالکل ضرورت ہی نہیں تھی۔''

''آپ جانتے ہی ہیں، کارپوریٹ اسپتالوں کا خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ اسپتال کی عمارت کا maintenance، زیادہ سہولتیں، آپ لوگوں کی بہت اچھی تنخواہ۔'' ایچ آر۔ والے نے بات جاری رکھی، ''سی سیکشن اب عام ہو گیا ہے۔ ہمارے اسپتال میں نارمل ڈیلیوری کو پچاس ہزار لگتے ہیں اور سی سیکشن کے ڈیڑھ لاکھ۔ کل جو ڈیلیوری نارمل ہوئی تھی، آپ کو آپریشن ضروری بتانا ضروری لگنا چاہئے تھا نا!''

''شاید دو نمبر والوں کو پیسہ خرچ کرنے میں مشکل نہ ہوتی ہو۔ بیچارا مڈل کلاس اور لوور مڈل کلاس آدمی کیا کرے گا!'' میرے شوہر نے سوال کیا۔

''سرکاری اسپتال جائے۔''

''مجھے ذرا جلدی ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈاکٹر اپنی جگہ بیٹھے سوچتے رہے۔

''جو گزر گیا سو گزر گیا...کوئی بات نہیں....آئندہ دھیان رکھیے۔ ٹرسٹیوں کے ساتھ میٹنگ ہے۔ میں آپ کے فیور میں بات کروں گا۔''

''...لیکن ہم جیسے نوکری پیشہ لوگوں کو کتنا مشکل ہے! میری اپنی بیٹی کی ڈیلیوری ہے، میں کیا کروں گا!'' ڈاکٹر نے گھر پہنچ کر مجھ سے کہا، ''سرکاری اسپتال لے جائیں بیٹی کو؟''

''سرکاری؟'' مجھے تعجب ہوا۔

''ہاں سرکاری اسپتال بہتر ہیں۔ وہاں صحیح بیماری کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس طرح کی دھاندلی تو بالکل نہیں ہوتی۔''

''لیکن وہاں لمبی قطاریں ہوتی ہیں۔ بہت وقت لگتا ہے۔'' میں ان کی بات سے مایوس تھی۔

''وہاں مریض تھوڑی بے ایمانی کر لیتا ہے۔ واچ مین اور چپراسی کو سو پچاس روپئے تھما دئے۔ وہی اسے لیے لیے پھرتا ہے۔ تھوڑا مصلحت سے کام تو لینا ہی پڑتا ہے نا!''

ملیحہ کی باتیں سن کر میری آنکھوں میں بھابی کا چہرا آ گیا، 'کن پریشانیوں میں الجھ گئیں بیچاری!!'

''آپ نے اپنے شوہر کے 'سووی نیئر اسپتال' جوائن کرنے کی بات کی تھی۔ مجھے لگا تھا کہ آپ کے شوہر وہیں ہیں۔ اسی لیے سہیلی کا خیال آیا تھا۔'' میں نے معذرت چاہ لی۔

''انہوں نے پندرہ دنوں کی تنخواہ بھی نہیں لی۔'' ملیحہ نے گہری سانس لی۔ مجھے اس کے چہرے پر اطمینان اور فخر کے احساس ملے جلے سے نظر آئے۔ مجھے غور سے خود کو دیکھتے ہوئے دیکھ کر ملیحہ ہنس دی۔ اس کے دانتوں کی پانتیں چمک گئیں۔

اس نے گھڑی دیکھی، مسکراتے ہوئے تپائی پر رکھی تحفوں کی تھیلی میرے ہاتھوں میں دھیرے سے رکھ دی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ کو دیر ہو رہی ہوگی۔ میرے شوہر بھی گیٹ کے باہر منتظر ہیں۔ خدا حافظ''

وہ دو قدم آگے بڑھ گئی۔ پھر پلٹ کر بولی،

باجی! اگر نیشنل کمیٹی ڈیڑھ سو کتابیں خرید لے تو اچھا رہے گا۔''

میری نظر ملیحہ کے ملیح رنگ چہرے پر ٹنگی ہلکے سے مسکراتی آنکھوں سے اوپر اٹھ کر تحفوں کی تھیلی پر ٹھہر گئی۔ میں نے نظر اٹھا کر ایک بار اور اس کی طرف دیکھا۔ مجھے عجیب طرح سے دیکھتے دیکھ کر اس کے دانتوں کی پانتیں دوبارہ چمک اٹھی تھیں۔

◀◀ ● ▶▶

301, Sadiqua Mansion,
Shastri Nagar, Khopoli,
Dist.Raigad, Maharashtra,
mob:9370821955
Email: sadiquanawabsaher@hotmail.com

شفیع مشہدی کے افسانے

(تعارف وانتخاب)

مصنف	:	شفیع مشہدی	مرتب	:	ہمایوں اشرف
سن اشاعت	:	۲۰۲۲ء	قیمت	:	۳۵۰ روپے
تعداد اشاعت	:	۵۰۰	صفحات	:	۲۷۶

ملنے کا پتہ

بک امپوریم، اردو بازار سبزی باغ، پٹنہ۔۴

● کنول بھزاد

راجدھانی

چودھری کرم داد کی اچانک وفات کے بعد پگ اس کے بیٹے چودھری امداد علی کے سر پہ آ گئی تو وہ بیٹھے بٹھائے بلا شرکت غیرے تمام تر جائیداد کا مالک بن گیا کہ اکلوتا جو تھا۔ یا تو یہ تھا کہ بڑے چودھری کی مرضی کے بغیر ایک چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔

چھوٹے چودھری کو باپ کے جانے کا غم کیا ہوتا الٹا اسے محسوس ہوا جوانی اور بے فکری کے دن لوٹ آئے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ شکار پر نکل جانا، تاش کی بازیاں اور محفلیں پھر سے شروع ہو گئیں۔ آٹھ سالہ شادی شدہ زندگی میں بیوی پروین کی طرف نہ پہلے توجہ کی تھی نہ ہی اب کوئی پرواتھی۔ البتہ باپ کی موجودگی میں وہ دکھاوا ضرور کرلیا کرتا تھا کیونکہ چودھری امداد علی کی بیوی پروین کرم داد کی سگی بھانجی تھی۔ پروین اس کی بے اعتنائیوں کی عادی ہو چکی تھی سارا دن حویلی کے کاموں میں جتی رہتی اور صفائی کا تو اسے خبط تھا......چمکتی دمکتی حویلی میں بس اس کا ایک دل ہی تھا...... جو بجھا رہتا تھا۔

چودھری کی محبت اور قربت اسے پہلے بھی میسر نہ تھی اب تو یہ حال تھا کہ وہ شکار کے لیے نکلتا تو کئی دن گھر نہ آتا۔ اس بار بھی گئے ہوئے ساتواں روز تھا کہ اچانک اس کی آمد کا غوغا اٹھا۔ پروین بھی استقبال کے لئے کمرے سے باہر آ گئی۔ مگر چودھری کے ہمراہ زرق برق لباس میں ملبوس ایک طرحدار عورت کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ چودھری نے ایک نگاہ غلط انداز بھی اس پر نہ ڈالی اور نئی نویلی بیوی کو ہمراہ لیے اپنی اور پروین کے مشترکہ خواب گاہ میں چلا گیا۔ پروین کھڑی کی کھڑی رہ گئی، کرتی بھی کیا کہ خواب گاہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

شام کے کھانے پر چودھری اسی عورت کے ہمراہ خوابگاہ سے برآمد ہوا اور کھانے کی میز پر جلوہ افروز ہو گیا۔ پروین کو آس پاس نہ پا کر خادمہ کے ذریعے بلا بھیجا۔ جب وہ آئی تو یوں گویا ہوا۔

''یہ تاجور ہے......میری بیوی......اس کا خیال رکھنا......اس کی عزت میں کوئی کمی نہ آئے...... خادماؤں کو بھی سمجھا دو کہ کس طرح پیش آنا ہے۔''

پروین نے تاجور کو نظر بھر کر دیکھا...... بلاشبہ اس کے ترکش میں وہ سارے تیر تھے جو کسی بھی مرد کو گھائل کر سکتے تھے۔ اگلے چند ہی دنوں میں تاجور ساری حویلی پر چھا گئی۔ اس نے امداد علی سے فرمائش

کر کے حویلی کو نئے فرنیچر، بیش قیمت قالینوں اور دیگر سامان سے آراستہ کیا......اور ساری حویلی میں اٹھلاتی پھری...... پروین جیسے اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کر رہ گئی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی اب مین میخ نکالی جانے لگی۔ گرہستی کے وہ کام جو اسے خوشی بھی دیتے تھے اور مصروف بھی رکھتے تھے۔ حویلی کے دیگر امور سے بھی پروین کو بے دخل کر دیا گیا۔ اب تو کھانا بھی تاجور کی پسند سے بننے لگا تھا۔ گرمیاں آئیں تو چودھری تاجور کو لے کر شمالی علاقہ جات کی سیر کو نکل گیا۔

امداد علی کو یوں لگتا تھا جیسے تاجور کی صورت میں اسے ہفت اقلیم مل گئی ہو۔ زندگی گویا اب بہاروں کا مسکن تھی۔ تاجور حسین تھی اور اسے عشوے غمزے بھی خوب آتے تھے۔ جو پہنتی اس پر سج جاتا، زیورات اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتے، ہر وقت خوشبو میں بسی رہتی۔ آٹھ سالوں میں چودھری کا جی پروین سے مکدر ہو چکا تھا۔ سانولی سی فربہی مائل پروین تو جیسے اس کے نزدیک عورت ہی نہ تھی۔ بس اللہ میاں کی گائے۔ نسوانیت سے عاری، ٹھس سی عورت۔ نہ پہننے کا سلیقہ تھا نہ ہی اوڑھنے کا ڈھنگ۔ اور اب تاجور کو پا کر وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا۔

دن جیسے پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ چودھری کو نہ حویلی یاد تھی نہ سنگی ساتھی نہ ہی زمینداری کی الجھنیں۔ بس وہ تھا اور تاجور تھی۔ چودھری اور تاجور کی غیر موجودگی میں پروین پھر فعال ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن حویلی کے کاموں میں مصروف رہتی۔ زمینوں کے حوالے سے اسے تشویش رہتی مگر باہر کے سارے کام دلاور ہی سنبھالتا تھا۔ وہ چودھری کا معاون خاص تھا۔ کسی بھی کام کے سلسلے میں حویلی کے اندر آنے کی اجازت بھی بس اسے ہی میسر تھی۔

پروین کو اس صورتحال میں بے اولاد ہونے کا غم اور بھی ستانے لگا تھا۔ اولاد ہوتی تو وہ یوں اتنی بڑی حویلی میں بولائی بولائی نہ پھرتی۔ چودھری کے بقول وہ بانجھ تھی اور محض اس کی وجہ سے حویلی حقیقی خوشیوں سے محروم ہو چکی تھی۔

پروین کو یقین تھا کہ تاجور جلد ہی حویلی کا وارث پیدا کرے گی۔ اس کے بعد اس کی کیا حیثیت ہوگی اس کے بارے میں وہ سوچتی تو ہول جاتی۔ تقریباً مہینے بعد تاجور چودھری کے ہمراہ حویلی لوٹ آئی تو خوشی جیسے اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ خریداری کے ڈھیر سارے رنگ برنگے تھیلے اس کے ہمراہ تھے۔ خادمائیں اس کی آؤ بھگت کے لئے بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔

پروین گومگو میں تھی کہ باہر جائے یا نہ جائے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ تاجور اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ پروین اسے یوں اچانک سامنے پا کر اضطراری کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

تاجور نے پوچھا ''کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہوں میں......'' پروین بولی۔

''یہ دوجوڑے کپڑے ہیں آپ کے لئے آخر آپ کا بھی حق ہے۔'' تاجور نے بڑے انداز سے کہا۔

''دوجوڑے کپڑے......؟'' پروین نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔اس کی آنکھیں تاجور کے چہرے پہ گڑی تھیں۔تاجور دل ہی دل میں بل کھا کر رہ گئی۔

''کمبخت اتنی بھی سیدھی نہیں جتنی نظر آتی ہے۔'' وہ زیرلب بڑبڑائی۔

''لگتا ہے آپ کو خاصا رنج ہے کہ میں نے آپ کی جگہ لے لی؟'' تاجور باز نہ آئی۔

''نہیں تم جہاں ہو وہ میری جگہ کبھی تھی ہی نہیں......نہ مجھے اس کی تمنا ہے۔'' پروین قطعیت سے بولی تو تاجور لاجواب ہوکر مڑی اور کہا۔

''بہت تھک گئی ہوں اتنا زیادہ گھوم پھر کے اب ذرا آرام کروں گی۔'' پروین رات کے کھانے پر بھی ان دونوں کے ساتھ شامل نہ ہوئی۔ چودھری کو یوں ہی موہوم سا خیال آیا۔ پھر دل ہی دل میں سوچا ''خس کم جہاں پاک'' اور تاجور کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''یہ پہلا نوالہ میرے ہاتھ سے۔'' تاجور اس سے بولی تو چودھری نہال ہوگیا۔ رشیداں نے چودھری اور تاجور کے مخول دیکھے تو کانوں کو ہاتھ لگایا۔خادماؤں میں بس بوڑھی رشیداں تھی جس کو پروین کا غم کھائے جاتا تھا۔وہ جہیز میں پروین کے ساتھ آئی تھی اور پروین کی ساری مجبوریاں سمجھتی تھی۔ماں باپ کے گزر جانے کے بعد پروین کی شادی شدہ بھائیوں کے گھر میں کوئی جگہ نہ تھی۔دونوں بھائیوں کی من چاہی بیویاں ہی گھروں میں راج کرتی تھیں۔ پروین اسے بیٹیوں کی طرح عزیز تھی۔ بے چاری میری مالکن کتنی اکیلی ہوگئی ہے۔ظالم چودھری اسے پوچھتا تک نہیں۔اس ڈائن نے حویلی میں آکر ہر چیز پر امداد علی سمیت قبضہ کرلیا ہے۔وہ پروین کی دلجوئی میں لگی رہتی۔مگر پروین جیسے سب کچھ تیاگ چکی تھی۔رشیداں کے بس میں صرف دعائیں اور بددعائیں دینا ہی تھا اور یہ کام وہ بخوبی سرانجام دیتی تھی۔وہ ہمیشہ دعا مانگا کرتی تھی کہ تاجور بھی بانجھ نکلے،اس کی بھی کبھی اولاد نہ ہو۔

اب جانے رشیداں کی بددعائیں تھیں کہ اللہ کی کوئی مصلحت۔سالوں بیت گئے تاجور بھی اولاد سے محروم ہی رہی۔ چودھری میں بھی آپ پہلے سا دم خم نہیں رہا تھا۔اب بھی من چاہی بیوی کے سنگھاسن پر تاجور ہی براجمان تھی مگر وہ پہلے سا جنون نہ تھا۔

وہ بہانے بہانے سے باہر زیادہ وقت گزارنے لگا تھا۔ایک دن تو غضب ہوگیا، چودھری گھر آیا

تو اس کے ہمراہ ایک کم عمر معصوم سی لڑکی تھی۔ جس نے سرخ عروسی لباس پہن رکھا تھا اور بے حد گھبرائی اور سہمی سہمی نظر آتی تھی۔ تاجور کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ مگر بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر آگے بڑھی اور چودھری سے بولی۔

''سائیں مجھے تو خبر کی ہوتی میں آپ کے ہمراہ چلتی، بارات اور باجے گاجے لے کر اور آپ کی دلہن شایان شان طریقے سے بیاہ کر لاتی۔ یوں چپ چپتے نکاح کیوں کرلیا؟''

چودھری کوئی جواب دیے بغیر اپنی اور تاجور کی مشترکہ خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ تاجور اس کے پیچھے پیچھے لپکی اور چودھری سے کہنے لگی۔

''یہ خواب گاہ اس نئی نویلی دلہن کے قابل کہاں۔ میں آپ کی دلہن کے لیے نیا کمرہ آراستہ کرتی ہوں۔ لگے تو سہی کہ عروسی کمرہ ہے۔'' چودھری نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا اور چپکا بیٹھا رہا۔ یہ کہہ کر تاجور باہر نکل گئی۔ اس نے خادماؤں سے کہا کہ چودھری اور اس کی دلہن کی خوب خاطر مدارت کی جائے۔ خود کمرے کی آرائش میں لگ گئی۔ جب کمرہ ایک عروسی کمرے کی طرح خوب سج سنور گیا تو وہ چودھری کے پاس جا کر بولی۔

''آپ ابھی یہیں بیٹھیں میں دلہن کو لے کر کمرے میں جاتی ہوں۔ وہاں جا کر وہ گم ہی ہوگئی۔'' کافی دیر چودھری امداد انتظار میں بیٹھا رہا پھر اسے اونگھ آ گئی اور وہ وہیں سو گیا۔ نئی دلہن بھی کچھ دیر بعد بے سدھ ہو کر سو گئی۔ تاجور کتنی ہی دیر اس کے معصوم چہرے کو تکتی رہی اور پھر ایک خادمہ کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر باہر نکل گئی۔

پروین بھی یہ سب دیکھ کر حیران پریشان تھی۔ اسے بھی معصوم لڑکی سے ہمدردی تھی۔ چودھری کی بے غیرتی پر اسے بھی غصہ آیا جو جانے کس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر بیٹی کی عمر کی لڑکی بیاہ لایا تھا۔

اچنبھے کی بات یہ تھی کہ چودھری اگلے کئی دن بھی تاجور کے کمرے میں مقیم رہا۔ جانے تاجور نے اس کے کان میں کیا پڑھ کر پھونکا تھا کہ وہ نئی دلہن سے لاتعلق سا نظر آتا تھا۔

البتہ تاجور اس کا خوب خیال رکھتی۔ اسے معلوم ہوا کہ دو بیگھے زمین چھڑانے کے چکر میں باپ نے اس کم عمر لڑکی کو چودھری کے نکاح میں دے دیا تھا۔ تاجور کو یاد آیا کہ مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا چودھری کو خوب آتا تھا۔ چند ماہ کی بیوہ تاجور کے بھائی بھی مجبور ہی تھے۔ چودھری کے پاس رکھی گروی زمین کے بدلے تاجور کا نکاح چودھری سے ہوا تھا۔ مگر غربت اور بھابھیوں کی ستائی تاجور خوش تھی کہ ایک مالدار آدمی کی بیوی بن رہی تھی۔ پھر چودھری ان دنوں جوان بھی تھا اور قبول صورت بھی۔

تاجور اپنی راجدھانی میں خوش تھی اور کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تھا۔ مگر اب وہ چوکنی ہوگئی تھی اسے اپنی راجدھانی بچانی تھی کسی بھی قیمت پر۔ پروین کی طرح ہتھیار ڈال کر بیٹھ جانا اس کی سرشت میں نہ تھا۔

لڑکی جس کا نام فیروزہ تھا اب بھی سہمی سہمی سی نظر آتی تھی۔ایک روز تاجور کو اس پر بہت ترس اور پیار آیا۔وہ پہروں اسے تسلی دیتی رہی کہ فیروزہ یہاں بالکل محفوظ ہے اور چودھری اس سے دور رہے گا۔جب چودھری زمینوں پہ چلا جاتا تو تاجور پہروں اس سے باتیں کرتی۔بوڑھی رشیداں نے ایک روز پروین سے کہا وہ تو ایسے فیروزہ کے ناز اٹھاتی ہے جیسے وہ اس کی بیٹی یا بہو ہو سوکن نہیں۔ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

چودھری کی صحت روز بروز گرنے لگی تھی۔دلاور کی ہمراہی میں کئی طبیب آئے مگر چودھری کی طبیعت نہ سنبھل سکی۔وہ جیسے بستر کا ہی ہو کے رہ گیا تھا۔

انہی دنوں حویلی میں ایک صبح غوغا اٹھا کہ فیروزہ رات کے اندھیرے میں کہیں بھاگ گئی ہے۔ساری حویلی سناٹے میں آ گئی۔مگر کیا ہو سکتا تھا۔دلاور نے جگہ جگہ اپنے آدمی دوڑائے مگر وہ اپنے باپ کے پاس نہیں گئی تھی نہ ہی کسی رشتے دار کے پاس۔معلوم نہیں اسے آسمان کھا گیا تھا کہ زمین نگل گئی تھی۔آہستہ آہستہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ویسے بھی اس وقت چودھری کی صحت یابی پہلی ترجیح تھی۔سو سب کی توجہ اس پہ مرکوز تھی۔

پروین نہ چاہتے ہوئے تاجور کے قریب آ گئی تھی۔اسے چودھری کی فکر تھی آخر تو اس کے سر کا سائیں تھا۔اکثر راتوں کو بھی وہی جاگتی جبکہ تاجور دوسرے کمرے میں لمبی تان کر سو جاتی۔

وہ اماوس کی رات تھی۔حویلی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔دور حویلی کے بڑے دروازے کے پاس دو سائے ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر موجود تھے۔

''لڑکی محفوظ ہے نا دلاور؟'' یہ تاجور کی آواز تھی۔

''اس کا بہت دھیان رکھنا......بڑی معصوم اور بھولی سی ہے......سمجھو قدرت کا انعام ہے تمہارے لیے۔'' پھر اس نے ایک بڑی سی پوٹلی اور ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

''میں نے چودھری سے فیروزہ کے طلاق نامے پر دستخط کرا لیے تھے۔تم اس سے نکاح کر لینا اور یہاں سے کہیں بہت دور چلے جانا۔جہاں چودھری تم دونوں کی گرد بھی نہ پا سکے۔پوٹلی میں اچھی خاصی رقم اور زیور ہے۔کام آئیں گے تم دونوں کے۔میری فکر مت کرنا۔میں جلد اس حویلی کے وارث کو جنم دوں گی۔'' دلاور یہ سن کر مضطرب سا ہو گیا۔مگر چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہا۔

''جاؤ......رب راکھا'' یہ کہہ کر تاجور مڑی اور تیز تیز قدموں سے اپنی خوابگاہ کی طرف چل دی۔چودھری اب روبہ صحت تھا کہ دلاور کی لائی ہوئی دوائیاں ختم ہو چلی تھیں۔

◀◀ ● ▶▶

735 Raza block street 8
Allama Iqbal town Lahore Cell - 0307 4912849

● کوثر جمال

سرنگ کی دوسری طرف

ویران سڑک تھی اور دن کا وہ پہر جب تاریکی اجالے کو آسانی سے پچھاڑ لیتی ہے۔نومبر کی خزاں رسیدہ شام کو تیزی سے بڑھتے اندھیرے نے دبوچ لیا تھا۔اور آج اس نے غلطی یہ کی تھی کہ کوئی ٹیکسی لینے کی بجائے ٹیوشن سینٹر سے پیدل ہی گھر کی طرف چل دی تھی۔ٹیوشن سینٹر جہاں وہ ملازم تھی وہاں سے اس کے گھر تک کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا البتہ یہ راستہ غیر معمولی طور پر سنسان تھا۔اسے کبھی کبھار اس پرسکون راستے پر پیدل چلنا اچھا لگتا تھا کہ یہ انسانی ہجوم کی یلغار سے قدرے محفوظ اور فطرت کے حسن سے بھرپور راستہ تھا۔سڑک کی دونوں اطراف کے بیشتر درخت اپنی پرانی پوشاکیں اب اتار چکے تھے۔تاہم کچھ سدا بہار درخت ایسے بھی تھے جہاں اب بھی پنچھیوں کے آشیانے محفوظ تھے۔عام طور پر اس کی ایک کولیگ اس کے ہم راہ ہوتی تھی،وہ دونوں باتیں کرتے ہوئی چلتیں تو راستہ آسانی سے کٹ جایا کرتا تھا۔

لیکن آج وہ اکیلی تھی۔

ابھی وہ کچھ ہی دور گئی ہوگی کہ ایک کار اس کے بالکل قریب آ کر رکی،یوں جیسے اس کا راستہ کاٹ رہی ہو۔پھر جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوا۔اسے عقب سے کسی نے اپنے مضبوط بازووں کی گرفت میں بے بس کیا تھا۔اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔شاید اسے بے ہوش کیا گیا تھا۔بعد میں بے پناہ اذیت اور بے توقیری کی شدت جب اسے ہوش کی دنیا میں واپس لائی تو اس نے بے طرح چاہا کہ کاش وہ کبھی ہوش میں نہ آتی۔جو کچھ ہوا وہ دوسروں کے لیے ایک افسوسناک خبر تھی،اس کے خاندان کے لیے ایک ایسا اندوہناک حادثہ تھا جس میں ان کی عزت کی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا تھا کہ وہ اس خبر کو چھپا کر روائتی انداز سے اپنے خول میں چھپنے اور اپنے بھاگوں اپنی توقیر بچانے کے قابل بھی نہیں رہے تھے، جیسا کہ اس سماج کے متوسط طبقے میں ایسے واقعات کی ''پردہ پوشی'' کا عام رواج تھا......لیکن یہ سب کچھ خود اس کے لیے اذیت کا ایسا دورانیہ تھا کہ وہ نہ تو اس کی مدت کا تعین کر سکتی تھی اور نہ ہی اس کی شدت کا۔

جو حادثہ تھا وہ ہو چکا تھا۔اس کا جسم اور روح دونوں ہی زخموں سے چور چور تھے۔بہت گھاؤ اور چوٹیں آئی تھیں کیونکہ اس نے آسانی سے خود کو پامال ہونے نہیں دیا تھا۔وہ پوری طاقت سے دو مردوں کی

وحشت و بربریت کا مقابلہ کرتی رہی تھی۔ یہ گھاؤ کچھ ظاہر تھے، کچھ پوشیدہ۔ اب ان ضربوں اور زخموں کے علاج کی ضرورت تھی۔ انسان نے بہت محنت سے اپنے اور دوسروں کے جسموں پر لگے زخموں کے علاج دریافت کیے ہیں۔ گھاؤ مندمل ہو جاتے ہیں لیکن ان کے نشان رہ جاتے ہیں۔ چوٹوں کا درد آہستہ آہستہ کم ہو جاتا ہے اور پھر کبھی کبھار سرد موسموں میں جاگتا ہے۔ کچھ حادثے ایسے بھی ہوتے ہیں جو انسان سے ہمیشہ کے لیے کچھ نہ کچھ چھین لیتے ہیں، جیسے کوئی عضو یا کوئی حس، انسان کو مجبوراً ان محرومیوں کے ساتھ جینے کا ہنر سیکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ ان سب نقصانات کے باوجود اس میں فطری طور پر زندہ رہنے کی خواہش اور جہد کی طاقت موجود رہتی ہے۔ لیکن...... اُس کے ساتھ گزرا حادثہ ان سب سے مختلف تھا۔ اس خوفناک رات کو گزرے کچھ ہفتے بیت چکے تھے۔ وہ اب صدمے کے اثرات سے آہستہ آہستہ باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جسم بحال ہو چکا تھا۔ پھر بھی کچھ ایسا تھا جو اپنی جگہ جوں کا توں موجود تھا۔ اس اذیت ناک رات کی دہشت نے اس کے احساسات و خیالات ابھی تک اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ رکھے تھے۔ وہ جب تنہا ہوتی تو اسے اپنی ہی چیخیں سنائی دیتیں۔ وہ اپنے آپ سے باہر نکل کر اپنے کچلے جانے کا منظر دیکھتی تو جسم کا تمام پانی جلد کے مساموں سے بہہ نکلتا۔ ایک ست رنگی کیفیت کا بھیانک آکٹوپس تھا جس کی گرفت سے آزاد ہونے میں اس کی ساری طاقت صرف ہو جاتی۔ وہ دیر تک غسل کرتی رہتی لیکن یہ کیسی گندگی تھی جو کسی طرح صاف نہیں ہو پا رہی تھی۔ یہ کیسا داغ تھا جو اس کے اجلے لباس پر بھی دیکھنے والے دیکھ سکتے تھے، اور دیکھتے رہیں گے، شاید ہمیشہ، عمر بھر۔ یہ سوچ کر اسے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ مایوسی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی۔ ماہرِ نفسیات نے کہا تھا کہ اس کریہہ تجربے کے ذہنی اثرات سے نکلنے میں اسے کچھ زیادہ وقت لگے گا۔ کیونکہ حادثہ جتنا اذیت ناک تھا اتنی ہی وہ طبعاً حساس بھی تھی۔

اذیت کے اس سفر میں ایک اضافی بات ایسی تھی جو اس کے ساتھ ہو چکی زیادتی کی شدت کو کئی گنا بڑھا رہی تھی۔ اس کی زندگی کے بہی کھاتے میں ایک ایسا نقصان لکھ دیا گیا تھا جو بے پناہ اور دائمی تھا۔ ایسا عظیم خسارا جو اس کی پوری زندگی کو گرہن زدہ کر چکا تھا اور جس کا کوئی ازالہ نہیں تھا، اسی طرح جیسے اس کے معاشرے میں اس جیسی لڑکیوں کے ساتھ صدیوں سے ہوتا آیا تھا۔ اس کے آس پاس کی زندگی میں، اپنوں اور پرائیوں کی سرگوشیاں اور بولتی نگاہیں انگنت سانپوں کی طرح اسے اپنے جسم پر رینگتی، ڈنک مارتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ جسم کے نیل دور ہو چکے تھے لیکن ان سانپوں کا زہر اس کی روح کو نیل و نیل کر رہا تھا۔ اسے سب سے زیادہ تکلیف اپنے منگیتر کے رویے سے ہوئی، جس کی آنکھوں میں اس کی چاہت کے چراغ بجھ چکے تھے۔ کیا وہ واقعی چاہے جانے کے قابل نہیں رہی تھی؟ کیا اس کا منگیتر کبھی اسے عزت بھری محبت

دے سکے گا؟ اس طرح کے کئی سوال اسے عجیب سی کیفیت میں مبتلا رکھتے جیسے وہ زمین کی بجائے پانی پر چلنے کی کوشش کر رہی ہو۔ گو اس کی منگنی برقرار تھی کیونکہ اس رشتے کی گرہ دونوں طرف کے خاندانوں نے اپنے اپنے مفادات کی طاقت سے لگائی تھی، لیکن اس منگنی کا قائم رہنا اب زبردستی کے احسان کا ایسا بھاری بھر کم پتھر تھا جس کے بوجھ تلے اسے سانس لینا دشوار لگ رہا تھا۔ کیا اس کی زندگی اسی طرح پانی پر چلتے ہوئے گزرے گی؟ وہ پریشان کن سوچوں میں گھری بے بسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی چلی جاتی۔ عجیب حادثہ تھا جو جسمانی اور ذہنی صدموں کے ساتھ ساتھ اسے بے مثال تنہائی کی دلدل میں اتار چکا تھا۔ وہ اپنے سب پیاروں کے ہوتے ہوئے بھی اکیلی ہو چکی تھی۔ اس کا باپ جب اسے دیکھ کر اپنا سر جھکا لیتا تھا تو اسے اپنا آپ گندگی کا ایسا ڈھیر لگتا جو اپنے خاندان کے لیے باعثِ شرم تھا لیکن جس سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں تھا۔

'اگر میں اپنی جان لے لوں تو کیا میرے خاندان کی عزت واپس آ جائے گی؟' اس نے یہ بھی سوچا۔ لیکن اس کی دادی تو جب بھی اسے دیکھتی تو گہری آہ بھر کر کہا کرتی تھی کہ ایک بار کی کھوئی ہوئی عزت کبھی واپس نہیں ملتی۔ اس کا شدت سے جی چاہتا کہ کبھی اپنی ماں کا وہ پیار دیکھے جسے وہ ہوش سنبھالنے سے ابتک دیکھتی آئی تھی۔ لیکن ماں کے پیار پر رحم کا جذبہ غالب آ چکا تھا۔ یہ سوچ کر اسے جھرجھری سی آ جاتی کہ وہ اب پیار کی بجائے رحم کے قابل تھی۔

پھر کچھ وقت گزرا اور دھیرے دھیرے ایک بھرپور زندگی جینے کی خواہش اس کے اندر انگڑائیاں لینے لگی............اسی خواہش کے زیرِ اثر اس کی سوچ آخرِ کار انگڑائی لے کر بیدار ہوئی اور اس نقصان پر سوال اٹھانے لگی جو کہنے والوں کے مطابق اس کا ہو چکا تھا۔ وہ اس نقصان کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے تو کوئی غلطی، کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ وہ مظلوم تھی اور لوگ کہتے تھے وہ گوہرِ عصمت گنوا بیٹھی۔ اس کے جسم پر جو گھاؤ لگا تھا وہ دو لوگوں نے لگایا تھا۔ دو بھوکے، بے حس، سفاک مردوں کی جنسی درندگی نے۔ عجیب بات تھی کہ وہ مرد جو انسان کے مقام سے گر کر درندے بنے تھے وہ اس معاشرے میں آسانی کے ساتھ جی سکتے تھے، گو وہ مجرم تھے، گرفتار ہو چکے تھے اور امید تھی کہ وہ اپنے جرم کی سزا بھی کاٹیں گے، اس کے باوجود ان کی عزت ان کے پاس رہے گی۔ معاشرہ یہ نہیں کہے گا کہ ان کی عزت ختم گئی۔ لیکن وہ جو انسان کے مقام پر موجود تھی، جس نے کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا تھا، جس نے چوری نہیں کی تھی، ڈاکہ نہیں ڈالا تھا، وحشی نہیں بنی تھی وہ اس سب کے باوجود بے آبرو ہو گئی تھی۔ اسے آبرو جیسے اس نازک آبگینے سے نفرت محسوس ہونے لگی جسے جانے کب اور کیوں عورت کے جسم میں رکھ دیا گیا تھا۔ جسم پر لگنے والے زخم تو ایک حادثے کا نتیجہ تھے لیکن اب اس کی روح پر مسلسل گھاؤ لگانے والی ایک ایسی معاشرتی سوچ تھی جو مظلوم کی بجائے مجرم کے ساتھ

کھڑی تھی۔ان معنوں میں اس پر ظلم کرنے والے دو افراد نہیں، بلکہ پورا معاشرہ تھا۔ایسی سوچ کا رکھوالا معاشرہ جو عورت کو انسان کے مقام سے گرا کر ایک شئے کی حیثیت سے اس کے استعمال کے قاعدے قانون بنا چکا ہے۔معاشرہ جو ظالم کی بجائے مظلوم کے جسم پر ایک انمٹ مہر لگانے کی رسم کا نابینا امین ہے۔’’بے آبرو ہو جانے کی انمٹ مہر......‘‘یوں اس نے واضح طور پر اپنے دشمن کو دیکھ لیا،افسوس کہ یہ دشمن اس کے آس پاس اس کی عزیز ترین ہستیوں کے ذہنوں میں بھی موجود تھا۔

اس حادثے کے بعد ایک تبدیلی یہ بھی آئی کہ اسے اب رات کی تاریکی اچھی لگنے لگی تھی۔اس تاریکی میں کوئی ملامت بھرا لہجہ،کوئی رحم بھری نگاہ اس کے وجود میں سوراخ نہیں کرتی تھی۔رات کی کوکھ میں پلتے بھوتوں،عفریتوں،چڑیلوں کے روائتی تصورات دم توڑ چکے تھے۔انسان اور ان کی سوچیں اور رویے تو ان سے کہیں زیادہ خوفناک تھے۔خاموشی اور اندھیرا اب اس پر مہربان تھے۔آج بھی ایک گھپ اندھیری رات تھی،اس کے مقدر جیسی،کسی امید سے عاری۔خاموشی کا ہر سو پہرہ تھا۔وہ برآمدے کے ستون سے ٹکی دیر سے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سن رہی تھی،وہ زندہ تھی،اس کا دل پوری درستی سے اپنا کام کر رہا تھا۔پھر اس کی نگاہیں اس جگنو پر جا ٹھہریں جس کے جسم میں کوئی دیا روشن تھا۔یہ ننھا سا کیڑا تاریکی کے مہیب عفریت کے مقابل اپنی ذرا سی روشنی کا معجزہ دکھا رہا تھا۔وہ کسی خارجی اجالے کا محتاج نہیں تھا۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے اسے کئی جگنو نظر آئے،جگنوؤں کا ایک قافلہ۔یہ قافلہ جتنا بڑا ہوتا گیا،اندھیرا اتنا ہی کمزور پڑتا گیا۔یہ دیکھ کر اچانک ایک خواہش نے اس کے ذہن میں انگڑائی لی،تاریکی کو بے جان کرنے کی خواہش،جگنوؤں کے قافلے سے جا ملنے کی آرزو۔نئی طرح کی جرأت سے زندگی کشید کرنے کا خیال ایک توانائی کی طرح اس کی رگ و پے میں دوڑنے لگا۔مجھے جگنو بننا ہوگا،مجھے جگنوؤں کا قافلہ تلاش کرنا ہوگا،اس نے سوچا۔وہ پر جوش قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آئی،بتی جلائی اور آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔اسے اپنا آپ گزرے کل سے کچھ مختلف لگا۔آج اس کی آنکھوں کے چراغ روشن تھے۔اب اسے معاشرے کی بینائی تلاش کرنا تھی۔یہ ایک مشکل کام تھا،بہت ہی مشکل۔لیکن خود اپنی سوچ کی بیداری اور زندگی کا کوئی مقصد پا لینے کے بعد،کچھ کرنے کا ارادہ کرتے ہی اسے اپنی روح پر لگے زخم کا درد کچھ کم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔اس نے ایک گہرا سانس لیا،کچھ سوچ کر مسکرائی اور آہستگی سے اپنی انگلی کو منگنی کی اس انگوٹھی سے آزاد کیا جو کسی ان چاہے احسان کی طرح اسے دن رات کاٹتی رہتی تھی۔

◀◀ ● ▶▶

29,Governors way,Macquarie Links.
NSW-2565Sydney Australia,+412015784

● فارحہ ارشد

دنانیر بلوچ

’’جلدی سے میرا پوسٹ مارٹم کرو۔ مجھے مجسمہ مکمل کرنا ہے۔ وہ مجسمہ......جو چار روز قبل مکمل ہونے سے پہلے فروخت ہو چکا ہے۔کل شام وہ اسے لینے آ رہے ہیں۔‘‘

وہ کہتی جا رہی ہے مگر اس کی کوئی نہیں سنتا۔ ویٹنگ لسٹ میں اس کا ساتواں نمبر ہے اور وہ ابھی دوسرے نمبر والی کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں۔

وہ اس بارہ دری کی طرف بھاگنے لگتی ہے جہاں مجسمہ آخری ٹچ کے انتظار میں ’ادھورا‘ پڑا ہے۔ وہ رستے سے واپس دوڑنے لگتی ہے کہ کہیں وہ اپنے پوسٹ مارٹم کی باری آنے پر موجود ہی نہ ہو۔ مجسمہ بارہ دری میں بے حس و حرکت پڑا اسے دور سے واپس جاتے دیکھ رہا ہے۔ وہ ہل نہیں سکتا اور نہ ہی اسے روک سکتا ہے۔ وہ مکمل ہونے سے ذرا پہلے کے ادھورے پن کے صدمے میں مبتلا ہے۔ ایک آنسو مجسمے کی آنکھ میں تیر رہا ہے مگر ابھی ٹپکا نہیں۔ بدشگونی کا ڈر اسے آنسو ٹپکانے نہیں دیتا۔

وہ دنانیر ہے۔ عمدہ مجسمہ ساز۔ سرزمینِ مکران کا وہ بڑا شہر جو مصنوعی روشنیوں سے جگمگ کرتا ہے اس سے دور جہاں تاریکی ہے، اداسی ہے۔ وہ وہیں رہتی ہے۔ اس کے محبوب نے اسے مجسمہ سازی سکھائی۔ مجسمہ سازی اور پوسٹ مارٹم کے دوران وقفہ ہے۔ اس وقفے میں کہانی کہیں اور چل پڑی ہے۔

وہ محبوب مجسمہ ساز جس کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر وہ سینے سے لگائے خود بھی منجمد وقت میں ٹھہرے کسی لمحے کی تصویر ہی لگتی ہے۔ سانپوں کی سازش نے مجسمہ ساز کو نگل لیا ہے اور وہ آخری ٹچ سے ذرا پہلے، مجسمہ ادھورا چھوڑ کر بلیک اینڈ وائٹ تصویر سینے سے لگائے، سرخ اینٹوں والی سرکاری عمارتوں کے سامنے بھاگتی پھرتی ہے کہ مجسمہ ساز امن پسند اور محبت کے گیت گانے والا آدمی ہے مگر بستی والوں نے بتایا۔ مجسمہ ساز اس لیے غائب کر دیا گیا ہے کہ غائب کرنے والوں کا کہنا تھا وہ مجسمہ سازی کے اوزار نہیں، قتل کے ہتھیاروں سے لیس مشکوک باغی ہے۔ بستی والوں نے یہ بھی بتایا کہ روشندان کے کبوتر جب غصے سے پر پھڑ پھڑا رہے تھے تو مجسمہ ساز نے کہا

’’او میرے بھید بھرے پرندو امن کے گیتوں میں مجھے رخصت کرو۔‘‘

غائب کرنے والوں نے اسے بھی اس کا کوئی راز یا کوڈ سمجھا اور رات گئے تک تلاشیاں لیتے رہے

مگرانہیں ادھورے مجسموں اور پر پھڑ پھڑاتے کبوتروں کے سوا کچھ نہ ملا تو مجسمہ ساز کو اٹھا کر غائب ہو گئے۔

دنانیر کے ناخنوں کے نیچے تشنہ وریدوں کی تشنگی ادھورے مجسمے کے پہلو میں چھوڑ کر مجسمہ ساز کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر اٹھائے ننگے پاؤں موہنجوداڑو جیسے اجڑے شہروں کے انصاف پسندوں کے سامنے وہ بھاگتی پھر رہی ہے۔اس کے اردگرد سوال مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے ہیں۔سوال جو متوجہ کرتے ہیں سوال جو پسلیوں میں تیر کی طرح جا کھبتے ہیں۔سوال جن کی آواز کا شور سیاہ سناٹے میں چھید کرتا ہے۔

مگر وہ کہ وقت کے منجمد لمحے کو ڈالی گئی چٹخنی کی زنجیر میں پڑے تالے جیسی جس کی چابی اس صندوق میں بند ہے جسے کبھی کھولا ہی نہیں گیا۔مگر کیا سارے تالے صرف چابی سے ہی کھلتے ہیں؟

سوال جو دنانیر کی اونچی منڈیروں پر کائیں کائیں کرتے کسی نئے خواب جیسے مہمان کے آنے کا سندیسہ دیتے ہیں۔وہ منڈیر جس کی دیواروں کے اندر دنانیر رہتی تھی مگر اب وہ ایک تصویر کے فریم میں قید ہے۔وہ فریم جو اس کی دیواروں پر لگتا تو دیوار نگل جاتا۔مگر اب وہ اس فریم میں منجمد لمحے کی قید میں ہے۔ ساری تصویر برف کے گولے جیسے وعدوں کے نیچے ٹھٹھرتی ہے مگر اس کی آنکھیں......جو نقطہ انجماد میں بھی کسی مشعل کی طرح ٹمٹماتی لرزتی رہتی ہیں۔

اور اس کا دماغ جو بہت باخبر ہے۔جس کے زندہ ہونے کی اس سے بڑی گواہی کیا ہوگی؟ کہ اس کے سر پر منجمد تصویر سے اڑان بھرنے کا خیال ققنس بن کر ٹمٹماتا ہے۔ققنس جو اپنی ہی راکھ سے جنم لیتا ہے۔تو وہ جو دنانیر ہے۔کسی دیئے کی لو جیسی۔

لوگ اس کی کہانی سننا نہیں چاہتے جبکہ انہیں ازبر ہو چکی ہے۔اس کی کہانی کوئی آفاقی یوٹوپیا ہے؟......جسے ایک مچھیرا اتفاقاً دریافت کر بیٹھا ہو......یا تنگ گھاٹی سے وہ آڑو کے شگوفوں کے دریا میں اترے تو اسے ان پانیوں میں ہجر کی صدائیں سنائی دی ہوں۔

نہیں!وہ اسی زمین پر ایستادہ دنیا کی کہانی ہے،دنانیر کی دنیا۔

وہ ہجر جو اس دنیا کی دریافت سے پہلے دنانیر کی زمین کی مٹی پر چھڑک دیا گیا تھا۔آڑو کی پتیوں کے دریا میں بانس کی نازک ڈنڈیوں سے بنی کشتی چلاتے،ہجر کے گیت گاتے اور فرار کے آسمان میں مزید موتی ٹانکتے لوگوں کی دنیا۔شمشان گھاٹ کے جیسی یا کسی قتل گاہ کی مانند۔

یہ کہانی بہت پرانی ہے۔یہ تب کی بات ہے جب دنانیر آسمانوں کے ہنڈولے میں جھولتی تھی۔یہ لوگ دنانیر کے ہیں یہ گول سر والے زرد اور بیمار۔جن کے ہونے نہ ہونے سے فرق کیا پڑتا تھا؟

نہ ہوتے۔

مگر وہ ہیں۔

یوں انہیں زمین نگل جاتی ہے یا آسمان کھا جاتا ہے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔کوئی سندیسہ کوئی پتر نہیں آتا۔ابھی تھے ابھی نہیں۔جیسے کوئی مذاق میں چھپے اور پھر ملے ہی نہ۔

یہ مٹھی بھر لوگ نہ بھی ہوتے تو کیا ہوتا۔مگر وہ ہیں۔

مرنے پر آئیں تو مرتے ہی چلے جاتے ہیں جیسے مرنا بھی کوئی کھیل ہو۔بات بات پر مر جاتے ہیں۔چھوٹی چھوٹی بات پر موت۔

اتنا آسان ہوتا ہے مرنا؟مگر وہ مرتے ہیں۔ڈرتے ہی نہیں۔اور تب زیادہ مرتے ہیں جب کوئی بات ہی نہ ہو۔کچی مٹی کے برتن جیسے۔تڑخے اور پاش پاش ہو کر پھر مٹی کی مٹی۔یہ مٹی کے باوے بھلا نہ ہوتے تو کیا تھا؟۔مگر وہ ہیں۔

بھتوں جیسے۔سکڑتے غائب ہوتے وجود۔کیڑے مکوڑوں جیسے۔ان کے نرخرے موت کی زد میں بات بے بات آجاتے ہیں۔مگر زندگی ان کی آنتوں میں اٹکی رہتی ہے۔

وہی دنانیر کے لوگ۔دنانیر جس کی زندگی اور ہاتھ میں پکڑی بلیک اینڈ وائٹ تصویر دعا اور بد عا کے درمیان معلق ہے۔

گلِ سنجدی،زعفران اور مٹی کی خوشبو ایک سی ہے۔ہجر کی خوشبو۔موت کا عطر۔

دنانیر مجبور ہے مگر ذہین بھی تو ہے اور کچھ حالات کی شطرنج پر کھیلتے کھیلتے اسے ذہانت ادھر ادھر سے اکٹھی کرنا پڑی۔ہر شکست اسے نئی چال سکھا جاتی ہے۔اب وہ چال سے آگے سوچتی ہے۔

بلیک اینڈ وائٹ تصویر سینے سے لگائے برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے واقع کوئین الزبتھ ہال جا پہنچتی ہے تو خود بھی حیران ہوتی ہے۔تنفس قدرے برہم اور پیشانی پر چمکتی بوندیں۔

یہ دنانیر ہی تو ہے۔ایک ہزار سامعین کے سامنے''ٹیڈ ٹاک'میں بولنے کا دباؤ لیے۔جس نے اس کو بھیگی بلی بنانا چاہا مگر اسے تو بولنا ہے آج۔اس کی زبان بل کھاتی ہے اتنے لوگ دیکھ کر۔

ماہرین نفسیات اسی لیے پبلک سپیکنگ کو موت اور سانپ کے ڈسے سے بھی بڑا ڈر کہتے ہیں۔

لیکن اسے آج ڈر کو ہی اپنی طاقت بنانا ہے۔وہ بولتی ہے......بہت بولتی ہے اور بولتی ہی چلی جاتی ہے۔کوڑھ زدہ الفاظ،تعفن بھرے۔خون میں لتھڑے۔اور موت کے زعفرانی رنگ جیسے۔

سامنے کھڑے لوگ پہلو بدلتے ہیں۔ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں۔ہاں مگر ان کی آنکھوں کی سطح نم ہے۔

''ہمارے لئے ایک کٹورے پانی کی قیمت سو سال وفا ہے۔ہم وینگوف کے شاہکار پر بیٹھے پرندے

ہیں۔محبتوں کے گیت گانے والے لیکن ہماری زبان پر یہ کس نے موت کے اور ہجر کے ترانے رکھ دیئے۔''

وہ اپنے سارے سوال پکڑتی ہے اور لوگوں کے دماغوں میں انڈیلے جاتی ہے۔

'ٹاپوں کی آواز تو ہے مگر سفر ختم نہیں ہوتا کہ دائرہ مکمل کر کے اپنے آغاز کی طرف لوٹ آتا ہے۔ پر اب کچھ فیصلے لینا ہونگے۔ پر اکسی وار جو ہم انسانوں پر لڑی جارہی ہے۔ ہر طاقت ہمارے سروں کی بازی کا کھیل کھیل کر اپنی طاقت بڑھا رہی ہے۔ کس کس طاقت کا ایندھن ہم بنیں۔ شطرنج کی بساط بچھائے پیادوں کو ماہر کھلاڑی گھماتے ہیں، مارتے ہیں اور مارتے ہی چلے جاتے ہیں۔کسی کو کوئی اپنی مٹھی میں جیت کر لیے بیٹھا ہے کسی کو کوئی۔ ہمیں شطرنج کے بے جان مہرے نہیں، انسان سمجھا جائے۔ ہمیں اس بساط کا مہرا نہیں بننا۔ انسانی حقوق والے کہاں چھپ کر بیٹھے ہیں؟ ہمیں اپنی زندگی جینے کا حق دیا جائے۔ ہمارے سر پر بہت تفریح ہو چکی۔اب بس......!'

اٹھارہ منٹ اس کے لیے بہت تھے کہ اس کی مٹی کی باڑھ میں سے کئی آوازیں لپکیں۔ کچھ اپنی اور کچھ پرائی۔ اپنی اپنی طاقت کے نشے میں چور آوازیں۔

'یہ کون گستاخ ہے؟''......وہ اور زور سے گرجتی ہے۔

'نکل جاؤ میرے گھر سے۔'اس کی آواز رکتی نہیں۔

'وہ میرے جوان لے جاتے ہیں اور ہم سے کھیل کھیلتے ہیں۔ اپنی تفریح کے لیے ہمیں ہلاک کرتے ہیں۔'

آواز کی گونج تیز ہے جس میں اب درد سمٹ آیا ہے۔ آنسوؤں کا پھندا گلے میں پھنس گیا ہے۔ جسم بے بسی سے کانپتا ہے۔

'زرتشت! تم آگ کے شعلوں کو ہوا دے کر چلے گئے۔ میں تنہا جلوں اور اہرمن تماشا دیکھے؟'

اسے بولنا ہی تھا اور وہ بولی۔ گیلی چوب کی طرح سلگتی آواز۔

'ہمیں انسان سمجھا جائے۔ ہماری مٹی ہمارے پاؤں سے الگ کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ نہیں تو یہ مُٹھی بھر مٹی طوفان بن کر انہیں اندھا، گونگا اور بہرا کر دے گی جو باہر سے میری مٹی پر آ کر ہمارے ہی خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔'

اس کی آواز کی گونج ابھی فضا میں باقی تھی کہ وہاں سے باہر نکلتے ہی وہ جان گئی کہ کچھ مشکوک لوگ اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔ اس کی اپنے ملک کی فلائیٹ کی ٹکٹ بُک تھی۔

طویل مسافت کے بعد اپنی سرزمین پر پہنچ کر اس نے اپنی مٹی کی خوشبو کو ایک لمبی سانس لے کر

سینے میں اتارا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اب محفوظ ہے۔ مکران کی زمین پر ائیر پورٹ سے نکلتے ہی اس کی وفا کی قیمت جان ٹھہری۔ اور وہ مر جاتے ہیں۔ یونہی چھوٹی چھوٹی بات پر۔ انہیں مرنے سے ڈر کب لگتا ہے؟

اس نے بھی مرنے سے پہلے، گرتے ہی اپنی مٹی کو آخری بوسہ دیا۔ اور محبوب مجسمہ ساز کو یاد کیا۔

آہ! بانک دنانیر بلوچ۔

بس اتنی سی بات۔ مگر وہ جن کی آواز موت بھی نہیں روک سکتی۔ اس کی آواز بھی ان آوازوں میں مل کر سناٹے کو چیرتی ہوئی تمام طاقتوں کے ایوانوں تک جا پہنچی۔

اور پھر......

وہ پوسٹ مارٹم کی انتظار گاہ سے بارہ دری میں دھرے ادھورے مجسمے کی طرف بھاگتی رہی۔

پوسٹ مارٹم کے بعد قبر کی طرف جب وہ اسے لیے جا رہے تھے تو ادھورے مجسمے کی آنکھ میں رکھے آنسو سے اس نے چپکے سے کہا۔

''تمہاری آنکھ تو دریا ہے۔ دریا کا دروازہ بند کر دو ورنہ شہر سیلاب میں بہہ جائے گا۔''

شام کے پرندوں کے آخری ڈار نے دیکھا۔ مرنے والے کب مرے؟

زمین پر دنانیر کی قبر سے ایک محبت اور امن کے گیت گاتا پرندہ اڑا اور اس کی ہم نسل ڈار نے اس کے ساتھ شکستہ پروں کے باوجود اڑان بھری، ان کالے پانیوں کی طرف جہاں ان کے پر چھپا دیئے گئے ہیں۔ وہ ہفت رنگ پر، جن کے ملتے ہی ان کی اڑان دیکھنے والی ہوگی۔

◀◀ ● ▶▶

+923451272980Lahore

غضنفر شناسی

(ناولوں کی روشنی میں)

مرتبہ	:	ڈاکٹر ریشا قمر	سن اشاعت	:	۲۰۲۳ء
قیمت	:	۷۰۰ روپے	صفحات	:	۴۸۴

ملنے کا پتہ

بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

● م۔ص۔ایمن

تعویذ

وہ میرا محلّہ دار تھا۔ اس حوالے سے بچپن کا دوست، ہم جماعت ہم مزاج وغیرہ وغیرہ بھی تھا۔ ہمارے محلے میں سکول آٹھویں جماعت تک ہی تھا۔ ہم دونوں نے آٹھویں جماعت کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ وہ کسی کمپنی کا ملازم ہوگیا۔ میں نے درزی کا کام سیکھ لیا اور درزی کی دکان بنا ڈالی۔ مطالعے کا مجھے بہت شوق تھا لیکن مصروفیت کے سبب وقت نکالنا مشکل ہوگیا تھا۔

کہانیوں کا چسکا مجھے دوسری جماعت سے ہی لگ گیا تھا۔ کہانیاں اتنی پڑھیں کہ کہانیوں سے بے زاری ہوگئی تھی۔ یوں رجحان کہانیوں کی بجائے، ماورائی علوم کی طرف ہوگیا۔ ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی، علم جفر، علم الاعداد وغیرہ کی کتابیں پڑھنے لگا۔ علم الاعداد پر اس قدر عبور حاصل کرلیا کہ مستقبل کا حال، چوری شدہ گم شدہ مال کی بازیابی، خوابوں کی تعبیر وغیرہ بھی علم الاعداد سے نکال کر دوستوں کو حیران کرتا رہا۔ پھر اس سے بھی بے زار ہوا علم فلکیات سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ یہ بھی محض شغل تھا۔

ریاض اپنے اور اپنے گھر والوں کے کپڑے مجھ ہی سے سلوایا کرتا تھا۔ اس بار اس کے کپڑے وقت پر تیار نہیں ہوسکے۔ تین چار بار لینے آیا لیکن کپڑے تیار نہیں تھے۔ سخت سست کہتا ہوا چلا گیا۔ چار دن بعد پھر آیا تو مشین کے تخت پر پیر پھیلائے میں بیٹھا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ صورت حال بدستور وہی ہے تو بولا ''ابھی فارغ ہے۔ ابھی سی دے۔ میں تیرے پاس ہی بیٹھا ہوں۔''

میں نے کہا ''ایسا فارغ تو میں کئی دن سے ہوں۔ کام کچھ نہیں ہوتا۔ بس! کام دیکھ دیکھ کر گھبراہٹ ہوتی رہتی ہے۔ یہ دیکھ کتنا کام پڑا ہے، کتنے ہی گاہک ناراض ہو ہو کر جارہے ہیں، دو گاہک تو بغیر سلے ہی اپنے کپڑے لے گئے۔''

بولا ''ہاں یار! میں نے بھی محسوس کیا ہے...... جب بھی تجھے دیکھا ہے اسی طرح بیٹھے دیکھا ہے۔ خیر تو ہے؟''

میں نے کہا ''بس یار! کام کو دیکھتا ہوں تو عجیب سی طبیعت ہوتی ہے، بس بیٹھا رہتا ہوں دس بجے اور دکان بند کروں۔، کوئی گاہک آجائے تو غصہ آنے لگتا ہے کہ یہ کیوں آیا ہے؟ اب اس کے لیے کھڑا ہونا

پڑے گا۔اس کا ماپ لینا پڑے گا...... یہ دیکھ کٹے ہوئے بھی کتنے ہی کپڑے رکھے ہوئے ہیں،ان کی طرف دیکھا بھی نہیں جاتا۔''

سرگوشی میں بولا''کسی نے کچھ کروا تو نہیں دیا؟'' میں ہنس پڑا کہ شاید طنز کر رہا ہے۔ میں نے کہا ''مجھ پر کوئی کیا کروائے گا۔بس کام دیکھ دیکھ کر جی ہلکان ہوتا رہتا ہے کہ کہاں سے شروع کروں؟''

بولا''نہیں! مجھے تو کچھ اثر لگ رہا ہے...... یقیناً تجھ پر کسی نے کوئی عمل کروا دیا ہے۔''

میں نے ہنس کر کہا'' یہ کیا تم نے عورتوں والی بات کی ہے؟ ایسی باتیں تو عورتیں کرتی ہیں کہ فال نکلواؤ کسی نے کچھ کر دیا ہوگا؟...... کیا تم مذاق کر رہے ہو؟''

بولا''میں مذاق نہیں کر رہا۔کئی دن سے میں دیکھ رہا ہوں تیرے کام میں وہ چستی نہیں نظر آتی جو پہلے تھی، ڈھیلا ڈھیلا سا دکھائی دیتا ہے۔'' اس کا انداز سرگوشیانہ تھا اور ذرا بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ غیر سنجیدہ ہے۔اب مجھے بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

میں نے کہا''ہاں یار! شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔میرا دل کسی کام میں نہیں لگتا۔دکان کے باہر ٹھیک رہتا ہوں لیکن دکان پر آتے ہی بے چینی سے رات دس بجے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے کہ کب دس بجیں گے اور میں گھر جاؤں گا۔''

''شک نکلوانا ہے؟'' سرگوشی میں بولا،اگر سرگوشی نہ بھی کرتا تو اس وقت کوئی تیسرا شخص قریب موجود نہیں تھا جو سن سکتا۔''اگر پتہ کروانا ہے کہ کسی نے کچھ کر تو نہیں دیا تو بتاؤ! ایک بندہ ہے میرے پاس!''

میں نے کہا''یار! میں ایسی باتوں کبھی یقین نہیں کرتا۔ یہ سارے بابے ایسے ہی ہوتے ہیں،ان سے زیادہ تو میں خود جانتا ہوں لیکن عمل کبھی نہیں کرتا۔''

''جس کے پاس میں تجھے لے کر جاؤں گا وہ ایسے ہی نہیں ہے،تو چل ایک بار اس کے پاس ......اگر کوئی اثرات ہوئے تو فوراً بتا دے گا''

اب مجھے سوچنے پر مجبور ہونا پڑا۔مجھے سوچ میں دیکھ کر وہ پھر بولا''چیک کر لینے میں حرج ہی کیا ہے؟اگر کچھ عمل کسی نے کروا دیا ہے تو پتہ چل جائے گا،نہ ہوا تو وہ ایسا عمل کر دے گا کہ تیرا دل کام میں پہلے کی طرح لگنے لگے گا۔''

میں نے کہا''ٹھیک ہے۔کسی وقت چلے چلیں گے۔''

بولا''کسی وقت کیا؟......آج ہی چل اور ابھی۔''

میں گڑبڑا گیا''......لیکن یار! ابھی دس بجنے والے ہیں یہ کون سا وقت ہے کسی کے پاس جانے کا؟''

''تو جانے والا بن۔باقی مجھ پر چھوڑ دے۔''

میں ہنسا''ایسا کون ہوگا جو رات دس بجے تک میرے لیے بیٹھا رہے گا۔''

’’اس کی فکر چھوڑ تو! بس اٹھ ابھی چلتے ہیں۔‘‘

’’دس بجے گھر جا کر میں کھانا کھاؤں گا اور گیارہ بجتے تک سو جاتا ہوں کہ صبح پانچ بجے پھر اٹھنا ہوتا ہے۔‘‘

’’کھانا کھا کے آجا! دیر نہیں کر۔ آجا میں انتظار کروں گا تیرا۔‘‘

’’جانا کہاں ہے؟‘‘

’’تجھے پتہ نہیں بتاؤں گا۔ اکیلا نہیں جاسکے گا، اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا بس۔ کھانا کھا کر آجا...... میں گھر پر ہی ملوں گا۔‘‘ کھانا کھا کر میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے موٹر سائیکل نکالی اور مجھے ساتھ لیے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر چلتا ہوا ایک بستی میں پہنچ گیا۔ تنگ و تاریک گلیوں سے نکلتا ہوا ایک تاریک سے مکان کے پاس اس نے موٹر سائیکل روک دی اور تاریکی میں ڈوبے ہوئے مکان کے ہیولی کو دیکھتے ہوئے بولا ’’لگتا ہے سو گئے ہیں۔‘‘

میں نے کہا ’’اگر سو گئے ہیں تو رہنے دے۔ کل آجائیں گے دن کی روشنی میں۔‘‘

’’او نہیں یار! اب یہاں تک آ کر واپس نہیں جائیں گے۔ پھر اس نے دروازے پر دستک دے ہی دی۔ تیسری دستک پر اندر بلب جلا۔ کچھ آوازیں سنائی دیں۔ کسی نے پوچھا ’’کون؟‘‘

اس نے کہا ’’میں ریاض ہوں خادم! دروازہ کھول!‘‘ اور اگلے لمحے دروازہ کھل گیا۔ ریاض نے پوچھا ’’پیر صاحب جاگ رہے ہیں یا سوئے ہوئے ہیں۔‘‘

وہ ہنسا ’’پہلے سوئے ہوئے تھے...... اب جاگ رہے ہیں۔‘‘

ہم اندر داخل ہو گئے۔ بھاری تن و توش کے حامل ایک صاحب فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ سوئے ہوئے تھے اور ہماری دستک سے ابھی ابھی بیدار ہوئے ہیں۔ سلام کیا۔ مصافحہ کیا اور ہم دونوں ان کے قریب بیٹھ گئے۔ میں نے معذرت کی کہ آپ کے آرام کا وقت ہے اور ہم نے مداخلت کر دی ہے۔ وہ بولے ’’کوئی بات نہیں! فرمایئے! کیا خدمت کر سکتا ہوں؟‘‘

ریاض بولا ’’اسے چیک کریں پیر صاحب!...... اسے کیا ہو گیا ہے‘‘ پھر مجھ سے بولا ’’تو کچھ نہ بولنا‘‘۔ گویا اسے آزمانا چاہتا ہو۔

ان صاحب نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ میں ان کے سامنے بیٹھ گیا تو انہوں نے اپنا تکیہ اٹھا کر درمیان رکھ دیا، بولے ’’اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس تکیے پر ایسے رکھیں۔‘‘ انہوں نے اپنی انگلیاں پھیلا کر بتایا۔

میں نے ایسے ہی کیا۔ وہ کچھ پڑھتے رہے اور میرے بائیں ہاتھ کی چھنگلی کے ناخن کو اپنی انگشت

شہادت سے دبایا۔ پھر باری باری ساری انگلیوں کو بشمول انگوٹھے کے ناخن کے ...... باری باری دباتے گئے۔ مجھ سے پوچھا ''کوئی وظیفہ کرتے ہیں؟''

میں نے کہا ''نہیں!......کوئی نہیں''

پھر چند ثانیے بعد یہی عمل دوبارہ شروع کیا اور بولے ''اگر آج کل کوئی وظیفہ نہیں کرتے تو کبھی کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو کس طرح کا وظیفہ کیا ہے۔''

میں نے پھر جواب دیا کہ ''میں نے کبھی کوئی وظیفہ نہیں کیا۔''

بولے ''کوئی ورد کرتے ہیں؟''

ریاض نے مداخلت کی ''ورد اور وظیفہ الگ الگ ہوتے ہیں کیا؟''

اسے جواب دیے بغیر میں نے کہا۔ ''پابندی سے نہیں کرتا لیکن گاڑی کے انتظار میں، کسی دوست کے انتظار میں، راستہ چلتے ہوئے، سفر کے دوران سورۃ الملک پڑھ لیتا ہوں۔ اسماء الحسنٰی یاد ہیں نماز کے بعد گھر آتے تک اسماء الحسنٰی پڑھتا ہوں لیکن وہ بھی باقاعدگی سے نہیں، ساتھ کوئی باتیں کرنے والا ہو تو باتیں کرتے ہوئے گھر تک پہنچ جاتا ہوں۔''

پھر انہوں نے حیرت انگیز بات کی ''آپ کوئی وظیفہ کرتے ہیں یا کرتے رہے ہیں۔ اس وظیفے نے آپ کے گرد ایک مضبوط حصار بنا رکھا ہے، میں نے اپنے مؤکل بھیجے ہیں جو آپ کے جسم تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ ناکام ہو رہے ہیں۔ میں دوبار انہیں بھیج چکا ہوں وہ ناکام واپس آ گئے ہیں۔''

یہ سن کر مجھ پر عجیب سی کپکپی طاری ہو گئی۔ 'یہ کیسے ہو گیا؟'

وہ بولے ''کسی نے آپ پر عمل کروایا ہوا ہے اور بہت سخت عمل کروایا ہے لیکن آپ کے وظیفے کی وجہ سے وہ شیطانی قوتیں آپ کے جسم تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔ میرے مؤکلات بھی بڑی مشکل سے آپ تک پہنچے ہیں لیکن آپ کے جسم کے قریب وہ بھی نہیں پہنچ سکے حالاں کہ میرے مؤکلات آپ کو نقصان پہنچانے نہیں گئے۔''

میرا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔''

''اوئے تو تو کہتا ہے میرا کوئی دشمن نہیں ہے، پھر پیر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟ کچھ سمجھ آئی؟'' ریاض بول اٹھا۔

میں نے اعتراف کیا ''نہیں! میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔''

پیر صاحب بولے ''آپ بے فکر رہیں ......دشمن نے آپ پر بہت طاقت ور وار کروایا ہے اور بہت بڑی رقم خرچ کی ہے لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا اور نہ ہی وہ کامیاب ہو سکے گا۔ اگر آپ یہ بتا دیتے کہ

آپ کیا وظیفہ کرتے ہیں یا کرتے رہے ہیں تو مجھے آسانی ہو جاتی۔ میں خود معلوم کر لیتا لیکن میرے موٴکل آپ کے جسم تک نہیں پہنچ پائے۔" اب آپ یہ کریں کہ ہر فرض نماز کے بعد اول و آخر گیارہ گیارہ بار درودِ ابراہیمی اور درمیان میں گیارہ گیارہ بار معوذتین پڑھیں۔"

"یہ تو میں ویسے بھی پڑھتا ہوں" میرے منہ سے اچانک ہی نکلا۔

"کیسے؟" وہ جلدی سے بولے "کس طریقے سے پڑھتے ہیں؟"

"ہر نماز کی دو سنت رکعات میں...... فجر، ظہر، مغرب اور عشا کی دو سنتوں میں۔"

"پھر آپ کہتے ہیں کوئی وظیفہ نہیں کرتا......" وہ مسکرائے "یہ سب سے طاقت ور وظیفہ ہے۔ آپ کو اس کے طلسم کا ادراک نہیں ہے۔ یہ پڑھنا نہ چھوڑیں۔ جس گاڑی میں آپ سفر کریں گے اس گاڑی کا کوئی حادثہ نہیں ہوگا ان شاء اللہ۔ یعنی آپ کی وجہ سے وہ گاڑی، اس کے تمام مسافر محفوظ رہیں گے۔ جس محلے میں آپ رہیں گے اس محلے پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ آپ کے گھر کے کسی فرد پر کوئی عمل نہیں کر سکتا۔ جو آپ سے ہاتھ ملائے گا وہ بھی بہت حد تک آفات سے محفوظ رہے گا۔ آپ اپنے ساتھ کئی افراد کی حفاظت کر رہے ہیں اس وظیفے کے ذریعے" یہ کہتے ہوئے پیر صاحب نے بیٹھے بیٹھے ہی مجھ سے ہاتھ ملا لیا۔ ریاض پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

پیر صاحب بولے "اپنا عمل جاری رکھیں بہت مفید عمل ہے اور جو میں نے بتایا ہے یہ بھی کم از کم چالیس روز کریں ان شاء اللہ آپ کا دشمن خود ہی نقصان اٹھائے گا۔ مجھے پتہ نہیں چل سکا تو اسے بھی پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اس کا عمل رائیگاں کیوں گیا ہے، اسے نقصان کیوں ہوا ہے؟"

"اس کے دشمن کا پتہ چل سکتا ہے؟" ریاض نے پوچھا۔

"ہاں! پتہ تو چل سکتا ہے لیکن میرے موٴکلات ہی ان تک نہیں پہنچ سکے تو میں کیسے معلوم کروں؟ بہر حال مطمئن رہیں آپ نادانستگی میں بہت طاقتور وظیفہ کر رہے ہیں۔ اس کے اثرات کا اس کی قوت کا آپ کو ذرا بھی اندازہ نہیں ہے۔"

"ویسے تو یہ خود بھی بہت کچھ جانتا ہے۔" ریاض بولا "یہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ درزی کا کام کرتا ہے لیکن کتابوں کا بڑا شوقین ہے، ہر طرح کی کتابیں پڑھتا رہتا ہے، علم الاعداد بھی جانتا ہے پیشن گوئیاں بھی کرتا رہا ہے لیکن اب نہیں کرتا۔"

"اچھا! آپ علم الاعداد جانتے ہیں؟" پیر صاحب خوش ہو گئے۔

"بس جی جانتا کیا ہوں، کچھ تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ شادی سے پہلے اس کا شوق ہوا تھا پھر فکر معاش میں لگ گئے۔"

میں نے اس عمل ومشورے کا ہدیہ شکرانہ پوچھا کہ 'کیا پیش کروں' تو ہنس دیے ''کوئی نہیں! آپ ریاض کے ساتھ آئے ہیں اور دوسرا میں آپ سے علم الاعداد سیکھ لوں گا۔ کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ مجھے بھی علم الاعداد سے مدد لینا پڑتی ہے۔''

میں نے کہا۔''لیکن میں تو برسوں پہلے یہ سب ترک کر چکا ہوں۔اب تو بہت سی باتیں خیال میں بھی نہیں ہیں۔''

''جو سیکھا ہوا ہوتا ہے وہ کبھی نہیں بھولتا۔ جتنا آپ کو آتا ہے مجھے سکھا دیں۔'' انہوں نے کہا تو میں مذاق سمجھا۔ بہر کیف ان سے رخصت ہو کر ہم آ گئے۔

ایک بار ریاض نے کہا کہ ''یار! پیر صاحب تجھے بہت یاد کرتے ہیں جب بھی جاتا ہوں کہتے ہیں کہ اسے لے کر آؤ۔اس سے کچھ باتیں کریں۔''

میرے لگے بندھے معمولات میں فالتو وقت بالکل بھی نہیں تھا۔صبح نو بجے سے رات دس بجے تک دکان کو وقت دینا لازمی تھا۔کوئی چھٹی نہیں تھی لیکن جب چاہتے چھٹی کر بھی سکتے تھے۔ایک بار ریاض پر زور اصرار کر کے اپنے ساتھ مجھے لے ہی گیا۔

مختلف دلچسپیوں پر پیر صاحب سے بات چیت ہوئی۔وہ مجھ سے ملنے کے بے حد شائق تھے۔ بقول ان کے 'میری شخصیت ان کے لیے پرکشش تھی اور میری صحبت ان کے لیے بہت مفید تھی۔وہ مجھ سے کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن میرے معمولات جان کر انہیں کچھ مایوسی ہوئی کہ عید کی تعطیلات میں ہی مجھ سے ملاقات ہو سکتی تھی۔وہ بولے ''چونکہ میں آپ سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں اس لیے مجھے چاہیے کہ میں آپ کے پاس آیا کروں۔'' شاید یہ بات انہوں نے طنز سے یا مذاق سے ہی کہی ہو۔

ریاض بڑا متاثر ہوا۔ بولا ''نہیں جی! میں اسے لے کر آپ کے پاس آؤں گا۔آپ کیوں اس کے پاس جائیں؟''

انہوں نے مجھ سے پوچھا ''اچھا یہ بتائیں! آپ ساعات نکال سکتے ہیں؟''

میں نے کہا ''جی ہاں۔''

بولے ''مجھے ساعت نکالنے کا طریقہ بتا دیں۔کبھی اشد ضرورت پڑتی ہے تو کتابیں دیکھنی پڑتی ہیں، سائل بیٹھا ہو تو بڑا عجیب سا لگتا ہے۔

میں نے کہا ''جس دن کی ساعت نکالنی ہو اس دن کا غروب آفتاب کا وقت اوپر لکھیں۔
اسی دن کا طلوع آفتاب کا وقت نیچے لکھ کر نفی کر دیں......کل دورانیہ مل جائے گا۔اس جواب کو

بارہ پر تقسیم کر دیں۔ ایک گھنٹے کا دورانیہ نکل آئے گا۔ اس دورانیے کو طلوع آفتاب کے وقت میں جمع کر دیں۔ جو جواب آیا وہ پہلی ساعت ہوگی۔ اسی طرح ایک گھنٹے کا دورانیہ حاصل جمع میں جمع کرتے جائیں گے ساعات نکلتی جائیں گی۔ بارہ ساعات کا وقت پورا ہوگا تو آخری جواب اس دن کے غروب آفتاب کا وقت نکل آئے گا۔ مارچ اور ستمبر میں آسانی ہوجاتی ہے رات دن برابر ہوجاتے ہیں۔"

بولے "یہی تو سمجھ نہیں آتا...... آپ کبھی دن کے اوقات میں تشریف لائیں۔ مجھے ایک دن کی ساعت نکال کر دکھائیں گے تو کچھ سمجھ آجائے گا۔ ویسے تو کچھ سمجھ نہیں آتا۔"

میں نے کہہ دیا "ٹھیک ہے، کبھی دن میں حاضر ہوجاؤں گا۔"

گفتگو کے دوران سورج گرہن کا ذکر نکل آیا۔ کہا "مجھے سورج گرہن کے بارے میں معلومات چاہیئں۔ آپ بتاسکیں گے کہ سورج گرہن کب ہوگا اور کتنی دیر رہے گا کہاں کہاں نظر آئے گا؟"

میں نے بتایا "یہ تو آپ کو کسی بھی جنتری سے معلوم ہوسکتا ہے۔"

"جنتریوں سے یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ وہ گرہن پاکستان میں، کراچی میں بھی نظر آئے گا یا نہیں۔ مجھے اس گرہن کا معلوم کرنا ہے کہ جو کراچی میں بھی نظر آئے۔"

میں نے کہا "یہ تو پھر بہت باریک حساب ہے۔ قبل از وقت نہیں معلوم ہوسکتا۔ یہ ہے کہ اس وقت کراچی میں دن ہو تو امکان پایا جاتا ہے۔ بہرحال یہ بھی ضروری نہیں کہ دن کے وقت ہونے کے باوجود سورج گرہن کراچی میں دکھائی دے۔ البتہ کچھ دن پہلے بتایا جاسکتا ہے۔"

بولے "ٹھیک ہے کچھ دن پہلے ہی بتادیں۔ بہت شکر گزار ہوں گا۔"

جب ہم ان سے رخصت ہونے لگے تو ہمارے ساتھ وہ دروازے تک آگئے۔ ریاض کہتا ہی رہا کہ آپ بیٹھیں ہم چلے جائیں گے لیکن وہ ہمیں دروازے تک پہنچا کر ہی رہے۔ چلتے چلتے انہوں نے مجھ سے پوچھا آپ کا کوئی فون نمبر ہے تو دیں کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے تو آپ کی یاد آتی ہے۔

اس وقت ٹیلی فون تار سے بندھا ہوتا تھا 'گشتی فون' ایجاد نہیں ہوا تھا اور میرے گھر میں بھی نہیں تھا، ایک پڑوسی کے گھر لگا ہوا تھا جس کا نمبر دے دیتا تھا اور کسی کا فون آتا تو وہ پڑوسی مجھے بتادیتا لیکن ضروری نہیں تھا کہ بروقت میں فون کے قریب ہی ملوں۔

ایک دن فون پر ان کا پیغام آیا کہ "میں انہیں فون کرلوں۔"

میں نے فون کیا تو جواب میں بولے "آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہوں لیکن آپ اکیلے آئیں۔ کسی کو اپنے ساتھ نہ لائیں۔" 'کسی' کا مطلب ریاض ہی ہوسکتا ہے کیوں کہ ریاض کے سوا میں کسی

دوسرے کے ساتھ جا ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کے بلاوے پر میں چلا گیا۔

رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے بنا وقت ضائع کیے کہا ''میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ اس ہفتے میں ہی سورج گرہن لگنے والا ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک وقت اگر بتا سکیں تو نوازش ہو گی۔ مجھے ایک خاص تعویز لکھنا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ سورج گرہن دوپہر کے وقت ہو اور ہمارے علاقے میں ہو۔''

''دیکھیے جناب! پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لیں کہ سورج گرہن یا چاند گرہن کے ساتھ لفظ 'لگنا' نہ کہا کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ناپسند فرمایا ہے۔ گرہن ہوتا ہے لگتا نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ سورج گرہن کو اپنی مرضی کے مطابق لانا ممکن نہیں ہے کیوں کہ سورج ہر مہینے گرہن کی سی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کوئی ایسا تعویز لکھنا ہے تو کسی بھی قران کے وقت لکھ سکتے ہیں سورج گرہن کا ہونا ضروری نہیں۔''

''نہیں! اس تعویز کے لیے شرط ہے کہ سورج گرہن کے وقت کھلے آسمان تلے سمندر میں کھڑے ہو کر لکھنا ہے۔'' وہ بولے۔

''اگر تعویز کے لیے کوئی ایسی شرط ہے تو بھی سورج گرہن کسی بھی ملک میں، کسی بھی علاقے میں ہو اس کے اثرات کرہ ارض کے کسی بھی مقام پر پڑتے ہیں۔ اس لیے جس علاقے میں بھی سورج گرہن کا عمل ہو آپ اپنے مقام پر وہ تعویز لکھ سکتے ہیں۔''

وہ بولے ''اس کی شرط ہی سورج گرہن ہے اور پہلے سے معلوم ہو تو اس کی تیاری کی جائے۔ پچھلی بار جب سورج گرہن ہوا تو مجھے ایک دن پہلے پتہ چلا۔''

''ایسا تو نہیں ہے۔ سالانہ جنتریاں چھپتی ہیں۔ تقریباً ہر جنتری میں سورج گرہن چاند گرہن کی تفصیل ہوتی ہے۔''

''جنتریاں تو میں دو کبھی تین لے لیتا ہوں لیکن ان میں یہ نہیں لکھا ہوتا کہ وہ گرہن ہمارے علاقے میں بھی نظر آئے گا یا نہیں، یہ تو ایک دو دن پہلے اخبارات میں ہی آتا ہے۔ مجھے ایسا بندہ چاہیے جو اس کی پیشین گوئی کرے کہ وقوع ہونے والا سورج گرہن ہمارے شہر میں بھی نظر آئے گا اور اس کا صحیح وقت کیا ہوگا۔ دراصل میرا ایک بہت بڑا معتقد ہے اس کا کام لٹک رہا ہے۔ پچھلے چار سال سے میں نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے اور سال گزر جاتا ہے...... کام نہیں ہوتا۔''

''آپ بے فکر ہو کر اجتماع شمس وقمر کے وقت تعویذ لکھ دیں۔ یہ بہتر ہے۔ کام کرے گا۔'' میں نے کہا۔

''آپ سمجھ نہیں رہے میری مشکل کو! کچھ لوگوں کو تو ٹالا جا سکتا ہے کچھ کو نہیں، سریع الاثر تعویذ وہی ہوتا ہے جس کی شرائط پوری کی جائیں۔ سوچیں! ایک شخص کو میں پانچ سال سے یہ کہہ رہا ہوں کہ تمہارا کام

اسی صورت میں ہوگا کہ سورج گرہن کے وقت تمہارا تعویذ لکھا جائے اور میں اسے بغیر سورج گرہن کے تعویذ لکھ دوں تو وہ شک میں پڑ جائے گا۔تعویذ کام کرے یا نہ کرے اس کے شک کی وجہ سے وہ کام ہوگا ہی نہیں کیوں کہ یہ سارے کام اعتقاد سے ہوتے ہیں۔ مجھے اسی نے بتایا ہے کہ سورج گرہن اسی ہفتے ہوگا اور ہمارے شہر میں بھی دیکھا جاسکے گا۔اگر سورج گرہن کے بغیر میں اسے تعویذ دے دوں تو وہ ضرور یہ خیال کرے گا کہ مجھے پانچ سال سے ٹال کیوں رہے تھے؟''

''آپ مجھے اس تعویذ کی مزید شرائط بتا سکتے ہیں؟''میں نے کہا۔

''جی ہاں کیوں نہیں !اہم شرط یہ ہے کہ سورج گرہن کے وقت سمندر میں ناف تک کھڑے ہو کر نقش لکھنا ہے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے''میں نے فوراً کہا''سمندر میں کھڑے ہو کر نقش لکھا ہی نہیں جا سکتا۔آپ پانی میں کھڑے ہوں گے۔لہر آئے گی آپ کو اچھال دے گی۔آپ کے پیر کے نیچے سے حقیقتاً زمین کھسک جائے گی۔نہ آپ کو کاغذ کا ہوش گا نہ ہی قلم کا......بس خود کو ڈوبنے سے بچانا ہوگا اور سمندر کا پانی کوئی ٹھہرا ہوا تو ہوتا نہیں ہے کہ آپ اس میں ناف تک جم کر کھڑے ہو سکیں......تعویذ کیسے لکھیں گے؟''

وہ سوچ میں پڑ گئے''لیکن کتاب میں تو یہی شرط لکھی ہے۔''

''آپ مجھے دکھائیں کہاں لکھا ہوا ہے؟''

''اس جانب سے معذرت قبول کیجیے۔یہ ہمارا خاندانی قلمی نسخہ ہے۔کسی غیر کو دکھانے کی سخت ممانعت ہے۔''

''نقش دکھانے کی ممانعت ہوگی۔نقش نہ دکھائیں۔تحریر دکھا دیں تاکہ میں اس پر کچھ غور کروں کیوں کہ سمندر میں کھڑے ہو کر تعویذ لکھنا قطعی ناممکن ہے۔کسی صورت نہیں لکھا جا سکتا۔''

''معذرت!ہمیں سختی سے حکم ہے کہ یہ کتاب کسی کے سامنے نہ لائیں۔''

کتاب سامنے نہ لائیں اس کے صفحے کی فوٹو کاپی کروالیں۔نقش کا حصہ کاٹ لیں۔مجھے تحریر دکھا دیں کہ کیا لکھا ہوا ہے؟ شاید کوئی ترکیب نکل آئے۔''

''کمال کرتے ہیں آپ بھی۔جب آپ ایسے شخص کو میں وہ کتاب نہیں دکھا سکتا تو اس کی فوٹو کاپی کیسے بنوا سکتا ہوں؟ فوٹوسٹیٹ والا نہیں دیکھ لے گا؟اصل میں ہمیں ہمارے بزرگوں کی جانب سے بڑی سخت تاکید ہے کہ کسی بھی غیر کے سامنے یہ نسخہ نہ لایا جائے۔یہ ہمارے پردادا کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ ہے۔اس کی ایک وجہ جو میں سمجھتا ہوں شاید یہ ہے کہ ان کی تعلیم برائے نام تھی۔اس لحاظ سے ان کی تحریر بھی بہت بھونڈی

ہے، دیکھنے والے پڑھ نہیں سکتے ...... مذاق اڑاتے ہیں۔ ہمارے ابا، ہمارے دادا اسے استعمال کرتے رہے ہیں، لوگ حیران ہوتے ہیں کہ میں تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتا ہوں اور تعویذ لکھتا ہوں؟ کیوں کہ یہ ہمارا خاندانی کام ہے۔ ہم خلق خدا کی خدمت کرتے ہیں۔ لوگوں کو بے وقوف بنا کر رقم نہیں بٹورتے۔''

میں نے کہا'' آپ ایک کام کریں......اس کتاب میں سے وہ عبارت پڑھ کر سنا دیں، یا پھر اس میں سے وہ عبارت لکھ کر مجھے لا دیں۔ کتاب بے شک میرے سامنے نہ کریں۔ میں اس عبارت کو از خود دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''لکھا ہوا تو یہی ہے۔'' وہ بولے'' آپ کہتے ہیں تو میں ایسا کرسکتا ہوں۔ آپ کچھ دیر انتظار کرلیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنے طاقچے میں سے غیر مجلد کاغذات کا ایک پلندہ نکالا۔ اپنے سامنے رکھا۔ ہم دونوں فرش پر بیٹھے تھے۔ میں ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور ہمارے درمیان وہی طاقچہ تھا۔ انہوں نے اس پلندے کی ورق گردانی شروع کی اور ایک صفحہ سامنے کر کے ایک کاغذ پر کچھ لکھنے لگے۔ فارغ ہوئے تو ''قلمی نسخہ'' بند کیا اور کاغذ میرے سامنے کر دیا۔ میں نے پڑھا۔ لکھا تھا۔

اس نقش سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس کی شرائط پوری کرنا لازم ہے۔

سورج گرہن کے وقت سمندر کے پانی میں سمندر کی ریت پر برہنہ حالت میں ناف تک کھڑے ہو کر نقش لکھنا ہے۔ سر پر کسی چیز کا سایہ نہ ہو۔ رجال الغیب پشت پر ہوں۔ نقش تیار کر کے گرہن کے دوران ہی چمڑے میں سی لیں اور اسی دن فوری طور پر یا غروب آفتاب سے قبل مطلوبہ مقام پر زمین میں دفن کر دیں۔ ساری تیاری گہن سے قبل مکمل کرلیں۔

میں نے عبارت کو دوبارہ غور سے پڑھا۔ پھر سہ بارہ پڑھا۔ کچھ سمجھ میں آیا تو مسکرا دیا۔

''آپ کو کبھی موقع ملا ہے ساحل سمندر پر سمندری لہروں سے لطف اندوز ہونے کا؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کبھی آپ ننگے پاؤں سمندر کے کنارے پانی میں کھڑے ہوئے ہیں؟......کیسا لگتا ہے؟......لہریں دور سے آتی ہیں۔ ہمارے پیر کے نیچے ریت ہوتی ہے۔ پانی کی لہر آتی ہے، ہمارے پیروں کے نیچے سے مٹی سرک جاتی ہے۔ لہر کنارے سے سر ٹکرا کر واپس سمندر کی طرف جانے لگتی ہے۔ ایسے میں ایک اور لہر ساحل کے قریب پہنچ جاتی ہے اور جانے والی لہر کو اپنی ساتھ واپس لے کر آ جاتی ہے۔ اس کی طاقت دگنی ہو جاتی ہے۔ پہلی لہر ہماری پنڈلیوں تک ہی رہتی ہے، دوسری لہر ہمارے نصف دھڑ سے بھی اوپر ہو جاتی ہے، تیسری لہر ہمیں اور اوپر اچھال دیتی ہے۔ ہمارے پیر کے نیچے سے زمین نکل جاتی ہے۔ ہم

گرتے گرتے سنبھلتے ہیں جو نہ سنبھل سکے وہ لہروں کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ایسا ہی ہے نا؟‘‘

’’اتفاق ایسا ہے کہ میری زندگی میں کسی قسم کی تفریح نہیں ہے،اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرا بچپن لڑکپن جہاں گزرا ہے وہاں سمندر نہیں تھا۔نہریں اور جھیلیں تھیں۔اب میں اگر سمندر میں کھڑے ہو کر تعویذ لکھوں گا تو یہ پہلا موقع ہوگا۔‘‘

’’پہلی بات یہ ہے کہ آپ سمندر میں کیا کہ سمندر کے کنارے بھی کچھ دیر سکون سے نہیں کھڑے ہو سکتے،لہر آئے گی۔نہیں معلوم کتنی اونچی ہو اور آپ کو کتنا بھگوئے۔آپ کے ہاتھ میں کاغذ قلم ہوگا۔آپ انہیں سنبھالیں گے......خود کو ڈوبنے سے بچائیں گے یا تعویذ لکھیں گے؟اور اس کی شرائط دیکھیں۔اس میں ایک بات ہے برہنہ حالت میں......‘‘ میں ہنسا ’’اب سمندر میں آپ برہنہ حالت میں کیسے کھڑے ہو سکتے ہیں؟ وہ بھی دن دیہاڑے؟......سمندر کی لہر آپ کو اس کی اجازت نہیں دے گی۔دوسری یہ شرط ہے......اس پر غور کریں۔سر پر کسی چیز کا سایہ نہ ہو...... جب آپ سمندر میں کھڑے ہوں گے تو سایہ کسی چیز کا ہو ہی نہیں سکتا۔الا یہ کہ قریب کوئی بحری جہاز لنگر انداز ہو؟......تیسرے یہ رجال الغیب پشت پر ہوں......سمندر میں آپ رجال الغیب کی سمت کا اندازہ کیسے کریں گے؟زمین پر جہاں رہتے ہیں وہاں تو معلوم کر ہی سکتے ہیں۔‘‘

’’آپ رجال الغیب کے بارے میں جانتے ہیں؟‘‘ وہ حیرت سے بولے۔

میں مسکرایا ’’چوتھی شرط یہ کہ گرہن کے دوران ہی تعویذ چمڑے میں سینا ہے۔آپ سمندر میں کھڑے ہو کر نقش لکھ بھی لیں گے۔گھر واپس آتے ہوئے گرہن کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو یہ شرط پوری نہیں کر سکتے۔پھر غروب آفتاب سے پہلے اسی دن اسے مطلوبہ زمین میں دفن کیسے کریں گے؟اتنا وقت ہوگا آپ کے پاس؟سورج گرہن اور غروب آفتاب سے پہلے؟‘‘

وہ سوچتے رہے۔میری باتوں پر غور کرتے رہے۔میں نے کہا ’’اب میں بتاؤں کہ اسے سمجھنے میں آپ سے غلطی کہاں ہوئی ہے؟......اس میں سمندر میں کھڑے ہونے کا ذکر ہی نہیں ہے۔سمندر کے پانی کا ذکر ہے۔‘‘

’’ایک ہی بات ہے نا......سمندر کا پانی سمندر کے علاوہ کہاں ہوگا؟‘‘ وہ ہنسے۔

میں نے ان کی ہنسی نظر انداز کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا ’’کام ہو جائے گا لیکن اس کام میں مشقت اور خرچہ بہت ہوگا۔‘‘

’’خرچے کی مجھے فکر نہیں ہے۔سائل کا کہنا ہے کہ جتنی رقم چاہیے ہوگی وہ دے دے گا۔‘‘

’’یہ بات نہیں ہے۔وہ دے بھی دے گا لیکن اسے اس مشقت کا اندازہ پھر بھی نہیں ہوگا جو آپ

اٹھائیں گے۔ وہ چونکہ رقم خرچ کرے گا اس لیے کہہ سکتا ہے کہ اس نے اتنی رقم دی ہے۔ ایک تعویذ کے لیے۔ کیونکہ رقم کے بدلے اسے کاغذ کا ایک ٹکرا ہی تو آپ دیں گے؟''

''پھر کیا کیا جائے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اس عمل میں عناصر اربع شامل ہیں۔

آبی، بادی، خاکی، اور آتشی، پیر کے نیچے مٹی، سر پر سورج، آدھا دھڑ پانی میں، آدھا ہوا میں۔ سورج چاند کا اجتماع۔ مجھے یہ زمین سے کسی کا قبضہ چھڑانے کا یا زمین کے حصول کا معاملہ لگتا ہے۔''

''جی ہاں! کچھ ایسا ہی ہے۔'' وہ مسکرائے ''میں چاہتا تھا کہ یہ ساری باتیں آپ کو بعد میں بتادوں گا لیکن آپ میری توقع سے زیادہ باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ خود ہی سمجھ گئے۔''

میں نے کہا ''بہتر ہوگا کہ مجھے اس زمین کے متعلق کچھ بتائیں جہاں تعویذ دفن کرنا ہے؟ وہ زمین شہر میں ہے؟ گاؤں میں ہے؟ زرعی ہے، رہائشی ہے؟ تاکہ جو منصوبہ میرے ذہن میں آیا ہے اس پر عمل کا امکان جانچا جائے۔''

''ٹھیک ہے میں آپ کو پوری بات بتاتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرا ایک بہت ہی عزیز دوست اپنے دوست یوسف کو میرے پاس لایا۔ یہ پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہن بھائی چھوٹے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی بہت ساری زرعی زمین ہے، ان کے چچا نے ان کی زمین بھی سنبھال لی جب کہ ساتھ ہی چچا کی اپنی زمین بھی تھی۔ اس نے ان بہن بھائیوں کی بڑی اچھی تربیت کی، انہیں پڑھایا لکھایا ان کے تمام اخراجات پورے کیے، ان کی تمام فرمائشیں پوری کیں۔ کسی چیز سے محروم نہیں رکھا۔ غرض انہیں کسی قسم کی کمی نہ ہونے دی۔ پھر یہ سب بہن بھائی بالغ ہوگئے۔ اب حق یہ تھا کہ ان کا چچا ان کی زمین کا حساب کتاب ان کے حوالے کردیتا لیکن ہوا یہ کہ اس نے اب تک ان سب یتیموں کا حق دبایا ہوا ہے۔ زبان سے کہتا رہتا ہے کہ جائیداد ساری ان کی ہے۔ یہ ہی اس کے مالک ومختار ہیں، میں تو صرف متولی ہوں، ذرا یہ سمجھ دار ہوجائیں تو ان کے حوالے کردوں، لیکن حال یہ کہ سب بہن بھائیوں کی شادیاں بھی ہوچکی ہیں بال بچے دار ہوگئے لیکن اپنے چچا کی نظر میں وہ اب تک سمجھ دار نہیں ہوئے؟ ان کی ماں بھی سمجھتی ہے کہ زمینوں کا نظام اس کا دیور سنبھال رہا ہے تو ٹھیک ہی کررہا ہے۔ بچے ہیں...... بیچ کر کھا جائیں گے۔ باپ دادا کی زمین ہے۔ چچا ہی نے انہیں پالا ہے وہ ان کے حق میں بہتر سمجھتا ہے۔ ان کی ماں انہیں قانونی کارروائی سے باز رکھتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ بچوں کو ہی ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کروادیتی ہے کہ چچا تمہارے بزرگ ہیں انہوں نے اس وقت تمہارے سر پر ہاتھ رکھا جب تم کسی قابل نہیں تھے، وغیرہ۔ اب اصل وارث اپنے چچا کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، قانون کی مدد نہیں لے سکتے۔ ان کا چچا ہر کسی کے سامنے

بار ہا اقرار کر چکا ہے کہ میں تو صرف ان کی جائیداد کا نگراں ہوں، ذرا سمجھدار ہو جائیں، ذمہ داری کو سمجھ سکیں تو ان کے حوالے کر دوں گا۔

''یوسف بتا رہا ہے کہ بظاہر چچا کی سرپرستی میں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن ان بہن بھائیوں پر دو بار قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔ حملہ آور اس وقت حملہ کرتے ہیں جب یہ تینوں بہن بھائی اکٹھے کہیں جا رہے ہوں۔ حملہ آور گرچہ سارے ان کے لیے اجنبی ہوتے ہیں لیکن ان کا شک اپنے چچا ہی پر جاتا ہے جب کہ ان کی ماں نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے کہ چچا نے تمہیں قتل کرنا ہوتا تو تمہیں کمسنی میں ہی مار دیتا۔ پال پوس کر جوان کر کے شادیاں کروا کے اب تمہیں قتل کیوں کروائے گا؟ خبردار! ان کا نام بھی بدتمیزی سے نہ لینا۔

''اس لیے وہ میرے پاس آیا ہے کہ ان کا مسئلہ بغیر لڑائی بھڑائی کے حل ہو جائے۔ ہمارے بزرگوں کا ایسا عمل ہے کہ ان کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے لیے سورج گرہن کے وقت تعویذ تیار کرنا ہے۔'' اور سمندر میں کھڑے ہو کر......

''یہ ہوئی نا بات!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''بس سمجھیں کہ تینوں کا مسئلہ حل ہو گیا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوئے۔ ''تینوں کا کیسے؟''

''میرا مطلب ہے جو کچھ میں سوچ رہا تھا۔ میرا وہ مسئلہ بھی حل ہو گیا...... جو ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے آپ کے لیے اس پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ بہتر ہو گا کہ یہ سارا کام یوسف ہی سے کروائیں تا کہ اسے اندازہ ہو کہ محض ایک تعویذ لکھنے میں کتنی مشقت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ زمین یوسف کی اپنی ہے۔ اس کے لیے سارا کام آسان ہو جائے گا۔ آپ یوں کیجیے۔ یوسف سے کہیں کہ سب سے پہلے تو تعویذ دفن کرنے کی جگہ کا انتخاب کرے اور اس کے قریب ہی کسی ایسی وسیع جگہ کا انتظام کرے جہاں بندہ برہنہ حالت میں تعویذ لکھ سکے کیوں کہ تازہ ترین تعویذ کے دفن ہونے سے ہی زیادہ اثر ہو گا۔ ساتھ ہی دیگر شرائط بھی بتائیں کہ کھلی جگہ ہو، سر پر کسی چیز کا سایہ نہ ہو، ہوادار جگہ ہو، سورج کی روشنی بآسانی پہنچ سکے۔ یہ سب اسی کے ذمہ لگا دیں۔ سمندر کا پانی اور سمندر کی ریت بھی اسی سے منگوائیں تا کہ اسے پتہ چلے کہ سمندر کا پانی لانے پر کیا اخراجات ہوتے ہیں؟''

''میں سمجھا نہیں، سمندر کا پانی کیسے لایا جائے گا۔''

''دیکھیے! سب سے پہلے تو یوسف سے کہیں کہ وہ ایسی جگہ کا بندوبست کرے جہاں کوئی برہنہ حالت میں ہو تو اس کے قریب کوئی اسے دیکھنے والا نہ ہو۔ اس کے سر پر سایہ نہ ہو۔ یعنی کھلی جگہ بھی ہو اور تنہائی بھی میسر ہو، اگر جگہ زمین پر ہے تو بہت اچھے وگرنہ کسی بھی عمارت کی چھت مناسب رہے گی۔ اس جگہ ایک بڑا

ڈرم پہنچا دیں جس کا منہ اتنا کھلا ہو کہ اس میں ایک آدمی آسانی سے اتر سکے۔ اس ڈرم میں یوسف کو اتار کر اتنا پانی ڈالیں کہ اس کی ناف تک پانی پہنچ جائے۔ ایک تو ڈرم کے اندر اترنے اور نکلنے کی مشق ہو جائے گی، دوسرا ماپ کا اندازہ ہو جائے گا کہ پانی کتنا چاہیے؟ اگر چار ڈولوں میں پانی سماتا ہے تو سمندر سے پانچ ڈول پانی بھر کر منگوالیں۔ ایک ڈول سمندری ریتی بھی منگوالیں۔ اس کے لیے گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔ گاڑی کا، سمندری ریت کا، سمندر کے پانی کا یوسف خود انتظام کرے گا۔ اس سے کہیں پانی سمندر کے کنارے سے نہ لے، قدرے اندر جا کر لینا پڑے گا کہ ساحل پر پانی صاف نہیں رہتا آلائشیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس کے لیے کشتی کا انتظام کرنا ہوگا۔ جو وہ خود کرے گا۔ میرا خیال ہے یہ آتشی چال کا تعویذ ہوگا۔ اس کے لیے سرکنڈے کا قلم لینا پڑے گا۔ بہتر ہوگا کہ جو نقش لکھنا ہے وہ بھی یوسف ہی کے ہاتھوں لکھوائیں۔ وقت سے پہلے یوسف کو نقش کی چال کے مطابق خوب مشق کروالیں تا کہ وقت پر اسے سمجھانا نہ پڑے۔

”گرہن سے ایک دو دن پہلے سارا انتظام کروالیں۔ ڈرم میں پانی ڈال لیں۔ نقش کے سارے لوازمات تیار کر لیں۔ رجال الغیب کی سمت کا پتہ چلالیں۔ ڈرم میں مٹی ڈالیں تا کہ اس کی تہہ جم جائے۔ پھر ماپ کے مطابق سمندر کا پانی ڈال دیں۔ سورج گرہن سے دس منٹ پہلے یوسف سے کہیں کہ لنگوٹ باندھ کر وہ اس پانی میں اتر جائے۔ پانی اس کی ناف سے نیچے ہو تو اور ڈال دیں۔ زیادہ ہو تو کم کر لیں۔ ڈرم کے اوپر ایک تختہ رکھ لے تا کہ وہ میز کا کام دے۔ گرہن شروع ہو تو لنگوٹ کھول کر برہنہ حالت میں نقش لکھ لے۔ اس طرح وہ برہنہ حالت میں بھی ہوگا اور ڈرم کے اندر پانی میں، پردے میں بھی ہوگا۔ نقش تیار کر کے پانی کے اندر ہی لنگوٹ باندھ کر وہ ڈرم سے باہر نکل آئے اور بلا تاخیر نقش کو منتخب زمین میں دفن کر دے۔ آپ نقش اپنی نگرانی میں تیار کروائیں۔ وہ خود محنت کرے گا تو اسے احساس ہوگا کہ یہ کس قدر مشقت طلب کام ہے۔ یونہی کاغذ پر لکیریں نہیں لگائی جاتیں۔“

”ترکیب تو بڑی زبردست بتائی ہے آپ نے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ کیوں کہ ڈرم میں اترنا اور اس سے نکلنا میرے بس سے باہر ہوگا۔“ وہ مسکرائے۔ کیا ہوا...... کیا نہیں؟ روزمرہ مصروفیت میں نہ میں نے اس جانب توجہ کی نہ ہی مجھے اس کی ضرورت ہی تھی۔

عیدالاضحیٰ کا تیسرا دن تھا۔ گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ ریاض آ گیا۔ ”یار! کیا کر رہا ہے؟ آ چل...... پیر صاحب نے بلایا ہے۔“

”کس نے بلایا ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”بھول گیا؟...... یار! وہ تو تجھے بہت یاد کرتا ہے جب بھی جاتا ہوں تو تیرا بہت پوچھتا ہے اور تو اسے بھولے بیٹھا ہے۔“

''اچھا چھا۔ مجھے یاد آ گیا۔لیکن میں آج تو نہیں جا سکتا۔گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں اور مجھ ہی سے ملنے آئے ہیں۔اب انہیں گھر میں چھوڑ کر میں گھر سے نکل جاؤں؟''

''میں کل گیا تھا عید ملنے۔وہ دو مہینے کے لیے پنجاب جا رہا ہے۔اسے پتہ ہے کہ تو آج کل مل سکتا ہے اس لیے اس نے آج ہی بلایا ہے۔''

''دو مہینے بعد سہی۔مناسب نہیں لگتا کہ گھر میں مہمان آئے ہوں اور میں گھر میں موجود نہ ہوں۔''

''ایک گھنٹے کی تو بات ہے یار!اتنا تیری قدر کرتا ہے۔اتنا یاد کرتا ہے،اس کی لگن بھی تو دیکھ!'' وہ بولا ''چل میں تجھے حیران کر دوں گا۔تجھے ساتھ لے کر جاتا ہوں اور ایک گھنٹے میں واپس لے آؤں گا۔چل آ جا۔''

میں نے گھر میں بتا دیا کہ ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں ایک گھنٹے تک واپس آؤں گا۔پھر ریاض کے ساتھ چل دیا۔پیر صاحب کا آستانہ یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔کچی آبادی کے ایک محلے میں مکان کی جگہ تین منزلہ فلیٹ بن گیا تھا۔سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا۔عمارت سے تازہ تازہ رنگ کی مہک آ رہی تھی۔آٹھ ستونوں پر مشتمل ایک بڑا سا برآمدہ تھا جس میں دیوار کے ساتھ ساتھ نشست کا انتظام تھا اور ساتھ ہی مستورات کے لیے علیحدہ انتظام تھا۔اس وقت ان کے پاس ان کے کچھ عقیدت منداور چند عزیز بیٹھے تھے۔جو ان سے عید ملنے آئے ہوئے تھے۔

ہم داخل ہوئے تو پیر صاحب کھڑے ہو کر بڑے تپاک سے ملے اور اپنے قریب ہی جگہ دے کر مجھے بٹھا لیا۔یہ تبدیلی دیکھ کر میں واقعی حیران ہو رہا تھا۔بالآخر پوچھ ہی لیا ''یہ سب کیا ہے؟ یہ کب بنا؟''

''ابھی بنا ہے......عید سے چار دن پہلے ہی یہاں آئے ہیں۔''

''جگہ اچھی بن گئی ہے۔اب تو کرایہ بھی زیادہ ہو گیا ہوگا؟'' میں نے خیال آرائی کی۔

اچانک ریاض ہنس پڑا۔میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''اوہ بھائی!میں نے کہا تھا نا کہ تجھے حیران کر دوں گا،اب سنتا جا اور حیران ہوتا جا۔''

میں نے باری باری پیر صاحب کو،ریاض کو اور دوسرے لوگوں کو دیکھا جو میری بے خبری سے محظوظ ہو رہے تھے۔اس آستانے میں چونکہ میری آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔اس لیے خادم خاص کے علاوہ تقریباً سب ہی میرے لیے اجنبی تھے اور ان سب کے لیے میں نیا تھا۔

''یہ جگہ پیر صاحب نے اپنی مرضی سے بنوائی ہے۔'' ریاض بولا ''تعمیر کے دوران یہ خود ایک چھوٹے سے کمرے میں عارضی طور پر رہتے تھے۔یہی سب کچھ دکھانے کے لیے انہوں نے تجھے بلایا ہے۔''

اب میں نے پھر چاروں طرف طائرانہ نظر دوڑائی۔ریاض بولا ''تیرے سے کہتا ہوں تو بھی یہ کام شروع کر دے،پیر صاحب نے ایک ہی تعویذ لکھا ہے بندے کو کئی مربع زمین مل گئی ہے۔اس نے پیر صاحب

کے مالک مکان سے سودا کر کے اسے منہ مانگی قیمت دی ہے اور یہ جگہ خرید کر تین منزلہ بلڈنگ بنا کر پیر صاحب کو دے دی ہے۔ یہ مکان اب ان کا اپنا ہے۔ کچھ دنوں میں اوپر کی تین منزلیں کرائے پر اٹھا دیں گے۔ سمجھو پہلے کرایہ دیتے تھے اب لیا کریں گے......'' وہ معنی خیز مسکرایا۔ ریاض کی باتیں میں سنتا رہا اور 'حیران' ہوتا رہا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے تحریک دی۔ ''مذاق نہیں کر رہا......تو کچھ دن پیر صاحب کے ساتھ رہ لے یہ کام سیکھ لے گا۔''

پیر صاحب ہنسے ''انیس صاحب! یہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ بھی تعویذات کا کام شروع کر دیں۔''

''بھئی میرے پاس وقت اتنا نہیں ہے۔ ہاں! ریاض چاہے تو کر سکتا ہے۔ کیا ہے؟ لکیریں لگا کر کچھ ہندسے ہی تو لکھنے ہوتے ہیں۔ یہ لکھ سکتا ہے۔'' پیر صاحب اور ان کے عزیز زیر لب مسکراتے رہے۔ وہ پھر بولے ''دراصل ہمارے ایک دوست کی زمین پر اس کے چچا نے قبضہ کر رکھا تھا وہ بھی چچا پر دعویٰ نہ کر سکتے کہ وہ ان کے سرپرست بنے ہوئے تھے۔ میرے پاس آئے تو انہیں میں نے نقش بنا کر دیا تو دو دن میں ہی ان کے چچا نے ساری زمین بلا چوں و چرا ان بھتیجوں کے حوالے کر دی۔ نہ کوئی عدالت لگی نہ جرگہ ہوا بس خود ہی ان کے حوالے کر دی۔ اس نے خوش ہو کر مجھے یہ مکان خرید کر بنوا کر دیا ہے، میں نہ ہی نہ کرتا رہا چونکہ میں نے اسی کے ہاتھ سے تعویذ لکھوایا تھا، اسے پتہ چل گیا تھا کہ دو انچ کے کاغذ پر یونہی لکیریں نہیں لگائی جاتیں۔ بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ میں بتا رہا تھا کہ اس کے چچا نے دو تین بار ان بھائیوں پر قاتلانہ حملہ بھی کروایا ہے لیکن ناکام رہا جب اس سے اس کا ذکر ہوا تو صاف مکر گیا کہ میں کیوں اپنے بھتیجوں کو قتل کرواؤں گا؟

''جس دن میں نے ان کا تعویذ بنایا اس سے ایک دن پہلے ہی ایک تیز رفتار گاڑی نے ان کی گاڑی کو ٹکر ماری تھی۔ اس گاڑی میں یہ دونوں بھائی سفر کر رہے تھے۔ ساتھ ان کا ڈرائیور بھی تھا۔ گاڑی اچھل کر نہر میں جا گری۔ اتفاق تھا کہ کسی کو کوئی چوٹ نہ آئی۔ گاڑی سمیت سب بھیگ گئے۔ پانی میں سے نکل آئے۔ سب نے شکر ادا کیا کہ وہ بچ گئے۔

''اس پر ان کے گاؤں والوں نے ان کے چچا پر ہی شک ظاہر کیا کہ یہ اسی کا کام ہے۔ اس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے دوسرے دن ہی عدالت جا کر ساری جائیداد ان بہن بھائیوں میں تقسیم کروا دی۔ میری دھاک بیٹھ گئی کہ ایک دن تعویذ لکھا اور دوسرے دن انہیں جائیداد مل گئی۔''

''بچو!......بات مان لے......تو بھی شروع کر دے یہ تعویذ کا کام۔'' ریاض پھر بولا۔

پیر صاحب مسکراتے رہے۔ ہم نے اجازت چاہی کہ میرے گھر میں بھی میرے مہمان بیٹھے تھے۔

◀◀ ● ▶▶

Aimunn Library, Parsi Gate
Chanesar Goth Karachi Pakistan

● ریحان کوثر

ریختہ

’’آیئے سر......!‘‘ مرلی نے صدر دروازہ کھولتے ہوئے انسپکٹر سے کہا۔
’’ڈیوٹی پر چار کانسٹیبل تھے نا؟"انسپکٹر نے پان کی پیک تھوکتے ہوئے پوچھا اور اندر داخل ہو گیا۔
’’ہاں ساب......وہ کملیش کچھ لانے گیا ہے۔‘‘
انسپکٹر نے ایک سرسری نگاہ کمرے میں دوڑائی۔
’’میڈیا والوں نے کل بہت پریشان کیا!‘‘ مرلی نے ہاں میں ہاں ملائی،
’’ہاں ساب......ویسے آج ابھی تک تو کوئی آیا نہیں......ایک بات پوچھوں سر؟‘‘
’’ہاں‘‘
’’یہاں کل جو مرا وہ کون تھا؟‘‘
’’اسی بات کی تفتیش کے لیے تو ہم آئے ہیں۔ مکان برسوں سے بند پڑا ہے۔ مکان مالک کینیڈا میں رہتا ہے۔ عرصے سے یہاں کوئی دکھائی نہیں دیا! بس اتنا ہی معلوم ہے......دیکھتے ہیں اور کیا ملتا ہے۔‘‘
انسپکٹر نے میز پر رکھا چائے کا گلاس اٹھایا اور ایک پالی تھن میں ڈال کر بیگ میں رکھ لیا۔
’’وہ دیکھو صاحب وہاں کچھ ہے!‘‘
’’کہاں؟‘‘
’’اجی وہاں دیکھیں شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ لگتا ہے صاحب وہ کوئی بیوڑا تھا......شراب پی پی کر مر گیا۔‘‘
’’نہیں......امپوسیبل ...... پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوئی ہے کہ مرنے والے نے شراب پی تھی۔‘‘
’’ہمم ......‘‘ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مرلی پھر اچانک بول پڑا۔
’’لیکن صاحب وہ اس مکان کا مالک نہیں تھا تو یہاں آیا کیسے؟‘‘
’’مرلی......یہ دیکھو پچھلے دروازے کی کانچ ٹوٹی ہوئی ہے شاید یہیں سے وہ داخل ہوا ہو۔‘‘

''ہاں صاحب، صحیح کہا آپ نے ، مجھے لگتا ہے وہ چور تھا کوئی !! کوئی شاطر چور......!''

''نہیں چور بھی نہیں تھا کیونکہ یہاں ایسا کچھ ہے ہی نہیں جسے چرایا جا سکے۔ ویسے بھی اسے مرے ہوئے تین دن سے زیادہ ہو گئے تھے۔ پڑوسیوں نے بدبو کے سبب پولیس کو اطلاع دی تب پتہ چلا کہ یہاں کسی کی موت ہوئی ہے۔''

''ہمم، تو یہ بات ہے۔''

''مرلی ذرا نیچے دیکھو وہاں پلنگ کے نیچے کچھ نظر آ رہا ہے۔ شاید کوئی تھیلی ہے۔''

''صاحب یہ تھیلی نہیں تھیلا ہے! شاید اسی کا ہو؟''

''ہاں! ہاں! تھیلی تھیلا جو بھی ہے نکالو اور کھولو۔ دیکھیں کیا ہے اس میں؟ شاید کچھ پتہ چلے!''

''ارے......! صاحب اس میں تو بہت سارے ٹوٹے ہوئے آئینے ہیں......ارے ہاں! اس میں ایک نوٹ بک بھی ہے۔''

''ہاں نکالو اسے باہر اور یہ تھیلا لے کر چلو پولس اسٹیشن!''

''صاحب جی اس نوٹ بک میں کیا ہے؟ شاید یہ اسی کی ہے جو مرا تھا!''

''لیکن مرلی! اس میں تو اردو میں لکھا ہوا ہے!''

''جی صاحب جی! پڑھ کر سنائیں کیا لکھا ہے ویسے بھی آپ بڑی کھوب اردو بولتے ہیں!''

''کھوب نہیں خوب! اور ہاں میں صرف بولتا ہوں! پڑھنا مجھے بھی نہیں آتا......اسے اور باقی تمام چیزوں کو پولس اسٹیشن لے کر چلو! آج امن کمیٹی کی میٹنگ بھی ہے کافی سارے اردو جاننے والے وہاں مل جائیں گے۔ وہاں کسی سے پڑھوا لیں گے......!'' دونوں پولیس اسٹیشن پہنچے تو دیکھا کافی لوگوں کی بھیڑ جمع ہے۔ پولیس اسٹیشن میں امن کمیٹی کی میٹنگ کے پہلے یہ لوگ جامع مسجد کے امام صاحب کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ انسپکٹر بنسل نے وہیں پر کھڑے ایک شخص سے دریافت کیا تو وہ کہنے لگا۔

''میں؟ جی میں امام صاحب کا ڈرائیور ہوں۔ ان کے فون کا منتظر ہوں۔ امام صاحب کے فون آنے پر انھیں لانے جانا ہے۔''

مرلی نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے اردو پڑھنا آتا ہے؟ جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا، انسپکٹر بنسل اس ڈرائیور کو اپنے کیبن میں لے آیا اور نوٹ بک تھما کر کہا۔

''اس میں جو کچھ بھی لکھا ہے ہمیں پڑھ کر سناؤ!''

ڈرائیور نے نوٹ بک کے صفحات پر سرسری نگاہ ڈالی اور کہنے لگا۔

''لیکن سر! مجھے تو امام صاحب کو لانے جانا ہے۔''

مرلی نے پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ان کے فون آنے تک پڑھو! فون آتے ہی چلے جانا۔''

ڈرائیور نے بآواز بلند پڑھنا شروع کیا۔

''اسلام پور کی ٹرین آخر میں نے کسی طرح پکڑ ہی لی۔ ٹرین میں اپنی سیٹ نمبر ۲۴ پر بیٹھ گیا۔ میں نے بیگ کو نیچے کھسکا دیا اور جیسے ہی گردن اوپر کی ایک صاحب سامنے وارد ہوئے۔ اپنے ماتھے کا پسینہ رومال سے پوچھ رہے تھے۔ ان کے ماتھے پر سجدے کا نشان بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی سانسیں بھی قدرے پھول رہی تھیں۔ شاید وہ بھی دوڑ بھاگ کے ٹرین میں چڑھ پائے تھے، بس فرق یہ تھا کہ میں سیٹ نمبر ا سے اور وہ سیٹ نمبر ۲۷ کی جانب سے اس طرف چلے آئے تھے۔ رومال اپنے کاندھے پر رکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

''السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، جناب!!''

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ صاحب مجھے سلام کیوں ٹھوک رہے ہیں؟ میں نے پوچھا،

''جی بولیں کیا بات ہے؟''

''آپ شاید میری سیٹ پر براجمان ہیں!'' انھوں نے اپنا بیگ نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

''جی میری سیٹ نمبر ۲۴ ہے اور میں بالکل صحیح سیٹ پر بیٹھا ہوں!''

''جی نہیں! محترم آپ ۲۶ پر بیٹھے ہیں، آپ کی ۲۴ نمبر سیٹ وہ رہی بازو والے کمپارٹمنٹ کی سائیڈ والی سیٹ!'' میں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا ۲۶ نمبر لکھا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے معذرت کا اظہار کیا اور اپنی اصل سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ جب سانسوں کے ساتھ میرے ہوش وحواس بحال ہوئے تو میں نے ایک بڑی عجیب بات محسوس کی۔ اس بوگی میں سارے لوگ شکل وصورت، حرکات وسکنات اور لباس سے مسلمان ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے دوسری طرف گھوم کر نظریں دوڑائیں، اس جانب بھی سارے مسافر مسلم ہی تھے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ تھی کہ کوئی کسی کو نہ تو دیکھ رہا تھا اور نہ ہی وہ ایک دوسرے سے کچھ باتیں ہی کر رہے تھے۔ پوری ۲۷ سیٹیں سنگل ریزرویشن سیٹ معلوم ہو رہی تھی۔ بوگی میں موجود تمام مسافر کھڑکی کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ اس پر حیرت یہ کہ تمام کھڑکیاں پردوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس دیکھنے دکھانے اور تمام تر مشاہدات کے دوران ٹی سی ہمارے کمپارٹمنٹ میں آیا اور حاضری شروع ہوئی۔

سترہ، اٹھرہ، انیس، بیس، اکیس، بائیس، تئیس اور چوبیس۔ چوبیس نمبر پر میں نے اپنا پورا نام پریاگ راج بتا دیا۔ وہ مجھ سے پہلے تک سارے لوگوں کے نام پر بغیر نظریں اٹھائے اور بغیر کسی کا آئی کارڈ

چیک کیے اپنے ہاتھ کے کاغذ پر صرف نام کی تصدیق پر ٹک کرتا گیا۔ جبکہ ایسا اتفاق بہت کم ہوتا ہے۔ وہ مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ناک کی نوک پر لگے چشمے کے اوپر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

''جی......اور......میں شاہ رخ خان! دیجیے اپنا کوئی آئی کارڈ دیجیے۔''

یہ جواب مجھے تمسخر اڑاتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے جینس پینٹ کی پچھلی جیب سے پین کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔ اس نے جھٹکے سے میرا پین کارڈ دیکھا اور واپس کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''بیٹا سرکاری ملازمین سے اس طرح مسخرہ پن ٹھیک نہیں......! کبھی کبھی بھاری پڑ سکتا ہے۔''

ایسی ذلت آمیز گفتگو سے زیادہ مجھے اس کی چشمے کے اوپر سے جھانکتی ہوئی آنکھوں پر غصہ آ رہا تھا۔ دل کر رہا تھا کہ دو انگلیاں اس کی آنکھوں میں ڈال کر پھوڑ دوں۔ کاغذ پر ٹک کرنے کے بعد ٹی سی نے اتنے ہی جھٹکے سے میرے طرف آئی کارڈ بڑھایا جتنے جھٹکے سے لیا تھا۔ میں پین کارڈ کو شرٹ کی جیب میں رکھ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ جیب سے موبائل نکال کر دیکھا تو اس کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی یعنی اس کی چارجنگ پوری طرح اتر چکی تھی۔ پھر بھی بند موبائل پر انگلیاں پھیرتا رہا۔ میں نے کنکھیوں سے جب اپنے اطراف دیکھا تو مجھے اپنی یہ بے عزتی ذرا کم محسوس ہوئی۔ کیوں کہ آس پاس کے سارے ہی لوگ ہم دونوں کو نہیں بلکہ کھڑکی کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ ہماری باتوں پر کسی نے کوئی منفی یا مثبت تاثر نہیں دیا۔

کچھ دیر ایسے ہی بیٹھے ہوئے گزر گئے۔ اسلام پور آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے دس بجنے کو تھے۔ میں نے فریش ہونے کے لیے ٹوائلیٹ کا رخ کیا۔ پیشاب کے بعد پانی کا استعمال کیا اور کھڑے ہو کر جب جینس کی چین لگانے لگا تو بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا کہ۔

''ارے یہ کیا............؟ یا اللہ میں مسلمان ہوں؟''

سیکنڈ کے دسویں حصے میں فلیش بیک نظر آیا؟ یہ میں مسلمانوں کے طریقے سے استنجا کیوں کر رہا ہوں؟ ارے ہاں اسے استنجا ہی کہتے ہیں۔ لیکن میں تو راج ہوں ایک پراوڈ ہندو، میں ابھی ابھی بیٹھا تھا! یعنی میں بیٹھ کر اٹھا تھا؟ اور میں یا اللہ بھی بول رہا ہوں؟ کیا میں مسلمان ہوں؟

میں نے فوراً وہاں لگے آئینے کی طرف پلٹ کر دیکھا، لیکن یہ کیا؟ یہاں تو آئینہ تھا ہی نہیں! یہاں پر آئینے کی جگہ عجیب سی تصویر تھی! دھندلی سی تصویر! جس میں دعا کے لئے اٹھائے گئے ہاتھوں کے سوا باقی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا! ہاں ایک ہاتھ پر تسبیح لپٹی ہوئی تھی۔ آڑی ترچھی لکیریں اور ایک بڑا سا ڈریگن تھا۔ میں نے فوراً اپنا پین کارڈ نکالا، دیکھا اور حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس میں تو میرا نام مسلم خان لکھا تھا، کیا میں مسلمان ہوں! مطلب میں یہی ہوں جو اس پین کارڈ میں نظر آ رہا ہے۔ لیکن میری تو اینگری ہنومان کے

جیسے داڑھی تھی اس میں یہ کیسی داڑھی ہے؟ یہ داڑھی تو مسلمانوں جیسی ہے! تو کیا میں مسلمان ہوں؟

میں فوراً ٹوئلیٹ سے باہر آیا۔ واش بیسن کے پاس لگے آئینے پر نگاہ ڈالی لیکن یہ کیا!؟ یہاں تو سیریا اور عراق کے جنگ سے بدحال مسلمانوں کی تصویر ہے۔ تصویر ایسی تھی کہ میرا دل بھر آیا۔ میں جلدی سے دوسری طرف کے واش بیسن کی جانب دوڑا لیکن وہاں بھی مایوسی ہاتھ لگی۔ وہاں روہنگیا مسلمانوں کی تصویر چسپاں تھی۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں بھاگتا ہوا آیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ کمپارٹمنٹ کی سیٹوں کے درمیان بھی ایک آئینہ ہوتا ہے۔ میں فوراً اس کے سامنے کھڑا ہو گیا یہاں فلسطین کے مسلمانوں کی تصویر تھی۔ اب میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے رونے سے وہاں کسی کا کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ میں اپنے چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگا کہ سارے مسافر اپنی اپنی برتھ پر سو رہے ہیں اور سارے یکساں طور پر سفید چادر میں لپٹے نظر آ رہے ہیں۔ مجھ میں ایک عجیب جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ہمت کر کے اپنے سامنے والی برتھ پر لیٹے ہوئے مسافر کو دیکھنے کے لیے چادر سرکائی لیکن یہاں چہرہ نہیں بلکہ اس کے پیر تھے۔ پھر ہمت جٹا کر آگے بڑھا اور دوسرے طرف کی چادر سرکائی تو حیران ہو کر پیچھے ہٹ گیا، یہ کیا!؟ یہاں بھی پیر ہی تھے! دونوں طرف پیر! یہ کیا ماجرا ہے؟ دونوں طرف پیر؟ تو سر کہاں ہے؟ منہ کہاں ہے؟ دومنہ تو سنا تھا لیکن یہ دونوں طرف پیر کیسے؟

اچانک ایک جھٹکے سے ٹرین رکی، شاید میرا اسٹیشن اسلام پور آ گیا تھا۔ میں بیگ اٹھایا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ دروازے سے دیکھا تو پلیٹ فارم بالکل خالی تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد! یہ تھا تو اسلام پور ہی لیکن کہیں کوئی بورڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس جانب زیادہ توجہ نہیں دی۔ دراصل میں جلد از جلد اس ویران اسٹیشن سے باہر آنا چاہتا تھا اور جلدی جلدی ریلوے اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ پلیٹ فارم پر تو کوئی نہیں تھا لیکن اس گہری کالی رات میں اسٹیشن کے باہر بہت سی لڑکیاں سبز رنگ کی یکساں فراک، جس پر چاند ستارے بنے ہوئے تھے اور سفید شلوار سفید دوپٹے میں ملبوس دف بجا کر کچھ پڑھ رہی تھیں۔ شاید کسی کے استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا وہ۔

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ایک خوبصورت ترنم میں گا رہی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے میں ان کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ ''چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا۔ ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' گا رہی تھی۔ کیا خوبصورت ترنم، کیا میٹھی آوازیں، کیا جوش، کیا خلوص...... میں کچھ دیر وہیں کھڑا پوری نظم سننے میں محو تھا۔ میں نے وقت دیکھا، پتہ نہیں وقت کتنا ہوا تھا گھڑی بند تھی۔ جیب سے موبائل نکالا تو یاد آیا کہ اس کی تو چارجنگ پوری طرح اتر چکی ہے۔ میرے موبائل سے نظریں اٹھانے تک وہ لڑکیاں آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔''

یہاں تک پڑھ کر ڈرائیور اچانک رک گیا۔ مرلی اور انسپکٹر بنسل دونوں ایک ساتھ بول

پڑے، ''آگے کیا ہوا؟''

انسپکٹر بنسل نے آگے کہا، ''پڑھو جلدی آگے!''

ڈرائیور نے جہاں تک پڑھا تھا وہاں اپنی شہادت والی انگلی رکھ کر نوٹ بک بند کر دی اور کہنے لگا، ''سر پیش امام صاحب کو لانے جانا ہے!''

مرلی نے بے صبری سے کہا، ''تم پڑھو میاں! جب فون آئے تو چلے جانا! پڑھو! پڑھو!'' ڈرائیور نے نوٹ بک کھولی اور ورق پلٹ کر آگے پڑھنا شروع کیا۔

''میں چلتا رہا چلتا رہا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ یہ اسلام پور نہیں۔ یہ تو کوئی اور ہی مقام ہے۔ یہاں پر نصب تمام سائن بورڈ اور تحاریر پڑھنا میرے لیے ناممکن تھا۔ کیوں کہ وہ بڑی عجیب لکھاوٹ تھی۔ میں چلتا ہوا ایک چوراہے پر کھڑا ہو گیا۔ عجیب کالی گہری رات تھی۔ وقت کا اندازہ لگانا بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں وہیں فٹ پاتھ پر لگے ہوئے ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے پیر سیدھے کیے اور میری آنکھ کب لگ گئی پتہ ہی نہیں چلا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو سامنے ایک بزرگ شخص زمین پر گرا ہوا اپنا چشمہ ڈھونڈ رہا تھا۔ ڈھونڈنے کا کام تو تیز آنکھوں والے کیا کرتے ہیں وہ بے چارا تو اپنی آنکھوں کی دھندلی نظروں کے سہارے ٹٹول رہا تھا۔ چشمہ میرے پیروں کے قریب ہی تھا۔ اس کا ہاتھ بار بار چشمے کے قریب پہنچ کر دور چلا جاتا۔ مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے چشمہ اٹھا کر انھیں تھما دیا۔ انھوں نے مجھ سے کچھ کہا لیکن ان کی زبان مجھے بالکل سمجھ نہ آئی۔ ہاں لیکن! انھوں نے اللہ اللہ کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو دعا کی طرز پر اٹھا دیا۔ اس شخص کے ہتھیلی پر ایک تسبیح لپٹی ہوئی تھی۔ مجھے اچانک ٹرین کی وہ دھندلی سی تصویر یاد آ گئی۔ سامنے ایک بہت بڑے بینر ہولڈنگ پر وہی ڈریگن کی تصویر بھی تھی۔ اس شخص نے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ پتہ نہیں کیوں میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔

سڑک پر کچرا ڈھونے والی گاڑیاں سرپٹ دوڑ رہی تھیں۔ کچھ میں بہت ساری ٹوپیاں بھری ہوئی تھی۔ کچھ میں اسلامی لباس نظر آئے۔ پیچھے کچھ گاڑیوں میں انسانی بال نظر آئے۔ اتنے بال کہ جیسے لاکھوں لوگوں کی داڑھی ایک ساتھ صاف کر دی گئی ہو۔ وہ بزرگ آگے تھے اور میں ان کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک بہت بڑا ہاسٹل نظر آیا جہاں پہلی مرتبہ انگریزی میں کچھ لکھا ہوا نظر آیا۔ اندر سے موسیقی کی آوازیں آ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بہت سارے لوگ ایک ساتھ اجتماعی طور پر ناچ رہے ہیں۔ ہاسٹل کے دائیں جانب مفت میں ترمیم شدہ قرآن پاک تقسیم کیے جا رہے تھے۔ ہاسٹل کے سامنے بہت وسیع کھیت تھا، جہاں بہت سارے نوجوان کسی روبوٹ کی طرح مزدوری کر رہے تھے۔ میں حیران تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ نہ میں نے کبھی دیکھی! نہ کبھی سنی! نہ کہیں اس کا ذکر ہی رہا۔ کیا یہ کسی جغرافیائی

نقشے میں موجود ہے؟ ہوسٹل کے صدر دروازے سے جھانکنے پر انگریزی سائن بورڈ کی وجہ سمجھ آئی۔ دراصل وہاں بہت سے غیر ملکی صحافیوں کو بلایا گیا تھا۔ لیکن بڑی عجیب بات یہ نظر آئی کہ ان کے ہاتھوں میں موجود تمام کیمروں کے لینس پر ڈھکن لگا ہوا تھا اور صحافیوں کے منہ کالے کپڑوں سے بند تھے۔ میں نے دوبارہ دروازے پر لگے بڑے سے سائن بورڈ کو دیکھا، وہاں 'ویکشنل ٹریننگ سینٹر فار اویغور مسلمز' لکھا ہوا تھا۔''

ڈرائیور نے آخری صفحہ پڑھنے کے بعد نوٹ بک بند کر کے مرلی کو دیتے ہوئے کہا،

''انسپکٹر صاحب میں چلتا ہوں۔ پیش امام صاحب کو لے کر آتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر ڈرائیور باہر نکل گیا اور کیبن کا دروازہ بند ہوتے ہی فوراً پھر سے کھل گیا۔ جب سامنے پیش امام صاحب نظر آئے تو انسپکٹر بنسل اور مرلی دھر حیرتوں میں ڈوب گئے۔ انھیں دیکھ کر مرلی نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے قدرے تجسس سے دریافت کیا۔

''ارے امام صاحب؟ آپ آ گئے؟ آپ کا ڈرائیور تو بس ابھی ابھی نکلا ہے آپ کو لینے کے لیے!''

''میرا ڈرائیور! جناب ہماری اتنی استعداد کہاں؟ ہمارے لیے تو ہماری ایکٹیوا ہی کافی ہے اور ٹو ویلر کے لیے ڈرائیور کہاں رکھا جاتا ہے۔!'' پیش امام صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر وہ جو ابھی باہر نکلا وہ کون تھا؟ وہ تو کہہ رہا تھا کہ وہ آپ کا ڈرائیور ہے!'' مرلی نے دریافت کیا۔

''وہ جو ابھی ابھی باہر گیا، جس سے میں ٹکراتے ٹکراتے بچا؟ وہ،؟'' پیش امام صاحب نے الٹا سوال کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں ہاں وہی! دراصل اسے یہ کاپی پڑھنے کے لئے کیبن میں بلوایا تھا۔ اس میں اردو میں عجیب سا سفر نامہ یا قصے جیسا کچھ لکھا ہوا ہے۔'' انسپکٹر بنسل نے وضاحت کی۔

امام صاحب نے نوٹ بک کے اوراق کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے کہا،

''یہ تو اسکول کے تاریخ و جغرافیہ کے نوٹس معلوم ہوتے ہیں۔''

مرلی نے اٹکتے ہوئے کہا،'' پھر یہ اتنے سارے ٹوٹے ہوئے آئینے اور وہ اویغور مسلم۔۔۔!''

''مرلی! ڈال دو اسے ڈسٹ بن میں!'' انسپکٹر بنسل نے کہا۔

امام صاحب چونکے لیکن دوسرے ہی پل باہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے،'' چلیے صاحب...... اویغور مسلمان......کوئی دیوانہ رہا ہوگا......''

◀◀ ● ▶▶

Kashan-E-Kausar,
Dr. Sheikh bunker Colony, Kamptee 441001
Dist. Nagpur (M.S.) Mob. 9326669893

● **معظم شاہ**

نیلو، ایفرو وتی اور ایک خواب

وہ پانچ ستاروں والے ہوٹل کا ایک پر تعیش سوئیٹ تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی نشست پر بیٹھے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں جام تھے اور ہم مسلسل ایک دوسرے کی آنکھوں میں جانے کیا تلاش کر رہے تھے۔ ہر لمحے میرے دل کو درد کی ایک ٹیس گھیر لیتی تھی، میں اسے بھلانے اور خود کو حال میں ڈبو دینے کی ناکام سعی کرتا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں تھی، بارہا میرے ساتھ ایسے ہو چکا تھا، اور جانے کتنی بار مزید میں نے اس عذاب سے گزرنا تھا۔ مجھے بہت کچھ یاد آ رہا تھا، وہ تو میری گہری نظروں کا شکوہ کرتے ہوئے بار بار چہرہ چھپا لیتی تھی، یہ کیسے بے جھجک میری آنکھوں میں جھانک رہی ہے؟

یہ میں بار بار تقابل کیوں کرنے لگتا ہوں؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ یہ سوال میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے؟ یہ ایک اور سوال تھا۔ ایک دیوانگی، ایک مسلسل دیوانگی مجھے چہرہ بہ چہرہ، جسم بہ جسم بھٹکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اور جس کی تلاش تھی وہ مل نہیں رہی تھی۔

ہم دونوں بستر پر چلے گئے، وہی کھیل آغاز ہوا جو ازل سے آدم زاد حوا زادی کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ اب اس کھیل میں بھی کچھ لطف نہیں رہ گیا تھا۔ وہ بھی اپنے جیسی ہزاروں دوسری لڑکیوں کی طرح تھی، اپنے گاہک کو خوش کرنے کے لیئے جان لڑا دینے والی، لیکن یہ کاروباری رشتے محبت کا نعم البدل کب ہو سکتے ہیں؟

بستر پر بھونچال بھی پہلے جیسا تھا، اس کے چہرے پر جذبات کی سرخی بھی پہلے جیسی، وہی سب کچھ تھا، وہی سب کچھ......لیکن وہ نہیں تھی، وہ جو اس دل کو لوٹ کر جانے کہاں جا چھپی تھی؟

کئی پل گزرے، رات اپنے سفر میں دو منزلیں اور آگے چلی گئی، طوفان تھم نہیں رہا تھا، جسم کچھ اور، کچھ اور مانگتا تھا، جو اسے مل نہیں رہا تھا۔ آخر دل کی بیکلی رنگ لائی اور کھیل کے خاتمے کے لیئے اس نے بمشکل خود کو ''برس جانے'' پر آمادہ کیا۔ اس نے بھی ایسے سکھ کی سانس لی جیسے کوئی امتحان ختم ہوا ہو، تم نے یہ سب کیوں کیا؟ اب میں اس سے مخاطب تھا۔ تمہیں کیا ملتا ہے اس سے؟ چند ٹکے تو کسی اور طریقے سے بھی کمائے جا سکتے ہیں۔ اور وہ بے زبان گڑیا شکوہ کناں آنکھوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

نہیں ہو تم، وہ نہیں ہو جسے یہ دل چاہتا ہے۔ میں کیوں اس کارلا حاصل سے نکل نہیں سکتا؟ وہ تو

بولتی تھی ،لفظ جیسے اس کے غلام تھے ،وہ حسین تھی ،اتنی کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔اور تمہیں پتا ہے ،اس میں کچھ انوکھا جادو تھا ،مردے کو بھی چھو لے تو زندہ ہو جائے ، کچھ ایسا جادو......اس کے سامنے میں خود کو زندگی سے بھرپور محسوس کرتا تھا ،ایک پل کی بے دلی کا بھی تصور نہیں تھا۔

ہاں ایک معاملے میں وہ بھی تم جیسی تھی ،اسے بھی رقص کے لیئے ہر روز ایک نیا میدان چاہیئے تھا، کسی ایک تماشائی کی نظریں اس کی داد کا حق ادا نہیں کر سکتی تھیں وہ ہر روز نئے تماشائی سے داد کی خواہش رکھنے والی کسی ایک پر کہاں ٹک سکتی تھی؟

تمہیں پتا ہے ایفر ودتی کون تھی؟اور وہ ایسے میرا منہ دیکھنے لگی جیسے میں نے کسی اور زبان میں سوال کر دیا ہو ،کسی نامعلوم زبان میں۔

تم کیا جانو ، میں بتاتا ہوں۔ایفر ودتی وہ تھی جو بڑے بڑے نابغوں کو تاکتی تھی اور نشانہ بنا لیتی تھی ،وہ بہت خوبصورت تھی ،اپنے حسن کے جادو سے آگاہ تھی ، بے پناہ ذہین۔وہ اتنی عاجزی سے ملتی کہ اسے چاہنے والا خود کو بادشاہ تصور کرنے لگتا ،اتنی محبت دیتی کہ اس کے بعد محبت کا تصور ختم ہو جاتا اور پھر یکلخت وہ اپنا دامن چھڑا لیتی ،اس کا نشانہ بننے والا بھٹکتا رہ جاتا ،اس کا شکار اپنا گھر بار بھلا بیٹھتا تھا ،اسے اپنا ہوش نہیں رہتا تھا ،وہ جنگلوں میں اس کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا۔

ہائے میں اسے بھول کیوں نہیں جاتا ،تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا نیلو، میں نے حسن تقدیس مذہب کی رنگینیوں سے نکل کر تمہیں چاہا تھا ، میں نے تو تمہاری پوجا کی تھی ، میں تو تمہاری رضا میں خوش رہنے والا ،تمہارا صرف تمہارا تھا نا......اور تم نے مجھی پر شک کیا ، مجھے موردالزام ٹھہرا کر تم کیسے نکل گئیں؟ ماننا پڑے گا کہ تم بہت بڑی فنکار تھیں ،تمہارے اس فن سے تو شاید صرف تمہارے شکار بننے والے ہی واقف ہوں دنیا والے تو بالکل بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ اتنی بڑی شاعرہ ،اتنی بڑی دانشور کے پیچھے ایسی فنکار بھی چھپی ہوئی ہے۔لیکن تمہارے شکار بھی بھلا کب پہنچے ہوں گے حقیقت تک ، ہوسکتا ہے کئی بے چارے اپنے آپ کو ہی آج تک مطعون کر رہے ہوں ،خود کو ہی مجرم ٹھہرا کر بیٹھے تمہارے جانے کا ماتم کر رہے ہوں۔

ہائے میں کہاں ڈھونڈوں اسے ،نہیں ملتی نا ،اور یہ دل......اس کے بغیر ہر بات ، ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا ہے ، یہ بے چینی ختم کیوں نہیں ہو جاتی؟ میں اسے بھلا کیوں نہیں دیتا؟ تلخ مشروب سر چڑھ رہا تھا ،وہ اور اس کی ایک ایک یاد جیسے دل کو چیر چیر جاتی تھی ، میرے ساتھ کیوں نیلو؟ میرے ساتھ کیوں؟ میری آنکھوں سے لڑیوں کی مانند آنسو بہنے لگے ،ہچکیوں کے عالم میں کچھ کہنا مشکل تر ہو گیا ہوش ، بے خودی میں مکمل طور پر ڈھل چکا تھا۔

کیوں کیا ایسے نیلو؟ میرے ساتھ ہی کیوں کیا؟ یہ الفاظ میری زبان پر تھے جب میں اپنے رونے

پر جا گا، سخت سردی میں بھی پیشانی پسینے سے تر تھی، میں سوچنے لگا، پھر سوچنے لگا، اسی کے بارے میں۔ نیلو، میری نیلو، میں نے تو تمہیں پورا جان لیا لیکن افسوس تم میرے بارے میں نہیں جان پائیں، تمہیں پتا ہے جب میں بچپن میں گاؤں جاتا تھا تو واپسی پر کسی درخت سے دو پتے توڑ لاتا تھا، وہ میری کتابوں میں پڑے رہتے، جب پھر گاؤں جانا ہوتا تو میں سب سے پہلے وہ پتے اس درخت کے قدموں میں ڈال دیتا اور پھر اپنی من پسند زندگی میں کھو جاتا۔ واپسی پر پھر کسی درخت کے دو پتے میرے ساتھ ہوتے تھے، وہ مجھے میرے گاؤں کی یاد کی طرح لگتے، ایسے محسوس ہوتا جیسے میں شہر کے ہجوم ناشناساں میں ہوتے ہوئے بھی اپنے گاؤں میں ہوں۔

اب سوچو، میں، جسے یقین ہوتا تھا کہ پھر گاؤں واپس آنا ہے، پھر بھی وہاں کی نشانی ساتھ لاتا تھا، میں، جس کا کام ہی لوگوں کو پڑھنا اور سمجھنا رہا، میں تمہیں کیسے نہ سمجھ پاتا، اور تمہارے بچھڑ جانے کا یقین مجھے کیسے کیسے تمہاری یادوں اور نشانیوں کو محفوظ کر لینے پر نہ اکساتا ہوگا، تم تو اپنی ایک تصویر تک نہیں لینے دیتی تھیں، تم کیا جانو کہ تمہاری آوازیں، تمہاری ساکن اور متحرک تصویریں، تمہارا ہر روپ میرے پاس محفوظ ہے۔ میں جب چاہوں تمہارے چاہنے والوں تمہارے مداحوں کے دل میں چھائے تمہاری عظمت کے بت کو پاش پاش کر سکتا ہوں، تم کہتی تھیں نا کہ تم اپنی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھا کر پھرتی ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم موت سے کتنا ڈرتی ہو، میں اگر کہتا تھا کہ جب چاہوں تمہیں ایک چٹکی میں مسل دوں تو غلط نہیں کہتا تھا، لیکن تم بہت، بہت خوش نصیب ہو، میں نے اپنے سب سے مقدس وعدے دھوکہ نہ دینے کے کیئے تھے، مجھے یاد ہے اور دعا کرنا نیلو کہ میرے دل میں جو ٹوٹا پھوٹا، چھوٹی سی کمزور باقی والا ایمان کا دیا ہے یہ روشن رہے، جس دن یہ بجھ گیا اس دن دنیا میری سفا کی دیکھے گی۔ دنیا سے پہلے تم دیکھو گی، تم، جس نے میری اتنی بھی پروا نہیں کی جتنی کوئی گھر کے ملازم کی کرتا ہے۔ تمہاری سلامتی میرے ایمان سے مشروط ٹھہری، سو دعا کرتی رہنا کہ میرا ایمان سلامت رہے۔

میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا، دماغ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا کہ اشرف علی کی آواز آئی۔

حضرت صاحب، میں نے پانی گرم کر دیا ہے، وضو کر لیں۔

میں نے اپنے دماغ سے سارے فاسد خیالات کو جھٹک دیا۔ سحر سے کچھ پہلے کا وقت تھا، اشرف علی میرا خلیفہ بھی تھا اور خادم خاص بھی مجھے اس پر بے ساختہ پیار آیا اسے دعا دے کر میں نے بستر چھوڑ دیا، آج ملاقات کا دن تھا اور پتا نہیں کہاں کہاں سے لوگ اپنے مسائل لے کر مجھ فقیر کے در تک پہنچے تھے، میں نے خود کو ایک مصروف ترین دن کے لیئے تیار کر لیا۔

◀◀ ● ▶▶

● مکرم نیاز

سوکھی باؤلی

سارا ہنگامہ پانی کا تھا۔ پورے پانچ دن کے ناغہ کے بعد متعلقہ سرکاری محکمے کی من مانی مہربانی کے نتیجے میں جب گھر کے واحد نل سے پانی دوبارہ جاری ہوا تو ایک خلقت اس کے گرد جمع ہوگئی۔ نل کے پاس گھڑوں، بالٹیوں اور برتنوں کی جو منظّم قطار قائم ہوئی تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے تتر بتر ہوگئی۔ کیا بڑے، کیا بچے، کیا نوجوان ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ طویل وقفے بعد نصیب ہونے والے آب رواں کا وہی پہلا حق دار بنے۔

مقابلوں کی دوڑ میں کوئی اول نمبر پر آتا ہے تو کوئی دوسرے درجے پر قانع ہو جاتا ہے۔ لیکن پانی کے حصول کی اس جنگ میں کسی کو دوسرا یا تیسرا درجہ قبول نہ تھا۔ بحث و تکرار نے طوالت کھینچی تو دو چار بالٹی پانی یونہی ضائع ہوگیا۔ آخر کار گھر کے بڑوں کو ہوش آیا اور انہوں نے فیصلہ سنایا کہ درجہ بدرجہ ہر فیملی پہلے پینے کے لئے پانی حاصل کرلے اس کے بعد ہی دیگر مقاصد کی باری آئے گی۔ یوں پہلا مرحلہ بخیر و خوبی ٹلا تو جنگ کا اہم اور سنسنی خیز موڑ آپہنچا۔ نوجوانوں کی ٹولی سب سے آگے تھی۔ اب یہ پتا نہیں بزرگوں کو میدان کارزار سے بے دخل کیا گیا یا خود انہوں نے لڑائی میں شریک ہونے سے دانستہ گریز کیا تھا؟ مگر مشترکہ خاندان کی نوجوان نسل کے درمیان زوروں کا معرکہ چل پڑا۔

''......اور ہم تو شاید ابھی مہمان ہی کے درجہ پر فائز ہیں......اور وہ بھی شاید بن بلایا کہ جس کی باری سب سے آخر میں آئے......'' تیز و تند مکالموں کی بحثا بحثی کے بیچ ایک سنجیدہ اور مہذب لہجہ گونجا۔ بولنے والی ان سب کی نئی نویلی بھابھی تھیں جو شہر کے کسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدہ پر برسرکار تھیں۔ ان کی اس تیکھی چوٹ سے تمام لڑکے کھسیانے سے ہوگئے۔ پھر کسی نے خفت مٹانے کو جلدی سے کہا:

''ارے ہمیں سب سے پہلے بھابی کی فکر کرنا چاہئے تھی، انہوں نے یقیناً سوچا ہوگا کہ کیسے خود غرض بھائی بندوں سے پالا پڑا ہے جو نئے بسے خاندان کی ضروریات کا خیال تک نہیں رکھتے۔''

''نہیں میرے عزیز دیور جی! میں نے ایسا نہیں سوچا۔ ویسے بھی آدمی کی خود غرضی کی پہلی اور بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ دوسروں کی فکر کرنے سے قبل یہ پوچھے کہ دوسرے اس کی فکر کیوں نہیں کرتے؟ اس کی خبر کیوں نہیں لیتے؟ اور میں خود غرض نہیں......''

خود غرض کون نہیں ہوتا؟ مگر آدمی کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ غیر جانبداری سے فیصلہ نہیں کرپاتا کہ کون خود

غرض ہےاورکون بے غرض؟ غیر جانبدار فیصلے کے لئے ذرا اپنے گریبان میں بھی جھانکنا پڑتا ہےاوریہیں اچھے اچھوں کی پول کھل جاتی ہے۔ پانی تو سبھی نے حسب توفیق حاصل کرلیا تھا۔ حتی کہ جب پریشر کم ہونے لگا تب برقی موٹر لگا کرزبردستی حق وصول کیا گیا۔ ہرچند کہ بزرگوں کے نزدیک یہ بددیانتی اور بدمعاشی تھی لیکن نوجوانوں کا کہنا تھا کہ:

''اگر ارباب اقتدار اس معاملے میں دیانت داری اور انصاف سے کام لیتے تو انہیں کیوں بددیانتی کی طرف راغب ہونے کی ضرورت لاحق ہوگی؟'' حصول آب کے جھگڑے میں یا اپنی خودغرضی کی دھن میں جو ہستی یکسر فراموش کردی گئی تھی وہ خاندان کی سب سے محترم اور بزرگ ہستی دادی جان کی تھی۔

اس دنیا میں لوگ عمارت دیکھتے ہیں، مکان کی منزلیں گنتے ہیں، لیکن کوئی سنگ بنیاد کے بارے میں دریافت نہیں کرتا۔ دادی جان بھی محض بنیاد کا پتھر تھیں۔ لوگ سمجھتے ہیں بڑھاپا آدمی کو تمام جذبات، احساسات اور ضروریات سے بیگانہ کر دیتا ہے اس لئے ہمارے معاشرے میں بوڑھے لوگوں کو ''دادی جان'' جیسا کوئی معزز خطاب عطا کر کے گھر کے کسی کونے میں شوپیس کی مانند بٹھادیا جاتا ہے۔

''بے جان اشیاء تک اپنی رونق برقرار رکھنے کے لئے جھاڑ پونچھ کی محتاج ہوتی ہیں تو کیا جاندار عمر کے کسی موڑ پر ضروریات زندگی سے بےنیاز ہوسکتا ہے؟'' دادی جان نے بڑے کرب سے سوچا۔

اپنی ذاتی ضروریات کی تکمیل کی خاطر انہیں بھی پانی چاہئے تھا جب کہ پانی کے روزانہ حصول کا مسئلہ ہی اتنا گمبھیر اور اہم تھا کہ اس کے پیچھے ان کی ضروریات کا سوال ہی ہمیشہ غائب ہوجاتا۔

''ارے بیٹا! ایک گھڑا پانی مجھے بھی بھر لینے دو۔''

وہ عاجزی سے پکارتیں مگر پوتے پوتیوں کے ہجوم میں اکثر ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوتی۔ کسی کے دل میں محبت اور ہمدردی جاگتی تو وہ دادی جان کو ازراہ ترحم پانی کے ایک برتن سے نواز دیتا ورنہ وہ اکثر ایک بہو سے دوسری بہو کے حمام کے گرد چکر لگائے جاتیں۔ ان کی بہوئیں بھی بڑی نفاست پسند اور نازک مزاج تھیں۔ اپنے صاف ستھرے باتھ روم میں اپنی ساس کی بلا کھٹکے آمدورفت وہ کب تک برداشت کرپاتیں؟ اندر ہی اندر انہوں نے اپنے شوہروں کے کان بھرے تو دادی جان کے بڑے بیٹے نے حویلی کے ایک کونے میں موجود ایک قدیم اسٹور کو صاف کر کے اسے حمام میں تبدیل کرڈالا۔

''اماں۔ اب آپ کو وقت بے وقت ہم لوگوں کے حمام میں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کے لئے نیا حمام بنوادیا ہے۔'' یوں تو ان کے بڑے بیٹے نے سیدھے سادھے لہجے میں انہیں اس بات کی اطلاع دی تھی مگر پتا نہیں کیوں وہ ایک دم چونک کر اپنے سب سے بڑے بیٹے کو غور سے تکنے لگیں۔ ان کے بڑے بیٹے نے جلدی سے نظریں چرائیں اور آگے بڑھ گیا، ورنہ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر مزید کچھ دیر

وہاں کھڑا رہا تو اسے ماں کی آنکھوں سے ابل پڑنے کو بے تاب، اس سوال کا جواب ضرور دینا پڑے گا کہ:
آج تم لوگوں نے مجھے اپنے حماموں میں داخل ہونے سے روک دیا ہے کل کیا اپنے کمروں میں بھی میری آمد کو برداشت نہ کر پاؤ گے؟ اور گھر کے کسی کونے کھدرے میں میرے لئے زنداں بنوا دو گے؟

مگر انہوں نے بڑی خاموشی سے سب کا فیصلہ قبول کر لیا۔ وہ تو اس وقت بھی کچھ نہ بولیں تھیں جب ان کے شوہر کے انتقال کے بعد حویلی کے سب سے بڑے کمرے سے انہیں بے دخل کیا گیا تھا پھر حمام کی تبدیلی کے ایک معمولی سے واقعے کی کیا وقعت تھی؟ البتہ اس تبدیلی نے انہیں کچھ سہولت ضرور دے ڈالی تھی۔ نئے حمام کی اب وہ بلاشرکت غیرے مالک تھیں۔ مسئلہ صرف حمام میں موجود بیرل میں پانی بھرنے کا تھا۔ ایک تو نل سے ان کے حمام تک کا فاصلہ کافی زیادہ تھا دوسرے ان کی بار بار یاد دہانی کے باوجود ان کے پوتے اپنی دادی جان کا خیال رکھنا بھول جاتے۔ اس دن بھی وہی ہوا تھا۔ ان کے ایک چہیتے اور فعال پوتے نے یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے حمام کا بیرل پانی سے لبریز کروا دے گا۔ یقین دہانی اور عملی کارگزاری کے مابین کبھی کبھی کسی سبب نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ سادہ لوح دادی جان نے اپنے پوتے کی بھول کو اس فرق کا سبب قرار دے لیا تھا۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کی تکمیل جو ہمارے ذمہ ہوتی ہے انہیں ادا کرنا تو ہم بھول جاتے ہیں لیکن اپنی ضروریات پوری کرنا کبھی فراموش نہیں کر پاتے۔

دادی جان نے سوچا کہ ساری عمر کبھی دوسروں کی محتاج نہیں ہوئیں تو آج کیوں؟ ابھی ان میں اتنا دم خم ہے کہ دوسروں کی کچھ مدد لئے بغیر اپنی ضرورت آپ ہی پورا کر سکتی ہیں۔ لہٰذا دوسرے دن صبح سویرے انہوں نے برقعہ پہنا اور ہاتھ میں پانی کا برتن تھامے سب کی نظروں سے بچ بچا کر کچھ دور موجود محلّہ کے کمیونٹی مرکز کے اس میدان میں پہنچ گئیں جہاں علاقہ کے کارپوریٹر نے ہینڈ پمپ کے ذریعے بورویل کے پانی کی سہولت فراہم کر رکھی تھی۔

شور شرابا تو اس وقت اٹھا جب وہ پانی سے لبریز برتن اٹھائے اپنے گھر کی دہلیز پار نہ کر سکیں اور لڑکھڑاتے قدموں ایک جھٹکے سے دروازے کے اندر گر پڑیں۔ ساری عمر کی قوت گویا بیش قیمت پانی کی شکل میں ان کے چاروں طرف بہہ گئی۔ گھر کے تمام لوگ دوڑے دوڑے آئے۔ کسی نے سہارا دے کر انہیں اٹھایا۔ اس کے بعد احتیاط اور آرام سے ان کے ذاتی پلنگ پر لٹا دیا۔ پھر ان کے قریب سرگوشیوں میں گفتگو شروع ہوئی جو آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئی۔

''کیا ضرورت تھی انہیں باہر سے پانی لانے کی؟ اپنے کسی پوتے سے کہہ دیا ہوتا۔ یوں اس گھر کی عزت سربازار نیلام کرنے سے کیا ملا انہیں؟ کچھ ہو جاتا انہیں تو علاج کا بھاری خرچہ کون اٹھاتا؟''

''کیا وہ باہر کے لوگوں کو یہی احساس دلانا چاہتی ہیں کہ ہم ان کا خیال نہیں رکھتے۔ اپنی ضعیفی کی اگر وہ خود کوئی

پرواہ نہیں کرتیں تو کم از کم انہوں نے اس گھر کی، اپنے خاندان کی، ہم لوگوں کی عزت کا خیال رکھا ہوتا۔“ غصہ میں روتی ہوئی بلند ترین آواز ان کی سب سے بڑی بہو کی تھی۔ باہوش وحواس دادی جان کو ایسا لگا جیسے وہ اپنے عہد ماضی میں پہنچ گئی ہوں۔

بڑا رعب و دبدبہ تھا ان کا۔ ایک معروف ومقبول ٹھیکے دار کی بیگم ہونے کے ناتے سب ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے شوہر نے باؤلیاں کھدوانے کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ ان دنوں قصبے میں میونسپلٹی کا واٹر سپلائی نظام قائم نہیں ہوا تھا۔ لوگ اپنے وسیع وعریض مکانات اور بنگلوں کے احاطے میں باؤلی کھدوا کر اس کا پانی استعمال کرتے تھے۔ کچھ اپنے پیشے کی مہارت اور کچھ لوگوں کی ضروریات کے شدید تقاضے کے سبب ان کے شوہر کو اپنے پیشے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوگئی تھی۔ پھر بڑھتے اور پھیلتے خاندان کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنا چھوٹا سا مکان فروخت کیا اور ایک پرسکون علاقے میں زمین کا ایک بڑا رقبہ خرید کر وہاں دومنزلہ حویلی تعمیر کروائی۔ حویلی کے کھلے دالان میں انہوں نے مناسب وموزوں جگہ دیکھ کر باؤلی کھدوائی تو وہاں سے پھوٹ نکلنے والے صاف اور میٹھے پانی کو دیکھ کر اوروں کی طرح وہ خود بھی دنگ رہ گئے تھے۔ چند برسوں بعد اپنے خاندان کی دوسری نسل کو مستقبل میں پیش آنے والے مسائل کا انہیں اندازہ ہوا تو انہوں نے حویلی کی تیسری منزل کی تعمیر کا ارادہ باندھا۔ ایک مشہور تعمیراتی ٹھیکے دار کی زیر نگرانی کام شروع کیا گیا۔

تعمیراتی کام میں استعمال ہونے والے پانی کے لئے انہیں ایک علیحدہ باؤلی کھدوانا پڑی۔ کیونکہ ان کی بیگم ذاتی استعمال کے لئے بنائی گئی باؤلی کا پانی تعمیراتی کاموں میں استعمال کرنے کے خلاف تھیں۔ اتفاق سے جو دوسری باؤلی کھودی گئی اس کا پانی پینے کے لائق نہ نکلا۔ لہذا کام کے اختتام پر جب مزدور حویلی کے دالان میں پہنچے اور ان کی اجازت کے بغیر ایک مزدور نے ڈول باؤلی میں اتارا تو اسی دم غصہ میں بھری بلند بانگ نسوانی آواز گونج اٹھی اور ڈول مزدور کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک چھپاکے سے پانی کی سطح سے جا ٹکرایا۔

”اے۔ دور ہٹو! یہ تمہارے باپ کی باؤلی نہیں ہے۔ پانی پینا ہے تو باہر جا کر کسی دوسری باؤلی کا پانی پیو۔ خبردار اس پانی کو جو اپنے غلیظ ہاتھوں سے ناپاک کیا۔ چلو نکلو یہاں سے۔“

کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے آتی پاٹ دار آواز سن کر باؤلی کے قریب موجود سارے مزدور ششدر رہ گئے تھے، اور پھر سب ایک دوسرے کو گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھتے خاموشی کے ساتھ وہاں سے بکھر گئے۔

اس کے دوسرے ہی دن جب وہ کھڑکی کے پردے کی اوٹ سے کام کی نگرانی کر رہی تھیں تو انہوں نے ایک مزدور کو چلچلاتی دھوپ میں ہانپتے کانپتے سر پر ایک گھڑا اٹھائے حویلی کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ قبل اس کے کہ وہ اسے کچھ کہتیں، اچانک ان کی نظروں کے سامنے مزدور لڑکھڑایا اور دوسرے ہی لمحے نیچے گر پڑا۔ گھڑے میں موجود سارا پانی چند سیکنڈوں میں تپتی ہوئی خشک دھرتی نے چوس لیا تھا۔

''ارے کوئی ہے؟ دیکھوتو اسے کیا ہو گیا ہے؟'' وہ گھبرا کر چلائیں۔اس مزدور کے ساتھی دوڑے چلے آئے۔ پھر کچھ دیر بعد انہیں کسی نے بتایا کہ وہ مزدور اپنی بیوی بچوں کی پیاس دور کرنے ایک کلومیٹر دور سے پانی لانے گیا تھا۔ مگر واپسی میں شدید گرمی کی وجہ سے لو کا شکار ہو گیا۔ یہ سنتے ہی اچانک وہ پچھتاوے کے احساسات میں گھر گئیں۔ انہیں لگا کہ جیسے قصوروار وہ خود ہوں۔ مزدوروں کی حق تلفی کی اصل ذمے دار بھی وہ ہوں۔ خود غرضی کا مکمل نمونہ ہوں۔ اپنے باطن میں چھڑی اس جنگ نے انہیں توڑ پھوڑ ڈالا۔

''میں اپنا پچھلا فیصلہ واپس لیتی ہوں۔ آج سے ہر کوئی اس باؤلی کا پانی استعمال کرسکتا ہے۔''

اپنی آن بان اور اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہوں نے باؤلی کے ٹھنڈے پانی سے مستفید ہونے کی سبھی خاص و عام کو اجازت دے ڈالی۔ انہی دنوں مزدوروں کے متشکرانہ اور جان نثار رویوں نے ان پر یہ بھید آشکار کیا کہ انسانیت کے تقاضے کا لحاظ اور اس کی تعمیل ہی انسان کو حقیقی معنوں میں عزت دار بناتی ہے۔

اور آج......آج انہیں انہی کے گھر میں، گھر کی، خاندان کے افراد کی عزت کا حوالہ دیا جا رہا تھا۔

''مشکلات اور آسانیاں جو کل تھیں، اب بھی وہی ہیں......بس آج شاید نظریات کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔'' پلنگ پر آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دادی جان نے گہرے دکھ سے سوچا:

''آج اپنی آن کی خاطر جان جا رہی ہو تو کوئی اپنا قاتل آپ نہیں بنتا بلکہ بخوشی آن کو ٹھوکر مار دیتا ہے لیکن اپنی آن کی خاطر دوسروں کی جان جا رہی ہو تو شوق سے جائے۔ ایسے معاملے میں اپنی آن پر آنچ آنے دینا کوئی گوارا نہیں کرتا۔ رسم و رواج، روایات اور قدریں کیا گردش زمانہ کا شکار ہو گئیں؟ زمین بدل گئی کہ آسمان بدل گیا؟ خون بے وفا ہوا ہے یا جذبات فنا ہو گئے؟ کسے پتا کون بتائے؟''

دادی جان کے کشادہ دل سینے میں درد و غم کا غبار اٹھنے لگا۔

''رونا مت بہو بیگم، دیکھو تمہاری ہی خاطر اب پانی کے لئے میں کبھی باہر نہیں جاؤں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں بہو بیگم......نہیں جاؤں گی۔'' ٹوٹے ہوئے کمزور اور مدھم لہجے میں کہتے ہوئے دادی جان کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے الفاظ حویلی کی سوکھی باؤلی کے تلے سے ابھر رہے ہوں۔ نہ جانے کیوں اور کیسے ان کی بوڑھی آنکھوں سے پانی کے دو انمول قطرے ٹپکے اور بنجر زمین کی کوکھ میں جذب ہو گئے۔

◀◀ ● ▶▶

Asst. Executive Engineer, DB Section.
O/o Executive Engineer R&B, Central Buildings Division.
H.No. 10-1-1995,Mahaveer Marg, A.C.Guards
HYDERABAD - 500004Telangana.Mob.: 08096961731

● سارا احمد

مجھے گھر نہیں جانا

اسے نا معلوم کدھر جانا تھا۔ کبھی وہ دائیں طرف دیکھتا اور کبھی بائیں راستے کی طرف مڑنے لگتا۔ ارادے باندھتا مگر اپنی جگہ سے ایک انچ نہ سرکتا۔

''اوئے جمنا دیکھ ذرا اس بابے کو کسی گڈی کے نیچے نہ آ جائے۔'' کریم نے بل بناتے ہوئے آواز لگائی۔

''یار کریم بیگم صاحبہ آئیں تو انہیں اس کھاتے کی تفصیل نہ بتانا۔

''باؤ سوہنیا فکر ناٹ، میں نے اپنی جائز مزدوری لی ہے۔ باقی تم جانو اور تمہاری بیگم صاحبہ۔'' کریم نے پرانے کسٹمر سے عادتاً اپنی دائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ جمنا جو ایک گاڑی کے نیچے سے نکلا تھا استاد کی اس حرکت پر ہنسنے لگا۔

''اوئے جمنے تجھ سے تو میں بعد میں نبڑتا ہوں، جا ذرا اس کملے بابے کو پکڑ کر ادھر لا۔'' جمنا نے اوزار زمین پر پٹخے۔ اپنے ہاتھوں کی کالک کو میلے چیکٹ گریس لگے کپڑوں پر رگڑا اور ٹریفک سے بچتا بچاتا سڑک کے دوسری کنارے پہنچ گیا۔ جتنی سرعت سے وہ سڑک کے اس پار گیا تھا اتنی ہی تیزی اس نے واپس آنے میں بھی دکھائی۔

''چل چھوڑ دے اب بابے ہوراں کی بانہہ اور ادھر سے پلاسٹک کا شٹول پکڑ لا۔'' کریم نے بلائی چائے پر سے اتار کر کپ کے کنارے سے چپکاتے ہوئے کہا۔

''استاد لکڑی کا سٹول لے آؤں۔''

''او بازی گر کی اولاد اس شٹول کا بیلنس نہیں ٹھیک۔''

جمنا نے تابعداری سے ''جی اچھا استاد'' کہہ کر اس کے حکم کی بجا آوری کی۔

''لو جی بزرگو اس پر بیٹھ جائیں اور یہ فرمائیں کہ آپ نے خودکشی کا پلان میری دکان کے سامنے ہی کیوں بنایا۔ آپ کو پتہ ہے ادھر نزدیک ہی لڑکوں کا کالج ہے۔ آپ کسی سواری کے تھلے آ جاتے تو ان لونڈے لپاڑوں نے ہنگامہ کر کے یہ ساری روڈ بلاک کر دینی تھی۔''

کریم اتنی مغز کھپائی کرنے کے بعد شڑک شڑک چائے پینے لگا۔ یہ اس کا دکان پر آنے کے بعد

پہلا چائے کا کپ تھا۔ اپنی چائے ختم کرنے کے بعد اسنے اپنے دونوں ہاتھوں کو نچا کر بابا جی سے پوچھا۔

''نہ کوئی ہل نہ کوئی جُل ۔ میں نے کوئی فارسی تو نہیں بولی؟'' بابا بیچارہ شاید گونگا بہرا تھا۔ ہونقوں کی طرح اسے ٹکر ٹکر تکتا رہا۔

''چائے پیو گے؟'' کریم نے زمین پر رکھے خالی کپ اور پھر اپنے منہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ بابا بولا تو کچھ نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں جس طرح بچوں جیسی للچائی ہوئی چمک کوندی اس سے وہ سمجھ گیا۔ اس نے اپنی ورکشاپ کے چھوٹو کو آواز دے کر ایک اور چائے لانے کے لیے کہا۔ بابے نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اپنی گردن نیچے جھکا لی۔ اس کے مٹیالے کپڑوں کی طرح اس کی چپلیں بھی گرد آلود تھیں۔ یوں معلوم پڑتا تھا کہ کئی دنوں کی مسافت کی تھکن ان کے تلوؤں میں بھی کہیں اس کی طرح ہی چپ تھی۔ کریم نے بابا کے چائے پینے تک ورکشاپ کا سامان چھوٹو اور جمنا سے ترتیب سے رکھوایا۔

''میں ترے سنگ کیسے چلوں سجناں......'' ایک پرانی گاڑی ورکشاپ پر آ کر رکی جس کے اندر ٹیپ ریکارڈر چل رکھا تھا۔

''گاڑی کا ہارن نہیں کام کر رہا۔'' گاڑی سے اتر کر نوجوان لڑکے نے کہا تو کریم اس کا لباس دیکھ کر اپنی مسکراہٹ دبا گیا۔ گھٹنوں تک نیلے رنگ کی نیکر جس پر رنگ برنگی گاڑیاں بنی ہوئی تھیں اور مالٹے رنگ کی ٹی۔ شرٹ جس پر ہر سائز کے دل کی شکلوں کی بھرمار تھی۔ جمنا ورکشاپ کے اندر سے بجلی کی تاریں کھینچ کر لایا اور اسٹیرنگ کے نچلے حصہ میں اپنا سَر گھسیڑ دیا۔

''بھائی جان ذرا پیچھے جا کر دیکھنا بریک کی بتی جلتی ہے کہ نہیں۔'' جمنا نے گاڑی کے اندر سے آواز لگائی۔ وہ اکیس بائیس سال کا نوجوان جواب اپنے موبائل پر مصروف تھا۔ موبائل کی اسکرین سے اپنی نظریں ہٹائے بغیر گاڑی کی پچھلی طرف چلتا گیا۔

''نہیں یار......لائٹ نہیں جل رہی۔ کتنا وقت لگے گا؟''

جمنا نے گاڑی سے باہر نکل کر ٹیسٹر اپنی جیب میں رکھا۔

''ارتھ کام نہیں کر رہا۔ دس پندرہ منٹ کا کام ہے۔'' کریم دکان کے اندر باہر چکر لگا رہا تھا۔ بابا چائے ختم کر کے پھر اپنا سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ دھوپ ابھی پوری طرح نیچے نہیں اتری تھی۔ ابھی اس کی دستک سے سویا زمانہ آہستہ آہستہ جاگ کر اپنے اپنے کاموں کی طرف پلٹ رہا تھا۔ سارے وہی معمول کے کام تھے جنہیں رات کی گھٹڑی میں باندھ کر صبح پھر کھولا جا رہا تھا۔ جب کام سب وہی پرانے تو پھر راتیں اور صبحیں کیسے نئی ہوتیں۔ بابا اسٹول پر بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا۔ اس کا تہمند، لمبا کرتا اور کھسہ کسی دور دراز گاؤں

کے باسی ہونے کا پتہ دیتے تھے۔

"تو سمندر رہے میں ساحلوں کی ہوا......"اس لڑکے کی گاڑی ٹھیک ہوگئی تو اس نے دوبارہ ٹیپ ریکارڈ چلا دیا۔اس سے پہلے اس نے گاڑی کا ہارن دوبار بجا کر اپنی تسلی کی تھی۔

کریم جمنا کی کارکردگی سے خوش ہوگیا۔اسے ورکشاپ پر کام کرنے والے یہ دونوں لڑکے عزیز تھے۔جمنا اور چھوٹو کم اجرت اور دو وقت کے کھانے پر ٹکے ہوئے تھے۔

ابھی اس صبح کے منظر کے سارے رنگ نکھرنے تھے کہ ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی اور غیر ارادی قوت کے زیرِ اثر وہ سب ورکشاپ کے اندر پناہ گزین ہوگئے۔کریم نے ورکشاپ کا شٹر گرا دیا تھا۔اندھیرے میں آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو چھوٹو نے افراد کی گنتی کی۔گاڑی والا لڑکا، گونگا بابا، استاد کریم، جمنا اور وہ خود کل ملا کر پانچ لوگ تھے لیکن نہیں لکڑی کے بنچ پر رکھے پانی کے کولر کی اوٹ میں کوئی اور بھی تھا جس نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف کیا ہوا تھا۔یہ تو کوئی لڑکی تھی۔سفید کپڑوں میں ملبوس کانپتی ہوئی اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے۔چھوٹو کے قریب جانے پر سہم کر کچھ اور سمٹ گئی۔

"باجی......"چھوٹو کے پکارنے پر وہ لڑکی دوپٹے سے اپنا آدھا چہرہ چھپاتے ہوئے مڑی۔وہ کہیں آس پاس کے کالج میں ہی پڑھتی تھی۔اس نے ورکشاپ کی دیواروں سے لگ کر بیٹھے ہوئے باقی چہروں کے خوف کو کچھ کم ہوتے دیکھا۔کریم کے اشارہ کرنے پر چھوٹو نے کولر کے ساتھ رسی سے بندھا گلاس کھول کر پانی سے بھرا۔لڑکی نے ٹپٹا کر چھوٹو کے میلے ہاتھوں کو دیکھا اور انکار میں سَر ہلا دیا۔

"کسی اور نے پانی پینا ہے؟"کریم کی بھاری آواز ورکشاپ میں گونجی اور خوف زدہ نفوس کی گہری خاموشی میں گھل گئی۔سبھی کے سانس لینے کی آواز ایک دوسرے کو صاف سنائی دے رہی تھی۔باہر دھماکے کے بعد شور مزید بڑھ گیا تھا۔ایمبولینس کے سائرن کی آوازیں ان میں زیادہ نمایاں تھیں۔جمنا نے اٹھ کر ورکشاپ کے سوئچ اوپر نیچے کیے۔پنکھا چل گیا لیکن بتی نہیں جلی۔یوں لگا جیسے بلب نے روشنی کی لپک کو ان کی آنکھوں تک پہنچنے سے پہلے ہی اچک لیا ہو۔

"استاد دو دن سے میں کہہ رہا تھا کہ بلب چمکے مارتا ہے۔ٹھیک کروا لے یا بدلوا دے۔"

"کوئی ٹارچ نہیں ہے؟ اندھیرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔"وہ لڑکا اپنی ٹی۔شرٹ کا اگلا اکلوتا بٹن کھولتے ہوئے بولا۔اس افرتفری میں اس کا موبائل کہیں باہر ہی گر گیا تھا۔جمنا اور چھوٹو اس کی بوکھلاہٹ پر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ان دونوں کے گھروں میں لالٹینیں اور سرسوں کے تیل سے مٹی کے دیئے جلتے تھے۔ایک ہی گاؤں کے تھے۔جمنا گاؤں سے شہر آیا تو دو سال بعد اس نے

چھوٹو کو بھی اپنے پاس بلالیا۔ چھوٹو ان کے گاؤں کے کمی کی بیوہ سرداراں کا اکلوتا سہارا تھا۔

''استاد تم کیوں اتنے اداس لگ رہے ہو، ابھی کچھ دیر تک ہم سب اپنے اپنے کام سے لگ جائیں گے۔ تم مجھے آج دیہاڑی مت دینا۔'' چھوٹو محبت سے کریم کا گھٹنا پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

''اوئے نہیں شودے دیہاڑی کی بات نہیں کتنی محنت سے دکان بنائی تھی۔ سب کچھ ایک دھماکے نے برباد کر دیا۔''

''میری گاڑی کا بھی کچھ نہیں بچا ہوگا۔ پاپا نے مال لے کر دوسرے شہر جانا تھا۔''

وہ نوجوان بہت ہی چھوٹے دل کا تھا۔ رونے لگا اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''میری ماما نے بھی مجھے روکنا چاہا تھا لیکن مجھے سپورٹس ڈے کے لیے ٹرائیل دینا تھے۔ اچھا ہوا میری جڑواں بہن گھر پر رک گئی۔ اس نے ماما کا کہا مان لیا۔ میں نے نافرمانی کی اور مصیبت میں پھنس گئی۔'' وہ لڑکی بھی اپنا سَر اپنے گھٹنوں میں دے کر سسکنے لگی۔

ورکشاپ کے باہر نجانے کتنی زندگیاں سسکتی ہوں گی اور تڑپ کر اپنے پیاروں کو ڈھونڈتی ہوں گی۔ باہر لمحہ بہ لمحہ سراسیمگی اور افرتفری بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کہیں نزدیک ہی ایک اور دھماکہ ہوا تھا۔ ورکشاپ کی زمین پھٹنے کی حد تک کانپنے لگی اور لوہے کے لرزتے شٹر کا شور جسموں میں چھید کرنے کے قریب تھا۔ گونگا بابا بھی اپنی ٹانگیں پسارے انہیں اپنی آنکھوں سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ان سب کی نسبت اطمینان تھا۔

''پتہ ہے بابا کیا کہہ رہا ہے؟''

''کیا......؟'' لڑکا اور لڑکی دونوں بیک وقت بولے۔ کریم نے چھوٹو کا سر اپنے دوزانوؤں پر رکھتے ہوئے کہا۔

''امید کا دامن تھام کر ہم اپنی اپنی نیکیاں یاد کریں۔''

''استاد اگر گناہوں کے سوا کچھ پاس نہ ہو؟'' جمنا نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔

''اب ہم اتنے بھی تہی داماں نہیں کہ ہمارے پاس ایک نیکی بھی نہ ہو۔'' لڑکی بنچ کے پیچھے سے نکل کر ان سب کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے لہجے کا یقین ان سب کو قائل کر گیا۔

''میں اس ہفتے جمعہ کی نماز پڑھنے گیا تھا۔'' لڑکے نے فخریہ جتلایا۔

''اور اس نیک کام کے آگے پیچھے جو دوسرے نیک کام کیے وہ بھی گنواؤ۔'' لڑکی نے چڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھو تم چپ رہو۔ ایک تو پہلے ہی یہاں اندھیرا ہے اور اوپر سے تم اتنی کالی ہو۔ یقیناً تمہاری جڑواں بہن خوبصورت ہوگی۔'' لڑکی اس کی بات سن کر ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپانے لگی۔

''دیکھو اس طرح کسی کو حقیر مت جانو۔ مٹی میں مل کر سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ میں بھی اس ہفتے گرجا گھر گیا تھا اور فادر نے ہمیں ایسی بہت سی اچھی باتیں بتائی تھیں۔ جمنا جس کی عمر چودہ برس تھی اپنی عمر سے دگنی بات بتا کر اپنے نتھنے پھلاتے ہوئے ورکشاپ کے درمیان چلنے لگا۔ اس نے ایک دو بار اپنے کان شٹر سے لگا کر باہر کی آوازیں بھی سننے کی کوشش کی۔

زندگی سانسوں کے سوا دیتی بھی کیا ہے۔ باقی سب کچھ تو خود لینا پڑتا ہے۔ لین دین کے اس کاروبار میں کبھی ہنسنا پڑتا ہے اور کبھی رونا۔ اگر وہ اس زندان سے باہر ہوتے تو دیکھ سکتے کہ لمحوں میں انسانی چیتھڑے اڑا دینے والے اس سانحے کی خبریں مسلسل نشر کی جا رہی تھیں۔ جائے حادثہ کے اطراف خاردار باڑ لگا کر اتنی جگہ سیل کر دی گئی تھی اور لڑکوں کے کالج سے لے کر کریم کی ورکشاپ تک ساری سڑک بلاک تھی۔

کریم ہر شام اپنی سُستی مسلسل چائے نوشی سے کم کرنے کی کوشش کرتا مگر شاید اسے گھر جانا ہی نہ تھا۔ اس کی بیوی کو ابھی ساتواں مہینہ لگا تھا۔ وہ ورکشاپ کے ٹھنڈے اینٹوں کے فرش پر مایوسی کے عالم میں اپنی سوچوں میں غلطاں بیٹھا تھا۔ چھوٹو اور جمنا نے اس کے آنے سے پہلے صبح سویرے ورکشاپ کے اندر اور باہر سڑک تک چھڑکاؤ کیا تھا۔

گونگا بابا جیسے سب کچھ سمجھ کر بھی نہ سمجھنے کی کیفیت میں تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور زبان خشک ہو کر تالو سے چپک گئی تھی۔ وہ خود ہی اٹھ کر نوجوان کی ٹانگوں سے پہلے ٹکرایا پھر انہیں پھلانگتا ہوا پانی کے کولر کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ٹونٹی کھول کر دوسرے ہاتھ کی اوک میں پانی بھر کر اپنے ہونٹوں اور حلق کو تر کر لیا۔

''بابا جی اب ادھر ہی بیٹھ جائیں۔'' جمنا نے اس نوجوان لڑکے کے چہرے کی بیزاری بھانپ لی تھی۔

بابے نے کہاں سننا تھا۔ اسی طرح اس لڑکے کے پاؤں کو ٹھوکر لگاتا اور اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر پورا وزن ڈال کر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا۔

وہ نوجوان واقعی بے زار تھا۔ کتنے کام رک گئے تھے اور کتنے کام اسے ابھی کرنا تھے۔ اس کے کان میں سیٹی کی آواز کے ساتھ ہوا کچھ شور کرتی ہوئی سرگوشی کر گئی۔

''ابے یار چھوڑ یہ نیکی کی باتیں۔ کبھی کبھار ہم بھی جمعہ کے دن ابا کو دکھانے کے لیے مسجد چلے جاتے ہیں۔ خدا مہربان ہے یہ ابا ہی ظالم ہوتے ہیں۔''

''سہیل'' وہ نوجوان بڑبڑایا۔اس کی بے چینی کسی نے محسوس نہیں کی۔سہیل کے پاس اس کی فیس کے اڑتیس ہزار روپے تھے۔ان دونوں دوستوں نے شوبز کی ایک لڑکی کو تحفے تحائف دے کر اپنے لیے ماڈلنگ کا ایک موقع حاصل کرنا تھا۔پاپا کے دوسرے شہر جاتے ہی انہوں نے اسے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں بلایا تھا۔اس لڑکے کو اپنی مہم کے پہلے ہی مرحلہ پر ناکامی کا قلق تھا۔اب تک سہیل نے پاپا کو سب کچھ بتا دیا ہو گا۔گھر جانا اب اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔

'' پتہ نہیں خدا بد صورت لڑکیاں کیوں بناتا ہے۔لڑکیاں تو کم ازکم بدصورت نہیں ہونی چاہیے۔''لڑکے نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔اس لڑکی کے لیے اس لڑکے کا رویہ انجان نہیں تھا۔کب اس پر کسی نے نظرِ التفات ڈالی تھی۔دیدہ زیب ڈیزائن اور مہنگے ملبوسات بھی کسی کے دل میں اس کے لیے جگہ نہیں بنا سکے تھے۔اس کی جڑواں بہن اور دونوں بھائی اس سے مشابہت ضرور رکھتے تھے مگر اپنی رنگت کی وجہ سے اس سے الگ دکھتے تھے۔اس کی جڑواں بہن کا اس کی خالہ نے اپنے وجیہہ بیٹے کے لیے رشتہ مانگ بھی لیا تھا۔تعلیم ،امورِخانہ داری، حُسنِ سلوک اور سگھڑاپا سب ظاہری چکا چوند کے آگے ماند پڑ گئے تھے۔گھر رہنے سے اب اسے وحشت ہوتی تھی تبھی تو پاپا سے اجازت ملنے پر وہ فوراً گھر سے نکل آئی تھی۔اگر وہ ٹرائیل میں شریک ہو جاتی تو اسے دوسرے شہر جانے کا موقع مل جاتا۔اس کے لیے یہ گھر سے فرار حاصل کرنے کا ایک ٹرائیل تھا۔

چھوٹو استاد کریم کے گم صم ہو جانے پر اس کے پاس سے اٹھ گیا۔اس کی شٹر کو اوپر اٹھانے کی کوشش رائیگاں گئی۔جمنا نے اسے دیکھ کر تالی بجائی اور پھر اس کی بند مٹھیوں اور بھینچے ہوئے ہونٹ دیکھ کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔چھوٹو اتنا بھی چھوٹا نہیں تھا۔اس بیساکھ اس نے گیارہویں سال میں لگ جانا تھا۔اس کی ماں سرداراں بی بی اس کے باپ کے گزر جانے کے بعد نمبرداروں کی حویلی میں کام کرتی تھی۔بیاج کی رقم ادا ہوتے ہی اس نے کہا تھا شہر آ جائے گی اور پھر وہ اور چھوٹو ہمیشہ ساتھ مل کر رہیں گے۔باپ کی بیماری نے انہیں حویلی والوں کا مقروض بنا دیا تھا۔مقروض ان کے گاؤں کا تقریباً ہر گھر ہی تھا۔وہاں کوئی اسکول تھا اور نہ کوئی مدرسہ۔زمینیں بھی ساری حویلی والوں کی تھیں۔اگر کوئی گز بھر زمین کا مالک تھا تو اس پر بھی بڑے زمیندار کی نظریں رہتی تھیں۔سرداراں اس کے شہر جانے پر خوش تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ وہ اب گاؤں نہ آئے وہ اس سے ملنے خود چلی آئے گی۔

جمنا کو شہر کے چرچ بہت بھاتے تھے۔ایک بار وہ اپنے چچا کے ساتھ شہر آیا تھا اور پھر دوبارہ آنے کے لیے مسلسل سوچتا رہا تھا۔گاؤں میں ان کی برادری کے تین چار ہی گھر تھے۔اس گاؤں کا پانی انہیں راس آ گیا تھا اسی لیے وہ یہاں ٹھہر گئے تھے۔اس سے پہلے تین چار گاؤں بدل کر دیکھے تھے جمنا کا کوئی بہن بھائی

بچتا ہی نہیں تھا۔ دن پورے ہوتے ہی اس کی ماں کسی مردہ بچے کو جنم دے کر خالی جھولی رہ جاتی۔ اس کے چچا نے معلوم کیا تھا یہاں ایک پادری دفن تھا جو تبلیغ کے دوران یہاں پہنچ کر دَم توڑ گیا۔ انہوں نے اس کی قبر کے نزدیک ہی چار اینٹوں کا منبر بنا کر اپنا گرجا بنا لیا تھا۔ اس کا چچا ہر اتوار کی صبح بائیبل سے کچھ ابواب پڑھ کر اور پانی پر پھونک مار کر ان سب پر مقدس پانی چھڑک دیتا۔ بڑے زمیندار نے ان کی عبادت گاہ کو کبھی چھیڑا نہیں تھا لیکن اس خاندان کی خوبصورت عورتوں کو بابرکت جان کر اپنے پوتے پوتیوں اور ڈھور ڈنگروں پر مقدس پانی چھڑکوانے اکثر حویلی میں زحمت دیتا رہتا تھا۔ جمنا اس زمیندار کی آنکھیں نہیں پھوڑ سکتا تھا لیکن ماں سے ضد لگا کر گاؤں چھوڑ آیا تھا۔ اس کے لیے آنکھ کا پانی مقدس تھا۔

''مجھے لگتا ہے ہم صدیوں سے یہاں بند ہیں۔ ہم کب تک باہر کے ظلم سے چھپ کر یوں قید رہیں گے۔ تم اٹھ کر ان چھوٹے لڑکوں کی مدد کرو۔ کب تک ایسے بیٹھے پاپا کو بلاتے رہو گے۔'' اس لڑکی نے درد بھرے طنزیہ لہجے میں ملفوف الفاظ اس لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیے جسے اپنی خوبصورتی کا جھوٹا زعم تھا۔

''تم بھی تو اپنی ماما کو یاد کر کے ہلکان ہوئے جا رہی ہو۔ نافرمان لڑکی۔'' اب کے بار اس کی بڑبڑاہٹ بلند تھی۔ سامنے بیٹھی لڑکی نے اسے گھور کر دیکھا جس میں اس سے دوگنی اکتاہٹ تھی۔

وہ اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے پانی کے کولر پر بنے پھولوں کے ڈیزائن میں اپنی آنکھوں سے اپنی مرضی کے رنگ بھرنے لگی۔ وہ کریموں کے استعمال کے بعد بھی خوبصورت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے اپنے باپ کی طرح اس نے زندگی میں اپنا سارا زور نیک بننے کے لیے لگایا تھا۔ اپنی شخصیت کو لاتعداد ہنر کے کیل کانٹوں سے لیس کیا تھا جنہیں سطحی نظر نہیں پہچان سکتی تھی لیکن اب اس گھٹن میں اسے احساس ہو رہا تھا۔ اس کے پاس سارے بناوٹ کے پھول تھے جن سے خوشبو نہیں آ سکتی تھی۔ وہ اتنی نیک نہیں تھی جتنا اس نے باہر سب کو دکھایا تھا۔ تبھی تو وہ اندر اندھیرے کی طرح کالی نظر آ رہی تھی حالانکہ وہ اتنی بھی نہیں۔

کریم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی مگر اب اس میں کسی نادیدہ حسرت کی تلخی بھی شامل تھی۔ اس کی بیوی ماں بننے والی تھی لیکن اس کے بچے کی نہیں۔ مگر اب اسے کیا اس نے بھی جان بوجھ کر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ محبت کسی کو بے غیرت اور کسی کو غیرت مند بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے بڑوں کی محبت میں بے غیرت بن گیا تھا۔ اس کے ماموں کی طرف اس کی چھوٹی بہن بھی تو بیاہی ہوئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے اتر کر کہیں روپوش ہو گئی مگر خراج لے کر۔ اسے اپنی ورکشاپ ہی گھر لگنے لگی تھی۔

وہ سب کریم کی اداسی میں شامل ہو گئے مگر سمجھ نہ سکے۔ ان کی نظر دیوار کے ساتھ کمر لگائے اور کندھے جھکائے بابا پر پڑی جو اونگھتے ہوئے کچھ دیر کے لیے ان سے غافل ہو چکا تھا۔

''آؤمل کر شٹر اٹھاتے ہیں۔دھماکے سے شاید پچک گیا ہے اور باہر والے سمجھتے ہوں گے اسے مالک بند کر کے محفوظ کر گیا ہے۔'' کریم کے دماغ کے خلیوں میں کئی خیال بیک وقت دوڑنے لگے۔عورت بیوفا ہے اور نہ مرد۔یہ زندگی ہی بے وفا ہے۔جاگتے جاگتے کبھی اونگھنے لگتی ہے اور کبھی سوتے سوتے مَر جاتی ہے۔زندگی اور وفا کی مدت بہت قلیل ہے۔نینداور موت ہمیشہ ساتھ نبھا جاتی ہیں۔ان سب کے زور لگانے سے پہلے ہی شٹر باہر سے کسی نے اوپر اٹھا دیا۔

زندگی اور موت ایک ساتھ بلا اجازت اندر داخل ہوئی تھیں۔ باری باری مختلف آوازیں ابھریں۔ایک پولیس اہلکار نے بابا کا کندھا ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔اس نے اپنے چاروں طرف پریشانی سے دیکھا۔اندر آتی سورج کی روشنی نے اس کی نمناک آنکھیں چندھیا دی تھیں۔اس نے اپنی چپلیں اتار کر انہیں اینٹوں کے فرش پر جھاڑا اور ان کے تلوؤں کو آپس میں جوڑ کر اپنی بغل میں دبا لیا۔اس نے اپنی تھکن زمین سے اٹھا لی تھی۔

''بابا جی آپ اندر یہاں اکیلے ہی تھے۔آپ کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا؟'' بابا ان سب کے اجنبی چہرے حیرانی سے دیکھتا ہوا ورکشاپ سے باہر نکل آیا۔وہاں موجود لوگوں کو اس کی ذہنی حالت مشکوک لگی۔اس نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ورکشاپ کی چھت کا پنکھا چلتے چلتے رک گیا تھا۔اس کے پاؤں کے پاس چائے کے خالی کپ کی ڈنڈی ٹوٹی پڑی تھی۔ٹیسٹر،سفید دوپٹہ اور نہ جانے کیا کچھ بکھرا پڑا تھا۔بہت سی لاشیں بھی ہوں گی جو وہاں سے اٹھا لی گئی تھیں۔ورکشاپ سے لے کر سڑک تک خون ہی خون تھا۔عوام کی سہولت کے لیے آدھی سڑک ٹریفک کے لیے کھول دی گئی تھی۔کانچ اور خون سے بچنے کے لیے اس نے اپنی چپلیں دوبارہ پہن لیں۔وہ سڑک پار کرتے ہوئے بہت دیر تک اضطراری حالت میں کبھی دائیں اور کبھی گردن گھما کر بائیں طرف دیکھتا رہا۔اسے ابھی تک اپنے گھر کا راستہ یاد نہیں آیا تھا اور جن کو یاد تھا انہیں گھر نہیں جانا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

C/o Mushtaque Ahmad,
216 ANew Chauburji Park,Multan Road,Lahore, Pakistan

سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز (جنوری تا مارچ ۲۰۲۳)

مدیر : ڈاکٹر منصور خوشتر قیمت : ۳۰۰ روپے صفحات : ۲۷۵

ملنے کا پتہ: دربھنگہ ٹائمز،شوکت علی ہاؤس،پرانی منصفی،لال باغ،دربھنگہ (بہار)

● شہریار قاضی

مٹی کی چڑیاں

دن ڈھلے جب رانو باہر سے بکریاں لے کر آئی، اس وقت وہ جانے کے لیے چار پائی سے اُٹھ رہے تھے۔ دونوں نے یکے بعد دیگرے اس کے سر پر یوں ہاتھ رکھا جیسے پوسٹ ہونے والے لفافوں پر ڈاک مہر رکھ کر اُٹھالی جاتی ہے، اور پھر کھٹارا سی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر چلے گئے۔

بانس کے ستونوں پر کپڑے کی چھتوں والی جھگیوں کی اس بستی میں دائیں طرف سے چار چھوڑ کر اگلی دو جھگیاں رانو کی ہیں۔ جن کے سامنے چند قدموں کی جگہ کو اطراف میں لگی اینٹوں نے کچے صحن کی شکل دے رکھی ہے، جہاں ابھی کچھ دیر پہلے ایک چار پائی پر رانو کے اماں ابا، اور دوسری پر ایک پکی عمر کا شخص اور عورت جو شاید اس کی بیوی تھی، بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''اماں یہ کون لوگ تھے؟'' رانو نے اماں سے پوچھا تھا۔

ساجے نے ایک نظر شاداں کو دیکھا اور چپ چاپ جھگی کے اندر چلا گیا۔

''مہمان تھے رانو اور تُو اتنی دیر لگا آئی، رنگ کب کرے گی؟''

''اماں بس ابھی کر دیتی ہوں۔'' اس نے اپنی پوریں چڑیوں پر پھیرتے ہوئے جواب دیا تھا، جواب خشک ہو چکی تھیں۔

اب وہ ایک چڑیا اٹھا کر اس کے چہرے اور پشت پر رنگ لگا رہی تھی پھر دوسری...... تیسری ...... جب ساری چڑیوں پر رنگ ہو گیا تو ان کے منہ پر بنے سوراخ میں ربڑ کے دھاگے باندھنے لگی جو بازو بھر کے تھے، جن کا سِرا پکڑ کر بچے چڑیا کو زمین کی طرف گراتے تو وہ اُوپر نیچے جھولنے لگتی۔

بہت پہلے رانو بس دائیں ہاتھ کو گال اور بایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر رکھے بڑے اِنہماک سے شاداں کو دیکھا کرتی تھی، جب وہ چڑیاں بنا رہی ہوتی تھی۔ رانو کا اِنہماک تب بھی نہ ٹوٹتا جب اس کی دو لٹیں بائیں گال پر آ گرتیں، جنہیں وہ بائیں ہاتھ سے کان کے پیچھے اڑس دیتی۔ اُسے ہمیشہ لگتا تھا کہ یہ بال اُسے پریشان کرنے کے لیے سر پر اُگائے گئے ہیں۔ مگر پچھلے برس سے رانو نے سب سیکھ لیا ہے، کون سی مٹی لانی ہے اور کس طرح گوندھ کر چڑیاں بنانی ہیں۔

اُس نے جب سے ہوش سنبھالا، یہی دیکھا ہے کہ جاڑا ہو یا گرمی اماں ناغہ نہیں کرتی ہے۔ روز سویرے سویرے سر پر چڑیوں کی ٹوکری اور بغل میں پیلی بالٹی دبائے نکل جاتی ہے اور دن ڈھلے آتی ہے۔ ساجا ساری سردیاں میلی سی رضائی میں لیٹے اور گرمیاں پیپل کے نیچے تاش کھیلتے گزار دیتا ہے، اور یہ بھی کہ کتنے ہی دن، اُن میں بات ہوئے بغیر گزر جاتے ہیں۔ ہاں، اماں کی اُن آنکھوں کو وہ آج تک نہیں پڑھ پائی تھی جو اکثر واپسی پر ٹوکری رکھتے ہوئے ساجے کے چہرے کی طرف دیکھتیں اور پھر جانے کتنے ہی روز شکایت کی مجسم تصویر بنی رہتیں۔

رات کو جب وہ جھگی میں اماں کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی تو شاداں اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔

"رانو پہلے میں بھی اپنے اماں ابا کے پاس رہتی تھی جیسے تُو رہتی ہے اور پھر......"

"پھر کیا اماں؟"

"پھر میں سفیدے کی طرح دنوں میں گٹھ گٹھ بڑھتی گئی اور ایک دن اماں ابا نے میرا ویاہ تیرے اَبے کے ساتھ کر دیا۔"

رانو، شاداں کے بائیں کندھے پر اپنی گال ٹکائے اُس کے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی جو ہلکا سا کُھلتے اور پھر شاید زبان پر لفظوں کی ترتیب درست نہ ہونے کی وجہ سے پھر بند ہو جاتے۔ اندر کی طرح باہر بھی خاموشی تھی، جیسے کائنات کی ہر شے جھگی سے کان لگائے، ہونٹوں پر اُنگلی رکھے ایک دوسرے کو خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی ہو۔

"رانو تُو اب کچھ دِنوں کی مہمان ہے ہمارے پاس، وہ لوگ جو آج آئے تھے نا، وہ تیرے ابا کے کوئی دور پار کے رشتہ دار تھے۔ اُن کے ہاں تیرا رشتہ کر دیا ہے، وہ اٹھاراں تریخ کو پھر آئیں گے اور تجھے اپنے ساتھ شہر لے جائیں گے۔" شاداں نے جھگی کی چھت کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

"مگر اماں مجھے تیرے ساتھ رہنا ہے اور پھر تجھے چڑیاں۔" وہ بھرائی آواز سے فقط اتنا کہہ سکی تھی۔

"دیکھ رانو ہمارا گزارہ بھی ہو جائے گا اور پھر چڑیوں کے بغیر بھی تو آٹا مل جاتا ہے۔" شاداں نے اُس کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

"اماں تُو مجھ سے وہاں ملنے تو آیا کرے گی نا؟" یہ کہتے ہی وہ اماں کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔

"ہاں تو اور کیا نہیں آؤں گی۔" شاداں نے اس کا سر چوما اور آنکھیں بند کر لیں۔

صبح جب رانو اپنی سوجی ہوئی آنکھوں کو ملتے ہوئے جھگی سے باہر نکلی، شاداں ٹوکری اُٹھائے باہر جانے لگی تھی۔

''اماں......!''

''ہاں رانو......!'' شاداں نے پلٹ کر جواب دیا۔

''اماں اٹھاراں تریخ کب ہے؟''

''بارہ دن بعد۔'' شاداں نے اپنی کالی اُنگلیوں پر حساب کر کے بتایا تھا، جہاں بے حساب ایسی لکیریں اُبھری ہوئی تھیں جن کا آنے والے وقت سے تو کوئی تعلق نہیں تھا مگر وہ گزرے وقت کی چھاپ ضرور چھوڑ گئی تھیں۔

رانو ہر دوسرے، تیسرے دن یہی پوچھتی۔ ایک روز جب دن ڈھلے شاداں واپس آئی تو رانو صحن کے آگے راہ گزر پر چڑیاں بنا رہی تھی۔ سارا صحن، چولہے کے ساتھ بنی فٹ دو فٹ کی دیواریں اور جھگیوں کے اندر پڑی چارپائیوں کے نیچے جہاں تک نظر جاتی، مٹی کی چڑیاں پڑی تھیں جن میں سے کچھ خشک ہو چکی تھیں اور کچھ میں نمی باقی تھی۔ شاداں کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا جیسے ''رانو......یہ......اتنی......'' کہتے ہی بہاؤ کا رستہ مل گیا تھا۔

''وہ اماں میرے بعد تمہیں کون بنا کر دے گا اِس لیے میں......'' شاداں نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگالیا۔ اُس رات وہ دونوں کئی بار روئی تھیں۔

رانو بیاہ کر شہر آئی تھی، جہاں اسٹیشن سے ایک کوس دور پٹڑی کے پار چار جھگیاں تھیں۔ وہ جب سے آئی تھی سارا دن اپنی جھگی میں بیٹھی رہتی یا باہر نکل کر اُمید سے بھری نگاہیں اسٹیشن کی طرف اٹھاتی جو پلٹنے پر ہمیشہ خالی ہوتیں۔ دن میں دو ایک بار اپنی ساس کی جھگی میں جاتی مگر وہاں بھی اُس کا دل نہ لگتا تھا۔ شرفو صبح اُٹھتے ہی کبوتروں کو کھڈے سے نکالتا، دانہ ڈالتا اور اُنھیں آسمان کی طرف اُڑا دیتا اور پھر دن بھر آسمان کو تکتا رہتا یا کبھی ایک کبوتر ہاتھ میں لیے پٹڑی سے پار چلا جاتا اور کئی گھنٹوں بعد آتا۔

ہفتہ یوں ہی گزر گیا تھا۔ ایک دن وہ جھگی میں داخل ہوا تو اُس کے ہاتھ میں شاپر تھا جو اُس نے رانو کے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' رانو نے شاپر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''رنگ اور ربڑ کے دھاگے۔''

''رنگ......!'' رانو نے اتنا ہی دہرایا تھا۔

''ہاں تمہاری اماں نے، ابا کو بتایا تھا کہ تم مٹی کی چڑیاں بناتی ہو، جنہیں رنگ کر کے اور خوبصورت کر دیتی ہو۔''

''ہاں......!''

’’تو پھر اُٹھو، بناؤ اور کل جا کر بیچ بھی آنا۔‘‘

’’پر میں......میں تو کبھی بیچنے نہیں گئی، وہ تو بس اماں جاتی تھی۔‘‘

’’نہیں گئی تو اب چلی جانا، چڑیاں ہی بیچنی ہیں نا کونسا ڈنگروں کا وپار کرنے بھیج رہا تجھے، اب اُٹھ جا......جا کے مٹی کا اینتجام کر‘‘۔شرفو تحکمانہ انداز میں کہتے ہوئے جھگی سے باہر نکل گیا۔

پہلی بار ایسا ہوا کہ رانو چڑیاں بناتے ہوئے خوش نہیں تھی، ورنہ اماں کے لیے کتنی دلجمعی سے بناتی ،اُن سے باتیں کرتی جیسے وہ مٹی کی نہیں سچ مچ کی ہوں۔

ٹوکری اُٹھائے وہ بازار اور اُس سے ملحقہ گلیوں میں چلتے ہوئے بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھی مبادا رستہ بھول جائے۔آج اُس کی چند ایک چڑیاں بکی تھیں۔وہ جلدی سے پٹڑی پار کر رہی تھی کہ شاید آج اُس کی اماں آئی ہو مگر اُس کو اماں نظر نہیں آئی، وہ جھگی کے اندر بھی نہیں تھی۔

’’اِتنے کم پیسے؟‘‘ شرفو نے قدرے غصے سے پوچھا۔

رانو نے چڑیوں سے بھری ٹوکری اُس کے آگے رکھ دی۔

’’میں گلیوں میں آوازیں لگاتی رہی اور بازار بھی گئی مگر وہاں کسی نے لی ہی نہیں، یہ بھی گلی میں کچھ بچے کھیل رہے تھے وہاں پانچ چھ بِک گئیں۔

’’اوہ بے وقوف......! ایسے بکتی ہیں بھلا، گھروں کے اندر جا کر آوازیں لگا کر زبردستی بیچتے ہیں۔کل سے تم نے گھر گھر جانا ہے اور چڑیاں بچوں کو پکڑا کر آٹا یا پیسے لیے بغیر نہیں آنا۔‘‘ اگلی صبح اُس نے ویسے ہی کِیا جیسے اُسے بتایا گیا تھا۔وہ گھر کے اندر جاتی یا دروازہ کھول کر کھڑی ہو جاتی، جلد ہی اُس کی ٹوکری میں موجود چڑیوں کی جگہ آٹا لینے لگا تھا۔

ایک گھر کا دروازہ تھوڑا سا کُھلا تھا جسے رانو نے اور کھول دیا اور بولنے لگی۔

’’اے باجی چڑیاں لے لو چڑیاں، بچوں کے لیے رنگ برنگی چڑیاں۔‘‘

کوئی جواب نہ آیا تو وہ گھر کے اندر چلی گئی۔اِتنی دیر میں بنیان پہنے آدمی کمرے سے باہر نکلا۔

’’ہاں کیا ہے؟‘‘ اُس نے رانو کے بہت قریب آ کر کہا۔

’’وہ چڑیاں......!‘‘ پسینہ اُس کی کنپٹی سے بہتا ہوا سانولی گردن پر بہنے لگا۔وہ جلدی سے دوپٹہ سنبھالتی دروازے کی طرف پلٹی تو آدمی نے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا جس سے ٹوکری نیچے جا گری اور کئی ساری چڑیوں پر آٹا کفن کی مانند پھیل گیا۔

بکھری پڑی چڑیوں جیسی ایک اُس آدمی کے ہاتھوں میں پھڑ پھڑا رہی تھی اور جب اُس کے رنگ

اُترنے لگے تو اُس نے آنکھیں موندلیں۔ وہ کسی ٹرانس میں چلتی کب پٹڑی تک آن پہنچی تھی، اُسے کوئی خبر نہ تھی۔

ٹرین کے الوداعی ہارن نے اُسے ٹرانس سے نکالا تو وہ پٹڑی کے پار آ گئی تھی۔ شرفو کبوتر کو زبردستی اڑانے کی کوشش کر رہا تھا جو اُس کے چھتری ہلانے پر تھوڑا سا اڑتا اور پھر واپس بیٹھ جاتا۔ اُس سے کچھ پرے مٹی پڑی تھی جس سے وہ چڑیاں بنا کر لے گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مٹی سے چڑیاں بن گئی تھیں ،خوبصورت رنگوں والی چڑیاں......کچھ دیر پہلے فرش پر بکھری چڑیوں کی طرح وہ اب تڑپ رہی تھیں۔ وہ شاید اِس بات پر نوحہ کناں تھیں کہ کیا اُنھیں اِس لیے بنایا جاتا ہے؟

اور پھر اُس کا پھڑ پھڑانا......اُس کے اُڑتے رنگ......''نہیں نہیں......میں چڑیاں نہیں بناؤں گی۔'' اُس کی بغل سے ٹوکری وہیں پاؤں میں آ گری۔ ہارن کی آواز تیز ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اُلٹے قدم اُٹھا رہی تھی۔ شرفو کی نگاہ اُس پر پڑتے ہی اُس کے ہاتھ چھتری پر ساکت ہو چکے تھے۔ اپنی بند ہوتی آنکھوں سے شرفو کو دیکھتے ہوئے ،رانو نے آخری بار جو سوچا تھا وہ شاداں کی آنکھیں تھیں، جن کا مطلب وہ آج جان چکی تھی۔

◄● ►

Moh. Lalu jasray. Street Qazi Ashraf Wali, DEPALPUR
district OKARA. PAKISTAN
03160658627

جوہی کی کلی

(افسانوں کا مجموعہ)

مصنف	:	نیلوفر پروین	سن اشاعت	:	۲۰۲۱ء
قیمت	:	۲۰۰ روپے	صفحات	:	۱۴۴

ملنے کا پتے

بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔۶

الکتاب، یتیم خانہ کمپلیکس، اررریہ بہار

● سلیم سرفراز

خسارہ

مئی کی شعلے اگلتی دوپہر تھی۔ وہ بس میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے اس نے اپنے چہرے پر رومال باندھ رکھا تھا۔ کھڑکی کے باہر سٹی بس اسٹینڈ کے وسیع احاطے میں تیز وتند دھوپ کسی عفریت کی طرح چنگھاڑ رہی تھی۔ کچھ ہی مسافر تھے جو خود کو دھوپ کی گرفت سے بچاتے ہوئے بس کی طرف لپک رہے تھے۔ معاً کوئی اس کی بغل میں آ کر بیٹھا تو اس نے مڑ کر دیکھا، اسے لگا کہ باہر کی چنگھاڑتی ہوئی دھوپ اندر داخل ہوگئی ہے اور اس کے پورے وجود کو جھلسا گئی ہے۔

''ریحانہ!'' وہ زیرلب بڑبڑایا۔

اسے ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ اس چھوٹی سی دنیا میں کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں وہ اپنی اداس آنکھوں میں ڈھیر سارے سوالات لے کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوگی۔ وہ اس صورت حال سے بچنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے اپنی عینک کو ناک پر درست کرتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔ گزرے ہوئے کئی برسوں کا غبار بھی اس کے حسین چہرے کی جاذبیت پر کوئی پرت نہ ڈال سکا تھا۔ قدرے فربہی کی طرف مائل اس کا پرکشش جسم ہلکے دھانی رنگ کے شلوار سوٹ میں کسا ہوا تھا۔ اس کی سحر انگیز غزالی آنکھیں دھوپ کی عینک کے عقب میں پوشیدہ تھیں۔ اس کے سرخ وسپید چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے جنہیں وہ ایک تولیہ نما چھوٹے سے رومال میں جذب کرتی جارہی تھی۔ چہرے پر رومال ہونے کی وجہ سے وہ اسے شناخت نہیں کرسکی تھی ورنہ شاید وہ اس کے قریب بیٹھنا گوارہ نہ کرتی۔ وہ خود بھی شدید بے سکونی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے بس کے اندر نگاہیں دوڑائیں۔ تمام سیٹیں پر ہوچکی تھیں۔ خاصا طویل سفر تھا۔ اس ناقابل برداشت گرمی میں کھڑے ہوکر جانا بیوقوفی ہوتی۔ وہ دم سادھے بیٹھا رہا اور باہر کے سلگتے مناظر سے ذہن کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بس میں کچھ اور سواریاں آ گئیں تو کنڈکٹر نے آواز دی اور بس چل پڑی۔ کچھ نسوانی آوازوں کا بے ترتیب شور ابھرا تو اس نے اندر کی طرف دیکھا۔ نوعمر اور نوخیز اسکولی طالبات تھیں جو بس کی چھت پر لگی ہینڈل تھامے ہوئے آپس میں چہلیں کر رہی تھیں۔ انہیں تکتے ہوئے اس کا ذہن برسوں پہلے کی گل ریز شاہراہ پر سرپٹ دوڑنے لگا۔

وہ بی۔ کام فائنل ائر کا طالب علم تھا۔ اکنومکس، اکاؤنٹنسی اور بزنس میتھ پڑھتے پڑھتے اس کی ذہنیت

تاجرانہ ہوتی جارہی تھی اور وہ ہر کام میں نفع نقصان پر گہری نگاہ رکھنے لگا تھا کہ اسی وقت ریحانہ سے ملاقات ہوگئی۔ تب اس نے جانا کہ علم معاشیات ہو یا علم الحساب، دلوں کے معاملے میں ان سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ من کی تو الگ ہی لگن ہوتی ہے جو سود و زیاں سے ماورا ہوتی ہے۔ وہ پلس ٹو کی طالبہ تھی اور کچھ دنوں سے اس کے بھائی جان کے پاس ٹیوشن پڑھنے آنے لگی تھی۔ پہلی نگاہ میں ہی وہ آنکھوں کی راہ دل میں براجمان ہوگئی۔ جب اس کے آنے کا وقت ہوتا وہ سارے کام تج کر اس کا منتظر رہتا۔ جیسے ہی سادے لباس میں اس کا دلآویز سراپا نظر آتا اس کے دل کے تمام خوابیدہ ملائم تار تن جاتے اور اس کی رگوں میں موسیقیت بھر جاتی۔ وہ اس کے مخفی جذبوں سے بے نیاز اپنے گل نوشگفتہ جیسے چہرے پر ایک ہلکی سی معصوم مسکان لاتی اور اسے سلام کرتی ہوئی اندر ہال میں چلی جاتی جہاں بھائی جان دیگر لڑکیوں کو درس دے رہے ہوتے۔ آہستہ آہستہ اس کے لطیف جذبے اس پر آشکار ہوتے گئے اور بھائی جان کی نگاہ بچا کر سلام کے ساتھ کلام بھی ہونے لگا۔ اس کی آواز میں غضب کی نغمگی اور آہنگ تھا۔ سخن کرتی تو لگتا کوئی گیت گنگنا رہی ہو یا دور اونچائی سے کوئی آبشار گر رہا ہو۔ کل۔ کل۔ کل......وہ چلی بھی جاتی تو اس کی آواز کا فسوں دیر تک اس کے تمام وجود کو اپنی گرفت میں لیے رہتا۔

اس دوران بھائی جان کی شادی کی طے شدہ تاریخ قریب آ گئی۔ صرف ہفتے بھر کا وقت رہ گیا تھا۔ شادی کی تیاری زور شور سے جاری تھی۔ بیشتر سامان کی خریداری اسی کے ذمے تھی۔ سب کچھ تو ٹھیک تھا لیکن دلہن کے لیے ملبوسات خریدنا ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ وہ ریحانہ سے مدد کا طلب گار ہوا تو وہ فوراً تیار ہوگئی۔ وہ پہلی بار اس کے ساتھ بازار گیا۔ زنانہ ملبوسات کی دکانوں کا چکر کاٹتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ کپڑوں کا بے حد نفیس ذوق رکھتی تھی۔ اس کے منتخب کردہ ملبوسات یقیناً قابل تعریف تھے۔ خریداری کے بعد وہ اسے ایک اچھے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ ناشتے اور ٹھنڈے مشروب کا لطف اٹھاتے ہوئے ڈھیر ساری باتیں ہوئیں۔ اچانک اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین تھا کہ آپ دلہن کے ملبوسات کی خریداری کے لیے مجھے ساتھ چلنے کو کہیں گے۔''

''کیوں؟ تمہیں اس کا یقین کیوں تھا؟''

اس نے قدرے تعجب سے پوچھا تو وہ گہری مسکان بکھیرتی ہوئی خاموش رہی۔

وہ گھر واپس آئے تو وہاں ٹیوشن پڑھنے والی لڑکیاں بھائی جان پر دباؤ ڈال رہی تھیں کہ گیتوں کی محفل سجائی جائے۔ ریحانہ بھی ان میں شامل ہوگئی۔ بالآخر بھائی جان راضی ہوگئے اور شام ہوتے ہی ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ گیتوں کے مدھر بول ابھرنے لگے۔ مختلف نو خیز اور الھڑ آوازوں کے درمیان ایک ایسی نرم اور شیریں آواز لہرائی جس میں غضب کی کشش اور غنائیت تھی۔

''موہے چاندی کی پائل منگا دو سجن خالی پیروں سے پنگھٹ کو میں چلوں
اپنی سکھیوں کو دیکھوں تو میں جلوں وہ تو ناچیں میں شرما کے منھ پھیروں
موہے پنگھٹ کی رانی بنا دو سجن''

گیت کے مدھر شبد، انوکھی طرز اور مقناطیسی آواز کا مجموعی تأثر اسے کھینچتا ہوا اندر لے آیا۔ اس نے دیکھا کہ گیت کے بول ریحانہ کے ہونٹوں سے پھوٹ رہے ہیں اور دوسری لڑکیاں ٹیپ کا مصرعہ اٹھا رہی ہیں۔ اس پر نگاہ پڑی تو ریحانہ کی آواز کسی قدر دھیمی پڑ گئی لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں کچھ اور سوز و گداز گھل گیا۔ اور پھر ہر شام اسی طرح کے طربیہ اور عشقیہ گیت گائے جاتے رہے جن میں سب سے نمایاں اور مترنم آواز اسی کی ہوتی تھی۔ دوسری لڑکیوں کی بہ نسبت اسے گیت بھی خوب یاد تھے۔ غیر فلمی گیت جن کی طرزیں بھی جیسے وہ خود ہی بناتی تھی۔ رات گہری ہوتے ہی گیتوں کی محفل ختم ہو جاتی لیکن وہ رات بھر اس آواز کی ڈور تھامے آسمان پر جھلمل تاروں کے درمیان بھٹکتا رہتا۔ بھائی جان کی شادی ہونے تک وہ اس کے عشق کے دریا میں گلے تک ڈوب چکا تھا۔

یکا یک بس کو زور کا جھٹکا لگا اور اس کی یادوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جھٹکے کے اثر سے ریحانہ کا گداز بدن اس کے جسم سے ٹکرایا تو رگ و پے میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جو سرعت سے الگ ہو کر اپنے بدن کو اس طرح سمیٹ رہی تھی جیسے اسے سخت کوفت ہوئی ہو۔ وہ افسردہ سا ہو کر کھڑکی کے باہر تکنے لگا۔ بس عریض و ہموار سڑک پر تیز رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ یہ بائی پاس کی قومی شاہراہ تھی جو کچھ ہی عرصہ قبل تعمیر ہوئی تھی۔ اس کے بننے سے گاڑیوں کی آمد و رفت میں بے حد آسانی ہو گئی تھی لیکن حادثوں میں بھی زبردست اضافہ ہوا تھا۔ سڑک کی دونوں جانب گاؤں آباد تھے جہاں کے لوگ گاڑیوں کی رفتار اور سڑک کی وسعت سے اکثر دھوکہ کھا جاتے۔ جدید موٹر گاڑیوں اور ویگنوں کی قوت رفتار اس قدر بڑھا دی گئی تھی کہ اس قومی شاہراہ پر ہوا سے باتیں کرتیں۔ ذرا سی غفلت ہوتی کہ انسانوں کے ساتھ ان کے بھی کل پرزے بکھر جاتے۔ یکلخت اس کے اندر ایک عجیب سی خواہش جاگی کہ کاش کوئی بھاری بھرکم ٹرک اس کی بس کو ایسی ٹکر مارے کہ سب کچھ سڑک پر بکھر جائے۔

بس ایک اسٹاپ پر رکی۔ کچھ سواریاں نیچے اتریں۔ کنڈکٹر بھی نیچے اتر کر چلایا۔

''رانی گنج......رانی گنج آیئے......!''

دو چار افراد بس کے اندر آئے اور بس پھر چل پڑی۔

رانی گنج......حضرت شمس الدین بابا عرف غوث بنگالہ کا شہر۔ فروری کے مہینے میں ان کا عرس لگتا۔ دور دور سے زائرین آتے اور ان کے مزار اقدس پر گلہائے عقیدت پیش کرتے۔ ہفتہ بھر ٹرینوں اور

بسوں میں کافی بھیڑ رہتی۔قرب وجوار کے شہروں میں قوالیاں ہوتیں اور مزار شریف کے لیے چادریں لے جائی جاتیں۔ ہندو مسلم سبھی شریک ہوتے۔ان دنوں اسے یہ سب بے حد اچھا لگتا تھا۔اسے قوالی کی محفلیں اچھی لگتی تھیں۔انہیں سننے کے لیے شب بھر گھر سے غائب رہتا۔اسے قوالیوں میں دو چیزیں خاص طور سے پسند آتیں۔قوال جب بھی کوئی کلام گاتا تو درمیان میں اس کلام سے مناسبت رکھتے ہوئے بڑے اور معتبر شعراء کے مشہور قطعات اور اشعار بھی سناتا جاتا۔اس کا اصل کلام تو اوسط درجے کا ہوتا لیکن ان اشعار کی وجہ سے اس کی وقعت اور اثر انگیزی میں خاصا اضافہ ہوجاتا۔عمدہ قوالوں کو بہت سارے معیاری اشعار یاد ہوتے جن کا وہ برمحل استعمال کرتے رہتے۔مثلاً کوئی استاد قوال ایک مصرع گانا شروع کرتا۔

تیری یادوں کے چراغوں کو جلا رکھا ہے

الگ الگ طرز پر کئی بار اس مصرعے کی تکرار کرتا رہتا۔

تیری یادوں..........تیری یادوں......

ہاں تو جناب بشیر بدر فرماتے ہیں۔

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو　　نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہوجائے

اور فیض احمد فیض کچھ یوں فرماتے ہیں۔

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں　　کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

جبکہ محترمہ کشور ناہید فرماتی ہیں۔

تمہاری یاد میں ہم جشن غم منائیں بھی　　کسی طرح سے مگر تم کو یاد آئیں بھی

اور نکہت بریلوی کہتی ہیں۔

قربت میں بھی اکثر ہمیں یاد آتا رہا ہے　　وہ لمحہ جو فرقت میں ترے ساتھ گزارا

تیری یادوں..........تیری یادوں............

قوالی میں جو دوسری بات اسے پسند تھی، اسے لچھا کہا جاتا تھا۔کوئی کہنہ مشق قوال کسی کلام کے وسط میں چھوٹی بحر کی کوئی طویل نظم یا غزل مسلسل چھیڑ دیتا۔ڈھولک کی تھاپ اور قوال کی آواز بتدریج رفتار پکڑتی جاتی اور پھر ایسا سماں بندھتا کہ محفل پر وجد طاری ہوجاتا۔کسی کسی سامع پر تو ''حال'' آجاتا۔

ریحانہ نے ایک روز فرمائش کی تھی۔

''مجھے رانی گنج ''غوث بنگالہ'' کے دربار میں لے چلئے۔''

''لیکن ابھی تو عرس میں کافی دن باقی ہیں۔'' اس نے کچھ حیرت سے کہا۔

''عرس میں جانے کے لیے نہیں کہہ رہی۔ یوں ہی کسی جمعرات کو چلتے ہیں۔''

اگلی جمعرات کو ہی وہ اس کے ساتھ بابا کے دربار میں حاضر ہو گیا تھا۔ زائرین کی خاصی تعداد موجود تھی۔ مزار شریف کے باہر بائیں سمت بنے ہوئے حوض میں دونوں نے وضو کیا تھا اور ایک دکان سے شیرینی اور اگربتی لے کر مزار کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ صحن میں قوالی کی محفل جمی تھی۔ ایک خوش گلو قوال نغمہ سرا تھا اور امیر خسرو سوز ہجر میں غلطاں مزار شریف کے در و دیوار پر سر پٹخ رہے تھے۔

کہ تاب ہجراں ندارم اے جان نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
کسے پڑی ہے جو سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
نہ نیند نینا نہ رنگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
سپت من کے درآئے راکھوں جو جائے پاؤ پیا کی کھتیاں

فضا میں ایک پاکیزہ اور پرسکون اداسی چھائی ہوئی تھی۔ دل تھا کہ امڈا چلا آتا تھا۔ اس نے پہلی بار جانا کہ اداسی کا بھی اپنا رنگ ہوتا ہے، اپنا آہنگ ہوتا ہے جس میں ڈوب کر تمام وجود میں ایک عجیب سی سرشاری اور مخموری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں لرزتے قدموں سے روضۂ اقدس والے حجرے میں داخل ہوئے تھے۔ روضے کی جالی چوم کر انہوں نے سلام عقیدت پیش کیا تھا۔ روضے کی دایں طرف بیٹھے ہوئے مجاور کے سامنے شیرینی کے دونے اور اگربتیوں کے پیکٹ رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی اپنا دونا وہیں رکھ دیا تھا۔ روضے سے ذرا دور ہٹ کر اس نے فاتحہ پڑھا تھا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ دعا سے فارغ ہو کر اس نے ریحانہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ روضے کی دوسری جانب جہاں چراغ روشن کیے جاتے تھے اور اگربتیاں جلائی جاتی تھیں، وہ دکھائی دی تھی۔ وہ جگہ منت مانگنے والوں کے لیے مخصوص تھی۔ وہ اس کے قریب چلا آیا۔ دیکھا کہ وہ بھی منت کا دھاگہ جالی سے باندھ رہی ہے۔ کافی دیر تک وہ دونوں وہاں موجود رہے تھے۔ بھیڑ ہونے کے باوجود چہار سمت ایک باادب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس صحن سے آتی ہوئی قوالی کی آواز سماعتوں میں رس گھول رہی تھی۔

وہ دونوں مزار شریف سے نکلے تو شام کے سائے پنکھ پسارنے لگے تھے۔ چلتے چلتے اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تم نے کیا منت مانگی؟''

اس نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر پراسراری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''منت کے بارے میں کسی کو بتایا نہیں جاتا ورنہ وہ پوری نہیں ہوتی۔''

اسے یقین تھا کہ وہ اس کے ذریعہ مانگی گئی منت کے متعلق جانتا ہے۔لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد وہ اس کے تعلق سے شبہے میں پڑ گیا تھا۔

اس کے فائنل امتحان جاری تھے۔دو پرچے ہو چکے تھے۔تیسرے پر نظر ثانی کر رہا تھا کہ وہ دبے پاؤں چلی آئی۔اس کے چہرے پر حزن و یاس کی گہری پرتیں دیکھ کر وہ بے قرار ہو اٹھا اور سرعت سے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

وہ خاموش کھڑی ہوئی اپنے دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے پختہ فرش کو کریدنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔دوبارہ استفسار کرنے پر اس نے مضمحل آواز میں رک رک کر کہا۔

''ابو......نے......میری......شادی......طے......کر دی ہے۔''

اسے لگا کہ امتحان کے لیے یاد کیے ہوئے تمام جوابات اس کے ذہن سے یک لخت محو ہو گئے ہیں۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ تم نے بتایا نہیں کہ............''

اس نے ڈوبتی ہوئی آواز کہا۔

''آپ میرے ابو کو نہیں جانتے؟ بے حد سخت گیر اور ضدی آدمی ہیں۔اس زمانے میں بھی ذات برادری کے قائل ہیں۔انہیں اپنی برادری کا کوئی برسرروزگار لڑکا مل گیا تو موقع غنیمت جان کر تاریخ تک مقرر کر دی۔دس دنوں کے بعد ہی شادی ہے۔''

وہ بے جان مجسمے کی مانند بیٹھا رہا۔قدرے توقف کے بعد ریحانہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''اب ایک ہی راستہ بچا ہے۔ہم دونوں گھر سے بھاگ چلیں اور کسی دوسرے شہر میں جا کر شادی کر لیں۔''

اکنومکس،اکاؤنٹنسی،بزنس میتھ......اس کے ذہن میں سارے مضامین گڈمڈ ہونے لگے۔فائنل اکزام،کیریئر بلڈنگ،اچھی ملازمت،اونچی تنخواہ......بہت دنوں کے بعد اس کی تاجرانہ ذہنیت از سر نو بیدار ہوئی۔کیا اسے یہ خسارے کا سودا منظور ہے؟

نہیں۔نہیں! وہ امتحان بیچ میں چھوڑ کر اپنا مستقبل تاریک نہیں کر سکتا۔اس نے اس قدر محنت کی ہے۔کیا اسے رائگاں جانے دے۔

ریحانہ دیر تک اس کے جواب کی منتظر کھڑی رہی۔اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ خاموشی سے مڑی اور بوجھل قدموں سے باہر نکل گئی۔

بی۔کام کرنے کے بعد وہ اسکول سروس کمیشن میں بیٹھا اور منتخب ہوا۔ایک اچھے گھرانے کی لڑکی

سے شادی کی، بچے ہوئے۔ بظاہر وہ ایک مطمئن اور آسودہ زندگی گزارنے لگا تھا لیکن ازدواجی زندگی کی تکرار اور بچوں کے شور کے درمیان اکثر اس کی سماعتوں میں ایک خوش آہنگ آواز لہراتی۔

موہے چاندی کی پائل منگا دو سجن......

اور آنکھوں میں ریحانہ کا حسین اداس چہرہ ابھر آتا۔ اس کا سارا وجود ایک عجیب سے درد و کرب میں ڈوب جاتا اور وہ پہروں بے چین اور مضطرب رہتا۔ اسکول میں علم معاشیات کا درس دینے کے باوجود وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ حیات نفع بخش رہی یا سراسر خسارے میں گزری۔

لاشعوری طور پر وہ ریحانہ کے تئیں احساس جرم کا شکار تھا اس لیے چاہتا تھا کہ اس کا کبھی سامنا نہ ہو۔ لیکن آج وہ اس کی عین بغل میں بیٹھی تھی۔ بس کی طویل مسافت کے دوران اس نے طے کیا کہ ریحانہ کا سامنا کیا ہی جائے۔ اپنی بزدلی پر اس کے طعنے سنے اور اس کی تلخیِ سخن کو برداشت کرے۔ بنا کسی تاویل کے اس سے معذرت کرے تاکہ اس کا برسوں کا اضطراب ختم ہو۔

بس رانی گنج کے بس اسٹینڈ پر رکی تو باقی ماندہ مسافر اترنے لگے۔ ریحانہ بھی اس کی بغل سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ بھی اس کے عقب میں موجود تھا۔ بس سے نیچے اتر کر وہ آگے بڑھ گئی۔ اس نے اپنے چہرے سے رومال ہٹایا اور اس کے تعاقب میں لپکتے ہوئے آواز دی۔

''سنئے!''

وہ چونک کر پلٹی اور حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''ریحانہ...... مجھے پہچانا...... میں...... میں ہوں...... طفیل احمد............''

اس نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر بے حد سنجیدہ اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔

''لگتا ہے کہ آپ کو کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ریحانہ نہیں اور نہ ہی آپ کو پہچانتی ہوں۔''

وہ متانت سے مڑی اور بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ ٹھگا سا کھڑا رہ گیا۔ بہت دیر بعد اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آج ہی اپنی عینک کا نمبر درست کروائے گا۔

لیکن یکا یک اس خیال سے گہرے تذبذب میں پڑ گیا کہ وہ اپنی سماعت کا کیا کرے گا؟

◄◄ ● ►►

J.N.Pharmacy, K.T.Road
Asansol 713302 W.B

● رفیع حیدر انجم

دوپیاسے

دلّی اب ان دونوں کے لئے کوئی نیا شہر نہیں رہ گیا تھا۔ گذشتہ کئی برس سے رمضان المبارک کا پورا مہینہ اسی شہر میں گذارنے کا ایک سلسلہ سا بن گیا تھا۔ اس بار بھی دونوں پوری تیاری کے ساتھ یہاں آگئے تھے اور حضرت نظام الدین کی درگاہ شریف کے قریب واقع تبلیغی جماعت کے مرکز کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ مرکز کی یہ بڑی سی عمارت ان کے لئے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ کسی بھی بڑے شہر میں سب سے بڑا مسئلہ قیام کا ہوتا ہے لیکن یہ عمارت دین اسلام کے متوالوں اور خدمت گذاروں کو قیام وطعام کے تردد سے نجات دلا دیتی ہے۔ لٰہذا ماہ صیام میں ایسے ہی لوگوں کا جم غفیر یہاں ہمہ وقت نظر آتا ہے۔ یوں تو درگاہ حضرت نظام الدین میں عقیدت مندوں کے آنے جانے کا سلسلہ ہمیشہ لگا رہتا ہے مگر رمضان کے مہینے میں اس کے قرب و جوار کے پورے علاقے پر ایک خاص رنگ کا غلبہ چھا جاتا ہے جسے شناخت کی سہولت کے لئے مولویانہ رنگ کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ ملک بھر کے مختلف شہروں، قصبوں اور گاؤں کے دین دار حضرات اس علاقے کو مہینے بھر کے لئے اپنی پناہ گاہ بنالیتے ہیں۔

مولوی ثناء الحق اور فضل الرحمٰن بھی یہاں پناہ گزیں ہو چکے تھے جو اپنے چھوٹے سے غیر معروف شہر میں شنّو اور فضلو کے نام سے جانے جاتے تھے۔ دونوں ایک ہی تنظیمی مدرسے میں ملازم تھے۔ ان کا کام مدرسے کی دیکھ ریکھ، اقامت گاہ کی صفائی ستھرائی اور مطبخ کے لئے بازار سے اشیاء خورد ونوش اور دیگر ضروریات کی چیزیں مہیا کرنے کے علاوہ مدرسوں کی فرمابرداری بجالانا تھا۔

شنّو اور فضلو کی پہلی ملاقات شہر کے ایک شراب خانے میں ہوئی تھی۔ جو شہر کے ایک نشیبی علاقے میں واقع تھا اور جہاں بانس کی لمبی لمبی جھاڑیوں کے درمیان ٹھنڈی اور آرام دہ جگہیں محفوظ تھیں۔ اُن دنوں یہ لوگ مدرسہ کے ملازم نہیں ہوئے تھے۔ نوجوانی کا عالم تھا اور بے فکری کے دن تھے۔ شنّو کورٹ کچہری میں وکیلوں کے لئے چھوٹے موٹے کام کر کے سو پچاس کمالیا کرتا تھا اور فضلو ایک پلائی مِل میں آرہ مشین چلانے کے کام پر مامور تھا۔ لیکن شام ڈھلتے ہی شراب خانے آکر دس بیس روپے کا نشہ کرنا دونوں کے معمول میں شامل تھا۔

جلد ہی روز کی ملاقات گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ اور دونوں ایک دوسرے کے گھر بھی آنے جانے لگے۔ فضلو کی پہلی بیوی دو بچوں کو چھوڑ کر اس دنیا سے جا چکی تھی۔ پہلی بیوی کے گذر جانے کے بعد اس

نے دوسری شادی کرلی تھی۔اس کی دوسری بیوی جوان اور صحت مند تھی۔لیکن شنو کی بیوی دبلی پتلی اور کمزور تھی اور ہر وقت چار چھ بچوں کے درمیان گھری نظر آتی تھی۔اس کے مزاج میں بھی بسا اوقات چڑ چڑاپن غالب رہتا جس سے شنو کو بڑی کوفت ہوا کرتی تھی۔فضلو نے اپنی بیوی کو تاکید کر رکھا تھا کہ جب وہ گھر پر نہ رہے تو شنو کو دروازے سے ہی لوٹا دیا کرے۔اس کی بیوی اس تنبیہہ پر عمل بھی کرتی تھی۔لیکن محلے کے لوگ اس کی بیوی کو اکثر و بیشتر کھڑکی کے قریب کھڑی ہوکر دیر تک موبائل پر باتیں کرتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔

عشاء کی اذان کے بعد شنو جب گھر پہنچتا تو نشے کی حالت میں بھی وہ پورے ہوش و حواس میں رہتا تھا۔بیوی بچوں کے ساتھ اس کا سلوک عام انسانوں جیسا ہی رہتا تھا لیکن رات ڈھلے جب اس کی نگاہ اپنی بیوی پر پڑتی تو یکا یک فضلو کی بیوی کا سراپا کوند جاتا اور اس کا سارا نشہ پانی کی طرح اتر جاتا اور وہ کسی چوٹ کھائے ہوئے پرندے کی طرح بے جان سا ہوکر بستر پر پڑا آنکھیں بند کر لیتا تھا۔لیکن اس طرح وہ کتنے دنوں تک آنکھیں بند کئے بستر پر پڑا رہ سکتا تھا۔چائے کی کیتلی میں رکھا ہوا پانی جب آگ کی تپش سے ابلنے لگتا ہے تو بھاپ بن کر اپنے نکلنے کا راستہ خود بخود تلاش کر لیتا ہے۔کبھی کبھی شنو کے قدم بھی اس راستے کی طرف اٹھ جایا کرتے تھے جہاں جوانیاں اُبلا کرتی ہیں۔لیکن یہ بات اس نے فضلو کو نہیں بتائی تھی۔اسے لگتا تھا کہ فضلو اس کے لئے راضی نہیں ہوگا۔حالانکہ شراب خانے میں بیٹھ کر دونوں دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد ایک انہونی ہوگئی جس نے شنو اور فضلو کی دنیا ہی بدل ڈالی۔فضلو کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا۔شنو کو فکر لاحق ہوئی۔ایک آدھ دن کا ناغہ تو ہوا تھا لیکن لگا تار پانچ دن؟......ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔چھٹے دن وہ فضلو کے گھر پہنچ گیا۔آواز دی تو فضلو باہر نکلا۔لیکن یہ کیا؟ فضلو کے چہرے کا تو رنگ ہی اُڑا ہوا ہے۔مرجھایا ہوا، کھویا ہوا سا......ویران سی آنکھیں اور بے جان سے ہونٹ۔

''کیا ہوا؟ کئی دنوں سے نظر نہیں آئے!'' شنو کی مشکوک نگاہوں کی تاب نہ لا کر فضلو نے بہ مشکل اتنا ہی کہا۔

''بھاگ گئی۔''

''بھاگ گئی؟ کون؟''

''ریحانہ۔''

''رے......اچھا......'' اس خبر پر شنو کو نہ تو غم کا جھٹکا لگا اور نہ ہی اس کے اندر خوشی کی کوئی چنگاری پھوٹی۔لیکن جب گھر آیا تو اسے پہلی بار اپنی بیوی اچھی لگی۔

فضلو کی بیوی کے فرار ہوجانے کے بعد اچانک شنو نے اپنے اندر کچھ تبدیلی سی محسوس کی۔اس

کے اندر بچوں کے لئے انسیت کا جذبہ جاگ اٹھا تھا اور بیوی کے چڑ چڑے پن سے بھی اسے لطف آنے لگ تھا۔اس ناگہانی تبدیلی پر وہ حیران تھا اور خوشی بھی۔

فضلو نے دوسری شادی عجلت میں کی تھی۔لیکن تیسری شادی کے خیال پر وہ کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے میں بار بار نا کام ہو رہا تھا۔اسے اب شراب نوشی کی خواہش بھی نہیں ہوتی تھی۔کسی کام سے بھی طبیعت اچاٹ ہوگئی تھی لہٰذا زیادہ تر وقت گھر پر ہی سویا پڑا رہتا تھا۔

ایک روز اس نے شنو کے گھر کا رخ کیا اور وہاں دیر تک بیٹھا رہا۔شنو اس کی دل جوئی کرتا رہا۔شنو کی بیوی کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ اگر اس عورت کا معقول علاج کرایا جائے تو یہ صحت مند ہو سکتی ہے اور اگر صحت اچھی ہوگئی تو خوبصورت اور جوان بھی نظر آنے لگے گی۔

اچانک فضلو نے شنو سے کہا۔

''یار میں مسجد کے امام صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''امام صاحب؟'' شنو حیران ہوا۔''مگر کیوں؟''

''ان سے مل کر پوچھوں گا، تیسری شادی کرنا میرے حق میں بہتر ہوگا کہ نہیں۔''

''ارے تو اس میں امام صاحب سے پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟ مسلمان تو چار شادی کر ہی سکتا ہے۔'' شنو نے اپنی دانست میں علمیت بگھاری۔

فضلو مسکرایا اور کہا۔

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر میرا دل امام صاحب کی مرضی جاننا چاہتا ہے۔''

''تو پھر اس میں کیا مشکل ہے۔ابھی چلتے ہیں۔'' شنو نے خوش دلی سے کہا۔

دونوں فی الفور امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔یوں تو جمعہ کی نماز دونوں بلاناغہ ادا کرتے تھے اور امام صاحب کی تقریر سننا انہیں اچھا لگتا تھا۔لیکن کسی خاص مقصد سے دونوں پہلی بار یہاں آئے تھے۔مسجد سے ملحق ایک کمرہ امام صاحب کے لئے مخصوص تھا۔دونوں بڑے ادب واحترام سے اس کمرے میں اجازت لے کر داخل ہوگئے۔فضلو نے امام صاحب سے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ چند ثانیہ خاموش رہے، پھر کہا کہ شادی تو تمہیں کر لینی چاہئے مگر فی الحال تم اپنا یہ ارادہ ملتوی کردو اور وقتاً فوقتاً مجھ سے ملتے رہو۔مناسب وقت پر میں تمہیں اس کی اجازت دے دوں گا۔فضلو نے امام صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور جب بھی موقع ملا، دونوں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔

بس یہیں سے فضلو اور شنو کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی۔دونوں امام صاحب سے ملتے رہے

اوران کی ہدایت پر عمل کرتے رہے۔ دونوں نے پانچ وقت کی نماز شروع کر دی اور دو ایک بار چلہ کشی بھی کر آئے۔ امام صاحب کی بدولت ہی دونوں کو مدرسے کی ملازمت بھی ملی۔ دین سے لگاؤ اور مدرسہ کے تعلیمی وتبلیغی ماحول میں رہ کر دونوں نے اپنی وضع قطع، لباس اور حلیہ بھی تبدیل کر لیا تھا۔ اب لوگ انہیں بھی مولوی صاحب کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے لیکن مدرسہ سے جو قلیل تنخواہ انہیں ملتی تھی اس سے گذر بسر کسمپرسی میں ہو رہا تھا۔ مہنگائی جنگل کی آگ کی طرح بڑھتی جا رہی تھی مگر تنخواہ ایک مقررہ رقم پر اٹکی ہوئی تھی۔ بیوی کا علاج، گھر کا کرایہ، بچوں کی تعلیم اور ایسے ہی بیسیوں ضرورتوں کو پورا کر پانا دشوار ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ تنگ دستی میں گذارنے کے بعد انہیں آمدنی کا ایک دوسرا ذریعہ ہاتھ آیا۔ اس آمدنی کی ترغیب مدرسہ کے ایک مدرس ہی نے دی تھی۔ رمضان کے مہینے میں مدرسے میں تعطیل ہو جایا کرتی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ زکوٰۃ، امداد و عطیات وصول کرلائیں تو اس کے عوض معقول کمیشن دیا جائے گا۔ اس پیش کش کو انہوں نے خوش دلی سے قبول کر لیا تھا اور گذشتہ کئی سال سے اس کام میں دونوں نے مہارت حاصل کر لی تھی۔ اب دونوں ہر سال رمضان کے مہینے میں دلی آتے اور اپنے تجربے کی بنیاد پر شاد کام ہو کر گھر کو لوٹتے۔

شنو اور فضلو آج بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ گھر واپسی کا وقت قریب آ پہنچا تھا۔ عید میں اب چند روز باقی رہ گئے تھے۔ اس بار توقع سے زیادہ ہی رقم ہاتھ لگی تھی۔ خوشی میں سرشار دونوں نے آج لال قلعہ گھومنے کا پروگرام بنالیا تھا۔ جب وہ لال قلعہ پہنچے تو دن کا تقریباً ایک بج چکا تھا۔ لال قلعہ کا بلند و بالا دروازہ دیکھ کر انہوں نے سبحان اللہ کا ورد کیا اور اس کے در و دیوار کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے اندر کی طرف داخل ہوئے۔ آج گرمی حد سے سوا تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ لال قلعہ کے پتھر دھوپ کی تمازت سے کچھ اور سرخ ہو گئے ہیں۔ کافی دیر تک قلعہ کے وسیع و عریض احاطے کا چکر لگا کر دونوں نڈھال ہو چکے تھے۔ تھکان، حبس اور تپش سے ان کے حلق سوکھنے لگے تھے۔ کچھ دیر دیوان خاص کی صحن پر بیٹھ کر دونوں نے سستانے کی کوشش کی مگر پیاس کی شدت کسی طور پر چین لینے نہیں دیتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا، اگر پیاس نہیں بجھائی گئی تو ان پر بے ہوشی طاری ہو جائے گی یا شاید دم ہی نکل جائے۔ مگر دونوں روزے سے تھے اور نفسانی خواہشات پر قابو پالینے کے نام ہی تو روزہ ہے۔ یہی تو وہ گھڑی ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر خود کی تلقین کی اور روزہ توڑنے کے شیطانی وسوسے کو ذہن سے جھٹک دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن لمحہ بہ لمحہ پیاس کی شدت کے آگے ان کے ارادے کمزور اور صبر کی ڈور ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ ایمانی سکے کا دوسرا رخ بھی اب سامنے آنے لگا تھا۔ اللہ نے یہ بھی تو کہا ہے کہ ہر حال میں اپنی جان کی حفاظت کرو۔ یہ زندگی اللہ کی دی ہوئی امانت ہے جسے وہ ایک مقررہ وقت پر طلب کرے گا۔ پیاس

کی شدت سے تڑپ تڑپ کر جان دے دینا خودکشی کے مترادف ہے اور اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ دونوں ایک ہی ذہنی کیفیت سے گذر رہے تھے لیکن اپنا منشا ایک دوسرے پر ظاہر نہیں کر پا رہے تھے۔

گرمی کی شدت کے باوجود لال قلعہ میں سیلانیوں کی کمی نہ تھی۔ اتنی بھیڑ تو ضرور تھی کہ کوئی چاہے تو کسی کی نظروں سے تھوڑی دیر کے لئے اوجھل ہو جائے۔ اچانک شنو یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا کہ میں ذرا چھتہ بازار کی طرف جا رہا ہوں۔ فضلو نے ایسے ظاہر کیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ شنو کے جانے کے بعد فضلو نے چند لمحے کے لئے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر آہستہ آہستہ لال قلعہ کے صدر دروازہ سے باہر آ گیا۔ باہر سڑک پر جابجا ٹھنڈے پانی کی ریڑھیاں لگی تھیں۔ فضلو کے قدم لاشعوری طور پر اسی جانب بڑھتے چلے گئے۔ ٹھنڈے پانی سے سیراب ہو کر فضلو واپس آ کر اسی صحن پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں شنو بھی آ گیا۔ اُس کے چہرے سے شادابی عیاں تھی۔ دونوں نے صحن پر پیر پھیلا کر کچھ وقت آرام سے گذارا۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سورج کی تمازت بھی اب غروب کی جانب گامزن تھی اور اب ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ لیکن حبس بدستور قائم تھا۔

غروب آفتاب سے قبل لال قلعہ سے باہر نکل کر موسم کی خوش گوار آہٹ سے دونوں مسرور ہوئے اور خراماں خراماں جامع مسجد کی طرف بڑھنے لگے۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اندر وسیع و عریض صحن کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ روزے داروں کی قطار صف آرا ہے اور انواع و اقسام کے افطاران کے آگے قرینے سے سجے ہوئے ہیں۔ وہاں پر موجود روزے داروں نے ان دونوں کا خیر مقدم کیا اور افطار میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ دونوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ دعوت قبول کی اور روزے داروں کی صف میں شامل ہو گئے۔

چند ثانئے کے توقف کے بعد مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ شنو اور فضلو نے روزہ کھولنے کی دعا پڑھی اور شربت روح افزا کے کئی گلاس یکے بعد دیگرے حلق سے نیچے اس طرح انڈیل گئے جیسے برسوں کے پیاسے ہوں۔

◄◄ ● ►►

At.Gachhi Tola
Ward No:24
P.O.& Dist: Araria-854311
Mob:8002058079

● مقصود حسن

ڈیٹنشن کیمپ

"Are you Safe?

واٹس ایپ میسج کی آواز سن کر میں نے موبائل کا اسکرین آن کیا اور واٹس ایپ چیک کرنے لگا......آنند کا میسج تھا...... پہلے تو مجھے بہت غصہ آیا تھا پھر ہنسی بھی آئی......اگر چہ وہ اندھیرے اور سناٹے کا غلام تھا مگر مجھے اسکی نیت پر شک نہیں تھا۔ یہ اسکی چھیڑ تھی کیونکہ ہم دونوں میں ایسی کھینچا تانی چلتی رہتی تھی۔

اُن دنوں میرے ذہن پر بس ایک ہی خیال غالب رہتا تھا۔ میں سارے کام چھوڑ کر سارا دن اسی شیطانی قانون کے بارے میں سوچتا رہتا تھا...... دوستوں سے اس پر بحثیں ہوتی رہتی تھیں......آفس میں بھی سبھی کے ہونٹوں پر ایک ہی بات تھی......اُن سب کے بیچ میں اکیلا پڑ گیا تھا۔ آفس میں زیادہ تر لوگ من ہی من میں خوشی منا رہے تھے۔ کچھ تو کھلے عام جشن بھی منا رہے تھے۔ بظاہر اُن کا نشانہ پڑوسی ممالک کے لوگ تھے مگر اُن کی آڑ میں انہوں نے مجھے اور میری پوری بنیاد کو نشانے کی زد پر رکھا تھا۔

اِدھر چند برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ مجھے اپنے ارد گرد ایک اَن دیکھی دیوار اٹھتی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دوست اور شناسا اجنبی سے لگنے لگے تھے۔ مجھے اپنے آفس میں اور پھر اپنے ارد گرد گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

پچھلے کچھ برسوں میں اندھیرے اور سناٹے کا غلبہ اور دبدبہ کافی بڑھ چکا تھا۔ اندھیرے نے لوگوں کے دلوں میں نفرت کا ایسا بیج بو دیا تھا کہ اُن کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون سفید ہو گیا تھا اور انکی آنکھوں کی پرتیں سور کے چمڑے کی طرح موٹی ہو گئی تھیں۔ اور ان کے چاہنے والوں کے ضمیر مردہ جانوروں کی طرح سڑنے گلنے لگے تھے جن سے بدبو اٹھنے لگی تھی......

یوں تو نفرت کے بیج بونے کا کام بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا اور برسوں سے پروپگنڈے کا کھاد ڈالنے کا کام بھی چل رہا تھا چنانچہ اب زمین ایسی تیار ہو گئی تھی کہ اس بار جو نئی فصل اُگی وہ اتنی غلیظ اور جراثیم زدہ تھی کہ اس کی فطرت خونخوار کتوں اور گدھوں جیسی ہو گئی...... یہ عقل سے گدھے تھے مگر ان کے آگے ہڈی پھینکنے پر وہ وحشی کتوں میں بدل جاتے تھے جنہیں کبھی بھی نوچنے کھسوٹنے کیلئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

یہاں اندھیرے کے ساجھے دار سناٹے کا ذکر ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ وہ شیطانی قانون اسی

سناٹے کی خباثت کا نتیجہ تھا۔سناٹے کے دونوں ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے، وہ خون کی ہولی کھیل چکا تھا......اس نے اتنے خون بہائے تھے کہ سابرمتی کا پانی لال ہوگیا تھا۔اس کی خصلت ایسی تھی کہ اگر سابرمتی کا سپوت آج زندہ ہوتا تو وہ شرم سے خودکشی کر لیتا!!

اس سناٹے نے شیطانی قانون بنانے سے پہلے جو تیاری کی تھی اس کا ذکر ہونا بھی ضروری ہے۔ اس نے پورے ملک میں کوؤں کی ایک جماعت بنائی تھی اوران کی اچھی طرح منھ بھرائی بھی کردی تھی۔ یہ کوؤے شام ہوتے ہی کائیں کائیں کرنا شروع کر دیتے تھے اوراس کائیں کائیں کے شوروغل میں ہر سچ دب جاتا تھا......اگر کوئی سناٹے یا اندھیرے کے خلاف آواز اٹھاتا تو یہ کوؤے اس پر ایسے ٹوٹ پڑتے اور اسے اس طرح نوچنے لگتے کہ وہ بیچارہ بے بس ہوکر خاموش ہوجاتا ورنہ یہ کوئے اسے ملک کا غدار ٹھہرا کر اس کی زندگی اجیرن کردیتے۔اس طرح سناٹے نے پورے ملک میں ایسا خوف وہراس کا ماحول پیدا کر رکھا تھا کہ انصاف کی دیوی اس کی لونڈی بن کر ایک داشتہ کی طرح حرکت کرنے لگی تھی۔ سناٹا گھوڑوں کی خرید و فروخت میں بھی ماہر تھااوراس کے اِس طرزِعمل سے ہرجگہ دستوری نظام کی زنا بالجبر ہورہی تھی......

شیطانی قانون کی فطرت بھی شیطانی تھی......سناٹے نے بہت چالاکی سے اسے نافذ کیا تھااور بہت ہی بےشرمی اور بےحیائی سے اس کا دفاع کرر ہا تھا......اس کے پاس کتوں، گدھوں اورکوؤں کی ایک ایسی فوج تھی جواس قانون کونافذ کروانے کے لیے پاگل ہوچکی تھی......سناٹا اپنی شیطانیت پر مغرور تھااوراسکی شیطانیت،اس شیطانی قانون میں بھی جھلک رہی تھی......اس قانون کے شکنجے میں، میں اورمیری پوری بنیاد جکڑ چکی تھیں...... یوں محسوس ہورہا تھا کہ اچانک ہمارے پیروں تلے زمین کھسک گئی ہواورسر سے آسماں غائب ہو چکا ہواور ہم خلا میں معلق نظر آ رہے ہوں......ہرطرف افراتفری کا ماحول تھا۔ہم پیر رکھنے کے لئے زمین ڈھونڈ رہے تھے۔وہ زمین جو ہماری شناخت تھی آج اچانک ہم سے ہمارے ہونے کا ثبوت مانگ رہی تھی۔اندھیرا اور سناٹا ہماری لاچاری اوربےبسی پر زہریلی ہنسی ہنس رہے تھے مگر انہیں اندر ہی اندر ایک بات کھائے جارہی تھی۔

ہمارے ساتھ بہت سے فرشتے صفت امن کے پجاری بھی تھے اور یہی بات انہیں پریشان کر رہی تھی۔ان کے حوصلے سے ہمارا جوش پرواز کر رہا تھا، ہمارے لوگ شہید ہورہے تھے، کچھ ماؤں کی گودیں اجڑ رہی تھیں تو کچھ بچوں کے سروں سے ان کے والدین کا سایہ اٹھ رہا تھا۔

ان ہی دنوں ایک شام واٹس ایپ پر آنند کا وہ میسج آیا تھا!!

میں نے بھی ازراہ مذاق جواب دیا تھا۔

”نہیں بھائی, اب تمہیں میرے کام آؤگے... میرے پاس تو ایسے کاغذات نہیں ہیں،تمہیں بنا

دیناا ور اگر ڈیٹینشن کیمپ میں جانا پڑے تو صابن، تیل وغیرہ بھی پہنچاتے رہنا۔''

اس نے جواب میں ہنسنے والے ایموجیز (emojis) بھیجے......

میں نے بھی رونے والا ایک ایموجی بھیجا......

اس کا جواب آیا ''ارے یار، تم لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا......تم لوگ تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو......یہ تو ان گھس پیٹیوں کے لئے ہے جو غیر قانونی طور پر ہمارے دیش میں گھس آئے ہیں۔''

اسی طرح روزانہ ہماری کھینچا تانی چلتی رہتی......آنند لڑکا اچھا تھا مگر اندھیرے کا غلام......اس کی آنکھوں پر ایک خاص رنگ کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ پھر ایک دن سناٹے نے شاہینوں پر اپنے کتے چھوڑ دیے......شاہینوں کے پَر بندھے ہوئے تھے، کتوں نے بہت بری طرح انہیں نوچا کھسوٹا......ان کے گھونسلوں میں آگ لگا دی......کچھ گھونسلوں کے تنکے اٹھا کر لے گئے۔ سناٹے نے اپنے کتوں کو واپس بلا لیا......وہ اپنا کام کر چکے تھے...... شاہین مدد کیلئے چلاتے رہے......مگر پہرے داروں میں بھی کتے شامل تھے......دنیا تھوکتی رہی......مگر اندھیرے اور سناٹے بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی سے اپنے کتوں کا دفاع کرتے رہے......انصاف تو پہلے ہی لونڈی بن چکی تھی......صرف تماشائی بنی دیکھتی رہی......اندھیرے اور سناٹے اسکی منہ بھرائی کر چکے تھے......شاہینوں کا جوش بڑھتا رہا......دن سے رات، پھر دن......گھڑی کی سوئی گھومتی رہی......مگر اندھیرے اور سناٹے کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی...... پھر قدرت نے ایک دن اپنا نیا قانون لاگو کیا......اس قانون میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا......یہ قانون آہستہ آہستہ اپنا شکنجہ کسنے لگا......

اب ہزاروں لوگ اس شکنجے میں پھنس چکے تھے۔ سینکڑوں لوگ اس قانون کے شکار ہو چکے تھے۔ اندھیرے اور سناٹے نے ابھی تک اپنے کتوں، گدھوں اور کوؤں کی حفاظت کے لئے کوئی معقول انتظام نہیں کیا تھا۔ سناٹا غائب ہو چکا تھا۔ پھر اندھیرا ایک دن نمودار ہوا ہے اور اپنے غلاموں کو مزید اور اندھیرے میں ڈھکیل دیا۔

گدھے شام ہوتے ہی تھالی، گھنٹے اور تالی بجانے لگے تاکہ قدرت کا قانون واپس چلا جائے۔

آنند نے بھی گھنٹہ بجایا اور مجھے واٹس ایپ پر اپنی تصویریں بھیجیں۔

"Are you safe?"

ٹائپ کر کے میں سوچ رہا ہوں کہ آنند کو واٹس ایپ کروں یا نہیں!! فی الحال ہم دونوں میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے......ہم اپنے اپنے گھروں کے ڈیٹینشن کیمپ میں بند ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

SP (HQ), Baruipur Police District, Zila Parishad Bhawan,
Kulpi Road PO : Baruipur Kolkata -700144(WB) Mob :8617894344

● سیدہ آیت گیلانی

داستاں ایک شجر کی

راوی روایت کرتے ہیں کہ دشتِ بے کراں میں پروان چڑھنے والے اُس گھنے اور بلند و بالا شجر کو باغباں نے اپنے لہو سے سینچا تھا۔ باغبان کی ریاضت کا یہ اکلوتا ثمر تھا سو وہ ورثے میں فقط یہی شجر چھوڑ کر رخصت ہوا۔ اولاد نے بھی جَد کی طرح وراثت کو قیمتی امانت سمجھتے ہوئے اس کی آبیاری کو ہی ایمان جانا مگر جیسے جیسے وہ پھلتا پھولتا گیا ذریت کو نگلتا گیا۔ وہ خون پیتا گیا اوراس کا جسم توانا ہوتا گیا۔ خون کا ہر نیا پیالہ اس کو نئی زندگی عطا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جو کنبہ اس کی شادابی کی خاطر کٹا اسی کو گھنے سائے کے بجائے دھوپ کا کنارہ ملا۔

شجر کی ذریت سے بے وفائی کے قصے جب عام ہوئے تو غم سے نڈھال ایک گروہ گریہ کرتے ہوئے اٹھا۔ جن کے بین داستانِ وفا کی تفسیر اور کہانی رنج والم کی سناتے تھے۔ شاہِ عشرت جو کہ آواز سے گریزاں اور خوابِ طرب کا دلدادہ تھا، رخسارِ شب پر پڑتی نالہ وشیون کی ضربوں نے جب اس کی خلوت میں خلل ڈالا تو متفقہ رائے سے اس نے سب کے ہاتھ پشتوں پہ باندھ کر زبانوں کو قطع کرنے کا حکم جاری کردیا۔ کشتوں کے پشتے لگے مگر اس کے باوجود معمولاتِ زندگی رواں دواں رہے، بس یہ ہوا کہ باقی لوگوں نے زبانوں کو مونہوں سے کھینچ کر چھپا دیا اور بھول گئے کہ کہاں رکھی ہیں۔ زبان کی ضرورت تو تب ہوتی جب دُکھ سانجھا ہوتا۔

''اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ'' کلمۂ وقت قرار پایا تو انہوں نے اشارے ایجاد کر لیے۔ صدیوں بعد ضرورت کے باعث خدایاد آیا تو بولنا ناگزیر ہوا۔ زبان کی تلاش جاری ہوئی۔ مگر بے سود۔ کچھ ڈھانچے ملے مگر عینک والوں کے مطابق یہ ہڈیاں لب و دہن سے محروم، حرف و نطق کے ذائقے سے ناآشنا ان زبانوں کی تھیں جو لغت کے بوسیدہ اوراق میں دم گھٹنے کے باعث ہلاک ہوئی تھیں۔ وہاں کہنے والے بے تاب تھے اور بات بولائی پھرتی تھی مگر بول سماعتوں میں گھل کر دل تک رسائی پانے سے محروم تھے۔ گیتوں کے نُطق پہ پہرہ بدستور قائم تھا اور نوحوں کے لب سلے تھے...... جنھیں گفتار کی آزادی تھی انہوں نے گھٹی میں چُپ چکھی تھی کیسے کہتے کہ مدعا کیا ہے؟ مجبور لفظ آنکھوں سے بہنے لگے تو آنسو

کی کثرت نے پانی کو کڑوا کر دیا۔ درد کے مادے میں بارود گھلا تھا سو خوفزدہ ہوا سریلی بانسری سے نظر چُرا کر کسی اور سمت سے گزرتی تھی۔ پرندے بھی اسی ڈر سے کب کے کُوچ کر چکے تھے۔ محبت رسم تک محدود ہو کر رہ گئی تو کواڑوں کو کھلا رکھنا اور دہلیز پہ چراغ جلانا جرم متصور ہوا۔

حیا سے عاری، عیاری جو کہ پیوند کاری کی ماہر تھی اس نے بھی اس خرابے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ ہرے لبادے اوڑھا کر مٹی کی ٹہنیوں کو اس مہارت سے شاخوں کے ساتھ جوڑا کہ وہ زرق برق خلعت پوش شہزادیوں کی مثل اترانے لگیں۔ وہ جانتی تھی عقیدت کے اندھوں کے لیے رنگ ہی کافی ہے ذات کے زعم میں گرفتاروں نے اپنے خدا آپ بنا لیے تو عبا والوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ کسی کی مجال نہ تھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی بابت سوچتا۔ کچہریاں خدا کے نام سے ہی شروع کی جاتی تھیں یہ اور بات صحیفے دھندلی ہو چکی تھیں۔

روشنی برائے نام باقی تھی سبب یہ کہ کرنوں پر مخصوص لوگوں کی اجارہ داری تھی جن کے بلند ہاتھ انہیں مٹھیوں میں دبوچ کر اپنی مرضی کے سنہری مقفل طاقچوں میں بند کر چکے تھے۔ اب اجالے کی سمت کا تعین ان کے اشارۂ انگشت کا محتاج تھا جنھوں نے بڑے ٹہنوں سے عصا تراش لیے تھے۔ وہ نہ تو موسیٰ تھے نہ سامری مگر خودرو پودوں کی طرح بدہئیت بچھڑوں کی کثیر تعداد ان کی نوک پلک کی جنبش سے آن واحد میں زمین کے سینے پہ دندنانے لگتی۔ علم مفضول اور عمامہ افضل تھا اس لیے دینار کو دستار پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ غرض اور مفاد کے سکے ہاتھوں ہاتھ لیے جانے لگے تو بھینس نے شگن کا دھاگہ باندھ کر لاٹھی سے بہناپا جوڑ لیا۔ بھلا کون سر پھٹول میں پڑتا۔ دھاگے کی گرہ نے یہ حقیقت عیاں کی کہ روشنی روٹھ چکی ہے۔

خدا کے نزدیک خاموشی زہر آلود خطا اور باعثِ کفرانِ نعمت تھی۔ اس لیے شور کا عذاب غالب آیا جس کی حدت افزا دھمک سے کٹی زبانوں کے پرانے زخم بھی ابل پڑے۔ مشکوک موسم کی ہواؤں نے فضاؤں کو مسموم کرتے ہوئے سب سے پہلے شجر کی نام نہاد شادابی کو نگلا۔ شاخوں کے سر جھکے اور تونگر پیڑ کے خالی ہاتھ ایسے مڑ گئے جیسے بھکاری تشنج زدہ انگلیوں والی ہتھیلیاں پھیلاتا ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اندھیرے میں تاریخ کے حروف نے الٹا پھیرا لیا تو وقت نے مدہوش غیرت کے منہ پر کراہت کے مارے قے کر دی۔ جس کی بدبو سارے چمن میں یکلخت پھیل گئی۔ کنجِ قلب کا ہر گوشہ متعفن ہوا۔ کفِ افسوس کون ملتا کہ ہاتھ ابھی تک بندھے تھے۔ نااہل باغبانوں نے گٹھ جوڑ سے پیوندزدہ شاخیں حفظ ماتقدم کے طور پر الگ کر لیں تو قہر کی لپیٹ میں آئے کسی مدقوق کی مثل گھلتے شجر کے ناتواں پتے مسلسل جھڑنے اور شاخیں تیزی سے کٹنے لگیں۔ مجروح کونپلوں کے بہتے لہو کی ہر بوند سے ھل من ناصر کی صدا بلند ہوتی تھی مگر ٹوٹی ٹہنیوں میں نصرت

کی ہمت و طاقت تھی نہ جذبہ، جبکہ شہرِ بے آبرو کے کان سننے سے قاصر تھے۔ امداد کو کون آتا؟ ناصروں کے سب امن پسند قافلے تو اسی دن رخصت ہو گئے تھے جب تلوار اور دیوار کے درمیان، در تلے دبی لہولہو کہانی کا قصہ تختِ ملوکیت کے پائے تلے چھپا دیا گیا تھا۔

وقت شاید اسی تاک میں تھا اس موسم کے آتے ہی محبت اور مروت کی کونپلیں مرجھا گئیں اور روایتیں اپنی جڑوں سمیت زمین میں دھنس گئیں، ردائیز مانہ کی اوٹ سے دشنامائی سوچ کے سوتے پھوٹے اور جنگ کے نام پر کاروبار کا آغاز ہوا تو اس شجر کی جڑوں کو کاٹ کاٹ کر کئی منقسم روپ دے کر نئے بیج لگائے گئے جن کی پھوٹ سے نکلی شاخوں نے دماغوں کو امر بیل کی طرح چاٹ لیا۔ وہ شجر اپنے دفاع کے لیے اپنے ابراھیم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس نے صدائیں بلند کیں جن میں باغبان جیسے کسی مہربان کی جستجو کرلاتی تو دھوپ کنارے شکستہ بدن تڑپنے لگتے...... منقسم اجزا کو کُل کا فراق لگ تڑپاتا۔ ورثہ، وارث کو پکارتا تو ہر ڈال رونے لگتی۔ کوئی خسارے پہ ماتم کناں ہوتی تو کوئی انمول خرچے پہ محوِ گریہ۔ حساب حشر تک ملتوی ہو چکا تھا۔ چپ کا دستور ہنوز جاری ہے۔ آج تک راوی یہی روایت کرتے ہیں...... باقی خدا جانتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Holding No. 11 Safari Block
Behind of DPS, 94 Road
Sahiwal, Panjab, Pakistan

شہرذات (ناول)

مصنف : شاہد اختر قیمت : ۳۰۰ روپے

صفحات : ۲۰۲

ملنے کا پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔٦ بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۴
کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی راعی بک ڈپو، ۳۴۷ اولڈ کٹرہ پریاگ راج یوپی
ایجوکیشن بک ہاؤس، علی گڑھ کتاب دار، ممبئی
ہدیٰ بک ڈسٹری، بیوٹرس، حیدرآباد عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ

● گل ارباب

باغی

وہ دونوں گھبرائے ہوئے تو تھے مگر پر اعتماد نظر آنے کے لیے گھبراہٹ چھپانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔لیکن میری زیرک نگاہوں سے لڑکی کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اور لڑکے کی آنکھوں سے جھلکتی خوف کی لکیریں چھپی نہ رہ سکیں۔وہ دونوں کچھ دیر پہلے ہی پولیس موبائل سے اتار کر میرے آفس لائے گئے تھے۔

ایس ایچ او نور محمد نے لڑکے کو اتنے زور کا دھکا دیا کہ وہ میری میز سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا کالے برقعے میں ملبوس لڑکی کی جسامت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال اور لڑکے کی بیس سال تک ہوگی لڑکی نے چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا اس لیے اس کی شکل دیکھ کر میں کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔لیکن لڑکا اچھا خاصا خوب صورت اور ماڈرن لگ رہا تھا۔جدید فیشن کے مطابق کندھوں تک لمبے بال بالوں میں کالا ہیر بینڈ اور ہاتھ میں پہنا بریسلٹ اس کے مزاج کی چغلی کھا رہے تھے۔وہ ایک ایسا لڑکا نظر آ رہا تھا جسے ہم اپنی زبان میں ڈَم کہا کرتے ہیں اب تو پڑھے لکھے لوگوں نے ڈم کو ڈی جے کا نام دے رکھا ہے۔جبکہ لڑکی کا عبایا پہننے کا انداز اور پھر بنا ہاتھ کے سہارے کے نقاب کا چہرے کو چھپانا گواہی دے رہا تھا کہ وہ شرعی پردے کی پابند ہے۔

''سر یہ دونوں پارک میں بیٹھے نازیبا حرکات میں مشغول تھے......پوچھنے پر بتایا کہ دونوں میاں بیوی ہیں۔لیکن سر اتنی رات کو کوئی عقل کا اندھا اپنی سگی بیوی کو لے کر یوں اس ویران پارک میں بیٹھ سکتا ہے نازیبا حرکات کے لیے بیڈ روم تو ہوتا ہی ہے،اور سوتیلی بیوی تو ہوتی ہی نہیں مطلب امکان ہی ختم ان کے میاں بیوی ہونے کا۔''

'' نور محمد! پلیز بات مختصر کیا کریں۔بولنے پر آتے ہیں تو چپ ہونے کی دعا کرنی پڑتی ہے۔جب سے آپ کا افسر بن کر آیا ہوں اللہ پاک کے اور قریب آ گیا ہوں۔'' وہ بنا شرمندگی کے سر کھجاتے ہوئے مسکرانے لگا۔اسے عادت ہو چکی تھی ایسی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دینے کی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے لڑکے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ غیر ارادی طور پر نظریں چرا کر بولا۔

''میرا نام غازی خان ہے سر۔'' میں نے لڑکی کے لرزتے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر اس کا نام پوچھا

تو اس کی آواز بھی پورے وجود کے ساتھ لرز رہی تھی۔

''پش ش پشمینہ آفریدی'' وہ نام بتا کر سسکنے لگی۔ میں نے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایس ایچ او سمیت سب کو کمرے سے نکال دیا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے میری جوان بھابھی فوت ہوئی ہیں اور صبح ان کا چالیسواں ہے میں نے انتظامات دیکھنے ہیں۔ اس لیے جلدی جلدی بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟'' میرے اس طرح پوچھنے پر بھی وہ دونوں چپ رہے تو میں نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اک لمبی سانس لی اور آٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ایس ایچ او اور دیگر عملہ اتنی شرافت سے تم دونوں سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ بلکہ جب تم بتانا چاہو گے تب منہ سے آواز بھی نہیں نکلے گی۔ یہ لوگ مارتے ہوئے یہ نہیں دیکھتے کہ چوٹ کہاں لگ رہی ہے۔''

غازی خان نے سہم کر جلدی سے بولنا شروع کر دیا

''سر پلیز ہم سب کچھ بتاتے ہیں بس آپ ہمیں ان جانوروں کے حوالے نہ کریں'' شاید اس نے رستے میں مار کا ٹریلر دیکھ لیا تھا۔ میں واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

''شروع سے بتاؤ معاملہ کیا ہے؟'' لڑکی سر جھکائے مسلسل روئے جا رہی تھی۔

''سر! پشمینہ میرے گاؤں کی ہے اور......اور ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ہمارے گھر والے کبھی ہمارے رشتے کے لیے نہ مانتے......اس لیے کہ میری منگنی بچپن میں طے کر دی گئی تھی اور پشمینہ کی بات بھی خاندان میں طے تھی۔'' وہ بول رہا تھا اور میں دل ہی دل میں اگلی سچویشن کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پشمینہ مدرسے جاتی تو راستے میں ہماری ملاقات ہو جاتی تھی لیکن جب اس کی شادی کی تیاری شروع ہوئی تو ہم دونوں نے جدائی کی لمبی راہ پر چلنے کے بجائے نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا اور آج ہم اسی لیے گھر سے بھاگ کر شہر آ گئے کہ نکاح کر کے کبھی نہ بچھڑنے کا معاہدہ کر لیں۔''

میں نے پوچھا ''تو تم لوگ نکاح کر چکے ہو؟'' وہ جیسے کسی جرم کا اعتراف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ لڑکی کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

''آج دوپہر کو ہم نے نکاح کیا اور شام تک پارک میں بیٹھ کر یہ سوچتے رہے کہ اب کہاں جائیں جس دوست نے سب انتظام کیا تھا وہ بھی ڈر گیا کہ گھر لے گیا تو اس کی فیملی مصیبت میں نہ پڑ جائے؟'' میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''کیا مطلب بغیر کسی انتظام کے تم لڑکی کو گھر سے نکال کر لے آئے؟'' وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''اب جو ہونا تھا سو ہو گیا......تم اپنے اور لڑکی کے والد کا نام بتاؤ تا کہ ہم معلومات کر سکیں۔'' وہ

پریشانی سے مجھے دیکھ رہا تھا اور لڑکی کا سارا وجود ایک بار پھر لرزنے لگا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ اپنی ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ میری منت کرنے لگا کہ میں انہیں چھوڑ دوں۔

''اگر میرے والدین کو علم ہوا تو انہیں بہت تکلیف ہوگی۔ میری منگنی چچا کی بیٹی سے ہوئی ہے اور ہمارے خاندان میں باغی کی سزا موت ہوتی ہے۔'' میں نے اسے گھورا۔

''مسٹر غازی خان یہ سب اس لڑکی کو گھر سے نکالنے کے بعد سوچ رہے ہو؟ تم جانتے ہو کہ اس لڑکی کے باپ کا نام سن کر میرا دل کانپ اٹھا ہے کیونکہ وہ اپنے علاقے کی ایک بہت ہی مشہور اور باعزت شخصیت ہیں اور ان کے قبیلے کی روایات کے مطابق عورت کا بغاوت کے بارے میں سوچنا بھی جرم ہے اور اس جرم کی کم سے کم سزا موت ہو سکتی ہے۔'' میری بات سن کر دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''تم لوگ صبح سے نکلے ہوئے ہو یقیناً اب تک بات پھیل چکی ہوگی اور لڑکی کی تلاش بھی شروع ہو چکی ہوگی جس کا انجام تم دونوں کی موت ہوگا اور موت کے ساتھ ساتھ رسوائی بھی تم دونوں کے خاندانوں کا مقدر بن چکی ہے۔''

''غازی خان میں تمہارے والد کو بلا کر بات کرتا ہوں، لیکن یہ یاد رکھو کہ اس معاملے کے بعد خاندانی دشمنی کئی جانیں لے کر بھی ختم نہیں ہوگی۔'' ہم سہمے ہوئے غازی خان کے باپ کے منتظر تھے میرے فون کے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ میری تاکید کے مطابق اکیلا وہاں موجود تھا۔

ساری صورتحال سے آگاہ ہوتے ہی اس نے سرخ آنکھوں میں قہر بھر کر بیٹے کو گھورا جس کا سر شرمندگی سے اتنا جھکا ہوا تھا کہ اس کی ٹھوڑی سینے سے لگ چکی تھی۔

''بے غیرت! کم سے کم یہ تو سوچا ہوتا کہ تیرے گھر میں دو جوان بہنیں بھی ہیں ان کے سر سے باپ اور بھائی کا سایہ کیوں چھین رہے ہو؟''

''بابا! میں پشمینے سے محبت کرتا ہوں۔'' وہ منمنایا...... غازی خان کی بات سن کر اس کا باپ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور غازی خان کے منہ پر اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ لڑکی بھی ڈر کر کھڑی ہوگئی۔

''بابا پلیز معاف کر دیں۔'' وہ باپ کے پاؤں میں بیٹھ گیا۔

''بیٹا ہمارے خاندان کی بہتری اسی میں ہے کہ تم اس لڑکی کو ابھی اور اسی وقت طلاق دے کر جان چھڑاؤ اور گھر چلو۔'' میں نے دیکھا پشمینہ گرنے والے انداز میں کرسی پر بیٹھ چکی تھی اور دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ میرا پتھر دل بھی اس کی حالت دیکھ کر ہمدردی کے جذبے سے موم ہو گیا تھا۔

''دیکھیے خان صاحب! آپ اس بچی کے بارے میں بھی تو سوچیں اس کے ساتھ یہ ظلم آپ کیسے کر سکتے

ہیں جبکہ بقول آپ کے بیٹیوں کے باپ بھی ہیں؟'' میرے کہنے پر وہ پریشانی سے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس لڑکی سے ہمدردی ہم سب کو برباد کردے گی۔ اگر ہم یہاں سے نکل گیے تو اس طرح ہماری جان تو بچ سکتی ہے ان کی بیٹی جانے اور وہ...... میں اپنے بیٹے کو لے کر نکلتا ہوں ڈی ایس پی صاحب اللہ کے واسطے ہمیں چھوڑ دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی اس کی زبان پر اس لڑکی کا نام بھی نہیں آئے گا چند دنوں بعد میں اسے باہر بھیج دوں گا لیکن اس وقت گھر پر اس کی موجودگی ثابت کرنی ضروری ہے تاکہ کہیں سے بھی ان کو یہ ثبوت نہ ملے کہ غازی خان گھر پر نہیں ہے۔'' وہ اپنے قدموں میں بیٹھے غازی خان کو کالر سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھاتے ہوئے اس لڑکی کے سامنے لے گیا۔

''بولو میں اسے طلاق دیتا ہوں۔'' اس کے منہ سے غصے میں مغلظات نکل رہی تھیں۔

''بابا ابھی تو ہمارے نکاح کو صرف چار گھنٹے ہوئے ہیں، میں اسے کیسے طلاق دے دوں یہ اپنی تمام کشتیاں جلا کر میرے ساتھ آئی ہے؟'' وہ دکھی آواز میں بول رہا تھا میں اس لڑکے کی آواز سے جھلکتی لرزش محسوس کر چکا تھا جس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس میں دم نہیں کہ وہ مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشکلات کے اس پل صراط کو پار کر سکے اسی وقت لڑکی کے ساکت وجود نے اک جھٹکا کھایا اور وہ تیزی سے اٹھ کر غازی خان کے پاؤں پکڑ کر رونے لگی۔

''غازی خان میرے سارے وجود میں محبت کے اس خاردار سفر نے رسوائی کے کانٹے چبھو رکھے ہیں اب تم چھڑانا چاہو تو دامن تار تار ہو جائے گا۔'' غازی خان نے اتنی ہمت بھی نہ کی کہ پشمینہ کو قدموں سے اٹھا کر واپس کھڑا کر دیتا وہ ساکت وجود لیے کھڑا رہا۔ مسمار کرنا تعمیر کرنے سے کہیں آسان ہوتا ہے اور اس لڑکے کی کاٹھی اس کی سہل پسندی کی گواہی دے رہی تھی۔

''طلاق دیتے ہو کہ جان سے ماروں تمہیں؟'' پیچھے سے اس کے باپ نے ایک زوردار لات کمر سے ذرا نیچے رسید کرتے چیخ کر کہا تو وہ ڈر گیا۔

''ایسا نہ کہیں...... بابا یہ ساری عمر آپ کی نوکرانی بن کر رہے گی۔''

لڑکی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھنے لگی۔ ''تم تو مجھے مہارانی بنا کر رکھنے کے وعدے کر کے لائے تھے؟'' ایک منٹ کے اندر اندر غازی خان کے باپ نے اسے مکے لاتیں اور تھپڑ مار مار کر ادھ موا سا کر دیا تھا۔ اس کے ہر ہر وار پر پشمینہ کانپ جاتی یوں کہ جیسے یہ لاتیں اور تھپڑ اسے پڑ رہے ہوں۔

''میرے آفس میں آپ نے خوب تماشہ لگا رکھا ہے؟ کوئی اور مناسب حل ڈھونڈنے کی کوشش کریں ورنہ میں بیٹے کے ساتھ آپ کو بھی حوالات میں بند کر دوں گا۔ اس لڑکی کو یوں زبردستی طلاق دلوانا

کہاں کا انصاف ہے؟''

میرے غصے سے ڈر کر وہ منت سماجت پر اتر آیا۔

''آپ کا احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا بس دو منٹ اور دے دیں یہ ابھی طلاق دے گا اور ہم یہاں سے نکل جائیں گے آئندہ کبھی کسی کو ہماری شکل بھی نظر نہیں آئے گی نسلیں برباد ہو جائیں اس سے بہتر یہ ہے کہ اس لڑکی کی قربانی دے دی جائے۔'' وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے کسی بھیڑ بکری کی قربانی کی بات کر رہا ہو۔

''خدا کے لیے غازی خان مجھے طلاق نہ دینا بلکہ ایسا کرو اپنے ہاتھوں سے مجھے قتل کر دو میں آف بھی نہیں کروں گی۔'' وہ شاید سمجھ چکی تھی کہ غازی خان اسے چھوڑ دے گا۔

کمر پر باپ کی ایک تگڑی لات کھا کر وہ اٹھا اور روتے ہوئے چیخ کر بولا ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں۔'' اور یہ کہہ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگا۔

میں ساکت سا اسے حیرانی سے دیکھنے لگا وہ جواب بھی اپنے قدموں پر کھڑی تھی۔

باپ نے آگے بڑھ کر بیٹے کو گلے لگایا جیسے مبارکباد دے رہا ہو نئی زندگی کی۔ اس کی قسمت میں باپ سے نکاح کی مبارکباد لینا نہیں لکھا تھا ورنہ تو باپ کی زندگی میں یہ دن بہت یادگار اور خوشگوار ہوتا ہے۔ وہ اب قدموں پر مزید کھڑی نہیں رہ سکتی تھی اس لیے ایک بار پھر کرسی پر گر پڑی۔ گری تو شائد پچھتاوے کے پاتال میں تھی لیکن اس پستی کی گہرائی سوائے اس کے کوئی دوسرا نہیں ناپ سکتا تھا کیونکہ اس کے لیے پاتال میں اترنا پڑتا تھا۔

میں انہیں اتنی آسانی سے نہ جانے دیتا اگر سی پی صاحب کا فون نہ آتا۔ ان کے جانے کے بعد کمرے میں ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ وہ اب کانپ نہیں رہی تھی کسی مردے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ جیسے مرنے کے بعد انسان بے حس و حرکت ہو جاتا ہے اس کے بھی تو سارے خوف مر چکے تھے اب تو اسے صرف مرنے کی تمنا تھی۔

''اب کیا کرو گی؟'' میرے سوال پر اس نے پلکیں اٹھا کر مجھے یوں حسرت سے دیکھا جیسے ڈوبتا ہوا شخص بھنور سے لڑتے ہوئے کنارے کی طرف دیکھتا ہے۔

''تم نے محبت کے نام پر رسوائی کا طوق گلے میں ڈال لیا ہے۔ تم نے اعتبار کے نام پر بربادی کی بیڑیاں پاؤں میں پہن لی ہیں۔ تم نے بے وقوفی کے ہتھیار سے عقل کو مار ڈالا ہے تم نے من مانی کے لیے عزت کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اب تیار ہو جاؤ رسوائی اور بربادی کے لیے بے عزتی کی موت بربادی ہی تو ہے۔

''خدا کے لیے آپ بچا لیں مجھے۔ میں مرنا نہیں چاہتی مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے لیکن

میں ساری زندگی اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ بار بار یہ ہی بات دھرا رہی تھی۔

''اب منہ کیوں چھپا رکھا ہے منہ کھول کر بیٹھ جاؤ یہاں میرے سوا کون ہے۔بغیر اجازت کے یہاں کوئی نہیں آ سکتا۔'' میرے یوں کہنے پر پل بھر وہ ہاتھ ملتی رہی لیکن اگلے ہی لمحے کسی فیصلے پر پہنچ کر منہ کھول دیا۔

گلابی گالوں پر آنسو سوکھ کر نشان چھوڑ گئے تھے جیسے گلاب کی پتیوں پر کہیں کہیں سے شبنم دھول چاٹ کر اپنے ہونے کا ثبوت چھوڑ جاتی ہے۔سرخ چہرہ اور سوجی ہوئی آنکھیں۔اس کے خوبصورت چہرے کا حسن کم نہیں کر رہی تھیں بلکہ بڑھا رہی تھیں۔میں نے بمشکل اس کے حسن کے سحر سے نکلتے ہوئے کہا۔

''تمہارے گھر فون کرنا پڑے گا یقیناً وہ لوگ تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔''

''میں صبح مدرسے کے لیے نکلی تھی لیکن عصر تک واپسی ہو جاتی ہے روز جب دیر ہو جائے تو بابا یا بھائی خود آتے ہیں پتہ کرانے کہ دیر کیوں ہوئی؟'' میرے کہنے پر وہ نظریں جھکائے ہوئے بولی تو مجھے اس کی ہمت کی داد دل ہی دل میں دینی پڑی۔اس کی جگہ کوئی کمزور اعصاب کی لڑکی ہوتی تو اب تک نروس بریک ڈاؤن کی شکار ہو چکی ہوتی۔

''مدرسے کی منتظمہ کا نمبر ہے تو دو؟'' وہ حیران ہوئی پھر بتانے لگی۔

میں نے فون ملایا اور دوسری طرف کی بات سن کر مایوسی سے اسے دیکھا۔''استانی صاحبہ میں اسی کیس کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں لیکن جلد از جلد آپ مجھ سے ابھی مل سکتی ہیں؟''

ان کے مثبت جواب پر میں تیزی سے اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ چلنے کا کہا۔

''لیکن کہاں جانا ہے؟'' وہ ڈری نہیں تھی شاید سارے ڈر نکل چکے تھے مشکلیں اتنی پڑیں کہ آساں ہو گئی تھیں۔''اب سوال کرنے کا حق نہیں رہا تمہارے پاس۔جلدی چلو وقت کم ہوتا جا رہا۔'' میں نے اسے تقریباً کھینچتے ہوئے کہا تو وہ چل پڑی۔

''استانی صاحبہ اس بچی کو غلطی سے میرے سپاہیوں نے پکڑ لیا تھا۔اصل میں بالکل اسی حلیے کی ایک عورت کی اطلاع ملی تھی کہ سمگلنگ میں ملوث ہے اسی لیے اس بچی کو وہ لوگ تھانے لے آئے تھے لیکن میرے پہنچنے اور تفتیش ہونے تک کافی ٹائم لگ گیا۔ان کے والد صاحب کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں انہیں یہ علم ہوا کہ بچی دن بھر تھانے میں رہی ہے تو بلا کسی تحقیق اور وجہ جاننے کے پہلے اسے قتل کریں گے پھر پولیس والوں سے جواب لیا جائے گا۔''

''بیٹا میں کیا مدد کروں؟ پشمینہ بی بی کے والد اور بھائی آئے تھے کچھ گھنٹے پہلے اس کا پوچھنے۔میں نے معلومات کی تو یہ بچی آج مدرسے نہیں آئی تھی میں نے انہیں بتا دیا کہ آپ کی بیٹی گھر سے جھوٹ بول کر نکلی

ہے کیونکہ وہ ابھی تک مدرسے نہیں پہنچی ۔‘‘پشمینہ کی دبی دبی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگیں۔

میں چند پل کچھ سوچتا رہا۔

پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر اٹھا اور دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے پشمینہ کے پاس پہنچ گیا اسے کھڑے ہونے کا کہہ کر میں نے کہا’’نقاب ہٹاؤ‘‘ وہ تذبذب کا شکار تھی میں نے اس کے چہرے پر سے نقاب کھینچ لیا اور ایک تھپڑ پوری قوت سے اس کے گال پر مارا وہ چکرا کر آگے کی طرف گری اور اس کی روشن پیشانی میز کے کونے سے جا لگی میں نے اسے پکڑ کر دوبارہ کھڑا کیا تو وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی پیشانی پر لگے زخم سے خون کی اک پتلی سی دھار ناک سے بہتی گردن تک پہنچ گئی تھی ۔اس کی ستواں ناک میں سونے کی تتھلی مزید لشکارے مارنے لگی تھی اسی کے خون میں رنگ کر۔

گلابی گال پر تھپڑ کھانے سے جلد پھٹ گئی تھی اور گال نیلا ہو گیا تھا۔

’’بدلہ لے رہے ہیں؟‘‘ وہ سسکتی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

’’اگر بدلہ لینا ہوتا تو اس وقت تم زندہ نہ ہوتیں۔‘‘ میں نے دل میں اٹھتی درد کی لہروں کے سامنے بڑی مشکل سے ضبط کا بند باندھا اور وہ بند اس کی حالت دیکھ کر ٹوٹنے لگا تھا۔

’’چلو میرے ساتھ ۔لیکن پہلے منہ چھپا لو‘‘ میری گھٹی گھٹی آواز سن کر اس نے درد سے کراہتے ہوئے منہ چھپا لیا۔

’’جی آفریدی صاحب میں فوری آپ سے ملنا چاہتی ہوں آپ جتنا جلدی ہو سکے مدرسے تشریف لے آئیں۔ میں آفس میں آپ کی منتظر ہوں۔‘‘ استانی صاحبہ نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

’’ڈی ایس پی صاحب! میں کئی انسانی جانیں بچانے کے لیے یہ جھوٹ بول رہی ہوں۔ جو کام کبھی اپنے مفاد کے لیے نہیں کیا وہ دوسروں کے مفاد کے لیے کروں گی۔‘‘

ان کے نقاب میں چھپے چہرے کے تاثرات تو میں نہیں دیکھ پایا لیکن ان کی آواز کے زیر و بم سے یہ اندازہ ہوا کہ ان کو کتنی مشکل پیش آ رہی ہے اس جھوٹ کے لیے خود کو تیار کرنے کی کوشش میں۔‘‘

’’استانی صاحبہ میں ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا۔بس بات ایسے مضبوط انداز میں کیجیے گا کہ شک کی ایک شکن بھی نہ آ سکے یقین کی پیشانی پر۔‘‘

وہ پرسوچ انداز میں سر ہلانے لگیں۔

’’میں ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر ساری گفتگو سننا چاہتا ہوں۔‘‘

میری بات سن کر انہوں نے مجھے ملامتی نظروں سے دیکھا۔

''مطلب یہ ہوا کہ آپ کو اس علاقے کے سب سے بڑے دینی مدرسے کی مہتمم کی زبان پر بھروسہ نہیں ہے؟''

میں نے شرمندگی سے سر جھکائے رکھا۔

''میری ٹریننگ جس انداز میں ہوئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ میں ایک فیصد غلطی کی گنجائش بھی نہ چھوڑوں۔''

انہوں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے جیسے آپ کی تسلی ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں استانی صاحبہ؟'' وہ شدید ردعمل ظاہر کر رہے تھے۔ ''میں واقعی اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوں قصور میرا نہیں تھا پشمینہ ہمیشہ چند لڑکیوں کے ساتھ مدرسے آتی ہے لیکن اس دفعہ چھٹیوں کے دوران ہی سب سے کہا گیا کہ ایک بہت بڑی مذہبی شخصیت مدرسے تشریف لا رہی ہیں مجھ عاجز سمیت وہ کئی معتبر ترین ہستیوں کی استانی رہ چکی ہیں انہوں نے قابل بچیوں سے ایک زبانی ٹیسٹ لینا تھا سو میں نے ذہین لڑکیوں کی فہرست میں سرفہرست پشمینے کو دو دوسری بچیوں سمیت بلوا لیا۔ باقی دونوں بچیاں نہیں آئی تھیں اس لیے میں سمجھی کہ پشمینہ بھی نہیں آئی ہوگی۔ یہ سوچ کر میں نے آپ سے کہہ دیا کہ اگر وہ آتی تو میرے پاس حاضری لگوانے ضرور آنا تھا اس کی پسندیدہ ہستی آ رہی تھیں اور وہ نہیں پہنچ پائی تھی۔ میں قریبی کھڑکی کے آدھے ٹوٹے شیشے سے آتی واضح آوازیں سن رہا تھا۔ استانی جی بول رہی تھیں۔

''میں آپ سے بات کر کے جیسے ہی نیچے لائبریری میں پہنچی بے چاری پشمینہ فرش پر اوندھے منہ بے ہوش پڑی تھی۔''

''آپ نے اسی وقت مجھے فون کیوں نہیں کیا؟ ہمارے خاندان پر گزرنے والی قیامت کا اندازہ تو ضرور ہوگا آپ کو۔ ہمارے قبیلے میں بیٹی کا یوں غائب ہو جانا جیتے جی موت جیسا سمجھا جاتا ہے میرے گھر میں ماتم کا سماں ہے۔'' وہ میز پر مکا مار کر غصے سے چیخ پڑے۔

''آپ براہ کرم تحمل سے میری پوری بات سن لیں فیصلے میں جلدی ہم سب کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

ہم بچی کے ہوش میں آنے کے منتظر تھے۔ جب تک یہ اندازہ نہ ہو جاتا کہ معاملہ کیا ہے ہم بات پولیس تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اس طرح سیکڑوں بچیوں کا مستقبل خطرے میں پڑ جاتا۔ میں جس مقام پر کھڑی ہو کر حالات دیکھ رہی ہوں وہاں پہنچے بغیر ان حالات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔''

''اس نے کیا بتایا ہے؟'' وہ بے قرار تھے۔

''ڈاکٹر کو بلایا گیا اور ہوش میں آتے ہی اس نے بتایا کہ وہ اپنی پسندیدہ شخصیت سے ملنے اور ٹیسٹ دینے سے پہلے ایک کتاب میں کچھ چیزوں کی تصدیق کرنا چاہ رہی تھی مطلوبہ کتاب حاصل کرنا بہت ضروری تھا اور مہمان شخصیت کی آمد کی وجہ سے لائبریری جلدی بند ہونی تھی اسی لیے وہ جلدی میں سیڑھی اترتے ہوئے عبایا پاؤں میں پھنس جانے سے گری اور سر اور منہ پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی لائبریرین دوسرے دروازے سے نکل چکی تھیں اس لیے نہ اس کی موجودگی اور نہ ہی اس طرح گرنے کا کسی کو علم ہو سکا۔

میں نے اس کے ہوش میں آنے کے بعد آپ کو فون کر دیا کہ کہیں آپ پولیس تک نہ پہنچ جائیں۔'' وہ اتنے اعتماد سے جھوٹ بول رہی تھیں کہ مجھے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ ان کا معمول نہیں ہے۔

''اوہ میرے خدایا'' میں چشمِ تصور سے یہ دیکھ رہا تھا کہ آفریدی صاحب نے سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا ہے۔'' آپ جان ہی نہیں سکتیں کہ ہم کس اذیت سے گزر رہے ہیں۔اس کی ماں بہنوں نے تو اسے رو دھو کر دل ہی دل میں دفنا بھی دیا ہے۔میرے آدمی موت بن کر اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔اس یقین کے ساتھ کہ موت سے فرار ممکن نہیں وہ عنقریب اسے پکڑ لیں گے۔''

''ایسا تو نہ کہیں۔۔آفریدی صاحب! موت اور زندگی کے فیصلے صرف اور صرف اللہ کرتا ہے۔ انسان اس معاملے میں مکمل بے بس ہوتا ہے۔''

استانی صاحبہ کی آواز سنائی دی تو میں نے پہلو بدلتے ہوئے بے چینی سے سوچا'' اسے محبت نہ سہی محبت کا دھوکہ تو مل ہی جاتا مگر زندگی چھین لی جاتی اس لیے ایک بزدل مرد کے لیے اس کی قیمتی زندگی چھین لی جائے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا تھا۔اب پشمینے کو دوبارہ زندگی تو مل جائے گی لیکن خدا کرے کہ اسے زمانے کا دیا ہوا سبق ازبر ہو جائے اور وہ تمام عمر اپنے کیے پر شرمندہ رہے۔شرمندگی ہی اچھے اعمال کو جاری رکھنے کی وجہ بنتی ہے کیونکہ شرمندگی وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں کچھ برا کرنے کی سوچ ختم ہوتی ہے۔''

چند منٹوں بعد اسے اس کا باپ بڑی عزت اور شفقت سے اپنے ساتھ واپس گھر لے گیا۔

پشمینہ کی سوجی ہوئی پیشانی نیلا گال اور چھلی ہوئی کہنیاں گواہ تھیں کہ استانی جی سچ کہہ رہی ہیں۔

میں ان کے جانے کے بعد استانی صاحبہ کا شکریہ ادا کر کے مدرسے سے نکل آیا۔

میرا دل مطمئن ہو چکا تھا کیونکہ میں ایک لڑکی کی زندگی بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔بے شک اس نے اپنے خاندان کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا لیکن میں اس کے باپ اور قبیلے کے دوسرے مردوں کی طرح اسے اس کی ایک غلطی کی بھیانک سزا پاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔میرا علم اور میری سوچ جو مرد اور عورت دونوں کو مکمل انسان سمجھتی تھی وہ مجھے یہ سب نہیں کرنے دے رہی تھی، بے شک وہ میری کزن اور منگیتر بھی تھی

بے شک مجھے اس سے شدت کی محبت بھی ہوا کرتی تھی۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ کچھ ہی عرصے میں ہماری شادی ہونے والی تھی کہ اچانک میری بھابھی کی زچگی میں ہونے والی جوان موت نے ہماری شادی چالیسویں تک روک دی میرے لیے انتظار مشکل تھا لیکن مجبوری تھی اس لیے دن گن گن کر کاٹ رہا تھا میرے دل اور گھر دونوں کو اس کی آنکھوں کی چمک اس کے لہجے کی ٹھنڈک اور اس کی محبت کی خوشبو کا انتظار تھا لیکن پل میں سب کچھ بدلتے دیکھ کر بھی میں نے خود کو بکھرنے نہیں دیا تھا بکھرنے والوں کو یقین ہوتا ہے کہ کوئی سمیٹ لے گا تبھی بکھر جاتے ہیں لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھے اپنے آپ کو خود ہی سمیٹنا ہوگا اس لیے خود کو بکھرنے نہ دیا خود کو سمیٹنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہوتا ہے یہ بکھرنے والے ہی جان پاتے ہیں۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا خود سے ایک سوال کر رہا تھا اس سوال کے جواب پر ہی آئندہ زندگی کے فیصلوں کا انحصار تھا۔

''کیا مجھے اب بھی پشمینہ آفریدی سے شادی کر لینی چاہیے؟''

میرے اندر سے اس سوال کا جواب اثبات میں آیا تو میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا

''بے شک تو معاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے تو پھر کیوں نہ میں تیرے پسندیدہ بندوں میں شامل ہونے کی کوشش کروں؟''

مجھے اس کی الوداعی نظروں کا نم سا پیغام یاد تھا جس میں اس کے آنسوؤں کی پچھتاوے بھری جھڑی کہہ رہی تھی۔'' خان جی! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ میں معافی کے قابل تو نہیں لیکن آپ تو دیالو ہو مجھے معاف کر دو گے نا؟''

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی آنکھوں میں لکھی سوالیہ تحریر کسی اجنبی زبان میں لکھی ہوئی ہے اور نظریں چرا لیں میں نے اک ٹھنڈی سانس لے کر مفتی صاحب کا نمبر ملایا جن سے یہ پوچھنا تھا کہ رخصتی کے بغیر طلاق ہو جانے پر اللہ کا حکم کیا ہے عدت کی مدت پوری کرنے کی شرط ہوتی ہے یا نہیں؟''

◂◂ ● ▸▸

House of SP Arbab Shafiullah
Ronoghari, Chamkani Deh
Peshawar Pakistan
Mob: 03129423534

● ثمینہ سید

بندھن کا بوجھ

''اس سے پہلے کہ آپ ہمیں کہیں سیر کے لیے لے جاتے، یا ہمارے ساتھ باہر کی دنیا میں کھلی فضا میں کہیں گھومتے پھرتے۔ یہ دن آ گئے۔ اور اب...... آپ بھی اس قید کے ہاتھوں بے بس ہیں۔''

شفق نے مسکراتے ہوئے گہرا طنز کیا۔ تو حبیب احمد اسے گھور کر رہ گئے۔ جز بز ہوتے اٹھے اور غصے سے بولے۔

''بچوں کے سامنے میری بے عزتی کرنے سے فرصت ملے تو ایک کپ چائے لاؤنج میں پہنچا دینا...... اور ہاں ملازمہ کے ہاتھ بھیجنا۔''

''جی اچھا'' شفق نے شانے اچکائے۔ ان رویوں نے اسے بھی لاپرواہ بنا دیا تھا۔ وہ اس فینٹسی سے نکل آئی تھی کہ بیوی نہ چاہتے ہوئے بھی ''ملازمہ'' بنی رہے تو دل میں جگہ بنا ہی لے گی۔ کچھ دیر بیٹھی رہی بچوں کی کھلی کتابوں میں دلچسپی کی کوئی چیز، کچھ نیا ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی۔ کیونکہ پچھلے ایک سال سے یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ وبا کے ہاتھوں قید و بند کی صعوبتیں، آن لائن کلاسز، کھانے پکانے، بے وقت چائے اور طنزیہ بک بک۔

کبھی کبھار سکول والوں کے پرزور اصرار پر شفق اور حبیب احمد کو سلیقے سے تیار ہو کر کمپیوٹر کے آگے بھی بیٹھنا پڑتا۔ والدین کی حیثیت سے بہت سی چیزیں سمجھنا پڑتیں اور کئی طرح کے سوالوں کے جواب دینا پڑتے۔ اسے ہمیشہ یاد رہتا کہ وہ خود بہت ذہین فطین طالبہ تھی۔ ہمیشہ پہلی پوزیشن پہ اسی کی اجارہ داری رہتی۔ یونیورسٹی میں بھی گولڈ میڈل سے نوازا گیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسکے ابا نے ہمیشہ اس کی پسند اور دلچسپی کو ترجیح دی تھی۔ ہمیشہ اسی کی منتخب کردہ سمت میں اسے چلنے دیا۔ نا صرف اس کا ساتھ دیتے پیسہ بھی لگاتے۔ لیکن نہ جانے کیوں ناز نخرے اٹھانے والے یہی والدین بیٹیوں کی شادی کے وقت روایت پسند اور کٹھور بن جاتے ہیں۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی ایم فل، پی ایچ ڈی کے بعد شادی کرنے کا سوچنا چاہتی تھی۔ لیکن امی کو خدشوں کے ناگ ڈستے رہتے۔ لڑکی کی عمر زیادہ ہو جائے گی تو رشتہ نہیں ملے گا۔ اس کی سوچ پکی ہو

جائے گی تو ہماری نہیں سنے گی اور سب سے بڑھ کر تو امی کو شیطان کے شر سے خوف آتا رہتا۔ اکثر کہتیں
''شیطان انسان کے ساتھ ہی ہوتا ہے ہر پل نجانے کب حاوی ہو جائے۔ ہماری نانی کہتی تھی برائی اور بیراہروی تو قبر کی دیواروں تک پیچھا کرتی ہے۔ مرتے مرتے بھی گناہ سرزد ہو سکتا ہے اور ہم پڑھنے کی آزادی دے کر لڑکیوں کو شتر بے مہار ہی کر چھوڑتے ہیں۔''
''تو اللہ کا نام لے کے رشتہ ڈھونڈ بھیئے لوکے...... میری دھی رانی میرا فخر ہے، مان ہے میرا۔'' ابا جی کہتے تو شفق کی آنکھیں بھر آتیں۔
تب ان باتوں کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے یہ خدشے یہ مان کے تالے عقل سے ماورا لگتے تھے لیکن اب...... اب جب وہ بہت بڑے بزنس مین حبیب احمد کی بیوی بن چکی تھی۔ دو بیٹیوں کی ماں بن چکی تھی۔ تو گاہے گاہے امی کی باتیں دل کے دروازوں پہ دستک دیتی رہتی تھیں۔
''امی حق بجانب تھیں لیکن شادی کرتے وقت بھی بیٹی کی پسند، عمر اور ذوق کا خیال رکھ لیتیں تو...... اچھا ہی ہوتا۔'' شفق اکثر کام نپٹاتے اسی طرح کے فقرے بڑبڑاتی رہتی تھی۔
بچے سکول چلے جاتے اور میاں صاحب کروفر سے تیار ہو کر اپنے کام پہ چلے جاتے۔ اس کے سسرال والوں کے بہت بڑے مال میں کروڑوں روپے کی دکانیں اور بزنس تھے۔ اونچی سے اونچی اڑان۔ ایک دوسرے سے بڑی گاڑیاں، کئی کئی کنال پہ پھیلے گھر، میک اپ زدہ چہرے، باہر کے کھانے اور دنیا بھر میں گھومنے پھرنے کی آزادی۔ باہر سے پڑھ لکھ کے آئے نوجوان بھی اسی بزنس میں لگ جاتے۔ سب پہ دو کو چار کرنے کی دھن سوار تھی۔ کمی تھی تو محبت کی اور شدید کمی تھی تو ساتھ کی، تعلق میں خلوص کی۔ جو شفق جیسے مڈل کلاسیوں کا خاصا بڑا مسئلہ تھا۔ وہ چاہتی تھی حبیب احمد اسے اور دونوں بیٹیوں کو ساتھ لے کر دنیا دکھائیں۔ اکٹھے بیٹھ کے کھانا، پینا دیر تک باتیں کرنا اور اپنی مرضی کے پکوان بنانا جیسے عام سے اس کے خواب تھے۔ وہ مرد کے ساتھ کو حصار کی طرح اپنے گرد لپیٹنا چاہتی تھی۔ لیکن ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے نوکر تھے۔ کھانے کی ہدایات خانساماں کو دی جاتیں۔ حبیب احمد اکثر طنز کے تیر چلاتے رہتے۔
''یہ مڈل کلاسیے شوق کہیں دفن کر دو شفق بیگم۔ اسٹیٹس کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے آپ پر توجہ دو۔ اس گھر گرہستی کی، سگھڑاپے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اور ہاں گاڑی خود چلانا سیکھو، پیسہ خرچ کرنے کے طریقوں پر غور کرو۔ وہ جو تمہاری ذہانت تھی ناں اس کی یہاں کسی کو بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔ زندگی کے ساتھ دوڑنا سیکھو تا کہ میری بچیوں کی اچھی تربیت کر سکو۔ فیشن اور ٹیکنالوجی کا دور ہے بی بی...... رٹو پن اور ذہانت کے زعم میں رہنے کا نہیں۔''
شفق نے اپنی اخلاقیات اور تربیت کے مطابق نجی زندگی کا آغاز کیا تھا، رشتوں کو بنانے اور نبھانے کی

ہر کوشش کر دیکھی تھی۔لیکن یہاں سب اپنی مرضی اور اپنی پسند کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ہر کوئی دوسرے کو نیچا دکھانے کی سرتوڑ کوشش میں تھا۔ وہ کبھی ان سب کے ساتھ بھاگنے لگتی۔ شاپنگ، پارلرز، پارٹیاں، فیشن شوز، سوشل ورک......ہوٹلنگ سب کچھ کرتی اور کبھی تنہائی کے صحراؤں میں نکل جاتی۔ بیاعتنائی کے سرپٹ گھوڑے اس کی خاک اڑاتے۔تو وہ گم ہوتے ہوتے گمراہ ہونے لگی۔ مضطرب روح کا چین ڈھونڈ نے نکل پڑتی۔

بے شمار طنز اور روکھے رویے شفق کی پوروں پہ جمتے جا رہے تھے۔گھر میں ہر طرح کا آرام اور سہولتیں تھیں جن کی وجہ سے ہر دیکھنے والی آنکھ شفق کو خوش قسمت کہتی۔کوئی کیا جانے رشتے میں بلا کی گھٹن اور سرد مہری تھی۔حبیب احمد تعلق کی انتہا پہ بھی اسے ''ناشکری عورت'' کہتے ہوئے الگ ہوتے۔ جو لمحے ان کو درکار ہوتے ان میں شفق پوری طرح انوالو ہو ہی نہیں پاتی تھی۔انسان مشین بن کر ہر ضرورت پوری کر سکتا ہے۔لیکن جذبے......ان کی اپنی سرکشی ہے، اپنی مرضی، اپنا ہی رچاؤ۔ان پر زور زبردستی نہیں چلتی۔ اگر زبردستی کرنے کی کوشش کی جائے تو تعلق تڑک کر رہ جاتے ہیں اور منہ زور ہواؤں کی طرح مرضی کے رخ پہ نکل جاتے ہیں......یہی شفق کے ساتھ ہو رہا تھا۔تمام پیسے والوں کی طرح اسے بھی ڈپریشن ہونے لگا، زبان درازی ہونے لگی۔ کچھ دن لمبی چپ چلتی اور باقی سارے دن دو بدو لڑائی چلتی رہتی۔

اچانک زندگی نے پینترا ہی بدل لیا۔روایتوں، حکایتوں اور دوڑتی بھاگتی مشینوں کو سٹاپ لگ گیا۔ایسی رکاوٹ......ایسا ٹھہراؤ جو انسان کی سوچ اور اندازے سے بہت اوپر تھا تو انسان کا کسمسانا، الجھنا، مضطرب ہونا لازم تھا۔وقت نے مٹھی بند کر لی۔زندگی کو اسٹیٹس کا ناچ نچانے والے خود ایک انوکھی، ان چاہی تال پہ تھرکنے لگے۔ بے بسی انتہاؤں پہ تھی۔ساری دنیا ہی ایک دم بے بس ہوگئی ''وبا'' کی مرضی کے مطابق روز و شب کی ترتیب بنائی جانے لگی۔گھر آباد اور گلیاں، بازار ویران ہونے لگے۔

باہر کھلی فضا اور چور جگہوں میں پنپنے والے سچے جھوٹے رشتے دم توڑنے لگے تو گھروں میں قید سچے رشتوں میں ملاوٹ کرنے والے لوگ مرغِ بسمل بنے تڑپ رہے تھے۔ وبا زوروں پہ تھی اسے سائنس کی کوئی چال، گھناؤنی سازش کہا جاتا تو کبھی مذہب سے دوری کو وجہ گردان کر خوف و ہراس پھیلایا جاتا۔ راتوں میں گھروں کی چھتوں پہ بیوقت اذانیں دے کر سمجھا جاتا کہ یوں روٹھے ہوئے رب کو منا لیں گے۔وقت وبا کے چنگل میں جکڑا اڑیل پن دکھا رہا تھا۔انسانوں کو دھڑا دھڑ موت نگل رہی تھی اور قبریں اگلنے لگی تھیں۔شمشان گھاٹ اور قبرستانوں کی اراضی ناکافی لگنے لگی تو لاشیں دریاؤں میں بہائی جانے لگیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔موت کا سناٹا۔کسی صورت بھی کاروبارِ حیات ڈگر پہ نہیں آ رہے تھے۔اور بے نتھے بیل جیسے خود سر مرد......مرضی کی مالک ہو چکی بیویوں کے سر پر سوار تھے۔ بیویاں بھی نوکروں کو فارغ کر کے خود ہر کام کرنے پہ مجبور تھیں، ہر ایک کام

سے بڑا اور صبر آزما کام دن رات کے تمام گھنٹے شوہروں کے مزاج کے مطابق چلنا تھا۔ بے شک راستے کھوٹے ہو چکے ہوں۔ دل نفرتوں سے اور منافقتوں سے بھر چکے ہوں۔ جذبے سرد بھی ہو چکے ہوں بستر گرم رکھنا تھا۔

بہت ہی کم لوگ تھے جنہوں نے فاصلہ رکھنے کے دنوں میں فاصلے مٹائے ہوں اور محبت کی راہ گزر پہ چل پڑے ہوں۔ ورنہ طلاقوں کی شرح زیادہ ہو رہی تھی۔ آن لائن موٹیویٹرز اور ماہرِ نفسیات رواج پا رہے تھے۔ اسی اتار چڑھاؤ میں جذبوں سے ملمعے اتر رہے تھے۔ شوہر جو مہینہ بھر وضعدار بنے پھرتے رہتے تھے اب روز آپے سے باہر ہو جاتے۔ تو ایسے میں شفق کا حیران ہونا بنتا ہی تھا نا صرف حبیب صاحب کے محبت سے لبریز لہجے میں بلانے پہ حیران تھی وہ تو خود پر بھی حیران تھی۔ آج شام سے ہی مزاج میں چاہتوں کی ملاحت اتر رہی تھی۔ مسکرا مسکرا کر سج سنور رہی تھی۔ چال میں بھی مستی در آئی تھی۔ سمٹتے ہوئے فاصلے اسے خوش فہمیاں دے رہے تھے۔ اس نے بخوشی سمیٹ ڈالے۔ یا پھر کسی کی یاد نے بیجال کر دیا تھا...... ہجر نے ہرا دیا تھا۔ ایسے ہی بہکتے پل میں حبیب احمد نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ کسی معمول کی طرح چلتی گئی۔ مقابل کرم پہ خوش ضرور تھا لیکن بار بار چونک رہا تھا۔ انداز، ادائیں اسے زیر بار کیے دے رہی تھیں۔ بیوی سے اکثر مرد ایسی محبت کی توقع نہیں کر رہے ہوتے۔ شریف بنے رہتے ہیں تاکہ بیوی بھی حد میں اور اوقات میں رہے۔ لیکن اب اس وبا نے گھروں تک ہی محدود کر دیا تھا تو رشتے ہی غنیمت لگ رہا تھے سارے چھل کپٹ دم توڑ رہے تھے۔ اصل چہرے چھپانے مشکل ہو رہے تھے۔

جب جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا تو حبیب احمد نے سخت سناٹے میں شفق کو دیوانگی سے چومتے ہوئے سرگوشی کی۔

''یہ ہی مس کر رہا تھا...... یہی سب...... شیلا مائی ڈئیر...... شیلا!!!!!!!...... لو یو...... سسکاری بھری آواز نے شفق کے حواس بحال کر دیئے۔''

شفق نے آواز کی ٹوٹتی، لرزتی، نشے میں ڈوبی بازگشت پہ خود کو گہرے سمندر میں گرتا محسوس کیا۔ ماحول کا سارا سحر ایک چھناکے سے ٹوٹ رہا تھا شور تھا...... بلا کا شور...... لیکن موت جیسی چپ بھی تھی۔ سو بھید کھولتی زہریلی چپ...... وہ ایک طرف گرتی ہوئی دوہرے درد سے بے حال تھی...... بالکنی سے آتی ہلکی سی روشنی میں اس اپنے...... لیکن یکسر اجنبی شخص کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ......'' وہ ''نہیں تھا'' وہ بندھن کے بوجھ تلے دبی بری طرح کراہی۔

◀◀ ● ▶▶

● اقبال مٹ

درد جب حد سے گذرتا ہے

سال کے آخری مہینہ کے نصف کے بعد والا پہلا دن تھا۔ دن تو گزر ہی جاتا ہے جیسے پہلے والے دن گزر رہے تھے۔ مگر سال کا یہ دن میرے لیے کسی خصوصی مصیبت کا باعث بن چکا تھا۔ دادا جانی اور میری دادو اس دن بہت روتے تھے۔ ابا کہتے تھے کہ تم بعد میں پیدا ہوئے ہو اس لیے ان بکھیڑوں میں نہ پڑا کرو جو گزر گیا سو گزر گیا۔ دادا اور دادو تو مرکھپ گئے جیسے ہر کوئی مرکھپ جاتا ہے۔ خیر میں اس دن کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور سنبھال رکھتا تھا۔ یہ کوئی آدھی رات کا وقت ہوگا، گیڈر ہونگتے جاتے چلے جا رہے تھے۔ کتے بھی حقِ نمک ادا کر رہے تھے۔ کالے بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے دل پھٹے جاتے تھے۔ گیڈروں نے ہونگنا، کتوں نے بھونکنا اور گدھوں نے ہینگنا شروع کر دیا۔ جنگلی سوروں نے اودھم مچا دیا۔ سانپ بھی کنڈلی مارے اسی انتظار میں تھے۔ جنات اور شیاطین جھوم رہے تھے۔ فرشتوں کو عبادت سے فرصت ہی نہ تھی کہ وہ پہلے ہی بدھ کو جمعہ پڑھا چکے تھے اور خمیس نام کیا یک دن کو جمعہ کی رات کہتے نہ تھکتے۔

اسی شبِ سیاہ میں لوگوں نے کئی بھلی آوازیں بھی سنیں۔ کچھ اعداد پر ان سب کا اتفاق تھا۔ مگر انگلیوں پر گنتے گنتے بھول جاتے کہ انگوٹھے کی پوروں کو بھی انگلیوں کی پوروں کے ساتھ گننا ہے یا نہیں۔ ان کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ لوگ دیکھنے، سننے کی طاقت سے محروم ہوتے جا رہے تھے۔ پھر بھی ان کی آنکھوں پر چربی کی تہ اور کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا گیا۔

میں ابھی بمشکل اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ میرے مکان کے دروازے پہ زور زور سے دستک ہوئی۔ باہر ایک کالا کلوٹا ٹھگنا شخص کھڑا تھا۔ اس کے آس پاس دو مسلح آدمی نیلے کڑ کیلے کپڑوں میں کھڑے تھے جنھوں نے مجھے دیکھتے ہی بندوقیں تان کر پوزیشنیں لے لیں۔ میں نے حواس باختہ ہو کر اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر لیے۔ ایک نے مجھے نشانے پہ رکھتے ہوئے بندوق کی نال میری گدی سے لگا دی، پھر تلاشی لی۔ مجھ مفلوک الحال کی جیبوں سے بھلا کون سا مواد نکلنا تھا...... ایک ماروں گولڈ کی دو نمبر سگریٹ کی ڈبیا اور پچارو مارکہ ماچس کی کے سوا۔ اس نے مجھے کالے کھٹولے کی طرف دھکیلتے ہوئے آرام سے کہا۔

''چلو صاحب کے پاس۔'' اگلی طرف دو بندے ایک کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں نے کاٹن کے سفید لباس پہن رکھے تھے۔ ایک سگ دہن اور اس کی آنکھیں بلّے جیسی تھیں جبکہ دوسرا............ موٹا

تازہ۔ گھنی مونچھوں والا نرا حرامی لگتا تھا۔ ایسے دلے بازارِ حسن کی کنجریوں کے پاس باہر صحن میں تاش کھیلتے ہوئے اکثر دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

''یہ آسانی سے نہیں مانے گا.........'' پھر اس نے دوسروں کو آواز دی۔

''قاسم، لکؤ! تم دونوں گھر کے اندر گھس کر ثبوت تلاش کرو۔'' دونوں اندر چلے گئے، پھر دوسرے ہی لمحے ایک نے باہر آ کر پرجوش آواز میں اطلاع دی۔

''صاحب! پہلا ثبوت ہاتھ لگ گیا۔'' ایک کے ہاتھ میں، میرے دوست کا بھیجا گیا فکشن کا مجموعہ تھا۔ کتے جیسے منہ والے نے قہقہہ لگا کے کہا۔

''اب بول بچو! یہ نشانیاں تمھارے گھر کے اندر کیوں پائی گئیں؟'' میرا تو گویا بھٹہ ہی بیٹھ گیا۔

''سسس......سر جی! یہ تو محض فکشن کی دبی، گھٹی آوازیں ہیں۔ مم...... مجھے نہیں پتہ کہ یہ کوئی غیر قانونی کام یا اس کی نشانیاں ہیں۔''

کتے جیسے منہ والے نے باقی دونوں کو بھی تلاشی لینے کا کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ناجد نامی آدمی نے تین چار موٹی موٹی کتابیں لا کر میرے سامنے رکھ کر گویا حجت تمام کر دی۔ موٹے گینڈے نے لہجے میں بلا کا طنز سمو کر مجھے مخاطب کیا۔

''جانتے ہو اِن کتابوں کو؟؟؟؟'' میں نے انکار میں سر ہلایا۔ تب کتے جیسے منہ والے نے گویا میرے کانوں کے قریب دھماکہ کر دیا۔

''اِن میں سے پہلی کتاب منٹو کی ہے......دوسری کتاب بدنام زمانہ علامتی فکشن کی ہے، تم لوگ بیچوں بیچ بہت بڑی بڑی بکواسیات کرتے رہتے ہو اور کسی ایرے غیرے کو اس کا پتہ ہی نہیں چلنے دیتے۔ تیسری کتاب جنت کے نظارے ناول (خاصی فحش) ہے...... اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اب پھانسی کے پھندے کو تمھارے گلے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔'' میں بھونچکا سا کھڑا تھا اور میری ٹانگیں آہستہ آہستہ جواب دے رہی تھیں۔ ہم ادب سے وابستہ لوگ اپنی حساسیت کی وجہ خاصے بزدل اور کم قوت مدافعت رکھتے ہیں۔

اس کا مطلب ہے آپ مجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے ہو، تو مجھے گھر والوں کو اطلاع کرنے دیں۔ پہلے تم لوگ اپنی شناخت، وارنٹ اور اپنا تھانہ وغیرہ بتا دو۔

ہم اس کے پابند نہیں۔ مقامی تھانہ سے یا ایس ایس پی سے بھی تمہارے ورثا کو پتہ نہیں چل سکے گا، اب دوبارہ ان آدمیوں نے مجھے گھیر لیا۔ انہوں نے مجھے اٹھایا اور کسی نامعلوم دنیا میں پہنچا دیا۔

''یہ کون سی جگہ ہے اور تم لوگاں کون ہو؟''

’’ابھی کچھ دیر بعد تمہیں ساری صورت اور حال بتا دی جائے گی۔‘‘

’’چائے دو۔طلب ہو رہی ہے۔‘‘

’’نہیں تم صرف تھوہر ملی لسی پیو گے۔‘‘ کرخت آواز آئی۔میں کن انکھیوں سے اس عجیب مخلوق کو دیکھنے لگا جو کہ بالشتی مگر بڑے لمبے ہاتھوں والی تھی۔دور دیوار سے عجب وحشت ٹپکتی تھی۔ناگواری بدبو،جیسے کسی جاندار شئے کے گلنے سڑنے کی بدبو ہوتی ہے،نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔آخر مجھے ایک آنکھ سے کانے شاہ جن کے سامنے لے جایا گیا۔

’’تو تم ہو جس نے جانتے بوجھتے سال کے آخری ماہ کے اگلے نصف کے پہلے دن کو اپنی سالگرہ کے دن پٹاخے اور شرلیاں چھوڑی تھیں اور بوہڑ (برگد) کے نیچے رات کے وقت پیشاب کر دیا تھا۔‘‘

’’مگر اس سے تمہارا کیا تعلق؟‘‘

’’تعلق ہے،بدبخت تم نہیں جانتے،تمہارے اس گھناؤنے فعل سے ہماری عزت مآب پریوں اور ان کے معصوم بچوں نے کئی دنوں تک ہڈیاں نہیں کھائیں۔‘‘

’’لاحول ولاقوۃ......‘‘ میرے منہ سے نکلا۔

’’اے بکر گدھے کیا مہمان کو بغیر خدمت کیے ہی میرے سامنے لائے ہو؟‘‘ شاہ جن نے غصے سے مرچو بھتنے کی طرف دیکھا۔ی ی س......س ررر۔بھتنا کانپتے ہوئے مجھے گھسیٹ کر کوہ کاف کے ایک گہری کنویں نما جگہ میں لے گیا۔کنویں کے پیندے میں پانی نہ تھا۔یہ کوئی چار ضرب چار کی جیل کے سیل ایسی مرطوب اور حبس زدہ جگہ تھی۔اب مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ یہ کوئی ہوائی مخلوق ہے۔بکر گدھے نے مجھے رسیوں سے باندھا اور موچنے سے میری مونچھوں کے بال ایک ایک کر کے اکھاڑنے لگا۔اس کے پاس ڈرل مشین بھی تھی۔کہہ رہا تھا،’’بعد میں تیرے جسم کے مختلف حصوں میں سوراخ کر کے رسیاں ان میں سے گزار کر تجھے عبرت کے لیے فلاں سنسان ریلوے سٹیشن پر پھینک آؤں گا۔اگر بچ جاؤ تو اپنے بے احتیاط دوستوں کو بھی بتلا دینا۔‘‘ میری آنکھوں سے رنگ برنگی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔میری مونچھوں کے تمام بال اکھڑ چکے تھے اور میرا چہرہ درد کی شدت سے سرخ ہو چکا تھا۔

’’آپ سے کچھ کہنا ہے۔‘‘

’’کیا کہنا ہے؟‘‘ اس بھتنے نے درشتی سے کہا۔اب میں نے لہجہ ذرا دھیما رکھا اور کہا،

’’تمام غیر ضروری بال اسی طرح اکھاڑ دو۔چلو شاباش..................!!!!‘‘

◄◄ ● ►►

Post office high school chak
haider abad teh kabir wala dist khanewal pakistan.
03067514404

● نشاط پروین

بڑے گھر کی بہو

موبائل فون کی گھنٹی سنتے ہی زرینہ چونک پڑی۔

فون اس کی چھوٹی بہن سلمٰی کا تھا۔ وہ آجکل اپنے بچوں کو لے کر میکے آئی ہوئی تھی۔ ابھی پانچ منٹ قبل تو اس سے ایک گھنٹہ تک بات ہوئی تھی اور اپنے خاندان کے علاوہ گاؤں کے ہر ایک کی خیریت معلوم ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ موسم کے بدلتے ہوئے مزاج اور گھر کی مرغیوں اور کبوتر تک کا اسٹیٹس اپ ڈیٹ کیا جا چکا تھا۔ کورونا کی دوسری لہر اور اس سے ہونے والی پریشانیوں کا بھی تذکرہ ہوا تھا۔ اب ایسی کون سی بات رہ گئی تھی جس کے لیے دوبارہ فون کرنے کی ضرورت آن پڑی۔ اس نے فون ریسیو کیا تو ادھر سے سلمٰی کی روتی بلکتی آواز سن کر اس کا کلیجہ کانپ گیا۔ اس کے والد کے انتقال کو بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا ۔زخم ابھی تازہ ہی تھا کہ والدہ کو دل کی تکلیف شروع ہوگئی۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرنے والی والدہ بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ الٰہی خیر! اس نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

''کیا ہوا سلمٰی؟ ارے کچھ بولو تو سہی۔''

''امّی ......امّی ......!''سلمٰی ہچکیوں میں بولی۔

''ارے کیا ہوا امّی کو؟ بتاؤ تو سہی۔''

سلمٰی نے رک رک کر بتانا شروع کیا کہ امّی آنگن میں پھسل کر گر گئی ہیں۔ رضی بھیا انہیں گاڑی کے ذریعہ ڈاکٹر کے پاس شہر لے گئے ہیں۔ شہر بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ گاؤں میں تو کوئی ڈاکٹر تھا نہیں۔ اسی شہر میں ان کی بہن روبینہ بھی رہتی تھی۔ اور اب وہ دونوں کے پہنچنے کا انتظار کر رہی تھی۔

موبائل بند ہو چکا تھا اور زرینہ اسے ہاتھ میں لیے دھم سے صوفے پر گر پڑی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ پھر جب ذرا اوسان بحال ہوئے تو وہ دعائیں پڑھنے لگی۔

ابھی دن کے گیارہ بجے تھے۔ گھر کا بہت سارا کام پڑا تھا۔ مگر اب اسے ہوش کہاں تھا۔ ایک ایک منٹ اس پر بھاری ہو رہا تھا۔ کب امّی شہر پہنچیں گی، کب ڈاکٹر دیکھے گا، کب علاج شروع ہوگا؟

بیٹھے بیٹھے اس کی نظروں میں امّی کا چہرہ گھوم گیا۔ دبلی پتلی، سیدھی سادی، کم سخن امّی ......ابا کے انتقال کے بعد تو جیسے ٹوٹ سی گئی تھیں۔ یوں تو بھرا پُرا گھر تھا۔ تین بیٹے اور تین بیٹیاں۔ دو بیٹیوں کی شادی نہایت اونچے گھرانوں میں ہوئی تھیں۔ امّی ابّا کی خواہش تھی کہ رضی کی شادی بھی کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے ہو۔ رضی پڑھا لکھا تھا۔ اسمارٹ اور خوبصورت تھا۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں اچھی نوکری تھی۔ شہر میں ایک فلیٹ لے کر شان سے رہتا تھا۔ اس کے لیے اچھے اچھے رشتے بھی آرہے تھے لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ صاحب زادے نے کچھ اور ہی گل کھلا رکھے ہیں۔ وہ ہر سنیچر کو گاؤں آتا اور سوموار کی صبح چلا جاتا۔ اس کے علاوہ ہر چھٹی میں بھی گاؤں آتا۔ لوگ سمجھتے کہ ماں باپ اور بھائی بہنوں کی محبت میں آتا ہے لیکن وہ تو گھر میں کام کرنے والی لڑکی سے محبت کر بیٹھا تھا۔ اس لڑکی کا قصہ بھی عجیب وغریب تھا۔ باپ سبحان تو اسی گاؤں کا رہنے والا تھا مگر ماں بنگالن ہندو تھی۔ سبحان مزدوری کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ کام کی تلاش میں کلکتہ گیا اور وہاں کافی دن رہا۔ واپسی پر اس کے ساتھ ایک نوجوان سانولی سی لڑکی تھی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ ایک بے سہارا لڑکی تھی جسے اس نے مسلمان بنا کے شادی کر لی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایسی باتوں پر کسی پر مقدمہ چلتا تھا نہ کسی کی لنچنگ ہوتی تھی اور نہ ہی لو جہاد (Love Jihad) کی اصطلاح ایجاد ہوئی تھی۔ گاؤں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لہٰذا بات آگے نہیں بڑھی۔ پھر یہ ہوا کہ سبحان تو کام کرنے کے لیے دوبارہ کلکتہ چلا گیا اور دو برسوں تک گھر نہیں آیا لیکن اس کی بیوی کو اس کے جانے کے پندرہ ماہ بعد ایک بچہ پیدا ہو گیا۔ وہ سال دو سال پر کبھی کبھار گاؤں آتا لیکن اس کی بیوی ہر سال ایک بچے کی ماں بن جاتی۔ گاؤں کے شرفاء کو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو چاہیے ہی تھا۔ وقت گزرتا گیا اور اس کے بچے بڑے ہوتے گئے۔ انہی میں ایک لڑکی جوہی بھی تھی جو رضی کے یہاں کام کرتی تھی۔ وہ بچپن سے ہی اس گھر میں رہتی آرہی تھی اور اس گھر کے سارے قاعدے قانون سے واقف تھی۔ نشست و برخاست اور آدابِ گفتگو شریفوں جیسے تھے۔ خاصی خوبصورت تھی اور رضی اسی کی نگاہِ ناز کا شکار ہو گیا تھا۔

پھر ایک روز جوہی غائب ہو گئی۔ ہر جگہ اس کی تلاش ہوئی مگر اس کا کچھ اتا پتا نہ چلا۔ باپ تو کلکتے میں تھا۔ ماں رو دھو کر چپ ہو رہی۔ لیکن اچانک ایک روز زبردست انکشاف ہوا۔ گاؤں کے کسی آدمی نے رضی اور جوہی کو شہر میں ایک ساتھ گھومتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے آکر سارے گاؤں میں یہ بات پھیلا دی۔ رضی کے والد ہاشم صاحب اور والدہ رقیہ بیگم کو اس بات پر ذرا بھی یقین نہ آیا۔ انہیں اپنے خون پر پورا بھروسہ تھا۔ نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اس ہفتے جب رضی گھر آیا اور اس سے اس بابت سوال کیا گیا تو وہ صاف مکر گیا۔ اور اس شخص کو برا بھلا کہنے لگا جس نے بقول اس کے یہ ''افواہ'' پھیلائی تھی۔ گھر والوں کو ویسے تو اس کی بات پر

یقین ہو گیا تھا مگر شک کی ایک لکیر دل میں پڑ چکی تھی۔ چنانچہ رضی جیسے ہی شہر گیا ہاشم صاحب نے اپنے براہل کو اس کے پیچھے روانہ کر دیا۔ اس کا نام بھگوت تھا اور وہ ان کا داہنا ہاتھ تھا۔ بھگوت صبح گیا اور شام لوٹا۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا اور سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں مالک! رجی بابو نے سچ مچ بیاہ کر لیا ہے اور وہ انہی کے ساتھ رہتی ہے۔''

یہ سن کر لمبے چوڑے ہاشم صاحب کسی بے جان شہتیر کی طرح بستر پر ڈھ گئے۔ رقیہ بیگم سسکیاں لینے لگیں۔ ہوا اچانک جیسے رک گئی۔ صحن میں دانہ چگتی ہوئی مرغیوں نے حیرت کے ساتھ انہیں دیکھا اور کبوتر اپنی پرواز بھول گئے۔

راز کھل جانے کے بعد رضی کئی ہفتوں تک گھر نہیں آیا۔ پھر رقیہ بیگم نے بھگوت کو یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ اسے بلا لائے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ رضی آیا تو ان پر گھر والوں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ جوہی کو چھوڑ دے اور کسی اچھی جگہ شادی کر لے۔ مگر وہ نہ مانا۔ اس سے یہ بھی کہا گیا کہ ابھی ایک بہن کنواری ہے۔ اگر یہ بات پھیل گئی کہ اس نے ایک ایسی کم ذات لڑکی سے شادی کی ہے جس کے باپ کا پتا نہیں تو ہو سکتا ہے کہ بہن کی شادی میں اڑچن آئے۔ مگر وہ نہ مانا۔

اس طرح ایک سال گزر گیا۔

پھر ایک روز خبر ملی کہ رضی ایک بچی کا باپ بن گیا ہے۔ ماں باپ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس خبر سے وہ خوش ہوں یا رنجیدہ۔ دل میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ کاش! وہ پوتی کی پیدائش کا جشن مناتے لیکن ان کی خوشیوں کو تو وقت کا کالا ناگ ڈس گیا تھا۔ ایک دبی دبی سی خواہش ضرور تھی کہ وہ اس کو ایک نظر دیکھتے۔

پھر ایک روز رضی، جوہی اور اس کی بچی کو لے کر گاؤں آ گیا۔ بیوی کو میکے میں رکھا اور خود بچی کو لے کر گھر چلا آیا۔ جب راز کھل جاتا ہے تو آدمی شیر ہو جاتا ہے۔ اب نہ جھوٹ بولنے کی ضرورت تھی اور نہ شرمندہ ہونے کی حاجت۔ رقیہ بیگم آنگن میں چارپائی پر بیٹھی تھیں کہ رضی نے پھلیے میں لپٹی بچی کو ان کی گود میں ڈال دیا۔ وہ چونک پڑیں اور ان کی نظر بے اختیار بچی کے مسکراتے ہوئے چہرے پر چلی گئی۔ وہ ہو بہو انہی کی تصویر تھی۔ خوب گورا رنگ، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، بڑی بڑی ہرنی سی آنکھیں......وہ تیزی کے ساتھ ہاتھ پیر ہلا رہی تھی۔ دادی پر نظر پڑی تو وہ مسکرا دی۔ اچانک انہیں اپنے سینے میں پیار کا سمندر ٹھاٹیں مارتا سنائی دیا۔ انہوں نے اسے بے اختیار اپنے سینے سے لگا لیا اور اسے چومنے لگیں۔ رضی یہ نظارہ دیکھ کر مسکرا پڑا۔ ہاشم صاحب باہر سے لوٹے تو انہوں نے ایک ننھی سی جان کو بیوی کی گود میں پایا۔ وہ پہلی ہی نظر میں ساری بات سمجھ گئے لیکن مردوں کا دل عموماً مضبوط ہوتا ہے۔ انہوں نے اس کی طرف ایک غلط انداز نگاہ ڈالی اور فریش

ہونے کے لیے باتھ روم میں چلے گئے۔ پھر وہ حسبِ معمول کپڑے تبدیل کر کے آئے اور اپنی مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔ چھوٹی بیٹی سلمٰی نے ان کے سامنے شام کی چائے رکھی اور ذرا سا رُک کر ان کے چہرے کو دیکھا۔ مگر کوئی ہلچل کوئی بے چینی نظر نہیں آئی۔ جب وہ چائے پی چکے تو رقیہ بیگم بچی کو لے کر سامنے آئیں۔ انہوں نے ایک اُڑتی ہوئی نظر بچی پر ڈالی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ آخر تنگ آ کر رقیہ بیگم نے کہا۔

''دیکھا اسے؟ یہ رضی کی بیٹی ہے۔''

''ہاں دیکھا۔'' انہوں نے مختصر سا جواب دیا اور اُٹھ کر باہر چلے گئے۔

چند دنوں بعد رضی شہر چلا گیا لیکن بیوی اور بچی کو گاؤں میں ہی چھوڑ گیا۔ اگلی دفعہ جب وہ گاؤں آیا تو سامان رکھ کر سیدھا سسرال گیا اور بچی کو اُٹھا کر لے آیا۔ رقیہ بیگم تو گویا اسے دیکھنے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ انہوں نے لپک کر اسے گود میں لے لیا۔ رضی کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس کے دل میں یہ اُمید پیدا ہوئی کہ اس کے گھر والے جلد ہی جوہی کو بہو کی حیثیت سے قبول کر لیں گے لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ رقیہ بیگم تو مان بھی جاتیں لیکن ہاشم صاحب اسے کبھی نہیں اپناتے۔ وہ چند برس قبل فوج سے سبکدوش ہوئے تھے۔ پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ ان کے نزدیک خون، ہڈی اور ذات کی بڑی اہمیت تھی۔ گاؤں میں لمبی چوڑی پشتینی حویلی تھی۔ دور تک کھیتوں کا سلسلہ تھا...... کئی باغات تھے...... مچھلیوں بھرا تالاب تھا۔ انہوں نے بہت سارے جانور بھی پال رکھے تھے۔ گائے بکری سے لے کر مرغی، بطخ، کبوتر اور توتا سبھی ان کے پاس تھے۔ سب کچھ تھا ان کے پاس...... بس ایک چین نہیں تھا...... رضی کی نازیبا حرکت نے انہیں ہمیشہ بے چین رکھا۔

وقت گذرتا گیا۔ رضی کا آنا جانا لگا رہا۔ بچی دھیرے دھیرے بڑی ہونے لگی اور اس کا زیادہ تر وقت دادیہال ہی میں گزرنے لگا۔ خون میں ایک فطری کشش ہوتی ہے۔ بچی دادی سے بہت ہِل مِل گئی تھی۔ وہ بھی اس پر جان نچھاور کیے دے رہی تھیں۔ ہاشم صاحب کچھ بولتے تو نہیں تھے لیکن کبھی کبھی چوری سے اس کی جانب محبت کی نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ ایک دن رضی نے رقیہ بیگم سے کہا۔

''امّی! میں جوہی کو لے کر شہر جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ روحی آپ کے پاس رہے۔''

''مگر وہ ماں کے بغیر کیسے رہے گی۔''

''ابھی بھی تو زیادہ تر آپ ہی کے پاس رہتی ہے۔ وہاں شہر میں ہم دونوں کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہوگا۔'' اور اس طرح ننھی روحی دادی کے پاس رہنے لگی۔ پھر اس کے اگلے سال سلمٰی کی شادی بھی ہو گئی۔ خوبیٔ قسمت سے بہت اچھا خاندان ملا تھا۔ ہاشم صاحب اور رقیہ بیگم کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔رضی یکے بعد دیگرے چار بچوں کا باپ بن گیا۔اس تمام عرصے میں اس نے بارہا کوشش کی کہ ہاشم صاحب جوہی کو اپنی بہو مان لیں لیکن انہوں نے مان کر نہیں دیا۔البتہ پوتے پوتیوں پر نظر التفات ڈالنے لگے تھے۔

ہاشم صاحب کا منجھلا بیٹا سمیع تعلیم کے سلسلے میں زیادہ تر باہر رہا کرتا۔اسے پنے گھر والوں سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد اس نے ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری کر لی تھی اور ممبئی چلا گیا تھا۔اب والدین کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔وہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن لوگوں نے گھیر گھار کر اس کی شادی کرواہی ڈالی۔وہ کچھ روز تو گھر پر رہا، پھر اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر ممبئی چلا گیا۔اب گھر میں تین نفوس رہ گئے تھے۔ہاشم صاحب، رقیہ بیگم اور چھوٹا بیٹا رفیع۔رفیع کی عمر زیادہ نہیں تھی۔وہ کھلنڈرا مزاج کا تھا۔پڑھنے لکھنے میں اس کا دل نہ لگتا تھا اور وہ دن بھر آوارہ گردی کیا کرتا تھا۔

کون انسان کب اس دنیا کو چھوڑ کر چلا جائے کہا نہیں جا سکتا۔ایک روز ہاشم صاحب رات کا کھانا کھا کر سوئے تو پھر اُٹھے ہی نہیں رقیہ بیگم کی تو گویا دنیا ہی لُٹ گئی۔انہیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔اس وقت گھر پر سوائے چھوٹے بیٹے رفیع کے اور کوئی نہیں تھا۔لیکن ہوا کے دوش پر سوار ہو کر یہ خبر پوری دنیا میں پھیل گئی اور مغرب کے وقت تک دور نزدیک کے سارے رشتہ دار جمع ہو گئے۔عشاء کی نماز کے بعد ان کی تجہیز و تکفین ہوئی اور اس طرح زندگی کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

گزرتا ہوا وقت ہر شے پر گرد کی ایک ہلکی سی تہہ جما دیتا ہے۔کسی کی موت کا غم بھی دھیرے دھیرے ہلکا ہوتا جاتا ہے اور لوگ اپنے اپنے مشغلوں میں لگ جاتے ہیں۔لیکن اس موت کے بہانے رضی کو ایک موقع مل گیا۔وہ سب سے کہتا پھرتا۔امّی اب بالکل اکیلی ہیں۔انہیں کسی سہارے کی ضرورت ہے۔جوہی پورا گھر سنبھال لے گی۔لیکن ابھی بھی کوئی اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔

وہ اسی سوچ میں گُم تھی کہ کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی تو زرینہ چونک پڑی۔اس کے شوہر احتشام صاحب آ رہے تھے۔اسے آنسوؤں میں ڈوبا دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گئے۔اور جب انہیں صورت حال کا علم ہوا تو کہنے لگے۔

’’امّی کے ہاتھ میں فریکچر ہو گیا ہے۔بہت افسوس ہوا یہ جان کر اللہ انہیں جلد از جلد ٹھیک کر دے۔‘‘ پھر کچھ سوچ کر بولے۔

’’میرے لیے تو ابھی کہیں بھی جانا بہت مشکل ہے۔بہت سارے کام پڑے ہیں۔تم چاہو تو چلی جاؤ۔‘‘ زرینہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''بچوں کو کس پر چھوڑ کر جاؤں گی۔ آپ تو گھر کا کوئی کام کرتے نہیں ہیں۔''

احتشام صاحب نے شرمندگی کے ساتھ نگاہیں جھکا لیں۔ پھر سنبھل کر بولے۔

''رضی سے پوچھ لو۔ اگر پیسوں کی ضرورت ہے تو میں بھیج دیتا ہوں۔''

زرینہ نے رضی کو فون لگایا۔ رضی نے کہا کہ وہ لوگ شہر پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لے لیا گیا ہے۔ پہلے کووِڈ ٹسٹ ہوگا۔ پھر ایکسرے، اس کے بعد شاید آپریشن ہوگا۔ زرینہ نے پیسوں کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

''پیسوں کی نہیں آدمی کی ضرورت ہے۔''

لیکن زرینہ دوسرے شہر میں تھی اور وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔

روبینہ اسی شہر میں تھی لیکن وہ بھی بال بچوں والی تھی۔ شوہر کا اپنا کاروبار تھا۔ وہ تھوڑے وقفے سے تو ہسپتال جا سکتی تھی لیکن ہمہ وقت وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ سلمٰی گاؤں میں اپنے بچوں اور چھوٹے بھائی کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ سمیع اپنی بیوی کے ساتھ ممبئی میں تھا۔

زرینہ انہی خیالوں میں الجھی ہوئی تھی کہ موبائل پر میسیج ٹون بجی۔ رضی نے ویڈیو بھیجی تھی۔

زرینہ نے دیکھا۔ اسکرین پر چھوٹے گھر کی بیٹی لیکن بڑے گھر کی بہو، جو ہی ہسپتال کے بیڈ پر لیٹی اس کی امّی کی خدمت میں مصروف تھی۔

◀◀ ● ▶▶

Shah Colony, Shah Zubair Road
Munger Bihar 811201

تیرہ افسانے

مرتب	:	ڈاکٹر قسیم اختر	سن اشاعت	:	۲۰۲۲ء
قیمت	:	۳۵۰ روپے	صفحات	:	۲۷۶

ملنے کا پتے

بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

نولٹی بکس علامہ اقبال چوک، قلعہ گھاٹ دربھنگہ

● زویا حسن

گمشدہ آوازوں کا تعاقب

وہ مجھے پکار رہی ہے اور اس کی پکار میں بلاوے کی ایسی مٹھاس ہے، جو میں نے الائچیوں کے کھیتوں میں تب سنی تھی، جب شام ہونے کو تھی اور میں گھر کی جانب بھاگنے کی بجائے کھیتوں کے بیچوں بیچ آگے کی طرف بھاگتا چلا جاتا تھا۔ایک ہد ہد تھی جو میرے تعاقب میں تھی۔ وہ مجھے بلاتی تھی اور میں چھو کے نہ دیتا تھا۔مگر نہیں وہ تو مجھے اس بلاوے سے بہت پہلے بلاتی تھی اور میں سنتا نہ تھا، کیوں کہ میرے پاس بولنے کو بہت کچھ تھا۔ میرے منہ سے لفظ چن کر وہ جملے بناتی تھی۔ میرے ہر ہر لفظ سے کئی کئی معنی کشید کرتی مجھے سنتے ہی چلی جاتی تھی۔شام ہوتے کچھ اور سامعین جمع ہو جاتے اور اس گھر میں میرے پوپلے منہ سے نکلے لفظوں کے ورد گونجتے، اور ان کی گونج وہاں کے مکینوں کو زمان و مکاں سے آزاد کرتی ایک شادمانی کے جہاں تک لے جاتی۔ جہاں صرف میں تھا اور کوئی نہیں۔ وہ مجھے پکار رہی ہے، میں اس کے لبوں کو چھوتا ہوں اور انہیں کچھ لفظ عنائت کرتا ہوں۔ وہ لفظ کی مالا جپتی حال کھیلنے لگتی ہے۔

میں بے نیاز ہو جاتا ہوں اور آگے بڑھ جاتا ہوں۔

کوئی کھانستا ہے اور جو کھانستا ہے اس کے سینے میں درد کی آواز بلغم کی گڑگڑاہٹ سے پہلے مجھ تک پہنچتی ہے۔ میں میکانکی انداز میں اٹھتا ہوں اور اس کے لبوں سے پانی کا گلاس لگا دیتا ہوں۔مگر اس کی کھانسی رک نہیں رہی۔ میں اس کی پیٹھ سہلاتا ہوں اور تب مجھے معلوم ہوتا ہے اس کا لمس جانا پہچانا ہے اور وہ کوئی عورت ہے۔ میں اس سے پوچھتا ہوں۔

''تم کون ہو؟''

مگر وہ درد کی مالا جپتی ہے اور اس کی آنکھوں میں موت کا انتظار پھڑ پھڑا رہا ہے۔ وہ اپنی دوائیوں کے ڈبے کو کھولتی اس میں سے نئے نسخے ڈھونڈنے لگتی ہے۔ وہ ابھی بھی کھانس رہی ہے اور ماتمی بڑبڑاہٹ اس کے لبوں پہ ہے۔مگر مجھ سے مخاطب نہیں۔ جیسے وہ کسی اور دنیا سے بول رہی ہو اور میرے لفظ اس تک نہ پہنچتے ہوں......میں اونچی آواز میں سوال دہراتا ہوں۔مگر وہ دھڑا دھڑ دوائیوں کو اپنے اندر بھرنے میں مشغول

ہے۔میں اپنا سوال مزید بلند آواز سے کئی بار دھراتا ہوں۔ یہاں تک کہ وہ میری طرف متوجہ ہوتی ہے اور میرا ہاتھ پکڑ کر دیر تک اپنے رخسار پہ رکھتے اپنے وجود کی کچھ گرمی مجھ میں منتقل کرتی ہے۔تب میں جانتا ہوں کہ وہ میری بیوی ہے۔ادراک کا یہ لمحہ مجھ میں سکون پیدا کرتا ہے اور میں اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ جاتا ہوں۔

کمرے میں صرف میں اور وہ ہیں اور کچھ بے کار سامان ہے۔ بیکار اس لیے کہ وہ ہم دونوں کے کام کا نہیں۔سامان میں میری اور اس کی چارپائیاں ہیں جو ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر ہیں۔ان دونوں کے بیچ ایک میز ہے جس پہ پانی کا ایک جگ، گلاس، چمچ سرسوں کے تیل کی بوتل، کچھ بچی روٹی کے خشک ٹکڑے، دوائیوں کا کھلا ڈبہ جس سے کچھ دوائیاں ٹیبل پہ بکھری ہوئی ہیں اور موت کی انتظار کرتی کچھ سانسیں ہیں جو درد کا ورد جپتی ہیں۔ایک دو پٹ کی فولادی الماری ہے جو بے ترتیبی کا شکار ہے کہ اس کو ترتیب دینے والا کوئی نہیں۔ایک وال کلاک ہے جس پہ سوئیاں جانے کس حادثے کا شکار ہوئیں کہ مزید چلنے سے انکاری ہیں۔ایک وہ ہے جو ٹی بی، بلڈ پریشر، دل کے عارضے، بہرے پن اور بڑھاپے کی مریضہ ہے۔ایک میں ہوں جو آوازوں کے تعاقب میں ہوں۔ میری اپنی آواز کئی عرصہ سے کہیں گم ہوگئی ہے کسی تک پہنچی نہیں۔ اسی لیے میں آوازوں کے تعاقب میں ہوں کہ شاید کہیں سے میری آواز مجھے مل جائے۔

اس کمرے سے ملحق ایک اور کمرہ ہے جہاں بہت سی آوازیں آباد ہیں۔وہ کمرہ ایک بڑی عمارت کا حصہ ہے اور اس کا دروازہ عمارت کے اندر اس کے وسیع ہال میں کھلتا ہے اور ہم اس عمارت کے پچھواڑے میں رہتے ہیں۔میرا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے کہ ان آوازوں پہ کان دھرتا ہوں جو خاموشی میں گونجتی ہیں تاکہ اپنی کھوئی آواز کا پتہ لگانا آسان ہو۔

میں خاموشی کی آواز سننے کی کوشش میں کانوں کو اپنے وجود سے آزادی کا عندیہ دیتا ہوں۔وہ مجھ سے الگ ہو کر ساتھ والی دیوار سے چپک جاتے ہیں۔وہ آواز جو صرف تب تب ہی گونجتی تھی جب خاموشی ہوتی تھی گونجتی ہے۔وہ آواز ہنس رہی ہے اور اس کی ہنسی کے بیچ کوئی دوسری آواز مل کر دوستانہ پیغام دے رہی ہے۔وہ دونوں آوازیں دیر تک باتیں کرتی ہیں۔میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے لبوں سے کچھ لفظ چن کر ان تک پہنچا آؤں کہ دیکھو یہ لفظ بھی ہیں ابھی ان کا وقت پورا نہیں ہوا۔ایک وقت تھا کہ یہ بہت معتبر تھے ان کو سننے کے لیے ایک جہاں تھا......ان کو بھی سن لو، یہ تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔ایک وقت تھا کہ گاؤں کی خالص فضاؤں میں اڑتے پرندے اس آواز کے تعاقب میں رہتے تھے۔

باہر بارش برسنے لگی ہے۔

یہ میری آواز جو گم ہوگئی ہے اس کو مٹانے کی کوشش میں ہے۔میں چارپائی پہ اس خیال سے سہم کر

ٹانگیں اکٹھی کرتے اپنے ماتھے تک لے آتا ہوں اور ایک گٹھڑی سی بنا کر اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتا ہوں کہ کہیں یہ میری آواز جو کہ گم ہو چکی ہے کو مٹا نہ دیں۔ مگر بارش کی آواز میں پل پل مزید آوازوں کا شور شامل ہوتا رہتا ہے۔ وہ بول رہی ہے۔

''جہانگیر! او جہانگیر تم ٹھہر جاو ذرا...... ناتم نے ابا کو کون سی کہانیاں سنائی ہیں کل کی، کہ وہ میرے اور ویرے کے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ ہم نے پوری زندگی ڈنگر ہی رہنا ہے۔ تجھ جیسا نہیں بن سکتے...... 'بیبا'...... تو رک ذرا سارے پنڈ کو اپنے پیچھے لگا لیا ہے تو نے۔ تو نہیں بچے گا...... آج میرے ہاتھ سے۔

وہ میرے پیچھے بھاگتی تھی۔ وہ میری ہد ہد تھی جو الا ئچیوں کے کھیتوں کے بیچوں بیچ میرے پیچھے آتی تھی۔ مگر میں پکڑ کر نہ دیتا تھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو سارا زمانہ جو تمہاری جھوٹی کہانیاں سن لیتا ہے تو میں بھی تجھ سے متاثر ہو جاوں گی۔ اس موئے شہر کے سکول سے تو روز کوئی نئی خبر لاتا تھا اپنے ملک بارے تو چلو خیر تھی۔ گو ہم سب تیرے گرد بیٹھ کر تیری جھوٹی خبریں سنتے تھے مگر یقین نہیں تھا تجھ پہ کسی کو۔ اب موا ریڈیو لے آئے ہو، سارے پنڈ کو ارد گرد بٹھا کر سناتے ہو، ساتھ اپنے بھاشن دینے لگے ہو۔ اوپر سے چاچا دینو اپنے پتر کی لائقی دیکھ تجھے دھپ لگا دیتا ہے کہ چل کا مو ہیر سنا اور تو اپنے مراسیوں والے پکے سُر لگانے لگتا ہے تو یہ ہمارے وارے میں نہیں۔ تو نے ہم سب بالے بالیوں کو ہمارے گھر میں بے کار ثابت کرنے کی ٹھان لی ہے تو تو سن میں تیرا یہ ریڈیو ہی توڑ دوں گی تو ہاتھ تو لگ......''

میں ہاتھ میں ریڈیو لیے بھاگتا جاتا تھا اور وہ میرے پیچھے بھاگتی آتی تھی۔

وہ مجھ سے تین سال چھوٹی تھی۔ میں تب دسویں میں تھا اور اپنے گاوں میں واحد تھا جو شہر پڑھنے جاتا تھا۔ میری بات کو پورے گاوں میں معتبر مانا جاتا تھا۔ میرے کہے ہر لفظ پہ وہ سادہ سے لوگ کامل ایمان لے آتے تھے۔ میں ان کو سائنس کی کتاب پڑھ کر سناتا تو وہ عقیدت سے آنکھیں بند کر کے لگاو سے سنتے۔

ہد ہد کو اسی بات کا غصہ تھا۔ وہ اور میرے ہم جولی میری کمینگیوں سے واقف تھے۔ آج تنگ آ کر وہ میرے پیچھے آئی تھی۔ وہ بھاگ رہی تھی اور میں اس کے آگے بھاگتا پکڑ کر نہ دیتا تھا۔

وہ ہانپنے لگی تو میں رک گیا۔ وہ دھیرے دھیرے مجھ تک پہنچ گئی۔

میں نے اس کے کان میں محبتوں کے بول ڈالتے اس کی لٹ کو اپنی انگلی پہ لپیٹ لیا تھا اور اس کی بولتی بند ہو گئی۔

''چلو بیٹھ جاو یہاں...... فضول کی باتیں تو تم کر سکتے ہو یہ ہی تو تمہاری خوبی ہے۔''

وہ ادا سے قریبی، بنے، پہ بیٹھ گئی تھی۔

’’چل اب سزا ہے تیری اپنی آواز میں وارث شاہ کے کوئی بول سنا۔ سارا گاوں کہتا ہے تم سی آواز قسمت والوں کو ملتی ہے۔‘‘

میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں تو الائچیوں کے پودے حیا سے سر نہا لیتے اور جھومنے لگتے۔ سورج اپنی آخری کرن بھی کرہ ارض سے سمیٹتا گھر کی راہ لیتا۔

پھر ایک عالم سرمستی میں وارث شاہ کی ہیر کے کچھ بول جو ابا نے مجھے چاندنی راتوں میں کھلے آسماں تلے چار پائیاں بچھائے تب سکھائے تھے، جب اماں، میں اور ابا تین الگ الگ چار پائیوں پہ لیٹے آسمان دیکھتے تھے، اور گھپ اندھیروں میں شفاف آسماں پر موجود ستارے ہمارے آنگن کو روشن کرتے تھے، گانے لگتا۔

مینوں بابلے دی قسم رانجھیا وے مرے ماں جے تدھ تہیں مکھ موڑاں

تیرے باہجھ تعام حرام مینوں تدھ باہجھ نہ نین نہ آنگ جوڑاں

خواجہ خضر تے بیٹھ کے قسم کہادی

تہیواں خوار جے پریت دی ریت توڑاں

کوہڑی ہو کے نین پران جاون تیرے باہجھ میں کونت جے ہور لوڑاں۔

کئی سال وہ ہد ہد الائچیوں کے کھیت میں میری آواز کے پیچھے بھاگتی رہی۔

یہاں تک کہ میں شہر آ کر ایک حکومت مخالف تحریک کے ساتھ جڑ گیا۔ فکر معاش اور مقصد زیست کے بکھیڑوں میں الجھا رہا۔ وہ تب بھی مجھے خط لکھتی تھی۔

’’جہانگیر میرے کان، یہ الائچیوں کے پودے اور سارا گاوں تمہاری آواز سننے کو ہر وقت منتظر رہتے ہیں۔‘‘

وہ کھانس رہی ہے اور باسکٹ میں بلغم تھوکتے تھوکتے کل سے خون بھی تھوکتی ہے۔ اس کی زندگی سامنے لگی گھڑی کی سوئیوں میں اٹک سی گئی ہے، چلتی نہیں۔ میں میکانکی انداز میں اٹھ کر اس کا پیشاب سے بھرا بیڈ پین غسل خانے میں خالی کرتا ہوں اور اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتا ہوں۔ جو اس کا حق ہیں مگر وہ سنتی کب ہے۔

’’تم بہت پیاری ہو قدس۔ تمہارے گلابی ہونٹ میری کمزوری ہیں۔‘‘

مگر وہ مسلسل اپنے ایک گھٹنے میں مکے چلاتی چلی جاتی ہے۔ حالانکہ ایک وقت تھا کہ میرے ان بولوں پہ اور میری آواز کی فرمائش پہ وہ ایمان لے آئی تھی۔ اور انہیں کو کُل جان کر ساری زندگی میرے ساتھ گزارنے کو تیار ہو گئی تھی۔ میری آواز نے شہر آ کر بھی اپنے لیے بہت سے سننے والے ڈھونڈ لیے تھے اور ان میں سے ایک قدس بھی

تھی۔مگراب اس تک بھی میری آواز نہ پہنچ پاتی تھی۔میرے کان اب ماضی کے کچھ بول سننے کو مچلتے ہیں۔

کمرے میں درد کا نوحہ اب نقطہ عروج تک پہنچ چکا ہے۔'ہائے ہائے' کے نشتر میرے وجود کے تعقب میں ہیں۔ میں ان سے فرار چاہتا ہوں۔کیوں کہ وہ اپنا آپ تو مجھے سناتے ہیں میرا سننے کی ہمت کھو بیٹھے ہیں۔اس لیے میں اس شخص پہ توجہ مرکوز کرتا ہوں جس کی آنکھوں میں ہمت اور ولولے نمایاں ہیں اور اس کی آواز میں سب کچھ کر گزرنے کی للکار ہے اور جو کسی درد سے آشنا نہیں باغی ہے۔وہ مجھ سا لگتا ہے میں اسے سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوتا ہوں وہ کہہ رہا ہے؛

''کہی بات اور لکھا جملہ درست سامع اور قاری کے محتاج ہوتے ہیں میرے عزیز۔دانا شخص عام لوگوں میں بے وقوف اور مسخرہ کہلاتا ہے اور بے وقوف، دانا لوگوں میں قابل رحم سمجھا جاتا ہے۔لفظ کی حرمت میں یہ بھی ہے کہ اسے درست سامع کے کان میں انڈیلا جائے۔کیا سمجھے! مجھ سے بات کرنے کے لیے تمہیں ابھی بہت زیادہ بلوغت درکار ہے میرے عزیز۔''

وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے سامنے پڑی میز کو ٹھوکر لگاتا ہے اور اس کو سننے والا خجل سا ہو کر رہ جاتا ہے۔میں بھی اپنی ٹانگ اسی جذبے سے لہراتا ہوں۔

سامنے کی میز جس پہ پانی کا ایک جگ، گلاس، چمچ، سرسوں کے تیل کی بوتل، کچھ بچی روٹی کے ٹکڑے، دوائیوں کا ایک ادھ کھلا ڈبہ جس سے کچھ دوائیاں باہر آ گئی تھیں زمین پہ الٹی پڑی تھی۔

وہ شخص ایک انقلابی تحریک کا صدر تھا اور اپنی پارٹی کے جلسوں میں اپنی آواز کے طلسم سے ثور پھونک دیتا تھا۔مائیک پہ پورے جوش سے اپنی آواز کا جادو جگا رہا ہے اور لوگوں کے ایک جم گفیر کو اپنے نام کا ورد جپتے سنتا ہے۔

''کامران صدیقی زندہ باد!''

''کامران صدیقی زندہ باد!''

''تحریک انقلاب زندہ باد''

وہ ہواوں میں دونوں ہاتھ بلند کر کے ان کے ساتھ نعرے لگا رہا ہے۔اور کوئی سٹیج سے گر جاتا ہے کوئی اسے جھنجھوڑ رہا ہے کہ گرنے والے پہ توجہ دے۔میں ہڑبڑا کر توجہ کرتا ہوں وہ پانی کا گلاس پکڑنے کی کوشش میں چارپائی سے گر گئی ہے۔

دروازے پر دستک ہے۔بارش کے شور میں یہ دستک بہت پر اسرار سی معلوم ہوتی ہے۔میں خود غرض سا بن کر وہ جو گر گئی ہے کو وہیں کراہتا، بلکتا چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکتا ہے کہ شائد میری آواز کا کوئی سراغ ہو۔

دروازہ کھلتے ہی کئی چہرے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ان کی زبانیں فریاد کرکر کے خشک ہوئے جاتی ہیں اور حلق سے باہر لٹکتی ہیں۔میں کان لگا کر ان کو سننے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ سب مجھے پکار رہی ہیں۔میں سہم جاتا ہوں۔پھر ان میں سے وہ جو میرے پوپلے منہ سے نکلے لفظوں سے جملے بناتی تھی، میں اس سے اپنی آواز کا پتہ پوچھتا ہوں۔وہ دیر تک میرے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں بھر کر دیکھتی رہتی ہے۔

''تمہاری آواز اگلی نسلوں کے کانوں کی تلاش میں نکلی ہے میرے لال،صرف انہیں کو سنائی دے گی،مگر ایک عمر کے تمام ہونے تک اسے بھٹکنا ہوگا۔ہماری آوازیں بھی ایک عمر کا فاصلہ طے کر کے آئی ہیں،ہماری آوازیں جو کبھی تمھیں سنائی نہ دیں،ایک عرصہ تک تمہارے کانوں کے تعاقب میں تھیں۔دیکھو میرے لال انہیں تمہارے کان اب میسر ہیں۔آوازوں کو کہیں پہنچنے کے لیے بہت ساری آوازوں میں گم ہونا پڑتا ہے۔یہاں تک کہ وہ بہت سی آوازیں بے جان نہ ہو جائیں تب تک وہ سنی نہیں جاسکتیں۔''

مجھے اپنی آواز کی بے بسی پہ ترس آتا ہے،سو دیوانہ وار باہر کو بھاگتا ہوں۔وہاں نئی نسل کی آوازوں کے جھرمٹ میں،جن میں وہ آوازیں بھی شامل ہیں جو میرے کمرے کی دیوار کے اس پار رہتی ہیں، جو بولتی ہیں اور ہنستی ہیں بھی شامل ہیں مجھے اپنی شکستہ، بے جان اور دھتکاری ہوئی آواز مل جاتی ہے۔میں اس کے لیے ایک بار پھر سے کوئی کان تلاش کرتا ہوں، جو اسے سن سکے مگر وہ سب آوازیں بہت توانا ہیں اتنی کہ مجھے ان سے خوف آتا ہے اور وہ آوازیں کان نہیں رکھتیں۔میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنی آواز کو واپس کھینچ کر اپنے کمرے میں لے جاسکوں۔مگر ابھی اسے عمر تک سفر میں رہنا ہے یہ جان کر میں لٹا پٹا سا الٹے پاوں واپس آ گیا ہوں۔

◀◀ ● ▶▶

Adv. Hammad Hassan
Diamond city colony house 147
D block Sialkot Cantt ,Pakistan - Mob-03227008999

سہ ماہی عالمی انتساب (اکتوبر تا مارچ ۲۰۲۳ء)

ترتیب	:	ڈاکٹر سیفی سرونجی	مدیر	:	آفاق سیفی
قیمت	:	۲۰۰ روپے	صفحات	:	۲۸۸

ملنے کا پتہ

سیفی لائبریری سورنج مدھ پردیش ۴۶۴۲۲۸

● رویندر جوگلیکر

لاش نامہ

لاش کیا ہے؟

زندہ حال کا ماضی ہو جانا یا پھر حال میں تو بنے رہنا پر زندگی سے عاری ہو جانا۔وقت کے دھارے پر بے نیاز اور بے تمنا بہتے چلے جانا۔

یہ الگ بات ہے کہ زندگی سے عاری ہونے کے بعد اب تک چلا آ رہا زندگی کا سفر، مذہبی عقائد اور رسومات کے انجام دینے سے طے پانے لگتا ہے۔لاش کے اختیار میں اب کچھ نہیں رہتا کیوں کہ لاش زندگی سے عاری ہو چکی ہوتی ہے۔

لاش کے اگلے سفر کا طریقہ موت کے بعد اُس لاش سے وابستہ عقیدے اور مذہب پر منحصر ہوتا ہے۔ان ہی خیالوں سے پیچھا چھڑاتی ہوئی روحیں، دریا میں ڈوبتی اترتی لاشوں کے ساتھ محو سفر تھیں۔ان روحوں کو تب تک لاشوں کے ساتھ ہم سفر بن کے رہنا تھا جب تک یم دوت آ کر اُنھیں لے نہیں جاتے۔

دریا کا صاف اور شفاف نرمل اور موکش دینے والا پانی، روانی کے ساتھ بہتا چلا جا رہا تھا کہ نہ جانے کہاں سے اس میں ایک اور لاش آ کر گری اور پانی کے ساتھ بہنے لگی۔پورے عالم میں پھیلی وبا کے دوران چلتے دریا کے پانی نے اس طرح کا منظر اتنی بار دیکھ لیا تھا کہ پانی کی سطح پر نہ تو کوئی ہلچل ہوتی اور نہ کوئی لہر اٹھتی جو مردنی آمیز سکوں کو درہم برہم کرتی۔ایک دم بے حس، منجمد جذبات کی سمت لیے بہتا ہوا پانی۔

دریا کنارے دفن لاشوں کا معاملہ:

دریا کے طویل اور وسیع ساحل پر بہت سے یم دوت فرصت میں بیٹھے غپ ہانک رہے تھے۔اُنہیں ابھی ابھی ذرا فرصت ملی تھی۔کچھ لمحوں پہلے ہی انہوں نے دفن لاشیں برآمد کر کے ان میں اٹکی ہوئی روحوں کو اپنے قبضے میں لیا تھا۔وہ روحیں اپنے انجام کے بارے میں کوئی خاص فکر مند نہیں تھیں۔حالاں کہ ان روحوں سے وابستہ جسموں کو موت آنے کے ٹھیک پہلے تک وہ سب روحیں اس فکر میں مبتلا تھیں کہ ان کی آخری رسومات ٹھیک طرح سے انجام دی جائیں گی یا نہیں؟ کچھ روحیں جن کا دورانِ حیات کا پس منظر غربت اور عدم

فراہمی کا تھا اس لیے فکر مند تھیں کہ وہ جانتی تھیں کہ غربت نے انہیں اس حالت میں بھی نہیں چھوڑا ہے کہ ان کی آخری رسومات کے اخراجات اُٹھائے جا سکیں۔ چند روحیں اس لیے فکر مند تھیں کہ وبا کے چلتے ان کے اپنے لاشوں کو ہاتھ لگانے سے کترا رہے تھے اور ان کی آخری رسومات بیگانوں نے انجام دی تھیں اور بعض دفعہ تو غیر مذہب کے افراد نے۔ اب چونکہ یم دوت آ چکے تھے اور اُنہوں نے سب ہی روحوں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ وہ سب مطمئن ہو گئی تھیں کہ کم سے کم اب انہیں یہاں بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ اچھا برا جو بھی ہے کم سے کم آسمانوں میں تو رہیں گی اور کیا پتا وبا کی وجہ سے ہوئی موت کے سبب اُنھیں جنّت ہی میں بھیج دیا جائے۔

''میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گی، چھوڑ دو مجھے، میں یہیں رہ کر انتظار کروں گی...... جب تک میں اس کی لاش، جسم، اس کا چہرہ نہیں دیکھ لیتی۔''

ایک روح یم دوتوں کی پکڑ سے بار بار چھوٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ روح کمزور تھی۔ کسی بھی روح میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ طاقتور یم دوتوں سے آزاد ہو سکے۔

ایک یم دوت نے اس روح کے ہاتھ جکڑتے ہوئے کہا ''کس لاش کا انتظار ہے تمہیں؟ کیا بک رہی ہو؟''

''وہ میرا، ہم سفر...... میرا پیار''

''موت کے بعد سب رشتے ناتے فوت ہو جاتے ہیں اور پیار؟...... ایسے کسی رشتے کے بارے میں تو ہم نے کبھی نہیں سنا۔''

''میرے لیے ابھی کچھ فوت نہیں ہوا ہے! مجھ پر رحم کریں۔ مجھے یہیں چھوڑ دو...... جانے دو...... اس کی لاش میرے سامنے دریا میں پھینکی گئی تھی۔ بہتے ہوئے وہ یہاں سے گزر سکتی ہے۔''

''اے احمق روح! لاش کو دیکھ کر تم کیا کر لو گی؟ اس کی بھی روح کسی نہ کسی یم دوت کے قبضے میں ہو گی۔ ہمارے ساتھ چلو گی تو سیدھے اس کی روح سے ملاقات ہو جائے گی۔''

''یہاں سے جانے سے پہلے مجھے اس کا جسم دیکھنا ہے۔ اسے چھونا ہے۔ اس بدن کو جس کے لمس سے میں محظوظ ہوتی رہی ہوں، جس کا احساس میرے اندر تک موجود ہے، اس کی روح تک میری رسائی ہو پائے گی یا نہیں؟ میں نہیں جانتی۔ اس لیے مجھے یہیں رہنے دو۔''

ندی کی دیوی کا انتشار:

دریا کے پانی میں وبا سے موت پا چکے جسم تیرتے ڈوبتے بہتے چلے جا رہے تھے۔ دریا کی دیوی محسوس کر رہی تھی کہ ہر لاش سے وابستہ مخصوص زندگی کی یادیں، حسرتیں اور ارمان رِس رِس کر اس کے پانی میں مدغم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک شور سا تھا جو بہتے ہوئے پانی کی آواز سے بہت تیز تھا۔ ادھوری حسرتوں اور خواہشوں کا شور!

دیوی کو اس شور میں سے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن جب سے ایک لاش ندی پر بنے پل سے دریا میں آ کر گری ہے تب سے ایک نغمہ سا، ایک نظم نما کیفیت والی صدا دریا کے پانی میں ایک سکوں گھولنے لگی۔ دریا کی دیوی کے ذہن کو اس صدا نے اپنی اُور متوجہ کر لیا۔

دیوی نے محسوس کیا کہ اس لاش سے خوشی کی لہریں اٹھ رہی ہیں اور فراغت کے ترانے رِس رِس کر پانی میں مل رہے ہیں۔ قرار اور سکوں کی دُھن اس لاش میں نہاں تھی۔

دریا کی دیوی سے رہا نہیں گیا اور اس کے دل میں پیدا ہونے والے تجسس نے دریا کے اوپر منڈلا رہے یم دوتوں سے دریافت کیا۔

''اے یم دوتو! ذرا رکو! میری بات سنو!۔ ان بہتی ہوئی لاشوں میں ایک لاش......اوہ......میں معافی چاہتی ہوں!۔ میں جانتی ہوں میں آپ کے کام میں دخل اندازی کر رہی ہوں ...... جب سے یہ وبا چلی ہے......نہ جانے کتنی لاشیں میرے پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتی چلی گئی ہیں کہ میں سب کو بے حس اور منجمد، برف جیسے سخت اور ٹھنڈے ہو چکے جذبات کے ساتھ دیکھتی رہتی ہوں لیکن جب سے ایک لاش میرے سامنے پانی میں نہ جانے کہاں سے آن گری ہے تب سے دل میں ایک ہوک سی اٹھ رہی ہے۔ میرے تجسس کا باعث بنی ہوئی ہے۔ اس لاش سے وہ صدا، وہ نغمہ سنائی دے رہا ہے جو میرے بے حس پانی میں فراغت کی لہریں پیدا کر رہا ہے۔ اس مہاماری کے چلتے، اس وبا کے پر آشوب دور میں لاشیں ڈھوتے ڈھوتے میرے ذہن پر جو بوجھ پڑا ہے اس کے سبب میرے احساس و جذبات ماند پڑ چکے تھے۔ پر اس لاش سے رسنے والے نغموں نے معلوم نہیں کیوں میرے ذہن میں سکوں گھول دیا ہے۔ جتنی لاشیں بہتی ہوئی میں نے دیکھی ہیں وہ سب اپنی آخری رسومات پوری طرح انجام نہ پانے کی وجہ سے احساس کمتری کے بوجھ کے ساتھ میرے پانی میں بھیگی ہوئی ہیں۔ فکر مند چہروں کے ساتھ کبھی ڈوبتی ہیں کبھی سطح پر آ جاتی ہیں۔ پر یہ لاش......؟ اتنی خوش کیوں ہے؟ اس کے پیچھے کیا وجہ ہے......اے یم دوت............ بتاؤ مجھے!''

دریا پر منڈلاتے ہوئے یم دوت، دریا میں بہتی ہوئی لاشوں سے روحیں اور روحوں سے وابستہ حسرتوں، ارمانوں، خوابوں اور یادوں کو برآمد کر رہے تھے۔ ایک یم دوت دیوی کی پکار کا جواب دینے کے لیے پانی کی سطح پر نیچے تک آ گیا۔

''دیوی! ویسے تو مجھے اجازت نہیں ہے کہ کوئی بھی یم دوت فلسفیانہ موشگافیوں میں پڑے لیکن آپ کی اس پراسرار التجا کو سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ اس لیے میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔ دیوی! میں نے آپ کی بات سنی اور اس یم دوت سے جس نے اس لاش میں سے روح برآمد کی تھی......دریافت کر کے ساری

معلومات حاصل کر لی ہیں۔

''پھر کہو اے یم دوت! کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہ لاش ایک سنیاسی فقیر کی ہے جو ایک لڑکی سے محبت کر بیٹھا۔لڑکی بھی اسے چاہتی تھی۔لڑکی پسماندہ دلت طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ گاؤں والے سنیاسی کی اس خطا سے بہت ناراض ہوئے۔ایک ادھیڑ سنیاسی بیس برس چھوٹی لڑکی کے ساتھ کس طرح سے رہ سکتا ہے؟ پر کہتے کچھ نہیں تھے۔

گاؤں میں لوگوں کا خیال تھا کہ گاؤں کی خوشحالی کا سبب اس گاؤں میں سنیاسی کا موجود ہونا ہے اور ایسا ماننے والوں کی تعداد سنیاسی سے ناراض لوگوں سے زیادہ تھی۔ چنانچہ گاؤں میں اس بات کو لے کر بھی کوئی وبال نہیں ہوا۔جب لڑکی اور سنیاسی دونوں ایک ساتھ سنیاسی کی جھونپڑی میں رہنے لگے تھے۔ان کا رشتہ کچھ اس طرح کا تھا کہ نہ لڑکی نے سنیاسی سے پوچھا کہ وہ کب تک اس کے ساتھ رہے گا اور نہ سنیاسی نے کبھی اسے اپنے پاس روکنے یا چلے جانے کے لیے کہا۔جب مہاماری کا دور شروع ہوا اور گاؤں میں موتوں کا سلسلہ زور پکڑنے لگا تو گاؤں کے بزرگوں نے جو سنیاسی سے کڑھتے اور حسد رکھتے تھے،لوگوں کو ورغلاتے ہوئے کہا کہ ''پاپ اب حد سے بڑھ چکا ہے اور اگر اس سنیاسی اور اس لڑکی کو روکا نہیں گیا تو یہ وبا پورے گاؤں کو ختم کر دے گی۔''

اس ملک کی حکومت اور انتظامیہ کی بے رخی سے پریشان گاؤں والے اس بات پر یقین لے آئے اور سنیاسی کے پاس پہنچے۔

''آپ کو یہ سب یہیں روکنا ہوگا یا پھر گاؤں چھوڑ کر جانا ہوگا۔سنیاسی ہو کر ایک لڑکی ....وہ بھی اچھوت؟''

ایک بزرگ نے کہا۔''بابا جی! اب یہ سب نہیں چلے گا۔اس لڑکی کو تو ہم دیکھ ہی لیں گے اب'' گاؤں کا ایک نوجوان غرایا۔

''آپ کون ہوتے ہیں دخل دینے والے۔'' شور و غل سن کر لڑکی طیش میں آ گئی اور چیختی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکلی۔

''اس یتیم جوان ہریجن لڑکی کو جسے پورے گاؤں میں کہیں پناہ نہیں ملی تھی، جہاں اس کی عصمت کا شکار کرنے ارد گرد اسی گاؤں کے بھیڑئے موجود تھے، بھگوان تو چھوڑو! انسان دیکھنے تک ترس گئی تھی، اس وقت سنیاسی نے مجھے سیدھے بھگوان کے روبرو کھڑا کر دیا۔ مجھے انسان ہونے کا احساس کرایا۔ چلے جاؤ تم سب!''

لڑکی کی یہ بات سن کر چند عورتیں اس کے پاس آئیں اور اسے مارنے پیٹنے لگیں۔

''ارے ارے یہ کیا کر رہی ہو، چھوڑو......ہٹو............دور ہو جاؤ...... یہ پیٹ سے ہے......کچھ

تو خیال کرو!'' لڑکی کو بچانے کے لیے سنیاسی ان عورتوں کے جھنڈ سے جدوجہد کرنے لگا۔ سنیاسی کی بات سن کر بھیڑ سکتے میں آ گئی۔

''دیکھا! ہم نے نہ کہا تھا؟ پاپ کا گھڑا بھر چکا ہے، اس لیے یہ وبا یہ مہاماری اس گاؤں تک آ پہنچی ہے۔''

''گاؤں سے باہر نکال دو انہیں۔''

''ہم تو کہتے ہیں مار ہی ڈالو، جہاں بھی جائیں گے پاپ ہی پھیلائیں گے۔''

اتنا بیان کرنے کے بعد یم دوت ساکت ہو گیا اور اپنی گردن جھکا کر خاموش نظروں سے دیوی کے قدموں کی طرف دیکھنے لگا۔

''رک کیوں گئے یم دوت؟ آگے کہتے جاؤ۔ میں بھی تو سنوں میرے کنارے پر رہنے والے افراد کس حد تک جا سکتے ہیں۔''

''جب سنیاسی کو لوگ مارنے پیٹنے لگے تو اس شور غل میں کسی نے لڑکی کو اغوا کر لیا۔ لاٹھی، ڈنڈوں کی مار کھاتے، کچلے جاتے سنیاسی کو جب تک لڑکی دکھائی دیتی رہی اور اس کی چیخ پکار سنائی دیتی رہی تب تک سنیاسی زندہ رہا۔ لڑکی کے اغوا ہوتے ہی اس نے دم توڑ دیا۔ اس کی لاش ندی کے پل پر سے پھینک دی گئی اور جواب آپ کے مقدس پانی میں تیر رہی ہے۔ سنیاسی کی روح مطمئن ہے کہ اب اسے نجات مل جائے گی کیوں کہ وہ لڑکی کی روح سے ایک نہ ایک دن مل سکے گا۔ یہی سبب ہے کہ اس کی لاش کے دریا میں آنے پر آپ کو یہ سب محسوس ہوا۔''

''ہے ایشور! میرے ساحلوں پر یہ سب چلتا رہا اور مجھے کوئی خبر بھی نہ ہوئی!'' دیوی کا چہرہ سفید برف کی مانند سخت اور ٹھنڈا نظر آ رہا تھا۔

''آپ کو تو بہت سے واقعات..........'' یم دوت کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

دیوی اسے خاموش نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ان نگاہوں میں بے بسی اور شرمندگی تھی۔ ''آگے کہو یم دوت..........آگے کہتے جاؤ۔''

دیوی نے آنکھیں بند کر لیں اور یم دوت نے دیکھا دیوی کے آنکھوں سے تین رنگوں کے آنسو بہنے لگے۔ دائیں آنکھ سے زعفرانی رنگ لیے ہوئے، بائیں آنکھ سے ہرا رنگ لیے ہوئے اور ماتھے کی مانگ میں سے سفید رنگ کے آنسو بہہ رہے تھے جو دیوی کے رخسار کو ایک ترنگا نور عطا کر رہے تھے۔

''لڑکی کو اغوا کرنے کے بعد کیا ہوا؟ یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم! کیوں کہ سنیاسی کی روح سے ایسی کوئی یاد برآمد نہیں ہوئی لیکن یہاں سے قریب ایک کوس دور کنارے پر بہت سی لاشیں دفن کی گئی ہیں، وہاں پر بھی یم دوت رات دن اپنا کام کر رہے ہیں۔ شاید وہاں سے......''

''کیا تم پتا لگا سکتے ہو یم دوت......؟ بولو۔''

''جی دیوی! اگر آپ کی ایسی خواہش ہے تو میں ضرور جاؤں گا۔''

''مجھے معلوم ہے تم پر کوئی کارروائی ہو سکتی ہے، پر تم فکر مت کرو میں تمہاری گواہی دوں گی...... ارے میں نے تمہارا نام ابھی تک نہیں پوچھا۔''

''دیوی! میرا نام 'سناتن' ہے۔''

''جاؤ سناتن! اس لڑکی کی روح کا پتا لگاؤ...... ہاں! یہ تو بتاؤ کہ سنیاسی کی لاش سے جو یہ صدا، یہ نغمگی رس رہی ہے، جو یہ چہرے پر سکوں کے نشان ہیں......اس کا سبب کیا ہے؟''

''دیوی! سنیاسی کو معلوم ہے موت کے بعد لاش اور روح سے وابستہ کوئی ذات نہیں رہتی اور نہ ہی مذہب بچتا ہے۔ اس کے لیے یہ ہی تو نجات ہے۔ موکش ہے نربان ہے اور جب اس کا احساس مرنے سے پہلے ہو جائے تو مردہ جسم بھی نغمہ سرا ہو جاتا ہے......اچھا دیوی مجھے اجازت دیجیے میں جلد از جلد آپ کے پاس واپس آنے کی کوشش کروں گا۔'' یہ کہہ کر یم دوت اُڑ گیا۔

دریا کنارے دفن لاشوں سے روحیں برآمد کرنے کا کام قریب قریب ختم ہوا تو یم دوت دریا کنارے چھوٹے چھوٹے جھنڈ میں دائرہ بنا کر گپ شپ کر رہے تھے۔ کچھ کاغذوں میں حساب کر رہے تھے۔ کچھ یونہی بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ کچھ یم دوت سوم رس پینے لگے تھے۔ حالاں کہ یم دوتوں کو سوم رس پینے کی اجازت نہیں تھی پر وبا کے چلتے یم دوتوں کا کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ یم دوتوں میں جوش بھرنے اور اپنے کام کی تھکان اتارنے کے لیے انہیں ایک وقت تک چھوٹ دے دی گئی تھی۔

سناتن یم دوت جب یہاں پہنچا تو اسے سمجھ نہیں آئی کہ درکار معلومات کہاں سے حاصل کرے۔ تب ہی اس کی نظر ایک یم دوت پر پڑی جو اکیلا تھا اور ندی کنارے بیٹھا سستا رہا تھا۔

''جے یم راج جی کی۔''

''یم راج جی کی جے۔''

''میرا نام سناتن ہے میں یہاں سے ایک کوس کی دوری پر ندی میں ملنے والی لاشوں سے نسبت گروہ میں کام کر رہا تھا۔''

''یہاں پر کیا دریافت کرنے آئے ہو؟''

''مجھے اس ندی کی دیوی نے کچھ معلوم کرنے بھیجا ہے۔'' سناتن نے پورا قصہ اسے سنایا۔

''وہاں ادھر کونے میں چلے جاؤ، وہاں چند سرکش، ناراض، باغی روحیں ہیں جو یم دوتوں کے

ساتھ جانے سے پہلے اپنی کچھ شرطیں منوانا چاہتی ہیں۔''

سناتن یم دوت دریا کنارے پر چلتا ہوا بتائی گئی سمت بڑھتا چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا چند یم دوت روحوں کو کس کر زنجیروں میں پکڑے ہوئے تھے۔ بہت شور وغل ہو رہا تھا۔ کچھ روحیں یم دوتوں سے بحث کر رہی تھیں۔

سناتن نے ایک یم دوت سے کہا ''مجھے اس روح کی تلاش ہے جس کی لاش یہاں دفن ہو اور جو کسی سادھو سے محبت کرتی تھی۔''

یم دوت نے کاغذ کے پلندے میں کچھ کاغذات تلاش کیے جن میں ہر لاش اور اس لاش سے وابستہ روح کے ارمان، خواب، حسرتیں اور یادوں کے بارے میں سب معلومات درج تھیں۔

''ہاں! یہاں ایک ایسی لڑکی دفن ہے، اس کی آخری یاد کسی سادھو کو پٹتے دیکھنے اور ندی کے پُل کے نیچے کنارے پر اپنی عصمت دری کے بعد اس نے اُسی وقت پل پر سے سنیاسی کی لاش ندی میں پھینکے جاتے دیکھا تھا۔''

''عصمت دری؟......تو کیا اغوا ہونے کے بعد'......' سناتن من ہی من سوچنے لگا۔

''جلا کر مار ڈالا گیا اسے، پھر یہاں وبا میں مرنے والے لوگوں کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔'' یم دوت نے کاغذات میں درج عبارت پڑھتے ہوئے سناتن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سناتن کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔

''وہ دیکھیے! اس لڑکی کی روح، بڑی ضدی روح ہے، ہر یم دوت سے ایک ہی بات کہہ رہی ہے......نہیں جاؤں گی جب تک اپنے پیار کی بہتی ہوئی لاش نہ دیکھ لوں!......وہ دیکھو! وہاں دو یم دوت الگ سے اس کے ساتھ رکھنے پڑتے ہیں۔''

''کیا تم ہی وہ روح ہو جو سنیاسی......؟''

''ہاں ہاں......میں وہیں ہوں......'' لڑکی کی روح تپاک سے بولی۔

''مجھے یہاں کے سربراہ سے بات کرنی ہے۔'' سناتن نے لڑکی کو پکڑے ہوئے یم دوت سے کہا۔ اس یم دوت نے ندی کے بیچوں بیچ کھڑے ہوئے یم دوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ وہاں......ہمارے سربراہ''

''میرا نام سناتن ہے، میں دریا کی دیوی کی طرف سے ایک التجا لے کر آیا ہوں۔''

''عجیب بات ہے۔ دریا کی دیوی تو یہاں پر بھی سیدھے سیدھے آسکتی تھی، دریا کی دیوی تو دریا میں ہر جگہ موجود ہے، پھر انہیں کسی یم دوت کو بھیجنے کی کیا ضرورت آن پڑی؟''

ٹھیک اسی وقت لاشوں کا ریلا بہتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر سناتن بڑبڑایا۔

’’ہے ایشور!......چلیں اُس روح کو یہاں لے آئیں، وہ سنیاسی کی لاش پہچان لے گی۔‘‘

سربراہ نے ہاتھ کے اشارے سے روح کو یہاں لانے کو کہا۔ ایک یم دوت لڑکی کی روح کو لے کر دریا کنارے چل پڑا۔

اسی وقت دریا کی دیوی وہاں نمودار ہوگئی۔ سناتن اور اس پوری کارروائی کے سربراہ یم دوت نے انہیں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔

’’کیا ہوا سناتن؟ تمہاری بات چیت سن کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔‘‘

یہ سن کر سربراہ یم دوت نے اپنی نظریں نیچی کرلیں، تب ہی لڑکی کی روح کو لے کر یم دوت یہاں آ گیا۔

’’چھوڑو مجھے! کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟‘‘ لڑکی کی سرکش روح مسلسل احتجاج کر رہی تھی۔

دیوی نے دیکھا، لڑکی کی روح کے چاروں طرف نور کا ہالہ بنا ہوا تھا۔

’’تمہاری خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہی یہاں ہم سب موجود ہیں، تم یہاں ان بہتی ہوئی لاشوں کے بیچ اپنے پیار کی لاش پہچان لو......تمہیں پوری اجازت ہے، یم دوت اسے لے کر جاؤ اور اس کی خدمت کرو۔‘‘

سربراہ یم دوت نے بھی آنکھ کے اشارے سے، روح کو پکڑے ہوئے یم دوت کو اجازت دے دی، یم دوت لڑکی کی روح لے کر دریا کے اوپر منڈلانے لگا۔

’’دیوی آپ یم راج کے دائرہ اختیار میں دخل دے رہی ہیں‘‘

یم راج وہاں آن پہنچے۔ روحوں کو زمین سے آسمان کی عدالت تک پہنچانے کا سارا ذمہ یم راج کے حوالے تھا۔ یم راج نے جیسے ہی سربراہ اور سناتن کی طرف ایک تیزابی نظر ڈالی تو خوف اور شرم کے مارے دونوں کے ہوش زائل ہونے لگے تھے۔

’’آپ بھول رہے ہیں یم راج! یہ لاشیں میرے ہی پانی میں بہہ رہی ہیں اور میرے ہی کنارے پر دفن ہیں۔ ہر طرح کی معلومات دریافت کرنے کا مجھے پورا حق ہے۔‘‘

’’دیوی! میں آپ سے صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ روحوں کے کسی بھی معاملہ میں دخل نہ دیں۔ ہمارا جو نظام ہے اس میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔‘‘

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ یم دوت لڑکی کی روح کو لے کر واپس لوٹ آیا۔ یم راج کو وہاں دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

’’مہاراج کی جے ہو!‘‘ بس اتنا ہی کہہ کر وہ گردن جھکائے کھڑا ہو گیا۔

’’کیا ہوا؟ کیا سنیاسی کی لاش دکھائی دی؟‘‘

’’نہیں دیوی، کافی تلاش کیا۔ سنیاسی کی لاش ہمیں کہیں بھی نظر نہیں آئی۔‘‘

یم راج کا صبر پہلے سے ہی جواب دے چکا تھا۔

’’چلو ختم کرو یہاں سے، یہ سب سمیٹو تم! ہمیں اور بھی بہت سی روحیں برآمد کرنی ہیں ...... دیوی! اجازت دیجیے! مجھے افسوس ہے دیوی! اس وبا میں آپ کے پانی میں اتنی لاشوں کا بوجھ آن پڑا ہے۔‘‘

’’نہیں، میں نہیں جاؤں گی جب تک میں اپنے سنیاسی کا جسم نہ دیکھ لوں۔‘‘

سرکش روح یم راج کو آتش زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ یم راج اس کی آنکھوں میں ابلتے شعلوں کی تاب نہ لا سکے۔

’’چھوڑ دو اس کو، یہ مت بھولو کہ سنیاسی کی روح تو ہمارے ہی قبضہ میں ہے، یاد رکھو!‘‘

’’بے شک! لیکن آپ یہ بھول رہی ہیں کہ مجھے سنیاسی کے جسم نے ہی میرے جسم کے اندر روح موجود ہونے کا پہلے پہل احساس کروایا تھا۔ اس لیے مجھے اس کا جسم ایک بار دیکھنا ہے، چاہے کتنا ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔‘‘

یہ سُن کر یم راج وہاں سے غائب ہو گئے۔

سب کے جانے کے بعد دیوی اکیلی رہ گئی۔ اب کچھ یم دوت دفن لاشوں کی قبروں پر سے چادریں، چنریاں ہٹانے لگے۔ دیوی یہ سب بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ پر کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ اپنی گود میں دفن لاشوں کا یہ انبار دیوی کو پھر سے تر نگے آنسو رونے پر آمادہ کر رہا تھا۔ کچھ دوری پر سنیاسی کی لاش ایک کنارے پر کھڑی جھاڑی میں اٹکی ہوئی تھی۔

ایک گدھ کی نظر سنیاسی کی لاش پر ٹھہر گئی اور وہ سوچ رہا تھا ’آخر تم دریا میں بہتی کیوں نہیں ہو؟ لڑکی کی روح اب بھی دریا کنارے انتظار کر رہی ہے۔ وہ ہمارے عہد میں دریا کے ساحل پر ہماری بے بسی کی گواہ ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Flat No 504 , Century Heights , Jatkhedi Road
Near Sangrila Housing society , Bawadiya Kalan
Bhopal (MP)-Pin 462026
Whatapp/Cell:9630144514

● طارق شبنم

سونے کا پیالہ

بستی سے بہت دور نکل کر میں ایک گھنے جنگل تک پہنچ گیا تو جنگل میں ایک جگہ میں نے صاف و شفاف نیلے پانی کی ایک خوب صورت جھیل دیکھی۔ پانی دیکھ کر میں خوش ہوا اور جھیل کے میٹھے پانی سے اپنی پیاس بجھائی، ہاتھ منہ دھو کر اوپر والے کی بارگاہ میں گڑ گڑاتے ہوئے اپنے دل کی مراد پوری ہونے کی دعا مانگی۔ ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے ستانے بیٹھ گیا اور سوکھی روٹی کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔

''یہ کیسی زندگی ہے؟ جہاں لوگ اپنے ہی گھروں میں قید ہو کر رہ گئے ہیں، جہاں انسان کو انسان سے ہی ڈر لگے، جہاں کوئی کسی کے گھر نہ جا سکے، کسی سے مل نہ سکے اور کسی کے دکھ سکھ میں شامل نہ ہو سکے یہاں تک کہ اوپر والے کے گھر میں جا کر عبادت بھی نہ کر سکے۔ آخر خوف، ڈر، مار دھاڑ اور بے بسی کی اس آگ سے انسانوں کو کب اور کیسے خلاصی نصیب ہوگی؟''

''چھپاک ...... چھپاک......'' میں پریشان سوچوں کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا تو دفعتاً اس خاموش جھیل میں چھپاک کی زوردار آواز سے طلاطم برپا ہو گیا اور میں سوچوں کے خول سے باہر آ کر جھیل کی طرف دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد جھیل خاموش ہوگئی اور جھیل کے کنارے خوب صورت لباس میں ملبوس ایک باوقار حسینہ، جس کے چہرے پر شبنم کی سی تازگی اور ستاروں کی سی چمک تھی، کھڑی تھی۔ ارد گرد کا جائزہ لینے کے بعد وہ حسینہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے میری طرف آنے لگی جس کے ساتھ ہی چار جانب عطر کی خوشبو پھیل گئی۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے گھبراہٹ کے عالم میں میرے ذہن میں کئی طرح کے سوالات جنم لینے لگے......

''اے خدا کے بندے...... یہاں اس خوفناک جنگل میں کیا کر رہے ہو؟'' اسی لمحہ شہد سے بھی میٹھی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

''میں......میں......ایک مسافر ہوں اور یہاں کچھ دیر آرام کرنے بیٹھا ہوں۔'' میں نے ہمت جٹا کے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تمہاری منزل کہاں ہے؟''

''میری منزل......وہ......'' اس کے سوال کا مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا اور میری گھبراہٹ

میں اضافہ ہو گیا۔

''گھبراؤ نہیں اے آدم زاد...... میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔'' اس نے انتہائی شفقت بھرے لہجے میں کہا تو میری گھبراہٹ کسی حد تک دور ہو گئی، میں نے اسے تفصیل سے اپنے حالات اور منزل کے بارے میں بتایا۔

''اووہ...... ''کل یگ'' کے آدم زاد کی پریشانیوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں، لیکن......''

''لیکن کیا محترمہ......؟''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک ایسی دنیا میں پہنچا سکتی ہوں جہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور سکون ہی سکون ہوگا، لیکن بدلے میں تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔'' اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر کے کچھ سوچتے ہوئے قدرے توقف کے بعد بتایا۔

''کون سا کام؟ اور آپ ہو کون؟''

''میں پریوں کے دیس کی شہزادی ہوں اور اس جنگل کے پیچھے ایک غار ہے جس میں ایک بد مست جن نے میری ایک سہیلی کو قید کر رکھا ہے، تمہیں پانی کا ایک پیالہ میری سہیلی تک پہنچانا ہوگا۔''

''نہیں...... نہیں...... یہ مجھ سے نہیں ہوگا، جن مجھے مار ڈالے گا۔'' میں خوف سے کانپنے لگا۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا کیوں کہ وہاں سے انسانوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور جنوں کی خاص نظر صرف ہم پر ہوتی ہے۔ خیر کوئی جلدی نہیں ہے، اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دے دینا۔''

کہتے ہوئے وہ غائب ہو گئی اور میں تذبذب میں پڑ گیا کہ کیا کروں۔ دراصل میں دنیا کے موجودہ پریشان کن حالات سے سخت بے چین اور خوفزدہ تھا اور بہت دنوں سے اوپر والے سے دعا مانگ رہا تھا کہ مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا دے جہاں یہ خوف و ڈر، پریشانی، بے چینی اور بے یقینی نہ ہو۔ چین ہی چین اور سکون ہی سکون ہو۔ سکون کی تلاش میں میں نے کئی ملکوں کا سفر کر کے بیسوں شہر چھان مارے لیکن مایوسی اور ناامیدی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا اور آخر تنگ آ کر اس جنگل کی راہ لے لی۔ کچھ دیر سنجیدگی سے سوچنے کے بعد میرے دل و دماغ میں یہ خیال گھر کر گیا کہ شاید اوپر والے نے میری دعا قبول فرمائی اور اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے یہ وسیلہ فراہم کیا۔ میرا دماغ تیز رفتار موٹر کی پہیے کی طرح گھومنے لگا اور میں بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔

''تو کیا سوچا تم نے؟'' جلد ہی وہ واپس آ کر گویا ہوئی۔

''مجھے منظور ہے، لیکن میں آپ کی بات پر یقین کیسے کروں؟'' میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

''شاباش......'' اس نے متبسم ہونٹوں سے کہا اور آنکھیں بند کر کے کچھ منتر پڑا جس کے ساتھ

ہی ایک خوب صورت تخت میرے سامنے آ گیا۔

''آنکھیں بند کر کے اس تخت پر بیٹھ جاؤ۔'' اس نے تخت پر بیٹھتے ہوئے کہا، میں بھی تخت پر بیٹھ گیا اور تخت ہوا میں اڑنے لگا......۔

''اب آنکھیں کھولو۔'' کئی گھنٹوں کی اڑان کے بعد اس نے کہا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ایک سرسبز شاداب میدان میں پایا جہاں مختلف قسم کے بہت سے چوپائے چر رہے تھے۔

''یہی وہ دنیا ہے جس کی تمہیں تلاش تھی۔''

''لیکن، یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ میں بعد میں بتاؤں گی، فی الحال اس دنیا کی سیر کرو، جب میری ضرورت پڑے تو اسی جگہ آ کر تین بار ''جل پری شوقی'' پکارنا، میں حاضر ہو جاؤں گی۔''

اس نے بستی کی طرف جانے والا راستہ دکھاتے ہوئے کہا اور تخت سمیت غائب ہوگئی۔ کچھ دیر اردگرد کا جائیزہ لینے کے بعد میں بستی کی طرف نکل پڑا اور بہت دور جا کر ایک کچی سڑک پر پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ سڑک پر گاڑیوں کے بجائے بیل گاڑیاں دوڑ رہیں تھیں وہ بھی بہت کم۔ سڑک کے دونوں اطراف بہت سے مرد و زن کھیت کھلیانوں میں بے فکر ہو کر کام میں مصروف تھے جنہوں نے نہ ہی ماسکیں لگائے تھے اور نہ ہی احتیاطی دوری کا کوئی خیال رکھا تھا۔ چلتے چلتے تھک ہار کر میں بستی میں پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں، جن کے چھتوں پر گھاس پھوس تھی، کی بستی تھی۔ کسی بھی مکان کے اردگرد دیوار بندی نہیں تھی، خواتین گھروں کے صحنوں میں چکیاں پستی اور پتھروں سے بنے اوکھلوں میں کچھ کوٹتی تھیں۔ مرد بھی مختلف کاموں میں مصروف تھے جب کہ بغیر لباس کے بچے جگہ جگہ کھیل کود میں مگن تھے۔ یہاں کے لوگ کافی صحت مند ہٹے کٹے تھے، لیکن کسی نے بھی مناسب لباس نہیں پہنا تھا سب پھٹے پرانے بوسیدہ لباسوں میں ملبوس تھے بالکل قدیم انسانوں کی طرح۔ بستی میں بیچ بیچ میں مختلف قسم کے میوؤں سے لدے باغات تھے جنہیں دیکھ کر میرے مُنہ میں پانی بھر گیا۔ مجھے بھوک بھی لگی تھی اور وہاں مجھے کہیں کوئی دکان نظر نہیں آئی، سو میں یہ سوچ کر ایک باغ، جہاں کچھ مویشی چر رہے تھے، میں سستانے بیٹھ گیا تا کہ موقعہ پا کر دو تین سیب چبا ڈالوں۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کا صحت مند شخص آیا تو میں نے اسے پوچھا۔

''بابا...... یہ باغ آپ کا ہے؟''

''ہاں پتر...... میرا ہی ہے، کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟'' اس نے سرتاپا میرا جائیزہ لیتے ہوئے کہا۔

''بابا...... میں ایک مسافر ہوں، بہت بھوک لگی ہے کچھ سیب چاہیے کھانے کے لئے۔'' میں نے

پچاس روپے کا نوٹ اس کی اور بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پتر...... بھوک لگی ہے تو خود توڑ کر کھائے کیوں نہیں اور یہ کیا ہے؟''اس نے نوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''روپے ہیں بابا۔''اس نے نوٹ ہاتھ میں لیا اور کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد شان بے نیازی سے مجھے واپس کر کے ایک درخت سے پانچ چھ لال لال سیب توڑ کر میرے سامنے رکھے اور خود بھی ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے سیب کھانے بیٹھ گیا۔سیب انتہائی لذیذ تھے میں نے دو تین سیب کھائے اور یہ سوچنے لگا کی رات کہاں گزاروں۔

''چلو پتر......گھر چلتے ہیں۔''اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''بابا......وقت کیا ہوا ہے۔''

''بیٹا......شام کا وقت قریب ہے۔''اس نے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے وقت دیکھنے کے لئے جیب سے موبائیل فون نکالا لیکن اس میں کوئی سگنل تھی اور نہ ہی گھڑی کام کر رہی تھی۔

''بابا......آپ کے پاس موبائیل ہے ایک فون کرنا تھا۔''

''موبائیل......پتر وہ کیا ہوتا ہے؟''اس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کپڑے کے بنے تھیلوں سے مویشیوں کے مُنہ ایسے ڈھانپنے لگا جیسے ہم ماسک پہنتے ہیں۔

''بابا......آپ ان کے مُنہ کیوں بند کر رہے ہو۔''میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پتر...... یہ بے چارے ناسمجھ ہوتے ہیں اور راستے میں ادھر اُدھر منہ مار کر دوسروں کا حق کھاتے ہیں اسی لئے۔''اس نے کہا اور ہم مویشیوں کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دئے۔اس کا گھر مٹی سے بنے چھوٹے چھوٹے پانچ مکانوں پر مشتمل تھا،ایک طرف دس بارہ گھوڑے اور بیسوں چوپائے بندھے ہوئے تھے۔دوسری طرف پانچ چھ خواتین چرخہ کات رہی تھیں جب کہ چار خواتین پتھر کے بڑے اوکھلوں میں کچھ کوٹ رہیں تھیں۔ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ایک بزرگ خاتون مٹی کے بنے بڑے بڑے گلاسوں میں لسی اور ایک ٹوکری میں بڑی بڑی روٹیاں لے کر آ گئی۔بھوک کے باوجود میں آدھا گلاس لسی اور آدھی روٹی ہی کھا سکا جب کہ بابا نے پانچ چھ گلاس لسی کے ساتھ اتنی ہی روٹیاں بھی کھا لیں۔اس دوران بابا مجھے افرادخانہ کا تعارف بھی کراتا رہا۔اس گھر میں بابا کے باپ،دادا،پڑدادا، بیٹوں، پوتے پوتیوں، پڑپوتوں پڑپوتیوں سمیت چھ پیڑیوں پر مشتمل ستر سے زیادہ لوگ اکٹھے رہ رہے تھے۔شام کے کھانے کا منظر دیدنی تھا۔وہاں

چونکہ بجلی کا کوئی تصور نہیں تھا، مشعل جلا کر گھر کے صحن میں تین بزرگ خواتین مٹی کے برتنوں میں کھانا پروسنے بیٹھ گئیں۔ پہلے بچوں نے کھایا، پھر مردوں نے اس کے بعد خواتین نے۔ کھانا کھانے کے بعد سارے محلے کے بچے، جوان مرد و خواتین بے فکر ہو کر اکٹھے دیر تک چھپا چھپی اور دوسرے کھیل کھیلتے رہے، جس کے بعد میزبان گھر کے آدھے افراد گھروں کے اندر آدھے صحن میں سو کر خراٹے لینے لگے۔ تھکاوٹ کے باوجود بہت دیر تک مجھے نیند نہیں آئی اور میں قدیم انسانوں جیسے اس نئے ماحول کے بارے میں سوچتا رہا اور آخر اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ کوئی بچھڑا ہوا دیہی علاقہ ہے۔ ان کے پیار اور سادگی سے متاثر ہونے کے باوجود میں نے شہر کا رخ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ لوگوں کے چلنے پھرنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں میری سماعتوں سے ٹکرانے لگیں۔ میں بھی اٹھ کر گھر سے باہر نکلا۔ واش روم وغیرہ کا وہاں کوئی تصور نہیں تھا۔ کچھ دوری پر بہت سی کھلی زمین تھی اور ایک صاف و شفاف ندی بہہ رہی تھی۔ عورتیں ایک طرف اور مرد دوسری طرف حاجت بشری کے لئے جا رہے تھے اور واپس آ کر ندی پر کچھ ہاتھ مُنہ دھونے اور کچھ نہانے کے بعد پاس ہی واقع ایک میدان میں اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اوپر والے کی عبادت کرتے تھے۔ ندی پر ہاتھ مُنہ دھو کر صبح کے پرسوز ماحول سے لطف اندوز ہونے کے لئے میں ادھر اُدھر ٹہلتا رہا اور واپس آ کر ناشتے سے فارغ ہو کر بابا سے پوچھا۔

''بابا...... مجھے شہر جانا ہے، کوئی سواری ملے گی۔'' اس نے مجھے گھوڑے کی پیش کش کی لیکن میرے منع کرنے پر بتایا۔

''بونہ گام تک تمہیں پا پیادہ ہی جانا ہوگا، وہاں سے شاید کوئی بیل گاڑی مل جائے۔''

''موٹر گاڑی نہیں ملے گی؟''

''وہ کیا ہوتی ہے؟'' اس نے حیرت زدہ ہو کر لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ میں نے بھی اسے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا، اسی لمحے میرے ذہن میں پری کا خیال آیا۔ ان سے اجازت لے کر جنگل میں اسی جگہ پہنچ کر، جہاں پری نے مجھے چھوڑا تھا، میں نے تین بار ''جل پری شوقی'' پکارا تو وہ حاضر ہوگئی۔ میں نے اسے شہر جانے کے ارادے سے آگاہ کیا تو اس نے منتر پڑھ کر تخت حاضر کر دیا اور ہم دونوں اس پر سوار ہو کر ہوا میں اڑنے لگے۔''

''آنکھیں کھولو۔'' گھنٹے بھر بعد پری نے کہا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک چھوٹا سا سرسبز میدان تھا جہاں بیچ بیچ میں پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو شہر جیسی کوئی بات دکھائی نہیں دی۔

''جل پری......شہر کہاں ہے؟''

''یہی شہر ہے، گھوم پھر کے دیکھ لو، میری ضرورت پڑے تو اسی جگہ آ کر تین بار پکارنا۔'' کہہ کر وہ چلی گئی کیوں کہ وہ بہت جلدی میں تھی۔

میں نے ماسک پہنا، سینی ٹائیزر سے ہاتھ صاف کیے اور باہر کی طرف نکلا۔ ایک پرانے طرز کا چھوٹا بازار تھا، وہی دیہات جیسے مٹی سے بنے چھوٹے چھوٹے مکان جن کے چھتوں پر گھاس تھی۔ لوگ گھوڑوں، خچروں پر آتے جاتے تھے اور اکا دکا بیل گاڑیاں بھی چل رہی تھیں، ہماری جیسی گاڑیوں جیسا نام نشان نہیں تھا۔ میرے موبائیل پر وہاں بھی سگنل نہیں تھی۔ کچھ دیر ادھر ادھر گھوم پھر کے میں ایک نانوائی کے دکان پر جا کر اسے پوچھا۔

''بھائی صاحب ایک روٹی دے دو۔'' میں نے پانچ روپے کا سکہ اسے دیتے ہوئے کہا۔ سکہ دیکھ کر اس کی آنکھیں چندیا گئیں۔

''چھوٹے نہیں ہیں بھائی صاحب...... پھر کبھی دے دینا۔'' اس نے ایک روٹی اور مٹی سے بنا بڑا لسی کا گلاس میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت ایک خاتون ایک بڑی ٹوکری لے کر آئی اور ایک چھوٹا سا کالا سکہ نانوائی کو دیا جس نے پچاس سے زیادہ روٹیاں ٹوکری میں ڈال کے اس کو دے دی۔ میں نے لسی کے ساتھ روٹی کھالی جس دوران نانوائی سے باتیں کرتے ہوئے یہاں کی زندگی کے متعلق کافی جانکاری بھی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد میں پھر اسی میدان میں جا کر بیٹھ گیا اور اس شہر کے لوگوں کی طرز زندگی، جو اس دیہات سے زیادہ مختلف نہیں تھی، کے بارے میں سوچتا رہا۔ نہ ہماری طرح بڑے بڑے رہائشی مکانات، نہ موٹر گاڑیاں نہ ڈھنگ کا لباس نہ تعلیم نہ ترقی نہ بجلی اور نہ ہماری جیسی دوسری سہولیات پھر بھی لوگ اس قدر خوش، مطمئن، صحت مند، بیماریوں سے مبرا، سینکروں برس جی کر پرسکون زندگی گزار رہے ہیں، آخر راز کیا ہے؟ سب سے زیادہ میں اس بات سے متاثر ہوا کہ لوگ رات کو بھی چلتے پھرتے تھے یہاں تک کہ عورتیں اور بچے بھی، نہ کوئی خوف نہ ڈر۔ قریب آدھی رات تک سنجیدگی سے سوچنے کے بعد میں نے دل ہی دل میں اسی شہر میں رہنے کا فیصلہ کر لیا اور میدان، جہاں اب بھی مشعال جلا کر بہت لوگ بیٹھے بے فکری سے حقے کے کش لیتے ہوئے گپ شپ میں مصروف تھے اور کچھ لوگ سوئے بھی تھے، میں بھی سرور کی کیفیت میں ٹانگیں پھیلا کر سو گیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو نانوائی میرے سامنے موجود تھا۔

''بھائی صاحب...... چلو وہاں ہاتھ منہ دھو کر دکان پر آ کر روٹی کھا لو۔''

اس نے اپنائیت کے انداز میں کہا۔ ہاتھ منہ دھو کے میں دکان پر گیا اور لسی کے ساتھ روٹی کھالی، نان وائی کا خلوص دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھ ہی لیا۔

''بھائی صاحب...... یہ کس یگ کے لوگ ہو آپ؟ اور اس شہر کا نام کیا ہے؟''

''دعا پر یگ۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''یہاں کوئی کام ملے گا؟''

''میرے پاس ہی رہو، تمہاری ساری ذمہ داری میری۔''

''مجھے کرنا کیا ہوگا؟''

''بس یہاں بیٹھنا ہوگا اور کچھ نہیں لیکن شادی کرنی پڑے گی۔''

''شادی......لیکن......''

''سارا خرچہ میں کروں گا اور آپ کو رہنے کے لئے جگہ بھی دونگا۔'' اس نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''کتنا خرچہ ہوگا؟''

''دو تین ٹکے۔''

''یہ ٹکا کتنا ہوتا ہے؟''

''تمہیں نہیں معلوم...... یہ دیکھو، یہ پھوٹی کوڑی، تین پھوٹی کوڑی کی ایک کوڑی، دس کوڑی ایک دمڑی، دو دمڑی ایک پائی، ڈیڑھ پائی ایک دھیلہ، دو دھیلے ایک پیسہ، دو پیسے ایک ٹکہ......'' وہ سکے دکھا کر مجھے سمجھا تا رہا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے خوش ہو کر حامی بھر لی اور کچھ دیر تک اسے باتیں کرنے کے بعد آ کر سرور کی کیفیت میں اسی میدان میں بیٹھ کر نئے خواب بننے لگا۔ اسی لمحہ پری حاضر ہوگئی۔ میں نے اسے اپنے فیصلے کے بارے میں بتایا تو وہ اپنے عنابی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے گویا ہوئی۔

''اب میری بات پر یقین ہو گیا؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اسی لمحہ تخت حاضر ہو گیا۔

''چلو پہلے اپنا واعدہ پورا کرلو۔'' میں چاہ کر بھی انکار نہ کر سکا اور بادل ناخواستہ ہی اس کے ساتھ تخت پر سوار ہو کر اسی جھیل کے پاس پہنچ گیا جہاں وہ مجھے ملی تھی۔ اس نے مجھے سنہرے کاغذ میں لپٹا ہوا پیالہ دیا، غار تک پہنچنے کا راستہ، اپنی سہیلی تک پیالہ پہنچانے کا طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ وہ سخت پریشانی اور بے چینی میں ہے اور یہ پانی پیتے ہی اسے سکون نصیب ہوگا۔ میں پیالہ، جسے بے حد عمدہ خوشبو

آرہی تھی لے کر غار کی طرف روانہ ہوگیا۔

''کیوں نہ میں سنہری کاغذ اٹھا کر دیکھ لوں کہ اس پیالے میں کیا ہے؟ جو اتنی عمدہ خوشبو آرہی ہے۔''

''نہیں......نہیں...... یہ تو خیانت ہوگی۔'' میں کشمکش میں مبتلا ہوگیا کہ کیا کروں، آخر اچانک ایک جگہ بیٹھ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پیالے سے سنہری کاغذ ہٹایا تو یہ دیکھ کر میری آنکھیں چندیا گئیں کہ پیالہ خالص سونے کا تھا اور اسے نکلی ہوئی خوشبو چاروں اور پھیل گئی۔

''ارے نادان......کہاں بھٹکتے رہوگے، پانی پھینک دو اور پیالہ لے کر واپس اپنے گھر جاؤ ساری زندگی عیش و آرام سے گزرے گی۔'' میرے اندر سویا ہوا لالچ کا بے لگام گھوڑا بیدار ہو کر ہنہنانے لگا، کچھ لمحے سوچنے کے بعد میں نے عجلت میں پیالے کا ڈھکن اٹھا کر جوں ہی پانی گرانا چاہا تو ایک جھٹکے سے کسی نے پیالہ میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو سامنے جل پری تھی۔

''کمینے آدم زاد......آخر دکھائی نا اپنی اوقات۔'' پری نے مجھے خشم ناک نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''جل پری......مجھے معاف کردو، مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ مجھے ایک اور موقعہ دو، میں واپس جا کر ''دعا پر یگ'' شہر میں رہنا چاہتا ہوں۔'' میں خفت اور خجالت کی وجہ سے سر جھکائے ہوئے ہاتھ باندھ کر منتیں کرنے لگا۔

''دعا پر یگ میں رہوگے......''کل یگ'' کے نادان انسان، ابھی تم نے ''دعا پر یگ'' کی سیر کر کے وہاں کے پیار اور سادگی کی ایک ہی جھلک دیکھی ہے اور یہ تمہارا امتحان تھا۔ اس پیالے میں چشمہ سکون کا پانی ہے، جو تمہارے لئے ہی تھا اور جس سے پی کر تم ''تر تیا یگ'' کے خلوص کی چاشنی اور ''ست یگ'' کی سچائی کی مٹھاس بھی دیکھتے اور تمہیں سکون ہی سکون اور چین ہی چین نصیب ہوتا، لیکن نابیناؤں کو روشنی دکھانا ہی بے کار ہے۔ اس بے قمیت پیالے کے جھانسے میں آکر تم نے اپنے آپ کو اس انمول دولت سے محروم کردیا، کیوں کہ تمہارا اندرون لالچ اور حرص کی کالک سے لتھڑا ہوا ہے اور اپنے کالے کرتوتوں کے سبب بے سکونی پریشانی اور خوف وڈر کی زندگانی ہی تمہارا مقدر ہے''۔

جل پری نے اپنے لہجے میں برف کی سی خنکی ڈال کر کہا اور سونے کا پیالہ لے کر غائب ہوگئی۔ میں پشیمان ہو کر پریشانی کے عالم میں اپنا ریزہ ریزہ وجود لئے بوجھل قدموں سے واپس گھر کی طرف چلنے لگا۔

◀◀ ● ▶▶

Village Ajass Distt. Bandipora Jammu Kashmir 193502
Ceii.No 9906526432 Email...tariqs709@gmail.com.

● راجہ یوسف

بلورین

''ارے وااااہ......میری بلورانی آج کل کیا پڑھ رہی ہے۔''

''تیرے کام کی چیز نہیں ہے دیدی......رہنے دو۔''

''پھر بھی تو دکھاؤ کیا ہے۔'' بڑی بہن شفق نے کتاب ہاتھ سے چھین لی اور دیکھتے ہی نیچے پھینک دی۔''

''ارے یہ......چھی چھی چھی......پھر سعادت حسن منٹو......یہ کیا پڑھتی ہو بلورین؟''

''او ہو شفق دیدی......بتایا تھا نا تیرے مزاج کی چیز نہیں ہے۔''

''کتنی بار کہا اسے مت پڑھا کر۔اس کو پھر پڑھا تو امی کو بتا دوں گی۔''

بلورین اپنی معصوم بہن شفق کو یاد کرتے ہی رو پڑی۔شفق شادی کے بعد صرف پندرہ دن زندہ رہی۔اس کی موت سے سارے علاقے میں صف ماتم بچھ گئی تھی۔لوگوں میں اس کے شوہر گاما کے لئے نفرت تھی۔انہیں شفق کی بے وقت موت نے دکھی کر دیا تھا۔کھرچنا، پھاڑنا، اتارنا گاما کا شیوا تھا۔(گاما بدنام غنڈہ تھا۔لڑکیوں کے لئے وہ وبال جان بن گیا تھا۔جو بھی اس کے پنجوں میں پھنس جاتی تو جیسے چیل کے پنجے میں چوزہ......تڑپتی، پھڑ پھڑاتی یا جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتی)وہ بدمست سانڈ جیسا حیوان تھا......جاہل اتنا کہ شریف لوگ نظریں چرا کے راستہ ناپتے......لیکن نیتا سر پر ہاتھ رکھتے۔کبڈی کھیلنا اس کا مشغلہ تھا تو لڑائی جھگڑا کرنا دھندہ۔مدمقابل ٹیم کے دو دو بندوں کو ہاتھوں میں اٹھا کر لکیر پر ایسے پٹک دیتا کہ تماشہ بین گاما گاما چلاتے رہتے۔اسی لئے اب اصلی نام کے بدلے گاما پہلوان سے مشہور تھا۔غرور گھمنڈ میں اتنا اندھا کہ ماں بہن کی کوئی تمیز نہیں۔اس کے چمچے مکھن لگانے میں ماہر تھے اور گاما ان کی باتوں سے ہوا میں اڑتا رہتا۔پہلے پہل نشہ کر کے کوٹھے تک ہی پہنچتا لیکن چمچوں نے راہ چلتی لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا ہنر سکھایا۔اب تو یہ اس کا روز کا مشغلہ بن گیا تھا۔پاس پڑوس کے لوگ بستی چھوڑنے کو تیار۔کہاں کہاں گاما کی شکایت نہ لگائی۔پولیس کے پاس گئے۔اعلیٰ حاکموں کے در کھٹکھٹائے۔لیکن کہیں بھی سنوائی نہ ہوئی۔الٹا شکایت کرنے والوں کو سزا بھگتنی پڑتی۔خوف سے کوئی سر نہیں اٹھاتا تھا۔

عمر چالیس بیالیس کو آئی تو شادی کرنے کا شوق چرایا۔اس کے سارے ہرکارے اچھی لڑکی کی

تلاش میں نکل پڑے۔کئی بستیاں چھان ماری۔گھر کھنگالے۔لڑکیاں دیکھی۔لیکن گاما کے دل کو کوئی نہیں بھاتی۔ایک دن راہ چلتے شفق اور ربلورین کو دیکھا۔دونوں خوبصورت تھیں۔شفق کا بھولا پن اور بلورین کا چنچلا پن من کو بھا گیا۔ایک موالی کوان کی ماں راحیلہ باجی کے گھر بھیجا۔شفق اور بلورین نے کھری کھری سنائی۔راحیلہ باجی نے موالی کو دھتکار کر گھر سے نکالا۔اسی شام کو گاما نے ہلہ بول دیا۔شفق کو اٹھا کر لے گیا۔ پوری بستی میں ہاہا کار مچی۔کوئی گاما کے پاس جانے کے لئے تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔پھر بڑی مشکل سے اس کی ذات کے کچھ لوگ تیار ہو گئے۔وہ بھی جیسے اپنے سر پر کفن باندھے نکلے تھے۔ڈرے سہمے پڑوسی گاما کے گھر پہنچے۔اس کے بھائیوں بھابیوں کے پیر پکڑ لئے۔لیکن وہ بھی گاما کے منہ نہیں لگنا چاہتے تھے۔بڑی منت سماجت کے بعد آخر مجبور ہو کر وہ بستی والوں کے ساتھ گاما کے پاس چلے گئے۔گاما نے لڑکی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر چھوڑنے کی بات تو مان لی۔لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ لی کہ وہ لوگ شفق کو اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار کریں۔لوگوں نے منت سماجت کی۔ہاتھ جوڑے۔مذہبی بھائی چارے کی دہائی دی لیکن وہ ایک بات بھی نہ مانا۔مرغے کی ایک ٹانگ۔

''میں لڑکی کو ایسے ہی بنا کچھ کئے اس شرط پر چھوڑ رہا ہوں کہ یہ میری بیوی بنے۔میں کسی اور کے لئے تھوڑی اس کو پوتر چھوڑ دوں گا۔اس کو اگر لے جانا ہے تو یہ سوچ کے لے جاؤ کہ اس کو میری ہی بیوی بننا ہے۔''

بستی کے لوگ شفق کو لے کر آ تو گئے تھے لیکن کسی کو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ معاملہ کیسے سلجھائیں۔جب راحیلہ باجی نے سنا تو جیسے آسمان اس کے سر پر ٹوٹ پڑا۔اسے جب کوئی راستہ نہ سوجھا تو اس نے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ دونوں بیٹیوں کو زہر دے کر وہ بھی خود کشی کر لے گی......لیکن گاما نے اتنی مہلت ہی نہ دی۔صبح ہی شادی کا سارا سامان لے کر گھر پہنچا۔جس میں کپڑے،مہندی،کچھ سونے کے زیورات تھے۔ اور شام تک شادی کی پوری تیاری کرنے کا آدیش دے دیا۔ساتھ ہی ساری بستی میں اعلان کر دیا۔

''اگر تم اپنی بہو بیٹیوں کو محفوظ دیکھنا چاہتے ہو تو شفق کو میری دلہن بنانے میں مدد کرو۔ساری بستی کا کھانا آج میری طرف سے،اس لئے بے فکر ہو کر میری شادی میں شریک ہو جاؤ۔شادی کے لئے چاہے پنڈت کو بلاؤ یا مولوی کو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ویسے بھی میں دونوں کو نہیں مانتا ہوں۔بس یہ تم ذی عزت بستی والوں کے لئے کر رہا ہوں۔اپنی بہو بیٹیوں کو یہاں بلاؤ۔دلہن کو تیار کرو۔اور ہاں اپنی بیٹیوں سے کہہ دو میری دلہن کو سجانے سنوارنے میں کوئی کمی نہ چھوڑیں۔ابھی میں سدھرا نہیں ہوں ہاااا ں......''

شفق دلہن بنی اپنی سہیلوں میں گھری تھی۔کوئی اسے ابٹن لگا رہی تھی تو کوئی مہندی۔کوئی اس کے ماتھے کو چھوٹے جھومر سے سجا رہی تھی تو کوئی ہاتھوں میں چوڑیاں پہنا رہی تھیں۔کچھ اس کے کپڑے پریس کر

رہی تھیں۔تو دوتین لڑکیاں اس کے بال بنارہی تھیں......حالانکہ گھر کے اندر باہر گہما گہمی تھی۔لیکن کسی کے بھی چہرے پرخوشی کا شائبہ تک نہ تھا۔شفق کا چہرااترا ہوا تھا۔اس کی کسی بھی سہیلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔شفق کی چھوٹی بہن بلورین غصے سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔وہ بار بار مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔

اس شادی سے بس گاما اوراس کے دوست ہی خوش تھے اور ناچ بھی وہی لوگ تھے۔گاما کے گھر والوں میں بھی کوئی خوش نہیں لگ رہا تھا۔اور نہ وہ اس شادی میں شریک ہوئے تھے......لیکن شادی کے بعد صرف پندرہ دن میں شفق مرگئی۔

شفق اور بلوریں جب کالج جانے لگیں تھیں تو راحیلہ باجی کے ساتھ ساتھ پوری بستی خوش تھی۔دونوں بہنیں پڑوسیوں کی چہیتی تھیں۔شفق خوبصورت تھی لیکن سیدھی سادی اورشریف بھی بہت تھی۔پوری بستی میں اس کی اچھائیوں کا ذکر ہوتا تھا۔جبکہ بلورین بہت تیز اور منہ پھٹ واقع ہوئی تھی۔کسی کو بھی سامنے جواب دے دیتی تھی۔لیکن وہ پڑوس کی تمام عورتوں کے کام بھی آتی تھی۔کسی کو بازار سے کوئی ذاتی سامان لانا ہوتا تو اسی سے ہی منگواتی تھیں۔مائیں اپنی بیٹیوں کومشکل اوقات میں انہی دو بہنوں کے پاس بھیجتی تھیں۔تا کہ وہ انہیں سنبھال لیں۔اوروہ دونوں بہنیں نرسوں کی طرح ان کا خیال رکھتی تھیں۔

بلورین ناول،کہانیاں اورافسانوں کی دلدادہ تھی۔خاص کر وہ منٹو کی کہانیوں کی دیوانی تھی......اسے منٹو کے افسانوں کے کئی کردار اپنی ذات کا حصہ لگتے تھے۔ایسے کئی کردار تھے جو اسے اپنی نس نس میں اتارنے کا دل چاہتا تھا۔

شفق کی موت کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا۔کہ بلورین کے لئے گاما کا پیغام آ گیا۔پورا محلّہ بھڑ گیا......گاما کی برادری کے لوگوں کو بھی غصہ آ رہا تھا۔لیکن سب ہاتھ ہی ملتے رہ گئے۔اورگاما بلورین کو لے گیا۔بلورین مٹھیاں بھینچ رہی تھیں۔وہ منٹو کے ایک ایک کردار کو یاد کر کے جانے کیا کیا سوچتی رہتی تھی۔

''اری سنوتو ثمرہ۔گاما تھا ہی سانڈ جیسا آدمی۔سانڈ کی طرح وحشی بھی۔پہلی رات کو میں اس سے ڈرجاتی۔لیکن میں من بنا چکی تھی وہ ہارا ہوا ایشر سنگھ ہے اور میں بڑے دھڑلے والی کلونت کور۔''

''پھینک پتے......پتے پھینک......اور پھینک......'' ایک رات گئی،دوسری،تیسری رات تک اس کی ساری اتر گئی تھی۔اور چوتھی رات وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔شاید کسی حکیم وید سے مل کر آیا تھا۔لیکن اس کی آنکھوں میں ڈر اور خوف صاف جھلکتا تھا۔کئی داؤ آزمائے۔کلونت کور کے سامنے اس کے سارے داؤ ٹوٹکے پھس ہوگئے۔وہ بے حد ڈرا اور سہا ہوا تھا۔کلونت کور تیزی سے چیخی۔

''ایشر سائیاں،کافی پھینٹ چکا ہے،اب پتا پھینک۔'' کلونت کور نے اسے پرے پھینک دیا اور

دھتکار کر بھگا دیا.................تھوووو۔''

پانچویں صبح، ابھی بستی کی لڑکیوں کے ہونٹ سلے ہی تھے۔ابھی لڑکوں کے دلوں میں گاما کا ڈر بیٹھا ہوا ہی تھا۔ابھی بزرگ مرد عورتیں افسوس کے ساتھ ہاتھ ہی مل رہے تھے کہ شادی کی پانچویں صبح بستی میں اچانک بھنبھناہٹ ہونے لگی۔سبھی لوگ ایک ایک کر کے گھروں سے باہر آ گئے۔کچھ لوگ دوسری بستی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ہر کوئی ایک دوسرے سے پوچھ رہا تھا کیا ہوا۔دوڑتے دوڑتے لوگوں کی بھیڑ گاما کے آنگن میں جمع ہوگئی،اب وہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں بچی تھی۔کیا ہو گیا،سب کو ایک ہی بات کا خدشہ تھا کہ اب وہ بلورین کی لاش دیکھیں گے۔پہلا دوسرے سے پوچھ رہا تھا۔

''کیا ہوا''اور دوسرا آنگن کے بڑے پیڑ کی طرف اشارہ کرتا تھا۔جو بھی اس طرف دیکھتا تھا۔ہکا بکا ہو کر رہ جاتا تھا۔آناً فاناً بات چارسو پھیل گئی۔بستی میں پولیس پہنچ گئی۔پنچ سرپنچ سب جمع تھے۔پولیس نے پیڑ سے گاما کی لٹکتی لاش اتار دی۔پولیس کے لئے معاملہ زیادہ پیچیدہ نہیں تھا،خودکشی کے سارے ثبوت صاف تھے۔گاما نے پیڑ کی جس شاخ کو خودکشی کے لئے منتخب کیا تھا وہ شاخ اس چھپر کی عین سیدھ میں تھی جس کے نیچے جانوروں کو چارہ ڈالا جاتا تھا۔اسی چھپر پر چڑھ کر گاما نے رسی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈالا تھا۔چھپر کے پاس ہی اس کی چپل کا ایک پیر سیدھا اور ایک الٹا پڑا تھا۔پولیس نے پنچوں اور سرپنچ کے دستخط، انگوٹھے لئے اور فائل بند کر کے بغل میں دبا دی۔لاش کے وارثوں کو بلایا گیا۔کوئی سامنے نہیں آ رہا تھا۔کوئی موالی مشٹنڈا ابھی نہیں آیا۔پولیس نے کچھ منت سماجت کر کے اور کچھ ڈرا دھمکا کر گاما کی لاش اس کے بھائیوں کے سپرد کر دی۔

کئی دنوں کی گہما گہمی کے بعد آج راحیلہ باجی کے گھر میں تھوڑی خاموشی تھی۔بلورین کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔اور وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی تھی۔ماں نے اس پر کمبل ڈال دیا۔بلورین کو پتا بھی نہیں چلا کہ وہ کتنی دیر تک سوتی رہی۔جب جاگی تو اس کی خاص سہیلی ثمرہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔اسے دیکھ کر وہ مسکرائی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔اس کے سرہانے رکھی کتاب ثمرہ نے اٹھا لی۔

کتاب وہیں کھل گئی جہاں کے ورق فولڈ کئے ہوئے تھے۔کلونت کور

''سن ثمرہ......پانچویں رات گاما آیا ہی نہیں۔مجھے فیصلے کا انتظار تھا......اور فیصلہ ہو بھی چکا تھا۔''

بلورین کتاب کے اس پنے پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہی تھیں جہاں کلونت کور تھی۔

◀◀ ● ▶▶

Anchidora. AnantnagKashmir. 192101
Mob: 9419734234, 7006966876

● امین کنجاھی

یوٹوپیا

۱۹۷۶ء کہ آخری مہینے میں پاکستان کرکٹ ٹیم نے ویسٹ انڈیز کا Tour کرنا تھا، اور ویسٹ انڈیز میں پانچ ٹیسٹ میچ کھیلنے تھے، پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے ٹرائلز لاہور قذافی سٹیڈیم میں ہورہے تھے، اور روزانہ شام کو تین گھنٹے کا نیٹ پریکٹس سیشن ہوا کرتا تھا، نسیم روزانہ چپ چاپ اپنے گھر سے نکلتا، اور پاکستان کرکٹ ٹیم کی نیٹ پریکٹس دیکھنے قذافی سٹیڈیم لاہور پہنچ جاتا، اور بھی بہت سے لوگ اور نوجوان بچے اپنے قومی ہیروز کو پریکٹس کرتے، دیکھا کرتے، اور خوش ہوتے۔

پاکستان کی ٹیم ۷۷۔۱۹۷۶ء میں دُنیا کی چار بڑی ٹیموں میں شمار ہوا کرتی تھی اُس وقت پاکستان کی ٹیم میں اُوپنگ پئیر ماجد خان اور صادق محمد کا تھا، ون ڈاؤن ہارون رشید، جو کہ آسٹریلیاء سے کامیاب ٹور کرکے آیا تھا، اُسے ظہیر عباس کی جگہ، ٹیم میں شامل کیا گیا، کیونکہ ظہیر عباس اپنی، کوئی ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے، پاکستان ٹیم کے ساتھ ویسٹ انڈیز جا نہیں رہے تھے، پاکستان ٹیم کے کپتان مشاق محمد تھے، اور بیٹنگ میں جاوید میاں داد آصف اقبال، وسیم راجہ، وسیم باری، عمران خان، سرفراز نواز، اور سلیم الطاف شامل تھے۔

ایک دن نیٹ پریکٹس کے دوران، ایک پاکستانی بالر کو چوٹ لگ گئی، تو وہ بال چھوڑ کر ڈریسنگ روم میں چلا گیا، نسیم نے یہ موقع غنیمت جانا، اور بھاگ کر پاکستان ٹیم کے بالر کی گیند اُٹھائی، اور نیٹ میں کھڑے ہوئے، کپتان مشتاق محمد کی طرف اُچھال دی، مشتاق محمد نے جب یہ دیکھا، کہ یہ نیا لڑکا، جس کی عمر بمشکل ۱۷۔۱۸ برس کی ہوگی، کون ہے، کیسے نیٹ میں آگیا ہے، تو مشتاق محمد نے اُس کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور پوچھا، اور کہا۔

''آپ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟''

اُس نے کہا۔ ''میرا نام نسیم احمد ہے، میں لاہور سانده کا رہنے والا ہوں، اور میں روزانہ یہاں آکر پاکستان ٹیم کی نیٹ پریکٹس دیکھتا ہوں۔''

کپتان نے پوچھا۔ ''تم بیٹس مین ہو یا بالر ہو، نسیم نے کہا، میں Left Arm Finger Spin بالنگ کرتا ہوں۔

کپتان نے کہا ''نیٹ میں بالنگ کراؤ گے۔''

نسیم نے کہا۔ ''جی۔'' اور پھر کپتان نے پاکستان کے Opening Batsman کو کہا، کہ ''آپ نیٹ میں کھڑے ہوں، یہ بچہ آپ کو Spin Bowling کروائے گا۔''

نسیم نے دھڑکتے دل کے ساتھ، اُس کے ہاتھوں میں پسینے آئے ہوئے تھے، اپنے دونوں ہاتھوں کو پہلے زمین پر ملا پھر اپنی پینٹ کے ساتھ ہاتھ صاف کئے، بال اُٹھائی اور چھ قدم کا Runup گنا، اور Over the Wicket سیدھے ہاتھ کے بلے باز کو، اپنی زندگی کی پہلی بال کروائی، پہلی بال کافی پیچھے گری، اور بلے باز نے زوردار شاٹ کھیلا، نسیم تھوڑا گھبرایا، اور کپتان کی طرف دیکھا۔ کپتان نے اُسے اشارہ کیا، کہ نہیں تم پورا ایک Over کرواؤ، نسیم کا حوصلہ تھوڑا بلند ہوا، اور پھر اُس نے اگلی گیند، بلے باز کو کروائی، جو کہ ایک Flighted بال تھی، اور بلے باز نے اُسے باہر نکل کر بڑی شاٹ لگانے کی کوشش کی، مگر وہ سٹمپ ہو گیا، گیند اُس کے بلے کو چکما دے کر آف سٹمپ پر پڑنے کے بعد وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں چلی گئی، اور وکٹ کیپر نے بیلز گرادیں۔ یہ Over کی دوسری بال تھی، اِسی طرح اگلی چار بالوں میں بیٹس مین مزید دو دفعہ آؤٹ ہو گیا، نیٹ میں شور برپا ہو گیا، کہ یہ بچہ کون ہے، کہ جس نے پاکستان کے ایک بڑے بیٹس مین کو ایک آور میں تین دفعہ آؤٹ کیا ہے، سارے بڑے کھلاڑی اور ٹیم Management نے نسیم کو گھیر لیا، اور مختلف سوالات کرنے لگ پڑے۔

تم کون سے کلب سے کھیلتے ہو، کہاں کھیلتے ہو، کس ٹیم میں کھیلتے ہو، نسیم نے کہا، جی میں کہیں بھی نہیں کھیلتا، کرکٹ میرا شوق ہے جنون ہے، اور میں اِسی جنون کی بنیاد پر اپنے قومی ہیروز کو، روزانہ دیکھنے آجاتا ہوں، اور آج پہلی دفعہ میں نے زندگی میں کرکٹ بال پکڑی ہے، اور ایک Over کروایا ہے، پھر کیا تھا، ٹیم Management نے نسیم سے کہا، کہ تم، روزانہ سپہر تین بجے، گراؤنڈ میں آجایا کرو، اور پاکستانی، کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں کو، Spin Bowling کی پریکٹس کروایا کرو، یہ سلسلہ تقریباً ایک ہفتے تک جاری رہا، نسیم آتا، اور پاکستانی ٹیم کو نیٹ پریکٹس کرواتا، اور کھلاڑیوں کو آؤٹ بھی کرتا، فیلڈنگ بھی اچھی کرتا، اور کبھی کبھی بیٹنگ کا بھی نسیم کو موقع دیا جاتا، اور وہ اُلٹے ہاتھ سے، بیٹنگ بھی کرتا، گو بیٹنگ میں وہ اتنا، اچھا نہیں تھا، مگر پھر بھی پاکستان کے تیز بالروں کو ڈیفنسیو طریقے سے کھیل لیتا۔

۷۷۔۱۹۷۶ء میں میچ لائیو ٹیلی کاسٹ نہیں ہوا کرتے تھے، صرف ریڈیو پر، Running کامنٹری آیا کرتی تھی، انگریزی میں، عمر قریشی، اور افتخار احمد، کامنٹری کیا کرتے تھے، جب کہ اُردو میں منیر حسین جو کہ ایک صحافی تھے، وہ کمنٹری کیا کرتے تھے، نسیم اپنی کارکردگی سے بہت خوش تھا، اور اُس کو اِس بات

کی بھی بے حد خوشی تھی، کہ اُس نے کوئی بڑے لیول کا کرکٹ کھیلے بغیر، پاکستانی کرکٹ ٹیم کو، بالنگ کروائی، اور ایک ہفتے تک اپنی Spin Bowling کے جادو میں دبائے رکھا، اب اُس سے ہلکا ہلکا یقین ہو چلا تھا، کہ وہ، پاکستان کرکٹ ٹیم میں شامل کر لیا جائے گا۔

جب وہ ہفتے کے آخری دن نیٹ میں بالنگ کروا رہا تھا، اور نیٹ کا جب ٹائم ختم ہو گیا، مغرب کی آذان کی آواز نے نیٹ پریکٹس ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا، تو نسیم نے پاکستانی ٹیم کے تمام کھلاڑیوں سے ہاتھ ملایا، اور پاکستانی ٹیم کے Manager کرنل شجاع سے بھی مصافحہ کیا، پاکستانی ٹیم کے مینیجر نے اُس سے کہا کہ، آج سے نیٹ پریکٹس تو ختم ہو گئی ہے، مگر تم اپنا نام ولدیت اور گھر کا پتا، ہمیں لکھ کر دے جاؤ، اگر ہمیں تمہاری ضرورت پیش آئی، تو ہم تمھیں پاکستانی ٹیم میں شامل کر لیں گے، نسیم احمد نے اپنا ایڈریس جو کہ لاہور سانده میں رہتا تھا، گھر کا پتا لکھوا دیا، اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

کچھ دن گزرے تھے کہ پاکستانی ٹیم کا اعلان ہونا تھا، لہٰذا پاکستان کی ٹیم اور سینئیر کھلاڑیوں اور Management نے یہ فیصلہ کیا، کہ نسیم احمد کو پاکستانی ٹیم میں شامل کر لیا جائے، لہٰذا نسیم احمد کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پاکستانی کرکٹ بورڈ کا ایک نمائندہ بھیجا گیا، اور نسیم احمد کے بتائے ہوئے، گھر کے ایڈریس پر جب اُس نے دستک دی، تو اندر سے ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ باہر آئے اور اُنھوں نے پوچھا جی، آپ نے کس سے ملنا ہے، پاکستان کرکٹ بورڈ کے نمائندے نے کہا، کہ یہ نسیم احمد کا گھر ہے، تو بزرگ نے جواب دیا کہ ہاں جی یہ نسیم احمد کا ہی گھر ہے، اور میں اُس کا والد ہوں، PCB کے نمائندے نے کہا کہ آپ کو مبارک ہو، کہ آپ کا بیٹا پاکستان کرکٹ ٹیم میں شامل کر لیا گیا ہے، اور یہ بات میں بتانے کے لئے، نسیم احمد کو آیا ہوں، نسیم کے والد نے تھوڑی سی حیرانگی کا اظہار کیا، اور پھر کہا آیئے آپ اندر آ جایئے اور یہ خوشخبری نسیم احمد کو آپ خود سُنا دیجئے، PCB کا نمائندہ نسیم کے والد کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر داخل ہو گیا، گھر میں داخل ہونے کے بعد، چھوٹا سا صحن تھا اور صحن کے بلکل سامنے ایک کمرہ تھا، نسیم کے والد PCB کے نمائندے کو اُس کمرے میں لے گئے اور کہا، کہ آیئے نسیم کو ملیں اور اُسے یہ خوشخبری سُنا دیجئے، PCB کا نمائندہ ایک لمحے کے لئے سکتہ میں آ گیا، کیونکہ نسیم احمد چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، اور ایک ٹانگ سے معذور تھا۔

◀◀ ● ▶▶

23 B Affandi Colony Near Bilal Hospital
Satellite Town Rawalpindi, Pakistan
Mob: 03006559940

● محمد ارشد کسانہ

زقوم کی جانب

میں دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد جیسے ہی بیڈ پر لیٹا تو سو گیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا میری آنکھیں اچانک کھل گئیں۔ مجھے دوسرے کمرے سے کچھ عجیب وغریب آوازیں سنائی دیں۔ میں فوراً اٹھا اور اس کمرے کی طرف چل پڑا۔ میں نے پاس والے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو وہاں سب ٹھیک لگا، اندر میرے بھتیجے چین سے سوئے ہوئے تھے اس لیے میں نے احتیاط کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ میں اس آواز کا پیچھا کرتے کرتے چوتھے کمرے میں جا پہنچا مگر وہاں بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے وقت دیکھا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ مجھے فوراً یاد آیا کہ میرے گھر والے تو اس کے بعد ہی سوتے ہیں۔ شاید انہی میں سے کوئی اوپر آیا ہو، موبائل اور فلموں کا عہد ہے اب تو کچھ بھی ممکن ہوسکتا ہے۔ لہذا میں اپنے کمرے کی طرف پلٹنے ہی والا تھا کہ محسوس ہوا جیسے سامنے والے کمرے میں کوئی باتیں کر رہا ہو اور ان باتوں میں میرا نام بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ تو دو انجان سے آدمیوں نے جھٹک کر میری طرف دیکھا۔

''خوش آمدید۔'' ان دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ میں دروازے میں ہی کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کون ہوسکتے ہیں۔ اور اس کمرے میں یہاں کہاں سے چلے آئے جبکہ باقی تمام گھر والے تو نیچے ہیں۔ میں کچھ دیر تک حیران رہا پھر خیال کیا ہوسکتا ہے بھائی کے مہمان ہوں۔

''خوش آمدید۔'' ان دونوں نے دوبارہ دہرایا۔

''جی شکریہ!'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''آیئے بیٹھیے۔'' ایک نے ہاتھ سے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی ضرور!'' میں نے صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''زندگی میں آپ نے بہت ترقی حاصل کی ہے......'' ان میں سے ایک نے مسکراتے ہوئے بولا اور پھر سر اٹھا کر کمرے کی دیواروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مکان بھی شاندار بنایا ہے۔ دنیا داری خوب نبھائی ہے۔'' میں اس کی باتیں سن کر اندر ہی اندر خوش ہوا۔ ''زندگی میں بہت بڑا مقام حاصل کیا ہے، اس مقام پر پہنچنا اور اس کا فایدہ اٹھانا ہر کسی کے بس کی

بات نہیں......اے انسان! یہ بتا کیا اب کوئی خواہش باقی تھی؟''

''تھی!!......تھی کیوں......ابھی بہت خواہشیں باقی ہیں۔ ابھی تو سبکدوش ہونے میں دس سال باقی ہیں......خیر اپنا تعارف کروایئے۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔'' میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ہمارا تعارف تو تم زندگی میں کئی دفعہ سن چکے ہو۔ البتہ ملاقات پہلی دفعہ ہو رہی ہے۔ خیر تھوڑا صبر رکھو خود جان جاؤ گے۔'' مجھے ان کا یہ جواب بے ادب سا لگا اس لیے میں قدرے غصہ میں آ گیا۔

''آپ یہاں کس کے ذریعے آئے ہیں؟'' میں نے لہجہ بدل کر کہا۔

''ہم آپ کے لیے آئے ہیں۔'' انھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

''کیا کام ہے؟ تمہیں پتہ نہیں میرا یہ سونے کا وقت ہے۔'' میں مزید غصے میں آ گیا۔

''ہوں!! تم جاگے ہی کب تھے۔'' ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کی یہ ہنسی مجھ سے برداشت نہیں ہوئی۔ اور میں غصے کی لپیٹ میں آ گیا۔ میں انھیں کچھ کہے بغیر جلدی سے باہر نکلا اور سکیورٹی گارڈس کو زور زور سے بلانے لگا۔ جب کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں سیڑھیوں سے اتر کر گراونڈ فلور پر چلا آیا۔ میں نے یہاں سے بھی گارڈس کو بلایا مگر کسی ایک نے بھی آگے سے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ میرے اتنا چلانے پر میرے گھر والے بھی باہر نہیں آئے۔ بس مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہوا اور میں نے جھٹ سے دروازے کو ایک لات ماری، دروازہ پھٹاک سے کھلا اور میں گارڈس کو سبق سکھانے صحن میں چلا آیا۔ میں نے صحن سے پھر سکیورٹی گارڈس کو آواز دی مگر اس بار پھر میری آواز کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے صحن کا غور سے جائزہ لیا مگر وہاں کوئی بھی گارڈ موجود نہیں تھا۔ اچانک میری نظریں مین گیٹ پر پڑیں۔ جہاں ہمیشہ دو گارڈس موجود رہتے تھے۔ مگر اس وقت گیٹ بھی ویران پڑا تھا۔ میں نے سوچا ہوسکتا ہے گارڈس باہر ہوں۔ بس یہ سوچتے ہی میں گیٹ کی طرف چل پڑا۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر میں نے باہر دیکھا وہاں ایک انجان نوجوان پر میری نظریں پڑیں۔ وہ مجھے ٹک ٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کو نظر انداز کر کے گارڈس کو ادھر ادھر دیکھنے لگا مگر وہاں بھی کوئی گارڈ موجود نہیں تھا۔ میری نظریں پھر اسی نوجوان سے ٹکرائیں۔ اس بار وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو کچھ جانی پہچانی سی صورت معلوم ہوئی۔ میں نے مزید ذہن پر زور ڈالا مگر اس کی شناخت تک نہیں پہنچ پایا۔

''کمشنر پہچانا مجھے؟'' اس نے نزدیک آتے ہی سوال کیا۔ مجھے پہلی دفعہ کسی نے خالی کمشنر کے نام سے پکارا تھا ورنہ زندگی میں ہر کسی نے لفظ 'صاحب' کا استعمال میرے لیے ضرور کیا تھا۔ یہ لفظ سن کر میرے اندر غصے کا جذبہ اور بڑھ گیا۔

''کون ہوتم؟ بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تمہیں!''میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''میں مظلوم ہوں!''اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''مظلوم! کیا مطلب ہے تمہارا؟''میں نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں وہی مظلوم ہوں، جس کو تم نے چند پیسوں کی خاطر بے ایمان بتا کر نوکری سے نکلوا دیا تھا اور پھر میری جگہ کسی اور کو بٹھا دیا تھا۔''اس نے سر اٹھا کر کہا۔ میں نے فوراً اس کو پہچان لیا۔ اور پہچانتے ہی میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوئی۔

''میں بھی کس فورتھ کلاس کو منہ لگا رہا ہوں۔''میں نے اپنے آپ سے کہا۔

''تمہارے ساتھ ساتھ پورا ادارہ جانتا تھا کہ میں نہایت ہی شریف ایماندار ہوں مگر تم...... تمہیں پتہ ہے اس چھوٹی سی نوکری پر میرا پورا گھر چلتا تھا۔ میرے بوڑھے والدین، تین بھائی، بیوی اور دو بچے سب اس نوکری سے رزق حاصل کر رہے تھے۔ تمہارے نکالنے کے بعد پتہ ہے میرا سب کچھ ختم ہو گیا...... میں بھی ختم ہو گیا!''

یہاں تک بول کر اس نے اپنا سر جھکایا۔ مگر اس کی یہ حرکت مجھے پسند نہیں آئی۔ ایسے میں نے اپنی زندگی میں بہت لوگ دیکھے جو گڑگڑا کر اپنا کام نکلوایا کرتے تھے۔ پہلے پہل ان کے ایسے رویے سے میں کسی قدر متاثر ہوا کرتا تھا مگر بعد میں ایسے ناٹک باز لوگوں سے مجھے نفرت ہو گئی تھی۔

''کمشنر تم بے ایمان اور نہایت ہی لالچی تھے۔''اس نے پھر سر اٹھا کر بولنا شروع کیا تھا کہ میں نے فوراً اسے ٹوکا۔

''شٹ اپ! بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے!''

میں یہ کہتے ہی فوراً پیچھے پلٹا اور تیز رفتاری کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آج میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ ایک طرف میری کوئی آواز نہیں سن رہا تھا تو دوسری طرف انجان لوگ اچانک نمودار ہو رہے تھے۔ غصہ اور چڑچڑاہٹ میں نے اپنے اندر محسوس کیا۔ اب میں نے ادھر ادھر دیکھنے سے خود کو روک لیا اور کچھ دیر آرام کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بس یہی سوچ کر میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ کسی عورت کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

''کمشنر! بہت انتظار کیا ہے میں نے تیرا۔''میں نے ٹھہر کر اپنے بائیں طرف دیکھا ایک خوبصورت جوان لڑکی سفید لباس میں ملبوس صوفے پر بیٹھے مجھے تکے جا رہی تھی۔ میں بغیر جواب دیے آہستگی سے اس کی طرف بڑھا۔ میں تھوڑا قریب گیا تو مجھے یاد آیا کہ وہ آسیہ ہے۔

''آسیہ تم یہاں!''میں نے بے ساختہ کہا۔

''اور کہاں جاؤں گی۔تم سے ملنا تو ضروری تھا!''اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں!تم تو دوسرے شہر شفٹ ہوگئی تھی نا!''

''بس اتنا ہی پتہ کیا کہ میں دوسری جگہ شفٹ ہوگئی۔اس کے بعد کی خبر نہیں لی؟''

''ارے تمہیں پتہ ہے نا!میں کتنا مصروف رہتا ہوں۔ذہن آزاد ہی نہیں رہتا کیسے سوچوں!''

''خیر اس نوکری سے تم نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔بہت دولت جمع کی ہے۔اس نے دیواروں پر نظریں گھماتے ہوئے کہا۔

''کرنا پڑتا ہے!مگر اس کے بدلے میں لوگوں کے کام بھی تو کیے ہیں۔''

''اور مزے بھی خوب کیے ہیں۔''اس نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کی۔''

''مگر مجبور تو کرتے تھے نا!''

''مجبور!''

''کیا میں مجبور نہیں تھی؟''

''اس کے بدلے تمہارا کام کیا تھا۔وہ کام جو کوئی دوسرا نہیں کرسکتا تھا۔''

''اگر تم ایمانداری سے اپنا فرض نبھاتے تو بھی میرا کام کرتے۔کیونکہ میں اس کی حقدار تھی۔''

''آسیہ یہ سودا ہوتا ہے۔ایک ہاتھ سے دو دوسرے ہاتھ سے لو۔''

''اور جو تمہیں حکومت دیتی تھی وہ کیا ہے؟''

''ارے یار!چلو چھوڑو!تمہارا کام ہوگیا نا!اب اس کے بدلے میں اگر میں نے کچھ حاصل کرلیا تو کیا مسئلہ ہے!یہی دستور ہے یہاں کا!''

''مردوں سے رشوت اور عورتوں سے جسم!یہی دستور تھا تمہارا؟''

''چلو چھوڑو کیا کام ہے تمہارا؟''میں نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔

''میں مجبور تھی کمشنر!تم نے مجھے مجبور کیا تھا۔میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔مجھے ہر حال میں دوسرے شہر شفٹ ہونا تھا اور اس کے لیے جو رات تمہارے ساتھ گزاری تھی وہ میری مجبوری کی انتہا تھی مگر تم نے ایک بار بھی میری مجبوری کو محسوس نہیں کیا،ایک بار بھی میرے آنسوؤں کی طرف نہیں دیکھا،ایک بار بھی میری عزت کو محسوس نہیں کیا۔اس رات میرا سب کچھ لٹ گیا تھا۔''اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''بس چپ کرو!کام کے بدلے میں اگر میں رشوت لوں یا مزے لوں یہ حق ہے میرا۔یہ میری

زندگی ہے، میں جو چاہے کروں تمہیں کیا ہے؟'' میں نے اونچے لہجے میں کہا۔

میں نے جیسے ہی جملہ ختم کیا تو اوپر کے فلور پر مجھے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے غور سے سنا یہ میری بہن کی چیخیں تھیں۔ میں نے جلدی سے سیڑھیاں چڑھیں اور دوسرے فلور پر آ گیا۔ یہاں چیخنے چلانے کی بے شمار آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ خوفناک آوازیں میرے کمرے کی طرف سے آ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے تمام گھر والے رو رہے ہوں۔ میں جیسے ہی اپنے کمرے کے قریب پہنچا تو میرے دونوں بھائی آنسو صاف کرتے ہوئے دروازے سے باہر نکلے۔

''ساجد کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' میں نے ڈرتے ہوئے ان سے پوچھا مگر ان میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ کسی نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ میرے اندر اب غصے کی جگہ خوف پھیل گیا تھا۔ میرا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ میں ان دونوں کے درمیان سے نکل کر دروازے کے اندر داخل ہوا۔ وہاں گھر کے سارے افراد مجمع بنائے چلا چلا کر رو رہے تھے۔ میں نے جھٹ سے اپنے بیڈ کی طرف دیکھا۔ وہاں میری لاش پڑی ہوئی تھی۔

◀◀ ● ▶▶

Gali No 8 Near AK Public School Ramghat
Wazirabad, Delhi 110084
Mobile number 7006909305

متن کے آس پاس

(تنقیدی مضامین)

مصنف : سلمان عبدالصمد سن اشاعت : ۲۰۲۳ء

قیمت : ۱۴۰ روپے صفحات : ۲۳۲

ملنے کا پتہ

مرکزی پبلی کیشنز

ایس۔۱۷/۴، آزاد اپارٹ منٹ جوگا بائی ایکزٹ، جامعہ نگر اوکھلا دہلی

● آسیہ رئیس خان

ٹائم ٹیبل

علی نے کلائی سامنے کر گھڑی میں وقت دیکھا اور کتاب بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ دیوار پر لگا اپنا ٹائم ٹیبل اسے ازبر تھا پھر بھی نظر وہاں ٹھہر گئی۔ گہری روشنائی سے بنے جدول میں، ایک بج کر تیس منٹ کے آگے اس کی خوشنما لکھائی میں 'ظہر' درج تھا۔

''امّی!'' دیوار پر لگی کھونٹی میں ٹنگی ٹوپی نکالتے ہوئے اس نے آواز لگائی۔

''میں نماز کو جا رہا ہوں۔'' ماں کچھ کہتی اس سے پہلے ہی وہ باہر نکل گیا۔ اب تو عذرا نے گھڑی دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں سے زیادہ پابند اس کا بیٹا جو تھا۔ گھڑی کی طرح اس کی نہ کہیں سوئی اٹکتی تھی نہ کبھی سیل ختم ہوتے تھے۔ وہ اٹھ کر باورچی خانے میں آ گئی۔ یہ آٹا گوندھ کر بیٹے کے لیے گرما گرم روٹیاں پکانے کا وقت تھا۔ نماز کے بعد کھانا، آدھا گھنٹہ آرام اور پھر کوچنگ سینٹر، یہ اس کا معمول تھا۔ اس کے علاوہ صبح چار بجے سے رات گیارہ بجے تک ہر کام کے لیے علی کا وقت تقسیم اور طے تھا۔ ذہانت کے ساتھ خواب دیکھنے کی صلاحیت اور انھیں پورا کرنے کی قوت اور جستجو بھی اسے وافر مقدار میں ملی تھی۔ سول سروسیز امتحان کامیاب کرنے کا خواب آنکھوں میں سجاتے ہی اس نے تعبیر کے لیے جدوجہد شروع کر دی تھی۔ عذرا اور شاہد زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ شاہد سات جماعتیں پاس درزی تھا اور عذرا میٹرک پاس تھی۔ ایسے میں علی کی ذہانت، تعلیم سے رغبت اور لگن رشتے داروں اور جان پہچان والوں کو ہی نہیں عذرا اور شاہد کو بھی حیران کرتی تھی۔ ایسی قابل، صالح اور محنتی اولاد والدین کے لیے خود بخود اچھے دنوں کا خواب، بہتر زندگی کی دستک اور کندھوں سے ذمہ داریوں کا بوجھ کم ہونے کی نوید بن جاتی ہے۔ علی کے خواب سے کئی شاخیں نکل کر عذرا اور شاہد کی آنکھوں میں اپنی جڑیں بنا چکی تھیں۔

علی نماز سے آیا تو عذرا اس کے لیے دسترخوان لگا چکی تھی۔ شاہد صبح ٹفن لے کر دکان پر جاتا اور اس کی واپسی رات کے کھانے پر ہوتی تھی۔ عذرا یوں تو بلال اور صبا کے اسکول سے آنے کے بعد ان کے ساتھ کھانا کھاتی لیکن علی کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر ہر چیز اپنے ہاتھ سے اس کی پلیٹ میں ڈالنا اس کا پسندیدہ کام تھا۔ صرف یہی نہیں وہ اس کے لیے بہت بھاگ دوڑ کرتی تھی۔ اس کی کوچنگ اور ٹیوشن کی فیس شاہد کی کمائی سے تو ممکن نہ تھی۔ ایسے میں عذرا ہی معاشی طور پر پسماندہ یا اقلیتوں کے لیے مختص امداد اور اسکالرشپ ڈھونڈ

ڈھونڈ کر بیٹے کے لیے حاصل کرتی اور یہ کام آسان نہیں تھا۔علی کا مستحق ہونا ثابت کرنے کے لیے بیسوں قسم کے کاغذات پیش کرنے پڑتے، جن کے لیے کئی سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر کی خاک چھاننا پڑتی تھی۔ یہ سارے کشٹ اس وقت اسے بڑے معمولی لگتے جب وہ رات بستر میں لیٹی چھت کو تکتی اور بنا رنگ وروغن کے سیاہی اختیار کر چکی چھت پر اس کی امیدیں اور خواہشیں تصویروں میں ڈھل جاتیں۔ بڑے سے بنگلے میں سوٹ بوٹ میں بیٹھا علی، شاہد کی ریڈی میڈ کپڑوں کی یہ بڑی دکان اور مہنگے کالج میں جاتے بچوں کے علاوہ اسے سب سے اچھا اپنا ٹی وی سیریل اور اشتہاروں جیسا باورچی خانہ لگتا۔اپنے خالی وقت میں وہ اس تصوراتی کچن میں علی کے لیے بریانی بناتی تو کبھی اس کی پسندیدہ کھیر۔

علی کا کھانا ختم ہوا ہی تھا کہ جنید آ گیا۔جنید کے والدین چاہتے تھے کہ وہ ہر وقت علی کا سایہ بنا رہے تاکہ اس صحبت کا کچھ تو اثر اس پر ہو جب کہ عذرا، جنید جیسے نکمے طالب علم سے اسے کوسوں دور رکھنے کے خواہش مند تھی۔مزے کی بات یہ تھی کہ ان دونوں فریقین کے خیالات کا علی اور جنید کی دوستی پر کوئی اثر نہیں تھا۔ کرکٹ کا شوقین، لمبے قد والا دبلا پتلا جنید اسکول سے لے کر اب جونیئر کالج تک علی کے ساتھ تھا۔علی قیلولہ کرنے کی بجائے جنید کے ساتھ کرکٹ کھیلنے نکل گیا اور عذرا کلس کر رہ گئی۔سختی سے اپنے ٹائم ٹیبل پر کاربند رہنے والا علی صرف جنید کے لیے خود کو رعایت دے دیا کرتا تھا۔

''مسجد میں امام صاحب جو کہہ رہے تھے، اس بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟'' بلا گھماتے ہوئے علی نے پوچھا۔

''کس بارے میں؟'' کہتے ہی جیسے اسے یاد آ گیا۔''اچھا وہ......کاغذات کی تیاری، نام کی درستی اور احتجاجی ریلی......وہ سب؟''

''ہاں وہ ہی۔''

''میرا کوئی خیال نہیں اس بارے میں۔''

''کل وہ انکل بھی سب سے کہہ رہے تھے کہ ہمیں اپنے گھر سے بے دخل کرنے کی تیاری ہو رہی تو کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے؟''

''تُو کیوں پوچھ رہا ہے؟'' جنید نے رک کر اسے مشکوک نظر سے دیکھا۔

''میں آئین میں دیے گئے میرے حقوق کی حفاظت کروں یا اپنے اور امّی ابّا کے خواب پورے کروں؟'' اس کا انداز خود کلامی سا تھا۔

''کیا علی کتابوں کے علاوہ بھی کسی چیز میں دلچسپی لے رہا ہے؟'' یہ سوال، یہ خیال ہی حیرت میں

مبتلا کرنے والا تھا۔

''میں ان سب میں نہیں پڑتا...... کہیں تیرا ریلی میں جانے کا ارادہ تو نہیں......؟''

''میرے پاس وقت کہاں! تُو تو میرا ٹائم ٹیبل جانتا ہے۔'' علی نے لمبی سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ وہ میدان میں پہنچ گئے تھے۔

''ہوں......'' جنید کی ہوں میں اطمینان تھا۔

''یہ جھمیلے اپنے کام کے نہیں۔ چل آج تُو پہلے باؤلنگ کر۔'' اس نے علی کے ہاتھ سے بلا لے کر آگے جاتے ہوئے کہا۔

اگلے جمعہ نماز کے بعد شہریت ترمیمی بل کے خلاف احتجاجی ریلی نکلی۔ ریلی کے دوران نظم و نسق برقرار رکھنے والوں نے خوب مستعدی دکھائی۔ لاٹھیوں اور گولیوں میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے غیر سرکاری مددگار بھی شامل ہو گئے۔ امن قائم رکھنے کے نام پر بدامنی آگ کی طرح پھیلتی گئی۔ اس کی لپٹیں جسموں تک محدود نہ رہیں، یہ روحوں تک پہنچ گئی تھیں۔

جمعہ کی نماز کو گیا علی پانچ بجے تک واپس نہیں آیا اور شاہد اپنی دکان میں پھنسا تھا۔ شوہر کے بخیر گھر پہنچنے کی فکر کے بیچ بے قرار عذرا بیٹے کو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ علی تو کہیں مل نہیں رہا تھا لیکن نئی خبریں اور انکشافات اسے مزید ہراساں کر رہے تھے۔ ریلی میں شامل افراد کے علاوہ نماز سے گھر لوٹ رہے لوگ بھی گیہوں کے ساتھ پسنے والا گھن بن گئے تھے۔ وہ رات کو نامراد گھر لوٹی تو ایک کو زندہ دیکھ کر شاہد نے تسلی بھری سانس لی اور یہ سانس اسے کوڑے کی طرح لگی تھی۔

شہر میں نافذ کرفیو، افواہیں اور قانون کے نام پر غیر قانونی گرفتاریاں عروج پر تھیں۔ اس افراتفری میں لاپتہ افراد کی فکر صرف عزیزوں کو تھی۔ تھانے میں گمشدگی کا معاملہ درج کرانے والے وہاں پہنچ کر خود گمشدہ ہونے لگے تھے۔ اگلے تین دن تک شاہد اور عذرا دو بچوں کو سنبھالتے، تیسرے کو تلاشتے رہے۔ تین دن بعد ان کے بدترین خدشات ایک مین ہول میں بدصورت حقیقت بن کر سامنے تھے۔ وہ سر جس کی ذہانت روشن مستقبل کی ضمانت تھی، وہاں ایک تاریک سوراخ تھا لیکن یہ اسے مظلوم ثابت کرنے کے لیے کافی نہ تھا۔ ریلی میں شامل لوگ اور ماں باپ کہتے رہے کہ وہ مظاہرے کا حصہ نہیں تھا لیکن جب شناخت ہی جرم کا سب سے بڑا ثبوت ہو تو باقی آوازیں شور کے سوا کچھ نہیں۔ علی کا سسٹم میں شامل ہونے کا خواب سسٹم میں مجرم درج ہو کر پورا ہوا۔ چند دن پہلے تک ایک ذہین، محنتی لڑکے کے والدین اب مجرم کے ماں باپ تھے۔ غم سے جھکے سر کو شرم سے جھکا سر بنا دینے کی سازش کامیاب ہوئی تھی۔

اس گھر میں موتیں تو کئی ہوئی تھیں لیکن محلے میں ماتم بس علی کی موت کا ہو رہا تھا۔ وہ بھی دبا دبا سا،

خوف و ہراس میں لپٹا۔علی کی تدفین کے بعد سے جنید روز اس کے گھر جانے کا اردہ کرتا لیکن اس کے والدین چاہتے تھے کہ وہ اب کبھی علی کے گھر نہ جائے،اس سے دوستی اور محبت ظاہر نہ کرے۔حالات نے ہمدردی کی جو قیمت علی کے دروازے پر لکھی تھی اس کے پیش نظر سب محتاط تھے۔کوئی دستک دے کر درد بانٹنے نہ آیا کہ زندوں کی اہمیت بہر حال مُردوں سے زیادہ تھی۔

لیکن آج جنید گھر والوں کو چکما دے کر علی کے گھر آہی گیا۔اتنے سالوں میں جنید نے پہلی بار اس وقت شاہد کو گھر میں دیکھا تھا۔کچھ دن میں ہی وہ برسوں کا بیمار اور ڈھیلے کندھوں والا بوڑھا بن گیا تھا۔بلال اور صبا سہمے سے اپنی نانی کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔سڑکوں پر ان کے مستقبل کے لیے چھڑی جنگ سے بے نیاز،اس وقت ان کے چہرے پر بھائی کے یوں اچانک چلے جانے پر بے یقینی اور حیرانی تھی۔بوسیدہ در و دیوار اور پرانا ساز و سامان تو وہی تھا لیکن علی کے بنا اسے لگا اس گھر کی سانسیں بند ہوگئی ہیں۔ شاہد نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا اور جنید اس کے گلے لگ کر رو پڑا۔

شاہد کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر وہ علی کے چھوٹے سے کمرے میں آیا اور وہاں عذرا کو دیکھ کر دروازے میں ہی رک گیا۔وہ علی کی کرسی پر بیٹھی تھی۔اس کے ہاتھ میں علی کا ٹائم ٹیبل تھا۔دیوار سے کھینچنے کی وجہ سے کاغذ پر جگہ جگہ ادھڑی ٹیپ لٹک رہی تھی۔

''اس میں تو کہیں نہیں لکھا تیرے جانے کا ٹائم، پھر کیسے چلا گیا تو؟'' عذرا کی دھیمی بھیگی آواز میں دل چیرنے والا درد تھا۔اس کے کانوں میں علی کا جملہ گونجا۔

''میرے پاس وقت کہاں!'' وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا پھر خاموشی سے پلٹ گیا۔

عرصے بعد ایک بل نے قانونی حیثیت حاصل کرنے سے پہلے فرقوں اور طبقات میں بٹی قوم کو اس قدر نڈر کر دیا تھا کہ حراستوں اور اموات کے باوجود اگلے جمعہ احتجاجی ریلی پھر نکلی۔اس ریلی میں سب سے آگے دبلا پتلا لمبا سا ایک لڑکا نعرہ لگا رہا تھا۔

''تیرا میرا رشتہ کیا ہے......؟''

باقی مجمعے کی آواز گونجی:

''لا الہ الا اللہ!''

◀◀ ● ▶▶

701- B Mahavir Roshan Heights Guruprasad CHS
Plot no 42 Sector 40 Seawoods Nerul
Navi Mumbai 400706 9987021374

● نعیم یاد

فریب

جب سے اُسے نئے محلے میں مکان ملا تھا اس کی کیفیت بدل گئی تھی۔ وہ عمر کے اُس حصے میں تھا جہاں اُس کو قدم قدم پر اکیلے پن کا احساس ہوتا۔ ویسے بھی اتنے بڑے شہر میں کئی نرم و نازک چہرے تھے جو اس کے اندر اس احساس کو پروان چڑھاتے رہتے۔ کبھی کبھی اس کو محسوس ہوتا جیسے اس کا یہ احساس اب بڑھ کر ایک بہت بڑا تناور درخت بن گیا ہے۔ ویسے بھی بہت کچھ تھا اس کی بڑھوتری کے لیے......شہر کی گلیوں بازاروں، بس سٹاپوں اور سینماؤں کے قریب سے گزرتے ہوئے سیاہ برقعوں سے جھانکتے ہوئے سفید چہرے، اَدھ کھلے اور پورے کھلے چہرے گول اور بیضوی چہرے لپ اسٹک جوڑے، کاجل کے دوڑے...... وہ ان چہروں سے نظریں ہٹانے کی کوشش کرتا تو نیم عریاں جسم اس کی نگاہوں میں ابھرنے لگتے نئی وضع کا تنگ لباس...... ہر طرف حسن کے دریا بہتے نظر آتے تو اس کا من اس دریا میں غوطے لگانے کو کرتا۔

شام کو تھکا ہارا جب وہ مکان کو لوٹتا تو اپنا کھانا ساتھ ہی لاتا اور پھر کمرے میں بیٹھ کر کھا لیتا۔ ایک دن وہ کھانا کھا رہا تھا جب اسے دروازے پہ دستک محسوس ہوئی۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے یہ دستک اس کے دل پہ دی ہو۔ وہ باہر کو لپکا جب کالی چادر میں چھپا آدھا چہرہ پلیٹ میں مٹھائی لیے اس کے سامنے تھا۔

بات سنیئے یہ امی نے بھجوائی ہے آج ہمارا بھتیجا پیدا ہوا ہے تو اس خوشی میں......

آپ......وہ وہیں ساکت ہو گیا۔

جی میں یہ آپ کے پڑوس میں ہی رہتی ہوں۔

اس نے پلیٹ خالی کر کے واپس کی تو وہ چلی گئی مگر اسے لگا جیسے وہ خالی نہیں گئی تھی اس کا سب کچھ اپنے ساتھ لے کر گئی تھی۔

وہ نہ جانے کہاں کہاں تک اجنبی چہروں سے دل بہلاتا پھرتا رہا تھا اور وہ تو اس کے قریب تھی۔ پھر اس کے اندر ایک نئی تبدیلی آنے لگی۔ اندر کے درخت پر پھول اُگ آئے تھے اور ان پھولوں کی مہک میں اس کا ایک ایک پل گزرنے لگا۔ وہ ایک ایک پل اس کے حصار میں رہنے لگا۔ وہ اس کو دیکھنے کو ترستا۔ کبھی جاتے جاتے وہ اس کو نظر آ جاتی تو سارا دن اس کا سکون میں گزرتا ورنہ وہ ہر پل اس کے فراق میں

گھلتا رہتا۔ایک دن دفتر سے واپسی پہ اس کے ساتھی اس کو فلم دکھانے لے گئے۔

فلمی ہیروئن کو دیکھتے ہی اسے محسوس ہوتا جیسے اس کا چہرہ اس کے چہرے کے ساتھ بدل گیا ہو پر ہیرو......ہیرو کا چہرہ نہ جانے کیوں نہیں بدلا تھا۔اس کا دل کرتا کاش وہ ہیرو ہوتا کسی نہ کسی طریقے اس کو متاثر کرتا اور پھر اسے بیاہ کر کے گھر لے آتا۔اس کی بے چینی بڑھنے لگی کبھی کبھی اس کو لگتا جیسے اس کے اندر احساس کے اس درخت کے پھول گل سڑ گئے ہوں ان سے خوشبو کی بجائے تعفن کی بدبو آنے لگتی تب وہ بے چین رہنے لگا۔بے چینی میں وہ گھر سے باہر نکل آتا اور اس کی راہ تکتا شاید وہ گھر سے نکلے۔ایک دن محلے کے نوجوان امام مسجد سے اس کا تعارف ہوا تو وہ اس کے ساتھ گھل مل گیا۔امام مسجد عمر دراز بھی نوجوان تھا چہرے پہ نئی نئی اُگی ڈاڑھی اس کے حسن کو بڑھا رہی تھی۔وہ بھی فارغ وقت میں اس کی بیٹھک میں آجاتا۔تعلق جب بڑھ جائے تو تکلفات بھی ختم ہو جاتے ہیں تبھی ایک دن اس نے امام سے دل کی بات کہہ دی۔

مولوی عمر دراز نے کانوں کا ہاتھ لگایا اور فوراً کھڑا ہو گیا......توبہ توبہ کیسی باتیں کرتے ہو،اسلام میں تو نامحرم کو نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی حرام ہے اور تم اسے ملنا چاہتے ہو۔

وہ اس کو کیا سمجھاتا،رہ رہ کر اسے اپنی کم عقلی اور بے وقوفی پہ غصہ آتا کہ اس نے یہ بات مولوی سے کہہ کیوں دی۔بڑی مشکل سے اس نے اس بات کو ٹالا اور اسے بٹھایا مگر اس کے بعد وہ جب بھی ملنے آتا اسے پند و نصیحت کرنے بیٹھ جاتا۔وہ اس کو دلائل دیتا مذہب سمجھاتا پر وہ اس کی باتوں کا جواب دینے کی بجائے بس سر دھنتا رہتا۔

ایک دن اس کی قسمت رنگ لائی اور وہ اسے نظر آ گئی اس نے اِدھر اُدھر دیکھا جب کوئی اور نظر نہ آیا تو اس سے بات چیت کرنے کے لیے اس کے پاس چلا گیا۔منہ سے تو کچھ کہہ نہ پایا پر آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں نے ایک دوسرے کو بہت کچھ کہہ ڈالا۔وہ خوش رہنے لگا۔پھر روز ہی کن اکھیوں سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔اسے لگتا جیسے اس کے اندر احساس کے پیڑ سے پھر سے خوشبو آنے لگی ہو۔مولوی عمر دراز آتا اپنی تقریر جھاڑتا پر وہ اپنے ہی خیالوں میں کھویا رہتا۔

پھر کسی نہ کسی بہانے ملاقات کا موقع ملنے لگا۔اسے خوشی ہوئی کہ وہ بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ایک دن وہ اسے کہنے لگی ”تم ڈاڑھی کیوں نہیں رکھ لیتے؟ دیکھو ہمارے مولوی صاحب کو کتنی پیاری لگتی ہے۔“

اسے لگا جیسے اس اندر لگے درخت کے پھولوں پہ چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں چڑھ گئی ہوں جو اس کے اندر کا رس نچوڑ رہی ہوں۔مولوی عمر دراز سے اس کو چڑ سی ہونے لگی مگر وہ پھر بھی روز آجاتا۔اب وہ اس کے آنے سے گھبرا اُٹھتا۔ایک دن اس سے باتیں کرتے مولوی عمر دراز نے دیکھ لیا۔وہ جلدی سے اندر چلی گئی۔مولوی عمر دراز نے اس دن اس سے بات نہ کی۔وہ حیران تھا کہ مولوی آج اسے خوب جھاڑ پلائے گا مگر وہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا،بے چین سا۔تھوڑی دیر بعد وہ اس کی بیٹھک سے چلا گیا۔

دو تین دن گزر گئے نہ مولوی عمر دراز آیا اور نہ ہی وہ گھر سے نکلی تھی۔ایک عجیب سی بے چینی کی فضا تھی۔اس نے مسجد میں جا کے ایک دو لوگوں سے پوچھا تو پتہ چلا مولوی صاحب دو دن سے غائب ہیں کچھ بتا کر نہیں گئے۔مولوی عمر دراز کی تو خیر تھی مگر وہاں کی خاموشی اس کے اندر کو کھا رہی تھی۔وہ بے چینی میں شام کو بیٹھک سے باہر نکلا تبھی ستو مراثن ان کے گھر سے نکلی۔

’’مجھے تو پہلے ہی شک تھا اس لڑکی کے لچھن اچھے نہیں......‘‘ وہ بڑبڑاتی ہوئی جا رہی تھی۔

’’کیا ہوا خالہ؟ خیر تو ہے؟‘‘

اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کر اسے دیکھا اور آہستہ سے بولی’’ زمانہ بہت خراب ہے پتر بندہ کس پہ اعتماد کرے۔‘‘

’’ہوا کیا ہے خالہ؟‘‘

’’یہ جو تمھارے پڑوس میں گھر ہے ناں......ان کی جوان لڑکی اپنے مولوی صاحب کے ساتھ بھاگ گئی۔‘‘

’’کیا؟؟؟؟ کیا کہہ رہی ہو خالہ؟‘‘

’’ہاں پتر اب آگے مت بتانا ان کی عزت کا سوال ہے۔وہ تو آج اس کے کمرے سے خط نکلا تو پتہ چلا کہ وہ مولوی صاحب کے ساتھ بھاگی ہے۔ان دونوں کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔اچھا اب میں چلتی ہوں......‘‘

بڑی مشکل سے اس نے خود کو سہارا دیا۔

’’تم ڈاڑھی کیوں نہیں رکھ لیتے ہمارے مولوی صاحب کو کتنی پیاری لگتی ہے۔‘‘......اور پھر مولوی عمر دراز کی باتیں......

’’توبہ توبہ اسلام میں تو نامحرم کو نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی حرام ہے اور تم اسے ملنا چاہتے ہو۔‘‘

اسے لگا جیسے اس کے اندر احساس کے اس درخت پہ لگے پھولوں سے سارا رس نکل گیا ہو۔ اور اب رہ جانے والے کانٹے اس کے اندر کے وجود کو تار تار کر رہے تھے۔

◀◀ ● ▶▶

Dastan Manzil, Street No:6
Naseem Colony, Jauhar Abad
Dist:Khoshab (Pakistan)
Phone: 03137716609

● ڈاکٹر ابرار رحمانی

بِہار کی بَہار

[مظفر پور اور پٹنہ کی یادیں]

(خودنوشت سوانح کا ایک حصہ)

میری زندگی کسی بلا سے کم نہیں، بلکہ اگر ہم کہیں کہ میری آوارگی روزنت نئی بلا کو تخلیق کرتی رہتی ہے اور اس طرح ہم بلاؤں کے ہجوم میں جیتے رہے۔ اب ہم روز مرتے ہیں اور مرنے کی آرزو میں روز جیتے ہیں۔ کاش کوئی روز روز کے اس مرنے جینے کی کشمکش سے آزاد کرا سکتا۔ میں روز اپنی آزادی کے لیے دست بہ دعا رہتا ہوں، کاش میں اپنے اس خیال سے خود کو آزاد کرا سکتا، افسوس انسان اپنی دوروزہ زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھا ہے۔

......اب میری پیدائش کہیں بھی ہوئی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پیدائش اور نام میں کیا رکھا ہے۔ انسان اپنے قول و فعل اور عمل سے پہچانا جاتا ہے۔ لیکن کوائف نامہ کے اس کالم کو پُر کرنا بھی ضروری ہے ورنہ یہ کوائف نامہ نامکمل رہ جائے گا۔ کاش میں بھی غالب کے زمانے میں مظفر پور کا نواب ہوتا تو غالب ہمیں بھی خط لکھ کر یہ کہہ سکتے ''یہ مظفر پور ہے دارالسرور ہے، جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔'' ایسا بتایا جاتا ہے کہ میری پیدائش شہر مظفر پور کے اسلام پور میں ۱۸ مارچ ۱۹۶۰ء کو ہوئی۔ مظفر پور شمالی بہار کا مرکزی شہر ہے۔ اس لحاظ سے اسے کافی اہمیت حاصل ہے کہ وہاں پورے شمالی بہار سے تھوک خریداری کے لیے لوگ آتے ہیں۔

جہاں تک میری تعلیم و تربیت کا سوال ہے تو میں بتا دوں کہ میری ابتدائی تعلیم و تربیت مظفر پور کے محلّہ اسلام پور میں اپنی رہائش گاہ پر ہوئی، صبح کو ایک مولوی صاحب آیا کرتے تھے۔ خدا انھیں غریق رحمت کرے نام تو اب یاد نہیں، وہ مزاجاً سخت ضرور تھے۔ ایک پتلی سی چھڑی جسے ہم تنبیہ الغافلین کہتے تھے ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے، لیکن قرآن شریف اتنے اچھے ڈھنگ سے پڑھایا تھا کہ جس کا جواب نہیں۔ اردو میں اگر میرا شین قاف درست ہے تو اس میں بہت کچھ میرے مولوی صاحب کی تربیت کا ہاتھ رہا ہے۔

میری باضابطہ تعلیم:

پھر میری باضابطہ تعلیم کے لیے مظفر پور کے عابدہ ہائی اسکول میں میرا سیدھا چھٹی کلاس میں داخلہ کرا دیا گیا۔ جو میرے لیے ایک بوجھ سے کم نہیں تھا، کیوں کہ میں نے پانچویں تک پڑھائی کی ہی نہیں تھی۔ چنانچہ میں

پڑھائی سے جی چرانے لگا۔ عابدہ ہائی اسکول کا محل وقوع بھی کچھ ایسا ہے کہ کسی کو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہمیں ایک ایسے بازار سے گزرنا پڑتا تھا جسے بازار حسن کہتے ہیں۔ حالانکہ مجھے وہاں کوئی حسین چہرہ کبھی نظر نہیں آیا۔ یہ محلّہ چتر بھج استھان کے نام سے مشہور ہے۔ عام طور پر یہاں جسم فروشی کے نام پر چھاپے مارے جاتے ہیں اور گلوکاری، رقص و سرود کے فن کے نام پہ انھیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اسی چتر بھج استھان میں ایک مزار داتا کمبل شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ہر سال عرس ہوتا ہے، جس میں سب سے قیمتی چادر وہاں کی طوائفیں چڑھاتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ اس عمل سے ان کے سارے گناہ دُھل جاتے ہیں۔ وہاں سے تھوڑی دوری پر مظفر شاہ کا مزار ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ شہر مظفر پور انہی کے نام پر ہے۔ اسی مظفر پور میں ایک اور مزار کھیری شاہ کے نام سے مشہور ہے، جو اسلام پور میرے محلے کے قریب کمپنی باغ ٹاؤن ہال کے پیچھے واقع ہے۔ کمپنی باغ میں کے اسی ٹاؤن ہال میں ایک لائبریری بھی ہوا کرتی تھی۔ دو ایک دفعہ وہاں جانے کا اتفاق بھی ہوا لیکن اس سے استفادہ کی توفیق نہیں ہوئی۔ مظفر پور کا یہ پورا علاقہ یعنی اسلام پور کمپنی باغ ٹاؤن ہال سے عابدہ ہائی اسکول تک ہمارا میدان عمل رہا جہاں ہم نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات اپنے ہاتھوں سے برباد کیے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں یہ تو بچپن کا تقاضا تھا۔ چلئے لوگ کہتے ہیں تو ہم مان لیتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بچپن کے دن سہانے ہوتے ہیں اگر اللہ معاشی خوشحال سے نواز دے تو بچپن میں ہی آرزوؤں اور تمناؤں کو گویا پنکھ لگ جاتے ہیں۔ پڑھائی کو بوجھ سمجھنا اور نتیجے میں اس سے دور بھاگنا بچے کی مجبور بن جاتی ہے۔ یوں بھی بچہ پڑھ رہا ہو تب بھی اور جب گھر میں بیکار بیٹھا ہو تب بھی اداسی دھیرے دھیرے مایوسی کی حالت میں پہنچا دیتی ہے اور اس کے آگے کیا ہونے والا ہے اسے خود نہیں معلوم۔ بچے کے ایک طرف کنواں ہوتا ہے اور دوسری طرف کھائی۔ میں ادھر جاؤں یا اُدھر جاؤں۔ بڑی مشکل میں ہوں، میں کدھر جاؤں، والی اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

اکثر گرمی کے دنوں میں اور میرے بھیا دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں ایسے نکل پڑتے تھے گویا ہم لوگ چاندنی رات کی ٹھنڈی چھاؤں میں خراماں خراماں ٹہل رہے ہوں اور اس طرح کمپنی باغ پہنچ جاتے اور اس باغ میں اور اکثر گھر کے پیچھے میدان میں ہر وہ کھیل کھیلتے جو امیر زادوں کو سیکڑوں ہزاروں خرچ کرنے پر بھی حاصل نہیں ہوتا:

آؤ ہم تم ایک بنا کر اپنی ٹولی کھیلیں گے گلی ٹنڈا کھوکھو اور آنکھ مچولی کھیلیں گے

اس کے علاوہ ہم کھیلتے تھے ڈھیلو ڈھیلو، سنچی، کبڈی، پاس پاس/آئس پائس جو چھپنے اور ڈھونڈنے کا کھیل ہے یہ شیطان کی آنت کی طرح طویل سے طویل تر کھیل ہے، آپ چاہے جتنا کھیلیں جی نہیں بھرتا۔ لیکن میں وہی کھیل کھیلتا تھا جو میرے بھیا اور دوسرے سینئر کو پسند ہوتا۔ مثلاً ہم سنچی کھیلا کرتے جو کبڈی کا ایک ترقی یافتہ شکل ہے اب پتہ نہیں وہ مظفر پور بہار کے علاوہ اور کہاں کہاں کھیلا جاتا ہے اور کہاں نہیں۔ اس کے علاوہ میرے بھیا گولی/کنچا کھیتے تھے، لٹو نچاتے تھے اور پتنگ بازی میں تو انھیں مہارت

حاصل مہارت حاصل تھی۔ اکثر ہم لوگ وہی کھیل کھیلتے تھے جس میں پیسے خرچ نہیں ہوتے تھے۔ اصل میں ہمارا محلّہ اسلام پور اور آس پاس کا پورا علاقہ لوور مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ اب آیئے کچھ اور ایسے کھیل کھیلتے ہیں جسے آم کے آم گٹھلی کے دام کہہ سکتے ہیں۔

کمپنی باغ سے ذرا آگے کچہری ہے جہاں جامن کے کئی درخت تھے، پیڑ پر چڑھنا اور وہ بھی بڑے اور اونچے پیڑ پر چڑھنا بھائی جان[امداد حسین رحمانی] کو بہت لطف دیتا تھا۔ چنانچہ اکثر وہ جامن اور مولسری کے پیڑ پر چڑھ جاتے اور اوپر توڑ توڑ کر کھانے لگتے، پھر انھیں میرا خیال آتا اور وہ لال لال مولسری توڑ توڑ کر نیچے گراتے جاتے اور ہم اسے چن چن کر کھاتے جاتے۔ زیادہ کھا لینے پر ہمارا گلہ سوکھنے لگتا تھا۔ جامن کے زمانے میں جامن کے پیڑ پر چڑھ جاتے وہ کالے کالے جامن ایک کھاتے اور ایک گراتے جاتے تھے۔ چونکہ جامن نرم ہوتا ہے اس لیے اسے بڑے ہی پیار سے گراتے، نہیں تو اکثر پھٹ کر بکھر جاتا تھا، ہمارے مظفر پور میں یہ جامن بڑے بڑے میٹھے اور گودادار ہوتے اور اس کا نام فلینا ہے۔ کچہری سے چند قدم کی دوری پر ایک فٹبال اسٹیڈیم ہے جس سے ملحق خودی رام بوس کا مجسمہ ۱۸۵۷ء جدوجہد آزادی کی یاد دلاتا ہے۔ اس کے علاوہ کمپنی باغ میں امرود، کدم، جلیبی اور کھیری کے پھل بھی ہمیں مفت میں مل جایا کرتے۔ لیکن اسی کمپنی باغ کے پھلوں سے زیادہ قطار اندر قطار قسم قسم کے پھول کھلا کرتے تھے۔ ان پھولوں کا ذکر اجمل سلطان پوری نے اپنی ایک نظم 'یہ ہے میرا ہندوستان' میں بہت خوب کیا ہے۔ اکثر علی الصباح میرے ابا جی ہم دونوں بھائیوں کو جگا کر نماز فجر پڑھواتے اور پھر کمپنی باغ کی کھلی فضا مین جا کر ٹہلنے کی تلقین کرتے۔ وہاں گلاب، بیلا، جوئی، چمیلی کی بہار ہوتی تھی۔ ہدایت کے مطابق ہم لمبی لمبی سانس کھینچتے اور ہمارا سینہ آکسیجن سے بھر جاتا۔ اور ہم تازگی کا احساس کرتے۔ اور پڑھائی کے بوجھ والے دنوں کو ہم ہلکا کرتے رہتے۔ ادھر خدا جانے کیسے بھائی جان کو تاش اور جوا کھیلنے کی لت لگ گئی، پھر پورا محلّہ اسلام پور ہی اس وبا کی زد میں آتا چلا گیا۔ چنانچہ بھائی جان کو گھر سے ہزاروں میل دور رام پور برائے تعلیم بھیج دیا گیا۔ ادھر میں اکیلا دو تین سال سے چھٹی کلاس میں ہی ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا۔ پھر مجھے بھی اگلے سال رام پور بھیج دیا گیا۔ جہاں درسگاہ اسلامی میں زبانی ٹسٹ کے بعد میرا داخلہ پانچویں جماعت میں ہو گیا اور میری تعلیم کا سلسلہ اپنی رفتار سے چل پڑا۔ میں نے وہاں آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ کیوں کہ یہ درسگاہ صرف آٹھویں کلاس تک ہی تھی۔

خواہش تھی کہ آگے کی پڑھائی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے کروں گا، لیکن شاید خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ والد صاحب جو ٹھیکیداری کرتے تھے اچانک اس کی قباحتوں کے پیش نظر اس پیشے کو کلی طور پر یکلخت چھوڑ دیا۔ میرے والد کی معاشی حالت خراب ہوگئی۔ چنانچہ دو تین سال میں مظفر پور میں ہی ہر فکر کو دھوئیں میں نہیں اڑا سکا کہ میں اسموک نہیں کرتا۔ البتہ بربادیوں کا جشن مناتا چلا گیا۔ اب ذرا جشن منانے کا نرالا انداز بھی دیکھتے چلیں۔ ہم یعنی ہم تین بھائی اور ہمارے ابا جی چاروں نے مل کر ابن صفی سے بھرپور

اکتساب فیض کیا ہے۔اسی زمانے میں ابن صفی کے ناولوں سے خوب محظوظ ہوتے رہے۔اور شاید میری اردو اسی وجہ سے اچھی ہوگئی۔ابن صفی واقعی اردو کے مسیحا اور خادم بے لوث تھے۔ابن صفی کی جاسوسی دنیا اور ماہنامہ نکہت پڑھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہ جانے کتنے لوگوں نے اردو پڑھنا شروع کی۔

بات اس وقت کی ہے جب میں دس بارہ سال کا تھا۔ہمارے گھر میں مختلف رسائل وجرائد اور کتابیں آیا کرتی تھیں۔یہ وہی دور تھا جب جدیدیت کے تحت اردو ادب بحرانی کیفیت سے دوچار تھا۔شب خونی ادب کا دور دورہ تھا۔اردو کا عام قاری اس شب خونی لٹریچر سے ہلکان نظر آتا تھا۔ایسے میں ابن صفی کا جاسوسی ادب لاکھوں قارئین کے لیے بڑا سہارا بن کر سامنے آیا۔اس بحرانی دور میں ابن صفی کے ناولوں نے تپتی دوپہر میں بارش کی پھوار کا کام کیا۔ میرے والد حفیظ الرحمٰن صاحب مطالعہ کے بڑے شوقین تھے۔لیکن وہ بھی شب خونی ادب سے بیزار تھے۔وہ اس قسم کے ادب کے مطالعہ کو تضیع اوقات سمجھتے تھے۔وہ یونیورسٹی آف بہار (مظفر پور) سے اردو ادب میں گولڈ میڈلسٹ تھے۔ ہمارے گھر میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کا بطور خاص ذکر رہا کرتا تھا اور بطور خاص اقبال کی نظمیں ابا جی کو ازبر تھیں۔مظفر پور کا علمی اور ادبی ماحول قدرے بہتر تھا وہاں اردو کی کتابوں اور رسائل وجرائد کی اچھی خاصی کھپت تھی۔

مظفر پور ایک مردم خیز جگہ ہے۔یہاں ہر دور میں ایسی شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں جو اپنے کارناموں سے اپنے وطن کا نام روشن کرتے رہے ہیں اور اپنی مٹی کی خوشبو پھیلاتے رہے ہیں لیکن حال کے دنوں میں مظفر پور کی نامور ہستیاں وسیع امکانات کی تلاش میں اپنے وطن مظفر پور کو چھوڑ کر کوئی بمبئی کوچ کر گیا تو کوئی دہلی۔دلی میں مظفر پور کی ان ہستیوں میں ویسے تو بہت سے ہیں لیکن میں یہاں چند ایک کے نام لوں گا۔ان میں تو پہلا نام خود میرے ابا حضور کا ہے۔جن کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا۔پروفیسر انیس الرحمٰن صاحب جو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ انگریزی کے استاذ ہیں۔اور اپنی انگریزی دانی کا خوب خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اردو کے ذخیرے میں اپنا یوگدان دے رہے ہیں۔ڈاکٹر عبید الرحمٰن مظفر پور کا ایک نگینہ تھے۔انھیں اردو ورثے میں ملی تھی۔البتہ سائنس کو اپنی محنت اور لگن سے کسب کیا تھا۔چنانچہ وہ ایک انگریزی میگزین ''انڈین فارمنگ'' کے ایڈیٹر تھے تو دوسری طرف اردو شعر وشاعری میں اپنے معاصرین سے کسی طور پر پیچھے نہیں تھے۔سائنس میں اگر ان کی دو کتابیں ہیں تو اردو شاعری میں تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔افسوس یہ دوست شاید ناوقت اللہ کو پیارا ہوگیا۔

ظفر عدیم مظفر پور کی بڑی صلاحیتوں والی ہستیوں میں سے ایک تھے جنھوں نے مظفر پور سے 'انجو' نام کا رسالہ نکالا تھا اور فکشن کی تخلیق کو اپنی ذوق وشوق کا ذریعہ بنایا تھا۔لیکن انھیں کیا سوجھی کہ وہ اپنے وطن مظفر پور چھوڑ کر دلی آگئے اور ادبی صحافت کے بدلے اخباری صحافت شروع کردی۔قومی آواز میں خبریں بنانے لگے پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ خود بھی خبر بن گئے۔

محمد عارف اقبال نہ صرف محنتی ہیں بلکہ بڑی ہمت کے مالک بھی ہیں۔ چنانچہ وہ اب تک انتہائی دشواریوں اور پریشانیوں کے باوجود اردو بک ریویو نکال رہے ہیں۔ ساتھ میں وہ کتابوں کی طباعت کا کام بھی بڑی نفاست سے کرتے ہیں اور شاید اس سے انھیں معقول آمدنی بھی ہوجاتی ہے۔ ابن صفی کے تو وہ عاشق اور مرید رہے ہیں۔

عتیق مظفر پوری سائبان فاؤنڈیشن کے بانی تھے اور اس فاؤنڈیشن سے وہ مسلمانوں کی پسماندگی اور تعلیم کی اہمیت پر مختلف پروگرام کیا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے جاوید رحمانی روزنامہ سائبان کو پابندی سے آن لائن نکال رہے ہیں۔ تو دوستو! جب ایسی ایسی نایاب اور کامیاب ہستیاں مظفر پور چھوڑ کر دلی آبسی ہیں تو پھر مظفر پور میں سناٹا تو ہوگا ہی۔

ناچیز کا بھی وطن مظفر پور ہے، سارے جہاں سے اچھا ہونے کے باوجود میں وہاں سے دہلی آ گیا، جو اب میرا وطن ثانی ہے۔ جہاں سے میں نے جے این یو میں تعلیم حاصل کی، وہاں سے میں نے ایم۔ اے، ایم۔ فل، پی۔ ایچ ڈی کے علاوہ ماس میڈیا میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ یو پی ایس سی سے انٹرویو دے کر میں آئی آئی ایس میں شامل ہوگیا۔ سرکار نے مجھے وزارت اطلاعات ونشریات کے تحت آنے والے پبلی کیشنز ڈویژن میں میری بحالی کردی جہاں میں نے آجکل، یوجنا، روزگار سماچار میں ادارت کے فرائض انجام دیے۔ ریڈیو میں ہندی اور انگلش نیوز کی ایڈیٹنگ کے فرائض بھی انجام دیے۔ تقریباً ایک سال جموں میں بطور کورسپونڈنٹ کام کیا۔ ساڑھے اٹھائیس سال کی ملازمت کی۔ مظفر پور چھوڑنے کا مجھے بھی ملال ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مظفر پور کا علمی و ادبی ماحول اگر بہت اچھا نہیں تو بہت بُرا بھی نہیں۔ اتنا تو ضرور ہے کہ ہم اپنے آپ کو سمجھا سکیں کہ ہم کسی تاریک گہرے کنویں میں نہیں ہیں۔ بہر حال! مظفر پور کئی جہتوں سے لائق ستائش ہے۔ ادب کی تخلیق و ترویج اور اشاعت کے ساتھ ساتھ صحافت کے میدان میں بھی اس شہر کی سرگرمیاں قابل اعتبار رہی ہیں۔ چنانچہ گزشتہ صدی کی آٹھویں اور نویں دہائی کی بعض اہم سرگرمیاں ہمیں متوجہ کرتی ہیں۔

آٹھویں دہائی میں مظفر پور سے ڈاکٹر قیصر شمیم نے اپنے چند مخلصین کے تعاون سے سیکولر ہندوستان کے نام سے ایک رسالے کا اجرا کیا۔ جس کے چند ہی شمارے منظر عام پر آسکے۔ تقریباً اسی زمانے میں مختار احمد عاصی اپنے چند احباب کے ساتھ 'سرِیٔ' کے نام سے ایک رسالہ نکالتے تھے۔ یہ خالص ادبی رسالہ تھا لیکن اس کا بھی حشر اور رسالوں کی طرح ہوا۔

اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں ماہنامہ 'انجو' کا اجرا مظفر پور کی سرزمین سے ہی ہوا جس کے چیف ایڈیٹر ظفر عدیم تھے جو مظفر پور چھوڑ کر دلی آبسے اور ایڈیٹر منظر اعجاز نے پٹنہ کی راہ لی۔ لہٰذا انجو بھی ناوقت داغ مفارقت دے

گئی۔اس کے تین ہی شمارے شائع ہو سکے۔منظر اعجاز نے اس کے بعد اپنی ادارت میں ایک پندرہ روزہ 'انعکاس' کے نام سے نکالا جو آٹھ صفحوں پر مشتمل تھا۔اس میں ادبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر کھل کر اظہار رائے ہوتا تھا۔اس کا ایک ضخیم شمارہ فراق نمبر میگزین سائز میں ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔جس نے اردو کے ادبی حلقوں میں ہلچل مچائی۔اس کے بعد یہ بھی تعطل کا شکار ہو گیا۔اسی زمانے میں مظفر پور سے 'ادراک' نام سے ایک میگزین کا اجرا ہوا جس کے مدیران سلیم اللہ، سید حسن عباس اور ولی احمد ولی تھے۔اس کے بھی دو تین شمارے ہی نکل سکے۔وہی ادراک اب گوپال گنج سے 'ادراک جرنل' کے نام سے نکلتا ہے۔اس کے ایڈیٹر سید حسن عباس ہیں۔

بیسویں صدی کے آخری عشرہ میں 'صدف' نام سے ایک رسالے کا اجرا ہوا لیکن یہ بھی ایک دو شمارے کے بعد تعطل کا شکار ہو گیا۔اکیسویں صدی میں مظفر پور کی ادبی و علمی فضا اتنی سرگرم نہیں ہے پھر بھی کم سے کم تین رسالے تو اب بھی نکل رہے ہیں۔ان میں سے ایک مذکورہ بالا 'ادراک جرنل' ہے اور دوسرا 'ساغر ادب' ہے جس کے ایڈیٹر ڈاکٹر سید آل ظفر ہیں۔یہ پچھلے چار سالوں سے تواتر سے شائع ہو رہا ہے۔اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔ ہاں مظفر پور سے ہی ایک نہایت کارآمد رسالہ حکومت بہار کے اردو ڈائریکٹریٹ کے تحت اردو زبان سیل کے ہدایت پر ہر سال ایک فروغ اردو ورک شاپ، طلبہ کے لیے تقریری مقابلے کا انعقاد ہر ضلع میں ہوتا ہے۔اردو زبان سیل کی مختلف اکائیوں کی طرف سے ایک مجلّہ کی اشاعت بھی ہوتی ہے۔مظفر پور کا تازہ مجلّہ ایوان اردو کے نام سے شائع ہوا ہے۔جس میں علمی، ادبی مضامین اور تخلیق کے علاوہ ضلع کے اور دوسری سرگرمیوں کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔مظفر پور سے ایک اور رسالہ ''اصناف ادب'' کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

میرے ابا جی کو ابن صفی کے ناولوں سے جو شغف تھا اس کا ذکر خالی از دلچسپی نہیں۔ابن صفی کے بہت سے شیدائیوں کی طرح وہ بھی ابن صفی کے ناول کا بے صبری سے انتظار کیا کرتے تھے۔ہر ماہ کی ایک مقررہ تاریخ کو وہ کتب فروش کی دکان پر ہوتے اور شاید پہلی کاپی انہیں ہی ملتی تھی۔پاکٹ سائز کا یہ ناول ان کی پتلون کی گہری جیب میں کسی بے تاب پرندہ کی طرح پھڑ پھڑاتا ہوا، جیب سے نکل کر سامنے آنے کو بے تاب ہوتا۔ان کا معمول تھا کہ رات کا کھانا کھا کر اور دوسری ضروریات سے فارغ ہو کر بستر پر آ لیٹتے۔ میرے بچپن میں مظفر پور میں بجلی کی صورت حال ٹھیک نہیں تھی چنانچہ وہ کیروسین لالٹین کی روشنی میں جاسوسی دنیا کا مطالعہ شروع کرتے اور عموماً ڈیڑھ دو گھنٹے میں ناول ختم کر کے ہی دم لیتے۔شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ دوسری رات کی نوبت آئی ہو۔انھوں نے ایک ماہنامہ کو روزنامہ بنا دیا تھا۔ناول ختم کرنے کے بعد سیرابی اور سرشاری کی کیفیت ان کے چہرے مہرے اور گفتگو سے واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔یہ ابن صفی کی تحریر اور اسلوب کا ہی اعجاز تھا کہ جو زیادہ تر قارئین کو ایک ہی نشست میں ایک ناول کو ختم کرنے پر مجبور کرتا۔

میری اس بات کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہم تین بھائی اپنی اپنی باری کا بے صبری سے انتظار کرتے۔ چنانچہ دوسرے دن ہمارے بڑے بھائی جان ممتاز احمد رحمانی ناول پر قبضہ جما لیتے اور عموماً دو دن ان کا ہوتا۔ وہ بھی عموماً رات میں بستر پر لیٹ کر ناول کا مطالعہ کرتے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ جو نصابی کتابوں سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ ابن صفی کے ناولوں سے انھیں اتنی ہی قربت تھی۔ شاید اگر ابن صفی کے ناول نصاب میں بھی شامل ہوتے تو وہ بھی آج کسی یونیورسٹی کے اعلیٰ سند یافتہ اسکالر ہوتے۔

میرے منجھلے بھائی امداد حسین رحمانی جو عمر میں مجھ سے صرف دو سال بڑے ہیں، ان کا تیسرا نمبر ہوتا اور تیسرا یا چوتھا دن ان کا ہوتا۔ سب سے چھوٹا ہونے کی پاداش میں میرا نمبر سب کے بعد آتا۔ اس سے جہاں مجھے انتظار کی کوفت سے دوچار ہونا پڑتا وہیں ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ میں اب جتنے دن میں چاہوں اسے چائے کی چسکی کی طرح مزے لے لے کر پڑھوں۔ تھوڑا تھوڑا پڑھنا اور چھپ کر پڑھنا میری مجبوری تھی کہ مجھ پر بڑوں کی نظر رہتی تھی اور پھر دس بارہ سال کے لڑکے کی بساط ہی کیا تھی۔ درسی کتب اور ابن صفی کے تفریحی ناول کے درمیان ایک توازن برقرار رکھنا میرے لیے ایک بڑا چیلنج ہوا کرتا تھا جس میں پلڑا ہمیشہ ابن صفی کے ناولوں کا بھاری ہوتا۔

ہمارے معزز قارئین کو یہ یاد ہو کہ یہ وہی زمانہ تھا جب ہم گھریلو معاشی بحران سے دوچار تھے۔ ایسے میں ابن صفی کا جاسوسی ناول خود کو بہلانے کا بڑا اسہارا بن گیا تھا۔ میں مظفر پور میں ٹوٹ چکا تھا، بکھر چکا تھا، سوچا کیوں نہ پٹنہ چلا جائے۔ وہاں جا کر میں اپنے ٹوٹنے اور بکھرنے کے عمل کو ایک نیا نام دے سکوں گا، لیکن ٹوٹنے بکھرنے کا عمل کچھ دنوں تک پٹنہ میں بھی جاری رہا۔ جلد ہی میں نے اپنی اس کمزوری پر قابو حاصل کر لیا اور میں مزید ٹوٹنے اور بکھرنے کے اس عمل سے خود کو محفوظ رکھ پایا:

ضرورتوں نے مجھے تازہ دم رکھا ہے ابھی ‌ ‌ ‌ ‌ میں کب کا ٹوٹ کے خود ہی بکھر گیا ہوتا

۱۹۷۶ء میں مظفر پور سے پٹنہ پہنچنے کے لیے کافی مشقت کرنی پڑتی تھی۔ آج کے مقابلے اس وقت یہ سفر اتنا آسان نہیں تھا۔ مظفر پور اور پٹنہ کے بیچ گنگا حد فاصل کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ پہلے مظفر پور سے بذریعہ ٹرین سون پور اور وہاں سے بذریعہ بس پہلیجا گھاٹ جانا پڑتا تھا پھر پہلیجا گھاٹ سے بذریعہ اسٹیمر یا پانی کے جہاز سے مہندرو گھاٹ پٹنہ پہنچنا پڑتا تھا۔ کم و بیش ۶۰ کلومیٹر کا یہ فاصلہ چار پانچ گھنٹے میں طے ہوتا تھا لیکن آج ہم گنگا پر بنے پُل (گاندھی سیتو) کے راستے پٹنہ سے مظفر پور محض ڈیڑھ دو گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں۔ پٹنہ کا گاندھی سیتو ہمارے لیے ایک نعمت بن کر سامنے آیا۔ خیر سے اس وقت تک گنگا پوتر تھی یا کم سے کم اس قدر میلی نہ ہوئی تھی جتنی کہ آج ہے۔ پاپیوں کے پاپ دھوتے دھوتے آج یہ بری طرح میلی اور ناپاک ہو چکی ہے۔

وہ بھی ایک زمانہ تھا جب ہم طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کا نظارہ کرنے کے لیے پٹنہ سائنس

کالج (مدرسہ شمس الہدیٰ کے بالمقابل) کے پیچھے صبح وشام روزانہ ہی جایا کرتے تھے جہاں فریش اور ٹھنڈی ہوا ہمیں تروتازہ کرتی تھی۔ گنگا کا یہ کنارہ مظفر پور کے کمپنی باغ کے متبادل کے طور پر مجھے اچھا لگا، پھر اس ندی کے ساتھ ہمارے پوروجوں کی کچھ یادیں بھی وابستہ ہیں:

اے آبرودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو اترا تیرے کنارے جب کارواں ہمارا

یہی وہ گنگا ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی کو دیکھ کر ڈوب جانے کو جی چاہتا تھا تاکہ چین اور سکون میسر آسکے:

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبودے اے محیط آب گنگا تو مجھے

پٹنہ سے میں نے میٹرک، انٹر اور بی اے آنرس کی ڈگریاں حاصل کیں۔ میٹرک اگر ہم نے نائٹ اسکول سے کیا تھا تو انٹر اور بی اے ایک مارننگ کالج سے۔ اس کی بڑی وجہ تھی کہ مجھے مدرسہ کا حق ادا کرنا تھا۔ اگر میں نے نائٹ اسکول اور مارننگ کالج کا سہارا نہیں لیا ہوتا تو مدرسہ کی کلاسیں نہیں کرسکتا تھا۔ جب کہ عام طور پر مدرسہ شمس الہدیٰ کے زیادہ تر لڑکے یہی کرتے ہیں کہ دن کے اوقات کے اسکول اور کالجز میں داخلے لیتے تھے۔ مدرسہ تو ان کی رہائش کے لیے تھا۔ پڑھائی کے لیے تو اسکول کالج ہیں۔ یہ سراسر بے ایمانی ہے۔ جسے مدرسہ کے سبھی طلبہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ خسارہ میں کون رہا اس پر دونوں طرح کے طلبہ کے اپنے اپنے خیال ہیں۔ جب کہ میرا خیال بالکل واضح اور دو ٹوک تھا کہ میں اگر مدرسہ میں رہ رہا ہوں تو مدرسہ کا حق پہلے ادا کروں پھر کہیں اور کے بارے میں سوچوں۔

پٹنہ میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے مخدوش ہاسٹل میں سر چھپانے کے لیے وہاں داخلہ لے لیا تھا۔ رہنے کا مسئلہ تو حل ہوگیا لیکن کھانے کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ یہاں بھی خیراتی لنگر کا کوئی نظم نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا۔ لیکن یہاں بھی ایک افسوس ناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ صرف ۲۵ روپے ماہانہ پر ٹیوشن پڑھاتا تھا وہ مہینہ پورا ہونے پر اس شخص نے ہمیں پیسے نہیں دیے۔ خیر! پٹنہ میں بھی روزوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ لیکن ہمارا یقین اس رازق پر اور مضبوط ہوتا چلا گیا۔ میں نے اپنے مدرسے کے چوکیدار نجو میاں کے بیٹے نعیم الدین کو پڑھانا شروع کیا جسے ہم پیار سے بشو کے نام سے پکارتے تھے۔ پڑھائی کے بدلے وہ مجھے دن کا کھانا کِھلایا کرتا تھا۔ رات کا مسئلہ بھی اسی طرح حل ہوا کہ پٹنہ کے رمنہ روڈ میں ڈاکٹر محبّ احمد کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کیا اور بدلے میں وہاں رات کا کھانا کھانے لگا۔ اس طرح ہم نے پٹنہ کو اپنا بنالیا۔ لیکن مدرسہ میں رہتے ہوئے وہاں کے طلبہ پڑھائی کریں یا نہ کریں کھیل کود، غنڈا گردی اور سیاست ضرور کیا کرتے تھے۔ میں نے ایک ہوشیاری یہ کی تھی کہ ان سب کے باوجود ایک نائٹ اسکول میں بھی داخلہ لے لیا جہاں بہت سارے لڑکے پڑھنے کے لیے نہیں مٹرگشتی کے لیے آتے تھے۔ اس بات کی گہرائی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس اسکول

کا فرسٹ ڈویژن لانے والا میں پہلا طالب علم تھا۔ستم ظریفی یہ ہے کہ پہلے تو مجھے فیل گھوشت کیا گیا جسے ماننے کو نہ میں تیار تھا اور نہ میرے ہیڈ ماسٹر چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب بذات خود اسکول اکزامینشن بورڈ گئے۔اب جو وہاں چیک کیا گیا تو پتہ چلا میں تو کامیاب تھا لیکن کسی ناکام طالب علم کا ٹیگ مجھ پر لگا دیا گیا تھا۔

۱۹۷۷ میں بہار اردو اکیڈمی نے میٹرک میں فرسٹ آنے پر پچاس روپے ماہانہ اسکالرشپ دی۔جسے کچھ لوگ وظیفہ بھی کہتے ہیں۔اس وقت یہ پچاس روپے ماہانہ کا انعام میرے لیے نوبل پرائز سے کم نہ تھا۔خیر!اس اسکالرشپ کے سہارے میں نے انٹرمیڈیٹ کرلیا اور پھر جب بی اے کرنے کا موقع آیا تو میں نے بوجوہ اسی اورینٹل مارننگ کالج کو ترجیح دی۔میں نے ایسا قصداً کیا تھا۔حالاں کہ میرے کرم فرما محمود عالم صاحب لائبریرین خدا بخش نے مجھے پٹنہ یونی ورسٹی میں داخلہ کے لیے زور دیا۔ان کی بات صحیح تھی یعنی مجھے پٹنہ کالج میں ہی ایڈمشن لینا چاہیے تھا لیکن جب تک وقت نکل چکا تھا اور اب میں نے حکمت عملی کے تحت طے کرلیا تھا کہ میں اسی اورینٹل کالج میں رہوں گا۔جو مگدھ یونی ورسٹی میں آتا ہے۔حالاں کہ پٹنہ یونی ورسٹی ہو یا مگدھ یونی ورسٹی وہاں میرا اپنا یا سگا کوئی نہ تھا۔جب کہ میرے دوست ابواللیث نے پٹنہ کالج کو ترجیح دی۔پٹنہ یونی ورسٹی میں ہی بی اے اردو کرنے کے پیچھے ان کی سوچ یہ تھی کہ وہاں کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ممتاز احمد تھے، جو کلیم الدین احمد کے شاگردرہ چکے تھے،اور وہ انصاری برادری سے تعلق رکھتے تھے،ابواللیث بھی انصاری تھے اور اپنے سبجیکٹ پر کمانڈ رکھتے تھے۔یہ نسبت کافی تھی یونی ورسٹی میں ٹاپ کرنے کے لیے۔لیکن ہائے رے قسمت!اسی کلاس میں پروفیسر ممتاز احمد کی صاحبزادی بھی تھیں ابواللیث پھر بھی پُر امید تھے کہ ٹاپ تو وہی کریں گے کہ پروفیسر ممتاز ابواللیث کو بہت عزیز رکھتے تھے۔لیکن جب بی اے فائنل کا ریزلٹ آیا تو:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا　　دیکھا اس بیمارئ دل نے آخر کام تمام کیا

صاحبزادی ٹاپ پر اور ابواللیث ساتویں نمبر پر۔ایسا کیوں ہوا؟اور کیسے ہوا؟یہ تو وہی اچھی طرح سے بتا اور سمجھا سکتا ہے، جو آجکل کے مروجہ سورس اور سفارش کی سیاست سے واقف ہو۔

میرے زمانۂ طالب علمی کا ایک واقعہ بلکہ سب سے بڑا واقعہ وہ ہوا کہ جس میں میں موت کی سرحد سے واپسی کرنے میں کامیاب رہا۔ہوا یوں کہ میرا ایک ہم جماعت اپنے ساتھی کے ایک قیمتی قلم کی چوری کا گنہ گار ثابت ہوا۔چنانچہ میں نے غصے میں ایک زوردار طمانچہ اس کے چہرے پر رسید کردیا۔جس کے فوراً بعد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔'اب پچھتائے کا ہوت'اس بندے نے اپنی اس بے عزتی کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔اب کیا تھا میرا بھی خون جوش مارنے لگا لیکن میں پارٹی بندی میں بہت کچا اور کمزور تھا۔میں یہ سمجھتا رہا کہ یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔لیکن کسے معلوم تھا کہ منافق بھی ہمارے ساتھ ہیں۔وہ پورنیہ سے تعلق رکھتا تھا۔وہاں کے سارے طلبہ پٹنہ میں خواہ وہ مدرسے میں رہ رہے ہوں یا پٹنہ کالج کے ہاسٹل میں سبھوں نے یکجہتی کا مظاہرہ کرتے

ہوئے ملک الموت کی صورت ایک دن رات کے وقت جب میں نماز عشا کے بعد کھانا کھا کر حسب معمول پورے کیمپس کا ایک چکر لگا رہا تھا وہیں ایک معقول جگہ جہاں تاریکی تھی اور کسی کو پہچاننا مشکل تھا انھوں نے پیشہ ور غنڈوں کی طرح ہمیں گھونسوں اور لاتوں سے مارنا شروع کر دیا اور میں تنہا ان سے لڑتا ہوا جب نکل بھاگنے میں کامیاب ہونے کو تھا کہ اچانک کسی نے میری شہ رگ پر چاقو سے وار کر دیا۔اور میں خون سے لت پت ہو گیا تھا۔میں اس حال میں اپنے ایک ساتھی شمس الدین کے ساتھ پہلے تو ڈاکٹر محبّ احمد کے یہاں پہنچا جہاں سے انھوں نے فوراً ہمیں پی ایم سی ایچ جانے کا مشورہ دیا۔جس کے پرنسل ڈاکٹر محبّ احمد ہی تھے۔مرہم پٹی کے بعد میں نے پولیس کو بلوا کر ان لڑکوں کے خلاف ایف آئی آر درج کروایا۔ان لڑکوں کو پورنیہ کے ایک ایم ایل اے کی پشت پناہی حاصل تھی۔چنانچہ اس کارنامے کو انجام دینے کے بعد وہ سارے غنڈے سیدھے اپنے منتری جی کے یہاں جا کر پناہ گزیں ہو گئے ۔لیکن جب معاملہ پولیس تھانہ تک پہنچ گیا اور اس واقعے پر ہنگامہ زیادہ ہونے لگا اور ان لڑکوں کو ڈھونڈا جانے لگا تو یہ سارے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے۔پھر جب معاملہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈا پڑتا محسوس ہوا تو ان لوگوں نے اپنی صورتیں تو دکھانی شروع کر دیں،ہم نے بھی انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔اور جب تک میں پٹنہ میں رہا یہ بھگوڑے بنے رہے۔میں دہشت کی علامت بن گیا۔اس لڑائی میں میرے ساتھ دھباد کے شمس الدین کے علاوہ ارشد استھانوی بھی شامل تھے،جن کا ذہنگئی میں کوئی ثانی نہ تھا اور جو بعد میں صغریٰ ہائی اسکول بہار شریف کے پرنسپل ہوئے۔اسی اثنا میں میرے مخالفین نے دعوت میں میرے والد کو میری اس کارستانی کے بارے میں ایک مفصل خط لکھ کر کافی کچھ کہہ ڈالا۔چنانچہ میرے والد صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں پٹنہ چھوڑ کر دلی آجاؤں۔اور میں اپنے والد کے ساتھ رہنے کے لیے دہلی آ گیا لیکن وہ خود ہمیں چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔اُدھر پٹنہ میں دشمنی اور مخاصمت کی آگ وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہو کر دھیرے دھیرے خود ہی بجھ گئی۔

پروفیسر ممتاز احمد خود کو کلیم الدین احمد کا سب سے عزیز شاگرد مانتے تھے۔یہ بات مشہور کر رکھی تھی کہ پروفیسر ممتاز کلیم الدین احمد کے وارث ہیں۔چنانچہ اسی زعم میں پروفیسر ممتاز احمد نے اپنی نگرانی میں دو ریسرچ اسکالر کو کلیم الدین احمد کا موضوع دے دیا۔ان دونوں نے ڈگری ایوارڈ ہوتے ہی ۱۹۸۱ میں وارث الرحمٰن نے ''کلیم الدین احمد کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ'' اور ۱۹۸۶ء میں آفتاب احمد نے ''کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات'' پر ریسرچ کی تھی۔میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا کہ ان دونوں کتابوں کا معیار کیا تھا۔ البتہ ایک بات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ خدا بخش لائبریری کے ریسرچ کانگریس میں غالباً ۱۹۸۷ میں میں نے وارث الرحمٰن کی کتاب کا اور ۱۹۸۸ء میں آفتاب احمد کی کتاب کا پوسٹ مارٹم کیا تھا،لیکن وہ دونوں پیپر عابد رضا بیدار کی بد دیانتی کی نذر ہو گیا۔انھوں نے میرے دونوں پیپر ضائع کر دیے۔صرف اس پاداش میں کہ

میں اور میرے چند ساتھیوں نے جس میں خورشید اکبر، قیصر زماں، اشفاق عارفی اور چند دیگر ساتھی جن کے نام اب یاد نہیں، اس سمینار میں ایک بڑ بولے اور سمینار باز قاضی عبدالستار کے رعونت بھرے لہجے میں کہا کہ میں نئ نسل کو نہیں پڑھتا؛ پر ان کی کھنچائی کی تھی۔ اس زمانے میں فوٹو اسٹیٹ کی اتنی سہولت نہیں تھی، جتنی کہ آج ہے۔ اور کاربن کاپی بھی میں نے رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ عابد رضا بیدار نے اعلان کیا تھا کہ سبھی حضرات کے مقالے خدا بخش جرنل میں شائع کیے جائیں گے۔ لیکن انھوں نے اپنی بات کی لاج نہیں رکھی۔

واضح ہو کہ خدا بخش لائبریری ریسرچ کانگریس معروف محقق قاضی عبدالودود کے ادارہ تحقیقات اردو کے اشراک سے منعقد ہوا تھا۔ پانچ روزہ اس کانگریس میں ریسرچ کی صورت حال پر بحث ومباحثہ کے بعد ایک ۱۴رنکاتی قرارداد بھی پاس کیا گیا تھا۔ ۱۴ نکاتی یہ قرارداد دراصل ریسرچ کے رہ نما اصول ہیں جو نگراں، ریسرچ اور ممتحن سبھوں کے لیے یکساں طور پر مفید اور کارآمد ہیں۔ آیئے پہلے اس قرارداد کے ۱۴ نکات کو پھر سے دیکھتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں جھانکتے ہیں، اردو ریسرچ کانگریس نے ۱۹۸۷ء میں مندرجہ ذیل ایک ۱۴ نکاتی قرارداد منظور کی:

۱۔ یونیورسٹیوں میں ریسرچ کی پالیسی کا ایک مرتب پروگرام ہونا چاہیے اور مناسب ہوگا کہ پلاننگ میں ایک عہد کو سمیٹا جائے یا سلگتے (Burning topic) ہوئے سماجی مسائل پر یک بعد دیگر کام کیا جائے۔

۲۔ ریسرچ کے کام بہت ہی منظّم ومرتب انداز میں کیے جائیں اور یونیورسٹیوں کو چاہیے کہ وہ آپس میں ریسرچ کے کاموں میں اس طور پر تعاون کریں کہ ایک ہی کام کا فضول اعادہ نہ ہو۔

۳۔ دیگر شعبوں کے اشتراک سے مشترکہ قسم کے ریسرچ پروجکٹ پر کام کیا جائے تاکہ ریسرچ کے زیادہ مفید نتائج سامنے آسکیں۔

۴۔ پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے سلسلہ میں ایک قومی پالیسی ہونی چاہیے جس میں طلبا کے سامنے دو واضح اختیاری مضامین ہوں ایک وہ جس کا مقصد تعلیم برائے ملازمت ہو اور دوسرا وہ جس کا مقصد برائے ریسرچ ہو۔

۵۔ اساتذہ کا بنیادی کام پڑھانا ہے جب کہ ریسرچ محض ضمنی طور پر ان کے افکار سے ابل پڑتی ہے۔ چنانچہ یونیورسٹیوں میں پڑھانے کے کام کو زیادہ سنجیدگی اور خلوص سے کرنا چاہیے تاکہ ایک ایسا طالب علم جس کا مقصد تعلیم برائے ریسرچ ہے، جب ایم اے کی ڈگری لے کر آئے تو اپنے آپ کو ریسرچ اور اس کے طریقہ کار کے لیے ذرائع وساز وسامان سے بھرپور محسوس کرے۔

۶۔ ریسرچ کے موضوعات ترجیحاً کئی مسئلہ سے متعلق ہونے چاہیں تاکہ پورا سماج جس کا وہ ریسرچ کرنے والا ہر ہے اس کے ریسرچ سے مستفید ہو سکے۔ ایسے موضوعات جو مستقبل میں ریسرچ اسکالر کو کسی مفید کام کے لیے تیار نہ کرسکیں ان سے احتراز کیا جانا چاہیے۔

۷۔ریسرچ میں گیرائی سے زیادہ گہرائی پر زور دیا جانا چاہیے تا کہ ایک غیر تربیت یافتہ کچھ سیکھ سکے۔
۸۔ریسرچ کی بنیادی اخلاقیات پر طلبا، نگراں یا گائڈ اور ممتحن تینوں کو اگر وہ رضا کارانہ طور پر کاربند نہ ہوں تو سختی سے کاربند کرایا جائے۔
۹۔یہ کانگریس چونکہ یونیورسٹی کے اساتذہ یعنی نگراں طبقہ کی نمائندگی کرتی ہے لہٰذا اس طرح کا ایک قومی اجتماع ریسرچ طلبا کا بھی ہونا چاہیے تا کہ اس میں طلبا کے مسائل پر خودان کے نقطہ نظر سے نظر ڈالی جا سکے۔
۱۰۔اردو ریسرچ کانگریس کا انعقاد ایک ورک شاپ کے طور پر یو جی سی کے اشتراک سے ہر سال کیا جانا چاہیے تا کہ اس سال میں جمع کیے گئے مقالوں کا تنقیدی جائزہ لیا جا سکے۔
۱۱۔زندہ اشخاص پر ریسرچ کو لازمی طور پر بیکار قرار نہیں دیا جانا چاہیے، بالخصوص جب کہ ریسرچ کا موضوع اس معیار کا ہو جس پر ریسرچ اس کی زندگی ہی میں کیا جانا مناسب سمجھا جائے۔صرف ایک بات جو پیش نظر رکھی جائے وہ جرأت مندی کی ہے۔
۱۲۔ڈگری دیئے جانے سے قبل عوام کے سامنے زبانی امتحان لیا جانا چاہیے اور تحقیق کے نتائج کو طالب علم کے ذریعہ شہر/ریاست کے تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے جنھیں عوامی اعلان کے ذریعہ تحقیق کے نتائج کو سننے اور سوالات کرنے کی دعوت دی جائے۔
۱۳۔اردو ریسرچ کانگریس کو ایک رجسٹرڈ ادارہ بنایا جانا چاہیے جس کے زیر اہتمام ہر سال ایک ریسرچ کانفرنس منعقد کی جائے۔اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو اس سلسلہ میں اقدامات کرنے چاہئیں۔
۱۴۔کانگریس کے فیصلوں کو یو جی سی اور یونیورسٹی کے پاس غور کے لیے اور اگر وہ چاہیں تو اس پر عمل کرنے کے لیے بھیجنا چاہیے۔

۲۴۔۲۸ جنوری ۱۹۸۷ء کانگریس

پٹنہ، پاٹلی پترا اور عظیم آباد:

یہ وہی عظیم آباد ہے جو اپنی گنگا جمنی تہذیب کے لیے پہچانا جاتا تھا، لیکن اب اس تہذیب سے بھی بدبو آنے لگی ہے۔گنگا اور جمنا دونوں ہی اتنی میلی اور ناپاک ہو چکی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔اور جب گنگا کا یہ حال ہے تو پھر اس کی تہذیب تو متاثر ہوگی ہی۔مثال کے لیے ہمیں دور جانے کی قطعی ضرورت نہیں، ہم آئے دن اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔خیر! یہ وہ شہر ہے جو علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔یہاں ایک سے بڑھ کر ایک ادیب، شاعر اور دانشور پیدا ہوتے رہے ہیں۔

نوابوں کے زمانے میں آج کے پٹنہ یا پاٹلی پترا کا نام ہی عظیم آباد ہوا کرتا تھا، لیکن آج اسے پٹنہ

ہی کے نام سے جانتے ہیں۔ مگر کچھ لوگ بطور خاص شعرا حضرات عظیم آبادی بھی کہتے ہیں اور اپنے نام کے ساتھ بڑے فخر سے عظیم آبادی وغیرہ لگاتے ہیں۔ جیسے شاد عظیم آبادی، سہیل عظیم آبادی اور کیف عظیم آبادی اس طرح کے اور بہت سے ادیب وشاعر ہیں۔ آج عظیم آباد کے نام سے وہاں ایک چھوٹی سی کالونی ہے۔ جب کہ بہت سے لوگ عظیم آباد بول کر پورے بہار کو اس میں سمیٹ لیتے ہیں۔ اس طرح کی ایک مثال فاروق ارگلی کی کتاب 'جواہر عظیم آباد' ہے۔ جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور جس میں فاروق ارگلی نے پورے بہار کے نمائندہ ادیب وشاعر جس میں خاکسار بھی شامل ہے، کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

میں 'پدرم سلطان بود' کا قائل نہیں، میرے دادا جان اپنے زمانے کے ایک اعلیٰ سند یافتہ 'منشی' تھے۔ ٹھیک منشی پریم چند کی طرح۔ میرے دادا منشی شبراتی کے نام سے مشہور تھے۔ میرے والد کا نام حفیظ الرحمٰن تھا اور وہ بہار یونی ورسٹی مظفر پور کے گولڈ میڈلسٹ تھے۔ انھوں نے کہیں افسری کرنے کے بجائے اپنے کام کو ترجیح دی۔ اور کبھی انھوں نے موٹر ٹائر، ٹیوب اور دیگر موٹر پارٹس کا کاروبار کیا تو کبھی چوڑیوں کا کاروبار کیا۔ وہ کوئی بھی کام جائز طریقے سے کرنے سے نہیں شرماتے تھے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد انھوں نے ٹھیکیداری شروع کردی۔ مظفر پور میں سب سے زیادہ سرکاری ٹھیکے انھیں ملا کرتے تھے، لیکن یہاں بھی انھوں نے مستقل مزاجی نہ دکھائی، اور اس کام میں رشوت کا ناجائز کاروبار انھیں گوارہ نہیں ہوا۔ انھیں اپنے ہر کام کے لیے قدم قدم پر رشوت دینی پڑتی تھی، جوان کے جماعت اسلامی سے جڑنے کے بعد ان کے قلب ماہیت کے نتیجے میں یہ اتنا بڑا گناہ نظر آنے لگا کہ انھوں نے فوراً اس کام کو چھوڑ دیا۔ آج بھی بہار سرکار کے مختلف ڈپارٹمنٹس خاص طور پر الیکٹری سٹی بورڈ میں ان کے کئی فائل دبے ہوئے ہیں۔ اچانک اپنے اس کام کو چھوڑ دینے کی وجہ سے وہ اور ان کی پوری فیملی سڑک پر آ گئی۔

پٹنہ کے دوران قیام کی بات ہے۔ پندرہویں صدی ہجری کی آمد آمد تھی عالم اسلام میں جوش و خروش کا ماحول تھا۔ چنانچہ میں نے ''پندرہویں صدی ہجری اور ہم'' کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھ دیا جو دعوت کے شمارہ ۱۶ دسمبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ یہ میرا لکھنے اور چھپنے کا ابتدائی زمانہ تھا۔ چنانچہ کسی چیز کے چھپنے پر خوش ہونا فطری تھا۔ حلقہ طلبا اسلامی پٹنہ کے احباب نے مجھے مبارک باد دیں۔

لیکن میرے اس مختصر مضمون کے جواب میں کسی مسٹر رہبانی (ایک فرضی نام) نے ایک طویل خط لکھ ڈالا۔ چوں کہ میرے مضمون میں میرا پتہ درج نہیں تھا لہٰذا مسٹر رہبانی نے اسے دعوت کی معرفت مجھ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ میرے ابا جی ان دنوں دعوت میں ہی تھے انھوں نے یہ خط مجھے مدرسہ شمس الہدیٰ کے پتے پر پٹنہ بھیج دیا۔ اس خط کو دیکھ کر لگتا ہے کہ کسی فکشن نگار نے کوئی طویل ناول لکھ دیا ہو۔ چنانچہ میرے والد صاحب نے مجھے مبارک باد پیش کرتے ہوئے مضمون اس تاکید کے ساتھ ارسال کیا کہ میں اسے غور سے پڑھ لوں۔ لیکن

ضروری نہیں کہ اس کا جواب بھی دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ یہ خط کیا تھا ایک طویل ناول بلکہ داستان یا داستانچہ ہی لکھ ڈالا تھا۔ یہ بات ۱۹۸۰ کی ہے۔ تب سے اب تک میں نے اس خط کو سنبھال کر رکھا ہے۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

یہاں پر مضمون ''پندرہویں صدی ہجری اور ہم'' سے چند اقتباسات اور پھر مسٹر رہبانی کے اس طویل خط سے چند اقتباسات دینا خالی از لطف نہ ہوگا۔ میں نے لکھا تھا:

☆ دنیا کی تقریباً تمام زندہ قومیں اپنا ایک سنہ اور تاریخ رکھتی ہیں دراصل سنہ اور تاریخ انسانی زندگی کی بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتی ہے جو قوم اپنا سنہ اور تاریخ نہیں رکھتی گویا وہ اپنی بنیادی اینٹ سے محروم ہے ان کی بقا گویا کہ ایسی کھوکھلی بنیاد پر ہوئی ہے جو کسی وقت بھی زمانے کے تغیرات اور ایک معمولی سے جھٹکے سے بیٹھ جا سکتی ہے اور اس طرح وہ ملیا میٹ اور نیست و نابود ہو سکتی ہے۔......

☆ طلوع اسلام سے قبل دنیا کی مختلف قوموں میں مختلف سنین جاری تھے۔ انھوں نے اپنے سنین کو یا تو اپنے ظہور کی سب سے بڑی فتح کو آغاز مانا یا پھر کسی قوم نے اپنے سنہ کا آغاز اپنی تاریخ کے سب سے بڑے انسان کی پیدائش کو مانا یا پھر اپنی قوم کے سب سے بڑے انسان کی وفات کو اپنے سنہ کا آغاز مانا ہے۔

☆ اسلام وہ واحد مذہب ہے جو نہ کسی کی پیدائش کو اپنے سنہ آغاز مانتا ہے اور نہ کسی کی وفات کو۔ اسلام میں شخصیت پرستی سے احتراز کیا گیا ہے۔ غزوۂ بدر اور فتح مکہ کے بڑے بڑے واقعات جیسے داعی اسلام حضرت محمدؐ کی پیدائش کا واقعہ بلاشبہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ اس لیے اپنے سن کا آغاز نہیں بنایا کہ اس سے شخصیت پرستی کا خوف تھا۔ بعثت نبویؐ دوسرا بڑا واقعہ تھا۔ لیکن چوں کہ وہ معاملہ کی شروعات تھی نہ کہ معاملہ کی انتہا اور تکمیل۔ اس لیے اسے بھی سنہ کا آغاز نہیں مانا گیا۔......

☆ ہجرت جیسے عظیم واقعے کو بنیاد مان کر اسلامی سنہ کا آغاز کیا گیا۔ اور اس طرح اسلام نے اس بات کی مثال قائم کی کہ دراصل وہ شخصیت پرست نہیں بلکہ ان کے نزدیک ایسی باتوں کی اہمیت ہے جو ہمارے جمود کو روانی میں تبدیل کر دے۔ جو ہمیں خواب خرگوش سے جگا کر عالم ہوش میں لے آئے۔ جو ہمیں نہ صرف ایک بات کا علم دے بلکہ دعوت عمل بھی دے۔ دراصل واقعۂ ہجرت ہمیں پیغام عمل دیتا ہے۔''

اب مسٹر رہبانی کا جواب ملاحظہ کریں:

آپ کا مضمون ''پندرہویں صدی ہجری اور ہم'' اخبار دعوت ۱۶ دسمبر ۸۰ میں دیکھا۔ اچھا کیا آپ نے جنتا کے لیے اسلام کی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ لیکن کچھ باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔ کیا مہربانی سے اخبار الجمعیۃ (دعوت نہیں!) کے ذریعے رفع اشکال فرمائیں گے۔ مثلاً اہل اسلام نے شخصیت پرستی کے خوف سے محمد صاحب کی پیدائش، بعثت یا وفات یا

پھر فتح مکہ جیسے بڑے واقعات سے اپنا سنہ نہیں شروع کیا بلکہ ہجرت کے واقعے سے شروع کیا کہ اس میں ظہور وعروج اسلام کا حقیقی منشا مضمر تھا۔ رحمانی صاحب ذرا حالات وواقعات اور عمل پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام شخصیت پرستی نہیں بلکہ شخص پرستی پر مبنی ہے۔ یہاں تک کہ اسلامیوں نے محمد صاحب کے مقابلے میں خدا کو بھی دو نمبر پر ڈال دیا ہے۔

میرے مضمون کے خاص خاص نکات کے جواب میں مسٹر رہبانی نے جو کچھ کہا تھا وہ ہم سبھی جانتے ہیں۔ رہبانی صاحب نے پہلے تو میری اصلاح فرماتے ہوئے کہا کہ شخصیت پرستی نہیں بلکہ شخص پرستی ہونا چاہیے۔ طنزیہ لہجے میں بات کرتے ہوئے مسٹر رہبانی نے موج میں ایک بات ایسی کہی جسے پڑھ کر میں چوکنا ہو گیا۔ انھوں نے کہا:

محمد صاحب پر تو ہر قدم پر درودوسلام بھیجتے ہیں۔ خدا کو لے دے کے صرف پانچ وقت ہی یاد کرتے ہیں۔ محمد صاحب کا نام تو اتنے زیادہ القاب وآداب کے ساتھ لیتے ہیں بلکہ زیادہ تر تو بے توقیری کے ڈر سے نام لیتے ہی نہیں۔ صرف حضور، سرور کائنات، اکرم مقبول حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کہتے ہیں۔ جب کہ خدا کے ساتھ شاذ ہی کوئی القاب لگاتے ہیں۔ اور اسے خوب تو طراق سے بولتے ہیں۔ اس کے لیے لفظ فرمانا بھی استعمال کریں گے تو وہ بھی واحد غائب (فرماتا ہے) کے صیغہ میں، جو میں رحمانی صاحب کے لیے استعمال کروں کہ ''رحمانی صاحب فرماتا ہے'' تو وہ بُرا مان جائیں گے۔ محمد صاحب کو مکمل انسان مانتے ہیں جب کہ مکمل صرف خدا ہے۔

مسٹر رہبانی نے اسی طرح تلخ وترش انداز میں بڑے ہی شرح وبسط کے ساتھ میری بات کو ایک بحث میں الجھاتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ابا جی کی خواہش کے مطابق میں نے فیصلہ کیا کہ اس بحث کو طول دینا تحصیل حاصل ہوگا۔ لہٰذا میں اسے یہیں ختم کرتا ہوں:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

میری ادبی کاوشیں

میری زندگی کے ان ہی بڑے واقعات میں سے ایک پی ایچ ڈی کی ڈگری کا حصول بھی ہے۔ میں نے کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر اور بیباک نقاد پر پی ایچ ڈی کر لی۔ اس تھیسس میں میں نے بھی اپنی سخت گیری اور بے باکی کو پوری طرح سے برقرار رکھا۔ اور میں نے ایسا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، جس میں کلیم الدین احمد کی مغرب زدگی اور ان کی زیادتیوں کو طشت از بام نہ کیا ہو۔

میری پہلی باضابطہ تصنیف 'کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ' ہے، جو دراصل میرے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اس مقالے پر میری جتنی تعریف ہوئی اسے میں اپنی خوش نصیبی اور خوش بختی سے تعبیر کرتا ہوں۔ اللہ نے میرے اس کام کو میری عزت افزائی کا ذریعہ بنا دیا۔ میری اس کتاب سے سیکڑوں لوگوں نے استفادہ کیا ہوگا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے لیکن بعض ندیدے ایسے بھی ہیں جنھوں نے میری اس کتاب

سے من وعن نقل کر کے بصورت مضمون اپنے نام سے چھپوالیا۔ خیر! اردو میں تنقید کا سرمایہ بہت زیادہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی مضبوط روایت ہے۔ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی تنقید کا مقابلہ کریں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اردو تنقید ان کے مقابلے کم مایہ ہے۔ میر سے آزاد تک اردو تنقید کا سرمایہ تذکروں تک محدود ہے اور حالی سے تا حال گرچہ مغربی ادب سے استفادہ کی روایت مضبوط ہوتی ہے مگر پھر بھی تنقید کے سرمایے میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوسکا۔ اس پس منظر میں کلیم الدین احمد کی تنقید کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اپنی تنقید میں سب سے زیادہ مغربی اصول و تنقید سے فائدہ اٹھایا۔

میری دوسری تصنیف میرے مختلف النوع مضامین کا مجموعہ 'تلخ و شیریں' ہے۔ جسے اس کے تلخ وشیریں اور شگفتہ بیانی کے سبب کافی پسند کیا گیا۔ تلخ و شیریں میرے تنقیدی، تحقیقی اور تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ میں ان مضامین کو مجموعہ کی شکل میں چھپوانے کے حق میں قطعی نہیں تھا۔ لیکن اپنے چند احباب کے اصرار پر اس کے لیے تیار ہو گیا۔

تیسری کتاب غالب پر مضامین کا مجموعہ 'خزینۂ غالب' ہے۔ یہ مضامین ماہنامہ 'آجکل' میں شائع مضامین کا انتخاب ہے۔ اس کتاب میں 'دیباچہ' کے نام سے تفصیلی تحقیقی مضمون جو غالب کے ایک خط پر مبنی ہے پوری ایک بحث پر محیط ہے۔ یہ بحث ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے شروع کی تھی جسے ناچیز ابرار رحمانی نے آگے بڑھایا تھا اور پھر اس میں کچھ اور حضرات بھی بہ شمول عابد پشاوری شامل ہوئے۔ بحث دلچسپ تھی لہٰذا اسے کسی طور پر باذوق حضرات کے سامنے پیش کر دیا۔

چوتھی کتاب 'جنگ آزادی کا درخشاں باب' ہے، جو اپنی تاریخی حیثیت کی وجہ سے پسند کی گئی۔ اردو میں عام طور پر اس موضوع پر کتابیں تو ہیں، لیکن اس میں کوئی گہرائی اور گیرائی نہیں پائی جاتی۔ اس وجہ سے میری یہ کتاب پسند کی گئی اور قبول عام کا درجہ حاصل کر سکی۔

پانچویں کتاب 'سجاد ظہیر کی منتخب تحریریں' ہے جو نیشنل بک ٹرسٹ (این بی ٹی) کے لیے تیار کی گئی تھی۔ ایک دلچسپ بات سنیے۔ کتاب فائنل ہونے کے بعد سجاد ظہیر کے داماد علی باقر نے اس پر اپنا دعوا کر دیا۔ اس پر تو میرا نام (یعنی علی باقر) ہونا چاہیے، ابرار رحمانی کا نہیں۔ علی باقر نے اس سلسلے کو بلا وجہ دراز کرتے ہوئے اس میں اپنی اہلیہ (سجاد ظہیر کی بیٹی) کو بھی شامل کر لیا۔ پھر اس پر طرح طرح کے اعتراض کرنے لگے کہ اس میں سجاد ظہیر کی پانچ کہانیاں کیوں ہیں؟ اور یہ ایسا کیوں ہے، ویسا کیوں نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور جب یہ کتاب چھپ کر آئی تو اس میں پانچ کی جگہ تین ہی کہانیاں شامل تھیں جب کہ 'احوال واقعی' میں میں نے پانچ کہانیوں کا ذکر کیا ہے جو جوں کا توں رہ گیا۔ اس کتاب کا ٹائٹل کور مقبول فدا حسین کا

تیار کردہ ہے۔اس کتاب کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

میری ایک کتاب 'اداریہ نویسی اور میرے اداریے' عام طور پر اردو ادب میں اور خاص طور پر اردو صحافت میں بہت مقبول ہوئی۔ یہ 'آجکل' میں لکھے گئے میرے ۲۷ اداریوں کا مجموعہ ہے۔ جو جرنلزم کے طلبا کے لیے کافی سود مند ہے۔ یوں تو ادب یا صحافت میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی لیکن ہم نے اپنے کالم کے لیے اگر یہ عنوان سوچا ہے، تو اس کے پیچھے کوئی بات تو ضرور ہے۔ حرف آخر کے نام سے شائع ان کالموں کے مجموعہ کا نام بھی 'حرف آخر' ہے، کیوں کہ میں نے اس کالم میں جس موضوع پر بھی لکھا ہے وہ ایسی ہیں جنھیں میں حتمی سمجھتا ہوں ہے۔

میری ایک اور تصنیف 'سفینۂ افکار' کے نام سے آئی جس نے لوگوں کو متوجہ کیا۔ جس میں سات عناوین کے تحت مضامین شامل ہیں۔ ۱۔ نقش کہن، ۲۔ ذکر رفتگاں، ۳۔ مسائل وسائل، ۴۔ گاندھی اور اردو، ۵۔ کچھ مغربی ادب سے، ۶۔ یادِ یارِ مہرباں، ۷۔ تاریخ کے جھروکے سے۔ کل ملا کر ۴۳ مضامین اور مضمونچے اس میں شامل ہیں اس کے علاوہ آجکل سریز کی سات کتابیں، چار کتابوں کے تراجم اور پچاسوں تبصرے، اخبار کے کالم، ریڈیو کے لیے فیچر اور ڈرامے وغیرہ شامل ہیں۔

قارئین کے سنجیدہ حلقے میں میری کاوشوں کو عام طور پر سراہا گیا۔ ہمارے پاس روزانہ ایسے خطوط آتے رہے جن سے ہماری حوصلہ افزائی ہوتی تھی اور میری کارکردگی کو اس سے جلا ملتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کچھ قارئین ایڈیٹر کی خوشامد اور چاپلوسی بھی کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں سے میں نے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کی جس کے لیے مجھے خسارہ بھی جھیلنا پڑا۔ آج کے دور میں سچے اور اچھے قارئین بہت کم ملتے ہیں۔ یوں بھی اب پرنٹ میڈیا کی جگہ الیکٹرانک میڈیا نے لے لی ہے چناں چہ اب خط و کتابت کا وہ سلسلہ نہیں رہا اور کمپیوٹر کے ذریعے خط و کتابت کی عادت نہیں پنپ سکی۔

آمدم برسرِ مطلب، ہماری کاوشوں کو نہ صرف سنجیدہ قارئین کی طرف سے بہ نظر تحسین دیکھا گیا بلکہ ملک کی مختلف اردو اکیڈمیوں نے میرے کام کو سراہتے ہوئے میری مختلف کتابوں پر انعامات سے نوازا۔ حالانکہ میں ان انعامات کا قائل نہیں ہوں۔ اردو رسالوں کے صفحات میری اس سوچ کے گواہ ہیں۔ سہ ماہی 'مژگاں' کلکتہ نے تو اس تعلق سے میرے خط کو شائع بھی کیا تھا:

''میری کتاب پر مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا انعام ملنے پر آپ نے مبارک باد دی ہے۔ شکریہ! ساتھ ہی آپ نے اپنے مؤقر جریدہ ''مژگاں'' کے تازہ شمارہ پر میری رائے بھی طلب کی ہے۔ تو بھئی! یہ دونوں باتیں کسی نہ کسی طور پر آپس میں منسلک ہیں۔ اس لیے کہ آپ کے حالیہ شمارے میں بھی ایوارڈ کا بازار گرم ہے۔ ۱۹۹۹ء کے لیے ''مژگاں ایوارڈ'' کا اعلان کیا گیا ہے، جن میں شمس الرحمٰن فاروقی، اعزاز افضل،

شہناز نبی، عاصم شہنواز شبلی اور نعیم انیس کے نام شامل ہیں۔ معلوم نہیں، ان ایوارڈز میں آپ ان حضرات کو کس کس طرح سے نوازیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ایوارڈس محض ناموں کے اعلان تک ہی محدود ہو۔ تفصیل آپ ہی بتا سکتے ہیں۔ مجھے ان ایوارڈس کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ اب یہ ایوارڈس محض ایک فیشن بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ حقیقت ایوارڈ یافتگان بھی جانتے ہیں اور ایوارڈ دینے والے ادارے بھی اور ہم آپ بھی۔

۲۰۰۰ سنہ کے لیے دہلی اردو اکاڈمی کے انعامات تقسیم کیے گئے۔ اس سال دو خاص باتیں ہوئیں۔ کتابوں پر ملنے والے انعامات میں میرے دوست مشرف عالم ذوقی کے ناول ''ذبح'' کو ڈھائی ہزار روپے کا مستحق قرار دیا گیا۔ ذوقی نے یہ کہہ کر انعام لینے سے انکار کیا کہ انھیں انعام کے دوسرے درجے میں کیوں رکھا گیا۔ مشرف عالم ذوقی کو پچھلے سال بھی دلی اردو اکیڈمی نے الکٹرانک میڈیا کے لیے گیارہ ہزار روپے سے نوازا تھا لیکن ذوقی نے اس احتجاج کے ساتھ ایوارڈ قبول کرلیا کہ انھیں تخلیقی نثر کا ایوارڈ دیا جانا چاہیے تھا۔ واضح ہو کہ تخلیقی نثر کا ایوارڈ اکیس ہزار کا تھا۔

امسال کے ایوارڈ فنکشن میں اسی الیکٹرانک میڈیا کے انعام سے نوازے گئے تھیٹر اور ڈرامہ سے وابستہ جناب ریوتی سرن شرما نے ان الفاظ میں احتجاج کیا کہ انھیں دوسرے درجے کا فن کار کہلانا پسند نہیں۔ لہٰذا میں یہ انعام کی رقم اکیڈمی کو واپس کرتا ہوں کہ وہ اس رقم سے غریب لڑکیوں کے لیے تعلیمی وظیفہ جاری کرے۔ دہلی کے وزیر تعلیم نریندر ناتھ کو اعلان کرنا پڑا کہ اگلے سال سے یہ تمام انعام ایک ہی طرح کے ہوں گے۔

اب آیئے دہلی اردو اکیڈمی کے سب سے بڑے اعزاز کی طرف۔ امسال اکیڈمی کے اس سب سے بڑے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کی رقم اکیاون ہزار سے بڑھا کر ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو ایک روپے کر دئے۔

دہلی اردو اکیڈمی کا انعام گیان پیٹھ سے بڑا نہیں ہے، پھر وہ کون سے عوامل تھے جب دہلی اردو اکیڈمی نے قرۃ العین حیدر کو یہ ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا اور وہ کون سی مجبوری تھی جب عینی آپا نے اس انعام کو قبول کیا؟

جب ان انعامات اور ایوارڈس کی حقیقت یہ ہو تو پھر کیوں کر کوئی انعام پا کر خوش ہوا جا سکتا ہے؟ بات تلخ ہے مگر کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ جس مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے انعام سے مجھے نوازا گیا ہے اس اکیڈمی کے سب سے بڑے انعام پرویز شاہدی ایوارڈ سے اکیڈمی کے چیئر مین نے خود کو نوازلیا ہے۔ کیا یہ بات کسی طور پر مناسب معلوم ہوتی ہے؟ محترم سالک لکھنوی بزرگ شخصیت ہیں اور یقیناً مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا نظم و نسق سنبھالنے میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس کی قیمت وصول کی جائے۔ یقیناً ان کی خدمات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا لیکن انھیں انتظار کرنا چاہیے تھا اس وقت تک جب تک کہ چیئر مین کے عہدے سے نہ ہٹ جاتے۔ اکیڈمی اس بھول کو کیسے سدھارے گی۔

یہ تو اب اس کے عہدے داران ہی بتا سکتے ہیں۔

آپ نے مجھے انعام دینے پر مبارک باد دی ہے اس کے لیے ایک بار پھر آپ کا شکریہ لیکن یہاں ایک بات بتا تا چلوں کہ جس کتاب پر مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے انعام سے نوازا ہے۔ اس کتاب کو دہلی اردو اکیڈمی نے کسی لائق نہیں سمجھا۔ وجہ؟ وجہ تو دہلی اردو اکیڈمی کی ایوارڈ کمیٹی کے کنوینر عظیم الشان صدیقی ہی بتا سکتے ہیں۔ البتہ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اندھا بانٹے ریوڑی، اور اپنے اپنوں کو دے۔

میرے ابا حضور:

میرے والد حفیظ الرحمٰن صاحب نہایت پڑھے لکھے اور مہذب انسان تھے اور جہاں بھی ہوتے اپنی حرکات وسکنات سے سب کو متاثر کرتے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا نقش چھوڑا ہے۔ وہ افسر نما انسان کبھی وکالت کرتے کبھی ہومیو پیتھک معالج بن جاتے اور کبھی سرکاری نوکر شاہ۔ انھوں نے نچلا بیٹھنا کبھی سیکھا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ کبھی خالص سیاستداں ہو جاتے تو کبھی کسی سیاستداں کا ترجمان۔ مجھے یاد ہے، یہ میرے بچپن کی بات ہے ہمارے گھر میں آر ایس ایس کا ترجمان آرگنائزر کی دس پندرہ کاپیوں کا بنڈل آیا کرتا تھا معلوم ہوا کہ ہمارے ابا جی بھی آر ایس ایس کی شاکھا میں جایا کرتے ہیں۔ لیکن میں نے اکثر دیکھا ہے کہ آرگنائزر کا بنڈل پابندی سے آتا تو تھا مگر کبھی شاید ہی آگنائزر اپنے قارئین تک پہنچ پایا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ابا جی اپنے چند غیر مسلم دوستوں کے ساتھ جن میں ہمیں دو کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ ایک جوالہ پرشاد اور دوسرے سودھانشو جی دونوں ہی پیشے سے وکیل تھے اور سنگھ کے بہت قریب تھے۔ چنانچہ یاری دوستی میں مروتاً میرے ابا جی بھی شاکھا میں چلے جایا کرتے تھے۔ جہاں انھیں آر ایس ایس والوں کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، لیکن جب انھوں نے خود احتسابی کی تو انھوں نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ سیاست سے مکمل طور پر خود کو الگ تھلگ نہیں کر سکے۔ یوں بھی ہر شخص کسی نہ کسی معاملے کو لے کر سیاست کرتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ میرے ابا جی کبھی لیگی نظر آتے تو کبھی کانگریسی مسلم لیگ سے تو وہ اسی دن دور ہو گئے تھے جس دن ملک کی تقسیم کے ساتھ آزادی ملی۔ جہاں تک کانگریسی ہونے کا سوال ہے تو وہ کانگریس کے بھی نہیں ہو سکے۔ اب پتہ نہیں کہ انھوں نے کانگریس کو چھوڑا یا کانگریس نے انھیں نظر انداز کر دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ میرے ابا جی ذات پات کی سیاست کو پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ وہ عبدالقیوم انصاری جو اس وقت سیاست میں کافی بلندی پر تھے وہ انصاریوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے ریزویشن کا مطالبہ کر رہے تھے جب کہ میرے ابا شیخ حفیظ الرحمٰن کسی خاص ذات کے بجائے پوری مسلم کمیونٹی کو ایک مان کر ان کی پس ماندگی اور پچھڑے پن کے پیش نظر انھیں ریزویشن دیے جانے کے قائل تھے۔ وہ اتحاد بین المسلمین کے حامی تھے۔

کسی خاص موقعے سے عبدالقیوم انصاری مظفر پور آنے والے تھے چنانچہ میرے ابا جی اور ان کے حامیوں نے عبدالقیوم انصاری کو کالا جھنڈا دکھا کر اپنا نظریہ اور غم و غصہ ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن کسی مخبر نے پہلے ہی اس کی اطلاع تھانے کو دے دی اور میرے ابا جی کو ایک دن پہلے گرفتار کر لیا گیا اور اس طرح میرے ابا جی کا پلان سبوتاژ ہوتا دکھائی دینے لگا۔ ابا جی کی گرفتاری کے بعد اب انتظامیہ مطمئن تھی کہ انھوں نے مخالف نیتا کو گرفتار کر کے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ چنانچہ اب اطمینان سے مظفر پور کے کانگریس میدان میں پروگرام شروع ہوا اور جوں ہی عبدالقیوم انصاری مائک پر سامنے آئے، حفیظ الرحمٰن صاحب کے جان نثاروں نے اپنے پتلون کی گہری گہری جیبوں سے کالی کالی جھنڈیاں نکال کر انصاری صاحب کو دکھانا شروع کر دیا۔ وہاں پر موجود پولیس نے فوری طور پر ان سب کو گرفتار کر لیا۔ لیکن حفیظ الرحمٰن صاحب کا مشن جیل میں رہنے کے باوجود کامیاب رہا۔

میرے ابا جی حفیظ الرحمٰن صاحب کو الیکشن لڑنے کا شوق عود کر آیا۔ چنانچہ انھوں نے ایک الیکشن کا بھی سامنا کیا اور وہ بھی کانگریس کے اس شخص کے خلاف جو سیاست کے میدان کا گھاگ کھلاڑی تھا اور جس نے ہمارے ابا جی کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ انتخابی حلقہ تھا مظفر پور کا 'کانٹی' علاقہ اس وقت کانگریس کا انتخابی نشان دو بیلوں کی جوڑی تھا جب کہ میرے ابا جی کو انتخابی نشان شیر چھاپ دیا گیا تھا۔ مقابل کانگریس امیدوار کا نام تھا مہیش بابو جس کی شمالی بہار میں کئی پٹرول پمپ تھے اور ان کی کئی بسیں چلا کرتی تھیں مہیش بابو نے ایک دن بڑی بھلمنساہٹ سے حفیظ بابو کو الیکشن سے الگ ہونے کو کہا اور اس کے عوض ایک موٹی رقم کی پیش کش کی۔ لیکن ابا جی نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسے وہ دیانت داری کے خلاف سمجھتے تھے۔ نتیجہ معلوم! الیکشن ہوا، ووٹ ڈالے بھی گئے، ووٹ گنے بھی گئے اور پھر مہیش بابو کی جیت کا اعلان بھی کر دیا گیا ابا جی کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔ دراصل ہوا یوں کہ وہ موٹی رقم جس کی پیش کش ابا جی کو کی گئی تھی اس رقم کو راتوں رات انتخابی حلقے میں لوگوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ اور یوں سارے ووٹ یکطرفہ مہیش بابو اور کانگریس کو ڈال دیے گئے۔ اور حفیظ بابو ہار گئے۔

ابوذر کمال الدین

ہم میں سے اکثر لوگ جب ریٹائر منٹ کے قریب پہنچنے لگتے ہیں تو اپنے آپ کو غیر ضروری چیز سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اور ریٹائر ہوتے ہی وہ گھر کے کسی گوشے میں پناہ لے لیتے ہیں اور اس گوشے میں بیٹھ کر مختلف قسم کے منصوبے بناتے ہیں۔ پلاننگ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں پھر اس سے جی بھر جاتا ہے اور وہ اسے ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ لیکن ہم میں سے وہ لوگ جن کا لکھنے پڑھنے سے تعلق رہا ہے وہ اب اور زیادہ اس طرف دھیان دینے لگتے ہیں۔ اچھے سے اچھا لکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اچھے سے اچھا رسالہ /مجلّہ میں چھپنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ انھیں زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے اور زیادہ سے زیادہ پسند کیا جائے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد سرکاری افسران اور کرمچاری کو فنڈ کے نام پہ ایک موٹی رقم ملتی ہے۔اس رقم کو بہت کم لوگ ہی صحیح طریقے سے استعمال کر پاتے ہیں۔زمین جائداد کی خریداری اور رہائش کے لیے مکان ضروری ہے۔ لیکن یہ آپ کی زندگی کی معراج نہیں ہے۔آپ جس سماج میں رہتے ہیں وہاں آس پاس پڑوس میں بہت سے ایسے لوگ مل جائیں گے جو آپ کی مدد کی آس لگائے بیٹھے ہوں گے۔بہت سی لڑکیاں اپنی غربت کے سبب نہ پڑھ رہی ہوں گی اور نہ ہی ان کی شادی ہو پا رہی ہوگی۔اسی طرح آپ کے معاشرے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے یا تو گلی کوچوں میں کھیل رہے ہوں گے یا پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے بسوں میں، ٹرینوں میں، مٹرو میں جیبیں کاٹ رہے ہوں گے۔ایسے بچوں کو راہ راست پر لانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان کی شکم پروری کی جائے۔اور زندگی کی بنیادی سہولیات فراہم کی جائیں۔

اسی طرح بے یارو مددگار بیوائیں جو ہماری لاپرواہی کے سبب سماج کے ماتھے کا کلنک بن جاتی ہیں یہ آپ کی توجہ کی محتاج ہیں۔یہ سب رفاہ عام کے وہ کام ہیں جسے ہم میں سے بہت سے لوگ اپنی سروس کے دوران بھی کرتے رہتے ہیں اور سبکدوشی کے بعد تو پورے طور پر اس کار خیر میں لگ جاتے ہیں۔اور عنداللہ ماجور ہوتے ہیں، لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی اس موٹی رقم پر صرف اپنا حق سمجھتے ہیں اور اپنی ذات پر خرچ کرتے ہیں اور داد عیش دیتے ہیں۔قابل مبارک باد ہیں وہ لوگ جو اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور خود کو رفاہ عام کے کاموں میں لگائے رکھتے ہیں۔یہ وہ کام ہیں جن میں آپ کو اپنی جیب خاص سے اپنی گاڑھی کمائی کا ایک بڑا حصہ لگانا پڑسکتا ہے۔اب آپ کو اگر اس طرح کے خرچ پر اصراف یا فضول خرچی کا شائبہ نظر آتا ہے۔یا آپ کی اہلیہ اور بچوں کو آپ کا یہ کام ان کی حق تلفی لگتا ہے، تو بے شک آپ کوئی ایسا طریقہ یا راستہ نکالیے کہ جس سے آپ کے گھر والے مطمئن ہو جائیں۔بصورت دیگر آپ کی زندگی جہنم ہو کر رہ جائے گی، آپ گھر کے رہیں گے اور نہ گھاٹ کے۔

تحریک اسلامی سے وہ زمانۂ طالب علمی سے ہی پورے جوش اور جذبے کے ساتھ جڑے رہے ہیں دراصل وہ اپنے اس کام کو عبادت سمجھ کر ہی کرتے ہیں، چنانچہ آپ کے اس کام میں خلوص، نیک نیتی اور ایمان داری صاف طور پر نظر آتی ہے۔میرے ابا حضور حفیظ الرحمٰن صاحب کی زندگی میں جو انقلاب ایا اور جو تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں اور جو راہ راست پر چلنے کی توفیق ہوئی اس کے پیچھے شاید سب سے بڑا ہاتھ حسنین سید صاحب کا رہا ہے ان کے بعد جن شخصیات سے متاثر ہوئے ان میں سب سے پہلا نام ابوذر کمال الدین صاحب کا نام ہے۔ابوذر کمال الدین کی خاصیت یہ ہے کہ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں سے شفقت کا بہت خیال رکھتے اور ان کا سلوک ورویہ خواہ کوئی چھوٹا ہو کہ بڑا برادرانہ اور دوستانہ ہوتا ہے۔

سماج سدھار یا خدمت خلق کا سب کا اپنا اپنا ڈھنگ ہوتا ہے۔کوئی زیادہ سے زیادہ مالی امداد کرنے کوترجیح دیتا ہےتو کوئی اسے نقد کی شکل میں نہ دے کرغریب بستیوں میں ضرورت کی چیزیں پہنچانے کوزیادہ بہتر سمجھتا ہے۔جیسے ان بستیوں میں بجلی کا فراہم کردینا یا پینے کے پانی کے لیے ہینڈ پمپ لگوادینا یا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جوصدقۂ جاریہ کا حکم رکھتی ہیں۔ہمارے ابوذر کمال الدین ایک ایسے ہی دردمند انسان ہیں جواس طرح کے کام کرتے رہتے ہیں اوراب ریٹائرمنٹ کے بعدتو انھوں نے اس موضوع پر باضابطہ ایسی کتاب تصنیف کی ہے جوصدقۂ جاریہ کی بہترین مثال ہے۔

ڈاکٹر ابوذر کمال الدین کا اصل میدان معاشیات رہا ہے،لیکن ذہن ودماغ صالح اوراسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک مادی موضوع کو پڑھتے پڑھاتے رہنے کے باوجودان کی زندگی مادی آلائشوں سے پاک صاف ہے۔ وہ بہار یونی ورسٹی مظفر پور میں معاشیات کے استاد رہے ہیں۔ وہ ایک مختلف الجہات شخصیت کے مالک ایک اسکالر، ایک معروف عوامی شخصیت ، ایک اچھے مصنف اور خطیب ہیں،ساتھ ہی وہ ایک مفکر،ایڈیٹر، ڈبیٹر، ماہرتعلیم ، انسانیت نواز سماجی کارکن، سیکولر ڈیموکریٹ اورقانون کی حکمرانی میں یقین رکھنے والے انسان ہیں۔ چنانچہ بہت ساری تنظیموں ، اداروں اورتحریکات سے وابستہ ہیں۔اوروسیع زمینی تجربات ومشاہدات کے مالک ہیں۔

زندگی ریٹائرمنٹ کے بعد' ان کی تقریباً ایک درجن کتابوں میں شاید سب سے اچھی اور کارآمد کتاب ہے۔ دنیا اورحیات دنیا کے بارے میں اسلام کا نظریہ، کائنات میں انسان کی حیثیت اورحیاتی دنیا کے مختلف مراحل' پرمصنف کے مطالعہ،مشاہدہ اورغوروفکر کا نتیجہ ہے۔

ابوذرکمال الدین کی شخصیت کچھ اتنی پرکشش اور مقناطیسی ہے کہ جو بھی ان سے ایک بارمل لیتا وہ دوسری بار ملنے کا متمنی ہوتا وہ ہمارے اباجی کے دوستوں میں سے تھےاور میرے بھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ جب میرے والدصاحب معاشی بحران سے دوچار تھےاور زبوں حالی سے جوج رہے تھے تو ایسے میں ابوذر کمال الدین ان کا بڑا سہارا تھے جنھوں نے ان کے عزم واستقامت کومضبوط سے مضبوط تر کرنے میں ان کی مدد کی۔

بابا سائیں اور جمالیات

پروفیسر شکیل الرحمٰن جب ڈاکٹر ہوئے تب بھی بابا سائیں رہے اور جب وہ لکچرر اور پروفیسر ہوئے تب بھی اور جب وہ وائس چانسلر ہوئے تب بھی بابا سائیں ہی رہے اور کیریئر کے اخیر میں جب وہ سیاستداں ہوئے تب بھی حتیٰ کہ جب وہ منسٹر ہوئے تب بھی وہ بابا سائیں ہی رہے۔وہ بابا سائیں جسے جمالیات سے خاص لگاؤ تھا۔

جمالیات وہ شعبہ ہے جہاں معاصر منظرنامے میں شکیل الرحمٰن کی طرح جمالیات کے زلف وگیسو سنوارنے

والا کوئی اور دیوانہ نظر نہیں آتا۔ اس کو پالنا اور پوسنا تو دور کی بات ہے۔ ہماری نسل کے چند ایک ناقد جمالیات کو برتنے کی کوشش تو کر رہے ہیں لیکن وہ صرف کسی حسین پیکر کے حصار میں ٹامک ٹوئیاں مارتے نظر آتے ہیں۔

شکیل الرحمٰن نے تن تنہا جمالیاتی افکار کو اس بلندی پر پہنچا دیا تھا، آج کی نسل یا ہمارے بعد کی نسل کو شاید ہی توفیق ہو۔ شکیل الرحمٰن تاحیات جمالیات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ شکیل الرحمٰن کی عین خوش نصیبی کہ روزگار کی تلاش میں کشمیر جنت نظیر پہنچ گئے، جہاں قدرت نے خوبصورت مناظر اور خوب رو حسین چہرے دل کھول کر عطا کیے ہیں۔ کشمیر کے اس ماحول اور آب وہوا کا شکیل الرحمٰن نے بھرپور لطف اٹھایا اور اسے اپنی متعدد کتابوں میں محفوظ کر دیا۔ شکیل الرحمٰن ایک عام سیلانی یا سیاح نہیں تھے جو وقتی طور پر ان مناظر سے بھرپور لطف اندوز ہوئے اور بھول گئے۔ انہوں نے جمالیات سے بھرپور اس ریاست کو اپنا میدان عمل بنایا۔ چنانچہ انہوں نے جمالیات سے متعلق مختلف موضوعات اور پہلوؤں کو اپنی تحریروں اور کتابوں میں نہ صرف پیش کرنا شروع کیا بلکہ اسے وظیفۂ حیات بنالیا۔

آج ہم جس جمالیات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اس کے ڈانڈے کسی نہ کسی شکل میں بہت پہلے سے ہی تاثراتی فکر کی شکل میں موجود تھے، جسے شکیل الرحمٰن نے باضابطہ ایک فن کے روپ میں اپنایا۔ ماضی میں یہ جمالیات تاثرات کی شکل میں اپنی جھلک پیش کرتی رہی ہے اور یہی جمالیات تاثرات یا تاثراتی تنقید کی شکل میں رومانیت کے دور میں موجود رہی ہے۔

شکیل الرحمٰن کی تمام تصانیف کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بابا سائیں شکیل الرحمٰن نے نہ صرف جمالیات پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے بلکہ جمالیات سے متعلق اپنے افکار کا ایک قطب مینار کھڑا کر دیا ہے۔

ایک جامعی تھا، نہ رہا:

ہم نے ایسا ضدی مگر معصوم انسان کبھی نہیں دیکھا۔ صبح کو بستر سے اٹھتے ہی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا نام لیتے پھر کب انھوں نے ناشتہ کیا؟ کیا بھی یا نہیں؟ کوئی نہیں جانتا، شاید وہ خود بھی اس احساس سے ماورا ہو چکے تھے۔ بغیر پٹرول ڈالے تو ایک چھوٹی سی اسکوٹی بھی نہیں چلتی۔ ارے ہاں! پٹرول کے نام سے یاد آیا، میرا ایک دوست تھا، نام اب یاد نہیں، اسے جب بھی اور جہاں بھی کہو میرے ساتھ چلنے کو تیار رہتا تھا۔ بس اس کی ایک ہی طلب تھی کہ 'ابرار پٹرول ڈالتے رہو، یہ گاڑی تمھارے اشاروں پر چلتی رہے گی'۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ پٹرول سے ان کی مراد چائے تھی۔ کچھ ایسی ہی بات اس شخص کے ساتھ تھی۔ وہ علی الاعلان کہا کرتا تھا کہ بیٹھ جاتا ہوں، جہاں چائے بنی ہوتی ہے۔ گھنی چھاؤں کا دہلی میں کوئی مسئلہ نہیں۔ دہلی کی پتلی پتلی گلیاں گھنی چھاؤں کو بخوبی مہیا کراتی ہیں۔ رہی بات چائے کی تو وہ بھی احباب

کے ذمے طے تھی کہ چاہے وہ جہاں بھی جائے انھیں چائے کے ساتھ وائے بھی ضرور مل جایا کرتی تھی۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی چائے وائے کا مسئلہ تقریباً طے تھا۔اس شخص نے اپنے وجود کے انجن کو اپنے لہو سے گرم کر رکھا تھا۔ یہ گردش تو گویا ان کی پیروں کی بیڑیاں بن کر رہ گئی تھی۔ اکثر ان کی گردشِ پا ایک خاص روٹ پر ہی جاری رہتی۔اس روٹ پر ملنے والے ہر خاص و عام کو سلام کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے خراما ں خراماں اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے جاتے لیکن کسی کو آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی منزل آخر ہے کہاں؟ شاید یہ بات خود اس شخص کو بھی نہیں معلوم،اس کے خدا کو ہی معلوم ہو تو ہو۔

وہ شخص کبھی شیروانی پاجامہ اور کشتی نما ٹوپی میں نظر آتا کبھی کبھی وہ سوٹ بھی پہن لیا کرتے،شاید منھ کا مزہ بدلنے کی خاطر لیکن ٹوپی سر پر ہمیشہ موجود ہوتی۔جو مکمل طور پر تو نہیں بس ذرا سی ترچھی ہوتی۔ جسے عام لوگ ترچھی ٹوپی والے کہتے اور ہم کج کلاہ کہتے۔ یہ ان کی کج کلاہی ہی تھی کہ اپنے بھائی سے ذرا سی خانگی تنازعہ پر وہ ہمیشہ کے لیے پٹنہ چھوڑ کر دہلی آ بسے۔وہ ہر غم سے بیگانہ نظر آتے،آنکھوں پر چشمہ اس کی شخصیت کو پُر وقار بناتا تھا۔ اس باوقار شخصیت کو ہم سب اسرار جامعی کے نام سے جانتے ہیں۔(سید شاہ اسرار الحق، پیدائش:۲۱ جولائی ۱۹۳۸۔ وفات:۴ اپریل ۲۰۲۰ء)ایک چھوٹا سا بریف کیس بھی ان کی ذات کے ساتھ کورونا وائرس کی طرح چمٹا رہتا تھا۔ اس بریف کیس میں کیا کیا چیزیں ہوتی تھیں کسی کو نہیں معلوم۔شاید کوئی بم، ارے نہیں! لیٹر بم ہوتے تھے، جو خاص طور پر کسی اردو والے کو ڈرانے اور بہت سے اردو والے کو ہنسانے کے لیے وہ اس بم کا استعمال کرتے تھے۔

حال کے دنوں میں ان کا جوتا بھی انھیں بہت تکلیف پہنچانے لگا اور وہ لنگڑا کر چلنے لگے، لیکن چلتے رہے،مگر ان کا وقار اپنی جگہ قائم رہا۔اس باوقار اور معصوم شخص نے ایک بار ڈاکٹر کوثر مظہری سے میرا پتہ پوچھ لیا،ابرار صاحب ذاکر نگر کی کس گلی میں رہتے ہیں؟ کوثر مظہری نے تفریحاً لیکن انتہائی سنجیدگی سے انھیں بتایا کہ ابرار رحمانی ساڑھے بائیس نمبر گلی میں رہتے ہیں۔ بے چارے اسرار جامعی کافی دیر تک اس ساڑھے بائیس نمبر کی گلی کو ڈھونڈتے رہے، لیکن اس نمبر کی گلی ہو تو ملے نا؟ وہ تو بھلا ہو اس شخص کا جس نے اسرار صاحب سے استفسار کے بعد گلی نمبر بائیس کے تزئین اپارٹمنٹ میں ہمارے غریب خانے پر پہنچا دیا۔

ان کی تعلیم چوں کہ جامعہ میں ہوئی تھی، چنانچہ انھوں نے کچھ اپنایا ہو یا نہیں لیکن لفظ جامعی کو حرز جاں بنا لیا اور وہ شاید ان چند منتخب روزگار اشخاص میں سے تھے جنھوں نے اپنے نام کے ساتھ اس لفظ کو ٹانک رکھا تھا۔ یہ نہ صرف ان کا جامعہ ملیہ کے تئیں بے انتہا محبت کا ثبوت ہے۔آج ہزاروں لوگ ہوں گے، جو جامعی ہیں لیکن وہ اسے اپنے نام کے ساتھ نہیں جوڑتے، پتا نہیں کیوں؟ احساس کمتری یا شاید احساس برتری رہی ہو۔خیر! ہزاروں لاکھوں کی بھیڑ میں وہ 'جامعی' کے سبب دور سے پہچان لیے جاتے تھے۔وہ کسی مجلس / محفل میں پہنچتے اور بیٹھتے ہی

فوراً اپنے بریف کیس سے چھوٹے چھوٹے پُرزوں کی گڈیاں نکالتے پھر وہ موقع نکال کر لوگوں کو پُرزے تقسیم کرتے رہتے۔ان پُرزوں میں کسی میں ایک شعر کسی میں دوشعر اور کسی میں ایک قطعہ لکھا ہوتا تھا۔ان پُرزوں میں عام طور پر کسی نامی گرامی شخصیت پر طنز وتنقید کیا کرتے تھے۔ کچھ اس انداز میں کہ پڑھنے والے اس سے محظوظ ہوئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اسرار جامعی کو پٹنہ سے ہی جانتا ہوں لیکن انھوں نے مجھے دہلی آ کر پہچانا۔میں پٹنہ کے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے فضیلت کر رہا تھا۔اس مدرسے میں اس وقت کے بہار کے وزیر اعلیٰ کرپوری ٹھاکو ایک استقبالیہ دیا گیا تھا، جس میں اسرار جامعی نے ایک خوبصورت نظم پڑھی تھی۔عنوان تھا ۔

مانگ میری کر پوری ٹھاکر　　　چاہے جو ہو مجبوری ٹھاکر

ہر بند کے آخر میں 'مانگ میری کر پوری ٹھاکر' کی تکرار ہوتی تھی اور جو اسرار جامعی کے پڑھنے کے انداز سے دو آتشہ ہوگئی تھی۔اس استقبالیہ میں کیا کیا ہوا مجھ کچھ یاد نہیں۔البتہ یہ نظم اپنے جداگانہ انداز کے سبب یاد رہ گئی ہے۔

بات ۲۵۔۳۰ سال پرانی ہے۔ پٹنہ کے ایک مشاعرہ غالباً اے جی آفس کا مشاعرہ جو پٹنہ کا غالباً سب سے بڑا مشاعرہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس مشاعرہ میں جس شاعر کو بلایا جاتا وہ اپنے کو بہت خوش نصیب سمجھتا تھا۔اس مشاعرہ میں ملک اور بیرون ملک کے چیدہ چیدہ شاعروں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ مذکورہ مشاعرے کی نظامت غالباً ملک زادہ منظور احمد کر رہے تھے۔منظور صاحب نے خوش الحان، خوش گلو شاعر حفیظ بنارسی کو آواز دی کہ وہ اپنا کلام پیش کریں۔اس مشاعرہ میں حفیظ بنارسی نے ایک پوری غزل اپنے پرسوز ترنم کے ساتھ پڑھی اور سامعین نے خوب خوب داد دی۔اس غزل میں مقطع کا شعر تھا ۔

اللہ رے حفیظ ان کا یہ ذوقِ خود آرائی　　　جب زلف سنواری ہے اک آئینہ ٹوٹا ہے

بس پھر کیا تھا، اسرار جامعی کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔ انھوں نے بس ذرا سی تحریف کرتے ہوئے تخلص کے بعد ان سے صرف الف کو ہٹا دیا۔اس طرح حفیظ سے 'ن' مل گیا، پھر کیا تھا! یہ مت پوچھئے۔ اس پوسٹ مارٹم کئے ہوئے شعر کو اسرار جامعی نے اپنے اخبار جس کے وہ چیپ ایڈیٹر تھے، 'پوست مارٹم' میں شائع کر دیا۔ سامعین لطف اندوز ہوتے رہے اور حفیظ صاحب ناراض ہوتے رہے۔ اسرار جامعی اپنے اس ہنر میں کافی ماہر تھے، کسی بھی اچھے سے اچھا شعر میں ذرا سی چھیڑ چھاڑ کے بعد اسے عوام کی عدالت میں پیش کر دیتے اور لوگ اسے پڑھتے اور کافی پسند کرتے۔ ایک عرصے تک محظوظ ہوتے۔ غالب کا ایک شعر ہے ۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ　　　تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

اسرار جامعی کی چھیڑ خانی کے بعد اس شعر کی جو صورت بنتی تھی، وہ ملاحظہ کریں ۔

بنا کر مدیروں کا ہم بھیس غالب　　　تماشائے اہل رقم دیکھتے ہیں

اپنے اس شعر کی درگتی کو دیکھ کر غالب کی روح بھی بلبلا اٹھی ہوگی، جو یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ ع

کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

یہ اسرار کی پُر اسرار شخصیت کا کمال ہے کہ وہ ایک ذرا سی بات کو اپنے اس طرح کے ترمیم واضافہ سے کہیں کا کہیں پہنچا دیتے تھے۔ بسا اوقات اوج ثریا کو بھی شرما دیتے تھے۔ اپنے وطن ہندوستان جنت نشان کے حالات پر پہلے بھی وطن پرستوں نے اپنی نگارشات میں اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ آزادی کے ۷۰۔۷۵ سال بعد بھی آج بہت کچھ جوں کا توں ہے۔ اسرار نے بھی اپنے جذبات کا اظہار بڑے ہی پُر اسرار انداز میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

ہم جھانک بھی لیتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام وہ جھونک بھی دیتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اردو کے مختلف شعرا کے اشعار میں ترمیم واضافہ کی صورت حال دیکھیں اور اسرار جامعی کی خلاقی پر عش عش کیجیے۔ بہر حال اب 'چٹنی' ہو یا 'پوسٹ مارٹم' یا 'لیٹر بم'، اب سب بند ہو چکے ہیں اور ان کے دوبارہ جاری ہونے کی کوئی کوشش بھی نہ ہوگی، کیوں کہ اب اسرار خود ہی بند ہو چکے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اور نصرت ظہیر تو پہلے ہی اپنا ہنستا کھیلتا لہلہاتا طنز ومزاح کا باغ چھوڑ گئے۔ ابھی ان کا غم ہلکا بھی نہیں ہوا تھا کہ اسرار جامعی بھی چل بسے۔ مطلب یہ کہ اردو طنز وظرافت کے ایک عہد کا خاتمہ ہوا۔

ہنستا مسکراتا حسن مثنیٰ:

حسن مثنیٰ ہم سے جب بھی ملتا ہنستا مسکراتا ہی ملتا تھا۔ غم کے آثار اس کے چہرے مہرے سے کبھی ہویدا نہیں ہوتے۔ اس وقت بھی نہیں جب وہ آلام ومصائب سے دوچار ہوتا، جب کہ ہر انسان کی طرح اس کی زندگی میں کئی ایسے مواقع آئے جب ہم اس کے غم کو جانتے تھے۔ جب کہ اس کو اللہ نے کئی طرح کی بیماریاں دے کر اسے آزمائش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ حسن مثنیٰ کو کئی طرح کی بیماریاں تھیں جن کو جھیلنے میں اس نے ثابت قدمی کا بخوبی مظاہرہ کیا تھا۔ یہ اس کی ثابت قدمی ہی تھی کہ اس نے کبھی اپنی زبان پر اُف یا آہ جیسے الفاظ کو گستاخی کرنے کا موقع نہیں دیا۔ لہٰذا عام لوگ بلکہ قریبی احباب اور افراد خانہ کو بھی اس کی پریشانیوں کا علم نہیں ہوتا تھا، لیکن وہ مجھ سے اکثر اپنی پریشانیوں کو شیئر کر کے اپنے غم اور پریشانیوں کو شاید کچھ کم یا ہلکا کر لیا کرتا تھا۔ یوں بھی چوں کہ ہم خود نہ جانے کون کون سی بیماریوں سے دوچار ہیں کچھ ہمیں پتہ ہے اور کچھ واللہ اعلم بالصواب۔ کیفیت یہ تھی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے اور کچھ یوں شعر پڑھ کر اپنے اپنے غم غلط کر لیا کرتے:

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو پکارے ہائے گل میں چلاؤں ہائے دل

حسن مثنیٰ عمر میں مجھ سے آٹھ دس سال چھوٹا تھا لیکن جوش وخروش، محنت ولگن اور جانفشانی میں مجھ سے آگے تھا اور حالات چاہے جیسے بھی رہے ہوں وہ ہمیشہ ہنستا مسکراتا ہی ہم سے ملتا رہا اور ہم بھی اس

کے اس بھرم میں مبتلا رہے کہ جیسے وہ بیماریوں سے شفایاب ہورہا ہے اور انشاءاللہ جلد ہی ٹھیک ہوجائے گا۔

حسن مثنیٰ ایک نیک اور شریف النفس انسان تھا اور وہ کبھی میر کے دین و مذہب کو پوچھنے کا قائل نہیں رہا۔ ہاں البتہ وہ شخص ہر کسی سے علیک سلیک کا قائل رہا ہے، حالات کیسے بھی رہے ہوں۔ وہ لکھنے پڑھنے سے کبھی غافل نہیں رہا اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہزاروں میل دور رہ کر بھی ہم سے قریب محسوس ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ جب لکھتا تھا اور پھر چھپتا بھی تھا اور زیادہ چھپنے چھپانے کے سبب وہ جانا جاتا تھا۔ وہ ایک ذمہ دار انسان تھا۔ علاقہ جھارکھنڈ کے رانچی میں بحیثیت لیکچرر وہاں رہنے پر مجبور تھا۔ لیکن اس کا جس قدر نقصان ہوا اس سے کہیں زیادہ فائدہ ملا۔

کسی زمانے میں رانچی علم و آگہی کا گہوارہ رہا ہے اور رانچی یونیورسٹی اور رانچی کالج میں ایسے آفتاب و ماہتاب چمکتے تھے، جو کسی اور شہر کو نصیب نہیں اور رانچی کی اس خاصیت کو لوگ رشک کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد وہاں وہی خاموشی چھا گئی، لیکن حسن مثنیٰ کے وہاں پہنچتے ہی وہاں ماحول پھر لوٹتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ حسن مثنیٰ نے وہاں کئی اہم موضوع پر سمینار کا کامیاب انعقاد کیا تھا۔ سمینار کے علاوہ حسن مثنیٰ نے وہاں کئی اور پروگرام بھی کیے تھے لیکن آج: اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی۔

حسن مثنیٰ اور ہماری مادر علمی جواہر لال نہرو یونیورسٹی جہاں سے اس نے بھی میری طرح ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈگری ملنے کے فوراً بعد اس نے کتابوں کے چھپوانے کا سلسلہ شروع کردیا جو لامتناہی معلوم ہوتا تھا، جس کا اسے فائدہ بھی ہوا۔ موضوع بھی اچھے تھے۔ ایم فل میں اس نے ''مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری'' اور پی ایچ ڈی میں ریڈیو نشریات پر ایک اچھا کام کیا۔

انیس اور انیس شناسی حسن مثنیٰ کی ایک اور اہم اور نہایت قیمتی کتاب ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک مکمل اور بھرپور کتاب ہے ۵۰۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں میر ببر علی انیس کی زندگی اور فن کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مثنیٰ نے مجھ سے بھی انیس پر ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی لیکن اپنی بے جا پریشانیوں اور دیگر وجوہات کی بنا پر میں نے معذرت کرلی تھی۔ میں مثنیٰ کی ادنیٰ سی خواہش کی تکمیل نہ کرسکا، اس کا مجھے ملال تھا۔ لیکن ''انیس اور انیس شناسی'' پر حسن مثنیٰ کی یہ ضخیم کتاب جب چھپ کر آئی تو اس پر میرا مضمون کلیم الدین احمد اور انیس شامل تھا۔ میں حسن مثنیٰ کی اس محبت کا یوں تو پہلے سے ہی قائل تھا اور اب تو اس نے مجھے خرید ہی لیا تھا۔

ہمارے عبید بھائی:

وہ میرا یار تھا، بڑا دلدار تھا، مجھے اس سے پیار تھا، وہ میرا جاں نثار تھا۔ یاری دوستی کا پاسدار تھا۔ وہ شاعر بھی تھا اور ادیب بھی لیکن بنیادی طور پر وہ سائنٹسٹ تھا اور اپنے میدان کا ایک بہترین شہسوار بھی، جس کا کوئی ثانی نہیں تھا، وہ جب اپنی ڈیوٹی پر ہوتا تو اس ڈیوٹی کا حق ادا کردیتا اور ڈیوٹی کے بعد خالصتاً شاعر

ہوجاتا تھا۔شاعری کرتا تواچھی شاعری کرتا میری طرح تک بندی نہیں کرتا تھاچنانچہ اکثروبیشترمیری وہ سرزنش کرتا مگر پیار سے۔''انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو'' کا قائل تھااور ہم سے بھی انہیں اس بات کی توقع ہوتی لیکن ہم کہاں کے دانا تھے جوان سے دانائی کا مطالبہ کرتا ہے:

ہم کہاں کے دانا تھے،کس ہنر میں یکتا تھے   بے سبب ہوا غالب، دشمن آسماں اپنا

یادش بخیر! جب میں آجکل سے منسلک ہوا تب بہت سے لوگ بطور خاص شاعر حضرات جو مجھ سے جڑنے کے لیے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتے اور اپنا الو سیدھا کرتے، لیکن میں ٹھہراLow Profile انسان، چنانچہ ہم نے ان سب کو بھی اپنا دوست جانا جوایک دوست کے بھیس میں یا صاف لفظوں میں کہیں تو یہ سب دوست نما دشمن نکلے۔ہم انہیں دوست ہی سمجھتے رہے اور وہ ہماری جڑیں کاٹتے رہے۔ایسے میں وہ ایک شخص جو میرے لیے اجنبی تھا سفید براق کرتا پاجامہ میں ملبوس، دربغل دارد کتاب مجھ سے ملنے کو بے قرار تھا۔میں اس کی بے قراری کوواضح طور پر محسوس کرسکتا تھا لیکن چونکہ دفتر آجکل کی زیارت کے لیے آنے والوں میں سے بہت سے ایسے شعرا ہوتے جوصرف ہمارا وقت خراب کرنے آتے تھے۔چنانچہ ایسے حالات میں شعرا سے ذرادوری بنا کر ہی رہتا۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں معاصر شاعری کا مخالف ہوں۔

ہاں تو میں گفتگو کررہا تھااس شخص کی جو کرتا پاجامہ پہنے میرے دروازے پر مجسم انتظار کی صورت کھڑا تھا۔میں جوں ہی باہر آیا،اس شخص نے آگے بڑھ کر میرا استقبال کیا۔کچھ اس طرح گویا وہ میزبان ہوں اور میں نو وارد مہمان۔ بہرحال انہوں نے اپنی کتاب 'آواز کے سائے' کی دو کاپیاں دیں اس گزارش کے ساتھ کہ میں اس شعری مجموعہ کو دیکھ لوں اور ہوسکے تو اس پر ایک تبصرہ بھی کردوں۔میں نے جان چھڑانے کے لیے روایتی انداز میں حامی بھرلی،موصوف سے میرا یہ پہلا مختصر تعارف تھا۔یہ تھے ڈاکٹر عبیدالرحمٰن۔

ڈاکٹر عبیدالرحمٰن ہمارے سب سے قریبی اور عزیز دوست تھے اور انہیں ہم سب پیار سے عبید بھائی کہتے تھے۔ہمارے عبیدالرحمٰن انگریزی رسالہ 'انڈین فارمنگ' کے ایڈیٹر تھے جسے وہ بڑے سلیقے سے ترتیب دیتے۔ان کی مطبوعات میں تین شعری مجموعے اور دو سائنسی مضامین کے مجموعے شائع ہوئے۔

وہ بڑے نازک مزاج اور نفاست پسند انسان تھے۔وہ نہ صرف پرمغز مضامین لکھتے تھے بلکہ سائنس جیسے خشک موضوعات کواپنے شاعرانہ مزاج اور اسلوب وبیان سے اسے پرکشش بنادیتے تھے کہ بچے اور بوڑھے سبھی اسے پسند کرتے اور اسے پڑھ کر محظوظ ہوتے۔ میں نے اپنی دوسری تنقیدی کتاب 'تلخ وشیریں' کا مسودہ تیار کرکے ایک سادہ ٹائٹل کور کے ساتھ پریس بھیجنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے مجھے حکماً کہا کہ اس کتاب کا ٹائٹل مضامین کی مناسبت سے تیار کراؤ۔میں نے ان کی بات مان لی اور ایک خوبصورت

ٹائٹل تیار کیا جسے اکثر احباب اور قارئین نے پسند کیا۔

ہمارے عبید بھائی اپنے مخصوص انداز میں اپنے لٹریری فورم سب رنگ کے تحت ادبی محفلیں سجاتے جس میں زیادہ تر شعری نشستیں ہوتیں اور ان محفلوں کی نظامت وہ خود کرتے۔ ایک بار میں نے ان سے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ایک کل ہند مشاعرے کی نظامت بھی کروائی تھی، جسے لوگوں نے عام طور پر سراہا اور پسند کیا۔

یادوں کے کشکول میں جو کچھ یادیں محفوظ رہ گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں آجکل میں ایک عرصہ سے اداریہ لکھتا رہا لیکن کسی بھی اداریہ میں اس کے مخصوص مضامین/موضوعات کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ لہٰذا جب ۲۰۱۲ میں پروفیسر محمد حسن پر ایک شمارہ ترتیب دیا تو اس کا اداریہ بھی بغیر کسی عنوان کے لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر ہمارے عبید بھائی نے مشورہ دیا کہ اس اداریے کو موضوع کے لحاظ سے کوئی عنوان دے دیں تو اچھا لگے گا۔ چنانچہ میں نے اس اداریہ کا عنوان غالب کا مصرعہ:

کیا تیرا بگڑ تا جو نہ مرتا کوئی دن اور

کو بنایا۔ آج غالب کا یہ مصرع خود ہمارے عبید بھائی کو آواز دیتا محسوس ہوتا ہے۔

جنگجو قلم کار: خورشید اکبر

خورشید اکبر سے میرا تعلق کم وبیش ۳۵ سال سے زیادہ پرانا ہے۔ خورشید نے اپنی پہلی ملاقات میں ہی مجھ پر اپنی علمیت، ذہانت اور فطانت کا سکہ جما لیا تھا۔ غالباً ۱۹۸۶ء کی بات ہے۔ ان دنوں میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور خدا بخش لائبریری پٹنہ کی دعوت پر اس کے ریسرچ کانگریس میں شریک تھا میرے ساتھ میرے استاذ پروفیسر محمد حسن بھی شریک تھے۔ ریسرچ کانگریس کے ایک اجلاس میں گفتگو کرتے ہوئے قاضی عبدالستار نے حسب عادت لن ترانی شروع کردی۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ اصل بات کیا تھی لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ انھوں نے بڑے رعونت سے کہا ''میں نئی نسل کو نہیں پڑھتا'' پھر کیا تھا ہال کے ایک گوشہ سے اچانک احتجاجی شور بلند ہونے لگا۔ قاضی صاحب کی بات مجھے بھی بری لگی تھی چنانچہ میں بھی احتجاجیوں میں شریک ہو گیا۔ جب بات بہت بڑھ گئی اور محفل کا رنگ بگڑنے لگا تو میرے استاذ محمد حسن صاحب نے مجھے اشارہ کیا اور میں خاموش بیٹھ گیا۔ لیکن ایک نوجوان پھر بھی اپنے غم وغصہ کا اظہار کیے جا رہا تھا۔ وہ نوجوان کوئی اور نہیں یہی خورشید اکبر تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی لیکن خورشید اکبر نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ اس ہنگامہ آرائی اور احتجاج کی سزا خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر عابد رضا بیدار نے مجھے اس طور پر دی کہ اس موقع پر پڑھے گئے میرے دو مقالے ضائع کر دیے۔ افسوس کہ آج اس کی کاپی بھی بدقسمتی سے میرے پاس محفوظ نہیں۔ خیر بعد میں خورشید نے قاضی عبدالستار کے ساتھ کچھ اور کیا یا نہیں، یہ مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے ابھی دس سال پہلے قاضی صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک توسیعی خطبے

'جدید اردو ناول' پر ان کی علمی بد دیانتی کا بھرپور طریقے سے پردہ فاش کیا۔ مضمون تھا 'قصہ ایک توسیعی خطبہ کا'۔ راشد انور راشد کے قول کے مطابق اپنی وفات سے چند دنوں پہلے وہ ابرار رحمانی سے ملنے کے لیے بے قرار تھے۔ ملنا میں بھی چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی بے چین ہوکر فوراً علی گڑھ جا کر ان کی عیادت کرنے کا فیصلہ کیا لیکن میرے جانے سے پہلے وہ جا چکے تھے۔ البتہ عابد رضا بیدار کو سبق نہ سکھانے کا قلق شاید مجھے ہمیشہ رہے گا۔

خیر بات ہو رہی تھی خورشید اکبر کی۔ خورشید اکبر کو اسی وقت سے میں نے ادب کا جنگجو کہنا شروع کر دیا۔ جنگجوئیت مجھے بھی پسند ہے اس لیے کہ میں خود بھی جنگجو خصلت رہا ہوں۔ بعض لوگ ہمیں ادبی دہشت گرد بھی کہتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو خورشید اکبر ہم سے بڑا ادبی دہشت گرد ہے۔ اس لیے کہ ہم نے اگر دو چار دھماکے کیے ہیں تو خورشید اکبر نے آٹھ دس دھماکے کیے ہیں۔ دو تین دھماکے کی گونج تو اب تک ایوان ادب میں سنی جا رہی ہے۔ 'آسماں محراب یا شاعری کی مٹی خراب' کی گونج ابھی ماند بھی نہیں پڑی تھی کہ مظہر امام صاحب کی شاعری 'مظہر امام شاعری کی پچھلی صف کا مقتدی' نشانے پر لے کر تابڑتوڑ گولیاں داغ دیں۔ اس کے علاوہ بھی اور نہ جانے کہاں کہاں ڈھکے چھپے طریقے سے سرنگیں بچھائیں اور دھماکے کیے۔ خدا معلوم۔ مستقبل قریب میں موجودہ ادب کے سب سے بڑے منیجر کے خلاف دھماکہ کرنے کی تیاری کی اطلاعات مصدقہ ذرائع سے موصول ہوئی ہیں۔

پٹنہ ہے ہی ایسی سرزمین جہاں مصلحتوں کے پودے نہیں پنپتے۔ حالاں کہ وہاں بھی مصلحت اور خوشامد پسند فضا کو مسموم کرتے رہتے ہیں لیکن حق اور انصاف کی فصلیں ہمیشہ لہلہاتی رہی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں وہاں سے شوکت نامی دہشت گرد کے تعلق سے کچھ ایسی ہی خبریں ملی ہیں۔ پٹنہ میں ایک جگہ ہے سبزی باغ جہاں سبزی نہیں بلکہ ادیب و شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ میرے نام سے وہیں ایک ہوٹل ہے 'رحمانیہ ہوٹل' جہاں ایک کپ چائے کی پیالی پر تنظیم بنتی ہے۔ اور دوسرے کپ چائے کی پیالی پر ایک مشاعرہ بھی برپا ہو جاتا ہے۔ مجھے ایک ایسا ہی مشاعرہ خورشید اکبر کے ساتھ سننے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ جہاں خورشید کو اپنی غزل سنانے کی پاداش میں چائے کے ساتھ وائے کا بھی اہتمام کرنا پڑا تھا۔ اب اسی سبزی باغ میں رحمانیہ کی جگہ قبرستانیہ ہوٹل نے لے لی ہے۔ چونکیے نہیں۔ دراصل وہاں ایک چھوٹا سا عیسائی قبرستان ہے (اور جواب استعمال میں نہیں) جہاں ایک ٹی اسٹال ہے اور اب پٹنہ کے ادیب رحمانیہ کے بجائے قبرستانیہ کو ترجیح دینے لگے ہیں کیوں کہ اب یہی جگہ گوشہ عافیت یا پریم آشرم کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

اس گوشہ عافیت میں بھی ہمارے سرگرم، فعال اور متحرک ادیب اپنے اپنے جوہر اور جولانی طبع کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں کبھی کبھی تو یہ مظاہرے اتنے واشگاف اور تلخ ہوتے ہیں کہ قبرستانیہ کے مردے بھی پناہ مانگتے ہوں گے اور بے ساختہ یہ مصرع گنگنانے لگتے ہوں گے:

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایسی ہی ایک بے تکلف محفل قبرستانیہ میں ادبی دہشت گردوں میں کچھ کہا سنی ہوگئی پھر کیا تھا آؤ دیکھا نہ تاؤ، لگے ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کرنے۔ معلوم ہوا کہ اس جھڑپ میں الخالد اور الاکبر نامی دہشت گردوں کو کافی چوٹیں آئیں۔ غرض ہمارے ادبی دہشت گرد دوستوں کی دہشت گردی کے نہ جانے اور ایسے کتنے قصے مشہور ہیں جن میں خورشید اکبر خاص ہیں۔

ذوقی معاصر فکشن کا نمائندہ:

ذوقی سے ہمارا تعلق آجکل میں آنے سے اور پہلے کا رہا ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ہم ایک سہ ماہی رسالہ نکالا کرتے تھے۔ چند ہم خیال دوستوں کے ذوق وشوق اور محنت کا نتیجہ تھا۔ ذوقی نے ہمارے رسالے 'پیش رو' کو دیکھا اور اپنی پسندیدگی کا مظاہرہ کیا۔ ہم نے بھی ان سے ایک مختصر کہانی کی فرمائش کر دی۔ کہانی کا عنوان تھا 'فنی لینڈ' اس عنوان کا جو حشر ہونا تھا اور جس کا ہمیں خدشہ تھا وہ ہمیں پہلے سے معلوم تھا کیونکہ کاتب نے اپنی حرکت سے، اپنی خصلت یا جبلت کا مظاہرہ کر دیا تھا۔

ذوقی جس قدر زودنویس تھے اتنے ہی بسیار نویس بھی۔ ایک رات میں ایک کہانی تیار، تو ایک ہفتہ میں ایک ناول۔ انہوں نے لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیا تھا۔ شروع شروع کے دنوں میں ان کے اس ڈھیر میں سے قیمتی اور کام کی چیز نکالنا کارے دارد تھا۔ لیکن پھر یہ ان کی عادت ثانیہ بن گئی تھی اور روز روز کی مشق سے ان کی تحریریں اتنی صیقل اور چمک دار ہوگئیں کہ لوگ انہیں پسند کرنے لگے۔ ذوقی کو اردو ادب میں یہ مقام اگر ان کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے تو وہیں ان کی دبنگ مزاجی اور حاضر جوابی نے بھی انہیں ایک خاص شکل عطا کی تھی۔

بھلا اہل ادب کب مانتے تھے　　بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

ذوقی دوٹوک بولتے تھے اور دوٹوک لکھتے بھی تھے۔ نہ زمانہ ساز تھے اور نہ زمانہ باز اپنے کام سے کام رکھا اور آگے بڑھتے گئے۔

ان کی ابتدائی تخلیقات میں ''شہر چپ ہے'' شامل ہے۔ یہ ناول برائے تبصرہ میرے مطالعہ میں آیا تو میں نے اس ناول پر سخت تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ سن بلوغت کو پہنچ رہے کسی نو آموز کا کارنامہ ہے۔

ذوقی نے میرے اس ریمارکس کا برا نہیں مانا بلکہ اعتراف کیا کہ اس ناول کو شائع نہیں کروانا چاہئے تھا، یہ جلد بازی میں اٹھایا گیا ان کا ایک غلط قدم تھا۔ چنانچہ بعد کے ان کے ناولوں میں بیان، نیلام گھر، ذبح وغیرہ ان کے پختہ فن اور طرز نگارش کا نمونہ ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد اردو کہانی پر خاص طور پر ۸۰ کے بعد کی کہانیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا تھا: ''مشرف عالم ذوقی بلاشبہ نئی کہانی کا ایک اہم نام ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ موجودہ نسل کی فوج کے وہ سپہ

سالار ہیں تو غلط نہ ہوگا، بیان تو خیران کا ایک دستاویزی ناول ہے۔ انہوں نے اور بھی کہانیاں لکھی ہیں لیکن یہیں یہ بات بھی کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ بسیار نویسی نے جہاں ان کی شناخت قائم کی وہیں انہیں خراب بھی کیا ہے۔

یادش بخیر! میں نے ۹؍اکتوبر ۱۹۹۱ کو سروس جوائن کی تھی۔ ایڈمنسٹریشن کی ہدایت کے مطابق اردو شعبہ میں بیٹھنے لگا۔ اس وقت محبوب الرحمٰن فاروقی اور خورشید اکرم 'آجکل' میں اور عابد کرہانی 'یوجنا' میں کام کر رہے تھے۔ اتفاق سے تینوں چھٹی پر تھے۔ اسی اثنا میں ۲۴؍اکتوبر ۱۹۹۱ء کو عصمت چغتائی کا انتقال ہو گیا۔ چونکہ میں ان دنوں فراغت سے ہوا کرتا تھا تو بیٹھے بیٹھے میں نے عصمت چغتائی پر ایک نظم لکھ ڈالی۔ جب ہمارے یہ سینئر حضرات چھٹی سے واپس اپنی ڈیوٹی پر آ گئے تو ہماری پریشانی دور ہوئی۔ ورنہ ہم تنہائی کے شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ آجکل کے ایڈیٹر محبوب الرحمٰن فاروقی نے مجھے 'آجکل' میں کام کرنے کی ہدایت دی اور میں آجکل میں بحیثیت سب ایڈیٹر کام کرنے لگا۔ مشرف عالم ذوقی اس وقت تقریباً روزانہ ہی دفتر آجکل آیا کرتے تھے۔ ذوقی چونکہ بہت دلچسپ اور حاضر جواب انسان تھے چنانچہ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں نے عصمت چغتائی کے انتقال پر ایک نظم لکھ کر انہیں بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے تو انہوں نے نظم سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے پوری نظم سنائی اور انہوں نے چھوٹتے ہی کہا کہ اس نظم کا عنوان 'دوزخی' کے نام رکھ لیں تو یہ عصمت کے حسب حال ہوگا اور میں نے ایسا ہی کیا۔

شوہر کے تعاقب میں:

تبسم فاطمہ ذوقی کی اہلیہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والی ایک پیاری اور دلنواز شخصیت تھیں۔ تبسم اور ذوقی دونوں ایک دوسرے کو اس قدر محبت کرتے تھے کہ ہم سب کے لیے ایک مثال تھے۔ یہ قدرت کا کرشمہ ہی ہے کہ تبسم ذوقی کے جانے کے دوسرے دن ہی کوچ کر گئیں۔ ذوقی کی طرح وہ بھی کہانیاں لکھتی تھیں لیکن ذوقی کی طرح زود نویس یا بسیار نویس نہیں تھیں مگر کہانی کے فن اور فکر میں ان کا اتباع کرتی تھیں۔ غیر محسوس طرز یقے پر تبسم کی کہانیوں میں اس کا عکس آتا رہا ہے۔ ٹی وی کے لیے ڈرامے اور سیریل وغیرہ کا کام دونوں مشترکہ طور پر کرتے تھے۔ بعض معاملات میں وہ ذوقی سے آگے کی چیز تھیں۔ وہ سیاسی اور صحافتی سوجھ بوجھ بھی رکھتی تھیں اور اخبار کے لیے ہفتہ وار کالم بھی لکھا کرتی تھیں۔

ایک مدت سے تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں — اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

شوکت اردو افسانہ:

یہ سنہ ستری افسانہ نگار شوکت حیات بیسویں صدی کے آخر تک بہت فعال رہے لیکن پھر اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ وہ مرجھا سے گئے اور کچھ ایسے مرجھائے کہ پھر پنپ نہ سکے۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی یا شوکت بھائی کا خود کردہ عمل تھا۔ خدا جانے۔ وہ جتنے قلم کے دھنی تھے اتنے ہی اپنے گفتار میں بھی ماہر

تھے۔ چنانچہ ہر شام جب ہم پٹنہ کے سبزی باغ کے رحمانیہ ہوٹل میں پہنچتے تو وہاں باہر سے ہی شوکت حیات کی آواز سنائی دیتی تھی۔اس وقت ہم کیا اور ہماری بساط کیا؟ چپکے سے اپنے دوستوں کے ساتھ چائے پی کر نکل لیا کرتے تھے۔ وہ جب بحث کرتے تو مجال ہے کہ کوئی ان کے سامنے ٹک سکے۔لیکن پھر وہ بھی وقت آیا جب دھیرے دھیرے ان کا سورج غروب ہونے لگا۔

جب میں رسالہ 'آجکل' میں آیا تو وہاں ان سے باضابطہ ملنے ملانے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور نتیجہ بایں جارسید کہ وہ مجھ کو اپنا چھوٹا بھائی کہنے لگے۔ان کے ہاتھ میں قلم تو رہا لیکن قلم کا استعمال کب کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے اور کتنا کرنا ہے، شاید اس کا اندازہ وہ نہیں کر سکے۔دراصل وہ ایک معصوم اور نرم دل انسان تھے۔

جب بھی ان کی طبیعت ٹھیک ہوتی وہ ہمیں فون ضرور کرتے اور لمبی لمبی باتیں کیا کرتے تھے۔اہلیہ یہ دیکھ کر اوب سی جاتیں۔ کچھ ہی دن پہلے انہوں نے مجھ سے اپنے بیٹے کے لیے میری بڑی بیٹی کا ہاتھ مانگا تھا۔لیکن میری بیٹی کی شادی کی تاریخ طے تھی۔ کچھ دنوں بعد شوکت حیات سے جب میری ملاقات ہوئی تو شکایتی لہجے میں کہا کہ تم نے مجھے سمدھی کیوں نہیں بنایا۔اس کے بعد انہوں نے بیٹے کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیے۔لیکن اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیا چگ گئی کھیت۔

جہاں تک ان کی فکر وفن کا سوال ہے تو بلاشبہ ان کا فن سن ستر سے ہی پنپنا شروع ہو گیا تھا جس کا نقطۂ عروج 'گنبد کے کبوتر' ہے۔ جو آجکل میں شائع ہوا اور 'کتھا ایوارڈ' سے نوازا گیا۔لیکن ایسا پھر کیا ہوا کہ انہوں نے قلم ہی بند کر دیا۔حالانکہ بابری مسجد کے بعد بھی کئی مسائل سامنے آئے جن پر ہمارے قلم کاروں نے اپنی فنکاری کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ سچ ہے ہر عروج را زوال۔

شوکت حیات کی فکر وفن پر بہت سے ناقدین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ میں نے بھی ایک مقالہ 'دیباچہ ایک غیر مرتب افسانوی مجموعہ کا' لکھا۔ جسے پہلے ایک رسالہ نے شائع کیا پھر بھیونڈی کے رسالہ تکمیل میں گوشۂ 'شوکت حیات' میں شائع ہوا۔لیکن یہاں عنوان بدل کر شوکت حیات کے افسانے کر دیا گیا۔'دیباچہ ایک غیر مرتب افسانوی مجموعہ کا' کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ ہوا یوں کہ بہت پہلے شوکت بھائی نے بہار اردو اکیڈمی سے اپنا افسانوی مجموعہ چھپوانے کے لیے مالی تعاون لیا تھا لیکن وہ پیسہ کھا پی کر بیٹھ گئے اور افسانوی مجموعہ ایک عرصہ تک منتظر اشاعت رہا۔لیکن جب میں نے اپنا یہ مضمون شائع کرا دیا تو وہ بڑے فکرمند ہوئے۔ بالآخر ان کا مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہوا۔ یہی مجموعہ/کہانی ان کا نقطۂ عروج تھا اور یہی ان کی فکر وفن کا نقطۂ انجماد بھی۔

یہیں ایک واقعہ کا ذکر کرتا چلوں کہ ان کی بہت ساری خوبیوں یا خرابیوں میں ایک بات یہ تھی کہ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے وہ بانگ دہل اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ جب میرے اداریہ لکھنے پر پابندی لگا دی گئی تو قارئین

آجکل نے دہلی سے لے کر پٹنہ تک اس کے خلاف احتجاج کیا۔ پٹنہ میں باضابطہ مشتاق احمد نوری نے ایک احتجاجی محفل آراستہ کی جس کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی کرر ہے تھے۔اس محفل میں شوکت حیات نے اپنے روایتی انداز میں زوردار اور بلند آواز میں اپنی بات کہی کہ اداریہ لکھنا ایک ایڈیٹر کا بنیادی حق ہوتا ہے اور اس سے اتفاق یا اختلاف قارئین کا حق ہے۔شوکت حیات کی یہ باتیں یاد آتی رہیں گی۔وہ ہمارے دلوں میں محفوظ رہیں گے۔

ایک فعال ادیب:

مناظر عاشق ہرگانوی آخر دم تک فعال ومتحرک رہے۔انہوں نے اپنی ساری زندگی لکھنے پڑھنے اور چھپنے چھپانے میں گزار دی۔ان کی تصانیف کی تعداد کم وبیش 250 بتائی جاتی ہے۔جن میں تالیف، تحقیق،تنقید اور تصنیف سبھی کچھ شامل ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ وہ ان ہزاروں اردو والوں کا قرض چکا رہے تھے جنہوں نے اردو کی روٹی تو کھائی لیکن اردو کے لیے انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔مزے کی بات یہ ہے کہ ہرگانوی صاحب کورونا وائرس پر کم ازکم تین کتابیں فوری طور پر شائع کرائیں۔کورونا وائرس افسانچے،کورونا وائرس لطیفے،کورونا وائرس منظوم۔ستم ظریفی یہ ہے کہ پھر بھی کورونا دیوی نے انہیں نہیں بخشا۔

ایک ہی زلف گرہ گیر کے اسیر

وہ بھی کیا دن تھے جب میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں کلیم الدین احمد کی تنقید پر پی ایچ ڈی کر رہا تھا،کلیم الدین احمد کا اردو تنقید سے متعلق یہ جملہ بہت مشہور ہوا کہ ”اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر“۔اس وقت ہم عمر کی اس منزل میں ہوتے ہیں جب ہم موہوم کمر کی تلاش میں سوتے جاگتے سرگرداں رہتے ہیں اور لڑکیاں بھی اس کے معیار پر کھرا اترنے کے لیے جانے کیا کیا کچھ کرتی رہتی ہیں۔اس بیچ وہ تاک جھانک بھی کرتی رہتی ہیں۔انہی دنوں ایک خوبصورت حسینہ نے میرے اردگرد منڈلانا شروع کیا،اسے شاید یہ نہیں معلوم تھا کہ میں شادی شدہ ہوں۔وہ میری جونیئر تھی لہٰذا میرا رویہ اس کے ساتھ مشفقانہ اور دوستانہ تھا۔ایسے میں اس کہانی میں ٹوئسٹ اس وقت آیا جب پیغام آفاقی نے اپنی پولیس جیپ کو لے کر جے این یو میں منڈلانا شروع کیا اور میری اس دوست کو اپنے ساتھ باہر لے جانے لگے۔وہ حسینہ بھی وقت گزاری کے لیے اپنے اس عمل کو تفریح خیال کرتی تھی لیکن آخر کب تک۔پیغام جو اپنے آفس میں اختر علی فاروقی کے اصل نام سے جانے جاتے تھے،ان کے سینئر/باس کو اس بابت معلوم ہوا چنانچہ انہیں تنبیہ ملی تب جا کر انہوں نے جے این یو میں آنا اور اس سے ملنا اور پھر تفریح کے لیے باہر لے جانے میں کمی کر دی۔قصہ مختصر یہ کہ ہم دونوں یعنی میں اور پیغام ایک ہی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے۔

اختر علی فاروقی نے اپنا قلمی نام پیغام آفاقی بہت سوچ سمجھ کر رکھا تھا۔شاید پیغام کا خیال تھا کہ وہ جو کچھ بھی اپنی تحریر میں پیش کر رہے ہیں اس پیغام کی حیثیت آفاقی ہے۔اور سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے

اپنے نام کی لاج رکھ لی۔انہوں نے اردو کے ذخیرے میں دو ناول 'مکان' اور 'پلیتہ ' جیسی شاہکار تخلیقات کا اضافہ کیا۔اس کے علاوہ افسانوی مجموعہ 'مافیا' اور شعری مجموعہ 'درندے' کے نام سے شائع ہوئے۔

پیغام آفاقی ان خوش نصیب فکشن نگاروں میں سے ہیں جو اپنے پہلے ہی ناول سے مشہور ہوئے اور جو شہرت انہیں مکان سے ملی وہ بعد کے ناول سے نہیں مل سکی، جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری کارنامے کے طور پر 'پلیتہ ' کے نام سے شائع کرائی۔یہ بھی ان کی عین خوش نصیبی ہی تھی کہ انہیں قاضی عبدالستار جیسا ناول نگار بحیثیت استاد اور ناقد میسر آیا۔مجھے قاضی عبدالستار کا وہ توسیعی خطبہ یاد ہے جو قاضی صاحب نے ''ہمعصر اردو ناول'' کے عنوان سے ۲۶ راگست ۲۰۰۳ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دیا تھا۔جس میں قاضی صاحب نے صرف چار ناول نگاروں کے نام لیے تھے ان میں قرۃ العین حیدر، عزیز احمد اور الیاس احمد گدی کے ساتھ پیغام آفاقی کا نام بھی لیا تھا۔حالانکہ ان کے اپنے عزیز شاگرد غضنفر بھی فعال اور متحرک ہیں۔قاضی صاحب بلا شبہ اپنے عزیز شاگردوں میں گرچہ غضنفر کو شمار کرتے تھے لیکن پیغام آفاقی سے شاید انہیں زیادہ قربت رہی۔عام طور پر آفاقی کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ وہ اردو کے طالب علم رہے ہیں جب کہ ایسا نہیں۔پیغام آفاقی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہسٹری کے اسٹوڈنٹ تھے جہاں مشہور تاریخ داں عرفان حبیب ان کے استاد تھے۔

پیغام آفاقی بچپن سے ہی تنہائی پسند تھے اور عام بچوں کے ساتھ کھیل کود میں کم ہی شریک ہوتے تھے ۔فٹبال اور کرکٹ گراؤنڈ پر کسی ناول یا افسانے کے پلاٹ کو ترجیح دیتے تھے۔ان اوقات میں وہ مطالعہ اور غور و فکر کیا کرتے تھے۔مطالعے کے نتیجے میں حاصل کردہ تجربات و مشاہدات کو مناسب موقع سے استعمال کر لیا کرتے تھے۔

تیزی سے ابھرتا ادیب و استاد:

مولا بخش جیسے سخت جان انسان کو بھی نہ چھوڑا جو اس سے پہلے کم از کم دو تین بار موت کی سرحد سے واپسی کر چکے تھے۔مولا بخش ہمارے دیرینہ رفیق رہے ہیں۔مجھے معلوم ہے کہ رات میں کیسے ان کے پیٹ میں تو کبھی ان کے سینے میں اتنی شدید تکلیف ہوتی کہ ان کی اہلیہ نے ان کی زندگی کی آس ہی چھوڑ دی تھی لیکن وہی خاتون کسی طرح اس سناٹی رات میں اپنے خاوند مولا بخش کو لے کر اسپتال پہنچی اور دوا علاج کے بعد زندہ سلامت واپس گھر لے کر آتیں۔

دراصل مولا بخش بڑی جدوجہد کے بعد کامیابی و کامرانی بھری زندگی کو حاصل کرنے والوں میں سے تھے لیکن جب وہ اس پوزیشن میں آئے کہ عیش کوشی یا عیش پرستی کی طرف ان کے قدم آگے بڑھیں، خدا نے انہیں اپنے خاص بندے کی طرح اپنے پاس بلا لیا۔

مولا بخش نے اپنے کیریئر کے شروعات میں جب وہ کامیابی کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اس وقت انہوں نے مجھ ناچیز پر میری کتاب کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ کے حوالے سے ایک

طویل مضمون لکھا تھا۔ یہ میرے مزاج کے خلاف ایک لایعنی عمل ہے، پھر بھی مولا بخش کے اس خلوص سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مولا بخش کو مجھ خاکسار سے کسی فیض کی توقع رہی ہو۔ مولا بخش اردو کے موجودہ منظر نامے میں تیزی سے ابھرنے والے اسکالرس میں سے تھے۔ انہوں نے دہلی کے دیال سنگھ کالج سے بطور لیکچرار اپنے کریئر کا آغاز کیا تھا اور اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔

اونچی اڑان کا عقاب:

ظفرالدین اونچی اڑان کا تیز طرار پرندہ تھا۔ وہ اونچی اڑان والے ایسے عقاب تھے جن کو اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔ ظفرالدین نے 'قومی آواز' میں بطور کاتب اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ لیکن وہ جلد ہی بھاگ کھڑے ہوئے یہ محض ان کی قسمت تھی یا خدا کی خاص نوازش کہ انھیں مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی حیدرآباد کے بانی وائس چانسلر شمیم جے راج پوری کے ہمراہ حیدرآباد پہنچ گئے۔ پی ایچ ڈی تو تھے ہی اپنی تقرری کروالی۔ اور بن گئے وہ بانی لیکچرر پھر جلد ہی وہ پروفیسر بھی ہو گئے اور ڈین بھی لیکن موت نے انھیں مزید مہلت نہیں دی۔ ورنہ کوئی بعید نہیں کہ وہ وائس چانسلر بھی ہو جاتے۔ مولانا آزاد یونیورسٹی کے بنیاد گزاروں میں ان کا بھی نام لیا جاتا ہے۔

خوش مزاج اور زندہ دل انسان:

رضوان قیصر جو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تاریخ کے استاذ تھے وہ میرے دیرینہ رفیق تھے اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ بڑے ہی خوش مزاج، زندہ دل اور یار باش قسم کے انسان تھے۔ کچھ دنوں پہلے عرصے دراز کے بعد انڈیا گیٹ پر ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو ہم دونوں ہی بہت خوش ہوئے لیکن رضوان کی بے خودی دیکھئے کہ انھوں نے وہاں کی تیز رفتار ٹریفک کو نظر انداز کرتے ہوئے اسٹیرنگ چھوڑ کر مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے فوراً اشاروں سے تنبیہ کی کہ یہاں مناسب نہیں۔ انھوں نے میری بات آسانی سے مان لی۔ یہ کسے پتہ تھا کہ وہ ملک الموت کی بات بھی اتنی جلدی مان لیں گے۔

عبدالصمد فکشن کا مزدور

خیر سے جدیدیت کی اَکہانی کا دور بہت مختصر ثابت ہوا اور جلد ہی اردو کہانی ماجرا نگاری کے ساتھ پھر سے جلوہ افروز ہوئی۔ سن ستر میں ماجرا نگاری یا قصہ گوئی کے ساتھ کہانی لکھنے والوں کا ایک طویل سلسلہ سامنے آتا ہے جن میں حسین الحق، شوکت حیات، ذکیہ مشہدی، شفیع جاوید، انجم عثمانی، مشرف عالم ذوقی، خورشید اکرم، پیغام آفاقی، غضنفر، شموئل احمد، علی امام نقوی، عابد سہیل، نیر مسعود، اقبال مجید، اقبال متین اور عبدالصمد کے علاوہ بھی اور بہت سے نام شامل ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی جنہوں نے ادب میں جدیدیت کی گھٹن کو بڑھاوا دیا تھا جو لایعنی علامات واستعارات کے داعی تھے اور کہانی

کے نام پرا کہانی کوفروغ دینے کے سب سے بڑے علم بردار رہے،انہوں نے جب کہانی لکھنی شروع کی تو وہ ماجرانگاری اورکہانویت سے بھرپورتھی۔صحیح ہے کہ خداجب جسے چاہے،راہ راست پر لے آئے۔

۱۹۷۰ء میں سامنے آنے والے کہانی کاروں میں عبدالصمد ایک اہم نام ہے۔عبدالصمد کی یہ خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے جب قلم سنبھالا تو جدیدیت کا کہرا چھٹ چکا تھا۔چناں چہ انہوں نے بارہ رنگوں والا کمرہ،اور پس دیوار جیسے افسانوی مجموعوں کے علاوہ ناول ’دوگز زمین‘اور’مہاتما‘ تخلیق کئے۔ان چاروں کتابوں کے منظرعام پر آنے کے بعدان کی شناخت مستحکم ہوچکی ہے۔عبدالصمد کی کہانیوں کا موضوع خواہ نفسیاتی ہو،اقتصادی ہو،صارفی ہو یا روحانی ہو،ان سبھی کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں سیاست سے ضرور ملتے ہیں۔عبدالصمد خود سیاست سے جڑے ہوئے ہیں۔سیاسی گلیاروں کے چکر لگاتے رہتے ہیں لیکن ان میں اتنی جرأت ہے کہ وہ سیاست کی بدعنوانیوں کو آشکارا کرسکیں۔ساتھ ہی ان موضوعات کو برتتے ہوئے وہ فن کی پاسداری سے بھی غافل نہیں ہوتے۔ان کی فکر سیاسی ضرور ہے لیکن فن کا پیمانہ بھی وہ چھلکنے نہیں دیتے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا فکروفن سیاست اورادب کا حسین امتزاج اورسنگم ہے۔

اقبال حسن آزادایک فعال ادیب:

معروف ادیب وشاعراورمضمون نگارجناب اقبال حسن آزاد بہار کے نالندہ ضلع کے باشندہ ہیں اور فی الحال مونگیر میں مقیم ہیں۔انھوں نے اپنا تعلیمی سفرانتہائی صبرواستقلال کے ساتھ کبھی دربھنگہ کے لہریاسرائے سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تو کبھی بہارشریف سے ان کی اسکولنگ ہوئی۔پٹنہ سے انھوں نے ہائی سیکنڈری اور کلکتہ سے بی اے اردو آنرس اور پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔پی ایچ ڈی انھوں نے بہار یونیورسٹی مظفرپور سے حاصل کی۔جے آر ایس کالج جمال پورمونگیر سے پرنسپل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔وہ افسانے اور تحقیق میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں،لیکن ان دنوں وہ فیس بک پر اکثر شعروشاعری بھی کرتے نظرآجاتے ہیں۔ افسانے انھوں نے خوب کہے ہیں۔چھپنے چھپانے کا بھی شوق رہاہےاوراپنی علمی پیاس وہ بجھانے کے لیےادبی مجلّہ سہ ماہی’’ثالث‘‘ کا اجرا کیا۔جسے وہ بڑی محنت لگن اورسعی پیہم سے سہ ماہی تو نہیں اب عملاً ششمائی اورسالانہ کی شکل میں پابندی سے نکالتے ہیں۔مجلّہ کی ہمیشہ لحیم وشحیم نظرآتا ہے۔حالیہ شمارہ شوکت حیات پرخاص ہے۔

ان کے اب تک تین افسانوی مجموعے’’قطرہ قطرہ احساس‘‘ ۱۹۷۷ء’’مردم گزیدہ‘‘ ۲۰۰۵ءاور پورٹریٹ ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئے اور عام طور پر قارئین نے انھیں پسند کیا۔انھوں نے اردو نثر میں طنزو مزاح کی روایت پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔’’نثری اصناف ادب اورطنزومزاح کی روایت‘‘ ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔جہاں تک افسانے کا تعلق ہے یہ ان کا خاص میدان رہاہےاوراس میں انھوں نے اپنی فنکاری کا خوب خوب مظاہرہ کیاہے۔اب وہ درس وتدریس کے فرائض سے سبکدوش ہوچکے ہیں تو ہم امید

کرتے ہیں کہ وہ اب افسانے نہیں بلکہ ناول اور ناولچہ بھی تخلیق کریں گے۔ ہمیں اس کا انتظار رہے گا۔

حسن نواب کی یادیں:

حسن نواب حسن کی شخصیت پٹنہ کے حلقۂ ادب میں کافی مقبول رہی ہے۔ یہ ان کی مقناطیسی شخصیت کا کمال ہے کہ ہم ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ہم جب بھی پٹنہ پہنچتے تو گویا وہ مجھے اغوا کر لیتے اور پھر جہاں چاہتے لے جاتے ہیں۔ اکثر ایسے لوگوں سے ملواتے جن سے مل کر ہمیں یقیناً خوشی ہوتی۔ وہ کچھ اتنا اور اس قدر اپنائیت کا مظاہرہ کرتے کہ لوگ ان کے بے دام کے غلام ہو جاتے۔ وہ اکثر ایسے ادیبوں اور شاعروں سے ملواتے جو اپنے اپنے شعبوں میں شہرت وشناخت رکھتے تھے۔ حسن نواب حسن زود گو تھے اور نہ ہی بسیار نویس۔ اپنی بساط بھر جو کچھ بھی لکھتے تھے ٹھوک بجا کر لکھتے تھے۔ چنانچہ ان کو جس قدر بھی قارئین میسر آئے وہ حسن نواب کی اسی نوابی شان کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا انہوں نے نہ تو اپنی کتابوں کی اشاعت کی طرف دھیان دیا اور نہ ہی اپنی شاعری کی اشاعت کے لیے کسی ادارے یا رسالے کو پریشان کیا۔ حسن نواب بیشک کم لکھتے تھے لیکن جب بھی جو کچھ بھی اور جس قدر بھی لکھتے وہ اچھا لکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ مستعد اور تیار رہتے تھے۔ سرراہ چلتے پھرتے انہیں ایسے واقعات دیکھنے کو مل جاتے جو کسی نہ کسی طور پر انہیں متاثر کرتے اور وہ واقعات کو کہانی بنانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ وہ جس فارم میں بھی اپنی بات رقم فرماتے تھے اس کو کوئی نام دینا بھی کار دارد تھا۔ آج کل کے پورے ایک صفحہ پر حسن نواب حسن اس چیز کو پیش کرتے تھے اور انہیں اس بات کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ قارئین تک آپ کے جذبات واحساسات پہنچ بھی پارہے ہیں یا نہیں۔

حسن نواب بڑے دوست نواز اور یار باش انسان تھے اور دوستی میں وہ کبھی عمر کے تفاوت کو مدنظر نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے، بچے اور بوڑھے سب میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ انہوں نے شاید مذاق ہی مذاق میں ۱۲ راشعار پر مشتمل ایک بھرپور نظم لکھ ڈالی۔ بڑے خلوص اور محنت کے ساتھ ناچیز پر کئی شاعروں نے قصیدہ نما نظمیں لکھی ہیں لیکن حسن نواب حسن کا ہے انداز بیاں اور۔ حسن نواب حسن سے اتنے گہرے اور مضبوط مراسم ہو گئے تھے کہ انہوں نے ناچیز ابرار رحمانی پر پوری ایک نظم رقم کر دی۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

شخصیت ان کی مری نظروں میں حیرانی کی بات　　　لکھنا مشکل ہے بہت ابرار رحمانی کی بات

اسی طرح جب میری بیٹی کی شادی ۲ اپریل ۲۰۱۵ کو ہوئی تو اس موقع سے حسن نواب نے ایک خوبصورت، طویل اور جذباتی 'رخصتی نامہ' بھی لکھا۔ 'سہرا' پہلے ہی ابراہیم اشک نے لکھ بھیجا تھا۔ یہ ان کے خلوص ومحبت کی دلیل ہے۔

◆ ● ◆

Tazeen Aptt. 179/22, Zakir Nagar
New Delhi- 110025
Mob: 9911455508 / 8860944899

● پروفیسر صفدر امام قادری

معاصر اردو فکشن: مسائل و امکانات

[ہم عصر اردو فکشن کا تنقیدی مقدمہ]

جدید، مابعدِ جدید اور معاصر ادب: شناخت کا پیمانہ:

ادب کی تاریخ میں بعض ایسی اصطلاحات رائج رہی ہیں جن کا دائرۂ کار وسیع، ہمہ گیر، متنوع ہونے کے ساتھ ساتھ بسا اوقات مختلف طرح کے تنازعات کا باعث بھی ثابت ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف دوم میں ''جدید'' اور ''نیا'' جیسے الفاظ علوم وفنون کے حلقے میں چکر کاٹنے لگے تھے۔ ایک صدی گزرنے کے باوجود ہماری زبان میں اب تک یہ اصطلاحات رائج نظر آتی ہیں۔ سرسید کے زمانے میں جدید کے جو معنی تھے، محمد حسین آزاد تک آتے آتے اس کے مطالب بدل گئے۔ حلقۂ اربابِ ذوق ہی نہیں، ترقی پسند تحریک کے دور میں بھی بار بار ''نیا'' اور ''نئی'' جیسے الفاظ ادب اور سماجیات کے شعبوں میں خوب خوب کُھلے ملے رہے۔ پریم چند نے ترقی پسندوں کی انجمن کے تاسیسی پروگرام میں جو خطبۂ صدارت پیش کیا، وہاں بار بار 'نیا ادب' کا ذکر آتا ہے۔ سجاد ظہیر نے اس تحریک کے ترجمان کے طور پر جو رسالہ نکالا تو اس کا نام ''نیا ادب'' ہی تھا۔ اس زمانے میں ترقی پسند ادب کی شناخت کے لیے 'نیا ادب' کی اصطلاح بالعموم استعمال ہوتی تھی۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ خود غالی قسم کے ترقی پسند بھی ترقی پسندی سے کچھ کم 'نئے ادب' کی اصطلاح کا استعمال نہیں کر رہے تھے۔ نظمِ جدید اور نئی نظم کی بھی اصطلاحیں ہماری تاریخ میں ایک خاص مدّت سے موجود رہی ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد اردو میں جو نئی ادبی تحریک سامنے آنے لگی، اسے تو 'جدیدیت' ہی کہتے ہیں۔ کسی لغت میں 'نیا' اور 'جدید' کے معنٰی الگ الگ نہیں تلاش کیے جا سکتے۔ یہ خلفشار صرف اردو سے متعلق نہیں بلکہ دنیا بھر کی زبانوں میں، خاص طور پر ادب، لسانیات اور سماجی علوم کی تاریخوں کے مطالعے کے دوران ایسی الجھنیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

'معاصر' اور 'ہم عصر ادب' کی اصطلاح بھی اگرچہ 'جدید' کی طرح پرانی نہیں مگر اسے بھی ہمارے یہاں آزمانے کا چلن کم و بیش اب نصف صدی کا قصہ ہے۔ اردو میں جدیدیت کا زور ذرا کم ہونے لگا، ٹھیک اسی وقت جدیدیت سے مختلف ادبی منظرنامے کی تلاش میں ادبی مورخین، نظریہ ساز اور نقاد سرگرم ہوئے۔ پہلا سوال تو یہی تھا کہ جدیدیت کا اختتام یا اس کے اختتامی آثار کب سے تسلیم کیے جائیں؟ اردو افسانے

کے مورخین کے ہاں بالعموم یہ رائج ہے کہ سریندر پرکاش، بلراج مین را کی نسل جس نے تجریدی افسانوں پر خاص توجہ دی تھی، ان کے فوراً بعد ایک ایسی نسل آئی جو کھلی تجریدیت سے خود کو علاحدہ کر کے اپنی نئی پہچان کے لیے کوشاں تھی۔ سلام بن رزاق، شوکت حیات، حسین الحق اور بہت سارے اس زمانے کے نئے لکھنے والے اولاً جدید حلقے میں شامل ہوئے مگر پھر ایک وقفے کے بعد اس سے الگ پہچان کے تمنائی ہوئے۔ شوکت حیات تو مرتے دم تک ''سنہ ستری'' کی عمومی پہچان کے لیے کوشاں رہے۔

۱۹۸۰ء کے آتے آتے اردو رسائل کے صفحات سے یہ پیغام بھی آنے لگا کہ جدیدیت کے عہد اور موجودہ زمانے کے ادب کے تقاضے بدلنے لگے ہیں۔ نقادوں کے بیچ یہ بحث بھی چھڑتی رہی کہ موجودہ ادب کو کس طرح سے پہچانا جائے؟ شمس الرحمان فاروقی کم از کم دو دہائیوں تک مصر رہے کہ اب بھی جدیدیت قائم ہے اور جدید ادب کے بعد جو الگ حلقے کے مصنفین لکھ رہے ہیں، وہ قابلِ اعتنا نہیں۔ جدیدیت کے قائد کی یہ بات زیادہ دور تک مانی نہ گئی اور الگ الگ حلقے سے خود مختاریاں ظاہر ہونے لگیں۔ ستر کی نسل نے پہلے سے ہی خود کو جدیدیت سے الگ پہچان دینے پر اصرار کر رکھا تھا، اسّی کی نسل کے بہت سارے افراد اور بعض بزرگ اہلِ قلم بھی نئے ادبی رویوں کی پہچان کے لیے سرگرم ہونے لگے۔ مظہر امام نے ''ایک لہر آتی ہوئی'' عنوان سے رسالہ 'کتاب نما' میں مہمان اداریہ لکھا جس میں عالم خورشید اور خورشید اکبر کے حالیہ مضامین کے اقتباسات شامل کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی کہ واقعتاً جدیدیت کے بعد ایک نئی نسل نئے ادبی تصورات اور رجحانات کے ساتھ سامنے آچکی ہے۔ مظہر امام کی یہ بات اس لیے بھی قابلِ توجہ معلوم ہوئی کیوں کہ ترقی پسندی سے جدیدیت کے دور میں جب ادبی تبدیلیاں اپنے آپ نیا رخ اختیار کر رہی تھیں، اس وقت بھی مظہر امام بڑے سلجھے ہوئے انداز سے اس منظرنامے کو سمجھنے میں پیش پیش تھے۔ یہ ملحوظ رہے کہ ابتدا میں شمس الرحمان فاروقی نے اپنے کئی مضامین میں نئے لکھنے والوں اور ان بزرگوں کے خیالات سے اختلاف کیا مگر بعد میں ان کے یہاں بھی علی الاعلان ہٹ دھرمی کے احوال کم ہوتے گئے۔ غالباً انھیں یہ بات سمجھ میں آچکی تھی کہ جدیدت کوئی حتمی ادبی رویہ نہیں ہے، اس لیے اسے بھی ایک نہ ایک دن زوال تک پہنچنا ہی ہے۔ ایسے ہی مرحلے میں وہ خود بھی بہ تدریج کلاسیکیت کی طرف بڑھنے لگے تھے جس کی وجہ سے آخری دو تین دہائیوں میں انھیں جدیدیت کا نظریہ ساز ہونے کے علاوہ اردو میں کلاسیکی ادبی سرمایے کا ایک بڑا نباض بھی تسلیم کیا گیا۔

۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء کے دوران جگہ جگہ یہ بحث شروع ہونے لگی کہ جدیدیت کے بعد کے اس نئے ادبی رویے کو کس نام سے پکارا جائے؟ پہلے ستّر کی دہائی کی طرز پر اسّی کی دہائی کی اصطلاح رائج ہوئی۔ سینکڑوں سے می نار کے عنوانات اور کتابوں کے ناموں میں '۱۹۸۰ء کے بعد' کا سابقہ یا لاحقہ جوڑ کر ادب

کی تاریخ اور اصنافِ سخن کے ارتقا کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش ہوئی۔کہیں یہ فہرست ۱۹۷۰ سے ہی شروع ہو جاتی تھی۔حقیقت یہ تھی کہ اس زمانے میں سنہ ستری نسل کے افراد اپنی ساری تخلیقی قوتوں کے ساتھ سرگرمِ عمل تھے۔مگر ۱۹۹۰ء کی نسل کی دھمک اور آنے والی صدی میں جو ادب تخلیق کیا جائے گا،اس کے مسائل بھی لوگوں کے زیرِ غور رہے۔اب یہ سوال بھی پیش نظر تھا کہ اسے آخر کون سا ادبی نام دیا جائے تا کہ ۱۹۷۰ء یا ۱۹۸۰ء یا ۱۹۹۰ء کے بعد کے ادبی سرمایے کی جانچ پڑتال کی جا سکے۔مسائل صرف ظاہری نہیں تھے،داخلی بھی تھے۔ان برسوں میں ترقی پسندوں کا بھی طلسم ٹوٹا تھا اور جدیدیت برداروں کی قلعی بھی اتری تھی۔اس نئی نسل کا ان دونوں ادبی رویوں سے کوئی مکمل معاندانہ یا رقیبانہ رشتہ نہیں تھا۔اسی وجہ سے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء یا ۲۰۰۰ء تک کے ادب کو جب یکجا طور پر مطالعے کی میزان پر رکھا گیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس ادب میں ترقی پسندوں یا جدیدیوں کے ہزاروں افکار و اطوار سے اتفاق اور تقلید بھی موجود ہے۔انکار کا معاملہ تو اظہر من الشّمس تھا کہ اپنے نئے ادبی مزاج کی بنیاد پر ہی اس نئی نسل نے جدیدیت اور جدیدیوں نے ترقی پسندی سے خود کو علاحدہ تصورِ ادب کی بنیاد پر پہچانے جانے کی درخواست کی تھی۔

ایسے موقعے سے آلِ احمد سرور نے الطاف حسین حالی کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے ایک اصطلاح استعمال کی: تناظریت (Perspecticism)۔اس عہد کے ادب کی صفات کے اعتبار سے سرور صاحب کی یہ اصطلاح حد درجہ معقول تھی مگر افسوس کہ اس نام کے حوالے سے نہ نئی نسل متوجہ ہوئی، نہ اس زمانے کے نظریہ ساز نقادوں کو اپنے عہد کے ادبی سرمایے کے شناخت نامے کے لیے یہ نام موزوں معلوم ہوا۔اس زمانے میں پاکستان میں وزیر آغا نے مابعد جدید ادب کے مختلف حوالوں سے ادبی غور و فکر کے لیے نیا ماحول بنانا شروع کر دیا تھا۔ہندستان میں اس کے بعد گوپی چند نارنگ اور وہاب اشرفی نے مابعد جدید ادب کے اصول و ضوابط کو اردو میں عام کرنے کی کوشش کی۔وہاب اشرفی نے تو بعد میں اس موضوع پر ''مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات'' عنوان سے ایک مکمّل کتاب بھی لکھی۔

دیکھتے دیکھتے ۱۹۸۰ء کے بعد کے ادب کو 'مابعد جدید ادب' کے نام سے پہچاننے کا ایک رویہ سامنے آیا۔معدودے چند نقادوں کو چھوڑ دیں تو کم و بیش سارے تخلیق کار اور نئے ادب کے خدمت گار اس اصطلاح کے دائرے میں پہچانے جانے لگے۔یہ الگ بات ہے کہ مغرب میں یہ اصطلاح ایک مدت پہلے استعمال میں آ چکی تھی اور عالمی سطح پر اس کے مسائل و مباحث کہیں بھی اردو سے ہم آہنگ ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔محمود ایاز سے لے کر ہمارے زمانے کے بہت سارے نقادوں نے بھی مابعد جدید ادب کی اصطلاح پر سب سے بڑا سوالیہ نشان یہی لگایا کہ اس کے اصولی مباحث جس ذوق و شوق کے ساتھ پیش کیے

جاتے ہیں، اس کے مقابلے اطلاقی اور عملی پہلو بے رخی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ سب سے آخری بات مابعد جدیدیت کے اس دور کے سب سے بڑے مبلغ گوپی چند نارنگ کے ان مضامین کے سلسلے سے سامنے آئی جو مابعد جدیدیت کے اصول ونظریات سے متعلق تھے اور انھیں نارنگ صاحب نے اپنے غور وفکر کا نتیجہ بتایا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ مضامین مختلف نقادوں کے مضامین کے تراجم اور تلخیص کا درجہ رکھتے تھے اور انھیں تنقید یا ادب کی کوئی نئی اصول سازی قرار دینا معقول بات نہیں تھی۔

اکیسویں صدی کے ابتدائی دس برسوں میں مابعد جدید عہد کا عمومی ادبی اور تنقیدی منظرنامے پر اصطلاح کے طور پر ذکر آنا کم ہوگیا۔ ٹھیک اس سے دو تین دہائی پہلے جدیدیت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ آج بہت محدود تعداد میں ایسے نقاد یا تخلیق کار ہیں جو مابعد جدید ادب کی اصطلاح آج کے ادب پر منطبق کرتے ہیں۔ گنتی کے ان لوگوں کو اس بحث سے خارج کیجیے جو گوپی چند نارنگ کے اثر سے اس حلقے میں داخل ہوئے تھے، وہ حضرات ہی مابعد جدید لفظ کا استعمال فی زمانہ کر رہے ہیں۔ ایسے افراد ترقی پسندی اور جدیدیت کے خاتمے کے دور میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ انھیں ہر دور میں جامد اور سنگی ذہن کا آدمی تصور کیا گیا کیوں کہ ہر شخص خود کو آسانی سے بدل نہیں سکتا ہے۔ بقولِ اقبال: انھی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد۔

اکیسویں صدی میں پھر یہ مسئلہ پیدا ہونے لگا کہ موجودہ ادبی رویّے کو کون سا نام دیا جائے یا اس نسل کو کس اصطلاح کے حوالے سے پہچانا جائے۔ ستّر اور اسّی کی نسل یا مابعد جدیدیت کی اصطلاحیں؛ سب کم وبیش ضائع ہوچکی تھیں۔ ۱۹۷۰ء کے زمانے میں ایک عمومی اصطلاح کبھی کبھی ہمارے سامنے آنے لگی تھی۔ جس طرح سے انیسویں صدی سے جدید اور نیا کا سلسلہ شروع ہوا، اسی طرح ۱۹۷۰ء کے بعد ایک اصطلاح سامنے آئی؛ ہم عصر یا معاصر ادب۔ رہ رہ کر نقادوں نے توجہ کی مگر کسی دوسرے نام کے چلن نے اس اصطلاح کو شاہ سرخیوں میں آنے نہیں دیا۔ لیکن یہ بات بھی رہی کہ رہ رہ کر نقادوں کے بیچ یا اس سے بڑھ کر تخلیق کاروں کے درمیان ہم عصر کی اصطلاح رواں دواں تھی۔ جب کسی بڑے نام یا ادبی رویے سے ادبی منظرنامہ خالی ہوتا تھا، 'معاصر' کی اصطلاح اپنے آپ آگے بڑھ جاتی تھی۔ یوں بھی ادبی مورخین کو ادب کی تاریخ نویسی کے مرحلے میں معاصرین کو ایک جگہ بٹھانا ہی پڑتا ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جسے سب وقتاً فوقتاً آزماتے ہی رہتے ہیں۔ شاید یہی آسانی ہو کہ ستّر اور اسّی یا مابعد جدیدیت کے متوازی معاصر ادب یا ہم عصر ادب کی اصطلاح رفتہ رفتہ مستحکم ہوتی چلی گئی۔ ہر چند کہ یہ زمانی نام ہے، اُسی طرح جیسے مابعد جدید ادب ہے یعنی جدیدیت کے بعد کا ادب۔ مگر اس دور کے ادب کے داخل میں ہزاروں ایسے معنوی طلسم موجود ہیں جن کی بنیاد پر اس اصطلاح کو قبول کرنے میں ایک بڑے حلقے کو کوئی جھجک نہیں ہوتی ہے۔

ایک مختصر سی بات اور بھی ہے کہ ہم عصر ادب یا معاصر ادب کا نقطۂ آغاز کب سے تسلیم کیا جائے۔ ہمارے بعض جوشیلے نقاد یا تخلیق کار تو ایسے ہیں کہ وہ اس اصطلاح کے دائرے میں صرف اکیسویں صدی کے ہی ادب کو شامل کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔بعض جاں سوز ۱۹۸۰ء کے بعد سے آج تک کے دور کو اس اصطلاح میں شامل رکھنا چاہتے ہیں۔ ذرا اور رواداری برتی جائے تو جدیدیت کے بعد جب پہلی بار ۱۹۷۰ء کی نسل نے الگ ادبی تقاضوں کے تحت شعروادب کے پیمانے وضع کرنے کا اعلان کیا تو کیوں نہ ہم ہم عصر ادب کو جدیدیت کے بعد کے عہد یعنی ۱۹۷۰ء کے بعد کے حوالے سے پہچاننے کی کوشش کریں؟ ادب کی تاریخ میں پچاس برس کوئی بڑا زمانہ نہیں ہوتا اور عام طور پر لکھنے والوں کی تصنیفی عمر پچاس برس ہو ہی جاتی ہے۔سلام بن رزاق اب بھی تصنیف وتالیف میں سرگرم ہیں جب کہ انھوں نے ۱۹۷۰ء کے پہلے سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔شوکت حیات اور حسین الحق ابھی ہم سے رخصت ہوئے، یہ سب اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ان سب نے اپنی ادبی زندگی کے پچاس برس سے زیادہ علم وفن کے لیے وقف کیے۔اس لیے یہ بہت موزوں ہوگا کہ ہم عصر ادب یا اس کی کسی صنف کے حوالے سے ہم گفتگو کریں تو ہمارے پیش نظر ۱۹۷۰ء کے بعد کا ادب لازمی طور پر ہونا چاہیے۔اس سے ادبی تاریخ کا سلسلہ بھی آگے بڑھے گا اور ہم تواتر وترتیب کے ساتھ اپنی زبان کی تاریخ کا محاسبہ کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

ہم عصر اردو افسانہ: اردو افسانے کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ایک صدی میں اس صنف نے واقعتاً ترقی کی ہزار منزلیں طے کی ہیں۔ ہر دور میں اس صنف سے متعلق ایسی تخلیقات سامنے آتی رہیں جن کی وجہ سے اردو تنقید کے منظرنامے پر افسانہ نگاری کی مقبولیت کبھی کم نہ ہوئی۔اگر ہر عہد کے قابلِ ذکر افسانہ نگاروں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ یہ تخلیق کار اپنے زمانے کے نمائندہ فن کار کے طور پر قبولِ عام کا درجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔اگر ابتدا سے ۱۹۳۶ء کے دورانیے کو ایک دور تسلیم کرلیا جائے تو یہ کہنے میں کسی کو دریغ نہیں ہوگا کہ وہ زمانہ نثر میں پریم چند کا اور شاعری میں اقبال کا تھا۔ ۱۹۳۶ء سے ۵۰۔۱۹۶۰ء کے عرصے کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تب بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعروں اور نقادوں سے اُس دور کے افسانہ نگار ذرا بھی کم تر نہ رہے۔منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت اور قرۃ العین حیدر وغیرہ اپنے ہم عصر شعرا سے مقبولیت اور ادبی مرتبے میں بجا طور پر ہم سری کے دعوے دار تھے۔

عہدِ پریم چند اور پھر ترقی پسند افسانہ نگاروں کو سامنے رکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ ہمارے تنقید نگاروں نے اپنی بے پناہ قوت مذکورہ افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے تجزیے اور تفہیم میں صَرف کی۔ یہ آج بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ ۵۰-۶۰ برس (بیسویں صدی کا نصف اوّل) اردو افسانہ اور افسانہ نگاروں کی ادبی

شناخت، برتری اور قبولِ عوام سے عبارت ہے۔ترقی پسند افسانہ نگاروں کی چھاؤں میں ہی جدیدیت کے علم بردار اُبھرنے لگے تھے۔ شاعری کی طرح جدید افسانہ نگاروں کی پہلی کھیپ اُن افسانہ نگاروں کی تھی جن کا تعلق ترقی پسند لوازمات سے بھی تھا اور جن میں سے بعض کی ادبی تربیت بھی ترقی پسندوں کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ جدیدیت کے مخصوص اصول وضوابط کے ساتھ ہمارے ممتاز افسانہ نگاروں غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، بلراج مین را، خالدہ حسین، احمد ہمیش وغیرہ کی ایک کھیپ سامنے آئی جنھوں نے علامت اور تجرید کو اپنے افسانوں کا اِس طرح حصّہ بنایا کہ ہمارا ادبی مزاج ایک نئے ذائقے سے ہم آشنا ہوا۔جدیدیت پسند نقادوں نے اُس زمانے کے افسانوں کی علامتوں کو واضح کرنے میں اپنی پوری صلاحیت کا استعمال کیا اور بار بار لوگوں کو نئے نئے زاویۂ نظر سے تفہیم کی طرف توجہ دینے کی وکالت کی۔

دوسری طرف جدید افسانوں پر یہ سب سے بڑا الزام عائد ہوا کہ اِن کے قارئین کا دائرۂ اثر محدود تر ہوتا جا رہا ہے۔بار باراُن کے افسانوں کی تجریدیت یا علامتوں کے تعلق سے سوالات قائم ہوتے رہے جس کے نتیجے میں تھوڑے ہی دنوں میں صورتِ حال میں تبدیلی کی کیفیت پیدا ہوئی۔شاید تبدیلی کی ایک فطری گنجائش تھی جو ۱۹۷۰ء کے بعد اُبھرنے والی نسل میں دیکھنے کو ملی۔ اِن پر تجریدیت کا بھی سایہ تھا اور یہ علامتوں سے نکل کر روایتی بیانیے کی طرف بھی جانا چاہتے تھے۔۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کے دوران جن افسانہ نگاروں نے اپنی شناخت قائم کی، اُن کے یہاں کہیں نہ کہیں یہ تذبذب اور دورنگی موجود ہے کہ وہ دونوں طور کو اپناتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے بیانیے پر علامت کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے اور اُن کی علامتوں میں وضاحت اور صراحت کے لیے گنجائشیں بھی موجود ہیں۔ اِن کے بعد ۱۹۸۰ء سے آج تک جو نسل سرگرمِ عمل ہے، وہ تقریباً انھی ملے جُلے خطوط پر گامزن ہے جس میں روایتی بیانیہ اور علامت کا بہترین امتزاج موجود ہے۔

اِسے محض اتّفاق نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۹۷۰ء کے بعد کے فکشن پر ہمارے معتبر نقادوں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔اس دور میں نقادوں کے چہیتے بعض ایسے افسانہ نگار بھی تھے جن کی قدر شناسی بھی ہوئی مگر ان کی افسانہ نگاری ہی نہ چل سکی۔ جی لگا کر قدر شناسی کا مرحلہ تو اس نسل کے لیے ہنوز باقی ہے۔آج اگر غور کریں تو فکشن کے نمائندہ نقّاد پچھلے تیس چالیس برس کے افسانوں کو توجہ سے نہیں دیکھ پا رہے ہیں یا بہت کم دیکھ رہے ہیں۔شاید یہ بھی بات ہو کہ ہمارے معتبر نقادوں میں اب بھی وہی لوگ امتیاز رکھتے ہیں جو یا تو ترقی پسند تھے یا جدیدیت کے علم بردار۔انھوں نے اپنی پسند کی نسل پر تنقیدی پھول نچھاور کرنا اپنا مقصد سمجھا اور کچھ اس قدر exhaust ہو گئے کہ اپنے عہد کے ادبی سرمائے کا بہ نظرِ غائر تجزیہ کرنا اور اپنے مطالعے کی ترجیحات میں اسے جگہ دینا انھیں گوارہ نہ ہوا۔ادب کی تاریخ میں ایسی مثالیں زیادہ نہیں جب معتبر نقادوں

نے اپنے عہد کے زندہ ادب سے اس طرح بے اعتنائی برتی ہو۔

۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانوں میں تکنیکی سطح پر پچھلے فکشن سے اچھی خاصی تبدیلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ پریم چند کا انداز، ترقی پسند افسانہ نگاروں کا طور اور جدیدیت کے علم بردار افسانہ نگاروں کے اسلوب کو ایک ساتھ سامنے رکھتے ہوئے جب ۱۹۷۰ء سے موجودہ عہد تک کے افسانوی منظرنامے کا موازنہ کیا جاتا ہے تب بعض بالکل انوکھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ علامتی افسانوں کے بعد روایتی بیانیے کی طرف ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگار یک لخت چلے آئے۔ اِسے سرسری نتیجہ برآمد کرنا مانا جائے گا۔ بس اتنا صحیح ہے کہ ہر نسل تاریخ اور روایت سے اخذ و استفادہ کرتی ہے اور ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں کی نسل اپنے سابقین کے اسالیب سے بھی اسی انداز سے اثرات قبول کرنے میں کامیاب ہوئی لیکن بڑی بات یہ ہے کہ تکنیکی سطح پر اردو افسانے کی سب سے موثّر دنیا ڈھونڈ نکالنے میں شاید انھیں کامیابی مل گئی۔ اُن کے یہاں راست بیانیہ کے عناصر بھی موجود ہیں اور علامتوں کا سحر بھی قائم ہے۔ جہاں ضرورت ہوئی، تجرید سے کام لیا اور جہاں گنجائش پیدا ہوئی، وہاں ٹھوس حقائق پر بھی انحصار کیا۔ اس مرحلے میں اکثر افسانہ نگاروں نے یہ کوشش کی کہ اُن کا افسانہ سادہ قصّہ نہ بن جائے اور اس کے پہلو بہ پہلو یہ بھی خیال رکھّا کہ اُن کی تحریر چیستاں نہ ہو جائے۔ اِن افسانہ نگاروں کی یہ بھی کوشش رہی کہ زندگی اپنی پوری طاقت، جسارت، بے چارگی اور پیچیدگی کے ساتھ افسانے میں اُتر آئے۔ اِسی لیے جدیدیت کے افسانہ نگاروں کے کھوئے ہوئے قارئین بھی اِنھیں کچھ حد تک واپس ملے اور ہم عصر زندگی کی بوقلمونیوں کے متلاشی نئے پڑھنے والے بھی بہت حد تک میسّر آ گئے لیکن اِن کی بدنصیبی یہ رہی کہ چار اور پانچ دہائیوں کی خدمات کے باوجود انھیں حقیقی نقّاد اور جاں نثار قارئین نہیں ملے۔

اردو تنقید کے موجودہ منظرنامے پر غور کریں تو نمائندہ اور معتبر نقّادوں کی ایک کہکشاں سجی ہوئی دکھائی دے گی۔ رسائل کے مدیران اُن نقّادوں کو اہتمام سے فہرست میں اوّلین درجہ عطا کرتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی افسانے پر لکھے اُن کے مضامین کے موضوعات پر غور کریں تو محسوس ہوگا کہ منٹو، بیدی اور کرشن چندر سے آگے اُن کا ذہن ہی کام نہیں کر رہا ہے۔ ایسے نقّاد جو اِس سے آگے بڑھتے ہیں وہ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے تجزیے کے بعد اردو افسانے کا جائزہ سمیٹ لیتے ہیں۔ بعض ذرا اور آگے بڑھتے ہیں اور سریندر پرکاش یا غیاث احمد گدّی تک اپنا تذکرہ پھیلا دیتے ہیں۔ اِن میں سے تمام تخلیق کار اور نقّاد ایسے ہیں جن کی پیدائش ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیان ہوئی تھی اور جنھوں نے آزادی ملنے کے آس پاس یا اس کے کچھ بعد کے دور میں لکھنا پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ یہ نقّاد ٹھیک اپنے زمانے کے ادب سے گریز اور پچھلے دور کی تحریروں سے لگاوٹ کی خو اپنائے ہوئے رہے۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ

نقّاد جان بوجھ کر اپنے زمانے کی تحریروں سے اغماض برت رہے ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اپنے عہد کی تخلیقات سے آنکھیں موندنا بہر صورت اک ظالمانہ کوشش ہے۔ ادب کی تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے اس صورتِ حال کو مجھے مجرمانہ کہنا چاہیے۔ شمس الرحمان فاروقی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، فضیل جعفری، عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی وغیرہ کے نام بہ طور نمونہ پیش کیے جاسکتے ہیں جنھوں نے ۱۹۷۰ء کے بعد کے فکشن کی قدر شناسی پر یکسر کوئی توجّہ نہ دی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ انھوں نے چند منتخب ناموں کی گردان کو اپنا شیوۂ تنقید سمجھا اور کمال ہوش مندی سے پوری نسل کو اپنے مطالعے سے خارج کر دیا۔

سچّی بات تو یہ ہے کہ آپ جس زمانے میں ہیں، اُس کی زندہ نسل کو بہ نظرِ توجہ نہیں دیکھیں گے تو آخر آپ کو کیسے معلوم ہوگا کہ نیا ادب کون سی کروٹ لے رہا ہے۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کے ہزاروں افسانے شائع ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں۔ رسائل کے صفحات ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں سے بھرے پڑے ہیں لیکن اُن کا ادبی احتساب نہیں ہو رہا ہے۔ کہاں ایک زمانہ تھا کہ راجندر سنگھ بیدی کے چند افسانے شائع ہوئے اور آلِ احمد سرور اُن افسانوں کے بنیادی امتیازات واضح کرتے ہوئے مکمل تحریر پیش کر دیتے ہیں۔ سرور بیدی سے عمر میں بھی بڑے تھے اور اُس زمانے میں زیادہ معتبر لکھنے والے کی حیثیت سے تسلیم شدہ تھے۔ یہ رواداری اور انصاف آج کے معتبر نقّادوں میں ۱۹۷۰ء کے بعد کے تخلیق کاروں کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھنے کو نہیں ملتے۔

وارث علوی، وہاب اشرفی اور مہدی جعفر تین بزرگ نقّاد ایسے موجود رہے جنھوں نے خاص طور پر معاصر افسانہ نگاروں کے تعلق سے مضامین لکھے۔ وارث علوی نے ۱۹۷۰ء کی نسل کے حوالے سے کچھ مضامین ضرور لکھے مگر ان کی بھی حقیقی توجہ گذشتہ افسانہ نگار ہی رہے۔ تھوڑے بہت انفرادی مطالعات جو انھوں نے بعد کے دور سے متعلق کیے، وہ یا تو فرمایشی معلوم ہوتے ہیں یا اس عہد سے الگ تھلگ کر کے اس سرمایۂ ادب کو پرکھنے کی محض کوشش ہے۔ لیکن بھرپور تجزیے کے بعد وہ کسی ایک افسانہ نگار کو بھی مکمل طور پر ہر پہلو سے اعتبار دلا پانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ وہاب اشرفی نے غیاث احمد گدّی کا جس طرح جی لگا کر محاکمہ کیا، کیا شوکت حیات اور شموئل احمد کی افسانہ نگاری پر لکھتے ہوئے وہ توجہ صرف ہوئی؟ مہدی جعفر بھی افسانہ نگاروں کی بھیڑ سے چُن کر کسی ایک کی بہت ساری خصوصیات کہاں واضح کر پائے؟ حالاں کہ وہاب اشرفی نے تقریباً ہر قابلِ ذکر افسانہ نگار اور ناول نگار کے حوالے سے اپنے مضامین قلم بند کیے اور مہدی جعفر کم و بیش چار دہائیوں سے ہم عصر فکشن کے مختلف پہلو کو ہی اپنی تنقید کا مرکز بنائے رہے۔

اِسی لیے آج یہ سب سے بڑا چیلنج ہے کہ ہم عصر افسانے کی تعبیر و تشریح کے نہ صرف نئے پیمانے وضع کیے جائیں بلکہ اس عہد کے ایک ایک تخلیق کار کا مقام و مرتبہ کیا ہے، اُس کا بھی تعین کیا جائے۔

۱۹۷۰ء کے بعد اُبھرنے والی نسل میں کم از کم پچیس ایسے افسانہ نگار ضرور موجود ہیں جن کے پچاس سے زیادہ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ بعض کے یہاں یہ تعداد ۱۰۰ کے پار بھی پہنچتی ہے۔ اب ایسی نسل کو نوآموز اور مبتدی کہہ کر ٹالنا واقعتاً جرم ہے۔ ہمارے نقادوں کا یہ فریضہ تھا کہ وہ اِن تخلیق کاروں کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالیں اور اُن کے ادبی امتیازات روشن کریں لیکن یہ کام آج تک ممکن نہیں ہوا۔

ہم عصر افسانے سے متعلق ممتاز اہلِ قلم کی اگر فہرست تیار کی جائے تو کم و بیش مندرجہ ذیل گوشوارے پر اتفاق کی گنجایش پیدا ہوسکتی ہے:

الف۔ترقی پسند عہد کے ایسے افسانہ نگار جنھوں نے باضابطگی کے ساتھ اِس عہد میں بھی لکھنے کا کام تواتر کے ساتھ جاری رکھا: انتظار حسین، جوگندر پال، اقبال مجید اور رتن سنگھ۔ ۱۹۸۰ء کے بعد اقبال مجید اور رتن سنگھ نے تو کچھ اس رفتار سے افسانے لکھے جیسے نئی نسل کے وہی لکھنے والے ہوں۔ سچائی یہ ہے کہ ان کی قدر شناسی بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ اسی حلقے میں قرۃ العین حیدر اور قاضی عبدالستار کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں مگر ان کے بہترین افسانوں کی تحریر کا زمانہ ہم عصر افسانے سے قبل کا ہی ہے اور ان کی شناخت بھی اس سے قبل قائم ہو چکی تھی۔

ب۔جدیدیت کی تحریک کے ساتھ ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں اکثر و بیشتر خاموش ہوگئے یا گذشتہ شہرت کے حصار میں بہت دنوں تک قید رہے مگر اس دوران شفیع جاوید جیسا افسانہ نگار بھی تھا جس نے اپنے انفرادی اسلوبِ فکر پر خود کو قانع رکھا۔ بھلے ادبی تفوق اور بڑی شہرت کے حلقے سے وہ دور ہوئے لیکن گذشتہ پچاس برس میں ان کی افسانہ نگاری کا مخصوص انداز قائم رہا۔ ان کے ابتدائی مجموعوں کو سامنے رکھیں اور ۱۹۹۰ء کے بعد کی تحریروں کے انتخابات سے موازنہ کریں تو زبان و اسلوب کے عمومی ارتقا کے علاوہ آسانی سے کوئی تبدیلی تلاش کرنا محال ہے۔ کمال یہ ہے کہ فن اور زندگی کی ایک ایسی داخلی لَے انھوں نے شروع میں ہی ایجاد کر لی جس کے سہارے ان کی کہانیاں جدید ہونے کے باوجود ہم عصر ثابت ہوئیں۔

ج۔ ۱۹۷۰ء کے بعد جس نسل نے اپنی واضح پہچان قائم کی، آج انھی کی قوت سے اردو کا ہم عصر افسانہ اپنے ارتقا کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ انور خاں، ساجد رشید، علی امام نقوی، پیغام آفاقی، شوکت حیات، شفق، انجم عثمانی اور حسین الحق تو اس دنیا میں نہیں مگر ان کے کام موجود ہیں۔ اس نسل سے تعلق رکھنے والے دیگر افسانہ نگاروں کے کچھ نام یوں ہو سکتے ہیں: سلام بن رزاق، عبدالصمد، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، انور قمر، انیس رفیع، نورالحسنین وغیرہ۔

د۔ایسے افسانہ نگاروں کا بھی ایک طبقہ موجود ہے جو عمر کے اعتبار سے تو ۱۹۷۰ء کی نسل سے تعلق رکھتا ہے مگر حقیقت میں وہ ۱۹۸۰ء کے بعد اور بعض ۱۹۹۰ء کے بعد اپنی تحریروں سے پہچان قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان

میں نیر مسعود، شمس الرحمان فاروقی، غضنفر، شموئل احمد، مشتاق احمد نوری، اسرار گاندھی، علی امام وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

ہ۔ ۱۹۸۰ء کے بعد افسانوی منظر نامے پر ایک ایسی توانا نسل سامنے آئی جس نے جدیدیت سے انحراف کی کہانیاں لکھنے کا افسانوی اور تنقیدی دونوں اعتبار سے دعویٰ پیش کیا۔ ان میں چند کے نام کچھ اس طرح لیے جاسکتے ہیں: مشرف عالم ذوقی، صغیر رحمانی، غزال ضیغم، خورشید اکرم، قاسم خورشید، سہیل وحید، ترنم ریاض، ذکیہ مشہدی، خالد جاوید، شاہد اختر، ثروت خاں، صدیق عالم، احمد صغیر، تبسم فاطمہ، محسن خان، صادقہ نواب سحر، اسلم جمشید پوری، نگار عظیم، محسن خاں، خورشید حیات، اقبال حسن آزاد، رحمان شاہی، اختر واصف وغیرہ۔

و۔ ہم عصر افسانہ نگاری میں جدیدیت، ۱۹۷۰ء کی نسل اور ۱۹۸۰ء کی نسل پر ہی فہرست سازی مکمل کر لی جائے تو یہ حقیقت سے منہ موڑنا کہا جائے گا۔ نئی صدی میں لکھنے والے کم نہیں ہوئے ہیں اور ہر چند ان کی پہچان کے ابھی شدید مسائل سامنے آئیں گے مگر ان کے تذکرے سے اکثر ہمارے مضامین خالی ہوتے ہیں۔ ایسے لکھنے والوں میں اکثر وہ لوگ ہیں جن کی پیدایش ہی ۱۹۸۰ء کے بعد ہوئی ہے۔ شہناز رحمان، صدف اقبال، علیم اسماعیل، رومانہ تبسم، شارقہ شفقتین، شاداب ابراہیم، توصیف بریلوی، شہناز یوسف، ذاکر فیضی، فضل اللہ مکرم، سلمان عبدالصمد اور عبدالباسط جیسے ملک کے طول و عرض میں نسبتاً نئے اور نوآموز لکھنے والوں کی ایک نسل سامنے آرہی ہے۔ یہ بات آسان ہے کہ انھیں پہلے ہی کچا کہہ کر راندۂ درگاہ قرار دے دیا جائے جیسا بزرگ نقادوں کا شیوۂ پسندیدہ رہا ہے مگر انھیں ابھی لکھتے رہنے کا حوصلہ تو دیا ہی جانا چاہیے۔ دس بیس سال میں کچھ سرمایہ اکٹھا ہو جائے تو اس کی باضابطہ جانچ پرکھ کر کے احتساب کا فریضہ ادا کیا جاسکتا ہے۔

ہم عصر افسانے کے احتساب میں کوتاہیوں کی غالباً اصل وجہ نفسیاتی ہے۔ ادب کی تاریخ میں شاید ہی ایسے مواقع آسانی سے میسر آتے ہیں جب لکھنے والوں کے زمانے میں ہی نقاد اور قاری مل کر ان کا بت تراش لیں۔ ابھی ابھی قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین، قاضی عبدالستار، شمس الرحمان فاروقی اور گوپی چند نارنگ گزرے۔ جیلانی بانو ہمارے بیچ موجود ہیں مگر ان کے علاوہ ایسا کوئی نظر نہیں آتا جن کی تحریروں کو اہتمام کے ساتھ انھی کے زمانے میں سمجھنے کی کوشش ہوئی ہو۔ ایسے ہی لوگوں کو living legend کہا جاتا ہے۔ دنیا میں صف دوم میں شامل ادبا کو اب نوبیل اور بُکر ایوارڈس بھی ملنے لگے ہیں۔ آخر پہلی صف کے گزرنے یا ختم ہونے کا انتظار کوئی کب تک کرے؟ ان سے الگ دوسروں پر بھی نگاہ جانی چاہیے۔

اردو کے مستند افسانہ نگاروں کے مجموعی سرمایے پر توجہ کیجیے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ پریم چند، منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت، قرۃ العین حیدر؛ سب کے یہاں پانچ دس یا فیاضی سے کہا جائے تو بیس ایسے شہکار افسانے ہوں گے جن کی بنیاد پر ان کا ادبی مقام متعین ہوا۔ ان میں سے راجندر سنگھ بیدی پر توجہ دیں تو کل سرمایہ

چھپن افسانوں کا ہی بیٹھتا ہے۔اس کے مقابلے میں ہم عصر افسانہ نگاروں کو دیکھیں تو کس قابلِ ذکر لکھنے والے کے پاس پانچ دس ایسے افسانے نہیں جنھیں دیر سویر ہی سہی، اردو کی ادبی تاریخ میں مقام ومرتبہ مل کر رہے گا۔ بات سلام بن رزاق سے شروع کیجیے۔ ننگی دوپہر کا سپاہی، بجوکا، کالے ناگ کے پجاری، انجام کار، خصی، کام دھینو، آندھی میں چراغ، شکستہ بتوں کے درمیان، ابراہیم سقہ اور آوازِ گریہ تک ہی خود کو محدود کیا جائے تو کیا ان میں سے بعض لاجونتی، کالو بھنگی اور ہتک یا کفن کے ساتھ قابلِ مطالعہ نہیں؟ شوکت حیات کے گنبد کے کبوتر، بانگ، ڈھلان پر رکے ہوئے قدم، کوبڑ، رانی باغ، گھونسلا، شکنجہ، چیخیں وغیرہ کو سرسری کہانی قرار دینا کیا معقول بات ہے؟ حسین الحق کے انہد، نا گہانی، نیو کی اینٹ، سوئی کی نوک پر رکا ہوا لمحہ، بارش میں گھرا مکان وغیرہ کہانیوں کو پڑھتے ہوئے کیا ہمیں اپنے سابقین کے کمالِ فن کی یاد نہیں آتی؟ طارق چھتاری کے باغ کا دروازہ، نیم پلیٹ، ژمبان، دھوئیں کے تار، گلوب وغیرہ کہانیاں ہمیں دعوتِ مطالعہ دیتی ہیں کہ لکھنے والے تحریر کے بطن میں اتر کر کوئی نیا جوہر اگر تہہ میں موجود ہے تو اسے ڈھونڈ کر نکال لیں۔ غضنفر کے افسانوں میں خالد کا ختنہ، کڑوا تیل، سانڈ، مسنگ مین، تانا بانا وغیرہ بھی توجہ کے ساتھ مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔ سید محمد اشرف کے افسانوں میں آخری بن باس، روگ، تلاشِ رنگِ رائیگاں، بادِ صبا کا انتظار وغیرہ کو توجہ کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس فہرست میں اس زمانے کے چند مشہور افسانوں کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ مشرف عالم ذوقی کا افسانہ بھنور میں ایلس، شموئل احمد کا سنگھاردان، قاسم خورشید کا پوسٹر، غزال ضیغم کا مدھوبن میں رادھیکا، صغیر رحمانی کا واپسی سے پہلے، شاہد اختر کا برف پر ننگے پاؤں، ثروت خاں کا حسن کا معیار، سہیل وحید کا سرکاری ملازم کی بیوہ، ذکیہ مشہدی کا صدائے بازگشت، انیس رفیع کا سانپ سیڑھی، پیغام آفاقی کا پیتل کی بالٹی، عبدالصمد کا گومڑ، ساجد رشید کا نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی، خورشید اکرم کا حبس، ترنم ریاض کا یہ تنگ زمیں وغیرہ افسانے صرف بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔ ان افسانوں میں اگر لکھنے والوں کے نام ہٹا دیں اور صرف تخلیقی شہہ پارے کے طور پر انھیں اردو کے بہترین سرمایۂ ادب کے اوصاف سے موازنہ کریں تو ہمیں فنی اور فکری اعتبار سے کہیں مایوسی اور احساسِ کمتری کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ بیدی کو کردار تراشنے کا فن آتا تھا مگر جب غزال ضیغم کے افسانے مدھوبن میں رادھیکا کا مقابلہ کیجیے تو زبان کے شاعرانہ رنگوں کے اضافے کے ساتھ وہی اطمینان، ارتکاز اور آخری لمحے تک کہانی کو اپنی مٹھی میں رکھ کر خیر وشر کے ہچکولے دینے میں کہاں افسانہ نگار کسی لیجنڈری سے پچھڑ گیا ہے؟

طارق چھتاری کا باغ کا دروازہ، غضنفر کا سانڈ، سلام بن رزاق کا شکستہ بتوں کے درمیان، شوکت حیات کا گنبد کے کبوتر، حسین الحق کا نا گہانی وغیرہ کو سامنے رکھتے ہوئے ذرا توجہ دیجیے کہ ان میں سے کون ایسا افسانہ ہے جسے آپ اردو کی ادبی تاریخ کے نمایندہ ترین افسانوں کے ہم پلہ نہیں رکھ سکتے۔ زبان، فکر، ٹریٹمنٹ،

فنی اعتبار سے چاق و چوبند ہونا اور چاول پہ قل ھواللہ لکھنے کا کام ان افسانوں میں بھی ہوا ہے۔ آپ کو شاعرانہ حسن چاہیے، بیان کی سبک خرامی منظور ہو، عہد کی دھڑکنوں اور ان کی سرگوشیوں کی تلاش ہو؛ ان میں کون سا ہنر ہے جسے لکھنے والوں نے پیوست نہیں کر دیا ہے! صغیر رحمانی نے جب 'واپسی سے پہلے' لکھا تو سب چونک گئے تھے کہ دیہاتی زندگی کی کہانیاں لکھنے والے کے پروں میں بارود بھری پھلجڑی کس نے باندھ دی۔ بیس پچیس برس میں افسانہ نگار نے خوب سلیقے سے توقعات واضح کیں مگر سلام بن رزاق، شوکت حیات اور حسین الحق پر جب توجہ نہ دی جا رہی ہو تو صغیر رحمانی کی طرف کون آئے گا؟ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ لگاتار اپنے ادبی معیار کو قائم رکھنے کے باوجود ذکیہ مشہدی کے افسانوں کا بھی معقول احتساب اب تک ممکن نہ ہوا۔

۱۹۸۰ء کے بعد ناول نگاروں کی نسل ان معنوں میں ذرا خوش نصیب رہی۔ ان میں سے بعض مثلاً عبدالصمد، غضنفر، مشرف عالم ذوقی، حسین الحق، شموئل احمد، سید محمد اشرف اور خالد جاوید وغیرہ کے ناولوں پر نقادوں کی بے اعتنائی کا سلسلہ ٹوٹا۔ نیر مسعود، شمس الرحمان فاروقی اور خالد جاوید کے سلسلے سے ہمارے نقادوں کا رویہ کچھ اضافی طور پر فیّاضانہ ثابت ہوا جس سے احتساب کے عمل میں انصاف کے امور پر سوالات قائم ہوئے۔ یہ کام قمر احسن کے سلسلے سے پہلے بھی ہو چکا تھا جس کا نتیجہ ادبی تاریخ کی یافت کے اعتبار سے دیکھیں تو صفر ہی ثابت ہوگا۔

معاصر افسانہ نگاروں کے سلسلے سے مستند نقادوں کی جو بے اعتنائی ہے، اس کا شاید یہ بھی سبب ہے کہ اکثر نقادوں کی پرورش اردو کے شعری ماحول میں ہوئی اور وہ شعری ڈھانچے میں سوچنے کے عادی رہ گئے۔ پھر یہ سوال بھی ہے کہ ہر نسل کو اپنا نقاد تو پیدا کرنا ہی چاہیے۔ جدیدیت اور اس سے پہلے ترقی پسندی نے اپنے نمایندہ نقاد پیدا کیے۔ کمال یہ کہ ان ادبی رویوں سے اختلاف کرنے والے لوگوں نے بھی اس عہد کے ادبی سرمایے کا بے لاگ جائزہ لیا تھا۔ بعض معاصر فکشن لکھنے والے بھی حسبِ استطاعت افہام و تفہیم کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ حسین الحق، شموئل احمد اور مشرف عالم ذوقی تو اپنے عہد کے فکشن کے سلسلے سے لگاتار لکھتے رہے ہیں مگر تنقیدی معروضیت سے ان کا کچھ خاص تعلق معلوم نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ان کے اٹھائے گئے نکتے ذاتی افہام کے مدار پر بے وجہ گھومتے رہتے ہیں۔ طارق چھتاری نے بھی کئی اچھے مضامین ہم عصر افسانوں کے سلسلے سے لکھے مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ نئے نقادوں کو ان کی تحریروں سے ترغیب ملی ہو اور اس کے اثر سے ایک نسل سامنے آ سکتی ہے۔

ہم عصر اردو ناول: ۱۹۷۰ء سے موجودہ عہد تک نصف صدی میں ناول نگاروں کی جو نسل سامنے آئی، ان میں سے کم و بیش وہ سب لوگ شامل ہیں جو اوّلاً افسانے کے میدان میں آئے۔ عبدالصمد، غضنفر، پیغام آفاقی،

حسین الحق، سید محمد اشرف، انور خاں، علی امام نقوی، شموئل احمد، عشرت ظفر، نورالحسنین، الیاس احمد گدی، اقبال مجید، مشرف عالم ذوقی، شمس الرحمان فاروقی، جوگندر پال وغیرہ کے نام بغیر کسی اضافی توجہ کے ہمیں یاد آتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں ناول نگار کی حیثیت سے ابھرنے والی نسل کی الگ سے فہرست بنائیں تو اس میں خالد جاوید، ثروت خان، شایستہ فاخری، ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، صادقہ نواب سحر، رحمان عباس، صدیق عالم، شبیر احمد، حبیب حق، صغیر رحمانی، محسن خان، اشعر نجمی وغیرہ ایسے ناول نگار ہیں جنھیں اچھی خاصی پہچان حاصل ہو چکی ہے۔ ان کے ساتھ نئی نسل کے متعدد نوخیز اہلِ قلم بھی سرگرمِ سفر ہیں جنھوں نے اپنے ایک یا ایک سے زیادہ ناول پیش کر دیے ہیں۔ نیلوفر خوشنود، سفینہ بیگم، سلمان عبدالصمد، عمران عاکف خاں، حمیرا عالیہ، ممتاز عالم رضوی وغیرہ اردو ناول کی بساطِ نو کے تار و پود جوڑنے میں کامیاب نظر آ رہے ہیں۔ ان کے علاوہ پچاس برسوں میں گنڈے دار ناول نگاروں کی بھی ایک خاص تعداد اپنی تصنیف کے لیے دادطلب نگاہوں سے دیکھتی رہی ہے۔ محمد علیم، کوثر مظہری، شوکت حیات، نسترن احسن فتیحی، فضل رب، محمد حسن، ساجدہ زیدی وغیرہ کے ناول ان کی دوسری تصنیفی سرگرمیوں کا حصہ بنتے ہوئے منظرِ عام پر آئے۔ اس مجموعی سرمایے کی سرسری فہرست سازی کیجیے تو دو سو سے کم ناول معاصر اردو فکشن کے حصے میں نظر نہیں آئیں گے۔ کیا ان میں پانچ فی صد قدر اول کی تحریروں کی تلاش نہیں کی جاسکتی؟ ترقی پسند ناولوں میں بھی قابلِ قدر تصانیف کا تناسب اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

'آگ کا دریا' جب ۱۹۵۹ء میں پاکستان سے شایع ہوا تو اس وقت کے بڑے نقادوں نے ہرگز یہ نہیں بتایا تھا کہ اردو میں یہ کوئی بڑا واقعہ ہے۔ عزیز احمد سے لے کر صمد شاہین تک اس ناول کی خامیوں پر گفتگو کر رہے تھے۔ بیس برس گزرتے گزرتے اس ناول کو اردو کی ادبی تاریخ کا ایک ایسا کارنامہ مان لیا گیا کہ وہ اب All Time Great کی فہرست میں شامل ہے۔ خود قرۃ العین حیدر نے 'اداس نسلیں' پر متعدد قسم کے اعتراضات کیے اور انھیں ہرگز اس بات کا احساس نہیں تھا کہ 'آگ کا دریا' کی طرح ہی 'اداس نسلیں' بھی اردو ناول کی تاریخ میں جگہ پانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ 'آنگن' کو اتنا وقت تو نہیں لگا، شاید اس کا اختصار بھی قبولِ عام کے دروازے تک پہنچانے میں معاون ہوا ہو۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ترقی پسندوں کی دوسری نسل نے اپنے جو مشہور اور بڑے ناول لکھے، وہ سب کے سب ترقی پسندی کا زور تھمنے کے بعد سامنے آئے۔ ایک طرف افسانہ نگاروں میں تجرید پسندی کا زور ہے، نئی نسل روایتی بیانیہ سے برات کا اظہار کر رہی ہے، وہیں ہمارے تجربہ کار اور بااعتبار ترقی پسند افسانہ نگار ناول نگاری کی طرف باضابطہ طور پر متوجہ ہو رہے ہیں۔ قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، ممتاز مفتی، خدیجہ مستور، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ کے یک قلم نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۵ء کے بیچ اپنے اس انداز کے ناول لکھے۔ ان میں سے اکثر وہ لوگ ہیں جن کے کاندھے پر پندرہ بیس برس کی افسانہ نگاری

اور دیگر شعبۂ حیات میں کام کرنے کا تجربہ ہے۔صرف ادبی مشق ہی نہیں مطالعۂ کائنات کے لیے بھی انھیں وافر مواقع میسر آئے جس کی وجہ سے اس دور میں اِن لکھنے والوں نے اپنے شہکار پیش کیے۔

ہم عصر ناول نگاری میں بھی جو پہلی نسل ہمارے سامنے نظر آتی ہے، ان کی پشت پر کم و بیش ڈیڑھ دو دہائیوں کا تصنیفی تجربہ کام کر رہا ہے۔عبدالصمد، غضنفر اور پیغام آفاقی نے جب اردو میں اپنے پہلے ناول پیش کیے تو افسانہ نگاری کا ایک لمبا دور بیت چکا تھا۔غضنفر نے تو شاعری بھی اچھی خاصی پیش کر دی تھی۔اس طرح تخلیقی تجربے سے خود کو آراستہ کرنے کے بعد یہ نسل ناول کی طرف آئی۔حسین الحق، سید محمد اشرف، مشرف عالم ذوقی وغیرہ کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تصنیفی مشق کے ایک بڑے دورانیے کو پار کیے بغیر یا مطالعۂ کائنات کے بہت سارے مدارج سے کامراں گزرنے کے بعد ہی ناول کی تصنیف کا بالعموم مرحلہ سامنے آتا ہے۔اسی لیے کسی ناول کو قبولِ عام کا درجہ بہت کم فوری طور پر حاصل ہوتا ہے۔کبھی ایسا اتفاق ممکن ہے مگر عام طور پر کسی ناول کو پڑھنے والے قبول کرنے میں اچھا خاصا وقت لگاتے ہیں۔شاید اس کے پیچھے ایسی وجہ ہو کہ ناول کا اثر غزل کے شعر کی طرح نہیں ہوتا بلکہ دھیرے دھیرے ہماری رگوں میں اور ہماری سانسوں اور دھڑکنوں میں اس کی لہریں پیوست ہوتی جاتی ہیں۔ان میں برسوں اور کبھی کبھی دہائیوں کا سفر درپیش ہوتا ہے۔اکثر تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی لکھنے والے نے پانچ سات برس کے بعد دوسری تصنیف یا تیسرا اور چوتھا ناول لکھا مگر قارئین اور نقادوں کا ایک بڑا حلقہ ابھی اس کے گذشتہ ناول کے تازہ سحر میں گرفتار ہے۔جس طرح ناول کی تصنیف کا کام برسوں کا وقفہ چاہتا ہے، اسی طرح ناول کی قدرشناسی کے لیے بھی وہ زمانی فصل لازم ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو ناول نگار، قاری اور نقاد کے درمیان مباحثہ و مجادلہ ممکن ہی نہیں ہوتا۔رسائل کے صفحات پر وہ گرم جوشی فوری طور پر پیدا ہی نہیں ہو سکتی ہے جیسی اس وقت ہونی چاہیے جب وہ ناول ہمارے اعصاب پر سوار ہو چکا ہو۔

عبدالصمد، غضنفر، پیغام آفاقی سے لے کر شمس الرحمان فاروقی تک کی نسل کو ابھی چھوڑیے، ان کے بعد آنے والے ایسے ناول نگار جو بیسویں صدی کے بعد اپنی شناخت کا دعوا پیش کر رہے ہیں، ان کی قدرشناسی کے مسائل رفتہ رفتہ پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔وہ خود اس سلسلے میں اتنے بیدار، چاق و چوبند اور نرگسیت میں مبتلا ہیں کہ ان کا آزادانہ محاسبہ بہت مشکل ہے۔معاصر اردو فکشن پر گفتگو کرتے ہوئے وارث علوی نے ایک زمانے میں کہا تھا:

> ’’ایک ایسے دَورِ ابتلا میں جب کہ افسانہ نگار نوکِ قلم سے نہیں بلکہ نوکِ سناں سے اپنا لوہا منوانے کے لیے کمر بستہ ہوں اور ہفتہ وار اور پندرہ روزہ اخبارات میں اپنی علاقائی شناخت کا غلغلہ بلند کر رہے ہوں اور صحافت کے زور پر اپنا وہ حق مانگ رہے ہوں جو ادب کے زور پر اُنھیں نہیں ملا۔کم از کم کوئی بھی دانش

مند نقّاد اپنے ڈیڑھ اینٹ کے چولہے پر کوئی ایسی ہانڈی نہیں پکائے گا جو بیچ چوراہے کے (پر) پھوٹ کر نقصِ امن کا سبب بنے۔''

(افسانہ اور قاری [جدید افسانہ اور اس کے مسائل]، ص: ۱۰۶-۰۷)

اس اقتباس میں افسانہ نگار کے ساتھ ناول نگار کو شامل کر لیا جائے اور اخبارات کے ساتھ سوشل میڈیا کے پلیٹ فارم بھی داخلِ دفتر ہو جائیں تو وارث علوی کی باتیں زیادہ کھل کر ہماری سمجھ میں آئیں گی اور یہ بھی واضح ہو سکے گا کہ مستقبل کے ادبی اور علمی خطروں کو وہ کچھ نہ کچھ ضرور سمجھتے تھے۔ یہ مضمون ۱۹۹۰ء یا اس سے پہلے شایع ہوا تھا۔ وارث علوی کی مذکورہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ سے دسمبر ۱۹۹۰ء میں پہلی بار شایع ہوئی تھی۔ اس وقت اردو میں ہم عصر ناول نگاروں کا کوئی غلغلہ بلند نہیں ہوا تھا اور نہ ہی عبدالصمد، پیغام آفاقی اور غضنفر کے علاوہ نئے لکھنے والوں میں سے کسی نے اپنے ناول شایع کرائے تھے۔ اس لیے وارث علوی نے اپنی گفتگو کو افسانہ نگاری پر مرکوز رکھا۔ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ عام طور پر فکشن کے مورخین افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی فہرست الگ الگ بہت کم بناتے ہیں۔ اکثر افسانہ نگار ہی ناول نگار ہو جاتا ہے۔ چند لوگوں کو مستثنیٰ سمجھا جائے تو یہ کلیہ ادبی تاریخ کی ترجمانی کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح وارث علوی نے ہفت روزہ اور پندرہ روزہ اخبارات اور صحافت کے بل بوتے پر اپنی ادبی پہچان کے لیے اصرار کرنے کی جو بات کہی ہے، موجودہ عہد میں جب ملٹی میڈیا کے وفور کا دور ہے، اس میں سوشل سائٹس کا اتنا بڑا پلیٹ فارم کھڑا ہو گیا ہے جہاں کسی ایڈیٹر یا نامہ نگار کا پردہ بھی نہیں ہے۔ مصنف خود اپنے بارے میں یا مصنف کے عقیدت منداس خاص مصنف کے بارے میں جو چاہیں، وہ عوام کے سامنے پیش کرنے میں آزاد ہیں۔ وارث علوی نے سوشل سائٹس پہ اردو کے افسانہ نگار اور ناول نگاروں کی دھاچوکڑی نہیں دیکھی تھی مگر ان کے جو نتائج ہیں، وہ اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ فضا میں جو آلودگی پھیل رہی تھی اور جو پھیلنے والی تھی، اس سے وہ بے خبر نہیں تھے، اسی لیے ان کے نتائج جو مذکورہ اقتباس میں سامنے آئے ہیں، بہت حد تک درست ہیں۔

ایک دور تھا جب شعرائے کرام کی نازک مزاجی کا چرچا ہوتا تھا۔ وہ اپنے قدردانوں سے اپنی تعریف تو سن سکتے تھے مگر ان کی ایک سطری تنقید بھی ان کے لیے ناگوار ہوتی تھی۔ انھیں تنقید نگاروں نے یا اس عہد کے پرکھنے والوں نے ناچار الگ تھلگ رکھا۔ پریم چند سے افسانہ نگاروں کی جو نسل سامنے آئی، ان میں جدیدیت سے پہلے تک سب کے سب اتنی آسانی سے شہرت پانے میں کامیاب ہوئے کہ انھیں شاید اپنی قدر شناسی کے لیے کوئی بڑا امتحان ہی نہیں دینا پڑا۔ وہ دور ہی ایسا تھا کہ تخلیق کار کی قدر و قیمت سمجھنے والے قاری اور نقاد دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کے دور میں افسانہ نگاروں کے لیے تنقیدی وکالت کا دور سامنے آیا۔ اس کے باوجود بلراج مین را ہوں یا احمد ہمیش یا سریندر پرکاش؛ پچھلے دور کے افسانہ نگاروں کی مقبولیت سے

کوسوں دور رہے۔ ستر کے بعد کے افسانہ نگاروں نے اپنی آنکھوں کے سامنے جدیدیوں کی تنقیدی زورآوری سے افسانہ نگاروں کے مقام ومرتبے کے تعین کا بازار دیکھا تھا، اس لیے ان میں بھی یہ لت در آئی۔ بعد کی نسل کو سوشل میڈیا کا زمانہ حاصل ہوگیا۔ دوسری بات یہ بھی ہوئی کہ اردو زبان کی ریڈرشپ مرحلہ وار طریقے سے گھٹتی چلی گئی۔ کوئی ایسا رسالہ نظر نہیں آتا جس میں نقاد اور قارئین بحث کر کے کسی تحریر کو با اعتبار بنا سکیں۔

ایسے ماحول میں سوشل سائٹس کی مدد سے اردو کے ناول نگاروں کی پوری ایک فوج سامنے آئی جسے خود اپنے ادبی اعتبار کے بارے میں احترام وعقیدت کا عرفان حاصل ہے۔ یہاں مقرر کردہ قبیلے ''انیسیے'' اور ''دبیریے'' بنے ہوئے دستیاب ہیں۔ بعض ناول تو دورانِ تصنیف ہی عظمت وفضیلت کے تاج وافسر سے آراستہ ہو جا رہے ہیں۔ کتاب کی حصول یابی کی رسید، اخلاقی، رواداری اور تکلف میں لکھے ہوئے الفاظ تنقیدی ثبوت کے طور پر آزمائے جا رہے ہیں۔ تاریخ کے اسی موڑ پر شعرا نے قبولیت کے سلسلے سے کوئی عجلت پسندی نہیں دکھائی۔ اپنا نیا یا پرانا کلام پیش کر دیا اور تھوڑی بہت روایتی واہ واہی ہوگئی مگر گردن پر چھری رکھ کر کسی شاعر نے اپنے ہم زبانوں سے اپنی اہمیت منوانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔

یہ کام صرف اور صرف ہمارے عہد کے ناول نگار کر رہے ہیں۔ گم نام قارئین اور ناتجربہ کار اور نوآموز تنقید نگاروں اور پسندیدہ لکھنے والوں سے عقیدت کے پھول قبول کیے جا رہے ہیں۔ مصنف خود اطلاعات فراہم کرتا ہے، اس لیے حیل وحجت کی گنجایش کہاں؟ مگر جب یہ آپ کو پتا چلے گا کہ کسی ناول کی پہلی اشاعت ایک ہفتے میں آؤٹ آف اسٹاک ہوگئی یا تین مہینے میں اس کی چار اشاعتیں اور کئی ملکوں میں دوسری اشاعتیں بھی سامنے آگئیں تو ایک طرف یہ تجربہ کار قصہ نویس کا طبع زاد قصہ معلوم ہوتا ہے یا پھر موجودہ عہد کی اشتہار بازی اور تکنیکی تکڑم یا ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی ہوڑ کے علاوہ اسے کیا کہا جائے؟ اس تماشے میں ناولوں کا کماحقہٗ احتساب نہیں ہو رہا ہے۔ تعارفی، تعریفی اور پانچ سات سو لفظوں کے نوٹس شایع کرائے جا رہے ہیں۔ آٹھ سو صفحات کے ناول کو پڑھ کر اگر کسی نے دس بیس صفحہ نہیں لکھا، خاص طور سے ایسی حالت میں جب اس سے پہلے بھی اس ناول نگار کی کئی تصنیفات سامنے آچکی ہوں تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ موجودہ ماحول میں ناولوں کا آزادانہ احتساب نہیں ہو رہا ہے۔ معاصر اردو فکشن کی نصف صدی کا نصف دوم انھی خطرات کی وجہ سے مشکل دور میں ہے۔ ورنہ جی تو یہ چاہتا ہے کہ اس نسل کے ادبی سرمایے سے دس چُنی ہوئی تحریریں منتخب کر کے ترقی پسند یا جدید عہد کے بڑے لکھنے والوں کی تصنیفات کے متوازی رکھا جائے۔ نشانہ اگرچہ بڑا ہے مگر ایسا کہنا مشکل ہے کہ ہم عصر اردو ناول نگاروں نے آگ کا دریا یا اداس نسلیں یا ایک چادر میلی سی جیسے ناول اگر نہیں لکھے تو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ دو گز زمین، پانی، اماوس میں خواب، مکان، ایوانوں کے خوابیدہ چراغ، لے سانس بھی آہستہ، کئی چاند تھے سرِ آسماں، فائر ایریا، نعمت خانہ اور

زندیق جیسے ناول گذشتہ تیس پینتیس برسوں میں سامنے آئے۔ ذرا زمانی وقفہ بیتنے دیجیے، ان ناول نگاروں کے کچھ اور ناولوں کو شایع ہوکر قارئین کے بیچ بکھرنے دیجیے۔ یقینی طور پر ان میں سے چند تحریریں ہماری تاریخ کا اُسی طرح حصہ بنیں گی جس طرح امراؤ جان ادا، گئودان، آگ کا دریا، اداس نسلیں، آنگن، شکست، ٹیڑھی لکیر وغیرہ ناولوں نے ہماری ادبی تاریخ میں اپنا سکہ بٹھایا تھا۔ ہمیں ہمیشہ یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ ناول کا جادو دھیرے دھیرے قائم ہوتا ہے مگر وہ تادیر قائم رہتا ہے۔ آج کوئی تحریر آئی اور اسی ہفتے میں احتساب کے مرحلے سے گزر کر Magnum Opus بن کر وہ تاریخی مقام حاصل کرنے کی خوگر ہوگئی تو آپ سمجھ لیجیے کہ اس میں کوئی نہ کوئی گڑبڑی ہے۔ ناول کی قدر شناسی ہر حال میں سست روی سے ہی ممکن ہوگی۔ ہمیں ٹھہر کر اور صبر کے ساتھ ہم عصر ناول نگاری کے منظر نامے کے مقام و مرتبے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

آج کے فکشن کے احتساب کے راستے میں یہ بھی رکاوٹ ہے کہ بیش تر تخلیق کار آزادانہ طور پر اپنے احتساب کے لیے تیار نظر نہیں آتے۔ منٹو بیدی کے زمانے کو سامنے رکھیے تو یہ واضح فرق سمجھ میں آجائے گا۔ قرۃ العین حیدر کے بارے میں بھی اچھا خاصا لکھا گیا۔ ہر تنقید سے تخلیق کار کا اتفاق کرنا کیوں کر لازم ہوسکتا ہے؟ غالب اور میر آج زندہ ہوتے تو کیا ان پر جو کچھ لکھا گیا ہے، ان پر وہ بہ نظرِ تحسین توجہ کرتے یا اپنے نقادوں سے حجت پر اپنا بچا ہوا وقت صرف کرتے۔ مشرف عالم ذوقی کی ہر تحریر پر ان کی اپنی رائے مسلم ہوتی تھی، ایسے میں نقاد کا کام کہاں بچ جاتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی صرف مثال ہیں، ان کے جیسے ہم عصروں میں بہت سارے ہوں گے۔ شموئل احمد، خالد جاوید، رحمان عباس اور اشعر نجمی کو بھی اسی فہرست میں شامل رکھنا چاہیے۔ فکشن کی تنقید کے سلسلے سے یہی بڑا مسئلہ ہے۔ ردعمل میں اس عہد کے نقاد کے پاس بھی جائے پناہ ہے۔ ہم عصر ادب کو چھوڑ کر وہ بھی منٹو، بیدی اور قرۃ العین کرتا رہے گا۔ اس لیے صرف ہم عصر نقادوں کو نہیں جاگنا ہے بلکہ ہمارے افسانہ نگار اور ناول نگاروں کو بھی اس تخلیقی خدائی سے باہر نکلنا ہوگا جس کے طلسم میں وہ دورانِ تخلیق گرفتار ہوتے ہیں۔ بیدی اور منٹو بھی باہر نکلے تھے، پریم چند بھی اپنی جادوئی دنیا کے اسیر نہ ہوئے۔ ورنہ ہم آپ وقت کی اس ضرب کو کہاں سنبھال پائیں گے۔

◀◀ ● ▶▶

Department of Urdu,
College of Commerce, Arts and Science,
Patna: 800020, Bihar
Res: 202, Abu Plaza, NIT More,
Ashok Rajpath, Patna: 800006, Bihar
Email: safdarimamquadri@gmail.com
Mob: 09430466321, 07903688448

● ڈاکٹر اسلم جمشیدپوری

اکیسویں صدی میں اردوافسانہ......بہار کے پس منظر میں

جہاں تک نئی صدی اور بہار کے نئے افسانے کا تعلق ہے۔تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہار میں کئی اہم نام ہیں،جنہوں نے اس صدی میں افسانے کے فروغ میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔یوں دیکھا جائے تو اردو افسانے کے نشیب وفراز میں بہار کے افسانہ نگاروں نے ہمیشہ اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ہر عہد میں بہار کے افسانہ نگاروں نے اپنا بہترین پیش کر کے خود کو آگے رکھا ہے۔ایسے بہت سے افسانہ نگار تھے اور ہیں ،جنہوں نے بیسویں صدی کی آخری دو تین دہائیوں سے اب تک افسانے کو استحکام و استناد عطا کیا ہے۔

بہار میں نئی صدی میں افسانے کی بات کی جائے تو اس تقریباً ۲۱۔۲۲ برس میں واضح طور پر دو تین نسلیں افسانے لکھنے میں مصروف ہیں۔ایک وہ نسل جو ۱۹۷۰ کے آس پاس ابھری اور افسانے کے احیا میں اہم کردار ادا کیا۔اس نسل کے کچھ افسانہ نگار اب مرحوم ہو چکے ہیں جبکہ بہت سے افسانہ نگار ابھی حیات ہیں اور تادمِ تحریر ان کے افسانے شائع ہو رہے ہیں۔اس نسل میں حسین الحق ،شوکت حیات،شفق، پیغام آفاقی، عبدالصمد، غضنفر ،مشتاق احمد نوری،اقبال حسن آزاد، ذکیہ مشہدی،شفیع مشہدی، فخرالدین عارفی،شفیع جاوید،انور امام،صبوحی طارق ،کہکشاں پروین،مشرف عالم ذوقی ،نوشابہ خاتون،رحمٰن شاہی،علی امام،اسلم سلازار،وغیرہ نے نئی صدی میں بھی افسانے کی زلفیں سنواری ہیں۔

دوسری نسل ایسے افسانہ نگاروں کی ہے،جس نے ۱۹۸۰ کے آس پاس لکھنا شروع کیا اور صدی کے آخر میں ان کے مجموعے بھی سامنے آئے۔مثلاً مشرف عالم ذوقی ،احمد صغیر،خورشید حیات،تبسم فاطمہ،اسلم جمشید پوری، تسنیم کوثر،افسانہ خاتون،وغیرہ نے نئی صدی میں بھی افسانے کے فروغ میں حصہ لیا۔اس صدی میں افسانے لکھنے والی نسل کے چند نمایاں نام اس طرح ہیں مجیر احمد آزاد ،اوینا ش امن ،رمانہ تبسم،ابو بکر عباد،سلمان عبدالصمد، فیاض احمد وجیہہ،معصومہ خاتون،وصیہ عرفانہ،نیاز اختر،نیلوفر پروین،مشتاق شمسی،شارقہ شفقتین رضوانہ،شفقت نوری،عندلیب عمر،صدف اقبال، زینب نقوی،نسرین ترنم وغیرہ۔

صدی کا بدلنا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔اس صدی کے موضوعات گذشتہ صدی سے بالکل مختلف

تھے۔لیکن گذشتہ صدی کے آخری چند برسوں میں وقوع پذیر ہونے والے بڑے واقعات وحادثات کا اثر واضح طور پر نئی صدی پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔خاص کر بابری مسجد کا انہدام،مختلف فرقہ وارانہ فسادات، بمبئی بم دھماکے، وغیرہ ایسے واقعات وحادثات ہیں،جن کے اثرات دیر پا تھے۔اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان واقعات کے اثرات گذشتہ صدی تک محدود نہ رہے ، بلکہ نئی صدی میں بھی دکھائی دیے۔اقلیتوں کے خلاف نفرت انگیز جذبات کا تالاب وسعت اختیار کرتا گیا اور ایک سمندر کی شکل میں اس صدی میں ظاہر ہورہا ہے۔نفرت کے اس بازار کی اساس گذشتہ صدی میں ہی ملتی ہے۔ ہمارے بعض افسانہ نگار ایسے ہیں ،جن کے پہلے مجموعے کی اشاعت ضرور گذشتہ صدی کے آخر آخر میں ہوئی،مگر ان کی بھرپور شناخت اکیسویں صدی میں قائم ہوئی۔جن میں تبسم فاطمہ،آشا پربھات،تسنیم کوثر،شیریں نیازی،نسرین ترنم، وغیرہ کی اصل شناخت اسی صدی میں ہی مستحکم ہوئی۔ ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے کافی بعد میں افسانہ نگاری شروع کی یا ان کے پہلے مجموعے کی اشاعت کافی بعد میں ،اس صدی میں ہوئی ۔جن میں اظہر نیر،شاہد جمیل،نسیم محمد جان،مشتاق شمسی،(ابرار مجیب،تنویراختر رومانی،اختر آزاد)وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں یوں تو کئی طرح کے افسانہ نگار بہار میں سرگرم عمل ہیں،مگر میں یہاں بہار کے چند ایسے افسانہ نگاروں کا تفصیلی ذکر کرنا چاہوں گا،جنہوں نے اس صدی میں لکنا شروع کیا،یا جن نوجوانوں کے پہلے مجموعے کی اشاعت نئی صدی میں ہوئی۔اور جن کے دم سے نئی صدی میں بہار کا نام روشن اور تابناک ہے۔

اویناش امن کی افسانہ نگاری کی باضابطہ شروعات ۲۰۱۷ میں ہوئی ۔انھوں نے پہلا افسانہ ’’سمندر کی خاموشی اور تنو بھائی‘‘ تحریر کیا، جو فیس بک کے ’’اردو افسانہ فورم‘‘ پر شائع ہوا۔اسی سال ان کا افسانہ ’’کہانی کے آگے کی کہانی‘‘ نیا ورق ممبئی میں شائع ہوا۔بہت جلد اس افسانہ نگار نے اردو کے ابھرتے افسانہ نگاروں میں اپنا منفرد مقام بنالیا۔

اویناش امن نے ایسے افسانے لکھے،جن میں نیا پن اور انفرادیت تھی۔ان کے افسانے چونکا تے ہیں۔ان کے کئی افسانے،شیر کا احساس،خوف،عقرب،پل صراط،طوطے کی فطرت،صبح کیوں نہیں آتی وغیرہ نے نہ صرف چونکایا بلکہ ایوانِ افسانہ میں زلزال پیدا کر دیا۔معروف فکشن نگار شموئل احمد نے ان کے افسانوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

> ’’اویناش امن اپنے تخلیقی رویے میں قدرے مختلف ہیں۔موضوع کے تنوع اور عصری مسائل کے ساتھ ان کے افسانے حقیقت کی نئی جہت سے روشناش کراتے ہیں۔اویناش امن کی کہانیاں، عام انسانوں کے درد سے بھیگا چہرہ لئے

زمین سے اگتی ہیں۔ان کے یہاں خیالات کی وسعت اور مشاہدے کی سچائی ہے۔'' [شیر کا احساس،اویناش امن،فلیپ کور،۲۰۱۹]

شموئل احمد نے اویناش امن کے افسانوں کے تعلق سے سچی اور کھری بات کہی ہے۔اویناش امن کے افسانے آج نہ صرف بہار کی نمائندگی کر رہے ہیں بلکہ نئے اردو افسانے میں موضوع کی بوقلمونی ،پیش کش کے انوکھے انداز اور بہترین تخلیقی زبان کے لئے جانے جاتے ہیں۔

''شیر کا احساس اور دیگر افسانے'' اویناش امن کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔جو ۲۰۱۹ میں شائع ہوا ۔۲۰۲۰ میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل پندرہ افسانے ہیں۔ ہر افسانے کا موضوع مختلف،انداز جدا اور زبان جاذبیت لئے ہوئے ہے۔یوں تو مجموعے کے ہر افسانے پر طویل گفتگو ہو سکتی ہے کہ ان کے افسانے ،شیر کا احساس ،خوف،صبح کیوں نہیں ہوتی، پل صراط،بکھرتے آشیانے،قلی گاڑی، جاگتی آنکھوں کا سراب، مداری،سمندر کی خاموشی اور تنو بھائی وغیرہ افسانے موجودہ عہد کے منفرد افسانے ہیں،مگر میں ان کے بالکل اچھوتے افسانے ''عقرب'' پر کچھ اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ یہ افسانہ اپنے موضوع اور ٹریٹمنٹ میں اردو افسانوں میں بالکل نیا ہے۔اس میں دو کہانیاں متوازی چلتی ہیں۔ایک عقرب یعنی بچھو کی دوسری ایک بے ایمان کلرک کی۔بچھو کے سراپے کا بیان ،اپنے آپ میں انوکھا ہے۔لگتا ہی نہیں کہ یہ تعریف بچھو کے جسمانی اعضاء کی ہو رہی ہے۔:

> ''وہ جب پیدا ہوا تو اپنے بھائی بہنوں جیسا ہی نظر آتا تھا۔انہی کی طرح سرخی مائل، بادامی رنگ ،آٹھ پیر جن میں سے دو شکنجے کی شکل میں آگے کی جانب مڑے ہوئے، چوڑی تہہ دار، آگے جا کر خطرے کا اعلان کرتی ہوئی ہک کی طرح مڑی ہوئی،اوپر کی طرف اٹھی دم میں ضم ہوتی پیٹھ۔''
>
> [افسانہ،عقرب، مجموعہ،شیر کا احساس،اویناش امن،۹۳،مطبوعہ ۲۰۱۹]

اس افسانے نے قارئین کو چونکایا تھا۔ایسے افسانے جن کے موضوعات اور پیش کش مختلف و منفرد ہے،اویناش امن کی شناخت ہیں۔اردو افسانے کو ان سے بہت سی امیدیں ہیں۔

رمانہ تبسم بہار سے ابھرنے والی ایک تازہ کار افسانہ نگار ہے۔رمانہ تبسم نے بہت جلد لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ان کے افسانے عورت کی آواز ہیں،جن میں معصوم اور بے گناہ مظلوم عورتوں کی آوازیں شامل ہیں۔انہوں چار پانچ سال قبل ہی اس دنیا میں قدم رکھا اور اپنی انفرادیت ثابت کی۔ان کا پہلا افسانہ ''بریف کیس'' تھا جو ۲۰۱۶ میں ماہنامہ آنگن،ممبئی میں شائع ہوا۔آپ کا افسانوی مجموعہ ۲۰۱۹ میں ''صبح

بہاراں‘‘ کے نام سے شائع ہوا۔آپ کے پہلے افسانوی مجموعے نے کافی شہرت پائی۔اس مجموعے میں کل ۱۷ افسانے ہیں۔تلاش، داغ، زندگی کے موڑ پر، کاش ایسا ہوتا، آہ، جذبۂ الفت، صبحِ بہاراں، کہاں گئے وہ دن، جال، عکس وغیرہ افسانے مجموعے کی زینت ہیں۔مجموعے کے زیادہ تر افسانے سماج کے نشیب وفراز، اونچ نیچ اور عدم مساوات کے خلاف ایک احتجاج کی شکل ہیں۔آپ کے افسانے ظلم کے خلاف ہیں۔فرقہ وارانہ فسادات، مرد اساس سماج میں گھری عورت، نفرت کا پھیلتا بازار، انسان کی شناخت کا المیہ، دہشت گردی، این آر سی اور شہریت کا قانون آپ کے محبوب موضوعات ہیں۔

رومانہ تبسم کا ایک افسانہ ’’صیاد کا معاہدہ‘‘ فسادات اور این سی آر کے موضوعات کو عمدگی سے اٹھاتا ہے۔ساتھ ہی عدالتوں میں جو ہوتا ہے، اس کی عمدہ تصویر کشی ہے۔

’’دیکھتے ہی دیکھتے دونوں طرف سے مذہبی نعرے فضا میں گونجنے لگے۔گھروں اور عبادت گاہوں کو نذرِ آتش کر رہے تھے اور نفرت کی آندھی تیز ہونے لگی۔چنگاری شعلہ بنتی جا رہی تھی۔شعلے ایکلے بعد دوسرے گھروں کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔فسادی منہ پر رومال باندھے گولیاں داغ رہے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے لاشوں کی فصل اگ آئی تھی۔یہ منظر دیکھ کر وہ دل برداشتہ ہو گیا اور فورس کو موقع واردات پر بھیجنے کے لیے کئی اعلیٰ عہدہ داران کے نمبر ڈائل کرنے لگا لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا بلکہ جو پولیس پہلے سے وہاں موجود تھی وہ دنگائیوں کے ساتھ مل کر پتھر اور گولیاں برسا رہی تھیں، آنسو گیس چھوڑ رہی تھی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔اس کی آنکھوں کے سامنے رحمت اور موہن کے گھروں کو نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔‘‘ [افسانہ: صیاد کا معاہدہ، رمانہ تبسم]

رومانہ تبسم نے اپنی لگ پہچان بنائی ہے۔اکیسویں صدی میں رمانہ تبسم اپنے نقش ثبت کر رہی ہیں۔ان سے مزید بہتر افسانوں کی توقعات ہیں۔

مجیر احمد آزاد بہار کی سرزمین سے افسانوی افق پر نمودار ہونے والا ستارہ ہے۔یوں تو مجیر احمد آزاد نے افسانے لکھنا گذشتہ صدی میں ہی شروع کر دیا تھا۔اور صدی کے آخر تک کافی شہرت کما چکے تھے۔ان کی پہلی کہانی ’’جیون اپنا‘‘ روزنامہ قومی تنظیم میں ۱۹۹۸ میں شائع ہوئی۔جبکہ ماہنامہ ’’آواز نو‘‘ دربھنگہ میں ان کی کہانی ’’واپسی کا سفر‘‘ ستمبر ۱۹۹۹ میں شائع ہوئی۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ’’ڈوم‘‘ ۲۰۰۴ میں شائع ہوا۔ان کے اب تک چھ افسانوی مجموعے اور ایک بچوں کے لئے کہانیوں کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔

مجیر احمد آزاد نے کثرت سے افسانے لکھے ہیں۔ان کے افسانے ملک و بیرونِ ملک کے موقر ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ان کے افسانوں میں ترقی پسندی کے عناصر بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔وہ ایک ایسے معاشرے کی تعمیر وتشکیل کرنا چاہتے ہیں،جس میں مساوات ہو،سب کو برابر کا حق حاصل ہو،حاشیائی لوگ بھی سماج میں جینے کا برابر حق رکھتے ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں جہاں دیہات کو موضوع بناتے ہیں تو شہروں کی زندگی اوراس کے مسائل کو عمدگی سے اپنے افسانوں کا جز بناتے ہیں۔ان کے افسانوں کے تعلق سے نئی نسل کے ناقد ڈاکٹر جمال اویسی رقم طراز ہیں:

''مجیر اپنے افسانوں میں اس ضابطہءحیات تلاش کرنے کے جو یانظر آتے ہیں۔جس میں انسان کا وقار بلند ہو۔کہا جا سکتا ہے کہ مجیر احمد آزاد کے افسانے خاص مقصد حیات کے تحت لکھے جاتے ہیں۔اگران کے افسانوں میں جدید زندگی کا آشوب ہرصورت سے دکھائی دیتا ہےتو اس کے پیچھے افسانہ نگار کا مافی الضمیر کارفرما ہے'' [دربھنگہ میں اردو افسانہ،مجیر احمد آزاد،ص۵۹]

جمال اویسی کی بات یہاں تک تو سچ لگتی ہے کہ مجیر احمد آزاد خاص مقصد حیات کے لئے افسانے قلم بند کرتے ہیں۔دراصل مجیر احمد کے افسانے کسی مقصد کے تحت لکھے جاتے ہیں،وہ زندگی کو بڑے کینوس میں دیکھتے ہیں۔وہ انسان کوانسان مانتے ہیں۔وہ انسان کو خانوں میں بانٹنے کے خلاف ہیں۔وہ ہر طرف خوشحالی چاہتے ہیں۔خوشی سب طرف ناچے گائے۔شہر کے ساتھ گاؤں بھی ترقی کریں۔ان کے افسانوں میں بہار کی زندگی اوراس کے مسائل ملتے ہیں۔بے روزگاری،بھوک،مفلسی،گھریلو مسائل،تشدد،دہشت گردی،نکسل واد،غنڈہ گردی،فرقہ واریت،سیاسی نشیب وفراز،سماجی تانابانا جیسے موضوعات مجیر احمد آزاد کے افسانوں میں عام طور پر ملتے ہیں۔پژمردہ پودے،دل کی لگی،انتظار،زمین،راگھو کی کھیتی،ڈوم،ابر کا ٹکڑا،کلاس ٹاپر،اندھیرے کا کرب،ٹھہری ہوئی صبح،دور دیس میں،جھکی ہوئی شاخ وغیرہ مجیر احمد کے نمائندہ افسانے ہیں۔ان کا ایک افسانہ ''ابر کا ٹکڑا'' کا یہ اقتباس دیکھیں:

'' تیز جھلسا دینے والی گرمی نے دہقانوں کی آنکھوں میں خدشات کے سائے بڑھا دیے۔ایسا لگتا تھا آسمان سے آگ کے گولے برس رہے ہیں۔دن ہفتہ اورمہینہ بیت گیا۔ابر کا ایک آوارہ ٹکڑا آسمان میں سیر کرتا گذر جاتا اور بارش کی آس میں آسمان پرنظریں ٹکائے ہوئے کسان حسرت سے اسے دیکھتے رہ جاتے۔نیل گو آسمان کی رنگت اب آنکھوں میں چبھنے لگی۔'' [افسانہ،ابر کا ٹکڑا،مجیر احمد آزاد]

مذکورہ افسانے میں افسانہ نگار نے عورت کی تنہائی کے کرب کو پیش کیا ہے۔دراصل یہ افسانہ عورت اور مرد کے درمیان کی ہمیشگی کی دوری کو لفظوں میں ڈھالا ہے۔لیکن یہ افسانہ گاؤں کی زندگی اور کسانوں کے مسائل کو اٹھاتا ہے۔افسانہ نگار نے عمدگی سے عورت کی زندگی کی تنہائی اور کسانوں کی بادلوں سے امیدوں کو متوازی پیش کیا ہے۔آخر کار آسمان سے برسنے والے بادل عورت اور کسان دونوں کی امیدوں کو پورا کرتا ہے۔مجیر احمد آزاد نے بڑی فنکاری سے افسانہ کیا ہے۔مجیر کے افسانوں کی زبان کبھی کبھی کھٹکتی ہے۔ہوسکتا ہے کہ یہ مقامی زبان کا اثر ہو۔

نیلوفر پروین،اردو کی ابھرتی ہوئی افسانہ نگار ہیں۔نیلوفر پروین کا تعلق تو گذشتہ صدی سے ہی ہے۔انہوں نے افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے آخر میں کیا تھا۔ان کا پہلا افسانہ ۱۹۷۹ میں شائع ہوا تھا۔لیکن وہ اکا دکا افسانے لکھنے کے بعد،خاموش ہوگئی تھیں۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”جوہی کی کلی“ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی سے ۲۰۲۱ میں شائع ہوا۔اس طرح ان کا شمار نئی صدی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

نیلوفر پروین کے مجموعے ”جوہی کی کلی“ میں پندرہ افسانے اور نو افسانچے شامل ہیں۔یوں دیکھا جائے تو نیلوفر پروین کے افسانوں میں پختگی ملتی ہے۔یہ پختگی دراصل تجربے اور مشاہدے سے آتی ہے۔ان کے بیشتر افسانے سماج کی دکھتی نبض ٹٹولنے جیسے ہیں۔وہ سماج کے عدم مساوات کے خلاف احتجاج ہیں۔’دائروں کے بیچ‘ اور ’جنم جنم کے ساتھی‘ ایسے افسانے ہیں،جن میں افسانہ نگار نے سماج کی نابرابری کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔ان افسانوں میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح حیثیت والے کمزوروں پر ظلم وستم ڈھاتے ہیں۔بڑے کوئی کام کریں تو جائز ،اسی کام کو چھوٹے کریں تو گناہ گار قرار دیے جاتے ہیں۔سماجی تقسیم،پیار محبت،پسماندہ طبقات کے مسائل،فرقہ وارانہ تشدد،دہشت گردی کے مختلف روپ،ملک میں بدلتی سیاسی سماجی صورت حال،انسانیت،عورت کے جذبات،ماحولیات وغیرہ کو موضوع بنا کر نیلوفر پروین نے افسانے کے قالب میں ڈھالا ہے۔معروف افسانہ نگار،نگار عظیم نے ان کے افسانوں پر اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔:

> ”نیلو فر نے سب سے زیادہ مسائل خواتین کے ہی پیش کئے ہیں۔دراصل زندگی کی ناہمواریاں، اضطراب، بے چینی، بے قراری ہی اظہار کی وجہیں پیدا کیرتی ہیں۔۔۔زندگی میں پیش آنے والے کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں،جنہیں عام انسان نظر انداز کر دیتا ہے۔دل میں لئے بیٹھا رہتا ہے،بھول جاتا ہے۔لیکن قلم کار زیادہ حساس ہوتا ہے۔لہٰذا الفاظ کی کاریگری سے وہ کاغذ پر نقش بناتا ہے۔“ [جوہی کی کلی،نیلوفر پروین،ص ۷۔۸،مطبوعہ ۲۰۲۱]

نگار عظیم کی یہ بات قابل غور ہے کہ قلم کار حساس ہوتا ہے۔اور وہ مختلف واقعات وحادثات کو قلم سے افسانہ بنا دیتا ہے۔نیلوفر کے اس مجموعے میں میں جو افسانے ہیں،ان میں سے بہت سے ایسے افسانے جو اچھے افسانوں کے زمرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔جوہی کی کلی،جنم جنم کے ساتھی،چارہ گر،شمع جلتی رہے گی،گھبرا کے محبت کر بیٹھے،دائروں کے بیچ،جذبہ ءدل،اجنبی دوست،ایک زخم اور سہی،ایسے افسانے ہیں جو نیلوفر کی شناخت ہیں۔ان افسانوں میں عورت کی زندگی،ان کے مسائل،سماج میں ان کا مقام،کسی کے لئے خود کو قربان کرنے کا جذبہ وغیرہ کو نیلوفر نے بہت اچھے ڈھنگ سے لفظوں کا جامہ پہنایا ہے۔نیلوفر پروین کے ایک افسانے کا اقتباس دیکھیں،آپ کو ان کی افسانہ نگاری کا معیار اور زبان سمجھ میں آجائے گا۔:

> ’’اور پھر آہستہ آہستہ کرن نے محسوس کیا کہ وہ خود کو محتاط رکھنے کے باوجود اندر سے کافی بکھر چکی ہے۔وہ غیر شعوری طور پر کاشف کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔وہ اسے پسند کرنے لگی ہے۔اپنے دل کے انکشاف پر وہ خاموش رہی کیونکہ اپنی خواہش کے آگے اس نے مصلحت کی دیوار چن رکھی تھی۔اپنے بھائی نادر کی ملازمت ہوجانے تک وہ اپنی ممی کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی۔‘‘ [افسانہ،جذبہ ء دل،نیلوفر پروین،ص ۷۸]

نیلوفر کے افسانے آس پاس کے کرداروں کے حامل ہیں۔وہ روزمرہ کے واقعات کو افسانوں میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔جوہی کی کلی،ان کے افسانوں کا پہلا پڑاؤ ہے۔امید ہے کہ نیلوفر پروین آئندہ اور اچھے افسانے دیں گی۔

ڈاکٹر شاہد جمیل نے اپنی افسانہ نگاری سے متاثر کیا ہے۔یوں تو شاہد جمیل گذشتہ صدی کے اواخر سے ہی لکھ رہے ہیں۔مگر ان کا پہلا مجموعہ ’’ابابیل کی ہجرت‘‘ گذشتہ برسوں ہی منظر عام پر آیا ہے۔ویسے شاہد جمیل کی کئی کتابیں پچھلی صدی میں شائع ہوگئی تھیں۔لیکن انہوں نے افسانے کی ابتدا گذشتہ صدی میں ہی کی تھی۔

شاہد جمیل نے افسانے کے میدان میں تاخیر سے قدم رکھا۔مگر ایسے افسانے قلم بند کئے،جو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ان کے پہلے مجموعے میں پندرہ افسانے شامل ہیں۔جن میں ابابیل کی ہجرت،جالے میں پھنسی مکڑی،دست و بازو،داغ،محبت کا صلہ،تہی دست،اپنے پرائے،مہاجر،صحرا میں بھٹکتی چڑیا،ایسے افسانے جنہیں شاہد جمیل کے نمائندہ افسانے کہا جا سکتا ہے۔شاہد جمیل کے افسانوں کا وصف یہ ہے کہ وہ بنا فلسفہ بگھارے زندگی کے معمے کو افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں پیچیدہ مسائل،عورتوں کی الجھنیں،نیا زمانہ،فلیٹ کلچر،ایک ان دیکھی ریس،جذبات کا تلاطم،تہذیبوں کا تصادم،معاشرے کا

بکھراؤ،نسلوں کے درمیان کا فاصلہ،سوچ کا فرق جیسے معاملات نظر آتے ہیں۔ان کے افسانوں کی زبان،ان کے بہار کے معاصرین میں اچھی ہے۔ایک تخلیقی رچاؤ ہے،جوان کے افسانوں میں خاص کشش پیدا کرتا ہے۔

شاہد جمیل کے افسانے میں عوام کا درد اور کسک ملتی ہے۔دراصل ان کے پاس زندگی کا تجربہ اور اپنا مشاہدہ ہے۔وہ افسانوں میں آس پاس کے کردار اٹھاتے ہیں۔ان کے کردار ہمارے آپ کے جیسے انسان ہوتے ہیں،جو گناہ بھی کرتے ہیں تو دوسروں کی بھلائی اور ہمدردی بھی کرتے ہیں۔ان ایک افسانے کا اقتباس دیکھیں۔:

> ''ملبیر سنگھ صبح نسیم کا لطف لیتا ہوا ڈھابے جا رہا تھا کہ بیتے دن فلم کی طرح اس کے ذہن میں رواں ہو گئے۔پھر وہ ماضی کی وادی میں چہل قدمی کرنے لگا۔اسے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔دسواں کلاس پاس کرتے بابو جی نے اپنے دوست کی اکلوتی بیٹی سے اس کی شادی کرادی تھی۔اچانک اس کی زندگی بدل گئی تھی۔اسے گل،گلستاں نظر آنے لگا تھا۔وہ رس گلے کی طرح پریم رس میں ڈوبا رہنا چاہتا تھا۔لیکن بابو جی اسے جلیبی کی طرح شیرے سے فوراً نکالنے پر تلے تھے۔''[افسانہ ،داغ،مجموعہ ،ابابیل کی ہجرت،ڈاکٹر شاہد جمیل،ص ۱۶۲،مطبوعہ،۲۰۱۸]

شاہد جمیل سے بہت توقعات ہیں۔اگر وہ اسی طرح مزید اچھے افسانے لکھتے رہے تو اردو افسانے میں بہار کی نمائندگی ہوتی رہے گی۔

نیاز اختر اردو افسانے کا ابھرتا ہوا ایسا نام ہے جس نے لکھنا تو گزشتہ صدی میں ہی کر دیا تھا،لیکن ان کا پہلا مجموعہ ''بوڑھے برگد کا انت'' ۲۰۱۳ میں شائع ہوا۔جبکہ ان کا پہلا افسانہ ''روح کا سفر'' ۱۹۸۵ میں سہ ماہی صدف، بھاگلپور میں شائع ہوا۔ان کے افسانوں میں بہار کی زندگی،وہاں کے لوگوں کے مسائل،طبقاتی کشمکش،ماحولیاتی نظام،ماحولیات کو پراگندہ کرنے والے عوامل،آدی باسی زندگی،سہر کے ساتھ ساتھ گاؤں دیہات کی پریشانیاں،انسانی نفسیات اور الجھنیں وغیرہ کو نیاز لفظوں میں ڈھال کر افسانہ کیا ہے۔ان کے افسانوں سے متعلق پروفیسر کوثر مظہری فرماتے ہیں:

> ''نیاز اختر نے جو بھی کہانیاں لکھی ہیں وہ ہماری اپنی زندگی سے ماخوذ ہیں۔اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر وہ کہانیاں لکھتے ہیں۔کردار بھی جیتے جاگتے ہیں۔ایسا اس لئے ہے کہ وہ اپنے Locale اور تہذیبی سیاق سے خود کو الگ نہیں رکھتے۔''[نیاز اختر کی کہانی،کوثر مظہری،مشمولہ بوڑھے برگد کا انت،نیاز اختر،ص ۷]

پرفیسر کوثر مظہری کی نیاز اختر کے افسانوں سے متعلق رائے مبنی بر حقیقت ہے۔نیاز اختر نے

اپنے آس پاس کو زیادہ فوکس کیا ہے۔ یہ کسی بھی فنکار کے لئے اچھی بات ہے۔ کوئی بھی فنکار اس وقت بڑا ہوتا ہے، جب وہ اپنے فن میں اپنے آس پاس کو پیش کرتا ہے۔ موضوع کوئی بھی ہو بڑا نہیں ہوتا، اسے افسانہ نگار استعمال کرتا ہے، اس میں انسانی خوشی و غم کی آمیزش کرتا ہے پھر زبان کی چاشنی میں پیش کرتا ہے ۔نیاز اختر کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہم عصروں سے زیادہ ماحولیات اور اس کے تحفظ کی بات کی ہے۔ ان کے افسانے کا ایک ٹکڑا دیکھیں اور خود اندازہ لگائیں۔:

’’گاؤں کے اس بوڑھے برگد کا سب سے بڑا پجاری جٹا شنکر تھا، جو چوراسی کے لپیٹے میں تھا۔ لیکن اب بھی چاق چوبند تھا۔ وہ روزانہ گاؤں سے ایک کلومیٹر پر واقع ندی تٹ پر اشنان کرتا اور ایک لوٹا جل لئے ہری جاپ کرتا ہوا برگد کے قریب آتا اور لوٹے کا نرمل جل اس برگد کی جڑ میں انڈیل دیتا۔ جٹا شنکر کو جل ڈالتے دیکھ کبھی لوگ پوچھ بیٹھتے کہ آخر وہ دیوی دیوتا پر جل ارپن نہ کر برگد کی جڑ میں ہی کیوں ڈالتا ہے تو جٹا شنکر بڑی ونمرتا سے جواب دیتا ہے۔

’’یہ کوئی معمولی برگد نہیں ہے، یہ میرے Sentiment سے جڑا ہوا ہے۔‘‘

[افسانہ، بوڑھے برگد کا انت، نیاز اختر، ص ۴۱-۴۲]

بہار کی اکیسویں صدی میں نمائندگی کرنے والے افسانہ نگاروں میں ابوبکر عباد کا نام منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ ابوبکر عباد بنیادی طور پر ناقد و محقق ہیں۔ لیکن ابوبکر عباد نے عمدہ افسانے بھی تخلیق کئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ابوبکر نے گذشتہ صدی کے آخر میں افسانے قلم بند کرنا شروع کیے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ابوبکر نے بہت کم افسانے لکھے۔ لیکن نئی صدی میں ابوبکر عباد نے بطور افسانہ نگار خود کو تسلیم کرایا ہے۔ آج ابوبکر عباد کے افسانے ملک کے معتبر ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ ابوبکر عباد کا پہلا افسانہ ’’بوسہ‘‘ ۱۹۸۹ میں فلمی ستارے میں شائع ہوا۔ بعد میں ان کے افسانے ایوانِ اردو میں دوست سے ہو دشمنی مگر، ہاتھ میں لے کر سرخ نشان اور الفاظ میں، آخری سردار، شائع ہوئے۔

ابوبکر عباد کے افسانے نئے زمانے کے نوجوانوں کے قصے ہیں۔ خاص کر یونیورسٹیز اور کالجز کے احاطوں میں پلنے اور پنپنے والے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے عشقیہ قصے، ساتھ ہی ان احاطوں سے بلند ہونے والی بیداری کی آواز کو ابوبکر عباد نے فن کارانہ مہارت سے افسانوی قالب میں ڈھالا ہے۔ دراصل وہ خود اے ایم یو، ڈی یو اور جے این یو سے وابستہ رہے ہیں۔ جامعہ کو بھی انہوں نے قریب سے دیکھا ہے۔ ان تعلیمی اداروں میں گذشتہ برسوں بیداری کی جو لہر اٹھی تھی، اس کا مشاہدہ ابوبکر عباد کو ہے۔ انہوں نے

اپنے افسانوں میں اس کا بہتر استعمال کیا ہے۔ابوبکر عباد کے افسانوں میں زندگی کے حقائق، مرد عورت کے رشتے، بے روزگاری کا کرب، سیاسی کرپشن، سماجی نشیب وفراز کو نئی نسل کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔

ابوبکر عباد کے ایک افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا۔ ابھی تو یہ انگڑائی ہے، آگے اورلڑائی ہے۔۔ہم کیا چاہیں؟ آزادی۔۔بھید بھاؤ سے آزادی۔۔''

[افسانہ۔۔ہاتھ میں لے کر سرخ نشان، ابوبکر عباد]

''خوش لباس اور خوبرو لڑکے لڑکیاں ہاسٹلوں سے نکل کر خوشبو کی مانند ہر سو پھیلنے لگتے۔ پیڑ کی چھاؤں میں بنے ڈھابے آباد ہو جاتے اور گرما گرم چائے کی چسکی اور کے سرور آمیزش کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ یونین اور الیکشن کی باتوں سے شروع ہونے والی گفتگو نیشنل اور انٹرنیشنل پالیٹکس تک جا پہنچتی تھی۔اور زبان و ادب کی بحثیں فکر وفلسفے کی منزلیں طے کرنے لگتیں۔''

[افسانہ۔۔وہ بے وفا کس کا ہوا، ابوبکر عباد]

فیاض احمد وجیہ نے نئی صدی میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔وہ بہار کی نوجوان نسل میں سب سے الگ ہیں۔ان کے موضوعات میں فکر وفلسفہ کے ساتھ گہری نفسیات بھی ملتی ہے۔فیاض احمد وجیہ کا شمار ان نوجوان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی عمر سے آگے کا افسانہ لکھا۔وہ انسانی نفسیات کے ماہر نباض ہیں۔ان کے افسانے عورت مرد کے رشتوں کی پیچیدگیوں کو ان کی نفسیات کے مطابق پیش کرتے ہیں۔وہ حساس دل رکھتے ہیں۔کبھی کبھی ان کے افسانے دل ودماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔وہ جذبات نگاری کے بھی ماہر ہیں۔ان کے افسانے، ہی کیزو بینا، سونپی ہوئی موت، سوگندھی، وغیرہ اپنے موضوعات کی بوقلمونی اور انسانی نفسیات کے لئے جانے جاتے ہیں۔فیاض احمد وجیہہ کے ایک افسانے کا اقتباس دیکھیں، آپ کو فیاض احمد کی انفرادیت سمجھ میں آجائے گی۔

''وہ بار بار اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''وہ بڑبڑایا۔کاس بناتا یہ سرخ نشان غائب ہو کر لمبا ہوتا ہوا ایاز اور جمیلہ پر۔۔۔اس کی زوردار چیخ اور مزاحمت کرتی ہوئی آواز نکلی۔''جمیلہ۔۔جمیلہ۔۔'' لیکن جمیلہ وہاں نہیں تھی۔وہ دوڑتا ہوا باہر آیا اور ہانپنے لگا۔سامنے صحن پر ایاز کے پاس ہی جمیلہ۔۔۔اس نے ایک بار پھر آنکھیں ملیں۔۔لیکن وہاں صاف طور پر سرخ نشان۔۔اسے محسوس ہوا، اس کی

آنکھوں سے لہو کی ندی بہہ رہی ہے، جو اسے تصویر کی سچائی سمجھا رہی تھی۔اس بار تصویر کو نہارتے نہارتے اسے گھٹن محسوس ہونے لگی۔''

[افسانہ۔سی کیز و بینا، فیاض احمد وجیہ]

سلمان عبدالصمد کی بنیادی پہچان ناقد اور ناول نگار کی ہے مگر سلمان عبدالصمد نے اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا افسانوں سے ہی کی تھی۔ان کے افسانے ملک کے موقر ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔سلمان عبدالصمد کی پہلی کہانی ''فیصلہ'' ۲۰۰۹ میں روزنامہ راشٹریہ سہارا میں شائع ہوئی تھی۔ان کے ایک درجن سے زائد افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ان کے افسانے موجودہ عہد کے مسائل کو آواز دیتے ہیں۔عام انسانوں کا دکھ، نوجوانوں کی بے روزگاری، تعلیمی شعبے کی خامیاں، درس گاہوں میں انگڑائی لیتا سماجی انقلاب، تہذیبی بحران، مذہبی تفریق، سماجی نشیب وفراز وغیرہ کو سلمان عبدالصمد نے بہتر ڈھنگ سے افسانہ کیا ہے۔سلمان کے ایک افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔:

''نیر اور نور رشیہ نے زندگی کی بہاروں میں اس وقت بھی دوستی کا رنگ بکھیرا تھا جب دونوں فیملی کی نگاہیں، دونوں پر کڑی تھیں۔بچپن کی ڈور نے ہی شاید انہیں، اسی وقت جوڑ دیا تھا، جب تہذیبی پنجروں کے منھ بند تھے۔ذات پات کی دیواریں اونچی اور خونی تھیں۔مذہبی وادیاں خاردار تھیں۔لیکن اب ذات پات کا جن بوتل میں قید ہوا چاہتا ہے۔مذہب، قریب ہے کہ زنجیروں میں سما جائے......'' [افسانہ ، نیا خدا۔سلمان عبدالصمد]

۱۹۷۰ اور ۱۹۸۰ کے بعد کے بہت سے افسانہ نگار اس صدی میں بھی خوب لکھ رہے ہیں۔ان کے بغیر اکیسویں صدی میں اردو افسانے کے فرغ کے متعلق بات کرنا ناممکن سا ہے۔ان افسانہ نگاروں نے نئے افسانہ نگاروں کی نہ صرف تربیت کی بلکہ انہیں حوصلہ بھی بخشا۔ایسے افسانہ نگاروں میں شہاب دائروی، حسین الحق، شوکت حیات، عبدالصمد، غضنفر،، شموئل احمد، اقبال حسن آزاد، سید احمد قادری ،مشرف عالم ذوقی، قمر جہاں، علی امام، اظہر نیر، تبسم فاطمہ، اشرف جہاں، احمد صغیر، خورشید حیات ، زینب نقوی، نسرین ترنم، نوشابہ خاتون، افسانہ خاتون وغیرہ نے اس صدی میں بھی خوب لکھا ہے۔اور ان کے مجموعے بھی اس صدی میں شائع ہوئے۔میں کچھ افسانہ نگاروں کے تعلق سے بات کروں گا۔

حسین الحق بہار کے ایسے افسانہ نگار ہیں، جن پر اردو افسانہ ناز کرسکتا ہے۔حسین الحق گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی سے ہی افسانے لکھ رہے ہیں۔آپ کے کئی مجموعے گذشتہ صدی میں شائع ہوئے۔اس صدی میں

آپ کے دو مجموعے، سوئی کی نوک پر رکا لمحہ (۲۰۰۲) نیو کی اینٹ (۲۰۱۰) شائع ہوئے ہیں۔ نئی صدی میں حسین الحق نے افسانے کی زلفیں سنواریں۔ حسین الحق نے افسانے کے ساتھ ناول بھی تحریر کئے ہیں۔

بابری مسجد کے سانحے پر حسین الحق نے ''نیو کی اینٹ'' لکھ کر اپنی فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔ اس افسانے کا نہ صرف موضوع منفرد ہے، بلکہ یہ افسانہ اقلیتوں کی موجودہ صورت حال کا نوحہ ہے۔ حسین الحق نے اپنے افسانوں کے ذریعہ نہ صرف اقلیتی ڈسکورس کی بازیافت کی ہے بلکہ ملک کی بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ بابری مسجد کی مسماری کے مسلمانوں کے دل میں بس جانے والے خوف کو حسین الحق نے ملک کی تہذیبی روایت کے پس منظر میں افسانہ کیا ہے۔ یہ بات انہیں انفرادیت عطا کرتی ہے۔

حسین الحق کے مشہور و معروف افسانوں میں سوئی کی نوک پر رکا لمحہ، ماحصل، اندھی دشاؤں کے سائے، مردہ آنکھوں کا زہر، بارش میں گھرا ہوا مکان، میری تمہاری کہانی، کھلی مٹھی کا نوحہ، یادوں کے کھنڈر، کفن احساس کا، ابھرتی ڈوبتی چاپ، آتم کتھا، منادی، ناگہانی، بلبلہ، بند مٹھی کا نوحہ، چہرہ پس چہرہ، نیو کی اینٹ، صحرا کا سورج، مور پاؤں، سبحان اللہ وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو اردو افسانے کی روایت میں اضافے سے کم نہیں۔ حسین الحق کا مشہور افسانہ ''ناگہانی'' ہے، جس میں بہار کی طبقاتی کشمکش اور ایری غریبی کا تقسیم کے پس منظر میں ایسا بیان جس نے کہانی کو انسانی زندگی کا مرقع بنا دیا ہے۔ اس کہانی کے کردار عزت النساء، جلال الدین، منشی بنسی دھر کے ذریعہ حسین الحق نے جاگیردارانہ نظام کے آخری ایام، جنسی بے راہ روی، عورت کی عزت و عصمت، دم توڑتی ہوئی تہذیب کا نوحہ فنکاری سے لفظوں میں ڈھالا ہے۔ کہانی کا ایک اقتباس دیکھیں۔:

> ''زمین داری کے بل پر صرف جلال الدین کا غضب نہیں چلتا تھا، پورا گھر چلتا تھا، زمین داری گئی تو گھر کے سارے ہالی موالی بھی لیتی گئی اور بے زمینی سے گھبرا کے اس کے بھائی بھی، دوسرے شہروں کو سدھار گئے، بعد میں خبر ملی کہ ان شہروں سے پاکستان روانہ ہو گئے۔ بچ گئے جلال الدین کے بوڑھے ماں باپ، وہ وقت کی مار زیادہ نہ سہہ سکے، اور بس دو میں آگے پیچھے عدم آباد سدھارے۔ خود عزت النساء کے میکے والے پہلے پاکستان جا چکے تھے۔ عزت النساء کی کائنات بس تین بچے اور فالج زدہ سوہر! عزت النساء کے لئے زندگی خارش زدہ کتے کے سر کا زخم بن گئی تھی۔'' [افسانہ، ناگہانی، مجموعہ۔ نیو کی اینٹ، حسین الحق۔۔]

شوکت حیات کا شمار بہار کے ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے بین الاقوامی شہرت پائی، اور جنہوں نے دوسروں کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنے پیمانے اور معیار خود طے کئے۔ اسی لئے جب

جدیدیت کے بعد بہت سے افسانہ نگاروں نے مابعد جدیدیت کو قبول کر لیا تھا،شوکت حیات نے اپنی اصطلاح خود وضع کی۔انامیت نامی اصطلاح شوکت حیات کی دین ہے۔

شوکت حیات نے بہت سے عمدہ اور خوبصورت افسانے اردو کو دیے۔موجودہ صدی میں بھی شوکت حیات چھائے رہے۔بہت دنوں تک ان کا کوئی مجموعہ نہیں آیا تھا۔۲۰۱۲ میں ان کا واحد مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' شائع ہوا۔جسے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔موجودہ صدی میں بھی شوکت حیات چھائے رہے۔ان کے افسانوں میں سماجی شعور،انسانی نفسیات،فلسفہ،آس پاس کا ماحول،طبقاتی رسہ کشی،تہذیبی شکست و ریخت،انسانیت کا فقدان وغیرہ کو اپنے افسانوں میں ہنر مندی سے پیش کیا۔معروف مابعد جدید ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ شوکت حیات کے افسانوں کے متعلق لکھتے ہیں۔:

> ''شوکت حیات ہمارے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جو تخلیق کار کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں۔وہ ادب اور ادبی مسائل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے اور اظہار خیال کرتے رہتے ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں ادبیت اور سماجی احساس و شعور دونوں پر اصرار کرتے ہیں۔وہ اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے طے شدہ نتائج اور سیاہ و سفید میں بٹے ہوئے افسانے کی روایت سے گریز کرتے ہوئی سچائی کی تلاش اپنے طور پر جاری رکھی اور نئی کہانی کا رشتہ نئی سماجی حقیقتوں سے جوڑا۔'' [گوپی چند نارنگ،گنبد کے کبوتر،شوکت حیات،ص۲۹۷]

شوکت حیات کے افسانے نہ صرف اپنے عہد کے بلکہ موجودہ عہد کے بھی ترجمان ہیں۔انہوں نے اردو کو ایسے افسانے دیے ہیں کہ ہم اس خزانے پر ناز کر سکتے ہیں۔شوکت حیات کے معروف افسانوں میں مادھو،رانی باغ،سانپوں سے ڈرنے والا بچہ،ڈھلان پر رکے ہوئے قدم،بلی کا بچہ،مسٹر گلیڈ،چیخیں،میت،گھونسلہ،کوبڑ،گنبد کے کبوبر،مرشد،گھڑیال،کوا،وغیرہ افسانے نہ صرف شوکت حیات بلکہ اردو افسانے کی شان ہیں۔

شوکت حیات کے مشہور افسانے گنبد کے کبوتر، پر ایک نظر ڈالیں۔یہ افسانہ بابری مسجد کی مسماری کے بعد ملک کی اقلیتوں خاص کر مسلمانوں

کی جو صورت حال تھی۔خوف و دہشت کے ماحول کی شوکت حیات نے بہترین عکاسی کی ہے۔بابری مسجد واقعے پر اردو میں گنبد کے کبوتر سے اچھا افسانہ نہیں ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''بے ٹھکانہ کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔متواتر اڑتا جا رہا تھا۔اوپر سے نیچے آتا۔بے تابی اور بے چینی سے اپنا آشیانہ ڈھونڈتا اور پھر پرانے

گنبد کواپنی جگہ سے غائب دیکھ کر مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب اڑ جاتا۔اڑتے اڑتے ان کے بازوشل ہو گئے۔جسم کا سارا لہوآنکھوں میں سمٹ آیا۔بس ایک ابال کی دیر تھی کہ چاروں طرف......' [افسانہ ۔گنبد کے کبوتر،شوکت حیات،ص۷۳]

عبدالصمد کا شمار بہار سے ابھرنے والے ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں سے فکشن کی وہ آبیاری کی کہ کہانی کو زمین حاصل ہوئی،قاری سے رشتہ مضبط ہوا،افسانے میں حیوانوں کی جگہ انسان نظر آنے لگے۔عبدالصمد۷۰ کی نسل کے واحد افسانہ وناول نگار ہیں ،جن کے ناول ''دوگز زمین'' کونوجوانی میں ساہتیہ اکادمی انعام حاصل ہوا۔عبدالصمد نے افسانے کے ساتھ ساتھ ناول کے میدان میں بھی اپنی مضبوط ومستحکم شناخت قائم کی۔موجودہ صدی میں بھی عبدالصمد نے اپنے افسانوں اور ناولوں سے اپنی الگ پہچان قائم رکھی۔اس صدی میں بھی ان کے کئی مجموعے اور ناول شائع ہوئے۔ان کے افسانوں کا ایک ضخیم انتخاب بھی منظرعام پر آیا۔

عبد الصمد کے مشہور افسانوں میں بارہ رنگوں والا کمرہ،ہونی انہونی،آگ کے اندر راکھ،نجات،بہ قلم خود،سحرالبیانی،سنگ مرمر کا رنگ،نشان والے،دمِ واپسیں،گھوڑ دوڑ،بہت دیر،دوسری حکومت ،مراتھن،رکے ہوئے قدم،ثوابِ جاریہ،سونے کے چاول،رائگاں،بارہواں کھلاڑی،باسی خبر،بین ہاؤس،بن موسم برسات وغیرہ ہیں۔

دمِ واپسیں کا ایک اقتباس دیکھیں۔آپ کو احساس ہوگا کہ ایک آدمی جب موت کے بالکل قریب ہوتا ہےتو کیا کیا سوچتا ہے۔اس کے اندر ثواب وعذاب،کامیابی وناکامیابی کا حساب لگا تا ہے۔:

''میں نے مرنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔لوگوں کو دیکھتا کہ وہ پرسکون موت پر رشک کرتے ہیں تو مجھے ہنسی آتی تھی۔موت ،موت ہے ،وقت آئے گا تو آجائے گی۔پرسکون اور بےسکون موت کیا ہوتی ہے۔آج مجھے شدت سے ان لوگوں کی بات یاد آرہی ہے۔اوراس کی سچائی پر یقین بھی ہورہا ہے۔زندگی میں،میں نے طرح طرح کے سکون خریدے اور سمجھتا تھا کہ کامیاب ہوگیا۔آج پتہ چلا کہ میں توزبردست ناکامی کا شکارتھا۔معلوم نہیں کس چیز نے مجھے ناکامی کو کامیابی سمجھنے پر آمادہ کیا تھا۔زندگی بھر کامیابی کے نشے میں مست رہا۔حقیقت کی طرف میری نگاہیں کبھی اٹھی ہی نہیں۔آج سب کچھ ختم ہو چکا ہےتو میری آنکھیں کھلی ہیں''

[افسانہ۔دمِ واپسیں۔مجموعہ دمِ واپسیں۔عبدالصمد۔ص ۲۸]

شموئل احمد اپنے انداز کے لئے جانے جاتے ہیں۔شموئل احمد کا شمار ایسے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے ،جنہوں نے اردو افسانے کا وقار بھی رکھا اور افسانے کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔شموئل احمد بیسویں صدی کے اہم افسانہ نگار ہیں۔لیکن نئی صدی میں شموئل نے کافی لکھا ہے۔ان کے کئی افسانے اور ناول جہاں مقبول ہوئے ،وہیں متنازعہ بھی رہے۔گرداب (ناول) لنگی (افسانہ) اسی زمرے میں آتے ہیں۔ویسے شموئل احمد نے بہت لکھا ہے۔افسانے ،ناول ،تنقید،خودنوشت ،تراجم، ٹیلی فلمیں وغیرہ لکھ کر خود کو ثابت کیا۔شموئل احمد نے چار ناول اور چھ افسانوی مجموعے،بگولے، سنگھار دان،القمبوس کی گردن،عنکبوت،نملوس کا گناہ،کوچہء قاتل کی طرف ،اردو کو دیے ہیں۔

شموئل احمد کے افسانے زندگی کے مختلف پہلوؤں کے عکاس ہیں۔ان کے افسانے میں فرقہ پرستی کی نئی عبارت،عورت مرد کے جنسی رشتے،سیاست میں جنسیت کا استعمال،کرپشن،تہذیبی انحطاط،رشتوں کی پامالی،سماجی تانے بانے،طبقاتی کشمکش،بہار میں امیر اور غریب کی تقسیم،دہشت گردی،وغیرہ موضوعات کا استعمال ہوتا ہے۔لیکن شموئل احمد جنسی موضوعات کا استعمال ہنرمندی سے کرتے ہیں۔جنس پر آج بھی مسلم سماج میں کھلے طور پر بات نہیں ہوتی ،لیکن یہ زندگی کی ایک ضرورت تو ہے ہی ،اور افسانوں میں منٹو،عصمت چغتائی ،واجدہ تبسم ،رحمٰن مذنب نے ہنرمندی سے اس کا استعمال کیا ہے۔

شموئل احمد کے مشہور افسانے لنگی،منرل واٹر،نملوس کا گناہ،سنگھار دان،کوچہء قاتل،عنکبوت ،مصری کی ڈلی،محمد شریف کا عدم گناہ،مرگھٹ،کاغذی پیرہن،القمبوس کی گردن وغیرہ ہیں۔

> ”اس نے ایک نظر بیوی کی طرف دیکھا۔اس کے بال کھلے تھے۔اور چہرے پر تازگی تھی۔غالباً اس نے شام کو غسل کیا تھا۔جب بھی وہ شام کو غسل کرتی، بال کھلے رکھتی۔جو لمبے تھے،اور کمر تک لہراتے تھے۔اس نے ہاتھوں کو پیچھے لے جا کر ایک بار بال کی تہوں کو سلجھایا۔اس کے سینے کے ابھار نمایاں ہو گیا اور سپید گردن تن گئی۔جس پر ابھی جھریاں نہیں پڑی تھیں۔اس نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا۔اور منے کو اٹھانے کے لئے بستر پر جھکی تو اس کا آنچل ڈھلک گیا اور کان کے آویزے ہل کر رہ گئے۔“[افسانہ۔۔محمد شریف کا عدم گناہ۔۔مجموعہ۔۔القمبوس کی گردن،شموئل احمد،ص ۲۲]

اقبال حسن آزاد کا شمار بہار کے افسانوی افق سے طلوع ہونے والے ایسے ستاروں میں ہوتا ہے،جس نے اپنی چمک سے دنیائے افسانہ کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا۔اقبال حسن آزاد نے بھی افسانہ نگاری

کا آغاز بیسویں صدی میں کیا تھا۔آپ کا پہلا افسانہ ''انقلاب'' ۱۹۷۷ میں شمع ،نئی دہلی میں شائع ہوا تھا۔ پہلا مجموعہ'' قطرہ قطرہ احساس'' ۱۹۸۷ میں شائع ہوا۔اس صدی میں اقبال حسن آزاد کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔''مردم گزیدہ'' (۲۰۰۵) اور پورٹریٹ'' (۲۰۱۷) شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔

اقبال حسن آزاد کے افسانے سماج کے ناسور کو سامنے لاتے ہیں۔خاندانی انتشار، مذہبی نمائش،انسان کا اندرون،عورت مرد کے رشتے ،زندگی کا فلسفہ،سماجی شعور،فرقہ پرستی کا پھیلتا زہر،رشتوں کی پامالی،روایت کا بکھراؤ،تشدد، دہشت گردی،کرداروں کی نفسیات وغیرہ کو افسانوں کے موضوعات میں ڈھال کر اپنے طور پر کہانی کہنے کی کوشش کی ہے۔اقبال حسن آزاد نے افسانے میں اپنی راہ خود متعین کی ہے۔وہ کسی تحریک یا رجحان سے متاثر نہیں ہوتے ہیں۔ان کے افسانوں کے تعلق سے ڈاکٹر اقبال واجد لکھتے ہیں۔:

> ''ان کے افسانوں کی فضا میں ہم جس طرف بھی نکل جائیں،ہمیں ایک ایسا نادید منطقہ ضرور ملے گا جو ہمیں اپنے ہونے کا احساس دلائے گا اور ہمیں ان چیزوں کی سیر کرائے گا جو یقینی اور وقوع پذیر ہیں۔اس طرح اقبال حسن آزاد نے اردو میں ۸۰ کے بعد کی نسل میں اپنی جگہ بنائی ہے،وہ ان کی افسانہ نگاری کے ساتھ مسلم اور روشن ہے۔اس عہد کے بیشتر لکھنے والوں سے وہ نمایاں اور ثابت قدم ہیں۔ان کے افسانے ان کے عہد کی شناخت بھی ہیں اور آنے والے زمانے کی پیش گوئی بھی۔'' [اقبال واجد، پورٹریٹ۔۔اقبال حسن آزاد،ص ۱۷]

اقبال حسن آزاد کے معروف افسانوں کا سوال ہے۔تو یہ بات بالکل طے ہے کہ سماج کے ہر طبقے کو اپنی اپنی پسند کے مطابق ان کے الگ الگ افسانے مقبول ہیں۔ویسے قطرہ قطرہ احساس،خدا سے مکالمہ،چاندی کے تار، شو پیس ،رونے والے،بے خواب،سوختہ ساماں،مردم گزیدہ،بھول بھلیاں،ٹکٹ،لا مکاں،دھند،عید کا چاند،پورٹریٹ،کاٹنے والے،جوڑنے والے،دھند میں لپٹی ایک صبح،پھر کب آؤ گے،گملے میں اگی زندگی،جلتی ریت پر ننگے پاؤں،مرد،زندگی۔اس پل،وغیرہ ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔شوپیس ان کا ایک لاجواب افسانہ ہے جس میں بدلتی قدروں کو اقبال حسن آزاد نے ماہرانہ طور پر افسانے میں ڈھالا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔:

> ''آتش دان کے اوپر بنے شوکیس میں بیلجیم ،فرانس،انگلینڈ،اور جاپان سے منگوائے شوپیس سجے تھے۔آتش دان میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں اور آتش دان کے سامنے سید شاہنواز حسین خان صاحب آرام کرسی پر آنکھیں موندے نیم دراز تھے۔انکے چہرے اور جسم پر سرخ شعلوں کا عکس لہرا رہا تھا۔ارباز حسین ڈرائینگ روم کے وسط میں آکر

کھڑے ہو گئے۔انہوں نے دیواروں اور شوکیس میں سجے ہوئے شو پیسوں پر نظر ڈالی اور پھر اپنے والد صاحب کو دیکھا۔انہیں لگا جیسے اس ڈرائنگ روم میں ایک اور شو پیس کا اضافہ ہو گیا ہو۔'' [افسانہ،شوپیس،مردم گزیدہ۔اقبال حسن آزاد،ص،۱۵۶]

مشرف عالم ذوقی کا شمار اردو کے انوکھے اور منفرد افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔مشرف عالم ذوقی نے یوں تو گذشتہ صدی کی آٹھویں دہائی سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔انہوں نے پندرہ سال کی عمر میں ہی اپنا پہلا ناول ''عقاب کی آنکھیں'' لکھا تھا۔ذوقی نے بہت کم عمری میں ہی اس دار فانی کو الوداع کہا۔وہ زود نویس تھے۔انہوں نے تقریباً ڈیڑھ درجن ناول ،نصف درجن افسانوی مجموعے،تنقید کی کتب،اسکرپٹس ، خاکے ،اخبارات میں مضامین،اردو کے علاوہ ہندی میں بھی بہت کچھ لکھا۔یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس صدی میں ان سے زیادہ شائد ہی کسی نے لکھا ہو۔ان کے معاصرین میں بھی کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ہاں یہ بات الگ ہے کہ مشرف نے جو کچھ لکھا وہ سب کا سب معیاری تھا۔لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اردو فکشن میں مشرف نے موجودہ سماج کے نشیب وفراز کو جس طرح افسانوی قالب میں ڈھالا ہے،اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے مسائل کو جس عمدگی سے مشرف نے افسانے یا ناول میں ڈھالا، کسی اور نے نہیں کیا۔اس صدی میں مشرف عالم ذوقی بے حد مقبول رہے ہیں۔ان کی مقبولیت عالمی سطح کی ہے۔وہ اس صدی کے مقبول ترین افسانہ نگار ہیں۔

مشرف عالم ذوقی نے اردو افسانے کو بہت کچھ دیا ہے۔بے باکی ،بے خوفی اور دیدہ دلیری ان کے افسانوں کی خاص پہچان ہے۔عصر حاضر کا کوئی سلگتا ہوا مسئلہ ذوقی کی حساس نگاہوں سے بچ نہیں پایا۔دہشت گردی،عالمی دہشت گردی،ہندو دہشت گردی،لیٹر بم،آنر کلنگ،می ٹو،فرقہ وارانہ فسادات،بابری مسجد کا انہدام،ردعمل کے طور پر،ممبئی بم دھماکے،گودھرا کانڈ،گجرات فسادات،مسئلہء فلسطین،تیسری دنیا کی بھوک،نوجوانوں کی بے راہ روی،بچوں میں جنسیت کا بڑھتا رجحان،عورت کو شئے سمجھنے والا مرد اساس سماج،تانیثیت ،میرا جسم میری مرضی،غرض موجودہ دور کا شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جسے ذوقی کے زندہ قلم نے نہ چھوا ہو۔ہاں یہ ضرور ہے کہ مشرف فکشن میں زبان کو دوسرے درجے پر رکھتے تھے۔کہیں کہیں ان کے فکشن میں زبان کے علاقائی اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی کے ایک افسانے کا اقتباس دیکھیں۔:

''بخار ہے۔مجھے بلایا کیوں نہیں۔؟لیپ لگا دیتا۔مولوی کی پھونک اثر کھو چکی ہے۔شلوک پڑھ کر پھونکتا۔پھر دیکھتی۔بٹیا کی آنکھوں میں اب بھی کوئی چمک نہیں ہے۔

''بولے گی نہیں۔۔نہیں بولے گی۔۔نہیں بولے گی تو یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔۔میرا جرم تو بتا دے بٹیا۔۔۔''اس بار پنڈت جی رونے رونے کو ہو

گئے۔ایک دم سے چیخ پڑے۔۔’سن ہندو ہوں ۔۔مودی نہیں ہوں میں‘بٹیا اور مرتضی حیران سے،ان کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔دوسرے ہی لمحے بٹیا پنڈت جی کے گلے سے لگ کرزورزور سے رو پڑی تھی۔۔‘‘

[افسانہ،مودی نہیں ہوں میں۔۔مجموعہ ایک انجانے خوف کا ریہرسل، مشرف عالم ذوقی،ص۔۳۷۸]

قمر جہاں بہار سے تعلق رکھنے والی اہم افسانہ نگار ہیں۔یہ بھی سچ ہے کہ قمر جہاں نے بیسویں صدی میں ہی افسانے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ’’چارہ گر‘‘ ۱۹۸۳میں شائع ہوا تھا۔قمر جہاں نے گذشتہ صدی میں ہی بطور افسانہ نگار اپنی شناخت بنالی تھی۔ان کے افسانے ملک اور بیرون ملک کے ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہونے لگے تھے۔موجودہ صدی میں بھی قمر جہاں کے افسانے شائع ہوتے رہے۔انکا مجموعہ ’’پنجڑے کا قیدی‘‘ ۲۰۱۵ میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل سولہ افسانے شامل ہیں اور سارے اسی صدی میں شائع ہوئے ہیں۔

قمر جہاں کے افسانوں میں تانیثیت ، بہار کے مسائل خاص کر بہار کی عورتوں کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔قمر جہاں کے مشہور افسانوں میں چارہ گر، الماری کی زینت،فریج کی عورت،کٹی پتنگ، دھند،سفر زندگی کا، واہمہ، چانداور چکور کی کہانی، وہ لڑکی، دہشت گرد وغیرہ افسانے قمر جہاں کی شناخت ہیں۔

تبسم فاطمہ کی شناخت اکیسویں صدی سے ہی وابستہ ہے، گوکہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۹۵ میں شائع ہوا تھا۔مگر انہوں اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اکیسویں صدی میں گذارا۔انکی تحریر کی بھی بات کی جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تبسم فاطمہ کے افسانوں اور شاعری میں پختگی اور ٹھہراؤ اس صدی میں آیا۔تبسم فاطمہ ،مشرف عالم ذوقی کی نصف بہتر تھیں،مگر مشرف کی تحریروں کا کوئی اثر تبسم کی تخلیقات پر نظر نہیں آتا۔اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ تبسم شادی سے قبل سے ہی لکھ رہی ہیں۔اوران کا اپنا انداز رہا ہے۔تبسم فاطمہ کے اب تک تین افسانوی مجموعے اور شاعری کے تین مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔تبسم اسکرپٹ لکھنے کی بھی ماہر ہیں۔آپ دوردرشن اور دوسرے چینلس کے لئے مختلف فلمیں بھی بنا چکی ہیں۔

تبسم فاطمہ کے افسانوں میں عورت کا نیا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔وہ چہرہ جو آج کی عورت کا چہرہ ہے۔آج عورت مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کا حوصلہ اور ہمت رکھتی ہے۔وہ مرد کی مرہون منت نہیں ہے۔وہ مرد اساس سماج کے جبر سے خود کو نکالنا جانتی ہے۔تبسم کے افسانے آج کے عہد کی عورت کی آواز ہیں۔دہشت گردی،فرقہ پرستی،عورتوں پر مظالم،رشتوں کی بے حرمتی،میاں بیوی کا تعلق وغیرہ تبسم کے پسندیدہ موضوعات

ہیں۔ان کا ایک مشہور افسانہ ''دشتِ خوف'' ایک عورت کے انجانے خوف کو بہتر ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔

''میں چلتے چلتے پھر ٹھہر گئی ہوں۔گھوم کر پیچھے کی طرف بھی دیکھا، مگر نہیں۔کوئی نہیں تھا۔دور تک کوئی نہیں۔صرف میرا وہم تھا۔مگر ایسا کیوں محسوس کیا میں نے۔ویرانے میں کبھی کبھی اپنے نام بھی بجنے لگتے ہیں۔اور کوئی اجنبی صدا باز گشت کرنے لگتی ہے۔کتنی ہی بار ایسا ہوا۔جب ان اجنبی صداؤں نے مجھے گہری اذیت میں مبتلا کر دیا۔ہر دم ایک خوف۔ایک خطرہ۔جیسے عقب سے کوئی میرا نام لے کر بلا رہا ہو۔مجھے آواز دے رہا ہو۔''سن رہی ہو تم......!''

[افسانہ، دشتِ خوف، تاروں کی آخری منزل، تبسم فاطمہ، ص۔۸۹]

احمد صغیر نئی نسل کے ایک مقبول فکشن نگار ہیں۔انہوں نے افسانے، ناول، تنقید وغیرہ کے میدان میں خود کو ثابت کیا ہے۔احمد صغیر نے پچھلی صدی میں لکھنا شروع کیا تھا۔لیکن ان کی شہرت کا زمانہ اکیسویں صدی ہی ہے۔انہوں نے ناول اور تنقید کے علاوہ افسانے بھی تخلیق کیے۔منڈیر پر بیٹھا پرندہ (۱۹۹۵)، انا کو آنے دو (۲۰۰۱) درمیاں کوئی تو ہے (۲۰۰۷) داغ داغ زندگی (۲۰۱۴) کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی (۲۰۱۵) مجموعے انہوں نے دیے۔

احمد صغیر کے افسانوں میں مقامی رنگ کا فن نظر آتا ہے۔وہ دلت افسانے لکھنے کے بھی ماہر ہیں۔ہندی میں تو دلت افسانوں کی مضبوط روایت ہے۔اردو میں ایسے افسانے بہت کم نظر آتے ہیں۔کم افسانہ نگار ایسے ہیں، جنہوں نے دلت افسانے قلم بند کیے ہیں۔مگر احمد صغیر شاید اردو میں پہلے افسانہ نگار ہیں، جنہوں نے دلت کہانیوں کا پورا مجموعہ ہی تحریر کر دیا۔انہوں فکشن کی تنقید بھی کی ہے۔

احمد صغیر کے مقبول افسانوں کی بات کی جائے تو، انا کو آنے دو، منڈیر پر بیٹھا پرندہ، ہوا شکار، درمیاں کوئی تو ہے، کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی، داغ داغ اجالا، سرنگ، اداس ہو جانے والا لمحہ، تاریکیوں کا رقص اور میرا وجود، قطرہ قطرہ زہر، شہر چھوڑتا نہیں، کرب کا لاوا، منظر دھواں دھواں وغیرہ سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔

''یہ کیسی دنیا ہے؟ یہ کیسا سماج ہے۔؟ غریبی اور مفلسی میں مروتو کوئی پوچھنے والا نہیں اور اگر قدم اٹھاؤ تو انگشت نمائی۔۔یہ انگشت نمائی صرف ہم غریبوں اور صرف ہم عورتوں کے لئے ہی کیوں۔۔۔؟ واقعی جینا بہت مشکل ہے اور بھوکوں مرنا شرعاً اور قانوناً ممنوع ہے۔پھر جینے کے لئے اگر کوئی راستہ نکالا جائےتو یہ دنیا روڑے کیوں اٹکاتی ہے۔۔'' [افسانہ۔سرنگ۔۔مجموعہ۔منڈیر پر بیٹھا پرندہ، احمد صغیر]

خورشید حیات کا تعلق ۱۹۸۰ کی نسل سے ہے۔اس نسل پر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اثرات

تھے۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے علامتوں اور خوبصورت نثر کا استعمال کیا۔ خورشید حیات کا اسلوب اپنے معاصرین میں سب سے جدا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں تخلیقی نثر کا ایسا استعمال کرتے ہیں کہ ان کے ہر لفظ سے ہندوستاں کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھوٹتی رہتی ہے۔ ان کے افسانے علامتوں میں ڈھلے ہوتے ہیں، مگر یہ علامتیں تفہیم و ترسیل میں کبھی مانع نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کے افسانوں کی علامتیں اور کردار ہمارے آس پاس کے ہوتے ہیں۔

خورشید حیات نے اپنا افسانوی سفر تو گذشتہ صدی میں ہی شروع کیا تھا۔ مگر ان کی شہرت اس صدی میں ہی ہوئی۔ ان کا ایک مجموعہ ''ایڈس'' ۲۰۰۰ میں شائع ہوا۔ خورشید حیات زود نویس نہیں ہیں۔ وہ کم افسانے لکھتے ہیں۔ ان کے افسانے ملک و بیرون ملک کے معروف ادبی اسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے مشہور افسانوں میں ایڈز، پہاڑ ندی اور عورت، پانچ انگلیاں، چلتی رکتی گاڑی کے بیچ، کشکول، دائروں کا قیدی، نروان، وقت کے احاطے میں وغیرہ ہیں۔

> ''چلتی گاڑی کے تجربے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ٹرین اپنی پوری رفتار سے چلتی ہے۔ اور مسافر اس کے اندر بیٹھا رہتا ہے۔ رفتار سے بے نیاز، اپنے معمول میں کھویا ہوا۔ اس وقت اسے باہر کی ہر چیز چلتی دکھائی دیتی ہے اور وہ خود کو رکا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔ جب ترقی کی رفتار بڑھی ہے تو انسان کی رفتار رک گئی ہے۔ مگر انسان اس کے بعد بھی ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔''
>
> [افسانہ، چلتی رکتی گاڑی کے بیچ، مجموعہ۔ ایڈز، خورشید حیات، ص۔ ۳۸]

نوشابہ خاتون بھی بہار کی ایسی خاتون افسانہ نگار ہیں، جنہوں نے گذشتہ صدی میں ہی افسانہ نگاری کی شروعات کی تھی، لیکن اس صدی میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے اسی صدی میں شائع ہوئے۔ نوشابہ خاتون کا پہلا افسانوی مجموعہ ''نقار خانہ'' ۲۰۰۷ میں اور دوسرا افسانوی مجموعہ ''بالا دست'' ۲۰۰۹ میں شائع ہوا۔ تیسرا افسانوی مجموعہ ''خلیج'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

نوشابہ خاتون کے افسانے ہمیں ترقی پسند عہد کی یاد دلاتے ہیں۔ بے روزگاری، عورتوں کا استحصال، بچہ مزدوری، زمین داروں کے ظلم و ستم، جہیز کے مسائل، دم توڑتی مثبت قدریں، وغیرہ ان کے محبوب موضوعات رہے ہیں۔ ان کا وصف خاص یہ ہے کہ انہوں موجودہ سماج کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ نوشابہ خاتون نے افسانے کے ساتھ ساتھ معاشرتی ناول بھی قلم بند کئے۔ ''نیا شوفر'' اور ''خزاں کے بعد'' ان کے مشہور ناول ہیں۔ نوشابہ نے اپنے فکشن میں ابہام کا استعمال نہیں کیا۔ علامت سے بھی گریز کیا۔ آپ کے افسانوں میں ترسیل کی کوئی کمی نہیں۔ آپ کی زبان تخلیق کے مطابق ہوتی ہے۔

اظہر نیر کا شمار بہار سے نمودار ہونے والے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے،جنہوں نے ایک عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذار دی۔افسانے لکھے،لیکن کبھی بہت سنجیدہ نہیں ہوئے۔جب سنجیدہ ہوئے تو عمر کافی گذر چکی تھی۔اس صدی میں ان کا پہلا (اور شاید آخری بھی) افسانوی مجموعہ سامنے آیا۔پہلے مجموعے میں افسانے کے ساتھ افسانچے بھی شامل ہیں ''۔سوکھے پیڑ'' اظہر نیر کا ۲۰۲۰ میں شائع ہوا۔اسمیں لگ بھگ تیس افسانے،اٹھارہ منی افسانے اور اٹھارہ افسانچے شامل ہیں۔اظہر نیر نے شاعری بھی کی۔دو شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔

آشا پربھات بہار سے ادبی افق پر نمودار ہونے والے ستارے کی مانند ہیں۔آشا پربھات اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں۔آپنے اپنے قلم کے جادو سے لوگوں کے دلوں میں آشا جگائی ہے۔آپ نے کئی ناول ''دھند میں اگا پیڑ'' (۱۹۹۷) ''میں اور وہ'' ''جانے کتنے موڑ'' کے علاوہ عمدہ افسانے ''وہ دن'' (۲۰۱۵) اس صدی میں شائع ہوئے۔

آشا پربھات نے اپنے افسانوں میں مرد عورت کے تعلقات،سماج کی غلاظتیں،انسان کی نفسیات خصوصاً عورت کی نفسیات،بہار کی طبقاتی رنجش کو پیش کرتی ہیں۔آشا کے افسانے ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔انکے کردار گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں،جو خیر کے ساتھ ساتھ شر کے کاموں میں بھی ملوث نظر آتے ہیں۔ان کے مشہور افسانوں میں،وہ دن،اچھی لڑکی،ایکوریم،سلاخوں کے پیچھے،کچھ رشتے ایسے بھی،خوف،چوتھا نشانہ قیامت وغیرہ شامل ہیں۔

اشرف جہاں کا شمار افسانہ نگار خواتین کے ساتھ ساتھ محقق و ناقد میں بھی ہوتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اشرف جہاں اب ہمارے درمیاں نہیں ہیں۔انہوں نے گذشتہ صدی میں ہی لکھنا شروع کیا تھا،ان کے افسانے انفرادیت کے حامل ہیں۔ان کے افسانوں کا پہلا افسانوی مجموعہ ''شناخت'' ۱۹۹۲ میں شائع ہوا۔دوسرا مجموعہ ''اکیسویں صدی کی نرملا'' ۲۰۱۰ میں شائع ہوا۔اشرف جہاں نے اپنے افسانوں سے اپنا الگ مقام پیدا کیا۔ان کے زیادہ تر افسانے عورت کی شناخت اور مرد اساس سماج میں اس کی حیثیت کو لے کر تھے۔وہ عورتوں کی آزادی کی حمایت تو کرتی ہیں مگر مذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے۔ان کے افسانے شناخت،شکنتلا،تہی داماں،اکیسویں صدی کی نرملا۔۔نیا فسانے کے قارئین پر اثر قایم کیا۔

امتیاز فاطمی بہار کی ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔آپ کا تعلق شاد عظیم آبادی کے خاندان سے ہے ۔آپ کے والد بہزاد فاطمی شاعر اور نثر نگار تھے۔یعنی آپ کو بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔آپ کا پہلا افسانہ ماہنامہ حریم میں ۱۹۸۵ میں شائع ہوا۔ان کے کئی افسانوی مجموعے ''ڈوبتی شام'' فسانہ خون دل کا'' اور ''ایک قطرہ آنسو'' شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

امتیاز فاطمی کے افسانے معاشرے کی اونچ نیچ خاص کر غریبوں اور دبے کچلے افراد کے ساتھ ناروا سلوک کو پیش کرتے ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں نوجوانوں کے روزگار کے مسائل، ہلکی پھلکی جنسی شرارتیں اور معاشرے میں در آنے والی برائیاں ۔۔کو افسانہ کرتی ہیں۔آپ کے اچھے افسانوں میں مٹی کے دیے، شمع فروزاں، گھر کا چراغ، پھر میں نے ایک فیصلہ کرلیا، ایک قطرہ خون، امر بیل، ٹوٹا ہوا سائبان وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

نئی نسل کے بہت سے افسانہ نگار ہیں، جنھوں نے افسانے کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔صدف اقبال ،شارقہ شفقتین رضوانہ، عنبری رحمٰن، رخسانہ خاتون، کہکشاں انجم، شفقت نوری، عندلیب عمر، نزہت طارق ظہیری نے بھی اپنے افسانوں سے چونکایا ہے۔ان خواتین افسانہ نگاروں سے نئی صدی میں بہار کو بہت امیدیں ہیں۔خوشی کی بات ہے کہ بہار سے اب خواتین افسانہ نگاروں کی نئی پود خاصی تعداد میں سامنے آرہی ہے۔

☆☆☆

کتابیات

۱۔اردو کی معروف خواتین افسانہ نگار (جلد اول و دوم) اسماء نینی ۲۔دربھنگہ میں اردو افسانہ مجیر احمد آزاد
۳۔۱۹۸۰ کے بعد اردو افسانہ، احمد صغیر
۴۔نیا اردو افسانہ (جلد اول، دوم) نور الحسنین
۵۔جہانِ فکشن، شہاب ظفر اعظمی
۶۔نئی صدی کا اردو افسانہ، ارشاد سیانوی
۷۔جدید اردو افسانے کے چند اہم فنکار۔ تسنیم فاطمہ
۸۔اکیسویں صدی میں اردو ادب، محمد ارشد کسانہ
۹۔شیر کا احساس، اویناش امن
۱۰۔صبح بہاراں، رُمانہ تبسم
۱۱۔ڈوم، مجیر احمد آزاد
۱۲۔ابابیل کی ہجرت، شاہد جمیل
۱۳۔جوہی کی کلی، نیلوفر پروین
۱۴۔بوڑھے برگد کا انت، نیاز اختر
۱۵۔نیو کی اینٹ، حسین الحق
۱۶۔گنبد کے کبوتر، شوکت حیات
۱۷۔دم واپسیں، عبدالصمد
۱۸۔القمبوس کی گردن، شموئل احمد
۱۹۔مردم گزیدہ، اقبا حسن آزاد
۲۰۔ایک انجانے خوف کی ریہرسل، مشرف عالم ذوقی
۲۱۔تاروں کی آخری منزل، تبسم فاطمہ
۲۲۔منڈیر پر بیٹھا پرندہ، احمد صغیر
۲۳۔ایڈز، خورشید حیات

☆☆☆

HOD, Urdu, CCS University, Meerut
aslamjamshedpuri@gmail.com
09456259850,8279907070

● ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خان

افسانوی ادب کا ایک روشن ستارہ: عطیہ پروین

اردو کی خواتین قلم کاروں میں ناول اور افسانوی ادب کے افق پر ایک نام کئی دہائیوں سے جگمگا رہا ہے اور یہ نام ہے عطیہ پروین!

ان کا اصلی نام سیدہ امت الزہرا اور قلمی نام عطیہ پروین ہے اور اسی نام سے وہ برصغیر ہند و پاک کے افسانوی ادب میں مشہور و معروف رہی ہیں۔ ضلع ہردوئی کا قصبہ بلگرام عرصۂ دراز سے مردم خیز رہا ہے۔ اس سرزمین میں ملک کی کئی اہم ادبی، مذہبی، سماجی اور سیاسی شخصیات نے جنم لیا۔ یہاں کی کئی نابغۂ روزگار اور عظیم المرتبت ہستیوں کی مختلف میدانوں میں اعلیٰ و ارفع خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عطیہ پروین کی ولادت بھی ایک سادات گھرانے میں، اسی قصبے بلگرام میں ہوئی۔

اس زمانے میں، معاشرتی حالات، خاندانی وقار، بزرگوں کے ادب احترام، زمیں دارانہ نظام، عفت و پاکیزگی، پردے کی پابندی اور محدود سوچ وفکر کے باعث قصبے کے زمیں دار سید خاندان کی لڑکیاں اسکول، کالج یا مکتب و مدرسے کا منھ نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ بڑی بڑی پابندیاں تھیں اور بہ جبر و کراہ سب کو ان سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں کوئی لڑکی قلم چلانے اور سماج کے خلاف قدم اٹھانے کی ہمت بھی کرتی اور اپنے مجروح جذبات اور دردِ دل کو بیان کرنے کا حوصلہ بھی دکھاتی تو سماج، گھر اور خاندان کے ڈر و خوف سے، اسے یہ کام بہت خفیہ طریقے سے کرنا پڑتا۔ قلم کاری کی صلاحیتیں فطری ہوتی ہیں اور عشق و مشک کی طرح اس کی جولانیاں اور جلوہ سامانیاں بھی چھپ نہیں سکتیں۔ یہ سماج کے لاکھ پردوں اور پہروں میں بھی سامنے آتیں اور اجاگر ہوتی ہیں۔ اس لیے عطیہ پروین کا حساس اور جذباتی قلم بھی زندگی کے دکھوں، ارمانوں، جذبوں اور آنسوؤں کو کیوں، کیسے اور کب تک روک سکتا تھا کہ اس کا فیصلہ تو روزِ ازل میں ہو چکا تھا۔ وہ وقت آیا اور نہایت عجلت و سرعت کے ساتھ آیا اور عطیہ پروین نے محض تیرہ سال کی اس کچی عمر میں اپنا پہلا افسانہ لکھا جو گڑیوں سے کھیلنے اور گڑیا گڈے کی شادی رچانے کا دور ہوتا ہے۔ کسی بھی قلم کار کی زندگی کا یہ ایک بڑا المیہ اور بڑی جاں سوز حقیقت ہے کہ اس کو متفرق سماجی، اقتصادی، سیاسی اور خاندانی پابندیوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے لیکن دراصل یہ حالات و واقعات ہی ہیں جو اس کی فنکاری کو چمکاتے اور اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

عطیہ پروین کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا رہا۔ایک طرف گھریلو ذمہ داریاں انھیں سنبھلنے کا موقع نہ دیتیں تو دوسری طرف ان کے دل میں پڑھنے لکھنے کی شدید حسرت پنپتی رہتی لیکن وہ گھر کی بڑی بوڑھیوں کی طرف سے دیے گئے گھریلو کام کاج میں لگی رہتیں ۔ ہنڈیا روٹی ،کفگیر چمچہ سنبھالے طرح طرح کے کھانے اور پکوان بنانے میں مصروف رہتیں یا پھر سوئی دھاگہ سنبھالے، سینے پرونے ،کاج بٹن کرنے اور کرتہ پاجامہ یا شلوار جمپر کاٹنے، سینے اور ترپنے میں مصروف رہ جاتیں ۔ان کا گھر اور گھرانا بھرا پرا تھا اور اس میں بہت سے لوگ تھے جن کی خدمت گزاری بہت کچھ عطیہ پروین کے ذمے تھی لیکن قدرت کو ان کے حق میں کچھ اور بھی منظور تھا۔عطیہ پروین نے ہمت و دلیری دکھائی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے لیے نصرت و کامرانی کے دروازے کھول دیے ۔حالانکہ ان کے اردگرد حالات صرف ایسے تھے کہ وہ اپنی کئی چچا زاد اور پھوپی زاد بہنوں کی طرح صرف باورچی خانے کا ،مختلف قسم کی خوشبوؤں والا دھواں سونگھتی رہیں اور سینے پرونے میں سوئی کی نوک سے اپنی انگلیوں کو زخمی ،جذبات کو مجروح اور دل کو فگار کرتی رہیں۔

عطیہ پروین کے والد کا نام سید محمد باقر حسین تھا جو انھیں بے حد چاہتے تھے اور اس چاہنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی ان کی والدہ سیدہ کنیز زہرا اپنی تین اولادوں یعنی عطیہ پروین،ان کے بھائی علی باقر عرف حسن میاں اور ننھی رضیہ کو بہت چھوٹا چھوڑ کے مالک حقیقی سے جا ملی تھیں۔والدہ محترمہ کے انتقال کے وقت عطیہ پروین کی چھوٹی بہن رضیہ صرف نو ماہ کی تھیں اور ان کو،ان کی نانی نے پالا پوسا تھا۔عطیہ پروین کا ننیہال لکھنؤ میں ہے۔ننھی رضیہ کے نانی کے یہاں لے جائے جانے کے بعد،ابا کے پاس یہ دونوں بہن بھائی،عطیہ پروین اور حسن میاں رہ گئے ۔ابا نے اب دونوں بچوں پر اپنا سارا پیار اور سارا وقت نچھاور کر دیا۔ان کی انگلی بھی دکھتی تو ابا بے چین ہو جاتے ۔یوں بھی باپ اور بیٹی کی محبت بڑی جذباتی ،دل گداز ،شدید اور بے لوث و بے غرض ہوتی ہے۔

اپنے ابا کی ایسی چہیتی اور ایسی لاڈلی بیٹی عطیہ پروین نے ایک روز رو رو کر ،پڑھنے لکھنے کی اپنی خواہش کا ان سے اظہار کیا تو انھوں نے شفقت پدری سے مغلوب ہو کر ان کی پیٹھ تھپک کر اور 'میری بیٹی' کہہ کر ان کو تسلی دی ۔اس کے بعد ان کے بیٹے کو پڑھانے کے لیے آنے والے مولوی صاحب سے کہا: ''مولوی صاحب! میری بیٹی کو بھی آپ اسی طرح دل لگا کر پڑھائیے جیسے آپ میرے بیٹے حسن میاں کو پڑھاتے ہیں۔''

اس طرح اس کمسن عطیہ نے خوشی کے مارے کانپتے ہاتھوں سے،سینٹھے کے قلم اور مٹی کی کلھیا میں بنی سیاہی کو اپنے دل سے لگا لیا اور جی جان سے پڑھائی اور کتابوں کے مطالعہ میں لگ گئیں لیکن گردش حالات اور سماجی پابندیوں کے باعث وہ کبھی اسکول یا کالج نہ جا سکیں۔اس کا انھیں ہمیشہ رنج و ملال اور تاسف و افسوس رہا ۔البتہ پڑھنے لکھنے کا شوق جنون کی حد تک ہو تو کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔اس لیے عطیہ پروین بھی گھر پر ہی مولوی

حسن صاحب سے،اپنے ابا سید محمد باقر حسین صاحب سے اور اپنے چچازاد بھائی سید اصغر حسین عرف چھبن میاں سے، جو علی گڑھ میں پڑھتے تھے اور پھر پڑھانے بھی لگے تھے، پڑھتی رہیں اور علم و ادب کی روشنی سے اپنے دل و دماغ کو روشن و منور اور روح کو آسودہ و بالیدہ کرتی رہیں۔انھوں نے پرائیویٹ طریقے سے کئی امتحان بھی دیے اور ان میں اچھے نمبروں سے پاس بھی ہوئیں۔آہستہ آہستہ ان کی دادی، پھوپھی اور دوسری بزرگ خواتین نے بھی ان کی اس خودسری، ضد اور بغاوت کو قبول اور کسی حد تک برداشت کرلیا۔یہی دور تھا کہ ان کے اندر کہانی لکھنے یا ادب تخلیق کرنے کی خواہش پلنے لگی۔جی کی ترنگ اور من کی امنگ مجبور کرتی کہ مچلتے جذبوں اور بے طرح آتے خیالوں کو صفحۂ قرطاس پر لکھ کر روح کو آسودگی اور دل کو فرحت و انبساط سے روشناس کرایا جائے۔

عطیہ پروین کے سبھی چچا تعلیم یافتہ اور ادب نواز و ادب پرور تھے۔ان کے ایک چچا 'منجھلے ابا' ادیب و شاعر بھی تھے اور کامیاب مقرر بھی۔عطیہ پروین ذہنی طور پر ان سے بے حد قریب تھیں۔وہ لکھا کرتے اور یہ ان کو بڑے شوق سے دیکھا کرتیں۔ان سے ادبی موضوعات پر گفتگو اور سوالات کرتیں تو وہ بے حد خوش ہوتے۔اپنے ناولوں کے پلاٹ اور اقتباسات سنایا کرتے تو عطیہ کو بہت اچھا لگتا۔ان کا رجحان اور انہماک، ادب اور خاص کر افسانوی ادب کی طرف بڑھتا رہا۔ان کے مذکورہ چچا انگریزی ناولوں کے ترجمے بھی کرتے تھے اور ان کے کئی ناول جیسے 'برف کے پھول' اور 'شیشے کی آنکھ' وغیرہ شائع بھی ہو چکے تھے۔وہ شاعری بھی کرتے تھے جسے قبول عام کی سند حاصل تھی۔ان کا کچھ کلام اور خاص کر ان کے لکھے کچھ قصیدے آج بھی عطیہ پروین کے پاس محفوظ ہیں۔ان کے چھوٹے چچا بھی ناول لکھتے تھے لیکن کتابوں کی طباعت و اشاعت سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔البتہ عطیہ پروین کے والد ادب کو تخلیق تو نہیں کرتے تھے لیکن انھیں مطالعہ کا بہت زیادہ شوق تھا۔رات کو مطالعہ، ان کا روزانہ کا معمول تھا۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ عطیہ پروین نے اپنا پہلا افسانہ محض تیرہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔اس کا عنوان تھا 'وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے'۔اس کہانی کی اشاعت کی کہانی بھی کافی دل چسپ اور قابل ذکر ہے۔ہوا یوں کہ یہ افسانہ عطیہ پروین کے ماموں علی صفدر رضوی نے ان کے صندوق سے نکال لیا اور لے جا کر اپنے وقت کے معروف افسانہ نگار رام لعل صاحب کو دکھایا جو اس زمانے میں کٹرہ ابوتراب خاں میں رہتے تھے۔یہ لکھنؤ کا ایک مشہور محلّہ ہے اور اسی میں عطیہ پروین کی نانیہال بھی ہے۔الغرض جوہری نے نگینے کو دیکھتے ہی پرکھ لیا اور کہا کہ یہ ایک اچھا افسانہ ہے اور جب رام لعل صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ مذکورہ افسانہ محض تیرہ سال کی ایک لڑکی نے لکھا ہے تو وہ حیرت زدہ بھی ہوئے اور انھوں نے خوشی کا اظہار بھی کیا۔ پھر ان کے ماموں سے فرمایا'' جناب! اپنی بھانجی کو قلم چلانے دیجیے، اس کو روکیے نہیں اور اس کا حوصلہ

بڑھائیے۔افسانے کے میدان میں اس کا مستقبل روشن اور تابناک نظر آتا ہے۔‘‘

اس طرح ان کے ماموں نے بھی عطیہ پروین کا حوصلہ بڑھایا، ہمت بندھائی اور خاندان والوں سے ٹکر لی کہ اس لڑکی کو قلم چلانے دیا جائے لیکن افسانہ نگاری کے لیے ابا کی بھی اجازت ضروری تھی۔ان کے سامنے بات آئی تو انھوں نے اجازت تو دے دی لیکن یہ بھی کہا کہ کوئی الٹا سیدھا افسانہ، نہ لکھنا اور شریفانہ انداز اختیار کرنا۔ابا کی تشویش، مشورہ، خوشی اور پھر اجازت !ان سارے مراحل سے عطیہ پروین ضرور گزریں لیکن انھوں نے ابا کی نصیحت کو کبھی فراموش نہیں کیا اور ہندوپاک کے نسائی ادب میں، بہ اعتبار زبان و بیان، موضوع و پلاٹ، اسلوب و طرز ادا ہر لحاظ سے اپنے افسانوں اور ناولوں کو پاکیزہ اور صاف ستھرا رکھا اور کبھی کوئی ایسی چیز نہ لکھی جو ننگ و عار کا باعث بنے یا شرمندگی کی موجب ہو۔اس طرح پاکیزہ اسلوب نگارش اور پاکیزہ انداز بیان اختیار کر کے عطیہ پروین نے قلم چلانا شروع کر دیا۔رسائل کے ذریعہ آہستہ آہستہ ان کو ادب میں اہم مقام ملنا شروع ہو گیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی اور سماجی رسائل میں ان کے افسانے شائع ہوئے۔ڈائجسٹ اور خاص کر خواتین کے رسائل میں ان کے ناولوں کی قسط وار اشاعت ہوئی۔عطیہ پروین نے اب تک ۳۵ ناول لکھے ہیں۔ان کے زیادہ تر ناول نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ایک ناول اردو پبلشرز اور دو ناول گوپال متل نے شائع کیے۔اس کے علاوہ دو ناول رنگ محل پبلی کیشنز سے بھی شائع ہوئے۔عطیہ پروین کے ناول ،قارئین میں کافی پسند کیے جاتے ہیں اور خاص کر خواتین میں بہت مقبول رہے ہیں۔اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کے ناول معاشرے کے ماحول اور حالات، گھریلو مسائل اور گھر آنگن کے درد و کرب کو اجاگر کرتے ہیں۔

عطیہ پروین کے چھ ناولوں کا ہندی اور پنجابی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور یہ سبھی ناول ’اجیت سماچار‘ چنڈی گڑھ سے شائع ہو چکے ہیں۔ ہندی ادب کے قارئین نے بھی ان ناولوں کو کافی پسند کیا۔ان ناولوں کے نام اس طرح ہیں- ۱۔جس کو سمجھے تھے مسیحا ۲۔ بہاریں پھر بھی آتی ہیں ۳۔ یہ رشتے دل کے ۴۔ پیار کا بندھن ٹوٹے نا ۵۔ رگ جاں سے قریب ۶۔ لو پھر بہار آئی۔

ان ناولوں کے علاوہ پنجاب کیسری نے بھی ان کے دو ناول - ڈھل گئی شام غم اور ناظمہ ہندی میں ترجمہ کر کے شائع کیے۔ان ناولوں کو بھی قارئین نے پسند کیا۔

عطیہ پروین نے اب تک تقریباً ڈھائی سو افسانے لکھے ہیں جو ہندوپاک کے مشہور و معروف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔انھوں نے طنز و مزاح اور انشائیہ نگاری میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔احمد جمال پاشا نے اپنے زمانے میں لکھنؤ کے مشہور و معروف اور مقبول عام اخبار ’اودھ پنچ‘ کا دوبارہ اجراء کیا تو بہت سے قلم کاروں کے ساتھ عطیہ پروین سے بھی اصرار کیا کہ وہ اس پرچے کے لیے مزاحیہ مضامین لکھیں۔اس پر عطیہ

پروین نے اپنے ہی خاندان کی ایک بزرگ خاتون کو مرکزی کردار بنا کر اوران کی بھولی بھالی وتصنع سے دور باتوں کو موضوع کی شکل میں پیش کرتے ہوئے ایک مزاحیہ مضمون لکھا۔اس کا عنوان تھا۔''چچی چھمن نے خط لکھایا''۔اردوطنز ومزاح میں مرکزی کردار کی شکل میں چچا چھکن، شیخ چلی وغیرہ بھی کافی مشہور رہے ہیں اور کئی قلم کاروں نے مختلف موضوعات کے تحت طنزیہ ومزاحیہ مضامین اور انشائیے لکھے لیکن چچی چھمن کا نسوانی کردار عطیہ پروین کے ذریعہ اردو میں پہلی بار متعارف ہوا تھا۔بہرحال یہ مزاحیہ کافی پسند کیا گیا اور قارئین کے اصرار پر چچی چھمن کو ہی مرکزی کردار کی شکل میں پیش کرتے ہوئے عطیہ پروین نے تقریباً تیس مضامین لکھے اور یہ سب کے سب لکھنؤ کے علاوہ ماہنامہ تحریک دہلی اور پاکستان کے بھی کئی رسالوں میں شائع ہوئے۔

قانون قدرت کے مطابق زندگی دونفوس یعنی زوجین کے مابین تعلق اور رشتوں سے گزاری جاتی ہے لیکن اگر کبھی ان میں سے کوئی ایک، زندگی کا ساتھ چھوڑ جائے تو وہ دونوں جو باہم شیر وشکر اور ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوتے ہیں،ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔زندگی اجیرن اور دشوار ہو جاتی ہے،راہیں مسدود اور محدود ہو جاتی ہیں۔زندگی کا سفر مشکل اور کرب آمیز بن جاتا ہے اور زندگی کے بیشتر خواب چکنا چور اور منہدم ہو جاتے ہیں۔قلم کاروں کے لیے یہ دکھ، دوسروں سے سوا ہوتا ہے کیونکہ وہ عام لوگوں کے مقابلے زیادہ حساس، زیادہ نازک دل اور زیادہ ٹوٹے بکھرے ہوتے ہیں۔

عطیہ پروین نے بھی اپنے قلب حزیں پر شوہر کی جدائی کا ایک شدید دکھ اٹھایا تھا۔شوہر کے انتقال کے بعد ان کی زندگی بھی شدید ذہنی درد وکرب اور دلی رنج والم کا شکار رہی۔زندگی کے سب سے نزدیکی ساتھی کے بچھڑنے کا دکھ،اس کی یادیں،اس کی باتیں،اس کے جذبات وخیالات،اس کی خوشی وغم کے لمحات،گھر کی ہر شے سے مترشح اور ظاہر ہوتے نظر آتے ہیں۔نظر سے دل تک اور دل سے رگ جاں تک،گزرے ہوئے پل، پلکوں کو بھگوتے اور دل کو اداس کر جاتے ہیں۔اس ساتھی کی جدائی کے زخموں کا اندمال آسانی سے نہیں ہوتا۔عطیہ پروین بھی اس صدمہ سے اچھوتی اور ان چھوئی نہ رہیں۔اس جانگداز اور جانکاہ دکھ نے انھیں زندگی سے بیزار، مضمحل، پژمردہ اور کبیدہ خاطر کر دیا اور کچھ عرصے تک ان کا لکھنا لکھانا موقوف اور بند رہا لیکن ارسطو کے مطابق آدمی man is human being ہے۔وہ اپنے لیے نہ بھی چاہے تب بھی اسے دوسروں کے لیے جینا پڑتا ہے۔زندگی کتنی ہی مشکل سہی، پروردگار عالم کا ایک سب سے قیمتی اور سب سے خوب صورت عطیہ ہے۔اس کو یوں ہی برباد اور نیست ونابود کرنے کا کسی کو حق نہیں۔اسی لیے اللہ تعالیٰ بندے کو غم دیتا ہے تو اس کا مداوا بھی فرما دیتا ہے، رنج ومحن دیتا ہے تو صبر کی دولت سے بھی نوازتا ہے اور یوں زندگی اپنے پورے حسن وجمال کے ساتھ اپنی انھیں راہوں پر گامزن ہو جاتی ہے۔اگرچہ راستے دامن دل کو کتنے ہی کانٹوں میں

الجھائیں: ان ہی راستوں نے جن پرتم تھے ساتھ میرے/ مجھے روک روک پوچھا تیرا ہم سفر کہاں ہے

بہر حال اپنے بچوں کی محبت اور وقت کے مرہم نے عطیہ پروین کو پھر زندگی کی طرف لوٹا دیا اور انھوں نے اسی حوصلے اور جذبے کے ساتھ قلم کو پھر سنبھال لیا۔ یہ بات بغیر کسی تکلف اور تصنع کے کہی جا سکتی ہے کہ عطیہ پروین نے بے شبہ بہت کچھ لکھا ہے اور وہ بھی بے تکان اور بنا کسی لمبے وقفے کے لکھا ہے۔ جیسا کہ ہم گزشتہ سطروں میں لکھ چکے ہیں ان کی تخلیقات ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی کثیر تعداد میں شائع ہوئی ہیں۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد انھوں نے رائے بریلی میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور چونکہ یہ شہر بھی ادبی اہمیت کا حامل ہے اس لیے یہاں بھی لکھنے کے اچھے مواقع میسر آئے۔ وہ ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتی رہیں اور ان کے قلم اور سوچ و فکر کو نئے نئے موضوعات بھی ملتے رہے لیکن زندگی کے اس موڑ پر ابھی ان کی قسمت میں کچھ اور بھی لکھا تھا اور وہ یہ کہ کچھ ناگفتہ بہ حالات اور چند ناگزیر وجوہ سے انھیں اپنی سسرال کی زمین پر واپس آنا پڑا۔ محترمہ عطیہ پروین نے اس بابت اور وہاں کے موجودہ حالات کے بارے میں، اپنے ایک خط میں راقم کو کچھ اس طرح لکھا تھا:

''ردولی کے قریب چھوٹا سا گاؤں، زمیں داروں کا گاؤں، مگر اب زمیں دار نہیں رہے جو ہیں وہ بھی اپنی بچی کھچی آن، بان، شان لیے، باقی رہ گئی زمینوں کو لیے بیٹھے زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ زمانہ بدل چکا ہے، ماحول بدل چکا ہے، کوئی ادبی ماحول نہیں ہے، کوئی ادب نواز نہیں ہے۔ کچھ روز تک میرا قلم چپ چاپ پڑا اپنی قسمت پر روتا رہا۔ میرے کچھ قلمی دوستوں نے، پرخلوص ساتھیوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں قلم اٹھاؤں۔ میں نے ہمت کی اور پھر قلم سنبھالا اور لکھنے لگی۔ یہاں بھی میری ڈاک آنے لگی جس کو لوگ حیرت سے دیکھتے تھے۔ ڈاکیہ کہتا: 'سید پور کی جندگی (زندگی) میں پہلی بار کہیں باہر کے ملکوں سے چٹھیاں آتی ہیں۔ اتی ڈاک تو آج تک یہاں نہیں آئی۔' بہر حال اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں انگلیوں میں طاقت رہے قلم پکڑنے کی، آنکھوں میں روشنی رہے اپنی تحریر کو خود پڑھنے کی۔ لکھ رہی ہوں، لکھتی رہوں گی۔ جب تک دم میں دم ہے اردو کی خدمت کرتی رہوں گی۔ نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا۔''

موجودہ دور میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اب ناول کا زمانہ گزر گیا اور قاری کے پاس، اس کو پڑھنے، اسے منھ لگانے یا اہمیت دینے کا وقت نہیں اور یہ کہ آج مختصر افسانے کی مقبولیت کا سبب وقت کی تنگی ہے اور اس کا شکار، قاری اور قلم کار دونوں ہیں لیکن یہ ایسے بے مقصد اور ناقابل قبول دعوے ہیں، جن کو تحریری شکل دینے سے پہلے کسی طرح کی تحقیق کی زحمت نہیں کی جاتی۔ سنی سنائی باتوں کو اپنی تحریر کا حصہ بنانا، غیر ذمے دارانہ دعووں کو سند عطا کرنا اور اپنی تحریر کو ہی حتمی اور قطعی سمجھ لینا جانبدارانہ اور غیر ذمہ دارانہ فعل ہے۔ راقم ایسے سارے دعوؤں کو صحیح نہ سمجھتے ہوئے قبول کرنے سے قاصر ہے۔

اس کی وجہ اور جواز اور مجاز کیا ہے؟

وہ، یہ ہے کہ میں اس وقت ہندوستان میں ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک شائع ہوئے افسانوی مجموعوں اور ناولوں کا ایک طویل و بسیط اشاریہ ترتیب دے رہا ہوں۔ اس کے لیے مختلف لائبریریوں، متعدد رسالوں، ان گنت کتابوں اور ملک کے بے شمار قلم کاروں سے رابطہ قائم کیا گیا ہے اور ان نتائج سے میں خود حیران ہوں کہ افسانوی مجموعوں کے مقابلے ناولوں کی اشاعت کہیں زیادہ ہوئی ہے۔ قارئین سے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ افسانوی مجموعوں کے دس ہزار ناموں پر مشتمل اس اشاریہ کی پہلی جلد انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آئے گی۔

بازار کا اصول یہی ہے کہ جس چیز کی جتنی مانگ ہوتی ہے اتنی ہی اس کی پیداوار بڑھتی ہے۔ اس لیے راقم کا سردست اب تک کا تجربہ یہی ہے کہ ناولوں کی تعداد افسانوی مجموعوں کے مقابلے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ یہ نتائج تحقیق سے حاصل ہوئے ہیں سنی سنائی باتوں سے نہیں۔ ناول آج بھی لکھے جا رہے ہیں اور قارئین ان کو پڑھ بھی رہے ہیں۔ ناولوں کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ خود عطیہ پروین نے بھی اب تک ۳۵ ناول لکھے ہیں اور یہ سب شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ان ناولوں کے نام اس طرح ہیں ۱۔ شہلا ۲۔ چندا ۳۔ مہ لقا ۴۔ زرتاج ۵۔ ربو آپا ۶۔ خاک ہو جائیں گے ہم ۷۔ پلکوں تلے ۸۔ پھول کھلتے ہیں ۹۔ آنگن کی چاندنی ۱۰۔ لو پھر بہار آئی ۱۱۔ اک شمع رہ گئی ہے ۱۲۔ بہاریں پھر بھی آتی ہیں ۱۳۔ دل کے دروازے ۱۴۔ ترے کوچے سے ہم نکلے ۱۵۔ اگر اور جیتے رہتے ۱۶۔ کسی کے ہو گئے جب تم ۱۷۔ ناگن بن گئی رات ۱۸۔ ناظمہ ۱۹۔ خوشنما ۲۰۔ ترانم رہے سلامت ۲۱۔ شام آرزو ۲۲۔ نگاہوں کے چراغ ۲۳۔ یہ رشتے دل کے ۲۴۔ راحتیں اور بھی ہیں ۲۵۔ رگ جاں سے قریب ۲۶۔ ڈھل گئی شام غم ۲۷۔ جس کو سمجھے تھے مسیحا ۲۸۔ رگ سنگ ۲۹۔ دل کچھ اس صورت سے تڑپا ۳۰۔ تیری آنکھوں کے دیے ۳۱۔ تمہارے لیے ۳۲۔ رہے تیری انجمن سلامت ۳۳۔ پھر بہاروں نے چوم لی چوکھٹ ۳۴۔ چھوٹے سرکار ۳۵۔ محبوب میرے۔

عطیہ پروین کے کئی ناولوں کے نام غالب اور چند دیگر مشہور شعراء کے معروف اور زبان زد خاص و عام مصرعوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان کے چار ناولوں کو اتر پردیش اردو اکادمی نے اعزاز و انعام سے نوازا ہے۔ انعام یافتہ ان ناولوں کے نام اس طرح ہیں ۱۔ چندا ۲۔ مہ لقا ۳۔ زرتاج ۴۔ خاک ہو جائیں گے ہم۔

انھوں نے اپنا ایک افسانوی مجموعہ 'یہ میرا ظرف دیکھ' ۱۹۸۶ء میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش، لکھنؤ کے جزوی مالی تعاون سے خود شائع کرایا ہے۔ اس میں ان کے ۱۹ افسانے شامل ہیں۔ جن کے نام اس طرح ہیں۔ وہ ایک تیری نشانی، مجھے نہ پکارنا، نوحۂ غم ہی سہی، آن، پچھلا دروازہ، لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا، گھبرا کے محبت کر بیٹھے، گڑیا، جو ہم نے داستاں اپنی سنائی، اگر اور جیتے رہتے، موم کی چٹان، لہو پکارے گا، گر تو

برا نہ مانے، بہو کہتی ہے، یہ میرا ظرف دیکھ، کہاں ہو، کھول دو دروازہ، کانٹوں سے محبت کرلو، جلاتے چلو چراغ۔

عطیہ پروین نے اپنے ناولوں کی طرح اس افسانوی مجموعہ کے کئی افسانوں کے نام بھی مشہور شعروں سے مستعار لیے ہیں۔ وہ نثر کے ساتھ ہی شعری رجحان بھی رکھتی ہیں۔ اسی ذوق وشوق کے باعث انھوں نے کئی نظمیں بھی لکھی ہیں جو شائع بھی ہو چکی ہیں۔ البتہ ان میں سے چند نظمیں بچوں کے لیے مخصوص ہیں۔

کہانی بہ جبر وکراہ لکھی جاتی ہے یا وہ خود قلم کار سے اپنے آپ کو لکھواتی ہے، یہ بحث معنی خیز بھی ہے، کسی حد تک ضروری بھی اور دل چسپ بھی۔ جس طرح کوئی حقیقت چھپائے نہیں چھپ سکتی اسی طرح کہانی بھی اپنے آپ کو لکھوا کر رہتی ہے۔ وہ قلم کار کے ذہن ودل پر ایسا تاثر اور دباؤ ڈالتی ہے کہ اسے معرض وجود میں لانے یا افسانے کا پیکر و پیرہن عطا کرنے کے سوا قلم کار کے پاس کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں راقم کا بھی یہی تجربہ ہے۔ خود اپنے تخلیقی سفر، گردو پیش کے ماحول، افسانوں کے موضوعات، سماجی پس منظر کی بابت عطیہ پروین اپنے افسانوی مجموعہ 'یہ میرا ظرف دیکھ' کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

''میں کیوں لکھتی ہوں یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ میرا دل اور میرا قلم مجھ سے لکھواتا ہے۔ میرے اندر کوئی تحریک پیدا ہوتی ہے جو مجھے لکھواتی ہے۔ میں نے اردو ادب کی اپنے خیال میں کافی خدمت کی ہے۔ ایک لمبے عرصے سے لکھ رہی ہوں۔ اپنا پہلا افسانہ میں نے ۱۳ برس کی عمر میں لکھا تھا اور اس فضا میں، اس ماحول میں، اس پابندی میں جہاں کہ لڑکیوں کا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ بڑی ڈانٹ پڑی پھر بھی میرے دل میں یہ خواہش کروٹیں لیتی رہی کہ کچھ لکھوں..... پھر میری بڑھتی ہوئی دیوانگی کو دیکھ کر میرے والد نے، خدا ان کو جنت عطا کرے، مجھے قلم اٹھانے کی اجازت دے دی۔''

ہم لکھ چکے ہیں، عطیہ پروین نے اب تک تقریباً ڈھائی سو افسانے لکھے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے کردار اور موضوعات، اپنے آس پاس کے ماحول اور سماج کے مختلف طبقوں سے اخذ کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا کوئی کردار مافوق البشر نہیں بلکہ حقیقی زندگی میں چلتا پھرتا کردار ہے۔ ان کے تقریباً سبھی افسانے معاشرتی حالات کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ عورت کی عزت واہمیت، اس کے رنج والم، اس کی خوشی ومسرت، اس کے دکھ اور درد، اس کی عادات و خصائل، اس کے مسائل ومصائب، اس کا استحصال واعتبار، اس کی محبت ووارفتگی، اس کی شفقت وجاں نثاری، اس کی خود سپردگی اور وفاداری، سماجی رسوم اور رواج، خاندانی رقابت ورفاقت، گھریلو جھگڑے اور قضیے، گھر آنگن میں سسکتی خوشیاں اور مسکراہٹیں، دبی کچلی آہیں اور سسکیاں، اس کی شرم اور حیا، اس کی لجاجت اور شرافت، اس کی عصمت اور عفت، عورت پر کیے جانے والے ظلم اور جور، اس کی پاکیزگی اور طہارت، عقدونکاح، طلاق وجدائی، جہیز نہ دینے یا کم دینے سے پیدا شدہ مسائل، ظلم وزیادتی سے جلائی جانے والی دلہنیں، سہاگ کے سکھ کو ترستی عورتیں، پردیسی پیا کی راہ تکتی پیاسی

آنکھیں، الھڑ جوانی کے قہقہے، کچی عمر میں محبت کا روگ، کنوارے ارمانوں کا سوز و گداز، غرض سماجی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر عطیہ پروین نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں کھل کر نہ لکھا ہو۔ خلوص و محبت ان کی تحریر کا بنیادی وصف ہے۔ ان کی زبان نہایت شائستہ اور مہذب ہے۔ وہ عام گھروں میں بولی جانے والی زبان استعمال کرتی ہیں جس میں کسی تصنع کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کا اسلوب نگارش بھی سادہ اور بہترین ہے اور کرداروں کی زبان، پلاٹ اور ماحول کے مطابق ہی اختیار کیا گیا ہے۔ وہ اس بات کو جانتی بھی ہیں اور اس کی نمائندگی بھی کرتی ہیں کہ عورت اس کائنات کی سب سے بہتر تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔

لیکن کس انسان کو.....؟

ہر انسان اشرف المخلوقات میں شامل نہیں کیونکہ قرآن عظیم میں پروردگار عالم نے کچھ انسانوں کو تو جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ لہٰذا انسانوں میں اشرف و مشرف، اقرب و مقرب، اطہر و مطہر اور اعلیٰ و افضل صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام اور اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کی بے چون و چرا، پیروی کرتے ہیں۔ بے شبہ، لاریب انسان اللہ تعالیٰ کی شاہکار تخلیق ہے اور کائنات اصغر کی حیثیت رکھتا ہے اور ایسا ہی انسان ملک و قوم اور معاشرہ و مذہب کی خدمت کر کے محبوب رب اور افضل الملائک بنتا ہے۔ اعمال کے لحاظ سے پروردگار عالم کی نظر میں عورت اور مرد، دونوں برابر ہیں۔ لہٰذا قلم ایک امانت ہے اور اس کا صحیح استعمال ہی اس کا حق ادا کرتا ہے۔ عطیہ پروین نے بھی اپنے افسانوں اور ناولوں میں ایک نیک مقصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ اپنے افسانوی مجموعہ 'یہ میرا ظرف دیکھ' میں وہ، یہ بھی لکھتی ہیں:

''یہ ضرور ہے کہ کچھ عورتیں اپنے آپ کو اس اونچے مقام سے گرا کر نیچے چلی آتی ہیں۔ میں انھیں اٹھانے اور ان کے اندر کی اچھی عورت کو جگانے کی کوشش کرتی ہوں۔ میرے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔''

اپنی انا اور آن کی خاطر انسان کیا نہیں کرتا۔ درمیانی طبقہ تو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس جانے والی شے کا نام ہے۔ مفلسی اور غربت کیسے دکھ دیتی ہے۔ غم و اندوہ کے عالم میں دل سے اٹھی ہوک ہونٹوں پر آنے کے بجائے آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے ٹپک جاتی ہے۔ حسرت و عسرت کون سے رنگ نہیں دکھاتی: پیرہن سے مفلسی ظاہر تھی اس لیے/ مہمان کے قریب سے بچے ہٹا دیے

اس تناظر میں عطیہ پروین کے ایک افسانے 'آن' کا یہ دلگداز اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''میری نظر باورچی خانے کے کھلے دروازے پر پڑی۔ بڑا سا چولہا ٹھنڈا پڑا تھا لیکن تین بڑی بڑی پتیلیاں اس کے اوپر ڈھکنوں سے بند رکھی تھیں۔ میری چھوٹی بہن سلمٰی نے بڑی رازداری کے ساتھ مجھے بتایا تھا کہ بی بی جی بے چاری کیا کرتی ہیں۔ چولہے پر دو تین پتیلیاں پانی سے بھر کر چڑھا دیتی ہیں۔ کوئی آتا جاتا تو دکھانے

کے لیے بار بار چولہے کے پاس جا کے پتیلیوں میں چمچہ چلانے لگتی ہیں تا کہ وہ سمجھے کھانا پک رہا ہے۔" (ص:۴۵)

عطیہ پروین نے اپنے قلم کی جولانیاں ایک اور صنف میں بھی دکھلائی ہیں۔اس صنف کا نام ہے 'ادب اطفال'۔انھوں نے بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ان کی بے شمار کہانیاں ماہنامہ کلیاں لکھنؤ، ماہنامہ کھلونا دہلی، ماہنامہ سیپ پاکستان اور بچوں کے دیگر کئی رسائل میں شائع ہوئیں۔ان میں سے کئی رسالے اب بند ہو چکے ہیں لیکن بچوں کے لیے کئی رسالے اب بھی بڑی پابندی سے شائع ہو رہے ہیں اور عطیہ پروین آج کل بھی بچوں کے ادب پر زیادہ سے زیادہ دھیان دیتے ہوئے بہت آسان زبان میں بچوں کے لیے دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ماہنامہ 'بچوں کی نرالی دنیا' دہلی میں بھی ان کی کہانیاں برابر شائع ہوتی تھیں لیکن اب (۲۰۰۴ء میں) یہ خوب صورت رسالہ بند ہو چکا ہے۔البتہ بچوں کے لیے شائع ہونے والے وہ دوسرے رسالے جن میں وہ مستقل شائع ہو رہی ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں-اچھا ساتھی، ھلال، نور، فنکار نو، گلشن اطفال، خیر اندیش، گل بوٹے، بچوں کی دنیا، امنگ، پیام تعلیم، گلدستۂ تعلیم وغیرہ۔بچوں کے لیے عطیہ پروین کی کئی کتابیں رحمانی پبلشرز نے شائع کی ہیں۔ان میں سے چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں-۱۔خوش قسمت کون ۲۔اللہ جو کرتا ہے ۳۔بھکاری بادشاہ ۴۔چاند بی بی ۵۔رضیہ سلطانہ ۶۔شہزادی جہاں آرا بیگم ۷۔شہزادی یاقوت۔ان کی کتابوں میں سے ایک کتاب 'سونے کی تجوری' کو اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ سے ایوارڈ مل چکا ہے۔

اردو ادب کو اس عظیم فنکارہ پر ناز ہے۔وہ آج کل کی ادبی سیاست سے کوسوں دور ہیں۔جوڑ توڑ کر کے اپنے اوپر خوشامدی مضامین لکھوانے کو بھی وہ پسند نہیں کرتیں۔کوئی فنکار گردش حالات اور وقت کے الٹ پھیر کے باعث بھلے ہی معدوم ہو جائے لیکن اس کا فن، اس کی تحریر، اس کا تخلیق کردہ ادب، اس کے تصورات وخیالات، تخلیقات یا کتابوں کی شکل میں باقی رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں اور عطیات میں سے ایک بڑا عطیہ شہرت و ناموری بھی ہے۔قارئین کی شکل میں، ملک و بیرون ملک میں، عطیہ پروین کے پرستاروں اور مداحوں کی کمی نہیں۔اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ وہ عطیہ پروین کو صحت و تندرستی سے نوازے اور اصلاح معاشرہ کی نیت سے، وہ ایسا ادب تخلیق کرتی رہیں جو صدقۂ جاریہ کی شکل میں، دونوں جہان میں ان کی کامیابی و کامرانی کا موجب بنے، آمین!

◀◀ ● ▶▶

Ghaus Manzil, Talab Mulla Iram
Rampur 244901 U.P.
Mob: 9719316703

● ڈاکٹر ارشد رضا

اردو افسانہ ۱۹۸۰ء کے بعد

انسان فطری طور پر قصّہ گو واقعہ ہوا ہے ۔وہ قصّہ سننا بھی چاہتا ہے اور قصّہ سنانا بھی چاہتا ہے۔ ہندوستان میں قصّہ گوئی کی روایت بہت پرانی ہے۔ یہاں کی مذہبی کتابوں کا ایک بڑا حصّہ بھی قصّہ گوئی پر مشتمل ہے ۔قصّہ ہی کے ذریعہ انسان کو اچھائی کی تعلیم دی گئی ہے اور برائیوں سے روکا گیا ہے۔انسان کی فطرت ہے کہ وہ پندونصاح سے براہ راست متاثر نہیں ہوتا۔اپنی باتوں کو قصّے کے ذریعہ کہا جائے تو لاشعوری طور پر اس کا ذہن اسے قبول کرلیتا ہے۔اردو میں قصّہ گوئی اور داستان گوئی کی اس پرانی روایت نے آگے چل کر موجودہ فکشن کی صورت اختیار کرلی۔۔۔فکشن کی مقبول ترین صنف ادب ''افسانہ'' بنیادی طور پر نثری بیان کی ایک مخصوص شکل ہے جس کی مسلسل تعریفیں بیان کی جاتی رہی ہیں،حدود کا تعین کیا جاتا رہا ہے،امکانات کی جانب اشارے ہوتے رہے ہیں اور نت نئے نمونے پیش کیے جاتے رہے ہیں ۔غرض کہ جب اردو مختصر افسانہ معرض وجود میں آیا اس وقت اردو میں داستانی عہد کی روایتوں کا کافی سرمایہ موود تھا۔

پریم چند جو صحیح معنوں میں اردو میں افسانہ نگاری کے بانی ہیں ان کے ذہن کی تربیت داستانوں کے ماحول میں ہی ہوئی۔جیسا کہ خود انہوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ ''طلسم ہوشربا'' کے مطالعے نے ان کے اندر چھپی ہوئی تخلیقی صلاحیتوں کو جگایا پریم چند کی افسانہ نگاری کا یہ پہلو قابل غور ہے کہ ان کے مختصر افسانے پر داستانوں کا کافی اثر ہے۔البتہ داستانوں کے برخلاف ان کے کردار حقیقی ہیں ۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کا دور دراصل ہندوستان میں قومی بیداری کا دور ہے اس لئے ان کے افسانوں کو وقت کی رہنمائی اور رفاقت ملی اور وہ بہت جلد فروغ پاگئی۔اسی لئے پریم چند کے افسانوں کا مطالعہ ''سوز وطن'' کے افسانوں سے لے کر ''کفن'' تک کیا جائے تو اس میں ایک تدریجی ارتقاء ملتا ہے۔

یہ تو طے ہو گیا کہ اردو افسانہ بیسویں صدی کے آغاز کی پیداوار ہے۔لیکن افسانے کے ارتقاء کی تاریخ کا یہ اہم مسئلہ ہے کہ اردو کا پہلا افسانہ کون سا ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک پریم چند کا افسانہ '' دنیا کا انمول رتن'' کو اولین افسانہ سمجھا گیا۔بعض لوگ سرسید کے ''گزرا ہوا زمانہ'' کو پہلا افسانہ کہتے ہیں۔احتشام حسین اور دوسرے لوگ سجاد حیدر یلدرم کے افسانہ ''نشے کی پہلی ترنگ'' کو پہلا افسانہ مانتے ہیں۔

مغربی شارٹ اسٹوری کے ماڈل پر مبنی سر سید کا ''گزرا ہوا زمانہ'' محض آغاز میں افسانہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا وسط اور اختتام دونوں مل کر اسے اصلاحی مضمون بنا دیتے ہیں۔ (۱۸۳۷ء تہذیب الاخلاق علی گڑھ)......... ''نشے کی پہلی ترنگ'' ۱۹۰۰ء یلدرم کا طبع زاد افسانہ نہیں ہے بلکہ ترکی افسانہ نگار خلیل رُشدی کے افسانے کا ترجمہ ہے۔

پریم چند کا ''دنیا کا انمول رتن'' رسالہ کانپور میں کبھی نہیں چھپا۔ یہ پہلی بار ان کے مجموعہ ''سوز وطن'' میں ہی شائع ہوا۔ لہٰذا یہ بھی ان کا پہلا افسانہ نہیں ہے۔ مرزا حامد بیگ نے ''فنون'' رسالہ لاہور کے ۱۹۹۱ء کے شمارے میں ''اردو کا پہلا افسانہ نگار'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس سے اس سلسلے کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق:-

(۱) نصیر اور خدیجہ۔ راشد الخیری، مطبوعہ مخزن، لاہور، دسمبر ۱۹۰۳ء۔

(۲) دوست کا خط۔ سجاد حیدر یلدرم، مخزن، لاہور، اکتوبر ۱۹۰۶ء

(۳) غربت و وطن۔ سجاد حیدر یلدرم۔ اردوئے معلیٰ علی گڑھ ، اکتوبر ۱۹۰۶ء

(۴) نابینا بی بی۔ سلطان حیدر جوش، مخزن لاہور، دسمبر ۱۹۰۷ء

(۵) عشق دنیا اور حب وطن، پریم چند، زمانہ، کانپور، اپریل ۱۹۰۸ء

گویا نئی تحقیق کی روشنی میں یہ قضیہ تقریباً فیصل ہو چکا ہے کہ علامہ راشد الخیری اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں اور ان کا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' اردو کا پہلا افسانہ ہے۔ جسے خط کی تکنک میں لکھا گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو افسانے کی روایت راشد الخیری سے ہی شروع ہوتی ہے لیکن فن کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو اسے افسانہ کہنا مشکل ہے۔ فنی نقطہ نظر سے جائزہ لینے پر پریم چند کو پہلا افسانہ نگار قرار دیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادبی اعتبار سے پریم چند ہی اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اردو افسانے کی بنیاد ڈالی۔ اور سنجیدگی کے ساتھ اس نوزائدہ صنف کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے عالمی ادب سے فیض اٹھایا۔ دنیا کے نامور افسانہ نگاروں کی شاہکار تخلیقات کا مطالعہ کیا، فن افسانہ نگاری کے تقاضوں کو سمجھا، ملک و قوم کو درپیش مسائل پر غور کیا اور اردو افسانے کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ اس بنیاد پر شاندار محل تعمیر کرنے کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔ بقول پروفیسر قمر رئیس:-

> ''پریم چند کی روایت اردو کے افسانوی ادب میں بنیادی روایت کا درجہ رکھتی ہے۔ پریم چند کے افسانے اردو افسانے کے سفر کی ہر منزل میں چراغوں کی طرح روشن رہے ہیں۔''

یہ حقیقت ہے کہ اردو افسانہ پریم چند کی زندگی میں ہی اپنی تشکیل سے تکمیل تک کئی مرحلوں سے گزر چکا تھا۔ پریم چند کے ہی سنگت میں رہ کر اردو افسانہ نے وطن پرستی کے جذبات اور ماضی کی عظمت کا احساس پیدا کیا، پریم چند کی صحبت میں ہی اس نے رومانیت کی سیر کی، اظہار کے نئے پیرائے تلاش کیے اور خود کو زندگی کی دھڑکنوں سے نزدیک کرلیا۔ اس طرح ایک قلیل سی مدت میں وہ کمسنی کی حد لانگھ کر اس مقام پر آ کھڑا ہوا جہاں سے بلوغیت کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔

پریم چند بلا شبہ اس عہد کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اس فن کے تمام امکانات کو بروئے کار لا کر اسے زمین اور زندگی سے قریب تر کر دیا...... پریم چند کی زندگی میں ہی افسانہ کی دنیا میں تین زبردست انقلاب بھی آئے۔ پہلا انقلاب افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' تھا جس نے پرانی روایت کی شکست وریخت میں حصّہ لیا اور نئے فن کی بنیاد رکھی۔ وقار عظیم نے صحیح کہا ہے کہ

''انگارے'' نئے اور پرانے افسانے کے درمیان ایک ایسی کڑی ہے جو دونوں کو جوڑتی نہیں بلکہ الگ کرتی ہے۔ اپنے باغیانہ عنصر کے سبب اسے غیر قانونی قرار دیا گیا لیکن چنگاری بھڑک چکی تھی لہٰذا جلد ہی دوسرا انقلاب رونما ہوا یہ تھا خود منشی پریم چند کا افسانہ ''کفن''۔ جس نے اس روایت پسند فن کار کو ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے پیش کیا۔ اور تیسرا انقلاب ترقی پسند تحریک کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ یہ تینوں انقلابات ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء کے بیچ رونما ہوا۔ اردو افسانے کا عہد زریں ترقی پسند تحریک کا دور ہے۔ اس کے زیر اثر اردو مختصر افسانے نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان جو ترقی کی اور جو فنی کمال حاصل کیا اس کے مدنظر اس زمانے کو بجا طور پر مختصر افسانے کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ ترقی پسند دور میں موضوعات اور اسالیب کے اعتبار سے اردو افسانہ کافی مقبول ہوا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کا سانحہ پیش آیا جس نے عوام کی طرح ادیبوں کو بھی دم بخود کر دیا۔ افسانہ کی فنی روایت کا تسلسل ٹوٹ گیا اور جب انہیں ہوش آیا تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ترقی پسند تحریک کا جواز تقریباً ختم ہونے لگا۔ لہٰذا ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء کے دور کو افسانے کا عبوری دور کہا جاتا ہے۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت کا آغاز ہوا۔ جدیدیت طوفان کی طرح وارد ہوئی اور رفتہ رفتہ افسانوی افق پر چھا گئی۔ جدید افسانہ نگاروں نے اسلوبیاتی سطح پر تجربے کئے اور کہانی کو تجریدیت کی شکل عطا کی۔ خیال کی پرچھائیوں کو لفظوں میں قید کر کے ایہام پسند افسانے تخلیق کئے گئے۔ لیکن جدید کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ ترسیل کا تھا۔ کہانی قاری سے کٹ کر رہ گئی۔

۱۹۷۰ء کے بعد نوجوان افسانہ نگاروں کی ایک ایسی نسل سامنے آئی جس نے وقت کے تقاضے کو

محسوس کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ ہم جدید افسانہ نگاروں کی روایت سے انحراف کرتے ہیں ۔۷۰ کے بعد بہت سے لوگوں نے یا تو جدیدیت کو چھوڑ دیا یا افسانہ نگاری چھوڑ دی ۔ زیادہ تر نئے افسانہ نگاروں نے جو اشاریت اور علامیت کو برتنے کے ہنر سے بھی واقف تھے ۔انہوں نے اسے وسیلہ کے طور پر اپنایا اور بعض رسائل نے ان نئے افسانہ نگاروں کو نہ صرف خصوصیت کے ساتھ شائع کیا بلکہ انہیں بلیوں پر اچھالا ۔ان میں سے جو دور اندیش تھے انہوں نے اپنا رویہ تبدیل کیا اور کہانی کو مرکزی دھارے سے جوڑنے کا کام کیا۔ان لوگوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت کے رول کو سامنے رکھ کر نئے سرے سے نئے ماحول میں اس کا تجزیہ کیا اور فکر کے نئے دروا کئے......غرض کہ کسی نے جدیدیت کے نام پر بے سمتی اور بے مقصدیت کو فروغ دیا تو کسی نے مابعد جدیدیت کے نام پر سیمینار اور ورک شاپ کر کے جدیدیت کے سر کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کی۔

جدیدیت نے تقریباً دس پندرہ سال تک اردو کے افسانوی ادب کو متاثر کرنے کے بعد ۱۹۷۰ء کے آس پاس تبدیلیوں کے لئے جگہ اس حد تک خالی کر دی کہ ایک طرح کے خلاء کا احساس ہونے لگا اور افسانے کے موضوعات اور اس سے زیادہ طریق اظہار میں تبدیلیاں اپنے وجود کا اثبات کرنے لگیں ۔ بقول عابد سہیل طریق اظہار پر زور یوں دیا گیا کہ جدیدیت نے ذہن میں جو طرز فغاں ایجاد کی تھی اس میں طرز اس قدر زیادہ ہو گیا کہ فغاں دب کر رہ گئی۔

اس طرح ۱۹۸۰ء کے آس پاس افسانہ ایہام اور علامتوں سے نکل کر بیانیہ کی طرف واپس لوٹ آیا اور لوٹتے ہوئے وہ اپنے ساتھ کئی دہوں کی مسافت ، اس مسافت کا تجربہ، اس تجربے کا کرب اور اس کرب کا اثر بھی ساتھ لایا۔

اپنے آغاز سے ۱۹۸۰ء تک لگ بھگ ایک صدی کی مسافت کے بعد اردو افسانہ بیانیہ کی جس راہ سے سفر پر نکلا تھا وقت کے تغیرات اور بہت اتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد بیانیہ کے اسی صاف ستھری شاہراہ پر پھر سے گامزن ہو گیا۔یعنی افسانہ نگاری کی وہ روایت جو پریم چند اور ان کے معاصرین سے شروع ہوئی مختلف مراحل سے گزر کر پھر اپنے محور پر واپس آ گئی البتہ ۸۰ء کے بعد کا افسانہ کہانی کی طرف لوٹا ضرور لیکن جاتے ہوئے کہانی کو جیسا چھوڑ گیا تھا ویسے کا ویسا ہی اسے قبول نہیں کیا بلکہ اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اردو افسانہ نے کہانی کی ساخت کی از سر نو تشکیل کی ۱۹۸۰ء کے بعد ابھر کر سامنے آنے والی اس نسل نے زندگی اور اپنے عہد کو صحیح تناظر میں جذب کرتے ہوئے اس وقت تک کے افسانے کے تمام منفی عناصر سے گریز اور مُثبت عناصر کو اختیار کر کے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی آمیزش سے افسانے کو نئی تخلیقی ہوش مندی کے ساتھ سنبھل کر لکھنا شروع کیا۔

اس ضمن میں سلام بن رزاق لکھتے ہیں :-

''ہم نے لکھنا شروع کیا تھا تو ترقی پسندی کا زوال تھا اور جدیدیت اپنا مقام بنا رہی تھی۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ترقی پسندی کا اکہرا افسانہ ہمیں لکھنا نہیں اور تجریدیت اور جدیدیت کے دبستاں میں بھی اپنے آپ کو کھونا نہیں چاہتے تھے لہٰذا ہمیں ایسا راستہ اختیار کرنا تھا جو ان دونوں کے بین بین ہو۔''

۱۹۸۰ء کے بعد ابھر کر سامنے آنے والی افسانہ نگاروں کی یہی وہ نسل ہے جس پر اپنی شناخت کو قائم رکھنے، اپنی ساکھ کو بنائے رکھنے اور زندہ رہنے کی ذمہ داری تھی اور جس کی ادائیگی کے لئے اسے انحراف و تسلسل کے کئی مرحلوں سے گزرنا پڑا اور جور دو قبول کے رویوں سے اثرات قبول کر کے رنگا رنگ اور متنوع تجربوں کی روشنی میں بیش بہا اضافے کے سفر پر آج بھی گامزن ہے۔ بلاشبہ آج کا معاصر افسانہ تہدار بھی ہے اس میں علامت بھی ہے، اس میں بیانیہ بھی ہے اور گہرائی بھی۔

چیخوف نے غالباً افسانے پر تفصیلی اور مدلل کوئی مضمون نہیں لکھا ہے لیکن اس نے اپنے بعض خطوط میں افسانے کی فنی عظمت کے بارے میں اظہار خیال ضرور کیا ہے۔ ایک افسانہ نگار کی کہانیوں پر ان کی دی ہوئی رائے ملاحظہ ہوں:۔

''تمہارے افسانوں میں وہ جامعیت نہیں ہے جو چھوٹی چیزوں کو زندہ بنا ڈالے۔ تمہارے افسانوں میں ہنرمندی بھی پائی جاتی ہے، ذہانت اور ادبی احساس بھی لیکن ان میں آرٹ بہت کم ہوتا ہے۔ ایک پتھر سے چہرہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں سے وہ تمام حصّے کاٹ کر پھینک دیے جائیں جو چہرہ نہیں ہے۔''

ادب کے تئیں مثبت ردعمل کے طور پر ۱۹۸۰ء کے بعد آنے والے زیادہ تر افسانہ نگاروں نے افسانے کے فن کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا ہے اور پتھر سے چہرہ بنانے کے لئے بے حد ہنرمندی کے ساتھ اس میں سے وہ تمام حصّہ کاٹ کر پھینک دیا جو چہرہ نہیں تھے۔

آخر میں راجیندر سنگھ بیدی کی تحریر میں سے یہ اقتباس پیش خدمت ہے۔ جس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں:۔

''کوئی کتنا بھی پرانی کہانی سے بچنے کی کوشش کرے وہ اس کے بندھے ہوئے اصولوں سے بہت دور نہیں جا سکتا ورنہ وہ کہانی نہ رہے گی وہ موسیقی ہو سکے گی، نرتیہ ہو سکے گی، نقاشی ہو سکے گی لیکن کہانی نہیں۔ آپ کہانی کی اکائی کو دہائی میں بدل دیجئے لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ کہانی ایک بنیادی فن ہے جو بڑی محنت

اور ریاضت سے ہاتھ لگتا ہے۔اور دھیرے دھیرے آپ کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔انسانی اساس کا احساس بن جاتا ہے اور جب کہانی کا ترنم آپ کے بدن میں چلا آئے تو آپ کو سڑک کے ہر کونے کھدرے میں کہانیاں پڑی ہوئی ملیں گی آپ کہانی کو نہیں ڈھونڈیں گے، کہانی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ،سوتے جاگتے آپ کو آلے گی.......اس صورت کی طرح بچّہ اس دنیا میں لائے بغیر جس کا جینا بے معنی اور لا حاصل ہے۔''(مختصر افسانہ راجندر سنگھ بیدی، زمانہ جنوری ۱۹۶۳ء)

مختصر یہ کہ ۱۹۸۰ء کے بعد دھیرے دھیرے اردو افسانہ کے رنگ و آہنگ میں نمایاں تبدیلیاں نظر آنے لگی۔مغربی افسانہ کی خام اور کورانہ تقلید کا رویہ بدلا۔افسانہ میں رموز و علائم کے ذمہ دارانہ تخلیقی احساس نے پیچیدہ تجریدی اور استعاراتی اظہار کی جگہ لے لی اور یہ رویہ صرف نوجوان ادیبوں کی تحریروں میں نہیں جھلکا بلکہ پختہ کار تجریدنگار بھی صاف کہانیاں لکھنے لگے جن کی اشاریت اور معنوی تہہ داری کی تفہیم میں دشواری نہیں ہوئی۔افسانہ میں افسانویت کی حرمت تقریباً بحال ہوگئی۔افسانہ دو انتہاؤں ترقی پسندی اور جدیدیت سے گزرتا ہوا اپنے موضوعات براہ راست زندگی سے حاصل کرنے لگا اب وہ کسی ازم یا تحریک کے زیر اثر نہیں لکھا جارہا ہے۔اب صورتحال بدل چکی ہے۔مطلع صاف ہو چکا ہے۔صبح کا بھولا شام کو اپنے گھر واپس آ گیا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Islam Nagar
3-Bhikanpur
Bhagalpur-812001(Bihar)Phone-9431090440

اردو کی تیرہ نئی مقبول کہانیاں

مرتبہ : ڈاکٹر ریشا قمر سن اشاعت : ۲۰۲۳ء
قیمت : ۴۰۰ روپے صفحات : ۲۵۲

ملنے کا پتہ

ریشا قمر ہاؤز نمبر ۲۔۷۔۹۰۔۱۸۹/۱۲۰ نزد مہندرا شوروم سیٹرم روڈ، گلبرگہ کرناٹک
بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ

● صابر رضا رہبر

جاوید دانش کا ڈراما 'عید لاشوں کے دیش میں' کا تنقیدی جائزہ

فنون لطیفہ میں ڈراما کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اور یہ فن بھی ہمارے یہاں مغرب سے وارد ہوا ہے۔ یونان میں اس کی پیدائش ہوئی اور وہیں اس کے باول پر نکلے۔ ایس کالیس، سوفوکلیز ،اسٹوفنز اور پیڈ یز جیسے فن کاروں نے اس کے چہرے کی مشاطگی کی۔ جوان وتوانا ہونے کے بعد مشرقی دنیا میں اس کی آمد ہوئی۔ اردو میں ڈرامے کی روایت بہت زیادہ قدیم نہیں ہے؛تقریباً دوسال پر اس کا ماضی محیط ہیجالاں کہ ہندستان میں ڈرامے کی تاریخ لگ بھگ دوہزار برس پرانی ہے۔ سنسکرت زبان کے ڈراما نگار بھبھوتی ،اور کالی داس سنسکرت ڈرامے کی دنیا میں آفتاب وماہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اردو ڈراما سنسکرت کا منت کش ہے۔صوفیا کی زبان اور ترسیل تبلیغ کا وسیلہ ہونے کے سبب اردو میں ڈراما نگاری کے آغاز میں قدرے تاخیر ہوئی۔

ارسطو نے ڈرامہ کو انسانی اعمال کی نقالی اور انسانی زندگی کی عملی تصویر قرار دیا ہے ساتھ ہی اس فن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو ڈرامے کا موضوع بن سکتا ہے۔اس کی تکمیل ادبی اصناف کی طرح محض الفاظ سے نہیں ہوتی بلکہ عمل مجسم کی ضرورت پڑتی ہے۔ پروفیسر حسن کیڈراما ضحاک کے بعداردوڈراما کی دینا میں ایک جمودسا طاری ہوگیاتھا۔میرا مطمح نظر ہرگز یہ نہیں کہ اس دوران اردوڈرامے لکھے ہی نہیں گئے ؛ دو چند اچھے اور معیاری ڈرامے ضرور سامنے آئے مگراس کی دھمک محسوس نہیں کی گئی۔اس مدت میں وجود میں آئے ڈرامے معیار کی کسوٹی پر کھرا نہ اترپانے کیسبب یاتو دم توڑ گئے یا پھر معیاری ہونے کے بعد بھی ان کی بازگشت اپنے محدود دائرے کو توڑنے میں ناکام رہی۔اس کے کئی علل ہوسکتے ہیں۔روایتی اور مبہم موضوعات کا انتخاب، پلاٹ وکردار میں ڈھیلا پن ، مکالمے کی پھسپھساہٹ ،جمالیاتی پہلو سے اغماض یا پھر جدید آہنگ اور عصری تقاضوں کا ساتھ دینے سے عاجزی بھی اہم وجہ ہوسکتی ہے۔تاہم اس سکوت کو جاوید دانش نے توڑنے کی کامیاب سعی کی ہے۔جاوید دانش نیاپنے ڈراموں میں تجربات ومشاہدات کواولیت دی ہیاور موضوعات کے انتخاب میں بھی چھانٹ پھٹک سے کام لیا ہے۔

ڈراما نگاری کے لیے انہوں نے دور دراز کی سمتوں وجہتوں کا سفر کرنے ،اساطیری اورتصوراتی دنیا میں تاک جھانک کرکے دور کی کوڑی تلاش کرنیکی بجائے اپنے گردوپیش کے احوال اور سماجی پس

منظر وپیش منظر کو زیر خامہ لایا۔ وہ بہتے پانی پر اور ریت کی کچی دیوار پر زندگی کی کہانی تحریر کرنے کے قائل نظر نہیں آتے ؛ وہ اپنے ڈرامے کی ٹھوس بنیاد کے لیے انتھک جد و جہد کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے گھسے پٹے اور ماورائی موضوعات سے دامن بچاتے ہوئے جیتے جاگتے اور سلگتے عمومی مسائل کو اپنے فن کا حصہ بنایا۔ انہوں نے فن ڈراما نگاری کو تازگی بخشنے کیلئے تمثیل وعلامات کا سہارا نہ لے کر تشکیلات وتعبیرات کے ایک نئے جہان کی کھوج کی جسے وہ 'ہجرت کے تماشے'، 'آوارگی' اور 'مزید آوارگی' سے تعبیر کرتے ہیں۔

جاوید دانش عہد حاضر کا معروف اور معتبر نام ہے۔ ڈراما اور داستان کے حوالے سے ان کی کارکردگی کو ادب وتنقید کی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے فن ڈراما اور داستان گوئی کو ایک نئی جہت عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے بھی انہوں نے انفرادیت کا پہلو اختیار کیا ہے۔ ہجرت، نقل مکانی اور مزدوروں کے دکھ درد کو اپنا عنوان بنا کر فن ڈراما اور داستان گوئی کو ایک نئی اور حقیقی دنیا سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فن کار کو اس کی حساسیت زندہ جاوید بناتی ہے کیوں کہ جس قدر فن کار حساس ہوگا وہ عوامی مسائل کو اسی شدت سے محسوس کرے گا اور اس کے گہرائی و گیرائی کے اظہار کے لیے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو اسی شدت سے کار لائے گا۔ مصور پیکر تراشی کے لیے رنگوں اور برش کا سہارا لے کر اپنے احساس کو تصویر کی شکل عطا کرتا ہے اور فن کار اپنے قلم کی سیاہی میں خون جگر شامل کر کے احساس کو چلتی پھرتی زندگی عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے فن کار محض ایک تخلیق کے سبب امر ہو گئے اور وہی ان کی حتمی شناخت قرار پائی حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا۔ بس فرق یہ ہے کہ جو بات دل کے نازک آبگینے سے لگ جائے اور پھر وہ پیکر کا روپ دھار لے تو ایک جہان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ناظرین وسامعین لاشعوری طور پر دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو کر ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وہ لیلائے حیات ہے جسے بے خودی کی کیفیت کہا جاتا ہے اور اسی کو فن کی معراج کہتے ہیں۔ بقول جاوید دانش:

> 'میرے خیال میں ہر سنجیدہ اور اچھے ڈرامے کے اختتام پر سحر زیادہ یا شدت جوش یا جذبات سے مغلوب قاری تالیاں پیٹ کر ایک نمایاں مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ اسے کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی خواب سے بیدار ہوا ہے، وہ خواب اس کے یا اس جیسوں کے بارے میں تھا۔ اسے خیالی پیکر، فریب خیال، تصوراتی یا ہوا میں معلق بے اعتباری یا پھر شعور اور آگہی کی اعلیٰ کیفیت کہہ لیجیے، ڈراما عقل وفہم سے بالاتر تجربہ ہے۔ یہ ایک طرح کا علامتی سفر ہے۔ کسی مقدس اقلیم میں ایک بصیرت اور معنی سے بھرپور دنیا کا سفر؛ انسانیت کو سمجھنے اور انسانی رشتوں کا سفر'۔ (ہجرت کے تماشے ص:۱۹)

جاوید دانش کی خوبی یہ ہے کہ وہ ڈراما لکھتے بھی ہیں اور ڈراما اسٹیج بھی کرتے ہیں۔اس لیے اس فن کی نزاکتوں اور فنی باریکیوں کو پوری طرح برتنے میں کامیاب ہیں۔ وہ بہت حساس فن کار ہیں اور ان کے سینے میں ایک دردمند دل بسیرا کرتا ہے۔اس لیے وہ عوامی زندگی کی حقیقتوں کو اجاگر کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔انہیں دبے کچلے افراد، مظلوموں اور بے سہاروں سے قلبی لگاؤ ہے۔انہوں نے پہلا ڈراما ٹریڈ یونین کے تعلق سے لکھا جو مزدوروں کے مسائل پر مبنی تھا۔اس کے بعد انہوں نے اس موضوع کو ہمیشگی عطا کرتے ہوئے کئی ایک ڈرامے لکھے۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں مزدوروں کے درد و کسک اور روٹی کے لیے کی جانے والی نقل مکانی کو کئی جہتوں سے پیش کیا ہے۔ وہ مہاجروں کے لبوں پر بکھرنے والی مسکراہٹوں کے پیچھے جاکر ان کی صداقت کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور پاتے ہیں کہ یہ مسکان صرف دنیا کو دکھانے اور اپنے درد کو چھپانے کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ جاوید دانش کے ڈراموں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ فن ڈراما کا شمار بھلے ہی فنون لطیفہ میں ہوتا ہو مگر یہ محض تفریح طبع کا موضوع نہیں رہا۔ جاوید دانش ڈراما کو زندگی، انسانیت کی تفہیم اور انسانی رشتوں کا علامتی سفر قرار دیتے ہیں۔ بقول جاوید دانش:

> ’ڈراما زندگی کے سفر کا علامتی اظہار ہے۔ انسانیت کو سمجھنے اور انسانی رشتوں کا سفر! کیوں کہ تھیٹر اپنی تمام تر بازی گری کے باوجود ہمیں زندگی کرنے کا ہنر خود زندگی سے بہتر طور پر سکھاتا ہے‘۔(چالیس بابا ایک چور ص:۱۴۹)

جاوید دانش کی ڈراما نگاری اور اس کے موضوعات کی حساسیت ایک مستقل مضمون کا متقاضی ہے مگر اس سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہاں ان کے ایک منفرد ڈرامے ’عید لاشوں کے دیس میں‘ کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ڈراما عید لاشوں کے دیس میں کا پس منظر: یہ ڈراما دنیا کی سب سے بڑی اوپن جیل غزہ کے خونچکاں حالات اور ایک بے بس و مظلوم ڈاکٹر کے زندگی کی المناکیوں پر مبنی ہے۔خود اس کا سارا بدن زخم سے چھلنی اور جسم کا پور پور درد سے کراہ رہا ہے مگر وہ اسرائیلی بمباری میں زخموں سے چور ہونے والے فلسطینیوں کے گھاؤ کی رفو گیری کے کام پر متعین ہے۔غزہ پر اسرائیلی بمباری کے دوران سوشل میڈیا میں ظلم و ستم کی چھن کر آنے والی دلخراش روداد نے جاوید دانش کو مضطرب کردیا۔ وہ اس سے کافی متاثر ہوئے اور اس درد کو قوت گویائی عطا کرنے پر مجبور ہوگئے۔اپنے فن کا سہارا لیتے ہوئے انہوں نے ’عید لاشوں کے دیس میں‘ رقم کردیا۔ یہی ایک حساس اور سچے فن کار کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ردعمل کی اظہار میں بھی اپنے فن کو شریک کرلیتا ہے۔

اس ڈرامے کو لکھنے کے بعد انہوں نے بیک گراؤنڈ ساؤنڈ کے انتخاب کے لیے اس کا انگریزی ترجمہ کرکے اپنے فلسطینی دوست کو بھیجا اور ان سے مشورہ کیا جس پر انہوں نے بیک گراؤنڈ ساؤنڈ کے لیے

مصنوعی آلات وصوتیات کے بجائے فلسطینی ماں بہنوں کی چیخیں اوردلوں کو چیر دینے والی آہ وبکا، بموں اورٹینکوں کی چنگاڑتی ہوئی مہیب آوازوں کی ریکارڈنگ بھیج دی۔اس طرح سے اس ڈرامے میں کہانی ، پلاٹ، مکالمہ، کرداراورموسیقی سب کے سبب حقیقی ہوگئے۔

یوں توباضابطہ طور پر یہ ڈراما پہلی بار ہندستان کی عظیم علمی دانش گاہ جواہر لال نہرو یونیوسٹی میں پڑھا اورسنا گیا مگراس کا پہلا سامع اورقاری ہونے کا شرف راقم الحروف کوحاصل ہے۔(فلسطین کے تعلق سیاحقر کی ایک زیرترتیب کتاب کا حصہ بنانے کیلیے انہوں نے یہ ڈراماارسال کیا تھامگرکسی سبب وہ کتاب آخری مرحلے میں شائع ہونے سے روک لی گئی۔جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں)۔جاوید دانش نیپروفیسرخواجہ اکرام الدین کی فرمائش پرپہلی بار یہ ڈراما جے این یو میں اس وقت پڑھاجب جے این یوکیمپس کا ماحول ہنگامہ خیز تھااورکنہیا کمار، عمر خالداور شہلا رشید کا معاملہ گرم تھااسی دوران جے این یو میں اس کے قرآت وسماعت کی محفل سجائی گئی تھی۔'عیدلاشوں کے دیس میں' کی سماعت کے بعدسامعین وناظرین پرسکتہ طاری ہوگیا تھا پھر دنیا کی کئی علمی دانش گاہوں میں پیش کیا گیا۔اس ڈراما کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی قرآت کے دوران ہم حقیقی ماحول میں پہنچ جاتے ہیں اورپھراسرائیلی مظالم اورغزہ کے مظلوموں کی بے بسی کا منظرآنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔جب ڈراما کے حصار سے باہرنکلتے ہیں تو آنکھیں بھیگ چکی ہوتی ہیں اوردیرتک اس کا طلسم برقراررہتا ہے۔

پروفیسر محمد حسن کے ڈراما ضحاک اورجاوید دانش کے ڈراما عیدلاشوں کے دیس میں' مماثلت:

جاوید دانش جب جے این یو میں ڈراما 'عیدلاشوں کے دیس' کی پہلی قرآت کی داستان سنانے رہے تھے اس دوران مجھے ڈراما ضحاک کی یادآ گئی اورپھرغورکرنیپروفیسر محمد حسن کے ڈراما ضحاک اور جاوید دانش کے ڈراما'عیدلاشوں کے دیس میں' کے دورمیان کئی طرح کی مماثلتیں نظرآئیں۔ڈراما کی پہلی قرآت کے وقت کے حالات اورمقام قرآت میں عجب اتفاق نظرآیا کیوں کہ دونوں کوپہلی بار جواہرلال نہرو یونیورسٹی میں پڑھا گیا۔ڈراماضحاک کے وقت ملک ایمرجنسی کے دورسے گزررہا تھااورڈراما'عیدلاشوں کے دیس میں' کی قرآت جب کی گئی تو بقول لال کرشن اڈوانی ملک میں غیراعلانیہ ایمرجنسی نافذتھی۔دونوں ڈراموں میں ظلم وستم کومرکزی خیال کے طور پرپیش کیا گیا ہے۔اس لیے یہ حالات تو یقینی طور پر ڈراما خوانی کے لیے موزوں نہیں ہوسکتے تھےیہ انہیں لوگوں کا دل گردہ تھاجواس سنگین ماحول میں بھی اس کی سماعت کی محفل سجائی۔بقول پروفیسر محمد حسن:

'ستمبر ۱۹۷۶ء میں میں نے 'ضحاک' مکمل کرلیا۔ایمرجنسی اپنے شباب پر تھی ،طلبہ کا اصرار بھی بہت تھا۔اب اس اصرار میں دوسرے احباب بھی شریک ہوگئے تھے۔(جس میں چند طلبا بھی شریک تھے) پورا ڈراما پڑھ کر سنایا۔احباب

نے بہت تعریف وتوصیف کی۔ساتھ ہی ساتھ اس کے نہ چھپ پانے پر دلی رنج وغم کا اظہار بھی کیا۔'(دیباچہ ڈراما ضحاک،ص:۲۰)

ڈراما 'عیدلاشوں کے دیس میں' کی سماعت کے لیے پروفیسر خواجہ اکرام نے بھی مخصوص طلبا واحباب کی محفل سجائی۔ناموافق حالات کا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے ہال کے دروازے اور کھڑکیاں مقفل کردی گئیں اور پھر ڈراما عیدلاشوں کے دیس میں کی سماعت کی گئی۔ڈرامے کے اختتام پر یہاں بھی سامعین پر ایک سکتہ طاری تھا جو دادو تحسین کی صداؤں سے ٹوٹا۔ڈراما ضحاک اور عیدلاشوں کے دیس میں کے پلاٹ اور مرکزی خیال بھی قدرے مشترک ہے کیونکہ دونوں میں ظلم وجبر کی داستان بیان کی گئی ہے۔ڈراما ضحاک میں ایک ایسے ظالم بادشاہ کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنی حکومت اور مملکت کی توسیع کے لیے سفاکیت کے تمام تجربے آزماتا ہے اور بوڑھے شیطان کی مدد سے جنگ میں فتح حاصل کرتا ہے۔اس کی رعایا کو سوال کا حق تو کجا اپنے اوپر ہونے ظلم وستم کے خلاف بھی لب کشائی کی اجازت نہیں۔سچ،جھوٹ،قتل اور قربانی کے معنی بدل دیے گئے،کوئی صدائے احتجاج نہ بلند کرپائے اس لیے ہونٹ تک سل دیے گئے۔بقول شہنشاہ

'ہماری مملکت میں سوال جرم ہے'

ضحاک کو یہ پسند نہیں ہے کہ اسے کوئی جابر وظالم حکمراں کے خطاب سے یاد کرے اس لیے اس کے وزراء وحکام ظلم وجبر،تشدد واستبداد،رحم وکرم اور ایثار وقربانی کے معنی تک بدل دینے کا خاکہ تیار کرنے میں سرگرم عمل ہو جاتےہیں اور کیوں کہ:

'اس کام کے لیے ملک کی پوری فضا بدلنی ہوگی،قانون بدلنا ہوگا۔لوگوں کی ذہنیت بدلنی ہوگی،سماج کا ڈھانچہ بدلنا ہوگا'(ڈراما ضحاک ص:۴۰/)

ضمیر کی تسکینیت کے سوال پر ضحاک کے وزیر اعظم کا غیض وغضب میں بجھا جواب ہوتا ہے کہ:''خاموش جاہلو!ضمیر ہمارا مسئلہ نہیں ہے،ہمارے سامنے اس سے زیادہ بھیانک سوال ہے،ہمیں روز انسانوں کے بھیجے درکار ہیں،سنتے ہو ہر روز صبح وشام'۔(ڈراما ضحاک ص:۳۸/۳۹)

بالکل اسی طرح ڈراما 'عیدلاشوں کے دیس میں' ایک ایسے فاشسٹ حکمراں کے جبر واستبداد کی کہانی ہے جو اپنی قابض ریاست کی توسیع کے لیے بستی کی بستی ویران کررہا ہے۔شاد آباد محلوں کو اجاڑ رہا ہے۔اس کے آہنی پنجوں سے کیا بچے،عورتیں،بوڑھے،بیمار اور ناتواں کوئی محفوظ نہیں۔یہاں بھی سوال کرنا اور اپنے حقوق کی بات کرنا گناہ عظیم ہے۔اس نیا پنے ہر غیر اخلاقی فعل کو جائز ٹھہرانے کے لیے سماجی ڈھانچے اور عوامی ذہنیت کو تبدیل کردیا ہے۔تبھی تو جب وہ بے گناہ فلسطینی بستیوں پر راکٹ کی برسات کرتا ہے تو اس کے عوام راکٹ کی زد میں آنے والے فلسطینیوں کی

چیخیں سن کر تالیاں بجاتے ہیں اور جشن مناتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو اتنا بے حس کر چکا ہے کہ اسے جلتی بستیوں کے مشاہدے میں لطف آتا ہے، بچوں اور عورتوں کی چیخوں سے اسے قلبی سکون ملتا ہے، اس لیے وہ بمباری اور ٹینکوں کے حملوں کے بعد اٹھنے والے شعلوں اور چیخ و پکار کو قرب سے دیکھنے و سننے کے لیے پہاڑ کے اونچے ٹیلوں پر باضابطہ اہتمام کرتا ہے۔ مخملی صوفوں پر براجمان پپکون کا مزہ لیتے ہوئے راکٹ داغنے پر تالیوں و سیٹیوں سے ظلم کی حمایت کا اعلان کرتا ہے۔ ضحاک کے پنجہ جبر و استبداد کو مڑورنے کے لیے فریدوں کا ورد مسعود ہوا تھا جس نے اس کے ظلم و ستم کے تمام آہنی دروازے مسمار کر دیئے مگر 'عید لاشوں کے دیس میں' میں ڈاکٹر غسان حبیب صباوی کے فریدوں بننے کا انتظار باقی ہے۔ ڈراما ضحاک ایک کلاسیکی اور قدیم اساطیری کہانی ہے جسے جدید نظم و آہنگ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں تمثیل و علامت نگاری سے کام لیا گیا ہے جبکہ ڈراما 'عید لاشوں کے دیس میں' میں سب کچھ حقیقت ہے۔ پلاٹ ،کردار اور مکالمے سبھی زندہ جاوید اور متحرک ہیں۔ یہاں حالات، بندشیں، پابندیاں اور ظلم و زیادتی کو بیان کرنے کے لیے علامت و تمثیل کے بجائے حقیقت نگاری سیکام لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما 'عید لاشوں کے دیس میں' کے مطالعے کے بعد قاری پر ایک سکتہ طاری ہوجاتا ہے۔ ڈراما ضحاک شاہنامہ فردوسی سے ماخوذ ہے اور ڈراما 'عید لاشوں کے دیس میں' کا پلاٹ انبیاء کی سرزمین فلسطین کے غزہ کے محصورین کے حالات زار سے اخذ کیا گیا ہے۔

عید لاشوں کے دیس میں پر ایک نظر: اسرائیلی جبر و تشدد کا سامنا کر رہے مظلوم فلسطینی بالخصوص غزہ کے محصورین کی جدو جہد کی ایک المناک اور طویل داستان ہے۔ فن کار کی یہ خوبی رہی ہے کہ اس نے مظلوموں کے دکھ درد کا ترجمان بن کر انصاف پسندوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ جاوید دانش نے بھی غزہ کے عوام پر برسائے جارہے ظلم و ستم کے ہتھوڑوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ انہوں نے پہلا ڈراما 'نئی شاخ زیتون کی' کے نام سے لکھا۔ اس کے بعد 'عید لاشوں کے دیس میں' رقم کیا جبکہ صالح تماری کے اسرائیلی جیل میں قید کے دوران لکھی گئی ڈائری کا 'برزخ کا سفر' کے نام سے اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ فلسطین سے جاوید دانش کا فنی و جذباتی رشتہ ہیاسی سبب فلسطینی ادب سے انہیں از حد دلچسپی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''جب فلسطینی ادب کا ترجمہ کر رہا تھا تو ٹی وی پر یاسر عرفات اور ایزک رابعین کے سمجھوتے کی خبر سنی۔ ساتھ ہی وہاں کی وحشتوں پر، ذہن غازہ پٹی پر پہلے ہی بھٹک رہا تھا، اسی رات ڈراما 'نئی شاخ زیتون کی' کا ظہور ہوا۔ اسی طرح برسوں بعد ٹی وی پر ایک فلسطینی ڈاکٹر کی کہانی سنی، غازہ پٹی پر قیامت برپا تھی۔ دوسرا سولو، پہلے

سے بھی زیادہ دل برداشتہ اور دل گیر۔ ’عید لاشوں کے دیس میں‘ لکھا اور خود کئی دنوں تک بہت رنجیدہ رہا۔ اگر ہم نے فلسطینی ادب کو نہ پڑھا ہوتا یا ان کو اردو میں منتقل نہ کیا ہوتا تو فلسطینی موضوع پر یہ دو ڈرامے کبھی نہ لکھ پاتا‘۔ (روشن ہے ریگزار ص: ۱۱)

’عید لاشوں کے دیس میں‘ یہ ایک سلو اور المیہ ڈراما ہے جو جاوید دانش اور پروفیسر صفدر امام قادری کی مشترکہ کتاب ’روشن ہے ریگزار‘ میں ضمیمہ کے طور پر شامل ہے۔ اس میں ایک ایسے فلسطینی ڈاکٹر کی روداد زندگی بیان کی گئی جو خود اسرائیلی ظلم و ستم کا مارا ہوا ہے مگر اس کا کام اسرائیلی حملوں میں چھلنی بدن باشندگان غازہ کے زخموں کی رفو گری ہے۔ ڈراما کے آغاز میں ہی قاری اس کی سحر انگیزی کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ طلسم ڈراما کے اختتامی مرحلے پر بھی ختم نہیں ہوتا بلکہ دیر تک اس کا اثر برقرار رہتا ہے۔ ڈرامے کا آغاز ان تعارفی جملوں سے ہوتا ہے:

’میرا نام ڈاکٹر غسان حبیب صباوی ہے۔ میں ایک کمزور اور بے بس ڈاکٹر ہوں۔ دنیا کے سب سے برے، غلیظ اور ٹوٹے پھوٹے جیل غازہ کے الشفا ہاسپٹل کا ایمرجنسی روم ڈاکٹر۔ جی غازہ ۱۸ ملین محصور لوگوں کا کھلا جیل؛ جس سے فرار ناممکن نہیں مگر بہت مشکل ہے۔ اس روز مرّہ کی مرتی اور زخمی آبادی میں زیادہ تر روتے سسکتے، سہمتے ہوئے یتیم بچے ہیں جو بنا روٹی، کپڑا اور مکان کے راستوں پر بھٹک رہے ہیں۔ دو تہائی زخمی جوان اور رفیوجی ہیں۔ مرنے یا زخمی ہونے سے بچ گئے ہیں، وہ رات دن اپنی یادداشتوں اور رشتے داروں کی میّت کے کفن دفن میں مصروف ہیں۔ عورتوں کی حالت سب سے نازک ہے۔ ڈری ڈری روتی سسکتی عورتیں جو ہر وقت اپنے سپوتوں کی حفاظت کی دعا میں گم ہیں‘۔

مذکورہ پیراگراف کی قرآت سے ایسا لگتا ہے کہ جاوید دانش کوئی ڈراما نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ اپنے خون جگر سے خیالات و تصورات کے کینوس پر فلسطینی مظلوموں کے درد کی مصوری کر رہے ہیں۔

ڈراما ’عید لاشوں کے دیس میں‘ کا مرکزی کردار ڈاکٹر غسان حبیب صباوی ہے۔ غازہ کے الشفا ہاسپٹل میں ایمرجنسی شعبے میں تعینات ڈاکٹر صباوی اسرائیلی راکٹ، ٹینک کے گولوں اور مشین گنوں کا نشانہ بن والے زخمیوں کو نہ بچا پانے پر بے حد شرمندہ ہے۔ اسپتال کا حال یہ ہے کہ یہاں انجکشن ہے نہ ہی دوا اور نہ ہی ڈاکٹروں کو فرصت کہ وہ زخمیوں کو اٹینڈ کر یکیوں کہ زخمیوں اور لاشوں کی آمد و رفت کا ایک سلسلہ ہے جو ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ بے بس و مجبور ڈاکٹر صباوی کا جذبہ طبیبیت انہیں کچوکے لگاتا ہے مگر وہ مجبور ہیں اور چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے کیوں کہ اسرائیل کی میزائلوں کی زد سے اب اسپتال بھی محفوظ نہیں رہا۔ اسپتال پر حملہ کے سبب یہ فرق کرنا مشکل ہو گیا ہیکہ زخمی ہاسپٹل کے مریض ہیں یا یہاں کے پناہ گزیں۔ اسرائیلی حملوں کا نشانہ بننے سے بچنے کے

لیے بے بس فلسطینیوں نے یہ تدبیر ڈھونڈ نکالی کہ اسپتال میں پناہ لی کہ اسپتال پر یقینی حملہ نہیں ہوگا مگر ان کا خیال خام ثابت ہوا اور راکٹ و میزائل کی زد میں غزہ کا الشفا اسپتال بھی آ گیا تھا۔ ایسے حالات میں بے بس ولا چار مگر زندہ دل ڈاکٹر سوائے معافی مانگنے کے اور کیا کر سکتا ہے، یہی ایک واحد راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ ضمیر کی ملامت سے بچ سکے۔ ڈاکٹر صباوی بار بار اپنی بے بسی پر آنسو بہا کر ان تمام یتیم و معصوم بچوں سے شرمندگی کا اظہار کرتا ہے جن کے والد کو وہ نہیں بچا سکا۔ وہ ہزاروں بیواؤں کے سہاگ کو بچانے میں ناکامی پر بھی اظہار ندامت کرتا ہے۔ ماؤں اور بے گناہ غازہ کے مجبور و محصور افراد سے بھی معذرت خواہ ہے جنہوں نے لشفا ہاسپٹل میں یہ سوچ کر پناہ لی تھی کہ شاید یہاں بمباری نہیں ہوگی مگر اسرائیلی بموں کے گولوں سے وہ بھی محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ اس دوران ان کی آنکھوں میں اپنی ماں کے ساتھ کی گئی اسرائیلی فوجیوں کی سفاکی کا دلدوز منظر بھی آ جاتا ہے جس پر دل سے ایک سرد آہ نکلتی ہے اور وہ کہتا ہے:

'میں سب سے زیادہ شرمندہ اپنی ماں سے ہوں جس کی آبروریزی
میری آنکھوں کے سامنے ہوتی رہی۔ میں چیخنا تو درکنار؛ رو بھی نہ سکا۔ میں کوئی دس
برس کا تھا۔ خوف اور دہشت سے میری آواز نہیں نکلی'۔

ڈاکٹر صباوی اور اس کے اہل خانہ پر ۱۹۶۷ء کی جنگ ایک قیامت بن کر آئی۔ آئی ڈی ایف کے بھیڑیوں نے رات کی تاریکی میں اچانک فلسطینیوں کے گھروں پر گولیوں کی بوچھار کر دی۔ وہ بارش کی طرح بمباری اور گھروں میں گھس کر اندھا دھند مشین گن کی فائرنگ کر رہے تھے۔ اس دوران ڈاکٹر صباوی کے باپ کو رسّی سے باندھ کر صحن میں پھینک دیا۔ اس کے دو بھائیوں کو گرفتار کر کے باہر لے گئے۔ پھر یکے بعد دیگر سات فوجی جوانوں نے اس کے ماں کی آبروریزی کی۔ اس کے سارے اہل خانہ مار دیے گئے۔ وہ اپنے باپ اور بھائی کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہو سکا بلکہ اسے یہ بھی نہیں پتا کہ ان کی آخری رسومات ادا بھی کی گئی یا یا پھر Mass grave میں ڈال دیا گیا۔ ڈاکٹر صباوی کی ماں کے ساتھ اسرائیلی فوجیوں کی درندگی کا یہ حال بھی سنیے!

'یکے بعد دیگرے سات فوجی جوانوں نے ماں کی آبروریزی ایسے کی کہ
جسم کے چیتھڑے کر ڈالے اور شاید آخری جوان کی ہوس سے پہلے اس کی جان نکل
چکی تھی۔ مگر وہ پھر بھی ایک وحشی کی طرح اس کو نوچتا بھنبھوڑتا رہا۔ میں پلنگ کے نیچے
سہما یہ دلسوز اور اذیت ناک منظر خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ڈر سے آواز حلق میں اٹکی تھی،
آنکھوں میں آنسو جم گئے تھے۔ باپ نے اپنا سر زمین پر پٹخ پٹخ کر لہولہان کر ڈالا۔ وہ
لوگ ہنستے رہے اور اپنی ہوس پوری کرتے رہے۔ پھر باپ کے بے ہوش جسم کو گھسیٹتے
ہوئے باہر پھینک دیا اور جاتے ہوئے اسے گولیوں سے چھلنی کر ڈالا'۔

اس حملے میں بچ جانے والا ڈاکٹر صباوی اپنے خاندان کا واحد فرد تھا جسے چاچا نے کسی طرح ایک رشتہ دار کے یہاں جارڈن بھیج دیا۔

کہا جاتا ہے کہ انتقام اپنے ساتھ ہمیشہ تباہی لاتی ہے جبکہ اس کے برعکس جذبہ ترحم اور معافی وہ ہتھیار ہے جس کے سہارے بڑے بڑے جنگی جنونی کو بھی انسان بنایا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ بدلہ اور جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں بلکہ وہ خود ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر صباوی کے چاچا عبداللہ کو اس لیلائے زندگی کا ادراک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نیا پنے بھائی کی آخری نشانی بھتیجے غسان حبیب صباوی کو جاردن روانہ کیا تو اس وقت اس سے یہ وعدہ لیا:

’میں بندوق نہیں اٹھاؤں گا۔ جنگ مسئلہ کا حل نہیں۔ اور ایک ڈاکٹر بنوں گا کہ اپنے لوگوں کو نئی زندگی دے سکوں‘۔

ایک لٹے پٹے انسان کے لیے سب کچھ بھلا کر اپنا گھر بسانا اور روشن مستقبل کا خواب دیکھنا ہی بڑے دل گردہ اور ہمت کی بات ہے مگر ایک ایسے شخص کا اپنے چاچا سے کیا ہوا وعدہ وفا کرنا جس کی آنکھوں کے سامنے اسکے بھائیوں اور والد کا بہیمانہ قتل کردیا گیا ہو، جسم سے دم نکلنے تک اس کی ماں کی آبروریزی کی جاتی رہی ہو، وہ سب کچھ پلنگ کے نیچے سہمی آنکھوں سے یہ دل سوز اور اذیت ناک منظر خاموشی سے دیکھ رہا ہو اس کا ماضی کی دردناک وادیوں سے نکل کر ایک نئی صبح کی تعمیر کرنے کی عملی جدوجہد کا آغاز یقیناً کسی کرامت سے کم نہیں۔

ڈاکٹر غسان حبیب صباوی ڈاکٹر بن کر اس جذبے کے ساتھ غازہ لوٹا کہ وہ اپنے لوگوں کو ایک نئی زندگی دے سکے گا مگر یہاں کے حالات تو جوں کے توں تھے۔ اس لیے وہ اپنے چاچا عبداللہ سے بھی شرمندہ ہیں کیوں کہ وہ غازہ کے زخمیوں کو نئی زندگی نہیں دیسکا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر غساوی کہتے ہیں کہ:

’اب کون بتائے کہ ان زخمی لوگوں کو دوائیں نہیں روٹی چاہیے۔ علاج سے بڑھ کر پینے کا صاف پانی چاہیے۔ سر پر ایک چھت چاہیے، لاکھوں فلسطینی خانہ بدوش زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ غازہ کے بارڈ سیل کردیئے گئے ہیں۔ اسرائیل اور Egypt کا بارڈر بند ہے۔ عالمِ اسلام کے شاہ اور صدور خاموش تماشائی ہیں، اسرائیلی آرمی گھر، بازار، ہاسپٹل، SheltersUN، اسکول، کھیت کھلیان؛ ہر جگہ بم برسا رہے ہیں۔ غازہ کے محصور موت کی آنکھ میں آنکھیں ڈالے لڑ رہے ہیں اور شہید ہو رہے ہیں مگر فلسطینی سخت جان نسل ہیں۔ مرنے سے نہیں گھبراتے، اس امید پر ڈٹے ہیں کہ ایک دن مادرِ وطن کو آزاد کرائیں گے مگر کیسے؟‘

تاریخ شاہد ہے کہ انقلاب آفریں شخصیات کی زندگی کا ابتدائی حصہ قابل رحم رہا ہے۔ ان کی ہمت وحوصلہ کو توڑنے کے لیے جسمانی وذہنی اذیتوں کے المناک دور سے گزارا گیا ہے۔ ان کی جوانی

کا بیشتر حصہ قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ پاؤں میں کھنکتی زنجیروں کے سائے میں نئی صبح کا نغمہ رقم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا ہے۔ یہ کوئی اساطیری دنیا کا قصہ نہیں بلکہ اسی عالم حقیقی کی کہانی ہے۔ نیلسن منڈیلا، موہن داس کرم چند گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، عرب بہاریہ کے سرخیل بوعزیزی اور آن سان سوچی کے حقیقی کردار کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ افراد جنہوں نے جمہوریت کی بحالی اور انسانی اقدار کی حفاظت کے لیے ہر نامساعد حالات کا سامنا کیا اور آزمائشوں و مصائبات کی وادیوں کو عبور کرنے بعد وہ دن بھی آیا جب وہ ان کی مراد اصلی ان کا قدم چوم رہی تھی۔ ڈاکٹر غسان حبیب صباوی کو بھی کم عمری میں ہی یروشلم کے جیل کی سلاخوں میں روندا گیا۔ تفتیش کے نام پر رتجگا پر مجبور کیا گیا اور نیند آنے پر ٹھنڈا پانی ڈال کر اذیتیں دی گئیں، ناخن کھینچ کر اس پر نمک لگا دیا گیا، اس کے بعد بھی تفتیش کاروں کی مطلب برآری نہیں ہوئی تو برف کی سل پر باندھ کر چھوڑ دیا گیا۔ ان کی طالب علم ہونے کی دہائی بھی کام نہ آئی۔ بقول ڈاکٹر صباوی:

> ''میں یہی کہتا رہا کہ میں ایک اسٹوڈنٹ ہوں، جارڈن سے چھٹیوں پر آیا ہوں، کسی انتفادہ کا ممبر نہیں مگر میری کسی بات کا ان کو یقین نہیں آتا۔ مارنے کے ساتھ ساتھ ایک نے میری انگلیوں سے ایک ناخن گھسیٹ کر اس میں نمک لگا دیا۔ میں چیختا رہا، چلاتا رہا، درد سے بلبلاتا رہا پھر بھی جب میں نے جواب نہیں دیا تو آخر ان لوگوں نے مجھے برف کی سل پر باندھ کر چھوڑ دیا۔ گھنٹے بھر میں جسم سُن ہو گیا، کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں اور ہڈیاں چٹخنے لگیں، پیشاب بند ہو گیا، آواز بند ہو گئی اور بے ہوشی کے عالم میں پتا نہیں کیا کیا ہوا۔ کوئی تین مہینے کی ذلت اور ٹارچر کے بعد پتا نہیں کیسے مجھے چھوڑ دیا گیا۔ مگر مجھے اس کا بھی انکشاف ہوا کہ مولوی جہنم کی آگ اور سزا کی جو بات کرتے ہیں، ان کو نہیں معلوم جہنم کا ایک حصہ برف کا بھی ہے جس کو میں جھیل چکا ہوں۔'

ڈاکٹر صباوی بھی فلسطین کی آزادی کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیتا ہے، اسلحہ کا سہارا لینے اور تحریک آزادی کا حصہ بننے پر غور کرتا ہے اور فلسطینی سرفروشوں کی ہمت کو سراہتا ہے مگر صرف سروں کے نذرانے سے ہی آزادی تو نصیب نہیں ہو سکتی ہے نا اور یہی سوال اس کے ہتھیار اٹھانے کی راہ میں حائل ہے۔

جبر مسلسل کا سامنا کرنے والے افراد دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے اپنا مقدر مان کر ہر ظلم کے آگے سر خم تسلیم کر دیتا ہے جبکہ دوسرا وہ جو ہر جفا کا مقابلہ کرتا ہے اور اپنی حیثیت کے مطابق اس کا جواب بھی دیتا ہے۔ مگر ڈاکٹر صباوی کا تعلق تیسرے طرح کے افراد سے ہے جو آفاقی ہوتے ہیں

اور جور و جفا کا مقابلہ معافی و درگزر سے کرتا ہے۔مگر جب ظلم جب بڑھتا ہے تو ایسے لوگ بھی ٹوٹ جاتے ہیں اوران کے رگوں کا لہو بھی جوش مارنے لگتا ہے۔یہی وہ حوصلہ شکن موڑ ہوتا ہے کہ جب بڑے بڑوں کے قدم بھی لرز جاتے ہیں۔ہتھیار ہی اس کے سامنے آخری آپشن ہوتا ہے۔کیونکہ خموشی کیساتھ مسلسل وحشیانہ جبر وتشدد کو برداشت کرتے رہنا بھی انسانی زندگی کی تذلیل ہے۔اسرائیل کی وحشیانہ کارروائیوں کے سبب اب ڈاکٹر صباوی کا جذبہ بھی دم توڑنے لگا ہے۔وہ اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ سارا کرب اس میں سمٹ کر آ گیا ہے۔

’’میں شرمندہ ہوں خود سے کہ ہم نے ہتھیار کیوں نہیں اٹھایا؟ کیا میں بزدل ہوں یا اپنے والدین کی موت سے ڈر گیا تھا؟ میرے ڈاکٹر بننے سے میرے لوگوں کو کیا فائدہ ہوا۔مجھ سے بہتر تو سامنے کے قبرستان کا گورکن ہے جو اپنے لوگوں کے جنازے عزت کے ساتھ دفنا تو رہا ہے۔مرنے والے کے گھر والوں کو سکون تو فراہم کر رہا ہے۔مجھ سے میرے لوگ خائف ہیں کہ میں ان کے زخمیوں کو بچا نہیں پاتا مگر میں ان معصوم لوگوں کو کیا بتاؤں کہ اکثر زخمی، کٹے پھٹے، جلے جھلسے اور مرے ہوئے آتے ہیں، ہم تو بس ان کی تسلی کے لیے ان کی لاشوں کی دیکھ بھال کر لیتے ہیں۔دس میں سے شاید ایک خوش قسمت زندہ واپس جاتا ہے۔ہم کتنے مجبور ہیں کیا بتائیں۔‘‘

’ڈراما عید لاشوں کے دیس میں‘ ہمیں ایک تجرباتی ومشاہداتی دنیا سے روشناس کراتا ہے۔اس کے پلاٹ کا رشتہ تصوراتی واساطیری دنیا سے بالکل الگ نہیں ہے۔اسپتالوں پر بموں کی برسات ، شاد وآباد گھروں میں اچانک ماتم ونوحہ خوانی ، بھوک سے بلبلاتے بچے ،توپ اور جدید اسلحوں کا غلیل ودیگر گھریلوں آلات سے مقابلہ کرنے کے دوران سینہ چھلنی کرتے آزادی کے متوالے سب کچھ اصلی ہیں۔ایک ایسی دنیا جہاں ہمدردی ،انسانی اقدار اور حقوق انسانی کا فلسفہ محض ایک قوم کے لیے مخصوص ہے۔تعلیمی سہولیات کا ذکر رہنے دیں۔یہاں تو صحت اور خوراک جیسی بنیادی ضرورتیں بھی عنقا ہے۔الشفا ہاسپٹل کے ایمرجنسی میں بارہ بیڈ ہے مگر ہر بارہ منٹ پر ایک مریض اور زخمی آ رہےہیں ۔مریضوں کے ساتھ ساتھ معالجین بھی بھوک، تھکن اور الجھن سے دو چار ہیں۔چوبیس گھنٹے کے روزے کے ساتھ ڈاکٹر مسیحائی کا فریضہ انجام دے رہےہیں اور دنیا اس کے حق اور دفاع میں آواز اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہے۔اس لیے ڈاکٹر غساوی الشفا ہسپتال کو ایک مقتل اور ذبح خانہ سے تعبیر کرتےہیں ۔

ایک حساس وایماندار ڈاکٹر کی ہمیشہ یہی سعی ہوتی ہے کہ وہ ہر کوشش کسی کی جان بچالے مگر جب وہ دوا، آکسیجن اور وسائل کی عدم دستیابی کے سبب کسی معصوم جان کو بچانے میں ناکام ہوتا ہے تو اس کا

ضمیراسے ملامت کرتا ہے۔ ڈاکٹر صباوی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ گولیوں کی گونج اور ٹینکوں کی گڑاگڑاہٹ کے درمیان جب شب کے ڈیڑھ بجے ایک مریضہ مریم کوایمرجنسی میں لایا گیا آپریشن روم میں کوئی سہولت نہیں تھی۔ بلیک آؤٹ کے سبب ڈاکٹر موبتی کی روشنی میں کام کررہےتھے۔ صبح میں مریم نے دوجڑواں بچوں کو جنم دیا مگر دونوں کے جسم جڑے ہوئے تھے اوردل ایک۔ کسی ایک کو بچانے کے لیے آپریشن ضروری تھا مگر یہاں آپریشن کا سامان ہی مفقود۔ گولوں اور ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ کیسبب باہر منتقل کرنا بھی مشکل تھا۔ چاربار مریم کا مس کریج ہوچکا تھا ، شوہرڈاکٹر سے کسی ایک بچے کو بچانے کی فریادکررہا تھا کیوں کہ یہ صدمہ برداشت نہیں کرپائے گی۔ تمام ترکوششوں کے باوجود جڑواں بچوں کوکسی بڑے اسپتال میں منتقل نہیں کیا جاسکا اوروہ اپنی زندگی کی جنگ ہارگئے۔ پھرتھوڑی دیر بعدمریم بھی سفرآخرت پرروانہ ہوگئی۔ جب انسان انتہائی لاچاراور مایوس ہوجاتا ہےتواس کے ہاتھ اٹھتے اوردست بہ دعا ہوتیہیں کیوں کہ یہی آخری سہارا ہوتا ہے۔ڈاکٹرغساوی کے پاس بھی یہی آپشن رہ گیا تھا:

’باہراندھادھند فائرنگ چل رہی تھی......فضامیں اللہ اکبر کانعرہ گونج رہا تھا......ٹینک گھروں کوگرا رہے تھے،عورتوں کی دل خراش چیخیں اذان میں مل کرعجیب ماحول بنارہی تھیں۔فریش زخمی یواین کے ورکرس لارہے تھے......پانی......پانی......کوئی کراہ رہا ہے......کوئی درد سے بےچین ہے......کوئی زورزور سے دعا مانگ رہا ہے، کٹے پھٹے جنازے لائے جارہے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں، آخراتنے مظلوموں کی دعائیں کہاں بھٹک رہی ہیں۔ان بے گناہوں پرکرم کیوں نہیں کرتا پروردگار! یہ آزمائش کیسی ہے جونسل درنسل چلی آرہی ہےاورختم ہی نہیں ہوتی.......وہ صبح کب آئے گی؟ آزادی کس قیمت پرملے گی؟........ نفرت کی یہ آندھی رکتی کیوں نہیں؟........ تھکتی کیوں نہیں؟........ خون کی یہ پیاس بجھتی کیوں نہیں؟........ آخرہم کب تک مرتے رہیں گے؟......ہماری قربانیاں کب کام آئیں گی؟......یااللہ! توخاموش تماشائی کیوں ہے؟........ابراہیم کی یہ کیسی اولادیں ہیں......ان کادل تو بدل کیوں نہیں دیتا؟‘

ایسے موڑپرایک حساس دل انسان کا ٹوٹ جانا فطری ہے۔یہاں بھی ڈاکٹرغساوی کادل کڑھتا ہے۔یہ ایک ایسا موڑ ہوتا ہے کہ جب اس کے پائے استقلال لرزنے لگتے ہیں اوروہ جھنجھلا کرخود سے سوال پوچھتا ہے کہ آخرکب تک خاموش تماشائی بنارہوں۔اپنے بزرگوں سے کیےوعدے وعید کب تک نبھاتا رہوں:

’آج شاید میں اپنے بزرگوں کو دیے گئے وعدے وعید توڑڈالنا چاہتا ہوں، مجھے کچھ تو کرنا ہوگا‘۔

اورپھرایک وہ دن بھی آیا کہ جب ایک مسیحا نے ظلم وستم کے سلسلے کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے صدائے دل ریش کی آواز پرلبیک کہا اورسادے کاغذپراپنا استعفیٰ لکھ کراپنے کیبن سے باہرنکل آیا۔

جیسے ایک آہنی شکنجے سے آزاد ہوا ہو۔ حالاں کہ وہ کنفیوز ہے مگر اسے سکون بھی ہے۔ وہ عید کا دن تھا جب وہ اپنے کیبن سے باہر نکل رہا تھا، اسی دوران جب کسی نے آنسو پوچھتے ہوئے کہا:

'عید مبارک ڈاکٹر'

یہ سن کر اس کے بدن کا سارا لہو گویا آنکھوں میں اتر آیا۔ تہوار تو مسرتوں کا پیغام لے کر آتا ہے ،عید میں نئے کپڑے، لذیذ کھانے اور پکوان ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے گلے مل کر خوشیوں کو دوبالا کیا جاتا ہے مگر یہاں ایسا کچھ نہیں تھا، بس زخم تھے، درد تھا، آنکھوں میں آنسو تھے اور پھر بے چارگی ولا چاری کی وسیع دنیا تھی ایسے میں عید کی مبارکباد کا کیا مطلب۔ اسی لیے اشکوں کے لبادے میں دی گئی عید مبارکباد بھی ڈاکٹر غساوی کو ناگوار لگی۔ ڈراما کا اختتام ڈاکٹر غساوی کے اسی ردعمل کے اظہار یے پر ہوتا ہے جوان کی بے بسی و بیکسی کا اعلامیہ ہے۔ عید کی مبارک دینے پر ڈاکٹر غساوی کے بقول:

'مجھے ایسا لگا کسی نے گالی دی ہو۔۔ عید اور لاشوں کے دیس میں؟

عید اگر ہے کامرانی اور محبت کا سلام   عید اگر ہے شادمانی اور مسرت کا پیام
دوستوں کس دل سے آئے گی اگر آئے گی عید   مدتوں اس سرزمیں پر آتے شرمائے گی عید

ایک مختصر سے ڈرامے میں جاوید دانش نے فن کی تمام خوبیوں اور نزاکتوں کو سمو دیا ہے جس سے اس میں آفاقیت پیدا ہوگئی ہے اور یہی اس کا امتیازی پہلو ہے۔ وہ اس کے ذریعہ ایک بے بس مجبور دنیا کی صدائے احتجاج کو دوسری دنیا تک پہنچانے کے لیے پیغامبری کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیتے نظر آرہے ہیں۔ کیوں کہ اس میں غزوہ کے مظلوموں کی چلتی پھرتی روداد حیات ہے۔ ڈراما 'عید لاشوں کے دیس میں' کے مطالعے کے دوران بالکل محسوس نہیں ہوتا ہے کہ ہم کوئی کہانی یا ڈراما پڑھ رہے ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ جاوید دانش کی آنکھوں دیکھی حالات جنگ میں لکھی گئی رپورٹ ہے۔

'عید لاشوں کے دیس میں' کے جائزہ لینے کے بعد وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جاوید دانش عہد جدید میں ڈرامانگاری کی مضبوط بنیاد ہیں۔ موضوعات کا حسن انتخاب اور تنوع ان کے فن کو انفرادی شناخت عطا کرتا ہے۔ عصر حاضر میں ان کے ڈرامے کو ایک نئے تجربے سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ زندہ لوگوں کے کرب و مسائل اور جدوجہد کرتے تارکین وطن کے درد والم کو اپنا موضوع سخن بنانا بھی ان کا اختصاص ہے۔

◀◀ ● ▶▶

White House, Nowgharwa
Sultanganj, Patna
Mob: 8804542020

● ڈاکٹر جگ موہن سنگھ

پاکستان کے ماہرِ فن قلم کار: محمد نعیم یادؔ

محمد نعیم یادؔ پاکستان کے نئے لیکن معتبر اَفسانہ نِگار، شاعر اور مصوّر کی حیثیت سے اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ شعر واَدب کے علاوہ اُنھیں اِنسانیت اور اِنسانی قدروں سے بھی عشق ہے۔ اپنی شاعری میں وہ جدید ترین اَفکار وخیالات کا اِظہار کرتے ہیں۔ لیکن اَفسانوں میں اپنے آس پاس کے ماحول اور معاشرہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اِنہیں مذہب اور اِخلاقیات سے بھی دِلچسپی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ابھی حال ہی میں خطِ ثلث، خطِ دیوانی اور خطِ النسخ میں کلامِ پاک کا نسخہ ۵۰ دِن میں تیار کر کے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ محمد نعیم یادؔ سیدھی سادی زندگی گُزارتے ہیں۔ وہ سیاسی اور سماجی آلودگی سے خود کو دور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حلقے میں اُنہیں عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

محمد نعیم یادؔ پاکستان کے ضلع خوشاب کے شہر جوہر آباد میں پیدا ہوئے۔ خوشاب کی سرزمین ادبی حوالے سے بہت زرخیز ہے یہی وجہ ہے کہ اَدب کے معتبر نام احمد ندیم قاسمی، واصف علی واصف اور ہندوستان کے معروف صحافی و ادیب سردار خوشونت سنگھ کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔ محمد نعیم یاد کے والد ایک محنت کش مزدور تھے نعیمؔ یاد ابھی کم عمری میں ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اپنی تعلیمی سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے ساتھ ٹیوشن پڑھانی شروع کی اور ایم۔ اے اردو اور ایم۔ اے اِکنامکس میں ماسٹرز کیا۔ شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں اور ساتھ ساتھ خطاطی، پورٹریٹ اور کتابوں کے سرورق ڈیزائن کرنے کے حوالے سے اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

محمد نعیم یاد کو بچپن سے ہی مطالعہ کا شوق تھا۔ غلام عباس، اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی ان کے پسندیدہ قلم کار ہیں جس کا ذِکر اُنھوں نے ''طلوعِ ادب، لاہور'' میں شائع ہونے والے اپنے انٹرویو میں کیا۔ محمد نعیم یاد کی پہلی کتاب ''آؤ پیار کے دیپ جلائیں پھر'' نثری مضامین پر مشتمل ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی۔ جب کہ ۲۰۱۱ء سے ۲۰۱۴ء تک وہ اپنے علاقے سے بچوں کے لیے ایک میگزین ماہنامہ ''مدنظر'' بھی نِکالتے رہے۔ ۲۰۱۴ء سے لے کر اب تک ان کی اردو، پنجابی اور انگریزی اَفسانوں اور اَفسانچوں پر مشتمل کئی کتب منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں اِک خواب جو ٹوٹ گیا، پتھر روتے ہیں، بے نام مسافتیں، چند اداس کاغذ، نیناں دے سفنے، کنڈیاں دی واڑ، The Fragrance of Words جب کہ پہلا شعری مجموعہ

''پورے چاند کی رات'' شامل ہیں۔

احقر کو محمد نعیم یاد کی دو کتب ''پتھر روتے ہیں'' اور شعری مجموعہ ''پورے چاند کی رات'' پڑھنے کا موقع ملا۔ محمد نعیم یاد نے اپنے اَفسانوں میں زندگی کی مختلف جہات کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کے اَفسانوں میں زندگی اپنی پوری رنگا رنگی کے ساتھ موجود ہے۔ اُنھوں نے معاشرے میں زِندگی بسر کرنے والے مختلف طبقات کے اَفراد کی حرکات وسکنات کو بے نقاب کِیا ہے۔ ان کے اَفسانے ہمارے معاشرے کے ذہنی، جذباتی، معاشرتی اور فکری رُجحانات کا آئینہ ہیں۔ اِن کا مُشاہدہ بڑا گہرا ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو نہایت فنی ہنرمندی سے پیش کرتے ہیں۔

اَفسانہ نہ کِسی بھی شکل میں کیوں نا لِکھا جائے اپنے ماحول اور معاشرہ کے کِسی نہ کِسی کِردار یا کِرداروں کے واقعات کی ترجمانی ضرور کرتا ہے۔ خاص طور پر اَفسانہ اور اَفسانچہ میں کسی خاص شخصیت اور اِس سے وابستہ کِسی خاص پہلو کو اِس طرح پیش کِیا جاتا ہے کہ وہ قارئین کے لیے ایک مثال بن جائے۔ یہ مثال منفی بھی ہوسکتی ہے اور مثبت بھی، خوش آئند بھی ہوسکتی ہے اور رنج وغم کا باعث بھی۔ چنانچہ محمد نعیم یاؔد اپنے اَفسانوں اور اَفسانچوں کے تازہ ترین مجموعہ ''پتھر روتے ہیں'' میں دراصل اِنسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ محمد نعیم یاؔد نے اپنی کِتاب میں 'حرفِ آغاز' کے عنوان سے خود لکھا ہے کہ:

> ''اِس مجموعہ میں اِنسانی شخصیت کے کئی پہلو کو پتھر سے مثال دی گئی ہے اور پھر کو رونے سے تشبیہ دی دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کی ہر طاقت سے سے بڑی طاقت والا کوئی ہے جو سخت سے سخت پتھر کو بھی پاش پاش کردیتا ہے اِنسانی شخصیت کے اَن گِنت آلو ہے ہے اور اِن پہلوؤں کبھی یہ سفید ریش عابد تو کبھی مونچھ مروڑ کر آنکھیں چمکانے والا غنڈہ۔ مدد کِسی دوسرے کے غم میں خود پریشان ہو جائے گا اور کبھی خود اپنے ہاتھوں سے دوسرے ہم جنسوں کی کھوپڑیوں کے مینار بنا کے کوہ کے لگائے گا کبھی محبت کی تھی اِس میں پتھروں سے نہر بھی خود لے گا اور کبھی محبت کی راہ میں دیوار بن کر چاہنے والوں کو زندہ در گور کر دے گا۔'' (افسانوی مجموعہ ''پتھر روتے ہیں'' ص ۶)

''پتھر روتے ہیں' میں نعیم یاد نے اپنے اَفسانوی اور اَفسانچوی فن کا کھل کر اِظہار کِیا۔ اِس مجموعہ میں دس اَفسانے اور ایک سو اٹھارہ اَفسانچے شامل ہیں۔ اس مجموعہ کے حرفِ آغاز میں نعیم یاد لکھتے ہیں:

> ''کِسی مصنف کی ایسی تحریروں کا مقصد قاری کو صرف وقت گزاری یا وقت پر گرفت حاصل کرنے کا بہانہ دینا نہیں ہوتا بلکہ لکھنے والے کا تحریر میں کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر

پوشیدہ ہوتا ہے۔(افسانوی مجموعہ ’’پتھر روتے ہیں ص ۷)

اِس مجموعہ میں نعیم یاد نے حقیقت نگاری کی روایت کو قائم رکھا تاہم اس روایت میں عمومیت نہیں پائی جاتی بلکہ یہ قدرے ایک بلند سطح سے ہمکنار ہوئی۔ یہاں بھی موضوع دیہاتی معاشرت میں بکھری بھوک، فرد کی خارجی اور داخلی زندگی، جسمانی اذیت اور کیفیت وغیرہ کی نمائندگی کی ہے۔اس حوالے سے اس مجموعے میں شامل اَفسانوں میں ’’پتھر روتے ہیں‘‘، بازگشت، مٹی کی مورتیں، حصار، آخری خط اور اُچی جائی نیوں لگایا‘‘ اہم ہیں جن میں دیہاتی رسم ورواج، میلوں ٹھیلوں، طبقاتی تقسیم اور دیہی ماحول کی عکاسی اس انداز سے کی ہے کہ ہر چیز نمایاں ہوتی ہے اور شاید ہی دیہی معاشرت کی ثقافت کا کوئی پہلو پس پردہ رہ گیا ہو۔

اَفسانہ ’’پتھر روتے ہیں‘‘ میں چودھری شریف مرکزی کردار ہے جس کا بیٹا ایک غریب لڑکے کو قتل کر دیتا ہے اور بعد میں اثر ورسوخ کی وجہ سے خود سزا سے بچ جاتا ہے۔اَفسانے میں ایک کردار شاہ جی کا بھی ہے جس کے ذریعے نعیم یاد نے اَفسانے میں چھپے اہم مقصد کو بتانے کے لیے بڑا خوبصورت انداز اپنایا:

> ’’جب تک انسان اللہ کے قریب رہتا ہے اس کی ڈور کا فاصلہ اپنے رب کے قریب ہوتا ہے تب تک وہ بڑی خوب صورتی سے اپنی زندگی کی اُڑان طے کرتا ہے۔ جب وہ ڈھیل لے کے اونچی سے اونچی اڑان اڑنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس پہ نصیحت کا اثر ایسے ہی ہوتا ہے جیسے اب میرے ان جھٹکوں کا اس پتنگ پہ۔ جب یہ اور اوپر اُڑتی جائے گی تو میرے جھٹکوں کا اثر اس پہ بالکل ختم ہو جائے گا یہاں تک کہ یہ خود بخود کٹ جائے گی اور پھر اس کی کوئی منزل نہیں ہوگی۔ کسی کیکر یا خاردار جھاڑی پہ جا گرے گی یا ہوا ہی میں پھٹ جائے گی۔‘‘(افسانوی مجموعہ ’’پتھر روتے ہیں‘‘ ص ۳۱)

شاہ جی کے اس کردار کے ذریعے نعیم یاد نے چودھری کا انجام دکھا کر معاشرے میں انصاف فراہم کرنے کی راہ ہموار کرنے کی بہترین کوشش کی ہے:

> ’’اِس سے پہلے کہ میں کوئی اور سوال کرتا اچانک باہر کے دروازے سے میلا کچیلا پھولوں سے سجا سہرا میری گود میں آگرا میں نے فوراًباہر دیکھا چودھری شریف ہنس رہا تھا ’’سکندر، اپنا سہرا سنبھال، اور جلدی کر بارات جانے والی ہے۔ پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا مجھے اس کی ہنسی سے خوف آنے لگا دفعتاً اس کی ہنسی خوفناک آوازوں میں تبدیل ہونے لگی اور پھر آنسوؤں کی لڑی اس کے رخسار تک

پہنچنے لگی اور وہ دوسری جانب چل دیا۔ میں نے باہر نکل کے دیکھا تو کئی ملازم اسے زنجیروں میں باندھے حویلی میں لیے جا رہے تھے۔ پتنگ شاید کسی کیکر کے کانٹوں میں پھنس چکی تھی۔'' (ایضاً ص ۳۴)

نعیم یاد کی دیہی ماحول سے گہری وابستگی اور دیہاتی لوگوں کی سادگی ان کے اَفسانہ ''آخری خط'' میں اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ جس میں شہر کے ماحول سے اُکتائے اَفسانے کا مرکزی کردار تایا جان اپنے بھتیجے کے ساتھ گاؤں جاتا ہے جہاں پہ اس کی محبت کا بھید اس کے سامنے کھلتا ہے۔ اس اَفسانے میں دیہات کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے سامنے آتی ہے:

سرسبز کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک راجباہ تھا جس پہ چلتے ہوئے وہ مجھے اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتا رہے تھے۔ کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو آگے ایک وسیع میدان تھا جس کے اردگرد پانی کے کئی جوہڑ بن چکے تھے انھیں دیکھتے ہی وہ بولے جانتے ہو یہاں پہ میلا لگتا تھا۔ اور میلے کے تین چار دنوں کی یادیں پورا سال ذہنوں میں نقش رہتی تھیں۔ (ایضاً اَفسانہ آخری خط، ص ۷۷)

اِس مجموعہ میں شامل دسواں اَفسانہ منشا یاد کے نام ایک خط ہے جس میں نعیم یاد نے ملک کے نامور اَفسانہ نگار و ڈراما نویس منشا یاد کے ساتھ اپنی والہانہ محبت کو اَفسانوی روپ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس خط میں وہ ان کے مشہور ناول ''ٹاواں ٹاواں تارا'' کے حوالے سے معاشرے کے مسائل کو پیش کر کے منشا یاد کے فن کی داد احسن طریقے سے دیتے ہیں:

''ذہانت، حب الوطنی، ہمدردی وایثار کے پیکر کو اس معاشرے کے ناسور عوامل جن میں جھوٹے پیر، وڈیرے، زرد صحافت کے علمبردار، بے کردار سیاستدان مل کر مٹی پھنکوا دیتے ہیں اور پتھر چبوانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔'' (ایضاً اَفسانہ منشا یاد کے نام خط، ص ۹۰، ۹۱)

محمد نعیم یاد اردو اور پنجابی کے ایک معتبر شاعر اور اَفسانہ نگار ہیں۔ انھیں مصوری، موسیقی اور مذہبیات سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کے اَفسانوں کا مجموعہ ''پتھر روتے ہیں'' میں شامل اَفسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے آس پاس کی شخصیتوں کو بڑی گہرائی سے سمجھا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہر شخص اپنے باطنی وجود کی بنا پر کسی نہ کسی دُکھ اور درد کو اُٹھائے پھرتا ہے۔ اِس سلسلے میں خاص طور پر ان کے اَفسانوں اور اَفسانچوں میں ''مٹی کی مورتیں''، ''انتقام''، ''آخری خط''، ''اپنا اپنا حق''، ''اپنا گریباں'' وغیرہ اہم ہیں۔

افسانوں میں محمد نعیم یآد کا انداز بیان سادہ اور سلیس ہے۔تشبیہات اور استعارات کے روایتی استعمال سے گُریز کرتے ہیں لیکن افسانوں کے بعض واقعات،اشیاء اور کردار محمد نعیم یآد کے زبردست تکنیکی برتاؤ کی وجہ سے خود بخود علامت اور استعارہ کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔مثال کے طور پر افسانہ''داخلہ منع ہے''میں'اینٹ' اس کے مرکزی کردار غلام رسول کی محرومیوں کی علامت ہے۔اسی طرح افسانہ''انتقام''،''مٹی کی مورتیں'' اور ''حصار'' وغیرہ میں بھی لوک کرداروں (Folk Characters) کے حوالے سے دیہی تہذیب وتمدن کی عکاسی کی گئی ہے۔اِس سلسلے میں ان کے افسانہ انتقام'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اِسے میلے پہ جانا ہمیشہ اچھا لگتا۔باپ کی اُنگلی تھامے جب کبھی وہ میلے کی طرف جارہے ہوتے تو وہ دیکھتا کہ اس کا باپ بڑی مشکل سے پیدل چل رہا ہوتا اور وہ تانگوں، سائیکلوں اور موٹر گاڑیوں پہ جاتے کئی لوگوں سے لفٹ مانگتا مگر کوئی بھی انھیں ساتھ نہ لے جاتا۔بالآخر وہ خود ہی پہنچ جاتے۔واپسی پہ اس کو گرما گرم جلیبیاں ضرور لے کے دیتا جسے وہ اخبار میں لپیٹ کے گھر لے آتا اور ماں باپ بے ساتھ مل کھاتا۔''(افسانوی مجموعہ''پتھر روتے ہیں'' ص۵۴)

محمد نعیم یآد کے افسانے سیدھی سادی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔اِن کے کرداروں میں اخلاقی اور مذہبی اقدار کی بڑی اہمیت ہے۔اسی لیے کہیں کہیں ان کے افسانے کہانی پن کے ذائقہ کے ساتھ اصلاح اور تعمیر کی حرارت بھی رکھتے ہیں۔محمد نعیم یآد کے اس مجموعہ میں ایک اَفسانہ''منشاء یاد کے نام خط'' کے عنوان سے شامل ہے۔یہ افسانہ خط کی تکنیک میں ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو میں اَفسانہ نگاری کے آغاز وارتقا میں راشد الخیری کا اَفسانہ''نصیر اور خدیجہ'' بھی خط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔جسے کچھ محققین اردو کا پہلا اَفسانہ بھی قرار دیتے ہیں۔منشایات کا شمار اردو میں جدیدیت کے بانیوں میں ہوتا ہے لیکن انہوں نے فیشن پرست جدیدیت کی طرح لفاظی نہیں کی بلکہ جدید ترین لب ولہجہ اور اسلوب میں ایسے تازہ کار اَفسانے لکھے تھے جن میں جدت کے ساتھ ساتھ کہانی پن کے عناصر بھی تھے۔محمد نعیم یآد نے اس اَفسانہ میں منشاء یآد کی دو کتابوں ''ایک کنکر ٹھہرے پانی میں'' اور''شہر افسانہ'' کا ذکر کیا ہے۔ محمد نعیم یآد اس اَفسانہ میں پاکستان کے بدحال جمہوری نظام کی بھی نشاندہی کی ہے اور منشاء یاد کو پاکستان کے ایک مثالی شخص اور فکشن نگار قرار دیا ہے۔

اسی طرح محمد نعیم یآد کے اس مجموعہ میں مختصر اور مختصر ترین 118 اَفسانچے بھی شامل ہیں۔ان میں سعادت حسن منٹو کے اَفسانوی مجموعہ''سیاہ حاشیے''میں شامل اَفسانچوں کی طرح دوسطری اَفسانچے بھی ہیں اور دس پندرہ سطروں پر مشتمل اَفسانچے بھی۔مثلاً''شریکِ غم''، ''احساس''،''خفیہ ترقی''،''بچاؤ'' وغیرہ دو

دوسطروں کے اَفسانچے ہیں جبکہ ''جوابی خط''، ''فریب''، ''محبت'' اور ''قربت کا سفر'' وغیرہ دس بارہ سطروں پر مشتمل افسانچے ہیں۔ دوسطری اَفسانچوں کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

''آج بارش کی وجہ کئی نمازی مسجد میں نہیں آئے مگر چند شدید بارش کے باوجود میلے کے موقع پر کئی لوگ لطف اندوز ہو رہے تھے۔'' (افسانچہ ''روشنی کا سفر'' ص ۱۳۸)

''شہر کے اس شاندار بنگلے کے سامنے بالآ کر وہ بچہ بھوک کی تاب نہ لاتے ہوئے مرگیا جس بنگلے کی چھت پہ بندھے کتے کے آگے کھانے کے لیےئی کلو گوشت رکھا تھا۔'' (افسانچہ ''احساس'' ص ۱۱۶)

''فساد میں بہت سے گھر جل گئے تھے مگر ایک گھر سلامت تھا جو فسادیوں کو ٹی وی پہ کوریج دے رہا تھا۔۔۔۔۔'' (افسانچہ ''بچاؤ'' ص ۱۱۲)

محمد نعیم یاؔد کی اس کتاب میں ''اَفسانچہ کی تعریف و دیگر فنی لوازمات'' کے عنوان سے ایک مضمون بھی شامل ہے جس میں مختلف ناقدین کے حوالے سے افسانے کی تعریف پیش کی گئی ہے اور فنی، تکنیکی و جمالیاتی لوازمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی کہیں پرانے اور نئے افسانہ نگار اب افسانچے لکھ رہے ہیں جن میں نور شاہ، وحشی سعید، بشیر مالیر کوٹلوی، اقبال حسن آزاد، زاہد مختار، ریاض توحیدی، راجہ یوسف اور نصیر احمد ناصر جیسے بزرگ اور نوجوان اَفسانہ نگار بھی شامل ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اردو کے دونوں بڑے علاقوں ہندوستان اور پاکستان میں فکشن یا کہانی کی صنف اب اَفسانہ اور اَفسانچہ کے حوالے سے ہی زندہ رہے گی اور محمد نعیم یاد کی کتاب اس کی عمدہ مثال ہے۔

اَفسانہ اور غزل اردو ادب کے دو بنیادی ستون ہیں۔ خاص طور پر معاصر اردو ادب اگر زندہ ہے تو غزل اور اَفسانہ کی وجہ سے۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو آج یہ جب کہ اردو ادب میں اچھے اور شاہکار اَفسانے اور ناول لکھے جارہے ہیں۔ اردو زباؔن اور شاعری کی آبرو ضمانت اگر کوئی صنف ہے تو وہ غزل ہے۔ قدیم دکنی دور سے لے کر ولی تک اور پھر میر و غالبؔ سے لے کر عصر حاضر میں منیر نیازی اور احمد مشتاق وغیرہ تک کی غزلیں اگر اردو شاعری کو زندہ رکھنے کا سبب بن رہی ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ آج ہم اردو غزل کی فنی اور جمالیاتی تقاضوں کو معاصر شعراء کسی نہ کسی حد تک لازمی طور پر برت رہے ہیں۔ ان معاصر شاعروں میں ایک اہم نام محمد نعیم یاؔد کا بھی ہے۔ حالاں کہ محمد نعیم یاؔد نوآموز شاعر ہیں لیکن ان کی غزلوں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ وہ عالم خورشید اور راشد انور راشد اور شفق سوپوری کے پائے کے شاعر ہیں۔ محمد نعیم یاؔد اکیسویں صدی

کے غزل گو ہیں اوراس کا اندازہ ان کی غزلوں میں موجود جدید ترین مضمون اور معنی آفرینی سے لگایا جا سکتا ہے۔اس سلسلے میں ان کی غزلوں کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بات بے بات تھے آئے آنسو کیا خبر کتنے بہائے آنسو
یاد برسات میں میرے دل نے درد سے لاکھوں بنائے آنسو

محمد نعیم یاؔد کی غزل منفرد اور غیر رسمی خصوصیات کی حامل ہے۔ان کی غزلوں میں اردو کی غزلیہ شاعری کی صدیوں پر محیط سماجی وثقافتی جزرومد اور لسانی وفکری اکتسابات کی پیدا کردہ ایک زندہ اور متحرک شعری کائنات نظر آتی ہے۔جس کی تکمیل کا عمل ابھی جاری ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد نعیم یاؔد نے مضمون اور معنی کے علاوہ تشبیہ واستعارہ بحر ووزن اور ردیف وقافیہ کے حوالے سے جن نئے تخلیقی رویوں کا مظاہرہ کیا ہے وہ انہیں معاصر غزل میں اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے کافی ہے۔اس ضمن میں چھوٹی بحر کے یہ اشعار دیکھیے:

کبھی داستاں کی نظر ہوئے کبھی آستاں کی نظر ہوئے
ہیں عجیب یاد مکین دل جو مکین جاں کی نظر ہوئے
زندگی کیسا ماجرہ ہے یہاں جیسے ہر ایک ناخدا ہے یہاں
ہر طرف کھار نظر آتے ہیں جب بھی گزار نظر آتے ہیں

محمد نعیم یاؔد کی خاص بات یہ ہے کہ ان کی غزلیں جدید اور مابعد جدید شاعری کی حدود کو ضرور چھوتی ہے لیکن اپنی غزلوں میں وہ بڑی خوبی سے تغزل کو بھی برتتے ہیں۔اِس سلسلے میں ان کی غزلوں کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اے وفا ہم کو اشک بار نہ کر دل ویراں کو سوگوار نہ کر
لاکھ ٹھہرے ہیں اجنبی لیکن ہم سے اس طرح تو دیوار نہ کر
تیرے عشق میں یوں بے ہوش تھے تیرے ہر بیان کی نظر ہوئے

محمد نعیم یاد کی شاعری کا خاص وصف اس کی سہل نگاری ہے۔اِن کے شعری مجموعے ''پورے چاند کی رات'' میں معروف شاعر''اقبال راہی'' لکھتے ہیں:

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ شعر کی زبان کو آسان بنانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔اُس کے بعض اشعار لفظی سطح پر اتنے سادہ اور معنوی سطح پر اتنے عمیق ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔اس لیے میں یہ ضرور کہوں گا کہ نعیم یاد نے بہت اچھا کیا کہ اظہار کو نئی اور نامانوس بحروں کے تجربوں کی بھینٹ نہیں چڑھایا۔اُس کا اندازِ فکر اور اندازِ اظہار اتنا صاف ہے کہ اُسے طویل اور مشکل تراکیب گھڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔یہ وہ اوصاف ہیں جو نعیم یاد کو خواص تک محدود رکھنے کی بجائے اردو شاعری کے عام قاری تک پہنچنے میں ممد ومعاون ثابت ہوں گے۔

(پورے چاند کی رات، ص ۱۰)

محمد نعیم یاؔد کی ایک مختصر ترین بحر میں لکھی گئی غزل ملاحظہ ہو:

ایمان ضروری ہے عرفان ضروری ہے
اب تو میرے غم کا عنوان ضروری ہے
اے چاندنی شب کوئی مہمان ضروری ہے
یہ عشق سمجھنے کو وجدان ضروری ہے

محمد نعیم یاؔد کی اس شعریت پر کوئی شبہ نہیں، اس کے بحر و وزن کو اجتہادی اور اختراعی کہا جا سکتا ہے۔ بحیثیت مجموعی محمد نعیم یاؔد کی غزلوں کے سارے سرمایہ کو سامنے رکھا جائے تو ان کے تخلیقی رویوں اور خارجی و داخلی لفظیاتی اور معنیاتی ہر پہلو سے اِن کی غزلوں کے امتیازات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

محمد نعیم یاؔد کے بعض قطعات بھی میرے سامنے ہیں۔ قطعہ میں بحر طے شدہ ہوتی ہے اور چار مصرعوں میں کسی ایک مضمون کو تمام تر شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ بیان کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے شاعر کو اِظہار و بیان اور زبان و محاورہ پر مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ خوبی محمد نعیم یاؔد کے یہاں ان کی غزلوں کی طرح ان کے قطعات میں بھی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے تین قطعات پیشِ خدمت ہیں:

ان کی حسرت ان کا ارماں ان کی الفت ان کی بات کیا کیا نہیں ہے مرے دل میں پورے چاند کی رات
آرزوئے بے دید بھی ہے بات کا شوق بھی ہے صورت موسیٰ عجب جب وارفتگی ہیں پورے چاند کی رات
یہ ٹھنڈی ہوا اس پے تیرے قرب کا نشہ کتنا تڑپائے گی پورے چاند کی رات
یاد رسمِ محبت سے چھڑا لے دامن عمر بھر تجھ کو رلائے گی پورے چاند کی رات
پھر بہار آگئی رہتا ہے کیوں پریشان کیوں دردِ دل چھپائے بنایا ہے برا حال
ایک ہلچل سی مچی ہے دو دلوں کے درمیان اذیت میں گزریں گے دونوں کے پھر ماہ و سال

محمد نعیم یاؔد کے زیادہ تر قطعات ''چاند کی رات'' ہیں۔ جسے انہوں نے میرے سامنے موجود کتاب کے تقریباً تمام قطعات میں بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ نعیم یاد جتنے بہترین اَفسانہ نگار ہیں اِتنے ہی اچھے غزل گو اور ماہرِ فن قطعہ نگار بھی ہیں۔

◄◄ ● ►►

S/o Sh. Vilayat Singh C/o Cambridge International School
Purkhoo Camp Jammu Pin Code : 181206
Mobile No.: 7889762542

● نیاز اختر

''ثالث'' ادب کی معتبر آواز

اردو کی مطبوعہ صحافت کی عمر دوسوسال ہوچکی ہے۔ اردو صحافت کی ابتدا شہر کلکتہ سے ہفت روزہ ''جامِ جہاں نما'' سے ہوئی۔ گزشتہ دوسوسال میں اردو صحافت اتنی پروان چڑھی کہ آج دیگر زبانوں سے آنکھیں چار کرسکتا ہے۔ اب تک ہزاروں کی تعداد میں اردو اخبارات، رسائل اور جرائد منظر عام پر آچکے ہیں۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بھی اردو صحافت کا اہم رول رہا ہے۔ اردو زبان کو فروغ دینے اور دوام بخشنے میں رسال وجرائد نے اہم اور قابلِ ذکر کردار ادا کیا ہے۔ کسی بھی ادب اور زبان کو زندہ رکھنے اور اس کی ترویج میں اس زبان میں شائع ہونے والے رسائل اور اخبارات کا نمایاں مقام ہوتا ہے۔ ادبی صحافت کے میدان میں سرزمین بہار ہمیشہ سے زرخیز رہی ہے۔ سہ ماہی رسالہ ''ثالث'' نے اپنا سفر ۲۰۱۳ء میں تاریخی شہر مونگیر سے شروع کیا اور بہت جلد زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان بن کر قاری اور ادیب وشاعر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اس رسالے کے مدیر جناب ثالث آفاق صالح، مدیر اعزازی ڈاکٹر اقبال حسن آزاد ہیں۔ نائب مدیر وقتاً فوقتاً بدلتے رہے ہیں۔ ابتدائی شماروں میں نظام الدین قاسمی صاحب نائب مدیر رہے ہیں۔ درمیان میں اعجاز رحمانی صاحب اور فی الوقت محترمہ نشاط پروین ہیں، جو ایک افسانہ نگار بھی ہیں۔ تاہم اس رسالے کے بال وپر سنوارنے والے ڈاکٹر اقبال حسن آزاد ہی ہیں، جو خود بھی نامور افسانہ نگار، مزاح نگار، تنقید نگار اور شاعر ہیں۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔

رسالہ ''ثالث'' کے ۲۰۱۳ء سے اب تک بائیس (۲۲) شمارے اشاعت پذیر ہوچکے ہیں۔ اس کا ہر شمارہ کتابی سلسلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بائیس میں سے نو (۹) عام شمارے ہیں اور تیرہ (۱۳) شمارے یا تو خصوصی نمبر ہیں یا پھر کسی نہ کسی بڑے تخلیق کار، شاعر، افسانہ نگار او ناقد پر گوشے ہیں۔ اس کے ہر شمارے میں نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی قلمکاروں کی تخلیقات اور فنی جواہر پیش کیے گئے ہیں۔

کتابی سلسلہ نمبر ایک میں اردو کے عالمی پیمانے کے کل پندرہ افسانے ہیں، تین تنقیدی مضامین، غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ اس شمارے کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں پروفیسر مہدی علی پر گوشہ شائع کیا گیا ہے۔ پروفیسر مہدی علی انگریزی استاد تھے اور مونگیر ہی میں قیام پذیر تھے۔ مونگیر سے انھوں نے اردو فورم کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی، جس کے زیر اہتمام ہر ماہ طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اس گوشے میں پروفیسر جابر حسین، شفیع مشہدی، ڈاکٹر سہیل اور اقبال حسن آزاد کے مضامین شامل ہیں۔ اقبال حسن آزاد نے ''مہدی ہے جس کا نام'' کے عنوان سے ایک بہترین خاکہ لکھا

ہے۔اس طرح اقبال حسن آزاد نے پروفیسر مہدی علی پر گوشہ نکال کر بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

''ثالث'' کے شمارہ نمبر۲ میں دیگر مضامین، افسانوں اور غزلوں کے علاوہ پروفیسر لطف الرحمٰن پر گوشہ شامل کیا گیا ہے، جس میں لطف الرحمٰن کے فن اور شخصیت پر سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔

''ثالث'' کے شمارہ نمبر۸ میں مشہور افسانہ نگار انتظار حسین پر گوشہ شائع کیا گیا ہے۔انتظار حسین کی وفات کے بعد ان کے اعزاز میں اس شمارے میں خصوصی گوشہ شائع کر کے اقبال حسن آزاد نے بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔انتظار حسین پر مضمون لکھنے والوں میں عمر فرحت، رافد اویس بھٹ اور سید عمران بلخی ہیں۔ان سب نے بڑی عرق ریزی اور مختلف زاویوں سے انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ماہنامہ ''شب خون'' سے اخذ کیا گیا انتظار حسین سے لیا گیا انٹرویو اور انتظار حسین کی تخلیقات میں سے ایک خاکہ بعنوان ''اے حمید افسانہ نگار جو پہلوان بنتے بنتے رہ گیا'' اور ایک افسانہ ''پسماندگی'' شامل ہے۔یہ شمارہ نئی پود کے لئے ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

کتابی سلسلہ ۹، ۱۰ ''فکشن نمبر'' کی صورت میں مشترکہ شمارہ ہے۔اس میں ملک اور بیرونِ ملک کے نامور افسانہ نگاروں کے کل پندرہ افسانے شامل کئے گئے ہیں۔مائیکروفکشن کے طور پر کل پانچ افسانچے شامل ہیں۔اس رسالے کے مستقل کالم ''انتخاب'' کے تحت مشتاق احمد نوری کا افسانہ ''لمبی ریس کا گھوڑا'' اور غضنفر کا افسانہ ''مِسنگ مین'' منتخب کیا گیا ہے۔اس شمارے میں پیغام آفاقی مرحوم پر گوشہ بھی شامل ہے، جس میں نعیم بیگ، سید جاوید ہاشمی اور محمد علم اللہ کے مضامین شامل ہیں۔

کتابی سلسلہ ۱۲ ''گوشۂ قمر رئیس'' سے مزین ہے، جس میں نگار عظیم اور اسلم جمشید پوری کے وقیع مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

کتابی سلسلہ ۱۴ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس میں دیگر لوازمات کے علاوہ حسین الحق پر گوشہ نکالا گیا ہے۔گوشے میں عبدالصمد نے پروفیسر حسین الحق پر خاکہ لکھا ہے۔مضمون نگاروں میں پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، وارث علوی، ڈاکٹر رفیع ظفر، کلام حیدری، صدیق الرحمٰن قدوائی، فاروق ارگلی، ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، مشتاق احمد نوری، اظہار خضر، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اور عشرت ظہیر جیسے نابغۂ روزگار قلمکار شامل ہیں۔سبھی مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔حسین الحق کی حیات، تدریس اور ادبی خدمات کے ہر گوشے پر نگاہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔کالم ''انتخاب'' میں حسین الحق کا شہرۂ آفاق افسانہ ''ناگہانی'' شامل کیا گیا ہے۔اس شمارے میں اقبال حسن آزاد نے اپنے اداریے میں حسین الحق کی شخصیت اور فن کو اس طرح قلمبند کیا ہے جیسے دریا کو کوزہ میں سمیٹ لیا گیا ہو۔اداریے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''کہا جاتا ہے کہ ایک مستند قلمکار وہ ہے جس کا اپنا ایک الگ اسٹائل ہو

اور جو اپنی تحریر سے پہچان لیا جائے۔ حسین الحق اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔"

کتابی سلسلہ ۲۰ میں اقبال حسن آزاد نے حسین الحق کو ان کی وفات کے بعد خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

اقبال حسن آزاد نسائی ادب کو بھی کافی اہمیت دیتے ہیں۔ اتنے کم عرصے میں انہوں نے "ثالث" کا کتابی سلسلہ ۱۵، ۱۶ جو عالمی خواتین نمبر ہے، شائع کر کے نسائی ادب پر کام کرنے والے محققین، ناقدین اور اسکالرس کو گراں مایہ ادبی تحفہ عطا کیا ہے۔ عالمی خواتین نمبر بلا شبہ ایک دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔ اس شمارے میں پرانی خواتین افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعرات نیز نسائی ادب پر مختلف مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ عالمی خواتین قلمکاروں کے کل تیس افسانے شامل ہیں جو عصری ادب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس شمارے کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ ڈاکٹر افشاں ملک کو مہمان مدیرہ کی حیثیت تفویض کی گئی ہے۔ ڈاکٹر افشاں ملک ایک معتبر افسانہ نگار، ناقد اور محقق ہیں۔ انہوں نے اپنے مہمان اداریہ بعنوان "اردو کا نسائی ادب... ایک جائزہ" میں نسائی ادب کے مختلف نکات کو اجاگر کیا ہے۔

اب ہم بات کرتے ہیں کتابی سلسلہ جلد نمبر ۶، ۷، شمارہ نمبر ۲۱، ۲۲ (جنوری تا جون ۲۰۲۲) کی جو شوکت حیات نمبر ہے۔ یہ نمبر ۴۹۸ رصفحات پر مشتمل ہے، جس میں شوکت حیات کے کوائف کے علاوہ بیس مضامین ہیں۔ سبھی مضامین اہمیت کے حامل ہیں اور شوکت حیات کے افسانوں کے زیر و بم کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس میں شوکت حیات پر سات خاکے ہیں، جن میں ان کی زندگی کے ہر پہلو اور امیج سامنے آتے ہیں۔ مشتاق احمد نوری نے "افسانے کا سکندر: شوکت حیات" لکھا ہے تو عبد الصمد نے "وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی"۔ پروفیسر اقبال حسن آزاد نے "بھول بھلیاں اور شوکت حیات" کے عنوان سے خاکہ لکھا ہے۔ تجزیے کے حصے میں چار ناقدین نے شوکت حیات کے چار افسانوں کے تجزیے کیے ہیں۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے افسانہ "میت" کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ ایک عمدہ تجزیہ ہے۔

بحیثیت مجموعی "ثالث" کا شوکت حیات نمبر ایک دستاویزی نوعیت کا شمارہ ہے جو ناقدینِ ادب بالخصوص ریسرچ اسکالرس کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔ اس طرح سہ ماہی رسالہ "ثالث" کے ذریعہ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے تاریخی شہر مونگیر کو ادبی حیثیت سے عالمی فلک پر پہنچا دیا۔ ان کی محنت، جانفشانی اور اختراعی قوت نے "ثالث" کو ایک نمایاں جریدہ بنا دیا۔ اب تک کے جو بھی شمارے چاہے عام ہوں یا خاص یا گوشہ سے مزین ہوں، کافی معلوماتی اور دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ رسالہ کم مدت میں ہی زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان بن کر آسمانِ ادب پر جلوہ افروز ہو گیا ہے۔ اور یو جی سی کیئر لسٹ کا حصہ بن گیا ہے۔

◀ ● ▶

S.D.O. Office Jamshedpur-831001 (Jharkhand)
Contact No.: 9431398553, 7488785934
E-mail: niyazakhtar40@gmail.com

● ڈاکٹر شاہد جمیل

منتظر آنکھیں

’’اب دعا ہی چمتکار کرسکتی ہے۔زیادہ سے زیادہ ہفتہ دس دن اور......‘‘ ڈاکٹر نیل کنٹھ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

ڈاکٹر کے چیمبر سے نکل کر شہباز اللہ نے پہلے ماں کو بتایا۔پھر وہ آئی سی یو یونٹ میں داخل ہوکر والد سے بولا :’’پاپا!ڈاکٹر نے آپ کی بات مان لی ہے۔گھر جانے کی اجازت مل گئی۔کوشش کرتا ہوں کہ آج کی فلائٹ مل جائے......‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ اُنھوں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

بیٹے کی واپسی کے بعد اُنھوں نے خود کلامی کی :’’باقی ماندہ دِنوں کو ان شاء اللہ بال بچوں کے درمیان گزاروں گا۔‘‘

رحمت اللہ صاحب نے دورانِ علاج اور پہلے بھی کینسر کے بیشتر مریضوں کو خوف وملال کے سائے میں تِل تِل مرتے ہوئے دیکھا اور چند مضبوط دل کو موت کا انتظار واستقبال کرتے ہوئے بھی پایا تھا۔ اُنھوں نے ساتھی مریضوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا کہ یہ سبھی دفعہ دو سو تین کے ملزمین جیسے اپنے اپنے فیصلے کے منتظر ہیں۔اُن کے دِل میں جذبۂ ترحّم لوٹن کبوتر کی طرح گلاٹھیاں کھانے لگا تب ذہن بھٹکانے کے لئے اُنھوں نے سوچا کہ اِس وقت تیماردار کوثر دلدل میں نیم دھنسی گائے کی طرح قوت مجتمع کرکے اسباب یکجا کررہی ہوں گی۔

اُنگلیوں کے لمس پر سِتار خاموش نہیں رہ پاتا اور یادیں، طبلے جیسا تھاپ کی منتظر رہتیں۔مرض کا پتا چلتے ہی رحمت اللہ صاحب کا ماضی بار بار پسِ چلمن آ کھڑا ہوتا۔اُنھیں لگتا کہ وہ نگاہِ التفات کا منتظر ہے۔اُن کا ذہن اکثر بجلی کے لوز کنکشن کی طرح بیتے دنوں کی باتوں اور یادوں سے ازخود جڑ جاتا تب وہ آنکھیں موند لیتے۔پپوٹے فلم کے پردے بن جاتے۔پھر اُن کا ماضی ندی میں ڈُبکی لگا کر نکلی دوشیزہ کی طرح بے پردہ ہوجاتا۔

رحمت اللہ صاحب کے دِل میں بھی پھانسی کے سزایافتہ مجرم کی طرح اپنی کارکردگی کے سود وضیاع کے احتساب کی شدید خواہش پیدا ہوگئی۔اُنھیں لگا کہ گاؤں کی مٹّی اور ماں اپنی اپنی آغوش میں بھر لینے کے لئے اُنھیں بُلا رہی ہیں۔اُنھوں نے آنکھیں موند لیں تب گزشتہ واقعات آبی پرندوں جیسا غول کے غول

حافظے کی جھیل پر اُترنے لگے۔

اُس وقت اُسے لگا تھا کہ بڑا، سمجھدار یا پھر کنبہ کی کشتیِ حیات کا ناخدا سمجھ کر امّی نے اپنی تمامتر توقعات اُسی سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ اسی سبب وہ بچپن کو عام بچوں جیسا نہ جی سکا تھا اور نہ عہدِ شباب کو یادگار بنا پایا۔ وہ زندگی کو پٹری پر لانے کی جگت لڑاتا رہتا۔ کنبے کو عُسرت اور بے وقعتی کی دلدل سے نکال کر معاشرے میں باعزّت مقام ومرتبہ دِلانا اُس کا مقصدِ حیات تھا۔

امّی ہر مشکل اور دشوار ترین کام اُسے ہی سونپتی تھیں۔ جب کبھی ابّا ٹوکتے، یہ نہیں کر پائے گا تب وہ یقین دِلاتیں، کرلے گا پھر وہ سر کو مثبت جنبش دیتے ہوئے پوچھتیں، کرلوگے نا؟ مثبت جواب سن کر بھی ابّا کے چہرے پر بے یقینی کے نقوش قائم رہتے تب امّی کا پُراعتماد جملہ کرلے گا، اُس میں جوش وتوانائی کے ساتھ ہدف مارنے کا جنون بھر دیتا تھا۔ وہ ابّا کی بے اعتمادی کو بطور چیلنج قبول کرتا اور اللہ سے عصائے موسیٰ طلب کرلیتا تھا۔

دس سال کی عمر میں پہاڑی گنج سے پورنیہ ضلع کے ایک دیہی علاقے کا تنہا سفر اور ماموں جان کی دی ہوئی سوغات کے ساتھ گھر واپسی پر اُس نے دل میں کوہ پیماں کی طرح پرچم لہراتے ہوئے سوچا تھا کہ اللہ نے انسان کو غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ برسوں بعد یہ بھی منکشف ہوا تھا کہ آزمائشی دور میں متوکّل اور مجتہد کے لئے اللہ نہ صرف راہیں نکالتا بلکہ حقیر محنت کا اجرِ عظیم عطا کرتا ہے۔ ایماندارانہ کوشش، خود آگاہی اور خود احتسابی، کامیابی کی کنجیاں ہیں۔

ابّا کی سبکدوشی سے تین سال قبل اُسے راجدھانی میں سرکاری ملازمت مل گئی تب وہ سب سے چھوٹے بھائی شہزادہ اور اُس سے بڑی بہن حیا کو ساتھ لایا تھا۔ اُس نے دونوں کا داخلہ معروف انگریزی میڈیم اسکول میں کلاس وَن اور تھِری میں کرایا تھا۔ ایک سال بعد سعیداللہ بھی ٹی سی لے کر چلا آیا تب اُس کا داخلہ گورنمنٹ اُردو ہائی اسکول میں کرایا تھا۔ پھر وہ تین بھائیوں سے چھوٹی بہن ناہید کی شادی کے لئے جہیز کی تیاری کرنے لگا تھا۔ دوستوں اور رشتے داروں کے طنز اور طعنے کو اَن سنی کرتا ہوا اُس نے اپنی جوانی کو تکمیلِ فرائض اور حصولِ مقصد کا ایندھن بنائے رکھا تھا۔

جزوی پنشن بیچنے کے بعد ابّا کو کل اُنچالیس ہزار روپئے نقد ملے اور سات ہزار روپئے ماہانہ بطور پنشن مُتعیّن ہوئے تھے۔ ناہید کی شادی امّی کے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔ لہٰذا اُس نے امّی کی پسند اور خواہش کے مطابق اُس کی شادی ننھیالی گھر سے ہی دھوم دھام سے کرائی تھی۔

پھر چار سال بعد بتّیس سال کی عمر میں گھر والوں کی منتخب کردہ کوثر سے اُس نے بھی شادی کرلی تھی کیونکہ اُس سے دو سال چھوٹا بھائی انواراللہ بہن کی شادی کے بعد ملتجی نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہتا تھا۔

دادا نے بھی پرندوں کو گھونسلے بناتے ہوئے دیکھا ہی ہوگا۔ پھر بھی اُنھوں نے ابّا کو ملے سرکاری کوارٹر میں دَم توڑا تھا۔ ابّا بھی اُنہی کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے، تب اُس نے عزم بالجزم کیا تھا کہ وہ

ایمانداری کی صالح روایت کو جاری رکھے گا، لیکن لا مکانی کی روایت کو عصائے موسیٰ سے منہدم کرے گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بعد کی نسل بھی عرضی میں مستقل پتہ کے کالم میں عارضی پتا ہی درج کرے۔

حسنِ اتفاق سے محکمہ میں برسوں سے خالی پڑے ایک عہدے کا اشتہار شائع ہوا تب اُسے ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ باصلاحیت انوار اللہ کے تقرّر سے اُسے لگا تھا، اچانک اُس کے جسم میں دو توانا دست و بازو اُگ آئے ہیں۔

ملازمت ملتے ہی گاؤں کی ایک پری جمال دوشیزہ کی ماں، بھائی سے رشتہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے بڑے بیٹے نے یہ کہہ کر ماں کا منہ بند کر دیا تھا کہ لڑکے کا اپنا گھر نہیں۔ پورا کنبہ بھائی کے کوارٹر میں رہتا ہے۔ ایک لڑکی کو کماؤ ور کے ساتھ اپنا گھر بھی چاہئے۔ چند دنوں کے بعد انوار اللہ نے اُس سے کہا تھا کہ بھائی جان! گھر بن جائے گا تب ہی اچھے رشتے آئیں گے۔

تحقیر و تذلیل آمیز جملہ بھائی کے دل میں بھی پھانس کی طرح چُبھ رہا تھا۔ اُس نے فوراً گھریلو بیٹھک کی تھی۔ سب یہ جانتے تھے کہ پہاڑی گنج سے ہجرت میں امّی کا کلیدی کردار اور اُس کی کھلی حمایت شامل تھی۔ اُس نے ہی منصوبے کے تحت بہن اور بھائیوں کا داخلہ راجدھانی میں کرایا تھا۔ دادا اور دادی پہاڑی گنج میں مدفون تھیں۔ ابّا کے بھائی بھتیجے اور احباب بھی وہیں مقیم تھے۔ لہٰذا ابّا کو اُن کی فرقت گوارا نہیں تھی اور نہ وہ سسرالی گاؤں میں بسنا چاہتے تھے۔ اُس کی نگاہ از خود امّی کی ملتجی آنکھوں پر جا ٹھہری تھی۔ اُن کا اجتہاد شفق رنگ اور خواب نمناک نظر آئے تب اُس نے امّی کی حمایت میں دوسرا حکم صادر کیا تھا کہ گھر گاؤں میں زمین خرید کر بنے گا۔ مکان بنے، ابّا چاہتے تھے۔ اِسی سبب وہ خاموش رہے۔ روزگار کے متلاشی بھائی مخالفت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ گھر بننے کا متمنّی و منتظر انوار اللہ پیپل میں اُگا نو عمر برگد جیسا تھا۔ مخالفت کا اندیشہ بھیگا پٹاخا ثابت ہوا۔

امّی نے اُسی وقت بتایا تھا کہ اُنھوں نے آبادی سے ہٹ کر سڑک کنارے سات کٹھّہ اراضی کے مالک کو بیع کے لئے راضی کر رکھا ہے۔ اُس نے اُسی اراضی کا قبالہ ابّا کے نام کرایا تھا تا کہ جائداد اور گھر موروثی تسلیم کئے جائیں۔

گھریلو بیٹھک میں امّی نے مکان کا ایک خاکہ پیش کیا تھا۔ امّی کی دِلی تمنّا کے مطابق آٹھ بھائیوں کے لئے ایک ایک ہوادار کشادہ کمرہ مع الماری، ملحق باتھ روم والا مہمان خانہ اور ڈرائنگ روم، کئی ریکوں والا کچن اور اسٹور روم، تین الگ الگ بیت الخلا مع غسل خانہ، بڑا سا برآمدہ، خوش نما چھجّا، کئی بالکونیوں، دو صدر دروازوں، ایک عقبی دروازے اور ایک گیراج والے تین منزلہ جدید طرز کے مکان کا نقشہ اُس نے مشہور آرکیٹکٹ سے بنوایا تھا۔ امّی کی فرمائشیں سنتے وقت اُسے لگا تھا کہ روزِ اوّل سے ایک بڑے کنبے کے ساتھ دو کمروں کے کوارٹر کی اذیّت ناک زندگی سے اُوب چکی امّی اپنے بچوں کو ایک مثالی گھر دینا اور آسودہ حال زندگی جیتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں۔

مکان کی بنیاد ڈالنے سے قبل اُس نے پھر ایک بیٹھک کی تھی کہ معاملہ کنواں کھود کر پانی پینے جیسا تھا۔ابّا کی رقم ناہید کی شادی کی نذر ہو چکی تھی۔سبھی بھائیوں کے درمیان حصّہ ٹھہرانا ممکن نہیں تھا۔لہٰذا اُس نے تیسرا حکم صادر کیا تھا کہ مکان کی تعمیر قسطوں میں ہوگی۔ابتدائی اخراجات کا بار کماؤ بیٹے اُٹھائیں گے۔ پھر اللہ جس بیٹے کو جتنا توفیق دے گا، وہ اتنا خرچ کرے گا۔گھر کا نام 'اتّحاد منزل' ہوگا،جس پر سبھی بھائیوں کا یکساں حقہو گا۔کمروں کی کنجیاں تاحیات امّی کے پاس رہیں گی اور والدین کی حیات تک ایک ہی کچن میں کھانا بنے گا۔

مشرق رُخی گھر کی بنیاد ابّا کے ہاتھوں رکھوائی تھی۔گاؤں والے بھی موجود تھے۔اچانک ابّا کا ہاتھ پکڑ کے امّی بولی تھیں: ''ٹھہریئے! بنیاد میں سونا ڈالا جاتا ہے۔'' پھر وہ ناک کی کیل اُتارنے لگی تھیں۔اُس کیل کو اُسی نے پہلی تنخواہ سے بنوا کر دیا تھا۔ ہتھیلی پر رکھی گئی ننھی سی کیل دیکھ کر ابّا آبدیدہ ہوگئے۔وہ ماضی میں جا پہنچے تھے۔امّی کے زیورات کو دفعِ مصیبتِ ناگہانی کی نذر کرنے والے ابا ہی تھے۔اُس کی نگاہ میں فوراً ابّا کی کوہنی بھی مجسّم ہوگئی تھی۔اخراجات پورے کرنے اور قرض کی ادائی کے لئے اُنھوں نے اُوور ٹائم ڈیوٹی کو معمول بنا رکھا تھا۔

ایک بیٹھک میں اُس نے چوتھا حکم صادر کیا تھا کہ پنشن کی رقم ابّا اپنی مرضی سے خرچ کریں گے۔ گھر کے اخراجات بھی کماؤ بیٹے ہی برداشت کریں گے۔فیصلے نے ابّا کو تمام تفکّرات سے نجات دے تھی۔ شادی میں تاخیر کی مسلّط کردہ اذیّت اور منفی اثرات سے وہ آشنا تھا۔لہٰذا اُس نے ایک دن انوار اللہ سے دریافت کیا تھا کہ اب تم اپنی پسند بتادو تا کہ اُس کے مطابق رشتہ تلاش کروں۔اُس نے بلا تمہید کہا تھا: ''بھائی جان! سماج میں رتبہ پانے اور بال بچوں کے اچھے فیوچر کے لئے ایک اچھے فیملی بائے گراؤنڈ کی ضرورت پڑتی ہے۔ہم لوگوں کو کہیں سے بیک اَپ نہیں ملا، اِسی سبب بہت جھیلنا پڑا۔لیکن میں بچوں کو اپنی جیسی زندگی جینے کے لئے مجبور نہیں کروں گا ......'' مجھ سے نگاہیں چار ہوتے وہ چُپ ہو گیا تھا۔آخری جملے میں اُس کی مشقّت بھری زندگی کا سارا درد اُبھر آیا تھا۔

ایک دن انوار اللہ نے اُسے ایک خوبصورت لفافہ پکڑایا تھا، جس میں تصاویر اور بائیو ڈاٹا تھے۔ سرکاری اسکول کے سبکدوش ماسٹر صاحب نے بھی مشقّت اُٹھا کر بچوں کو اعلیٰ تعلیم دِلائی تھی۔اُن کا ایک بیٹا ڈاکٹر اور دوسرا انکم ٹیکس کمشنر کے عہدے پر فائز تھا۔گاؤں میں پُشتینی جائداد اور راجدھانی میں بیٹوں کا اپنا اپنا بھی گھر تھا۔اُس نے پھر بیٹھک بُلائی تھی۔گھر کے کئی افراد کو بھی یہ رشتہ منظور نہیں تھا۔لیکن اُس نے بھائی کی حمایت میں پانچواں حکم صادر کیا تھا کہ انوار اللہ کو رشتہ پسند ہے،شادی وہیں ہوگی۔

برات کوارٹر سے راجدھانی کے ایک ہوٹل میں گئی تھی۔افرادِ خانہ اہم شخصیات اور صاحبِ اقتدار اصحاب کی تواضع میں لگے رہے۔بیٹوں پر منحصر والدین بے بس اور شرمسار تھے۔'نو ڈیمانڈ شادی' کا غیر متوقع انجام دیکھ کر گھر کے مخالفین افراد اُسے گھور گھور کر دیکھنے لگے تھے۔

کئی برسوں کے بعد چھت کی ڈھلائی ہو پائی تھی۔ اُس کے چند ماہ بعد ہی اللہ نے امّی اور کئی دہائیوں سے ساتھ رہ رہی لاولد بیوہ پھوپھی کی دعائیں قبول کر لیں۔ ایک ساتھ پانچ بھائی برسرِ روزگار ہو گئے۔ تین کو سرکاری نوکری ملی اور دو کو سعودی عرب میں۔ وہ خوش ہوا تھا کہ ہر وقت اُس کے وجود میں دس اور دست و بازو جڑ گئے۔

اللہ نے فارغ البالی عطا کر کے کنبے کو سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اچانک سبھی بھائی ہم خیال ہو گئے۔ پھر اُن لوگوں نے بغیر بیٹھک بُلائے سعید اللہ کو اُس کا قائم مقام بنا کر مکان کی تعمیر میں اپنا اپنا حصّہ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ بلا جواز معزولی پر وہ ششدر رہ گیا تھا۔ امّی اور ابّا کو بیٹوں کا یہ نازیبا رویّہ بہت ناگوار گزرا تھا۔ اِس کے باوجود اُنھوں نے چپّی سادھ لی تھی۔ لوک لاج سے بچنے کے لئے امّی نے فوراً یہ جواز گڑھ لیا تھا کہ بھائیوں نے بڑے بھائی کو راحت دی ہے۔ تعمیراتی پیش رفت کی جانکاری اُسے نہیں دی جاتی۔ امّی دانستہ بلند آواز میں ابّا سے مکان کی پیش رفت کیا باتیں کیا کرتیں۔ باتیں سن کر وہ مسرور ہوتا کہ خوش خوراک مُرغی کے چوزوں جیسا مکان بھی تیزی سے اپنا رنگ و روپ بدل رہا ہے۔ ایک دن اُسے یہ سن کر گہرا صدمہ پہنچا تھا کہ گھر کا نام 'اتحاد منزل' کی جگہ 'شیش محل' رکھ دیا گیا ہے۔ پھر اُس نے گاؤں جانا تقریباً ترک کر دیا تھا۔

بیمار سائرہ پھوپھی کا انتقال پہلی منزل کے گھر بھوج کی تقریب سے دس دن قبل ہو گیا تھا۔ اُس نے اعلان کیا تھا کہ پھوپھی کا جنازہ نو تعمیر مکان ہی سے نکلے گا۔ یہ گھر اُن کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ اُس کا سخت تیور دیکھ کر کسی نے مخالفت نہیں کی تھی کیونکہ بوڑھے شیر کی غرّاہٹ میں بھی ہیبت ہوتی ہے۔ تدفین کے دن سے ہی گاؤں کا مکان آباد ہو گیا۔ گھر بھوج کا انعقاد نہیں ہوا۔ امّی نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن ابّا اپنی مرضی سے جب جہاں جی چاہتا چلے جاتے، جب تک دل کرتا رہتے اور کبھی کبھار وہ بھائی بھتیجوں سے ملنے پہاڑی گنج بھی چلے جاتے تھے۔

ابّا بڑے مہمان نواز تھے۔ گھریلو اخراجات سے ملی نجات کے باوجود وہ مہمانوں سے مل کر تھیلا لیتے ہوئے گھر سے نکل جاتے۔ عام دِنوں میں بھی اُن کا جب جی چاہتا تب گوشت، مچھلی اور سبزیاں لاتے اور کبھی کبھار بجلی کے بل اور گیس سلینڈر کی رقم بھی ادا کر دیتے تھے۔ غربا اور اقربا بھی اُن سے مالی فائدے اُٹھاتے رہتے تھے۔ مکان دیکھ کر جب کوئی ابّا سے کہتا، آپ نے شاندار مکان بنوایا ہے تب وہ کہتے کہ بچوں نے بنوایا ہے۔ کوئی پوچھتا، کم آمدنی میں اتنے بچوں کو کیسے اعلیٰ تعلیم دلائی؟ وہ کہتے، اِس میں بچوں کا کمال ہے۔ ٹیوشن پڑھا پڑھا کر تعلیم حاصل کی ہے اور جب کوئی تعریف کرتا کہ بچے بڑے مہذّب اور اخلاق مند ہیں تب وہ جواب دیتے تھے کہ میں نے کسی طرح کفالت کی ہے۔ تعلیم و تربیت اُن کی ماں کی دین ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ چھوٹے بھائی بہنوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں انوار اللہ کا بھی اہم رول تھا......

''پاپا! سارا انتظام مکمل ہو چکا، فلائٹ سات بجے ہے......'' شہباز اللہ نے بلند آواز میں کہا تاکہ

والد سوئے ہوں، تو جاگ جائیں۔

رحمت اللہ صاحب نے نوزائیدہ بچے جیسا پٹ سے آنکھیں کھول کر بیٹے کو دیکھا۔ پھر وہ بولے:
''بیٹا! محسن کو یہ ہدایت کر دو کہ وہ پڑوسیوں اور رشتے داروں کو خبر کر دے۔ ملاقاتیوں کے لئے صحن میں دس پندرہ کُرسیاں لگا کے چائے پانی کا بھی انتظام کر لے......''

''پاپا! آپ کو کسی بات کی فکر نہیں کرنی۔ اب میں آپ کو تیار کراتا ہوں۔'' شہباز اللہ قطعِ کلام کرتے ہوئے بولا۔

گھر لوٹ کر رحمت اللہ خوش تھے کہ وہ دیارِ غیر میں نہ تو مرنا چاہتے تھے نہ ہی مدفون ہونا۔ کئی مہینوں کے بعد جسم آشنا بستر نے ایسا سکون بخشا کہ اُنھیں اذانِ فجر بھی سنائی نہیں دی تھی۔

صبح پڑوسی حسبِ معمول اپنے اپنے کاموں میں لگے رہے۔ اِس بات کا اُنھیں کوئی خاص ملال نہیں ہوا۔ لیکن اولاد اور بھائیوں کا عیادت کے لئے نہ آنا اُنھیں حیران کر گیا۔ تناؤ کم کرنے کے لئے وہ کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ کمرہ ویسا ہی تھا، جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے۔

ناشتے کا ٹرے لئے اچانک کوثر کمرے میں داخل ہوئیں۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے بولیں، ''دو تین بار کمرے میں جھانک کر میں لوٹ چکی ہوں۔ یہ سچ ہے! اپنے بستر پر گہری نیند آتی ہے۔ دوا دینے کا وقت نکلا نہیں جاتا تب میں تھوڑی دیر بعد آتی۔''

رحمت اللہ صاحب نے فوراً جگہ بنائی تب وہ ناشتے کا ٹرے رکھ کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ پھر محبت بھری ادا سے لقمہ ہونٹوں سے لگایا تب اُنھوں نے متشکّرانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چڑیا کے بچے جیسا منہ کھول دیا۔ لقمہ چباتے ہوئے بچپن کا ایک واقعہ اُن کے ذہن میں بے تکلّف دوست کی طرح آ دھمکا۔

امّی چھوٹے چھوٹے نوالے منہ میں ڈالتی تھیں۔ ایک بار اُس نے گوشت کی بوٹی کو دانتوں تلے دَبا رکھا تھا اور امّی اُسے اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ بوٹی اُن کی چٹکیوں سے اچانک پھسل گئی تھی۔ پھر شوربہ کی چھینٹیں اُس کی آنکھوں میں چُھبنے لگی تھیں۔ امّی نے فوراً آنکھیں دھو پونچھ کر اُن پر آنچل کی کئی تہیں رکھ کے باری باری کئی بار پھونکیں ماری تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اُسے راحت مل گئی تھی۔ پھر وہ گوشت کو چٹکیوں سے مسل کے لقمے کے اوپر رکھ کر کھِلاتی تھیں۔ مچھلی کے کانٹوں کو ڈھونڈ نکالنے میں اکثر کوئی کانٹا اُن کی اُنگلی میں چُبھ جاتا تھا۔ وہ جب تک لقمے چباتا رہتا، امّی نوالے بنا بنا کر رکھتے ہوئے کہتیں، یہ طوطا کا ہے، یہ مینا کا ہے، یہ کوّا کا ہے اور یہ چیل کا۔ اِسے سب سے پہلے کھا لو ورنہ چیل جھپٹّا مار کر لے اُڑے گی۔ منہ میں لقمہ ڈال کر پھر وہ کہتیں، کوّا بھی بڑا لالچی ہوتا ہے......

اِن دِنوں عہدِ رفتہ کو ازسرِ نو جیتے ہوئے رحمت اللہ صاحب کو اچھا لگتا ہے۔ یہ سوچ کر اُنھیں دکھ پہنچا کہ

پزّا، برگر، سینڈوِچ اور ہوم ڈیلیوری کلچر کے پروردہ بچوں اور اُن کی ماؤں کے حافظے میں ایسی دِلکش یادیں نہیں ہوں گی۔

''کہاں کھو گئے؟'' کوثر نے محوِ خیال شوہر سے پوچھا۔

''امّی یاد آگئیں کہ آپ بھی تو اُنہی کی طرح کھِلاتی ہیں۔''

ناشتے کے بعد منہ صاف کرتیں بیوی کو دیکھ کر اُنھوں نے سوچا، بیمار شوہر کی نیک سیرت بیوی ،روپ بدل کر ماں بن جاتی ہے۔

کوثر جانے لگیں، تب وہ بولے: ''وقت اور دن تو اُلٹے پاؤں چلنے لگے ہیں۔''

''میں سمجھ نہیں پائی......'' وہ ٹھِٹک کر بولیں۔

''بتائیے! کون سا مہینہ چل رہا ہے اور آج کون سی تاریخ ہے؟'' اُنھوں نے اِس طرح پوچھا گویا معمّہ ہو۔

وہ مسکرا کر بولیں: ''آج یکم اپریل یعنی اپریل فول ڈے۔''

''اب آپ کلینڈر دیکھئے!'' وہ بھی مسکراتے ہوئے بولے۔

کلینڈر دیکھ کر وہ بولیں: ''محسن نے کلینڈر تبدیل کر دیا ہے لیکن وہ صفحہ پلٹنا بھول گیا۔ میں ابھی پلٹ دیتی ہوں......''

اُنھوں نے سنجیدہ لب و لہجے میں کہا: ''پہلے آپ بیٹھ جائیے! میرے پاس وقت کم ہے اور مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

ٹرے رکھ کے وہ کُرسی پر روبرو بیٹھ گئیں تب وہ بولے: ''آپ کو بھی معلوم ہے کہ ڈاکٹر نے مجھے کھانے پینے اور سیر و تفریح کی کھلی چھوٹ دے دی ہے۔ میں گاؤں جا کر دال پٹھّی ، کونی کی کھیر، بھُنا ہوا شکر کند اور مکئی کی روٹی چھوٹی مچھلی اور ساگ کے ساتھ کھاؤں گا......''

وہ قطعِ کلام کرتے ہوئے بولیں: ''ترکیب بتانی ہوگی۔ دال پٹھّی کا نام تو سنا ہے، لیکن نہ کبھی دیکھا، نہ بنایا اور نہ کھایا ہے۔ مکئی کی روٹی، چھوٹی مچھلی اور ساگ تو نندو کی بیوی سے بنوالوں گی۔''

وہ افسردہ لہجے میں بولے: ''امّی زندہ ہوتیں، تو وہ بغیر کہے میری پسند کا سب کچھ بنا بنا کر کھِلاتیں۔ پوستہ دانہ کی روٹی کے تصوّر سے ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ جنّت مکانی امّی کے ہاتھوں میں مزہ تھا......''

رحمت اللہ صاحب کی نگاہ میں فوراً ایک بھائی کی شبیہ اُبھر گئی، جس نے بیوی کو بچپن کے چند واقعات سنا دیئے تھے۔ پھر اُس کی بیوی موقع ملتے اُسے اوقات بتانے لگتی۔ اِسی سبب اُنھوں نے دِل ہی دِل میں سوچا کہ امّی کفایت شعاری سے گھر چلانے میں ماہر تھیں۔ تنگدستی کے دِنوں میں وہ سوگرام کھِساری کی دال میں صرف ہلدی، مرچ اور نمک ڈال کر پاؤ بھر آٹے کی دال پٹھّی بنا کے پورے کنبے کو کھلا دیتی تھیں۔ دال میں ماٹر

ملاتیں اور مکئی اور اُجلے جنیرے کو وہ اِس طرح بھُنتیں کہ بس چٹکی بھر ہی ٹھریاں نکلتیں......

''پھر خیالوں میں گُم ہو گئے؟'' کوثر نے ٹوکا۔

''ہاں! نہ جانے کیوں اِن دِنوں ذہن میں ماضی کے واقعات ساون کے بادلوں کی طرح یکجا ہونے لگتے ہیں۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولے: ''شہباز سے کہئے! گاؤں چلنے کی تیاری کرے۔ محسن کو وہ اِسی وقت بھیج دے تاکہ وہ ننددو کے ساتھ گھر کی صاف صفائی کرلے اور ہفتہ دس دنوں کا راشن بھی خرید کر لے آئے۔ دوسرا کام آپ کیجئے، سبھی بچوں سے کہہ دیجئے کہ جائداد کی تقسیم ہوگی۔ جو آئیں گے، میں اُنہی کے درمیان تقسیم کروں گا......''

رحمت اللہ صاحب کی خاموشی جب طویل تر ہونے لگی تب آبدیدہ کوثر جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''کلینڈر دیتی جایئے۔'' اُنھوں نے چپّی توڑ دی۔

کلینڈر لے کر اُنھوں نے یکم تا دس اپریل کے حصّے کو کاٹ کر جیب میں رکھ لیا۔

جب یادیں، سہیلیوں کی طرح ایک ساتھ پسِ چلمن آ کھڑی ہوئیں تب رحمت اللہ صاحب نے بھی آنکھیں موند لیں۔ پھر وہ یادِ ماضی کے تہہ خانے میں جا پہنچے۔ کئی بھائیوں کے دِل میں بھی قیادت کا شوق مچل رہا تھا۔ لہٰذا انوار اللہ نے چار بھائیوں اور ایک بہن کی اور اختر اللہ اور اسد اللہ نے ایک ایک بھائی کی شادی کی قِیادت کی تھی۔ تمام شادیوں کی تقریبات میں وہ بھی رشتے داروں جیسا شریک ہوا تھا۔ حیا کی شادی میں تنگدستی کے باوجود اُسے متعیّنہ رقم دینی پڑی تھی۔

وہ دَور کنبے کی فارِغ البالی اور منتہائے عروج کا تھا۔ سبھی بھائی بہنوں کا اپنا اپنا گھر اور کئی کے پاس اپنی اپنی گاڑی بھی تھی۔ بچے بڑی تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ عید اور بقرعید میں ابّا اور امّی کے اصرار پر سبھی بھائی مع اہل وعیال پکنک منانے گاؤں جاتے اور دومنزلہ 'شیش محل' میں اپنے اپنے کمرے کو آباد کرتے تھے۔ اُس کی بیوی بچے گاؤں نہیں جانا چاہتے تھے لہٰذا وہ تنہا جاتا تھا۔ باہمی چندے کے پیسوں سے اِحاطے میں طرح طرح کے کھانے بنتے اور گروپ بنا بنا کر سب وہیں کھاتے پیتے تھے۔ پابندیوں سے آزاد بچے خوب اُدھم مچاتے اور کبھی کبھار آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی۔ چونکہ امّی صُلح صفائی کراتی رہتیں۔ بچوں کو دیکھ کر ہا کرس بھی پھیرے لگانے لگتے تھے۔ ابّا اور امّی کے لگائے آم، ناریل، لیچی، جامن، کٹھل، امرود، شریفہ، انار اور کاغذی لیمو وغیرہ کے پیڑ بھی مہمان نوازی میں پیش پیش رہتے تھے۔ گاؤں والے راہ چلتے ہوئے رشک اور حسرت آمیز نظروں سے کھاتے پیتے ہوئے دیکھ کر گزر جاتے۔ عید اور بقرعید میں

ملاقاتیوں اور سائلین کا دن بھرتانتا لگا رہتا۔ ابّا اور امّی کے چہرے شگفتہ گلاب سا کھلے نظر آتے۔

ایک یُگ اور خوشگوار گزرا تھا کہ بھائیوں کے بچے کمسن تھے اور بیبیاں اپنے اپنے شوہر کو جانچ پرکھ رہی تھیں۔ لہٰذا بھائیوں کے دِلوں میں باہمی بدگمانی جڑ نہیں جما پائی تھی۔ پھر وقت، سانپ کی طرح کینچلی تبدیل کرکے سُرعت سے منحنی چال چلنے لگا۔ اولاد پڑھ لکھ کر خود کو اپنے والدین سے زیادہ عقلمند اور بیبیاں خود کو شوہر سے زیادہ جہاندیدہ اور سمجھدار سمجھنے لگیں۔ لہٰذا گھریلو معاملات میں دونوں دخیل اور اثر انداز ہونے لگیں۔

اچھے دن ہارسنگار کے پھول جیسے قلیل مدّتی ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے 'شیش محل' نظر بد کا شکار ہوگیا۔ اچانک ایک رات بڑے بہنوئی ظفر کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔ دو ماہ بعد ہی ابّا کو سرکاری اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ اُن کے پھیپھڑوں میں انفکشن ہو گیا تھا۔ دہلی کے ایک مہنگے اسپتال لے جانے کی صلاح دے کر ڈاکٹر نے ابّا کو ڈسچارج کر دیا تھا۔ بیٹے باہمی چندہ کرتے رہے اور بیٹوں کا منہ تکتے تکتے ایک صبح باپ نے آنکھیں موند لی تھیں۔ عبید اللہ، ابّا کی جدائی کا غم برداشت نہیں کرسکا تھا۔ وہ بیمار پڑ گیا۔ معاملہ پھر باہمی چندہ کا نکل آیا تھا کہ عَبید اللہ کی کماؤ بیوی اور سسرالی رشتے داروں نے ہاتھ کھڑے کردیئے تھے۔ بھائی کو سحر زدہ سمجھ کر جھاڑ پھونک کا عمل بھی شروع ہوا تھا۔ لیکن سب بے سود۔ آئی سی یو میں مردہ پڑے عَبید اللہ کی پلکوں کو کُھلے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اُس کی اَدھ کھلی سوالیہ آنکھوں کا جواب دینا کسی کے لئے آسان نہیں تھا۔ چھ ماہ میں تین اموات ہوئیں۔ دو کا جنازہ 'شیش محل' سے نکلا تھا۔

امّی کو فیملی پنشن جاری ہوچکی تھی۔ اُن کی پنش پر کئی بیٹوں کی احتسابی نظریں رہتیں جب کہ وہ پانچ ہزار روپے میں زیادہ تر رقم غریب رشتے داروں، ضرورت مندوں اور سائلین پر خرچ کرتی تھیں۔

ایک دن جگر فِگار امّی نے اُس سے کہا تھا: ''بیٹا! جب شوہر، بیوی بچوں کی آنکھوں سے دیکھنے اور اُن کی مخبری پر یقین کرنے لگتا ہے تب آپسی رشتے کچّے دھاگے کی طرح ٹوٹنے اور برسوں کا بسا بسایا گھر اُجڑنے لگتا ہے۔'' اُنھیں اِس بات کا سخت ملال تھا کہ اُن کی پرورش اور تربیت میں ہی کمی رہ گئی ہے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد جب وہ امّی سے ملنے گیا تھا تب وہ بولی تھیں: ''سب بھائی بہنوں نے اپنا اپنا گھر بنالیا ہے۔ تمھاری بیوی بچے گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔ تم بھی ایک فلیٹ خرید لو کہ میں چاہتی ہوں کہ تمھارا بھی اپنا گھر ہو۔'' اُس نے فلیٹ کے ساتھ ایک کار بھی خرید لی تھی۔ اُس نے ایک تیر سے دو شکار کیا تھا۔ امّی سے کیا وعدہ پورا ہوا اور بیوی بچے بھی خوش ہو گئے تھے کہ اچانک اُن کا دیرینہ مطالبہ پورا ہو گیا۔

امّی کے حج اخراجات کے لئے باہمی چندہ مُہم جاری تھا۔ وہ امّی سے ملنے گاؤں گیا تھا۔ دورانِ گفتگو امّی انتہائی دردناک لہجے میں بولی تھیں: ''بیٹا! میں چندے کی رقم سے حج کرنا نہیں چاہتی......'' اُس نے

اُنھیں بھروسا دِلایا تھا کہ اللہ نے آپ کی ہر تمنّا پوری کی ہے، اِسے بھی پوری کرے گا۔گھر لوٹ کر اُس نے اختر اللہ سے بات کی تھی۔اُس نے بتایا تھا کہ شہزادہ سعودی عرب کی ملازمت کے دوران حج کر چکا ہے۔وہ امّی کو حج کرانے اور ابّا کا حجِ بدل کرنے کے لئے تیار ہے۔اُس نے پیسٹھ ہزار روپئے بھی دے دیئے۔لیکن مسئلہ درپیش یہ ہے کہ بقیہ لوگ دس بیس ہزار روپئے سے زیادہ نہیں دے رہے ہیں۔مجھے نہیں لگتا ہے کہ امّی حج کر پائیں گی۔سرکار نے بھی اِسی سال سے حج سبسیڈی ختم کر دی اور سعودی حکومت بھی اضافی رقم وصول کرے گی۔اِس سال حج اخراجات زیادہ بڑھا دیئے گئے۔اُس نے اختر اللہ سے کہا تھا کہ امّی کے تمام اخراجات کو وہ تنہا برداشت کرے گا۔بس تم لوگ ابّا کا حج بدل کرادو......

حج کے بعد امّی کی طرزِ زندگی یکسر بدل گئی تھی۔وہ گاؤں میں تنہا رہتیں اور اُن کا زیادہ تر وقت عبادات میں گزارتا۔کئی بیٹوں کے گھر چند دنوں کے قیام کے تلخ تجربوں اور بیٹوں کے باہمی نِفاق اور غیر اخلاقی رویّوں کو امّی غربت کے بُرے دِنوں کی طرح جھیل نہیں پا رہی تھیں۔ہر روز سب بیٹوں سے باری باری خیریت پوچھنے والی امّی اب اُسی بیٹے سے گفتگو کرتیں، جو اُن سے موبائل فون پر باتیں کرتا۔موسمِ سرما کی ایک رات وہ بیٹوں کی غیر موجودگی میں اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔اُنھوں نے اولاد کو نہ باہمی چندے کی زحمت دی اور نہ مذہبی رسومات ادائی کی اجازت۔اُسے لگا تھا، یہ امّی کی ممتا نہیں، سزا ہے۔وصیّت کے مطابق تدفین پنشن کی رقم سے ہوئی اور اُنھیں ابّا کی قبر کے بائیں پہلو میں دفنایا گیا تھا۔

تدفین کے بعد گھر لوٹا تو اُسے لگا کہ ابّا کی موت نے 'شیش محل' سے چہل پہل اور رونق چھین لی تھی لیکن ملک الموت نے تو امّی کی روح کے ساتھ اُن کے خوابوں کے گھر کی روح بھی قبض کر لی ہے۔تدفین کے دوسرے دن ایک بیٹا اپنے کمرے کو تالا جڑ کر چلا گیا تو سبھی کو تالا جڑنے کا از خود جواز مل گیا تھا۔وہ تنہا ایک ہفتے تک گاؤں میں ٹھہرا تھا۔پھر اُس نے اپنے کمرے کو مہمان خانہ بنا کر گھر کی رکھوالی کے لئے نندو حجام کو ایک ہزار روپئے ماہوار کے ساتھ رہنے کے لئے گیراج دے دیا تھا۔وہ یہ جانتا ہے کہ اِس مکان کی بنیاد میں امّی کی کیل دبی ہے اور ابّا کا جذبۂ افتخار بھی نیز اِس کی ابتدائی تعمیر پیسے سے نہیں جذبے سے ہوئی تھی......

کوثر نے کھانے کی ٹرے کو کچھ اِس انداز سے رکھا کہ برتنوں کی کھنک سے رحمت اللہ صاحب ماضی سے حال میں لوٹ آئے۔

کھانا کِھلاتے ہوئے کوثر نے جانکاری دی: ''کل صبح ہم لوگ گاؤں جا رہے ہیں۔''

دوسرے دن رحمت اللہ صاحب بذریعہ کار گاؤں پہنچ گئے۔

'شیش محل' کے اِحاطے میں عیادت کرنے والوں کی بھیڑ دیکھ کر وہ بولے: ''دیکھئے! گاؤں میں ا

بھی اخلاق ومرّوت باقی ہے۔''

پھر وہ کار سے اُترنے سے قبل بیٹے سے بولے:''میں باہر ہی بیٹھوں گا کہ......'' اُنھوں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ اُنھیں معلوم تھا کہ ڈرائنگ روم میں تالا جڑا ہوا ہے۔

محسن اور نندو نے باہر بیٹھنے کا عمدہ انتظام کر رکھا تھا۔ ملاقاتیوں کی بھیر چھٹنے کے بعد بھی اکّا دکّا لوگ آتے جاتے رہے تب شہباز اللہ والد کے پاس جا کر بولا:''پاپا! آپ چالیس کیلومیٹر کا سفر کر کے آئے ہیں اور مسلسل بول رہے ہیں۔اب آپ کھا پی کر تھوڑی دیر آرام کر لیجئے......''

جب سب لوگ جا چکے تب وہ بیٹے سے بولے:''میں یہیں بیٹھوں گا اور یہیں ایک ساتھ ہنس بول کر کھانا کھائیں گے۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' شہباز اللہ گھر لوٹ گیا۔

رحمت اللہ صاحب کھانا کھا کر چہل قدمی کرنے لگے۔ مکان اور پیڑ پودوں کی اَبتر حالت دیکھ کر اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اُنھیں لگا کہ نندو برآمدے کا بھی استعمال کرتا اور الاؤ لگاتا ہوگا تب ہی چھت اور دیواریں بدرنگ ہو گئیں۔ کئی جگہوں کی دیواروں پر بچوں نے جگہ جگہ طرح طرح کے نقش و نگار بنا دیئے تھے۔ صحن میں کرکٹ پچ دیکھ کر کھڑکیوں کے شکستہ شیشوں کو دیکھا۔ باہری دیواروں پر کہیں کہیں کائی کی دبیز تہیں جمی ہوئی تھیں اور جہاں جہاں موقع ملا، وہاں وہاں پیپل، برگد اور گولر کے پودے اُگ آئے تھے۔ پیڑ پودے اپنی اپنی جہد للبقا میں لگے تھے۔ پورا اِحاطہ چارہ گاہ بنا ہوا تھا۔ بکرے بکریاں اور مرغے مرغیاں بے دھڑک چڑ چُگ رہی تھیں۔ نندو نے بغیر اجازت دیوار میں کیلیں ٹھونک کر اپنی گائیوں کے لئے ایک جھونپڑی بنا لی تھی۔ بے برگ و بار کٹھل کا پیڑ سہما ہوا تھا۔ مالدہ کا ایک چھتنار درخت سوکھ گیا تھا، جس کی شاخیں کاٹ کاٹ کر لے جانے کے سبب وہ شکستہ بُت جیسا نیم دفن تھا۔ امّی کا بنوایا بڑا سا المونیم شیٹ لگا مرغی کا دربہ غائب تھا۔ اسکولی بچوں کے لئے ابّا کے لگوائے چاپا کل کے اُوپری حصّے کو کھول کر کوئی لے گیا تھا۔ صحن کی مٹّی کھود کھود کر لے جانے سے کئی جگہ گڑھے تھے، جن میں کتّے سوتے اور کتّیا بچے جنتی ہوں گی۔ اینٹیں نکال نکال کر لے جانے کے سبب چہار دیواری غیر مسلح سپاہی کی طرح دراندازوں کو روکنے میں ناکام تھی۔ وہ آہ بھر کے رہ گئے۔ اُنھوں نے سوچا کہ جب مکان کے وارثین شہر میں جا بستے ہیں تو پشتینی مکان کا یہی حشر ہوتا ہے۔ اپنا اپنا گھر بنا لینے کے بعد فریقین پشتینی مکان میں ایک کیل بھی مفادِ عامّہ میں نہیں ٹھوکتے۔ اگر ’شیش محل‘ راجدھانی میں ہوتا تب سب فریقین اپنے اپنے گھر میں رہتے اور اس کے کرایہ کی رقم سے اپنا اپنا حصّہ وصول کرتے۔ وہ مضمحل قدموں سے گھر کے اندر گئے اور بھائیوں کے مُقفّل کمروں کے در کو چھو چھو کر دیکھنے لگے۔ پھر وہ فسادزدہ شخص کی طرح الوداعی نظروں سے در و دیوار کو دیکھتے ہوئے صحن میں لوٹ آئے۔ بستر پر لیٹے لیٹے اُنھوں

نے سوچا کہ اگر وہ نندو کو حویلی کی رکھوالی کے لئے نہیں رکھتے تب اِس گھر کا حال اور بُرا ہوتا۔اُنھوں نے سانس کھینچ کر سوچا، اچھا ہوا امّی مر گئیں۔اُن سے اپنے خوابوں کے گھر کا یہ حشر دیکھا نہیں جاتا۔

جائداد کی تقسیم کی خبر ملتے ہی بیٹے بیٹیوں کو اب فرصت مل گئی تھی۔بیٹے بیوی بچوں کو چھوڑ کر آئے تھے۔ اکلوتی بیٹی شوہر اور بچوں کے ساتھ آئی تھی۔دوسرے ہی دن اُس کا شوہر بچوں کو لے کر لوٹ گیا تھا۔رحمت اللہ صاحب نے سوچا، اگر شہبا اللہ کی شادی ہوگئی ہوتی اور وہ نوکری کر رہا ہوتا تب وہ بھی بھائیوں کے ساتھ ہی آتا۔امّی کا حشر دیکھ کر اُنھیں بچوں کے رویّے سے دکھ نہیں پہنچا۔مدّتوں بعد صحن میں چہل پہل رہنے لگی تھی اور انواع واقسام کے کھانے بنتے۔لوک لاج نے بھائیوں کو بھی عیادت کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ایک دِن سبھی بھائی ایک ساتھ آئے اور اُسی شام واپس چلے گئے تھے۔اُنھوں نے کسی کو روکا نہیں تھا۔وہ اپنی حکمت عملی پر مسرور تھے کہ اُنھوں نے اپنے بچوں کو یکجا کر لیا۔

صاف ستھری آب وہوا، گاؤں والوں سے جی کھول کر گفتگو، صبح وشام کی چہل قدمی، من پسند کھانا، بیوی بچوں سے یادِ ماضی کا ساجھا کرنا اور اعزّہ واقارب کے ساتھ نشست وبرخاست نے رحمت اللہ صاحب کی صحت پر مثبت اثر ڈالا۔وہ ہر روز چھت پر ٹہلتے ہوئے طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کا منظر دیکھتے۔اُنھیں لگتا کہ آفتابِ تازہ اُنھیں صبح بخیر کہتا ہوا طلوع ہو رہا ہے اور تھکا ماندہ آفتاب بھی شب بخیر کی نیک خواہش پیش کرتا ہوا غروب ہو رہا ہے۔کلینڈر سے نکال کر لائے ٹکڑے سے وہ ہر شام ایک ایک تاریخ کو ضائع کر کے تہی دست ہو چکے تھے۔

کوثر خوش تھیں کہ دعاؤں کا اثر دِکھائی دینے لگا ہے۔بیس دن کیسے بیت گئے اُنھیں پتا نہیں چلا۔لیکن بچے کبیدہ خاطر تھے۔اُنھوں نے ایک دِن ماں سے شکایت بھی کی تھی کہ پاپا جائداد کی تقسیم میں دانستہ تاخیر کر رہے ہیں۔گھر واپسی کے لئے اُن پر بیوی بچوں کا سخت دَباؤ ہے۔پاپا کو ہماری فکر نہیں۔وہ تو اب اپنے آپ میں مگن رہنے لگے ہیں۔

منتظر آنکھیں رحمت اللہ صاحب کے لئے سوہانِ روح بن گئی تھیں۔ایک شام ٹہلتے ہوئے اُنھوں نے سوچا تھا کہ سبھی منتظر ہیں لیکن سب کے انتظار کی نوعیت مختلف ہے۔کوثر کو گھر واپسی کا، اولاد کو جائداد کی تقسیم کا، اُنھیں اپنی موت کا اور 'شیش محل' کو زمین بوس ہونے کا انتظار ہے......

Rahman House, Ground Floor
House No: 278 , Road No:11/D
Patliputra Colony Patna-800013
Mob:9430559161

● پروفیسر اسلم جمشیدپوری

ایک تھا بادشاہ

داستان جاری ہے۔ایک تھا بادشاہ...... ہمارا تمہارا خدا بادشاہ......

بہت زمانہ پہلے کی بات ہے۔ملک ایران میں ایک بادشاہ تھا۔اسے سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔وہ عدل پسند اور بڑا ایماندار تھا۔اس کی حکومت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔اس کے دورِ حکومت میں ہر طرف امن وامان تھا۔اس کی رعایا امن اور چین کی سانس لے رہی تھی۔بادشاہ خود بہت سے معاملات کا انصاف کیا کرتا تھا۔اس کے وزیر اور اعلیٰ عہدیدار بھی انصاف پسند تھے۔

بادشاہ کا نام ذوالقرنین تھا۔بادشاہ اپنی ریاست کا دور دورہ کیا کرتا تھا۔غریبوں اور مفلسوں کے معاملات جاننے کی کوشش کرتا اور حتی المقدور انہیں حل بھی کرتا۔باشاہ کا نام اور کام کا بڑا شہرہ تھا۔دور دور تک اس کے عدل وانصاف اور ایمانداری کے چرچے تھے۔باشاہ کو دنیا کھوجنے اور نئی نئی جگھوں کی دریافت کرنے کا بے حد شوق تھا۔اس کے لئے اس نے ایک ٹیم بنا رکھی تھی،جس میں سفر اور سمت کے ماہرین،وزراء،اعلیٰ عہدے دار،کے علاوہ خشکی اور تری کے ماہر فوجی شامل تھے جو بادشاہ کی ہر طرح سے حفاظت کرتے تھے اور بادشاہ کے سیاحت کے شوق کو پورا کرتے۔بادشاہ نے اپنی بھروسہ مند ٹیم کے ساتھ دنیا کے بہت سے مما لک کی سیر کی تھی۔

ایک بار بادشاہ ذوالقرنین نے مغرب کی جانب جانے کا ارادہ کیا۔اپنے سفر کے مشیروں اور منصوبہ کاروں کو بلایا۔اور ان سے اپنے دل کی بات کہی۔

''دیکھو مجھے مغرب کی دنیا دیکھنی ہے۔میں انتہائے مشرق کی طرف جانا چاہتا ہوں۔''

''بادشاہ سلامت! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں......''ایک مشیر نے التجا کی۔

''اجازت ہے......بولو......کیا کہنا چاہتے ہو......''بادشاہ نے اپنے انداز میں جواب دیا۔

''آپ وہاں نہ جائیں۔وہاں عجیب وغریب زبان والے لوگ رہتے ہیں۔''

''نہیں......ہم وہاں ضرور جائیں گے۔''

مشیروں اور منصوبہ کاروں نے آخر کار بادشاہ کی مرضی کے مطابق سفر کے انتظامات کئے اور ایک

قافلے کی شکل میں چل پڑے۔سب سے آگے بادشاہ کا حفاظتی دستہ ،اس کے پیچھے بادشاہ کی سواری، پھر وزراء اعلیٰ عہدے دار، حکماء اور اطباء اورسب سے پیچھے ساز وسامان ،ہتھیار، زاد راہ وغیرہ سے لدی گاڑیاں۔ یہ قافلہ جب شاہی محل سے وداع ہورہا تھا،توبادشاہ نے اپنے معتمد خاص کوحکم دیا۔

''جب تک ہم واپس آتے ہیں۔سلطنت کی باگ ڈور تمھارے سپرد۔ویسے ہمارا اور تمھارا نگہبان وہ خدا جس نے مجھے بادشاہ بنایا۔''

''جوحکم آپ کا۔میں آپ کے واپس آنے تک ملک کی باگ ڈور سنبھالوں گا۔آپ ادھر سے بے فکر ہوکر جایئے۔''

مہینوں لمبا سفر شروع ہوگیا تھا۔قافلے میں اچھے قسم کے گھوڑے تھے،جو چلنے میں برق رفتار تھے جن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔بادشاہ کا گھوڑا تو لاجواب تھا۔میدانی علاقوں کو روندتا کھوندتا قافلہ آگے بڑھ رہا تھا۔قافلے کے پیچھے دھول اور گرد کا ایک طوفان بھی چل رہا تھا۔چھوٹے دریا، جنگل، پہاڑ سب راستہ دے رہے تھے۔راستے کے جانکار آگے آگے تھے۔شام ہوتے ہی قافلے نے آرام کے لئے خیمے نصب کردیے۔سب آرام کرنے کی تیاری میں تھے۔ خانساماں طرح طرح کے کھانے بنانے میں لگ گئے۔رات کو آرام کرکے قافلہ تازہ دم ہوکے پھر روانہ ہوگیا۔

بارش ،دھوپ ،سردی کی مار جھیلتا ہوا قافلہ آگے بڑھتا رہا۔مہینوں سفر کے دوران بیماری، تھکن اور پریشانیوں کو لانگھتا قافلہ زمین کے مغربی کنارے پہنچا تو بادشاہ کے ساتھ اس کے اس کے درباری بھی خوشی سے جھوم گئے۔قافلے والوں نے خیمے لگائے اور آس پاس کی بستیوں میں گھومنے نکل پڑے۔وہاں ان کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جو عجیب زبان بولتے تھے اور بڑے غیر متمدن تھے۔وہ مہمان نواز بھی نہیں تھے۔بلکہ انہوں نے ان کو کافی پریشان کیا۔ذوالقرنین اور اس کے ساتھی وہاں کچھ روز گذار کے واپس ہولئے۔ذولقرنین اور ان کے ساتھیوں نے مقامی باشندوں کو ایک خدا کے بارے میں بتایا۔واپسی کا سفر بھی مشکلوں بھرا تھا۔رکتے رکاتے وہ لوگ مہینوں بعد اپنے ملک آئے۔اور چین کی سانس لی۔ذوالقرنین کے کئی ساتھی سفر کے دوران اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔

کچھ دن آرام کے بعد ذوالقرنین نے دوسرے سفر کا ارادہ کیا۔اپنے مشیروں اور منصوبہ کاروں کو بتایا کہ اب کی وہ دنیا کے مشرقی کنارے جانا چاہتا ہے۔سفر کا منصوبہ بنانے والوں نے راستوں وغیرہ کی جانکاری حاصل کرنے کے بعد بادشاہ کو خبر کی کہ اب وہ کسی وقت بھی اپنے لاؤلشکر کے ساتھ سفر پر نکل سکتے ہیں۔

اس بار بادشاہ کی ٹیم میں کچھ نئے لوگ بھی شامل تھے۔جن کے اندر جوش کے ساتھ طاقت بھی بہت تھی۔بادشاہ کی ٹیم میں تجربہ کار اور سفر کے ماہرین کی کمی نہیں تھی۔بادشاہ جب بھی سفر پہ نکلتا اندازے سے زائد زادِ سفر ساتھ لے جاتا۔اس بار بھی سفر کئی ماہ کی مسافت پر مبنی تھا۔سفر کا انجام انجانی منزل پر ہونا

تھا۔دراصل یہ مہماتی اورچیلینجنگ سفرتھا۔قدم قدم پےخطرات منتظر تھے۔دھوپ،بارش،سردی،ہوا کے علاوہ جنگلی جانوروں اور رینگنے والے حشرات الارض کا ڈراور خوف بھی کبھی کبھی سفر میں وقتی طور پر مانع ہوتی۔لیکن پھر نئے عزم کے ساتھ قافلہ پھرعازمِ سفر ہو جاتا۔

اس بار بادشاہ ایک ایسے علاقے میں پہنچا کہ وہ دنیا کی مشرقی حدتھی۔سامنے ایک وسیع وعمیق سمندر تھا۔مگر یہ کیا؟ سارا سمندر داصل ایک دلدل تھا اورسورج اسی دلدل والے سمندر میں ڈوب رہا تھا۔سورج کے ڈوبنے کا منظرایسا لگ رہا تھا گویاایک ساتھ ہزاروں لوگوں کوقتل کر دیا گیا ہو۔بادشاہ اپنے لوگوں کے ساتھ کچھ دن وہاں قیام پذیر رہا۔پھر واپسی کے سفرپےچل پڑا۔کئی ماہ کی طویل تھکا دینے والی مسافت کے بعدوہ اپنے ملک لوٹ آیا۔

کئی ماہ بعد بادشاہ ذوالقرنین کا پھرسفر کاارادہ ہوا۔اس باراس نے شمال کی دنیا دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔وہ دنیا شمالی کنارے پرجانا چاہتا تھا۔اس کی فوج کے،مشیراورسفر کے منصوبہ کاراس کے ساتھ ایک ان دیکھے طویل سفر پہ نکل پڑے۔کئی ماہ کے طویل سفراورقیام کے بعد بادشاہ اوراس کے ساتھی دنیا کے انتہائی شمالی حصے میں پہنچے۔وہاں کی قوم،بادشاہ ذوالقرنین کی افواج اورسازوسامان کودیکھ کرحیرت میں تھے۔

’’ارے دیکھو کتنے سارے گھوڑے......‘‘ایک مقامی باشندہ بولا۔

’’’فوج بھی بڑی تعداد میں ساتھ ہے۔‘‘

’’چلوبادشاہ کواپنی پریشانی بتاتے ہیں۔ہوسکتا ہے وہ ہماری مدد کر دیں۔‘‘

مقامی باشندے ایک گروہ کی شکل میں بادشاہ کے خیمے کے پاس پہنچے۔خیمے کے باہر سخت پہرہ دیکھ کرٹھٹھک گئے۔دربان سے ڈرتے ہوئے بادشاہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔دربان نے باہر رکنے کی بات کی اورخود بادشاہ کے حضور میں پہنچا۔بادشاہ کی تعظیم میں جھک کرکورنش بجاتے ہوئے عرض کیا۔

’’بادشاہ حضور! آپ سے ملنے مقامی باشندوں کا ایک گروہ آیا ہے۔آپ اجازت دیں تو انہیں اندر لے آؤں۔‘‘

’’ہاں ہاں......انہیں اندر لے آؤ۔‘‘

بادشاہ کی اجازت کے بعددربان نے ان سب کواپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔کئی خیموں سے گذر کراور تلاشی کے بعدوہ لوگ بادشاہ کے حضور پہنچے۔بادشاہ کی شان بان دیکھ کروہ سب حیران تھے۔ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔زبانیں گنگ ہوگئیں۔بڑی مشکل سےان میں سب سے بڑااورعقلمند ڈرتے ڈرتے گویا ہوا۔

’’ب......با......دش......شاہ......سلامت!‘‘

''ہاں ہاں بولو......ڈرو نہیں۔'' بادشاہ نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

''بادشاہ سلامت......بات یہ ہے کہ ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔''

''کیا بات ہے؟ کھل کر بتاؤ......ڈرو نہیں......''

''یہ جو پہاڑیاں ہیں ان کے پیچھے یاجوج ،ماجوج اور ان کی قوم رہتی ہے۔وہ زمین میں فساد پھیلاتے رہتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں آجاتے ہیں۔قتل وغارت گری مچاتے ہیں۔زبردستی ہمارا ساز و سامان اٹھالے جاتے ہیں۔ چوریاں،ڈکیتیاں اور قتل کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں۔ہم نے کئی بار پہاڑیوں کے شگاف کو بند کرنے کے لئے لکڑی اور پتھر بھی لگائے۔دیوار بھی چنی مگر وہ ہر دیوار کو توڑ ڈالتے ہیں۔اور پھر ہمارے گھروں میں زیادہ توڑ پھوڑ مچاتے ہیں۔ہم بہت دکھی ہیں۔''

''ہونہہ...... یہ بات ہے۔پھر تو تمہاری مدد کرنی ہی پڑے گی۔''

''ہم آپ کو اس کام کے لئے جو آپ کہیں گے کرنے کو بھی تیار ہیں۔''

'' مجھے بس آپ کے لوگ چاہیئں ،جو ہمارا ساتھ دیں۔''

''ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔''

وہ سب خوشی خوشی اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

ذوالقرنین کے حکم کے مطابق درّوں اور شگاف میں لوہے کی چادریں اور ٹکڑے ڈالے گئے۔اور آگ سلگائی گئی۔پھر تانبے کو بالکل رقیق بنا کر اس کے اوپر ڈالا گیا۔اور اسے ٹھنڈا کر کے چھوڑ دیا گیا۔کچھ دنوں بعد لوگوں نے دیکھا۔درّے اور شگاف کے درمیان اتنی پختہ دیوار بن گئی تھی کہ مضبوط ہتھیاروں سے بھی نہیں ٹوٹتی تھی۔یاجوج ماجوج کا ہمیشہ کے لئے علاج ہو گیا تھا۔مقامی باشندے خوشی سے جھومے جا رہے تھے۔

''ہرّا......اب خوب ناچو گاؤ۔'' ایک بزرگ نے نوجوانوں سے کہا۔

''اب ہمیں کسی کا ڈر نہیں۔''

''یاجوج ماجوج کے فتنے سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل گیا۔''

پوری قوم ناچنے گانے اور خوشیاں منانے میں مصروف تھی۔سب بادشاہ ذوالقرنین کے احسان مند تھے کہ ان کے دماغ اور عمل سے قوم کو ہمیشہ کے فتنے اور فساد سے خلاصی نصیب ہوئی۔سب کے سب ان کے احسان مند تھے۔

''ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔''

''میرا نہیں......اس خدا کا احسان مانو جس نے پوری دنیا کو بنایا۔جو پوری دنیا کا نظام چلاتا

ہے۔ وہ ایک ہے۔ اسی نے مجھے تمہارے پاس بھیجا۔ اور مجھے پختہ دیوار کے قایم کرنے کا ذریعہ بنایا۔‘‘

’’اے بادشاہ! تمہارے خدا کا شکریہ جس نے ہمیں اس فتنے سے نجات دی۔‘‘ کئی بزرگوں نے یہ کہتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔

بادشاہ ذوالقرنین کچھ دن کے قیام کے بعد اپنی فوج اور ساتھیوں کے ہمراہ اپنے ملک لوٹ آیا۔

یاجوج اور ماجوج نے درّوں اور شگاف کی دیوار کو توڑنے کی حتی الامکان اپنی کوششیں کیں۔ پتھر توڑنے والے ہتھیاروں کا استعمال کیا۔ ہر حربہ اپنایا۔ مگر ناکام رہے۔ جھنجلا کر اپنے اوپر ہی غصّہ نکالتے رہے۔

بزرگوں اور بڑوں سے سنا ہے، یاجوج ماجوج قیامت تک کے لئے پہاڑ کی دوسری طرف قید کر دیے گئے ہیں۔ قیامت کے قریب یاجوج ماجوج اور ان کا قبیلہ اس دیوار کو توڑ ڈالے گا۔ اور وہ دندناتے ہوئے آبادی میں پھیل جائیں گے اور خوب قتل وغارت گری مچائیں گے۔

مگر یہ کیا؟ یہ جو ہر طرف فتنہ وفساد پھیلا ہوا ہے، یہ سب کیا ہے۔ یہ داڑھی اور بے داڑھی لوگ کون ہیں؟ کہیں یہ یاجوج اور ماجوج تو نہیں...... جن سے قیامت تک کا صبر نہ ہوا۔ جو مضبوط دیوار کو توڑ کے ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ جو مختلف روپ اور بھیس بدل کر ہمارے سامنے ہوں۔ کہیں یاجوج ماجوج ہمارے اندر حلول تو نہیں کر گئے؟

داستان اب بھی جاری تھی...... ایک تھا بادشاہ......!

◀◀ ● ▶▶

Head, Dept: of Urdu
Chaudhry Charan Singh University
Meerut(U.P)Mob:8279907070

ستمبر کا سمندر
منتخب افسانوں کا مجموعہ

مصنف :	شاکر انور	سن اشاعت :	۲۰۲۱ء
قیمت :	۴۰۰ روپے	صفحات :	۱۷۴

ملنے کا پتے

ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی   فرید پبلشرز، اردو بازار کراچی

● ڈاکٹر نکہت نسیم

بے چہرگی

''بھلا دستکوں کے بھی بھاؤ بھید ہوتے ہیں آپی جان؟''میں نے مسکراتے ہوئے نم آنکھوں سے چشم تصور میں انہیں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں''دروازہ آہستہ سے کھٹکٹایا کرو ایسے لگتا ہے جیسے کوئی بری خبر لے کر آئی ہو۔''اُف......!دروازے پر ہاتھ رکھے وہ مسکرا رہی تھیں۔ یہ نکلتا ہوا قد......لمبے چمکیلے کالے بال جب پتلی کمر پر لہرتے تو یوں لگتا جیسے سانپ کسی پتلی دیوار سے لپٹا بل کھا رہا ہو۔ان کی شہابی رنگت بالکل ایسی لگتی جیسے کسی نے برف میں گلابی گلاب کی پنکھڑیاں ڈال دی ہوں۔ان کی خوبصورت شفاف آنکھیں جھل مل کرتی رہتی تھی۔ ہونٹ ایسے تھے کہ چپ بھی ہوتے تو بولتے ہوئے لگتے تھے۔شیریں سخن آپی جان میں ہم سب کی جان بند تھی۔

ان کے یونیورسٹی سے آنے سے پہلے ہی امی جی کی یاد دہانیاں عروج پر پہنچ جاتیں۔کھانا ان کی پسند کا بنا کہ نہیں؟ کمرہ صاف ہوا کہ نہیں؟ پھر ان کے آنے سے پہلے موسم کے حساب سے گھر کو گرم اور سرد کرنے کا حکم ایسے ملتا جیسے روزمرہ کے کام ہوں۔گھر کے ملازم تو جیسے انہی کے لیے رکھے تھے۔بابا جان بھی ان پر جان دیتے تھے۔کتنی عجیب بات تھی کہ مجھے یہ سب کبھی برا نہیں لگتا تھا کہ امی جی اور بابا جان، آپی جان سے زیادہ دلار کرتے ہیں کیونکہ آپی جان کی جان تو میں تھی۔انہیں صرف میرا خیال رکھنا ہوتا تھا۔وہ مجھ سے سات برس بڑی تھیں۔انہیں مجھ سے ڈھیروں باتیں کرنی ہوتیں تھیں۔گھر سے یونیورسٹی تک کے تمام قصے ،ان کی پسند و ناپسند سب مجھے ازبر تھے۔وہ مجھے سہیلی کہہ کر پکارا کرتیں تھی۔

خوبصورت سجی ہوئی سی آپی جان بہت دھیمے مزاج کی تھیں۔ وہ مجھے بھی اکثر یہی کہا کرتیں کہ لڑکیاں بے لگام اونچا بولتی ہیں تو مجھے مستقبل سے خوف آنے لگتا ہے۔ وہ کیوں؟ میری بات سن کر ہنس پڑتیں۔ان کے چمکیلے دانت ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں جیسی جھلک دکھلا کر کلامی ہونٹوں کے پیچھے چھپ جاتے۔اور وہ سنجیدگی سے کہتیں۔

''سنو سہیلی ......!اگر ان ماؤں جیسے ان کے سارے بچے ہو گئے تو میں کہاں جاؤں گی؟''
انہوں نے کانوں پر یوں ہاتھ رکھ دیئے جیسے انہیں شور سنائی دے رہا ہو۔

''جناب......! آپ ہونگی اپنے چپ چپاتے دھیما دھیما بولنے والے بچوں کے ساتھ سو پروا ناٹ۔''میں نے آپی جان کے ہاتھ کانوں پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''اور جو ہوئے ہی نہ تو......''وہ کہتے ہوئے ہنس پڑیں۔

''اف......! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''میں نے شرارت سے آپی جان کو دیکھا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ اس دنیا کے شور کو بیلنس کرنے کے لیے اللہ میاں نے ایک ساتھ آپ کو دس بارہ بچے دے دینے ہیں۔''میں نے ان کے کمرے سے باہر جاتے جاتے یوں کہا جیسے ایسے ہی ہونا ہو۔

''ارے انسان بنو۔''آپی جان میرے پیچھے لپکیں اور میں دوڑ کر امی جی کے پیچھے چھپ گئی تھی۔امی جی نے جب مقدمہ سنا تو ہنس پڑیں۔

مجھے لگا اس دن کے بعد امی جی اور بابا جان کے درمیان کمرہ بند بات چیت ہونے لگی تھی جس میں کبھی کبھار تایا جی بھی شریک ہو جاتے۔آپی جان یونہی اپنے حسن اور گھر کی چہل پہل سے بے نیاز ہی رہیں۔پھر ایک دن امی جان نے اچانک ہی مجھ سے آپی جان کی پسند پوچھ لی کہ کہیں انہیں کوئی یونیورسٹی میں پسند تو نہیں۔مجھے جب پتہ چلا کہ گھر میں گہما گہمی اور میٹنگ آپی جان کی شادی کے سلسلے میں تھی۔بابا جان کے جگری دوست کے بیٹے شہود کا رشتہ آیا تھا جو ابھی ابھی فوج میں میجر پرموٹ ہوئے تھے۔آپی جان کو جب میں نے پوچھا تو وہ مسکرا دیں۔شہود ان لے لیے بھی نئے نہیں تھے۔ وجیہہ سے شہود بھائی اب سچ مچ میرے بھائی بننے جا رہے تھے۔آپی جان کے چہرے پر کھلنے والی حیا بتا رہی تھی کہ وہ کیا کیا سوچ رہی ہیں۔ دونوں گھروں میں خوشیاں ایسی اتری تھیں جیسے ستارے گھروں میں رہنے آ گئے ہوں۔

آپی جان کی نصیحتیں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔''امی جی کو چاول مت کھانے دینا۔ان کی شوگر کو سب سے زیادہ ڈسٹرب کرتے ہیں۔بابا جان کے ساتھ واک پر ضرور جانا۔کپڑے جیسے ہی رسی سے اتارنا تو فوراً تہہ کر دینا۔امی جی کو سب سے زیادہ الجھن بکھرے کپڑوں سے ہوتی ہے۔ملازموں کو نوکر کبھی مت سمجھنا۔وہ اللہ کی طرف سے ہمارے لیے خدمت گار آئے ہوتے ہیں۔انہیں اللہ کا مہمان سمجھ کر عزت اور پیار دینا۔مہمانوں کے لیے امی جی کو آواز نہ دینی پڑے کہ ان سے مل لو۔''مجھے یوں لگا جیسے پورا گھر آپی جان کے کندھوں پر تھا۔ہائے میں تو سمجھی تھی کہ آپی جان کے دم سے صرف زندگی میں رونق ہے پر گھر گرہستی کا نظام بھی انہی کے دم سے چل رہا تھا کبھی نہیں جان سکی تھی۔شاید اس لیے کہ انہیں کسی کام کے لیے ہمیں آواز نہیں دینی پڑتی تھی۔وہ آواز دینے سے پہلے پہنچنے کے فلسفے پر یقین رکھنے والی تھیں۔

''اور میں کیا کرونگی آپی جان؟''انہیں سرخ جوڑے میں رخصت کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز

میں پوچھ ہی بیٹھی۔

''تم صرف خدمت کو عبادت سمجھ کر کرنا......احسان سمجھ کر نہیں پگلی۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنا دایاں حنائی ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔ پھر دیر تک ہم بہنیں ایک دوسرے کے گلے لگ کر روتی رہیں۔

''اچھا سہیلی چلوں۔ جانے کا وقت ہو گیا ہے۔'' انہوں نے میرے آنسو پونچھ دیئے اور سہیلیوں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح کھڑی ہو گئیں۔ ان کی سہیلیاں انہیں چھیڑ رہی تھیں اور پوچھ رہیں تھی کہ میجر شہود کے فون تو روز آتے ہونگے۔ خط کارڈ تو پرانے ہو کر بھی اچھے لگتے ہیں۔ ویسے ایس ایم ایس اور نیٹ پر چیٹ تو ہوتی ہی ہوگی؟ آپی جان نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''ارے کسی اور کو بنانا'' سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں پر میں سوچ رہی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات اہم تھی۔ شہود بھائی کو ہم سب ہی جانتے ہیں۔ آپی جان ہی کی طرح باتوں سے زیادہ دھیمے دھیمے مسکرانے والے۔ سب کے دلوں پر راج کرنے والے۔۔ ہم سب کو بے حد عزیز تھے۔

آپی جان کیا رخصت ہو کر گئیں کہ مانو یوں لگتا جیسے کسی حکومت کا تختہ الٹ گیا ہو۔ کوئی چیز کوئی وقت سنبھلنے میں نہیں آ رہا تھا۔ آپی جان کا کمرہ ان کے جانے کے بعد سے بند پڑا تھا۔ وہ دو ہفتوں کے لیے ہنی مون پر دبئی گئی ہوئیں تھیں۔ واپسی پر وہ ائیر پورٹ سے ہی ہمارے ساتھ سیدھی گھر ہی آ گئیں۔ ہم سب تو جیسے جی ہی پڑے تھے۔ رات ہوئی تو آپی جان کے کمرے میں جانے کے لیے آہستہ سے دستک دی تو انہوں نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''سوری سہیلی......! میری آنکھ لگ گئی تھی۔'' ان کی آنکھیں سرخ ہو رہیں تھیں اور وہ اپنی آنکھیں بار بار ہتھیلی کی پشت سے مسل رہیں تھی۔

'' چلیئے آپی جان صبح آ جاونگی......آپ بھی یہیں اور ہم بھی یہیں۔ صبح خوب ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔'' میری تجویز پر وہ مسکرا دیں اور کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''اچھی بچی بن گئی ہو۔ دستک کے بھید بھاؤ جان گئی ہو۔'' انہوں نے میرا ماتھا چوم لیا۔'' خدا حافظ سہیلی......!'' میں واپس اپنے کمرے میں آ چکی تھی پر یوں لگ رہا تھا جیسے آپی جان خود کو وہیں بھول آئیں تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ وہ رات ہمارے گھر میں ٹھہری رہ گئیں۔ صرف اس ایک رات کے مقدر میں صبح نہیں تھی۔ آپی جان نے میرے جانے کے بعد کمرہ بند نہ کیا تھا بلکہ ساری رات جاگتی رہی تھیں۔ صبح ناشتہ کرتے ہوئے وہ بہت زردسی لگیں جس کو سب نے تھکن سے تعبیر کیا۔ وہ ناشتہ کیے بغیر آرام کے غرض سے جو ٹیبل پر سے اٹھیں تو وہیں گر گئیں۔ ان کے کلامی ہونٹ پہلے زرد ہوئے پھر سرد ہو گئے۔ ان کی جھلمل آنکھوں کی روشنی مدھم ہو

گئی جیسے رات پڑ گئی ہو۔ آئی سی یو کے بیڈ نمبر چار پر ان کے لیے زندگی اور موت کی کشمکش جاری تھی۔ کبھی سانس آتی تو کبھی جاتی۔ پر آپی جان نے اپنی آنکھیں نہ کھولیں۔ ہر شخص کہہ رہا تھا چاند سورج کی جوڑی کو نظر لگ گئی۔ دونوں جانب سے صدقہ خیرات کی بارشیں ہو رہی تھیں۔ شہود بھائی گم صم سے آپی جان کے بیڈ کے پاس صبح سے رات تک بیٹھے رہتے پر نہ ان سے کوئی بات کرتے اور نہ ہماری طرح ان کی نبضیں ڈھونڈتے۔

آپی جان کو ایڈمٹ ہوئے تیسرا دن تھا۔ ان کی طبعیت میں سدھار کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ ہر لمحہ دھڑکے کی طرح گزر رہا تھا۔ باہر بارش اور ہواؤں نے جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ اب کبھی نہ تھمیں گیں۔ امی جی نے تو آپی جان کے ساتھ ہی ہوسپٹل میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ بڑی منت سماجت سے بابا جان کو لے کر میں طوفانی بارش میں سے گزر کر گھر پہنچی تھی۔ بابا جان گھر پہنچتے ہی نماز اور دعاؤں کے لیے جائے نماز پر بیٹھ گئے اور میں آپی جان کے کمرے میں آ گئی کہ ان کے آفس کے کچھ کاغذات ان کے بیگ میں پڑے تھے جو صبح ان کے آفس پہنچانا بہت ضروری تھے۔ وہ لینے کے لیے ان کا بیگ اپنے کمرے میں ہی لے آئی۔ بیگ میں ان کی پسند کا شنیل فائیو پرفیوم، ہیر برش، میڈورا کی ہلکی پنک میٹ لپسٹک کے ساتھ ایک لفافہ تھا جس پر میرا نام اور گھر کا پتہ بھی درج تھا۔ تاریخ بتا رہی تھی کہ یہ خط انہوں نے مجھے دبئی سے لکھا تھا۔ پر انہوں نے پوسٹ کیوں نہیں کیا تھا؟ اُف آپی جان! آپ کے پاس ہنی مون پر بہن کے لیے وقت بھی نہیں نکلا۔ آپ بھی ناں...... میں نے مسکراتے ہوئے خط کھول لیا۔

انہوں نے لکھا تھا۔

''سہیلی، شہود میرے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہتے ہوئے بھی میرے ساتھ نہیں رہتے۔ شاید انہیں بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے شروع کریں۔ آج دس دنوں کے بعد آخر میں نے خود ہی ان کے در پر دستک دے دی اور ان سے پوچھ لیا کہ ان کی گھمبیر خاموشی کی وجہ کیا ہے تو انہوں نے میرے اصرار پر رکتے رکتے مجھے بتایا کہ ان کا پارٹنر ان کا بیچ میٹ میجر سہیل ہے اور یہ بھی کہ وہ ان کی تسکین کے لیے بہت سے زیادہ ہے۔ سہیلی دستک تو میں نے بڑی دھیمی دی تھی پر دروازہ کھلتے ہی ایک طوفان سے سامنا ہو گیا۔ یوں لگ رہا ہے جیسے تنکا تنکا ہو کر اجڑ رہی ہوں۔ مجھے شہود کی ایمانداری پر فخر ہوتا جو شادی سے پہلے بتا دیتے پر اب ان کی بزدلی پر رنج ہو رہا ہے اور خود پر افسوس کہ میں نے ایک ہم جنس پرست سے محبت کی۔ پر افسوس سے زیادہ حیرت کہ وہ بھی اتنی شدید کر لی کہ مجھ سے اب اپنی ہی محبت نہیں سنبھل رہی۔ ایسا دھکا لگا ہے دل کو سہیلی کہ......'' اس کے بعد شاید آپی جان دردِ ہجر سے کراہ رہی ہوں گی۔ شکست فاش پر اوندھے منہ گر کر زار و قطار روئی ہوں گی۔ تنہا فیصلے کی دو دھاری تلوار پر چلیں ہوں گی۔ پھر ان سے کچھ نہیں لکھا گیا ہو گا۔

جبھی تو باقی کا صفحہ سادہ تھا۔

ہائے میری آپی جان۔ میں آدھی رات کو شدید بارش میں بھی گاڑی سڑک پر دوڑاتی جا رہی تھی۔ مجھے اپنی آپی جان کو گلے لگانا تھا، ان کے اداس دل کو منانا تھا۔ انہیں بہت پیار کرنا تھا۔ ان کی خوابناک آنکھوں کو چومنا تھا۔ میں جب ہانپتی کانپتی ہوسپٹل پہنچی تو آپی جان کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ امی جی آیت الکرسی کا ورد کر رہیں تھیں۔ آئی سی یو کے ڈاکٹرز اور نرسیں اپنی کوششوں میں مصروف جان ہی نہ پائے کہ میں اپنی آپی جان کے سامنے کھڑی تھی۔ میری آنکھوں کی جھڑی انہیں بتا گئی ہوگی کہ میں سب کچھ جان چکی ہوں۔ ڈاکٹرز انہیں ڈی فبری لیٹر سے واپس لانے کی کوششوں میں نڈھال ہو رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر انہیں زور سے آواز دی۔ پر وہاں تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ امی جی کی بدحواس سی سرگوشی آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

”تم سب آہستہ بولو۔ میری بیٹی کو اونچی آوازیں پسند نہیں۔“

آپی جان کو خاک اوڑھے آج پورے پانچ برس گزر چکے ہیں۔ میں جب بھی ان سے ملنے جاتی ہوں تو ان سے بہت ساری نئی باتوں کے بعد ہر بار کہی ہوئی اپنی بات ضرور دہراتی ہوں کہ ان کا وہ ادھورا خط میں نے ان کے آخری آرامگاہ جانے سے پہلے ہی شہود بھائی کو دے دیا تھا۔

◄◄ ● ►►

21 Juction Road
Moorebank, NSW-2170 Australia
0425201035

شب ہجراں

(ناول)

مصنف	: سرور غزالی	سن اشاعت	: ۲۰۲۱ء
قیمت	: ۲۰۰ روپے	صفحات	: ۲۰۸

ہندوستان میں ملنے کا پتہ

ڈاکٹر شاہد اقبال، آستانۂ حق، روڈ نمبر ۱۰، ویسٹ بلاک

نیو کریم گنج، گیا (بہار) ۸۲۳۰۰۱

● امین صدر الدین بھایانی

ماموں میاں کا گھرانہ

''کچھ سُنا تم نے بیٹا......؟ ماموں میاں نے گھرانے کا سودا کر دیا......!''

امی کی بات سن کچھ دیر کے لیے تو میں انھیں ٹکر ٹکر دیکھتا رہا کہ جیسے کچھ سمجھ ہی نہ آیا ہو کہ کون جانے امی کیا کہہ رہی ہیں مگر اگلے ہی لمحے یک لخت ان کی بات سمجھ میں آ گئی۔

''ارے نہیں امی...........ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ ماموں میاں کی تو جان ہی گھرانے میں ہے۔ وہ بھلا اس کا سودا کیسے کر سکتے ہیں؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یہ بات اپنی طرف سے کہہ رہی ہوں۔ سارے محلے میں اس بات کا چرچا ہو رہا ہے۔''

میں ابھی کچھ دیر قبل ہی دفتر سے گھر پہنچا تھا۔ امی کو سلام کرنے کے ارادے سے باورچی کھانے میں داخل ہوا۔ امی حسب معمول میرے لیے کھانا گرم کرنے کے ساتھ میرے پسندیدہ لوازمات کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ میرے سلام کا جواب دینے کی بجائے ماموں میاں کی کہانی سنا کر مجھے حیران ہی کر دیا۔ میں الٹے قدموں گھر سے باہر نکل آیا اور تیز تیز چلتا ہوا محلے کے گول چوک جا پہنچا۔

گول چوک قدرے گولائی میں ہونے کے سبب اِسی نام سے مشہور تھا جو کہ وہاں موجود انواع و اقسام کی دکانوں کے سبب ہمیشہ رونق میں ہی رہتا۔ نیم کے ایک گھنے پیڑ کے ساتھ یکے بعد دیگرے دکانوں کا ایک سلسلہ قائم تھا۔ پہلی ہی دکان کی پیشانی پر جلتے بلب کی تیز روشنی میں جلی حروف میں لکھا نام بہت دور سے پڑھا جا سکتا تھا:

''گھرانہ جنرل و پرویژن اسٹور'' اندر داخل ہوتے ہی میری نگاہیں ماموں میاں کو تلاش کرنے لگیں۔ حسبِ معمول دکان کے ایک کونے میں چیزوں کو الٹتے پلٹتے نظر آ گئے۔

''السلام علیکم،...........ماموں میاں!'' میں نے انھیں اپنی جانب متوجہ کیا۔

''ارے بھئی وعلیکم السلام، منیب بیٹا، آج تو خدا سے کچھ اور بھی مانگتا تو وہ بھی مل جاتا۔ میں

تمھارے بارے ہی میں سوچ رہا تھا۔'' ماموں میاں ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولے مگر میں نے محسوس کیا کہ ماموں میاں کی مسکراہٹ پہلے جیسی ہرگز نہ تھی۔ کچھ بجھی بجھی اور اداس اداس سی تھی۔

''ارے ماموں میاں، کیسے ہیں آپ؟''

''چھوڑو بیٹا ان باتوں کو۔ چند بہت ضروری کام نبٹانے ہیں۔ یہ بتاؤ آج کل میں مجھے اپنے ساتھ لے جاسکو گے؟'' میں ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ آیا تھا امی کی کہی بات کی تصدیق کرنے اور اب ماموں میاں کے سامنے گم سم سا کھڑا تھا۔

''کیوں بھئی کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ماموں میاں۔ بس سوچ رہا تھا کہ کل تو نہیں البتہ پرسوں دفتر سے آدھی چُھٹی لے کر صبح ان شاء اللہ ضرور لے جاسکوں گا۔'' وہاں سے نکلا اور تھکے قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچ کر کھانے کی میز پر بھی میں سوچوں میں ہی ڈوبا رہا۔ جیسے تیسے، تھوڑا بہت کھا کر سونے کے لیے اپنے بستر پر جا لیٹا۔ مگر نیند انکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اندھیرے میں چھت پر لگے پنکھے کی گردش پر نظریں جمائے دھیرے دھیرے ماضی کے دھندلکوں میں کھو سا گیا۔

ہوش سنبھالتے ہی میں نے ماموں میاں کو ہمیشہ ''گھرانہ جنرل و پرویزن اسٹور'' پر ہی بیٹھے پایا۔ وہ ہمارے محلے کی سب سے مشہور اور مصروف کریانے کی دکان تھی۔ مجھے بہت اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب میں تھوڑا سا ہی بڑا ہوا تب سے امی مجھے وہاں کبھی آٹا، چاول تو کبھی گھی، شکر کے لیے بجھوایا کرتیں۔ ماموں میاں کا گھر ہمارے ہی محلے میں تھا۔ ان کا بیٹا ثاقب اور میں ہم عمر اور ہم جماعت تھے۔ نام تو ان کا عاقب حسین تھا مگر جیسا کہ عموماً ہوتا ہے محلے والوں نے انھیں ماموں میاں، ماموں میاں کہہ کر پکارنا شروع کر دیا اور سارے محلے میں اسی نام سے مشہور اور جانے پہچانے جاتے تھے۔

میں نے ابو مرحوم کے زبانی سنا تھا کہ وہ ثاقب کی پیدائش سے پہلے کسی سرکاری محکمے میں ملازمت کرتے جہاں بالائی آمدنی کا دورِ دورہ تھا۔ البتہ وہ خود ناجائز آمدنی کے سخت خلاف تھے۔ دفتر کے سارے لوگ محض اِس وجہ سے ان کے خلاف تھے کہ وہ اوپر کی کمائی میں حصہ دار بننے کو کسی طور تیار نہ ہوتے۔ ثاقب کی پیدائش کے بعد نہ جانے کیا ہوا، انھوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ جمع پونجی اور ملازمت سے فارغ خطی لکھنے کے بعد حاصل شدہ رقم سے محلے میں ''گھرانہ جنرل و پرویزن اسٹور'' کے نام سے کاروبار کا آغاز کیا۔

ابو بتاتے تھے کہ انھوں نے اپنے اس چھوٹے سے جنرل اسٹور کو اپنے خون پسینے سے سینچا اور اس قدر محنت کی کہ نہ دن کو دن سمجھا اور رات کو رات جانا۔ یہ تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کا اسٹور

صبح سورج نکلنے سے پہلے کُھل جاتا اور رات گہری ہونے تک کُھلا رہتا۔

آٹھ دس برس کے عرصے میں گھرانہ جنرل اسٹور ایک چھوٹی سی دکان سے آگے بڑھ کر ساتھ پیوستہ مزید دو اور دکانوں تک پھیل گیا جس میں ماموں میاں کی واحد ہستی کے ساتھ اب دو تین مددگاروں کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

مجھے ثاقب پر بڑا رشک آتا تھا......!!!

وہ محلے بھر کے لڑکوں میں سب سے زیادہ خوش لباس سمجھا جاتا۔ ماموں میاں ثاقب سے بہت زیادہ محبت کرتے، اس کی ہر بات اور ضرورت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ثاقب پورے محلے میں کا وہ پہلا لڑکا تھا جسے اس کے ابو نے بائی سائیکل خرید کر دی اور وہ بھی کوئی عام سی نہیں بلکہ کافی مہنگی اور خوب صورت غیر ملکی بائی سائیکل۔

اسکول سے واپسی کے بعد کھانا کھا اور ہوم ورک مکمل کرنے کے بعد جب محلے بھر کے سارے ہم عمر لڑکے کھیلنے کے لیے جمع ہوتے تو ثاقب سر پر شاندار سی پی کیپ لگائے اپنی بائی سائیکل پر شان سے سوار ہو کر آتا تو میں کیا سارے ہی لڑکے اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے۔

ثاقب میرے ہمراہ سرکاری اسکول میں پڑھا کرتا تھا مگر چھٹی جماعت سے اسے انگریزی میڈیم اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ ہم دونوں ہم جماعت تو نہ رہے لیکن ہماری دوستی روز اول ہی کی طرح قائم و دائم تھی۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب ہم دونوں جماعت نہم میں تھے تو ایک روز اس نے آ کر مجھے بہت خوشی اور فخر کے ساتھ بتایا کہ اس کے ابو نے اسے ''پاکستان امریکن کلچر سینٹر'' کے انگریزی گفتگو میں مہارت کے کورس میں داخلہ کروا دیا ہے اور کورس مکمل کر کے وہ امریکیوں کی طرح فر فر انگریزی بولا کرے گا۔

مجھے ثاقب پر بے انتہا رشک آیا اور ماموں میاں دنیا کے سب سے اچھے ابو محسوس ہوئے۔ اس روز مجھے خود اپنے ابو جو کہ ایک مقامی نجی فرم میں کلرک تھے اور میری شدید خواہش کے باوجود مجھے انگریزی زبان میں مہارت کا کورس کروانے کے لیے نہیں بھیج سکتے تھے، بہت چھوٹے، بہت ہی بے وقعت سے محسوس ہوئے۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے اس روز پہلی بار سوچا کہ کاش ماموں میاں میرے ابو ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں بھی ثاقب کی مانند اچھی پوشاک زیب تن کرتا، خوب صورت سی بائی سائیکل چلاتا، انگریزی میڈیم اسکول جاتا اور انگریزی زبان سیکھنے کا مہنگا سا کورس کرتا۔

میرا رشک ہر نئے آنے والے دن کے ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔

میٹرک کے بعد گھر کے روز افزوں بڑھتے اخراجات اور ابو کا ہاتھ بٹانے کی نیت سے ایک مقامی نجی ادارے میں ملازمت کے ساتھ شام کے کالج میں داخلا لے کر انٹر کے امتحان کی تیاریوں میں جٹ گیا۔

ثاقب کو ماموں میاں نے شہر کے سب سے اچھے کالج میں داخل کروا دیا۔ وہ بڑی آن بان کے ساتھ کالج جاتا۔ کچھ ہی دنوں میں ماموں میاں نے اسے نئی چمچماتی ڈبل سائیلنسر والی سرخ ہنڈا ون ٹوینٹی فائیو موٹر سائیکل بھی لے دی۔

میں جب اپنی ملازمت پر پہنچنے کے لیے دو بسیں بدل صبح سویرے سات بجے نکلتا تب کہیں جا کر نو بجے تک پہنچ پاتا۔ عین اسی وقت ثاقب بھی اپنی نئی موٹر سائیکل پر سوار کالج جانے کے لیے نکلتا۔ کبھی کبھار ہمارا آمنا سامنا ہوتا تو وہ مجھے اپنی نئی نویلی، سرخ چمچماتی شاندار موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھا کر بس اسٹاپ پر اتار دیتا۔ میں بس اسٹاپ پر کھڑا اس وقت تک اسے جاتے دیکھتا جب تک وہ اپنی موٹر سائیکل پر سوار سڑک پر رواں دواں ٹریفک میں گُم نہ ہو جاتا۔ پھر گہری اور ٹھنڈی سانس لے کر دور سے آنے والی بسوں میں اپنی مطلوبہ بس کو تلاشتا۔

ایک اتوار کی شام جب میں اور ثاقب ساتھ تھے اس نے بتایا کہ وہ بیرونِ ملک پڑھائی کے لیے جانے کا سوچ رہا ہے۔ جس کے لیے وہ مختلف غیر ملکی تعلیمی اداروں میں داخلے، ویزے کے حصول اور دیگر معاملات کی تکمیل کے سلسلے میں سرگرم ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ وہ اگلے چار چھے ماہ تک کسی نہ کسی غیر ملکی تعلیمی ادارے میں تحصیلِ علم کے لیے روانہ ہو جائے گا۔

مجھے ایک بار پھر اس پر بے حد رشک آیا۔ سوچنے لگا کہ ایک میں ہوں کہ کبھی اپنے شہر کراچی سے باہر نہیں نکلا اور ایک ثاقب ہے کہ اب وہ کسی دوسرے ملک میں جا کر تعلیم حاصل کر کے اپنی قسمت اور مستقبل چمکائے گا۔ گو کہ ابو مرحوم نے بھی حسب استطاعت میری پرورش بہت پیار سے کی تھی مگر نہ جانے کیوں اس روز میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی کہ اللہ ماموں میاں جیسا باپ ہر بیٹے کو دے۔

سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ دو روز بعد حسب وعدہ صبح دفتر جانے سے قبل آٹھ بجتے ہی ''گھرانہ جنرل اسٹور'' پہنچ گیا۔ ماموں میاں تو جیسے میرے ہی منتظر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ آج بھی ان کی مسکراہٹ میں ایک اداسی سی تھی۔ میں نے اسے اپنا واہمہ جانا۔ ماموں میاں میری موٹر سائیکل جو مجھے اپنے دفتر کی جانب سے آنے جانے کے لیے ملی تھی کے پیچھے سوار ہو گئے۔

''جی ماموں میاں، اب بتائیں کہاں جانا ہے؟''

''بیٹا پہلے بنک لے چلو''، میں پہلے بھی انھیں کئی بار بنک لے جا چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دونوں بنک میں تھے۔ مجھے یہ جان کر شدید حیرت ہوئی کہ انھوں نے اپنے کھاتے میں موجود کم و بیش تمام رقم کا پے آرڈر قومی بچت مرکز کے نام بنوایا۔ وہ ایک بہت بڑی رقم تھی............!!!

وہاں سے فارغ ہوئے تو انھوں نے مجھے قومی بچت مرکز کے قریبی دفتر چلنے کو کہا۔ وہاں پہنچ کر پے آرڈر کی تمام رقم ''ماہانہ آمدنی اسکیم'' میں ڈلوادی۔ ماموں میاں نے جس قدر رقم جمع کروائی اس سے ملنے والی آمدنی سے ایک نچلے متوسط طبقے کے عمومی خاندان کا گزر بسر بہت اچھی طرح سے ہوسکتا تھا۔ جب کہ ماموں میاں کے گھر میں لوگ تھے ہی کتنے؟ کل دو نفوس، ایک وہ خود اور ایک ان کی بیگم۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ان سے پوچھوں کہ یہ سب کیا ہے؟ آخر انھوں نے اِتنی بڑی رقم وہاں کیوں جمع کروائی؟ وہاں سے نکلے تو میں نے موٹر سائیکل کا رخ گھر کی طرف کر دیا تا کہ ماموں میاں کو چھوڑ کر خود دفتر روانہ ہو جاوں۔

''سنو بیٹا میں نے ناشتہ نہیں کیا اور شاید تم نے بھی نہ کیا ہو۔ ایسا کرو کہ راستے میں کسی اچھے ایرانی ریسٹورینٹ پر روک لینا۔ وہاں بیٹھ کر اچھی سی چائے کے ساتھ مسکہ بن کھائیں گے۔''

تھوڑی دیر بعد ہم ایک ایرانی ریسٹورینٹ کی مخصوص سیاہی مائل کتھئی چوبی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میز پر مکھن اور جیلی لگے فروٹ بن اور چائے کے علحیدہ علحیدہ لوازمات اپنے مخصوص برتنوں میں سجے ہوئے تھے۔ میں نے کیتلی سے گرما گرم چائے کپ میں انڈیلی، دودھ شامل کیا اور چینی ڈال چمچ سے ہلا کر کپ ماموں میاں کے سامنے رکھا جو کہیں دور خلا میں گھور رہے تھے۔

''لیجیے، گرما گرم چائے۔'' میری بات سن کر وہ ہڑبڑا کر کچھ یوں چونکے جیسے گہری نیند سے جاگے ہوں۔ گہری نظروں سے بھاپ اڑاتی چائے کی پالی اور ساتھ رکھے مسکہ بند جسے بڑی نفاست سے تیز چھری کے ساتھ دو حصوں میں منقسم کر کے پلیٹ میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا کو بہ غور دیکھتے رہے۔

''ثاقب کو بھی تو مسکہ بن بہت پسند تھا۔'' ماموں میاں کی آواز کسی اندھے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

''ارے ہاں، ماموں میاں، یہ بتائیں کہ ثاقب کیسا ہے اور کیا کر رہا ہے؟'' میرے اس سوال پر ماموں میاں کے چہرے پر ایک عجب اداس سی مسکراہٹ آئی اور جس تیزی سے آئی اتنی ہی تیزی کے ساتھ معدوم ہوتی چلی گئی۔ چائے کی پیالی اٹھا کر اندر دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹ ایسے سکوڑ لیے جیسے چاہتے ہوں کہ ان کے دل و دماغ میں جو بات ہے کہیں ہونٹوں کی قید سے آزاد نہ ہو جائے۔

مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ اس موضوع پر بات نہ کرنا چاہ رہے ہوں۔ سوچا کہ بات بدل دی جائے۔ مگر اب جو سوال میرے ذہن میں تھا، ماموں میاں سے کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ قدرے توقف کے بعد کھنکھارتے ہوئے گویا ہوا۔

''میں نے......سنا ہے......آپ نے......گھرانہ......فروخت کر دیا؟'' میں نے اٹک اٹک کر اپنا سوال مکمل کیا۔ ان کی انکھوں نے ایک بار پھر میرے سر سے بھی اوپر کہیں دور خلاوں میں گھورنا شروع کر دیا۔

میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ان کے چہرے پر اداسی اور آنکھوں میں نمی تھی۔

''ہاں......میں نے اپنا کماؤ پوت بیچ دیا بس قبصہ دینا باقی رہ گیا ہے۔''

''مگر کیوں......؟''

''اس لیے کہ مجھے خود سے پیار نہیں۔''

''کیا مطلب......؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔مگر جیسے میری بات ان کے کان میں پڑی ہی نہ ہو۔ بڑبڑاہٹ کی مانند بولے۔

''اور جو خود سے پیار نہیں کرتا وہ بھلا کسی اور سے کیا پیار کرے گا۔''

''ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے دریافت کیا۔

''یہ میں نہیں کہہ رہا......! یہ ثاقب نے کہا ہے......!!!''

''ثاقب نے......؟''

''ہاں ثاقب نے کہا......اور اس نے تو یہ بھی کہا کہ مجھے صرف اپنے گھرانہ سے محبت ہے۔وہ کہتا ہے کہ ساری زندگی میں نے فقط گھرانہ سے ہی محبت کی اور اس کے حصے کی محبت بھی گھرانہ ہی کی نذر کر دی۔'' اتنا کہہ کر ایک لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور میری انکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگے۔

ان آنکھوں میں بسی ویرانی مجھے کسی اندھے کنویں جیسی محسوس ہوئی۔ مجھے لگا کہ اگر میں نے اپنی آنکھیں نہ ہٹائیں تو میں اس اندھے کنویں میں گر کر اس کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جاؤں گا۔ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ماموں میاں کی بھرائی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وہ کہتا ہے کہ نہ میں نے خود سے محبت کی، نہ اس سے اور نہ ہی کسی اور سے۔بس میری ساری محبت،توجہ اور وقت صرف گھرانہ تک ہی محدود ہے۔''

''یہ سب ثاقب نے کہا ہے......؟'' میں نے حیرت سے ماموں میاں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ماموں میاں جواباً خاموشی سے مجھے تکتے رہے۔مگر ان کی آنکھیں اور چہرے کا رواں رواں ان کی سچائی کی گواہی دے رہا تھا۔

''نہیں نہیں......ماموں میاں، ایسا کیسا ہو سکتا ہے۔آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی یا پھر وہ آپ سے مذاق کر رہا ہو گا۔'' میں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھ گیا............آپ کو اس کی جدائی نے پریشان کر دیا ہے۔آپ اسے واپس بلوا لیں؟''

میری بات سن کر ان کے ستے ہوئے چہرے اور بھینچے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی ایک جنبش ہوئی۔

میں جان نہ سکا کہ وہ جنبش کوئی ادھوری، معدوم سی ٹھہری ہوئی غمگین مسکراہٹ تھی یا محض ہونٹوں کی ہلکی سی پھڑ پھڑاہٹ۔ جو بھی ہو میں اس لمحے اور ہونٹوں کی اس جنبش کو آج تک بھلا نہیں سکا۔

''اس روز فون کیا تو تھا اسے......! بڑے چاؤ سے کہا کہ اب واپس آ جاؤ......! تم بن بہت اکیلا پڑ گیا ہوں......!!!'' ماموں میاں ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں گویا ہوئے۔

''وہ کہتا ہے کہ جب میں چھوٹا تھا اور اکیلا پڑ جاتا تھا تو اس وقت تو آپ گھرانہ میں گم تھے۔ اب میں اپنی دنیا میں مگن ہوں اور آپ شاید گھرانہ سے تھک گئے ہیں، اکتا گئے ہیں یا پھر آپ کو گھرانہ کی ضرورت نہیں رہی تو میری یاد آئی ہے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میری آنکھوں میں گڑی آنکھیں جھکا کر اپنے جوتوں کی طرف دیکھتے ہوئے اجنبی سے لہجے میں بولے۔

''کہنے لگا پہلے آپ مصروف تھے......! اب میں مصروف ہوں......! آپ کو تو گھرانہ سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی......! صبح منہ اندھیرے میرے جاگنے سے پہلے آپ گھر سے باہر اور رات دیر گئے میرے سونے کے بعد گھر کے اندر......! جب کبھی مجھے بھی فرصت ملی تو آ کر مل جاؤں گا......!!!"

ماموں میاں کی بات سن کر مجھے یاد آیا کہ ثاقب اکثر اس سے کہا کرتا تھا کہ اس کے ابو اسے بالکل بھی وقت نہیں دیتے۔ کبھی گھومنے پھرنے کے لیے بھی نہیں لے جاتے۔ بس رات دن اپنی دکان میں ہی گھسے رہتے ہیں۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ میرے ابو اتوار والے روز مجھے اور گھر والوں کو اپنے ساتھ فلم دکھانے شہر کے مقامی سنیما گھروں میں لے جایا کرتے تو کبھی مزارِ قائد، ہل پارک، چڑیا گھر جسے اس زمانے میں گاندھی گارڈن کہا جاتا تھا، یا پھر ساحل سمندر ہاکس بے، پیراڈائیز پوائینٹ اور کلفٹن کی سیر کو لے جاتے۔

اگر کسی تفریحی مقام پر جانے کا جی نہ چاہ رہا ہوتا تو وہ مجھے اپنے ساتھ اپنی پرانی سرخ ہنڈا ففٹی موٹر سائیکل پر یا تو کیماڑی کے نیٹی جیٹی پل پر مچھلیوں کے شکار تو کبھی کراچی کے مختلف علاقوں کی فٹ پاتھوں میں جا بہ جا لگنے والے پرانی کتابوں کے بازاروں کی خاک چھاننے نکل کھڑے ہوتے۔ اور تو اور اگر کچھ بھی نہ سوجھے تو سارے گھر والوں کے ساتھ ''کراچی سرکیولر ریلوے'' کے ایک اسٹیشن سے سوار ہوتے۔ ٹرین سارے شہر کے گرد مکمل دائرے میں سیر کرواتی شام کو ہمیں اسی اسٹیشن پر اتار دیتی جہاں سے ہم سب سوار ہوئے ہوتے۔

اگلے روز جب میں ثاقب سے اس بات کا ذکر کرتا تو وہ بڑی حسرت سے پہلے ابو کے ساتھ جانے کیا قصہ سنتا پھر بڑے ہی اداس لہجے میں کہتا۔ ''کاش کبھی میرے ابو بھی مجھے اپنے ساتھ یوں ہی سیر سپاٹے کروائیں۔'' کچھ دیر وہ گم سم سا بیٹھا رہتا پھر دھیرے سے کہتا۔ ''یار منیب کاش کہ میرے ابا تمھارے ابا جیسے ہو جائیں......!!!''

اگلے کئی روز تک میں مسلسل اسی کیفیت میں غلطاں و پیچاں رہا۔ مجھے کسی طور سمجھ نہ آتا تھا کہ کیا

واقعی ثاقب نے یہ سب کچھ کہا ہوگا ماموں میاں سے......؟ کیا وہ بھول گیا کہ ماموں میاں نے شہزادوں کی مانند اس کی پرورش کی......؟ تو کیا ہوا کہ وہ اسے وقت نہ دے سکے......؟ اُنھوں نے اس کی تمام ضروریات تو بہ طریق احسن پوری کیں۔ اعلا تعلیم دلوائی اور بیرونِ ملک بھجوایا......! ان کی وہ مصروفیات کس لیے تھیں، اسی کے لیے ہی تو تھیں اور آج وہ کہتا ہے کہ وہ مصروف ہے اور جب فرصت ملی تب ملنے آجائے گا......!!!

مجھے ثاقب پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہ سامنے آجائے تو اسے خوب کھری کھری سناؤں۔

دھیرے دھیرے دن گزرتے رہے۔ ماموں میاں کا گھرانہ تو پہلے ہی بک گیا تھا۔ نئے مالک نے اس کا نام تبدیل کر کے عصرِ حاضر کے مروجہ طور طریق کے مطابق پھڑکتا ہوا انگریزی نام اس کے ماتھے پر سجادیا۔

چند برس خاموشی سے بیت گئے۔ میں کبھی کبھی ان کے گھر چلا جاتا۔ دونوں میاں بیوی کے چہروں پر مجھے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے رونق سی آجاتی۔ ماموں میاں یا تو اپنی میز پر بیٹھے کچھ لکھتے یا کسی کتاب و رسالے کا مطالعہ کرتے نظر آتے۔ ایک روز مقامی اخبار کے ادبی ایڈیشن میں شائع شدہ ایک خبر میری نظر سے گزری۔

ادب، افسانہ و شاعری سے میری از حد دلچسپی کے سبب اخبارات میں شائع ہونے والے ہفت وار ادبی ایڈیشن کا مطالعہ میرے مشاغل میں سرفہرست تھا۔ وہ خبر پڑھ کر تو میں حیران ہی رہ گیا۔ خبر کچھ یوں تھی:

ماضی کے نامور افسانہ نگار عاقب حسین کا افسانوی مجموعہ ''گھرانہ'' شائع ہو گیا۔

''تین دھائیوں قبل اپنے افسانوں سے شہرت پانے والے نامور افسانہ نگار عاقب حسین جو کہ نامعلوم وجوہات کے باعث ادبی منظرنامے سے دور ہو گئے تھے ایک بار پھر اپنے افسانوی مجموعے ''گھرانہ'' کی اشاعت کے ساتھ منظرِ عام پر پھر سے نمودار ہوئے ہیں۔ ہمارے نمائندے کے مطابق مذکورہ مجموعے میں بیس افسانے ان کے پرانے دور سے ہیں جب کہ پانچ افسانے گذشتہ دو برسوں کے دوران رقم کیے ہیں۔''

خبر کے ساتھ کتاب اور صاحب کتاب کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ تصویر میں موجود مصنف کوئی اور نہیں ماموں میاں تھے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ماموں میاں کا اصل نام عاقب حُسین ہے مگر مجھے ہر گز اس بات کا علم نہ تھا کہ وہ اپنے زمانے کے ایک نامور افسانہ نگار بھی رہ چکے ہیں۔

اگلے روز دفتر سے واپسی پر اردو بازار جا کر ماموں میاں کا افسانوی مجموعہ خریدا اور اسی رات دیر گئے جاگ کر مجموعہ پڑھ ڈالا۔ ماموں میاں کے افسانے پڑھ کر تو میں حیران ہی رہ گیا۔ میرے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ماموں میاں جنھیں تمام عمر کریانہ فروشی کرتے دیکھا وہ اِس طرح کے گہرے افسانے بھی تخلیق کر سکتے ہوں گے۔ دو چار روز بعد میں افسانوی مجموعہ لے کر ماموں میاں کے یہاں جا پہنچا۔ میرے ہاتھوں میں اپنی کتاب دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔ ان کے دریافت کرنے پر میں نے ان کو بتایا کہ مجھے ان کے

افسانے بے حد پسند آئے۔ میری بات سن کر ان کے چہرے پر ایک رونق سی آ گئی۔

''آپ نے افسانے لکھنا کیوں چھوڑ دیا تھا؟'' میرے اس سوال کے جواب میں وہ کچھ دیر تک خلا میں گھورتے رہے اور پھر اسی طرح سے خلا میں گھورتے ہوئے بولے۔

''گھرانے کے لیے افسانے سے منہ موڑا اور گھرانے نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔۔۔!!!'' پھر چند سال اور بیت گئے۔ میں اپنی گھریلو و منصبی مصروفیات میں اس قدر مگن ہو گیا کہ ماموں میاں سے ملنے کے لیے بھی نہ جا سکا۔

پھر ۲۰۱۹ء کے اوائل میں کرونا کی لہر نے جہاں ساری دنیا کو ویران کیا وہیں ہمارا شہر بھی تالہ بندی کا شکار ہوا اور سب اپنے گھروں کے ہو کر رہ گئے۔ وبا کے شدت والے دنوں میں یکے بعد دیگرے دل دہلانے والی خبریں سننے کو مل رہیں تھی۔ ایک روز خبر ملی کہ ماموں میاں اور ان کی بیگم کرونا میں مبتلا ہو گئے اور پھر دونوں چند ہی دنوں کے وقفے سے کرونا کے ساتھ جاری زندگی اور موت کی جنگ ہار گئے۔ دونوں میاں بیوی کو چند رضا کاران کی مدد سے پلاسٹک میں لپیٹ کر محلے کے قبرستان میں خاموشی کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اگلے برس جب وبا کا زور کچھ کم ہوا، کرونا کے خلاف مدافعتی ٹیکے عام ہوئے اور دنیا بھر میں تالہ بندی کا سلسلہ دم توڑنے لگا تو ثاقب بیرونِ ملک سے آیا اور ماموں میاں کا مکان فروخت کر کے بنک میں موجود جمع پونجی لے کر واپس چلا گیا۔

میں جب جب محلے کے قبرستان ابو مرحوم کے لیے فاتحہ خوانی کرنے جاتا ہوں تو ابو کی قبر سے چار قطار آگے پانچویں اور چھٹی قبریں ماموں میاں اور ان کی بیگم کی ہیں، پر بھی فاتحہ خوانی ضرور کرتا ہوں۔

دونوں میاں بیوی کی قبروں پر لگے کتبوں پر دیگر تفاصیل کے ساتھ درج ایک لفظ پڑھنے والے کو چونکنے پر مجبور اور حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ماموں میاں کا اصل گھرانہ تھا کون سا......؟

گھرانہ جنرل و پروپرائٹر اسٹور......!

یا ان کا اپنا گھرانہ......!

یا افسانوی مجموعہ ''گھرانہ''......!

یا پھر ان کی اور ان کی بیگم کی آخری آرام گاہیں جن پر نصب کتبوں پر جلی حروف میں ''گھرانہ'' درج ہے......!!!

◀◀ ● ▶▶

903-Misty View CT
Lilburn,GA-30047
U.S.A

● اسحاق وردگ

نورگل کے حصے کی قیامت

یہ دن چڑھے کا وقت تھا۔ بازاروں کی رونقیں عروج پر تھیں۔ نورگل رات بھر بے خوابی کے آسیب کے زیرِ اثر کروٹیں بدلنے کے بعد صبح کی نماز پڑھتے ہی نیند کی آغوش میں گیا۔ تو دن چڑھے اس کی آنکھ بمشکل کھلی۔ وہ ناشتے کے دوران میں بھی نیم خوابی کی کیفیت میں ڈوبا رہا۔ لگ بھگ دس بجے کا عمل تھا۔ جب نورگل نے جیسے تیسے خود کو گھسیٹتے ہوئے موٹر سائیکل سٹارٹ کی۔ ابھی وہ گلی سے بھاری وجود کے ساتھ نکل ہی رہا تھا کہ نکڑ پر اسے یاد آیا کہ وہ ہیلمٹ گھر بھول آیا ہے۔ اس نے موٹر سائیکل موڑنا چاہی تو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اور گرتے گرتے بچا۔ گلی میں بچوں کے لیے یہ منظر کسی لطیفے سے کم نہ تھا۔ فضا میں ایک ساتھ کئی بچوں کے قہقہے اٹھے۔ لیکن فضا میں تحلیل ہونے کے بجائے نورگل کے اعصاب میں جذب ہو گئے۔۔ قہقہے سن کر اسے شرمندگی کے ساتھ ساتھ اپنے وجود میں ایک بے رنگ بھاری پن کا احساس بھی ہوا۔ اور اسی احساس کا تناؤ تھا کہ گھر سے دوبارہ نکلتے ہوئے اسے پھر یاد آیا کہ وہ ہیلمٹ بھول آیا۔ دراصل گھر میں قدم رکھتے ہی اس نے بدحواسی میں چیخ کر بیوی کو آواز دی تھی۔ اسے یہ ادراک ہی نہ ہو سکا کہ اس نے آواز کتنی بلند رکھی تھی۔ بس وہ ایک ذہنی رو میں بہہ رہا تھا۔

"ظہیر گل کی ماں! میں کچھ بھول گیا تھا کیا۔؟؟؟"

ظہیر گل اس کا آٹھواں بچہ تھا۔ جس کی عمر چھے سال ہو چکی تھی۔ اس کے سکول کے دن پورے ہو چکے تھے لیکن پچھلے کئی سالوں سے بڑھنے والی تنگدستی نے نورگل کو زندگی کی بند گلی میں یوں دھکیلا کہ وہ بمشکل زندگی کی گاڑی کھینچ رہا تھا۔ اور اب تو جیسے وہ دیوار سے لگ چکا تھا۔ ابھی پچھلے مہینے ہی بجلی کا بل ادا کرنے کے لیے اسے تیسری بار قرضہ لینا پڑا۔

بیوی جو شوہر کے دکان جانے کے بعد بستر پر جا پڑی تھی۔ چیخ سن کر اچانک اٹھ بیٹھی۔ جیسے وہ ایک روبوٹ ہو اور بٹن دبانے پر حرکت میں آ گئی ہو۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔ چھوٹا ظہیر گل بھی نورگل کی اس ناگہاں چیخ سے نیند میں سہم گیا تھا۔ اور آنکھیں ملتا ہوا خوف کے مارے چیختا ہوا جاگا۔ نورگل کی گھر والی کے منہ سے بے اختیار نکلا:

"یا اللہ خیر۔! آپ ٹھیک تو ہیں نا۔؟؟؟"

''کیا۔؟؟؟ میں ٹھیک نظر نہیں آ رہا۔'' نورگل نے ہاتھوں سے اپنے خدوخال ٹٹولے۔اور پھر ذہن جھٹکتے ہوئے بولا۔

''میں کیا بھول گیا تھا۔کوئی ضروری چیز۔؟؟؟''" نورگل نے ادھرادھر دیکھا۔اسے گھر کے درودیوار بدلے بدلے لگ رہے تھے۔جیسے معمول سے ہٹ کر گلی سے واپس پلٹ کر اس نے کوئی قانون فطرت توڑا ہو۔اوراب ایک نامعلوم قوت اس کے حواس اپنے قابو میں کر رہی ہواورنورگل خودکواپنے اختیار میں رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔اور یہ بوکھلاہٹ اور چیخ بھی اسی لاشعوری خوف کا اظہار ہو کہ اب کبھی کبھی اسے ہونے کا اعتبار نہیں ہوتا تھا۔

''ہاں۔یاد آیا۔مہینے بھر کے سوداسلف کی فہرست بھول گئے تھے۔''

نورگل کی بیوی نے ایک مڑا تڑا کاغذاس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔وہ اب بھی نیند کے خمار میں تھی۔اورظہیرگل کو سینے سے چپکائے اسے سہلا رہی تھی۔جواب بھی سسکیاں بھر رہا تھا۔

نورگل نے عجلت سے کاغذ کا ٹکڑا جھپٹ کر بیوی کے ہاتھ سے چھینا۔اور تیزی سے گھر سے نکل گیا۔اس کی بیوی دیر تک خلا میں کھوئی ہوئی وہیں کھڑی رہی۔جیسے وہ صدیوں کی نیند سے جاگی ہو۔اورآس پاس کے مناظر نے اجنبیت کی چادراوڑھ لی ہو۔اوروقت ک سکہ بدل چکا ہو۔گھر سے نکلتے ہی اسے ایک اور حیرت نے آن دبوچا۔اس نے موٹر سائیکل اپنے گھر کے سامنے کھڑی کرنے کے بجائے دور فاصلے پر کھڑی تھی۔وہ اس پہیلی کو نہ بوجھ سکا کہ برسوں سے وہ جس نظام زندگی کا عادی ہے۔اس نظام کی ترتیب کیوں الٹ رہی ہے۔اس کی ذہن میں ایک بار پھر کوئی قوت اپنے قابو میں کرنے کے لیے سر اٹھانے لگی۔اس نے ذہن جھٹک دیا۔مسلسل کئی مہینوں کے ذہنی دباؤ کا اسے یہی ایک طریقہ آتا تھا۔گلی سے سڑک پر آتے ہوئے اس کا راستہ حاجی نوشاد کی گاڑی نے کاٹا۔نورگل حاضر دماغی سے بریک نہ لگاتا تو شاید ٹکرا جاتا۔

''اوئے پاگل تو نہیں ہوا۔نورگل خانہ۔'' حاجی نوشاد جو اپنے ڈرائیور کے ساتھ شاہانہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔قہقہہ نورگل کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔نورگل جو پہلے ہی قہقہوں کے بوجھ تلے گھٹی گھٹی سانس لے رہا تھا۔جھینپ سا گیا۔

''حاجی صاحب!بس وہ۔میرادھیان۔پتانہیں۔وہ وہ وہ......''نورگل کچھ کہتے کہتے رک گیا۔اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔یا کچھ کہنا بھی نہیں چاہتا۔بس خاموشی کے حصار میں پناہ لینا چاہتا ہے۔

''ہوجاتا ہے۔ہوجاتا ہے۔'' حاجی نوشاد نے چہرے پر ایک مصنوعی جلال سجایا۔اور تسبیح والا ہاتھ داڑھی پر پھیرتے ہوئے بولا۔ہاتھ پر بندھی ہوئی قیمتی قیمتی گھڑی دھوپ میں چمکی۔تو نورگل کا دھیان

اپنی واسکٹ میں پڑے کاغذ پر گیا۔ جواب جیب سے سر نکال کر نور گل کی بوکھلاہٹ کا تماشا دیکھ رہا تھا۔

سڑک پر آتے ہی نور گل کا ذہن حاجی نوشاد کی ٹاٹھ باٹ والی زندگی کا طواف کرنے لگا۔ اسے وہ دن یاد آ گئے جب حاجی نوشاد علاقے میں صرف ''نوشادے'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ پھر قسمت نے پلٹا کھایا۔ نوشادے نے داڑھی رکھی۔ ہاتھ میں تسبیح اٹھائی۔ اور دین دار بن گیا۔ کرائے کے گھر سے ایک کنال کے گھر میں اتنی تیزی سے منتقل ہوا کہ ''نوشادے'' کے نام سے اسے پکارنے والے اب خوشامدی لہجے میں اسے ''حاجی صاحب......حاجی صاحب۔'' کہنے لگے۔ جیسے اب عمر بھر ''نوشادے'' کہہ کر سنگین غلطی کی تلافی کر رہے ہوں۔ علاقے کے رہائشی حاجی صاحب کی قسمت بدلنے پر رشک کرنے لگے۔ سب اسے دین کی خدمت کی برکت سمجھ رہے تھے۔ نور گل حیران تھا کہ وہ تو پیدا ہی دین کے خادم گھرانے میں ہوا ہے۔ اس کا باپ اور دادا نے دنیا سے رخ موڑ کر دین کی خدمت میں زندگیاں صرف کی تھیں۔ ان پر رب کیوں مہربان نہ ہوا۔ اچانک اس نے لاحول پڑھی اور بریک لگا دی۔ اور ذہن جھٹکنے لگا۔ ''لعنت ہو تجھ پر اے شیطان......'' اس نے ذہن میں اٹھنے والی ناشکری کے احساسات کو شیطانی وسوسہ سمجھا۔ اور اونچی آواز میں شیطان پر لعن طعن شروع کی۔ آس پاس سے گزرنے والے راہگیر کن انکھیوں سے اس کی بدحواسی پر زیر لب مسکراتے ہوئے گزر رہے تھے۔

نور گل ان سے بے نیاز سوچنے لگا کہ اس نے اچانک بیچ سڑک کے بریک کیوں لگائی۔ یہ تو قسمت اچھی تھی کہ پیچھے سے کسی گاڑی نے ٹکر نہیں ورنہ......آگے وہ سوچ نہیں سکا۔ بس خوف کی ایک لہر پورے وجود کو ہلا گئی۔ اچانک ہوا کے جھونکے سے جیب سے نکلا کاغذ اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگا۔ تو اسے یاد آیا کہ اس نے سودا سلف لانا ہے۔ نور گل نے موٹر سائیکل ظریف خان کے سپر سٹور کی طرف موڑ دی۔ تھوڑی دیر بعد ظریف خان کے ہاتھ میں کاغذ اور منہ میں قہقہے تھے۔ جو اچھل اچھل کر نور گل کے اعصاب سے ٹھکرا رہے تھے۔ نور گل کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔

''اوئے پاگل......نور گلہ۔ ! یہ سودا تو پرسوں ہی تو لے گیا تھا......بھول گیا یا وہ مہینے بھر کا سودا ایک دن میں کھا گئے......ہاہاہا۔'' نور گل نے دانت نکالے اور شرمندگی چھپانے کے لیے بولا۔

''ہاں ہاں۔ خیر۔ یہ تو ہو جاتا ہے۔ اور کوئی نئی بات۔؟؟؟ اور ہاں ک ک کا......روبار تو ٹھیک ج ج جا رہا ہے......اور ہاں......ہاں ہاں وہ......میں کیا کہہ رہا تھا ظریف خان؟'' نور گل کے جسم و جاں میں ہلچل مچنے لگی۔ لفظ اس سے دور بھاگ رہے تھے۔ اس کے گلے میں آواز نہیں بن رہی تھی یا پھر خیالات نے آواز کا روپ اپنانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس ذہنی کشمکش سے اس کا ذہن میدان جنگ بننے لگا۔

''تو کیا مجھے کوئی ان دیکھی چیز خود سے دور کر رہی ہے۔؟؟؟'' وہ بدحواس ہو گیا۔

''کیا کسی ان جانے حاسد نے مجھ پر جادو کر دیا ہے؟؟؟''نورگل ایک بار پھر کسی ان دیکھی طاقت سے خود کو چھیننے لگا۔

''یا پھر مجھ پر جنات کا سایہ ہے۔۔!!!''ظریف خان جو سٹور پر آنے والے گاہکوں کے ساتھ مصروف ہو چکا تھا۔فارغ ہوتے ہی نورگل کے قریب آیا۔ نورگل اسے دیکھ کر ذہنی جنگ سے باہر نکل آیا۔

''اور ہاں اور س س نا سٹور کیسے چل رہا ہے۔سب ٹھ ٹھ ٹھیک ک ک تو ہے نا......''ظریف خان گپ شپ کے موڈ میں تھا۔

''کیوں نورے......! تو مجسٹریٹ لگا ہے......جو پوچھ گچھ کر رہا ہے......ہاہاہا''

نورگل کے اعصاب میں''نورے''کا لفظ گولے کی طرح پیوست ہو گیا۔اس کے ذہن کی دیوار میں شگاف پڑ گیا۔جس میں جنگ کی آوازیں باہر نکلنے لگیں۔

''تو کیا میں کبھی حاجی نورگل نہیں بن سکوں گا۔''نورگل نے ذہنی دیوار کے شگاف سے اپنے اندر جھانکا۔ادھر ظریف خان پھر سے گاہکوں کی طرف گیا۔تو نورگل نے تیزی سے موٹر سائیکل سٹارٹ کی تا کہ ظریف خان دوبارہ اسے''نورے''کہہ کر شگاف کو مزید گہرا نہ کر دے۔جب ظریف خان فارغ ہوا تو اس نے دیکھا۔نورگل تیزی سے بڑی سڑک کی طرف مڑ رہا تھا۔اس نے چیخ کر آواز بھی دی۔

''اوئے نورے......! اپنا ہیلمٹ تو لیتا جا۔جو پرسوں تو بھول گیا تھا......''آواز نورگل کے کان سے ٹکرائی بھی لیکن اس کے کان اس گھڑی اندر کے شور پر لگے ہوئے تھے۔

وہ نورے سے حاجی نورگل بننا چاہ رہا تھا بالکل حاجی نوشاد کی طرح جس نے دن رات دین کی خدمت کی۔اور دیکھتے ہی دیکھتے نوشادے سے حاجی نوشاد خان صاحب بن گیا۔علاقے میں اس نے یہ چہ مگوئیاں بھی سنی تھیں کہ حاجی نوشاد قبضہ مافیا سے مل گیا ہے۔لیکن لیکن۔نورگل کے ذہن میں جنگ بڑھنے لگی۔

''قبضہ گروپ کیسے قبضہ کر لیتے ہیں۔جادو کے زور پر۔یا یا ڈرا دھمکا کر۔اگر اگر مجھے کسی نے ڈرا دیا اور میرے مکان پر قبضہ۔''خوف اس کے رگ رگ میں خون کے ساتھ بہنے لگا۔اس نے ایک جھرجھری بھری تو موٹر سائیکل پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔اس نے ہاتھوں کی گرفت مزید مضبوط کی۔اور ذہنی جنگ میں کود پڑا۔

''نہیں نہیں......میں کسی کو اپنے مکان پر قبضہ نہیں کرنے دوں گا۔میں حاجی نوشاد خان صاحب کو مار ڈالوں گا......حاجی نوشاد خان صاحب۔نہیں۔نہیں۔نوشادے کہو۔نوشادے۔ہاہاہا۔نوشادے۔نوشادے۔ہاہاہا۔''

قہقہوں کا ایک تیز ریلا خود بخود اس کے اندر سے امڈ آیا۔بالکل اس کے گھر کے گٹر کی طرح جو

کب کا ٹوٹ پھوٹ چکا تھا لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ اس کی مرمت کر سکے۔ کرونا کی پے در پے کئی لہریں اور اس سے پہلے سالوں تک شہر کے خراب حالات اس کے چلتے پھرتے کاروبار کو بہا کر لے گئے تھے۔ اور اب اس کے حواس بھی خش و خاشاک کی طرح اس بہاؤ میں بہہ رہے تھے۔ وہ خود کنارے پر بے بسی سے خود کو ڈوبتا، ابھرتا دیکھ رہا تھا۔

قہقہے اب بھی اس کے وجود سے نکل نکل کر فٹ پاتھ پر چلتے راہگیروں، آس پاس کی گاڑیوں، درخت پر بیٹھے پرندوں سے چپک رہے تھے۔ اور یہ سب مڑ مڑ کر نور گل پر غصے بھری نظریں پھینک رہے تھے۔ جو اس کے اعصاب سے چپک رہی تھیں۔ نور گل نے رفتار بڑھا دی تاکہ یہ نظریں اس سے نہ ٹکرائیں۔ چوک میں اسے لال بتی پر رکنا تھا۔ ٹریفک کے سپاہی نے اسے اشارہ بھی کیا لیکن وہ نہ رکا۔ وہ تو ذہن میں برپا جنگ میں محصور ہو چکا تھا۔ ٹریفک سپاہی نے موٹی سی گالی نور گل کی طرف پھینکی۔ جس نے ذہن میں پڑنے والے شگاف کو مزید گہرا کر دیا۔

''یہ سپاہی مجھے کیوں روک رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کیا کہا؟ کہیں قیامت کی نشانی تو نہیں ہے۔ کاش! آج قیامت آ جائے۔ زمین اپنے اندر کی آگ اگل دے۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے نظر آئیں۔ ارے ارے۔ یہ میری واسکٹ کی جیب میں کاغذات کیوں بک بک کر رہے ہیں؟ یہ دائیں جیب میں کیسا کاغذ ہے۔ شاید بجلی کا نیا بل ہے۔ نہیں نہیں۔ شاید قبضہ مافیا کی چھٹی ہے۔ جس میں دھمکی ہے کہ مکان چھوڑ دو۔ نہیں شاید اماں جان کی دوائی کا پرچہ ہے۔ نہیں شاید ٹریفک پولیس کا چالان ہے۔ نہیں ہاہاہا...... ہاہاہا۔''

قہقہے ہی قہقہے اس کے ارد گرد پھیل چکے تھے۔ دفعتاً اس نے ایک ہاتھ سے موٹر سائیکل تھامی اور واسکٹ اتارنے کی کوشش کی۔ ایک طرف سے واسکٹ اتری تو دوسرے ہاتھ سے موٹر سائیکل کو تھاما۔ اور جب واسکٹ دونوں طرف سے اتر گئی۔ تو اس نے قہقہہ لگایا اور اسے ہوا میں اچھال دی۔

جیبوں سے تسبیح، کاغذات، حساب کتاب کی ڈائری جیبوں سے نکل کر فضا میں پھیل گئے۔ کئی موٹر سائیکل سواروں اور رکشہ ڈرائیوروں نے حیرت سے یہ منظر دیکھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھے ایک کوڑا چننے والے نے جب واسکٹ کو گرتے دیکھا تو رواں دواں ٹریفک کی پروا کیے بغیر لپک کر اسے اٹھا لیا۔

واسکٹ میں پڑے کاغذات کے بوجھ سے آزادی کے بعد نور گل کے ذہن کا شگاف بھرنے لگا۔ تو اس نے موٹر سائیکل کی رفتار مزید بڑھا دی۔ قہقہوں کی آواز بھی بڑھنے لگی۔ فٹ پاتھ پر چلنے والی دو عورتوں میں سے ایک نے نور گل کا نوٹس لیا۔ تو اس نے دوسری عورت کو اشارے سے نور گل کی حرکتوں کی طرف متوجہ کیا۔

اب وہ بری طرح قہقہے لگا رہا تھا۔ان دیکھی قوت نور گل کو اس سے چھین چکی تھی۔

پانچ منٹ بعد ہی اس کے موٹر سائیکل کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ پیٹرول ختم ہو چکا تھا۔وہ کب کا شہر کی حدود سے نکل آیا۔موٹر سائیکل کے پہیئے شہر سے باہر خشک برساتی نالے کی ریتلی زمین میں دھنسنے لگے تو اس کی رفتار کم ہوئی۔ریت میں ایک بڑے پتھر سے جب اگلا پہیہ ٹکرایا تو نور گل اچھل کر ریت پر اوندھے منہ گر پڑا۔ریت اس کے منہ میں بھر گئی۔تو قہقہے اس کے حلق میں دبتے چلے گئے۔اس کا سر زمین پر پڑے پتھر سے جا ٹکرایا۔تو خون کی دھار خشک ریت کی پیاس بجھانے لگی۔زمین کی رگڑ سے اس کا گریبان پھٹ چکا تھا۔اور جیب میں پڑے نوٹ باہر نکل آئے تھے۔

''ارے یہ کاغذ ابھی تک...... ہاہاہا'' نور گل نے نوٹ سمیٹے اور ہوا میں اچھال دیے۔برساتی کی خاموشی میں اس کے قہقہے تحلیل ہونے لگے۔وہ اٹھ کھڑا ہوا۔اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

اچانک آسمان کی بلندیوں سے بانسری کی آواز نور گل کے دل و دماغ کو چیر کر اس کی روح میں اتر گئی۔اس کے قہقہوں کی آگ بجھ گئی۔زمین لرزنے لگی۔اب اس میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔نور گل نے دیکھا۔ان دراڑوں سے آگ نکل رہی ہے۔اس نے عجب والہانہ سرخوشی کے ساتھ دیکھا۔فضا میں پہاڑ اڑ رہے تھے۔اس کے قہقہے چیخوں میں بدلنے لگے۔اس نے اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔اور قریب کے ایک درخت کی جھکی شاخوں سے جھولنے لگا۔وہ مسلسل آسمان میں اڑنے والے پہاڑوں کو دیکھ کر شاخوں سے جھولتا گیا۔جیسے اس کے بدن میں بندر کی روح سما گئی ہو۔اور اس سے کچھ فاصلے پر قریبی گاؤں کے چرواہے چند لڑکے نور گل کی ان حرکتوں پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔نور گل کے حصے کی قیامت آ چکی تھی۔اور شریر بچے تالیاں بجا بجا کر اور نور گل پر قہقہے پھینک پھینک کر نور گل کے حصے کی قیامت میں زندہ دل تماشائیوں کا کردار ادا کر رہے تھے۔اس تماشے کو انجام تک پہنچانے کے لیے آسمان میں اڑنے والے گدھ پر تول رہے تھے۔جن کی خون آشنا نظروں نے اڑتے اڑتے ریت میں جذب ہونے والے نور گل کے لہو کی چمک دیکھ لی تھی۔ہستی کے تماشے کا پردہ گرنے والا تھا۔تاکہ نیستی کے تماشے کو شروع کیا جا سکے۔

◄◄ ● ►►

3257 Darugiran Jahangeerpura
Peshawar Khair Paktun Pakistan
Mob: 03459048908

● شاهد اختر

بازگشت

سلطان غیاث کا پانچ افراد پر مشتمل کنبہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ سب سے بڑا بیٹا جنید ابھی تھوڑی دیر پہلے یہیں بیٹھا گھر والوں سے تبادلہ خیال کر رہا تھا۔ تبھی اُس کے کسی دوست نے آواز دی۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ پانچ سات منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو اسے ماحول میں کچھ تبدیلی نظر آئی۔ صوفے پر بیٹھتے ہی اس نے حافظے کو ٹٹولا کہ وہ لوگ ابھی کیا باتیں کر رہے تھے۔ بدلے ہوئے چہروں کے تاثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے جنید بات کا سرا تلاش کرنے لگا کہ کہاں سے سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ اُسے فوراً ہی یاد آ گیا۔ وہ بات شروع کرنے جا رہا تھا کہ اُسے لگا معاملہ تشویش ناک ہے۔ ابھی دس منٹ قبل جب وہ اُٹھ کر باہر گیا تھا تب تک سب کچھ نارمل تھا مگر اندر آنے کے بعد جو فضا وہ دیکھ رہا تھا اس میں خاصی بے چینی تھی۔ اس نے ذہن پر زور دیا۔ بحث بھی جارحانہ نہیں تھی تو پھر یہ لوگ اُداس کیوں ہیں......؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں آخر ایسا کیا ہو گیا کہ یہ لوگ برسوں کے بیمار دکھائی دینے لگے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد جب افسردگی کی وجہ کسی نے نہیں بتائی تو اُسے ہی منہ کھولنا پڑا۔ ''What happened?'' اُس کے سوال کا بھی کسی نے نوٹس نہیں لیا تو جھنجھلاہٹ کے ساتھ لہجے میں درشتی اتر آئی۔

''میں پوچھ رہا ہوں کہ بات کیا ہے......؟''

''گرینڈ پا کا فون آیا ہے۔ وہ صبح کی ٹرین سے یہاں آ رہے ہیں۔ رہنے کے لیے......'' آخری لفظوں پر صفورہ نے زیادہ زور دیا۔

''oh-really--'' جنید کا چہرہ خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے تموج سے دمکنے لگا لیکن اگلے ہی لمحے اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اپنے صادق جذبوں کے اظہار کے لیے جس جگہ کا تعین کیا ہے وہ کسی طور پر مناسب نہیں۔ فوراً ہی اسے سنجیدہ ہو جانا پڑا۔ دادا جی کے آنے کی خبر سننے کے بعد اب وہ کسی طرح کی بحث کے موڈ میں نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو اُسے معلوم تھا کہ وہ کسی کو بھی قائل نہ کر سکے گا۔ گھر میں وہ فردِ واحد تھا جس کے خیالات کسی سے نہیں ملتے۔ وہ صرف ضرورت کی چیزیں ہی پرانی استعمال نہیں کرتا۔ کہنہ روایات جو مشرقیت کی امین ہیں لیکن اس گھر میں جنہیں مکڑی کے جالے کی طرح سخت نوک والی جھاڑو میں

لپٹ کر کہیں آڑ میں چھپا دیا تھا، جنید اس تہذیب کا بھی علمبردار تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ وہ پیدا گاؤں میں ہوا تھا۔ شاید اسی لیے بیگم سلطان نے بعد کے دونوں بچوں کی زچگی شہر میں کرائی تھی۔

سوندھی مٹی اور کھپریل کے چھپّر والا گھر جہاں طاقوں میں رکھے ہوئے چراغوں کی سیاہی اب تک اس کی آنکھوں میں رچی بسی ہے۔ شہر کے برقی قمقمے اُسے دھندلانے میں پوری طرح ناکام ثابت ہوئے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اسلاف سے محبت اور اپنی تہذیب سے انس کی وجہ گاؤں میں اگر اس کی پیدائش ہے تو یہ بات وہ کسی طور پر ماننے کو راضی نہیں۔ اس کا جواب تھا کہ اگر اسے سچ مان لیا جائے تو ڈیڈی ایسے کیوں نہیں ......؟ وہ بھی تو گاؤں میں پیدا ہوئے بلکہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ وہاں کے کھلیانوں، چوپالوں میں محفوظ ہے؟ سرد راتوں میں دوستوں کے ہمراہ رات رات بھر ہڑ دنگ کیا ہے ڈیڈی نے۔ تعجب ہے وہ یہ سب کیسے بھول گئے؟ اگر سب کچھ انہیں یاد ہے تو پھر اپنے بچوں کا گاؤں جانا پسند کیوں نہیں؟ اب تو خیر عبید اور صفورہ صاف صاف منع کر دیتے ہیں، ہمیں نہیں جانا گاؤں ......شاؤں ......وہاں کے لوگ بہت گندے ہوتے ہیں۔ برش تک نہیں کرتے اور ٹوائلٹ ......اُف ......گاڈ......سوچ کر ہی وامٹنگ ہوتی ہے۔ باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ سب اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے حربے ہیں۔ جنید بارہا اپنے خیالوں سے نبرد آزما ہوتا مگر کوئی بہتر نتیجہ وہ اب تک اخذ نہ کر سکا تھا۔ عبید اور صفورہ سے گھنٹوں بحثیں ہوتیں مگر دونوں الگ الگ پیروں کی جوتی بنے رہتے۔ مزاجوں میں اس قدر تضاد کوئی نئی بات نہیں تھی جب وہ بہت چھوٹے تھے تب بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ عبید اور صفورہ اس کی چیزوں پر نیت خراب کرتے۔ وہ بھی اپنی عادت سے مجبور تھا۔ بغیر چوں چرا کے مطلوبہ اشیاء ان کے حوالے کر دیتا لیکن دھیرے دھیرے اُسے احساس ہوا کہ یہ دونوں آپس میں طے کر کے اس کی ہمدردیوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اس کے ذہن میں آیا کہ وہ ان کا سگا بھائی ہے بھی یا نہیں۔ ممکن ہے میں ممی یا ڈیڈی کو کہیں پڑا ہوا مل گیا ہوں یا کوئی مجھے ان کے پاس چھوڑ گیا ہو اور یہ راز مجھے نہ بتا کر ان دونوں کو بتا دیا ہو۔ اپنے شک وشبہ کی دادا جی سے تصدیق بھی کی۔ دادا پہلے قہقہہ مار کر ہنسے پھر انہوں نے بتایا کہ ایسا نہیں ہے۔ تو سلطان اور شائستہ کا ہی بیٹا ہے۔ یہ جان لینے کے بعد پھر اس نے اپنی کسی چیز کے چلے جانے کا افسوس نہیں کیا۔ اس کے باوجود اختلاف بڑھتے جا رہے تھے۔

اندرا نگر شہر کا وہ علاقہ ہے جہاں عام آدمی اپنی ضرورت سے بھی آتے ہوئے جھجکتا ہے بلکہ خوف کھاتا ہے۔ ہر چند کہ دوپہر میں عمیق سناٹا ہوتا ہے جیسے سارے کے سارے مکان خالی ہوں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے کار سکوت توڑتی ہوئی کسی گیٹ کے مقابل کھڑی ہو جاتی ہے۔ چوکیدار گیٹ کھول کر کورنش بجا لانے والے انداز میں سلام کرتا۔ کار جھٹکے سے گیٹ کے اندر ہو جاتی۔ باہر پھر وہی سناٹا......وہی خاموشی......!

دن میں اس علاقے کے تینوں سیکٹرز اے، بی اور سی کی سڑکوں پر ردّی بیچنے والوں کے علاوہ اگر کوئی نظر آتا تو پوسٹ مین یا جھاڑو برتن کرنے والی نوکرانیاں یا سودا سلف لانے والے ملازم۔ البتہ شام ہوتے ہی تمام دن ویران وسنسان نظر آنے والی شاہراہ خوبصورت چہروں کی آماجگاہ بن جاتی۔ چھوٹے بچے پارک میں اسکیٹنگ کرتے یا دوڑ بھاگ کے دوسرے کھیلوں میں منہمک ہوتے۔ وہ اطفال میں جو دس بارہ کی عمر سے تجاوز کر چکے تھے۔ بیڈمنٹن یا ایسے ہی بغیر دوڑ بھاگ کے کھیلوں کا انتخاب کرتے ورنہ پارک کے کسی گوشے میں بیٹھ کر کیبل ٹی وی پر دکھائی جانے والی فلموں اور پروگرام پر بات کرتے یا کس Episode میں آئندہ کیا ہونے والا ہے، کی پیشین گوئی کر کے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں نظر آتے۔ مختلف چینلوں پر صبح سے رات تک دکھائے گئے فحش اور اشتعال انگیز سین پر سب کی متفقہ رائے یہی ہوتی کہ ممی پاپا کی موجودگی میں وہ پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔

یہاں مکینوں میں تاجروں کی اکثریت تھی۔ جو تاجر نہیں تھے وہ بھی سرکاری محکموں میں اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ بینک بیلنس میں وہ تاجروں سے کسی طرح پیچھے نہیں تھے۔ البتہ روپے کیش نہیں رکھتے۔ اوپر کی ساری کمائی نیچے ہی دبائے رہتے۔ غیاث الدین کا شمار بھی بڑے افسروں میں ہوتا تھا۔ میاں بیوی کے علاوہ تین بچے تھے جس میں بڑا لڑکا جنید جس نے اسی سال لاکھوں روپے ڈونیشن دے کر انجینئرنگ میں داخلہ لیا تھا۔ دوسرا نمبر صفورہ کا تھا۔ وہ پندرہ کی ہو رہی تھی اور فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ تیسرے بیٹے عبید میں بھی پانچ سال کا فرق تھا۔ وہ درجہ ششم میں پڑھ رہا تھا۔ چوتھا بچہ ان کے ترقی یافتہ ہونے میں مانع تھا۔ اس لیے میاں بیوی نے آپس میں طے کر کے آگے رِسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔

سلطان غیاث کا آبائی وطن جہان آباد تھا۔ وہاں لیمپ پوسٹ کی ملگجی روشنی میں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ والدین کے اکلوتے تھے۔ پھولوں کی سیج پر پرورش ہوئی۔ جو سوچ لیا ہو گیا...... پیسوں کا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ پرکھوں کی بھی بہت زمین جائیداد تھی، سلطان کے باپ حشمت یار کے پاس بیس بیگھا زمین تو بٹائی پر دے رکھی تھی اور اِدھر اُدھر بہت سے دھندے پھیلا رکھے تھے۔ اُن کی ایک ہی خواہش تھی کہ لاڈلا بیٹا کبھی کوئی کام نہ کرے، بس حکم دے۔ شاید اسی لیے بیٹے کا نام بھی سلطان رکھا تھا۔

غیاث کو پڑھنے لکھنے کا شوق اوائل عمری سے ہی تھا۔ وقت کے ساتھ یہ شوق جنوں اختیار کر گیا۔ حالاں کہ گاؤں میں ایسا کچھ نہیں تھا جس سے سلطان غیاث کو پڑھنے کی تحریک ملتی۔ بس اپنے آپ ہی شوق پروان چڑھتا گیا۔ ہائی اسکول تک تو حشمت یار کو بیٹے کے منصوبوں کا اندازہ ہی نہ ہوا مگر آگے پڑھنے کے لیے شہر جانے کی بات نکلی تو ماں باپ کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ دُلارے بیٹے پر سختی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا پیار سے سمجھایا بجھایا کہ تجھے کیا ضرورت ہے؟ جو کچھ تو پڑھ لکھ کر حاصل کرنا چاہتا ہے، ہم تجھے ابھی دینے کو تیار ہیں......''

''اور مجھے صرف تعلیم چاہئے''لختِ جگر کے دوٹوک جواب سے وہ دل برداشتہ ہوئے گم صم ہوکر بیٹے کو دیکھتے رہے۔ یہ کن گناہوں کی سزا ہے وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔اولاد کی ہر ضد پوری کرتے ہوئے وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کی یہ شفقت ہی ایک روز مصیبت بن جائے گی۔انہیں یقین ہو گیا کہ اب اسے شہر جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔خوابوں کے وہ چراغ جو بیٹے غیاث سے متعلق ذہن میں فروزاں کئے تھے ایک اک کر کے بجھنے لگے۔وہ سوچ رہے تھے کہ اسی سال شادی کردیں گے۔اپنے دوست مشیر کی بیٹی مہر النساء سے غیاث کی شادی اُسی وقت طے کر دی تھی جس روز غیاث سات سال کا تھا اور مہر النساء ایک سال کی تھی۔غیاث کی ماں اکثر مہر النساء کو بلا بھیجتی۔وہ شرم سے گلنار ہوئی جاتی۔جب اسے یقین دلایا جاتا کہ غیاث گھر پر نہیں ہے تب ہی وہ آنے کے لیے رضامند ہوتی۔ماں دوڑ دوڑ کر اپنی ہونے والی بہو کی خاطر مدارات کرتی اور ساتھ میں نصیحتیں بھی کہ خوب دودھ، دہی اور گھی وغیرہ کھایا کرے تاکہ جب یہاں آئے تو موٹی تازی ہو کر آئے۔مہر النساء اپنی ہونے والی ساس کی ہدایات آنچل سے باندھ کر باہر پھدک جایا کرتی مگر جاتے جاتے غیاث کی ماں اس کے ہاتھ میں کچھ پیسے دھرنا نہیں بھولتیں۔ایسی ہی جانے کتنی یادوں کے نقش بن بن کر مٹ رہے تھے اور اس سارے معاملے میں وہ قصوروار اپنے آپ کو ہی ٹھہراتے۔پندرہ سال میں کبھی اس کی کسی خواہش کو ٹھکرایا ہوتا۔کبھی کسی غلطی پر انتباہ کیا ہوتا یا کان اُمیٹھ کر گال پر طمانچے رسید کئے ہوتے تو شاید لاڈ کی یہ دیوار اس وقت اتنی بلند و مستحکم نہ ہوتی۔یا ہوتی بھی تو وہ اس قدر بے بس ولاچار ہرگز نہیں ہوتے۔

وہ دن اور آج کا دن،غیاث نے گاؤں کو ایسی پیٹھ دکھائی کہ پھر کبھی اُس طرف کا رخ نہ ہوا۔پہلے دو چار دن کی چھٹی ہوتی تو بھاگا آتا اور جب تک واپس نہیں جاتا دہلیز سے باہر قدم نہیں دھرتا،کہتا کہ تعطیلات میں آپ لوگوں کے ساتھ گزارنے آیا ہوں نہ کہ یاروں کے ساتھ۔دوستوں کے ساتھ ہی رہنا ہوتا تو شہر میں ہی رک جاتا۔اُس کے پرانے دوستوں کو معلوم ہوتا کہ غیاث آیا ہے،لیکن ان سے ملنے نہیں آیا۔کچھ تو اسے غیاث کے تکبر پر محبور کرتے،کچھ شہر کو کوستے۔دھیرے دھیرے احباب سے فاصلہ اتنا بڑھا کہ انہیں یقین کرنا پڑا کہ اپنا ایک دوست جاتا رہا۔

غیاث شہر کی باتیں گھر میں تفصیل سے بتاتا۔والدین کو وہاں کے قصے،مشاہدے سناتا تو انہیں بڑی مسرت ہوتی۔بہت سی باتیں تو ان کی سمجھ میں نہ آتیں پر وہ خاموشی سے بیٹے کے منھ سے جھڑتے پھول چنتے رہتے۔جب دوسرے لوگ غیاث کی تعریفیں کرتے تو حشمت یار کا سینہ افتخار سے پھول جاتا۔آنکھوں میں چمک اور تیز ہو جاتی۔کچھ دنوں بعد حشمت یار کی آنکھوں سے ایک اور پردہ اٹھا،ایک نیا منظر انہیں دکھائی دیا۔جیسے جیسے غیاث شہر کے لیے پرانا ہوتا گیا۔گاؤں کی گرفت بھی اس کے ہاتھوں سے ڈھیلی پڑتی گئی تھی۔خطوں کے وقفے میں پہلے تاخیر ہوتی تھی اب سال چھ مہینے میں ایک دو آ گئے تو بہت۔بھولے بھٹکے کبھی خود آتا تو ناگواری

کے ساتھ ہاں، ہوں میں باتیں کرتا اور سر پر پڑھائی کا بوجھ بتا کر اگلے دن صبح کی بس سے واپس ہو جاتا۔ بس میں بیٹھنے کے بعد جیب سے روپئے نکال کر گنتا جو کہ باپ نے چپکے سے اس کی جیب میں ڈال دیئے ہوتے۔

عرصہ بعد ایک بار آیا تو کہنے لگا اس نے کالج ٹاپ کیا ہے۔ پہلے تو ماں باپ سمجھ ہی نہ پائے پر غیاث نے انہیں سمجھایا تو خوشی سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ محبتوں کا مارا غیاث کا باپ سارے گاؤں میں دوڑ دوڑ کر سب کو بتا آیا۔ ڈھیروں مٹھائی تقسیم کی۔ دونوں میاں بیوی اندر ہی اندر بلیوں اُچھل رہے تھے۔ کیسا کڑیل جوان ہو کر آیا ہے۔ حشمت یار کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اب تک داڑھی مونچھیں کیوں نہیں نکلیں لیکن قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ بھی شہر میں اُتروا آیا ہے۔ خواہش ہوئی کہ اسے پھٹکاریں مگر رعب دار بیٹے کے سامنے ان کی گھگھی بندھ گئی۔ مہر النساء کے متعلق بھی گفتگو کرنے میں جھجک رہے تھے۔ تبھی غیاث نے انہیں بتایا کہ وہ شہر میں شادی کر رہا ہے۔ لڑکی اس کے ساتھ ہی پڑھتی ہے۔ اس کا باپ سرکاری افسر ہے۔ شائستہ سے شادی کے بعد مجھے بھی کہیں اچھی جگہ سیٹ کروا دیں گے۔ حشمت یار اور فاطمہ بیگم دم بخود سے اسے دیکھتے رہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ لڑکا جو ابھی کل تک ان کی گودیوں میں پیشاب کرتا تھا اب واقعی بڑا ہو گیا ہے۔ جب جنید پیدا ہونے والا تھا تو حشمت یار کے بے حد اصرار پر کہ پہلا بچہ ہے، ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ وہ گاؤں میں ہی آنکھ کھولے ہر چند یہ کہ مطالبہ بھی انہوں نے بہت ڈرتے ڈرتے کیا تھا۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر غیاث نے حامی بھر لی۔ معینہ تاریخ سے پہلے ہی وہ شائستہ کو موٹر میں بٹھا کر گاؤں لے آیا۔ گاؤں میں اب تک ایک نرسنگ ہوم بھی کھل گیا تھا۔ شاید اسی نے غیاث کی ہمت افزائی کی لیکن عین ڈیلوری والے دن شہر سے ایک لیڈی ڈاکٹر چمچماتی ہوئی کار میں آدھمکی۔ گاؤں کے لوگ کار ہی دیکھنے میں مصروف رہے تھے۔

جنید کی پیدائش کے بعد تک حالاں کہ اس کے ساس سسر نے خدمت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ راتیں ایک پیر پر کھڑے ہو کر گزار دیں۔ دیسی گھی کا گوند اور اچھوانی بنائی۔ بالٹی بھر بھر کے دودھ دہی لائے لیکن بہو کے ماتھے کی شکنیں دور نہ کر سکے۔ شائستہ نے سب کے سامنے یہ اعلان کیا کہ آئندہ وہ اس طرح کا کوئی بھی مطالبہ پورا نہ کر سکے گی۔

ہٹا کٹا حشمت یار بیٹے کے غم میں وقت سے پہلے بوڑھے نظر آنے لگے۔ غیاث جب بھی بھولے بھٹکے گاؤں آتا تو وہ دونوں اُسے روکنے کی حتی الامکان کوششیں کرتے۔ ’’اب مت جاؤ۔ کچھ وقت ہم لوگوں کے ساتھ بھی رہ لو۔ ہم بڑھیا بڈھے گرتی ہوئی دیواریں ہیں۔‘‘ غیاث پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ الٹا وہ انہیں ہی جھڑک دیتا۔ ’’میں نوکری چھوڑ کر آپ کا حقہ بھروں، یہی چاہتے ہیں نہ آپ لوگ۔ پچاسوں آدمی میرے انڈر میں کام کرتے ہیں۔ اُن سب کی ذمے داری ہے مجھ پر۔ جذباتی باتوں سے سے میں اپنی ذمے داری نہیں چھوڑ سکتا۔ سُن کر دونوں خاموش ہو گئے۔ حالاں کہ حشمت یار کی خواہش ہوئی کہ پوچھے ’’والدین کی کوئی ذمّے داری نہیں ہے تجھ پر‘‘ مگر وہ چپ ہی

سادھے رہے۔ اگلی بار جب وہ گاؤں آیا تو وہ دونوں سب کچھ بھول کر پھر اُسے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک بار تو اماں نے بریف کیس ہی چھپا دیا۔ طلب کرنے پر بھی جب واپس نہیں کیا تو وہ بریف کیس کے بغیر واپس چلا گیا اور پھر بہت دنوں تک خطوں کے جواب بھی نہیں دیئے۔ وہ تو کہو کہ اماں کے انتقال کی خبر آ گئی ورنہ شاید جاتا بھی نہیں۔ بیوی بچے اس بار بھی نہیں پسیجے۔ البتہ جنید بیس دنوں تک دادا کے پاس رکا رہا۔ ان بیس دنوں میں اس نے اپنے دادا کے ہرے زخموں کو مندمل کرنے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔

چالیسویں سے پہلے حشمت یار کا ایک اور خط آیا۔ لکھا تھا کہ تم اپنے گھر میں بھی قرآن خوانی وغیرہ کروا دو۔ غیاث اپنے باپ کے اس مشورے سے پوری طرح متفق تھا مگر اس کی اجازت صفورہ اور عبید نے نہیں دی۔ انہوں نے قرآن خوانی کے لیے منع نہیں کیا تا۔ بس محلِ وقوع گھر کے بجائے مسجد مختص کر دیا۔ تاویل یہ پیش کی کہ مسجد کے غیر مہذب لڑکوں سے ڈرائنگ روم میں پھیلاوا پھیلے گا۔ آپ پیسے مسجد ہی بھجوا دیں۔ اپنی اولادوں کی یہ تجویز مسترد کر دینے کی ہمت غیاث سلطان میں نہیں تھی۔ آخر کار وہی ہوا جو بچوں نے چاہا۔ نوکر سے دو ہزار روپئے مسجد بھجوا دیئے گئے اور ساتھ میں یہ پیغام بھی کہ اگر پیسوں کی مزید ضرورت ہو تو منگوا لیں۔ صابر نے ان میں سے پانچ سو روپئے بطور ثواب اپنی جیب کی نذر کئے۔ اتنے دنوں کی ملازمت کے بعد اُسے اتنا تو معلوم ہی تھا کہ کون سی چوری پکڑی جائے گی اور کون سی نہیں۔ اگر اس کا خیال غلط ہوتا تو ایک ایماندار نوکر کی حیثیت سے وہ یہاں اب تک ٹکا نہ رہتا۔

حسب معمول جنید دادا جی کو لینے اسٹیشن گیا۔ دادا جی گھر میں آئے تو سب نے رسماً ہائے ......ہیلو...... کیا۔ اس طرح کے خیر مقدم کا اندازہ انہیں یہاں آنے کے بعد نہیں ہوا۔ وہ تو پہلے سے جانتے تھے لیکن گاؤں کا وہ پشتینی گھر بیوی فاطمہ کے چلے جانے کے بعد فقط ایک مکان میں تبدیل ہو گیا تھا۔ صبح شام اٹھتے بیٹھتے ہر طرف بیوی کا چہرہ دکھائی دیتا اور یہ عذاب جب ان کے نحیف و نزار بدن نے جھیلنے سے انکار کر دیا تو انہیں شہر کا خیال آیا۔ ساتھ میں بہت سے اندیشے۔ حشمت یار نے ان صعوبتوں کو ترجیح دی اور سینے پر صبر کا پتھر رکھ کر مکان میں تالا ڈال آئے۔ اگر چہ ساتھیوں نے بہت روکا مگر حشمت یار نے کسی کی ایک نہ سنی۔

جنید نے دادا کا سامان کمرے میں رکھ کر انہیں نہا کر تازہ دم ہو جانے کا مشورہ دیا۔ جی تو ان کا بھی یہ چاہ رہا تھا مگر اپنی مرضی سے وہ کچھ نہ کریں گے۔ یہ وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ دادا کو غسل خانے میں بھیج کر جنید آیا سے چائے کا پانی رکھنے کے لیے کہا۔ صفورہ اور عبید کونے میں بیٹھے خاموشی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ آج تو گرینڈ پا کیمی سے نہا کر Fresh ہو جائیں گے۔ ٹنگ......ٹانگ......'' عبید نے جملہ پورا کیا۔ میرے رنگ روپ اور سوندریہ کی دیکھ بھال کرنے والا ...... کیمی ......؟ عبید کے اسٹائل پر صفورہ ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔

حشمت یار نے جانے سے قبل دونوں کو گھور کر دیکھا۔ چائے کا کپ لیے جنید بھی کمرے میں چلا گیا۔

شام کو کھانے کی میز پر تمام لوگ موجود تھے۔ سلطان غیاث نے اپنا تمام تر احتجاج خاموشی میں تبدیل کر لیا تھا۔ اپنے باپ کی غلطیوں کو نظر انداز کر دینا ہی کم رعایت نہیں تھی۔ اپنے بچوں کی زبان پر قدغن لگانا اس کے لیے ذرا مشکل تھا۔ شاید اندر ہی اندر وہ خوش ہو رہا تھا۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے سب نے گرما گرم ٹماٹو سوپ پیا۔ دادا جی اپنی جگہ بیٹھے سب کچھ دیکھتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا چیز ہے جو کھانے سے پہلے اتنے شوق سے پی جا رہی ہے۔ تبھی جنید نے ان کے کپ میں بھی انڈیل دیا۔ ''دادا جی یہ ٹماٹر کا شربت ہے......'' اس بار انہوں نے مشروب کو غور سے دیکھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ٹماٹر کی یہ کون سی نسل ہے۔ ٹماٹروں کا تو انہیں خود بھی بہت شوق ہے۔ کھیت کی منڈیروں پر بیٹھ کر سرخ اور تازہ ٹماٹر بہت کھائے ہیں۔ اسی لیے تو ان کا چہرہ بھی ٹماٹر کی طرح لال رہتا تھا۔ جیسے بدن کا سارا لہو چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ صفورہ تو ناک نقشے میں اپنے دادا کو ہی پڑی تھی۔ ویسی ہی گوری چٹّی تھی مگر اس کے باوجود اس کے چہرے پر حشمت یار کو وہ سرخی کبھی نہیں دکھی جوان کے اپنے چہرے پر تھی۔ اس کے لیے وہ سوپ کو ہی ذمّے دار ٹھہراتے، مشروب سپ کیا تو اس کا ذائقہ غیاث کے مزاج سے مختلف نہیں لگا۔

اگلے روز حشمت یار نے فجر سے پہلے بستر چھوڑ دیا۔ وضو کر کے کمرے ہی میں نماز ادا کی۔ قرب و نواح میں کوئی مسجد نہ تھی یہ جنید سے رات ہی معلوم کر لیا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر بکس سے کپڑے میں لپٹا ہوا قرآن نکالا اور تلاوت کرنے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد گیٹ کھول کر ہوا خوری کی غرض سے باہر نکل گئے۔ زنجیر میں بندھے ہوئے کتنے نے بھونکنا شروع کیا۔ جسکی آواز سے غیاث کی آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر باہر آئے تو گیٹ کھلا ہوا پایا۔ متجسس ہو کر باہر دیکھا تو والد بزرگوار کو دُوب پر ننگے پاؤں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ غیاث سلطان کا خون کھول اٹھا۔ جی تو چاہا کہ وہیں جا کر پھٹکاریں مگر ہمت نہ ہوئی۔ زور سے پھاٹک بند کر کے اندر کا رخ کیا تب تک شائستہ بھی بیدار ہو چکی تھی..... کون...... تھا......؟'' انگڑائی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

''ابا...... پارک میں...... ٹہلنے گئے ہیں......''

''تم تو کہتے تھے ابا بڑے Old fashioned ہیں پھر یہ Morning Walk کس لیے...... بھلا......؟'' بیوی کے سوال پر توجہ دیئے بغیر وہ ساتھ لائے اخبار کو دیکھنے لگے۔ آٹھ بجے کے قریب دھوپ ٹیرس پر آ گئی۔ جنید لان میں دادا کے ساتھ مخملی گھاس پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ حشمت یار بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اُسی وقت ایک ادھیڑ عمر کا شخص اندر داخل ہوا۔ سفید جھلا جھل کرتہ پائجامہ، لمبی سی شرعی انداز کی داڑھی، جبیں پر نمازوں کی کثرت کے باعث سیاہ نشان۔ دیکھنے سے ہی مسجد کے امام نظر آ رہے تھے۔

''یار جنید...... یہ کون صاحب ہیں......؟'' حشمت یار نے استفسار کیا۔
''دادا جی یہ متین صاحب ہیں۔ بازار والی مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں۔''
''خیر تو ہے...... یہاں کیوں آئے ہیں......؟''
''یہ یہاں روز آتے ہیں......؟''
''لیکن...... کیوں......؟''
''آدھا گھنٹہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور شیطانی بلاؤں سے بچنے کے لیے پورے گھر میں پھونک چھوڑتے ہیں......''۔
''کچھ فائدہ تو ہوتا نظر نہیں آرہا......'' حشمت یار کے لہجے میں افسردگی تھی۔ مولوی صاحب قرآن بھی اپنا ہی لاتے ہوں گے......؟''
''نہیں قرآن پاک تو وہی ہے۔ اس کے بعد دونوں بہت دیر تک خاموش رہے۔ مجھے غیاث کی اس قدر گمراہی کا اندازہ نہیں تھا۔ غضب خدا کا نماز اور قرآن کریم کی تلاوت کے لیے ملازم رکھے ہیں۔ سوچ رہا ہوں گاؤں واپس چلا جاؤں۔'' حشمت یار نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو جنید چونکا۔ ''نہیں دادا جی میں اب آپ کو گاؤں نہیں جانے دوں گا۔''
''مجھے لگتا ہے میں وہاں زیادہ آرام سے رہ سکوں گا۔ کس کس بات کو نظر انداز کروں بالکل دہریوں جیسی زندگی گزار رہا ہے۔ پتہ نہیں کس نیکی کے عوض تو مجھے مل گیا......''۔
''دادا جی ......آپ کو ......آپ کا حق نہ دلوا سکنے کا ایک قصور وار میں بھی ہوں، چوں کہ دشمن اکثریت میں ہیں اس لیے ہم پر بھاری ہیں مگر کبھی ہمارا بھی وقت آئے گا۔؟
''تو ......تو...... بہت بڑی بڑی باتیں سیکھ گیا ہے رہے۔ مسکراتے ہوئے حشمت یار نے کہا۔ اس کے بعد جنید اٹھ کھڑا ہوا۔ چلئے ناشتہ کرتے ہیں......''
حشمت یار کا یہ معمول تھا کہ رات کو بستر میں جانے کے بعد سارے دن کی باتوں کو سلسلے وار یاد کرتے اور سونے سے قبل مجموعی طور پر افسردہ ہوتے۔ کبھی کبھی پانی آنکھ کے کوروں سے ڈھلک کر تکیہ پر آجاتا۔ حشمت یار کو کچھ ایسی صعوبتیں اٹھانی پڑ رہی تھیں جس سے ان کا لاڈلا پوتا بھی ناواقف تھا۔ جیسے یہ بغیر نمک مرچ کا کھانا ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔ وہ تو بہت تیز مسالوں کے کھانے پسند کرتے تھے۔ گوشت ہو یا سبزی، الگ الگ طریقوں سے پکواتے۔ ارہر کی دال میں لہسن اور دیسی گھی کا بگھار جب مرحوم بیوی فاطمہ لگایا کرتی تو آس پڑوس کے گھروں تک اُس کی مہک جاتی۔ حشمت یار کو جس قدر اچھے کھانوں کا شوق تھا بیگم کو اس سے کہیں

زیادہ پکانے کا۔ پتیلیاں بھر بھر کے کھانا پکتا اور دونوں بڑھیا بڈھے چٹ کر جاتے پر یہاں تو سارا معاملہ ہی الٹا تھا۔ اتنے سارے لوگوں کا کھانا کوکر سے ڈونگوں میں پلٹ جاتا کوکر دھوکر الماری میں سجا دیئے جاتے اور ڈونگے کھانے کی میز پر۔ انہیں سب سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب اس میں سے بھی آدھا بچ جاتا۔ وہ تو خیر روز ہی بھوکے اٹھتے مگر یہ لوگ اتنا کم کیوں کھاتے ہیں۔ انہیں کس کا خوف یا لحاظ ہے۔

صفورہ کی دوست سویٹی کی برتھ ڈے پارٹی تھی، عبید بھی مدعو تھا مگر وہ ڈانس ریہرسل سے اب تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ شائستہ نے کئی بار صفورہ کو تیار ہو جانے کے لیے کہا مگر وہ ٹی وی کے سامنے سے اٹھنے کو راضی نہ تھی۔ جھنجھلا کر شائستہ نے اُسے ڈانٹا تو اس نے صاف طور پر بتایا کہ وہ سیریل دیکھنے کے بعد ہی جائے گی۔ آج کی قسط میں کئی راز کھلنے والے ہیں۔ ریموٹ لیے وہ بار بار چینل بدل رہی تھی۔ ایک چینل پر اشتہار آ رہے تھے۔ اس نے انگلی وہیں روک دی۔ عورتوں کے انتہائی ذاتی نیپکنز کا اشتہار تھا۔ اُس نے آواز بند کر دی۔ حشمت یار ایک کونے میں بیٹھے سارا تماشا دیکھ رہے تھے، اتنی ہمت نہیں تھی کہ صفورہ سے آواز بڑھانے کو کہہ سکیں۔

’’گرینڈ پا......آپ کو...... پتہ ہے یہ......کیا چیز ہے......؟‘‘

’’ہوں......‘‘ بڑے اعتماد سے حشمت یار نے جواب دیا۔

’’تو......بتائیے......کیا چیز ہے؟‘‘ چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے وہ بولی تھی۔

’’سیاہی سوکھنے والا...... وہ کیا کہتے ہیں......ہاں......سوختہ۔‘‘ جواب سنتے ہی وہ زور زور سے ہنسنے لگی پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

-Oh-grandpa-You-are?? Innocent تبھی شائستہ کمرے میں داخل ہوئی۔ صفورہ کو ہنستے ہوئے دیکھا تو پوچھ بیٹھیں۔ ’’کیا...... بات ہے......؟‘‘

’’مما......وہ نیپکنز کا ایڈ آ رہا تھا۔ میں نے گرینڈ پا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ کہنے لگے سیاہی سوکھنے والا سوختہ ہے، ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے پانی نکل آیا۔ شائستہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ دادا حیرت زدہ سے بیٹھے رہے۔

دن جیسے جیسے کٹ ہی رہے تھے۔ حشمت یار کی اضطراری کیفیت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی، شام کو عبید اور صفورہ معمول کے مطابق ریہرسل پر گئے ہوئے تھے۔ جنید بھی کالج سے نہیں لوٹا تھا۔ شائستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی پاس پڑوس کی عورتوں سے صحت کے تناسب پر تبادلہ خیال کر رہی تھی۔ آنے سے قبل اپنے سسر کو انتباہ کر آئی تھی کہ ’’ڈرائنگ روم کی طرف نہ آئیں اور یہ ٹوپی لگا کر تو ہرگز نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو تھوڑا صبر کر لیں۔‘‘ اس حکم سلطانی کے بعد تو حشمت یار کا خیال بھی ڈرائنگ روم کی طرف جانے سے رہا۔ غیاث اپنے کمرے میں آفس کی کوئی فائل لیے بیٹھا تھا۔ حشمت یار ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوئے ...... ’’کہئے ابّا......کوئی خاص بات......؟‘‘

غیاث نے استفسار کیا ہاں......کچھ کہنا ہے تجھ سے۔ ''حشمت یار نے ہمت بٹور کر کہا۔

''بیٹھئے......'' پاس پڑی ہوئی کرسی کی طرف غیاث نے اشارہ کیا،'' بیٹا سلطان تو یہ ٹی وی گھر سے ہٹا دے......''

''مگر کیوں......؟'' غیاث اپنے باپ کے اس مطالبے پر حیرت زدہ تھا۔

''تیری آنکھوں کا پانی کیا بالکل مر گیا ہے۔ دیکھا نہیں کیا کیا بے ہودگیاں دکھاتے ہیں۔ گھر میں لڑکی سیانی ہو رہی ہے۔ اس پر کیا اثر پڑے گا کبھی اس پر غور کیا ہے۔''

''ابّا یہ ٹی وی صفورہ ہی اپنی پسند سے لائی ہے۔ یہ گاؤں نہیں شہر ہے اور یہ علاقہ جہاں ہم رہتے ہیں شہر کا سب سے مہنگا علاقہ ہے۔ یہاں یہ سب کچھ عام ہے۔ یہاں آپ جیسے لوگ حیرت کا باعث بنتے ہیں۔ آپ جو کچھ غلط اور معیوب سمجھ رہے ہیں یہاں وہ برا نہیں ہے۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے......اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں......؟''

''کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں، میں سب سمجھ گیا۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ غیاث نے کہا ابا ذرا دیکھئے، مجھے پوچھے تو کہہ دیں نہیں ہوں''

''یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ بیٹا باپ سے جھوٹ بلوائے۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھے رسیور اٹھایا......ہیلو......کون......؟''

''ڈیڈی پنکی ہے۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''پنکی...... یہاں کوئی پنکی نہیں ......تبھی غیاث نے انہیں بتایا کہ صفورہ کا ہی نام پنکی ہے۔ کہہ دیجئے گھر پر نہیں ہے، حشمت یار سُنی ان سُنی کر کے آگے بولنے لگے۔

''تم کون بول رہے ہو......؟''

''انکل میں پنکی کا دوست ہوں......فیض......''

''مگر مجھے تو تم سراسر نقصان لگتے ہو، تمہیں شرم نہیں آتی لڑکیوں سے دوستی کرتے ہوئے۔ اتنے میں غیاث نے لپک کر رسیور چھینا۔ آپ نے تو حد کر دی ابّا جانتے نہیں صفورہ کو معلوم ہوگا تو کتنا ناراض ہوگی۔ آپ کو خاموش رہنا چاہیے۔'' ''جب سے آیا ہوں خاموش ہی تو ہوں۔'' کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ ایک گھنٹے بعد اپنے کمرے میں انہیں صفورہ کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

"Its too much mama...I con't tolerate him please send him back today"

حشمت یار بھی وہاں آ کھڑے ہوئے۔ باقی لوگ پہلے ہی وہاں موجود تھے، وہ غصہ میں تھر تھر کانپ

رہی تھی۔حقارت سے اس نے حشمت یار کی طرف دیکھا۔

’’آپ کو میرے دوست سے بدتمیزی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔‘‘ وہ بہت زور سے چلائی......

شائستہ نے اُسے ڈانٹا’’ آہستہ بولو۔آواز باہر جائے گی تو لوگ کیا سوچیں گے......‘‘

’’کچھ بھی سوچیں......مجھے اس کی پرواہ نہیں۔اس نے اپنی ماں کو بھی جھڑک دیا۔دیگر افراد صمّ بکم سے کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔جنید نے البتہ مداخلت کرنے کی کوشش کی۔صفورہ نے اُسے بھی آڑے ہاتھوں لیا۔

’’آپ چپ رہئے۔Insult میرے دوست کی ہوئی ہے۔اس لیے ناگوار بھی مجھے ہی لگے گا۔آپ کو اگر ان کا Favour کرنا ہے تو آپ بھی ان کے ساتھ گاؤں میں ہی رہئے۔‘‘ پہلی بار حشمت یار کے ہونٹوں نے جنبش کی۔’’بیٹا جنید چل سامان باندھ۔ہمیں اب ایک پل بھی یہاں نہیں رہنا ہے۔تھرائی آواز پر جنید ان کی طرف متوجہ ہوا۔ابھی وقت ہے آرام سے گاڑی مل جائے گی۔‘‘ جنید فوراً بیگ اٹھایا......چلئے......نہ کسی سے دعا نہ سلام......نہ کسی نے روکنا چاہا......نہ کوئی رکنے کو تیار۔آخر کار دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

اسٹیشن پہنچنے کے بعد جنید نے بیگ دادا کو پکڑایا کہ میں ٹکٹ لے کر آتا ہوں۔بوڑھے حشمت یار کی آنکھوں میں رکا ہوا بند ایک دم سے بہہ نکلا۔آنسوؤں کی تیز دھار کرتے کی آستین سے پوچھتے جاتے۔آس پاس کے لوگ رک رک کر دیکھنے بھی لگے۔جنید کے آنے سے قبل انہوں نے اپنے آپ کو پوری طرح نارمل کرلیا۔جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔’’دادا جی......یہ ٹکٹ حفاظت سے رکھ لیجئے......بس ٹرین ذرا ہی دیر میں آنے والی ہے۔میں چاہتا تو یہی تھا کہ اب آپ کو کبھی گاؤں نہ جانا پڑے......لیکن......کہتے کہتے اس کا گلا رُندھ گیا۔اپنا خیال رکھئے گا۔‘‘

’’تو......کیا......تو......میرے ساتھ نہیں چل رہا......؟حشمت یار نے حیرت سے پوچھا۔

’’دادا جی جب تک میری پڑھائی ختم نہیں ہوتی......میں گاؤں میں کیسے رہ سکتا ہوں......ہاں امتحان کے بعد میں ضرور آؤں گا۔‘‘ حشمت یار کو پہلی بار احساس ہوا کہ جنید بڑا ہوگیا ہے۔اس کی آواز بھی اپنے باپ سے کتنی ملنے لگی ہے۔اچانک انہیں کچھ خیال آیا۔اندر کی جیب سے روپئے نکال کر جنید کے ہاتھ پر رکھے......یہ ٹکٹ کے پیسے رکھ......اور اب تو بھی......پڑھائی کرلے۔‘‘اس سے پہلے کہ وہ نانکر کرتا حشمت یار پلیٹ فارم پر کھڑی ٹرین میں سوار ہوگئے......؟

◀◀ ● ▶▶

88/592-AL-Noor Apartment Flat No-205-IInd, Floor
Prem Nagar-Kanpur-208001
Mob.9450143117

● فرحین چودھری

نقب زن

ڈاکٹر نے اس علاقے میں گھر خرید نے سے پہلے خوب جانکاری کر لی تھی۔ صاف ستھرا، اشرافیہ کا علاقہ، جہاں ذاتیات میں مداخلت سے پرہیز کرنے والے، ریشم کے کویا جیسے، اپنے ہی خول میں گھٹ مرنے والے لوگ رہتے تھے...... بھلے ساتھ والے گھر کو آگ لگ جائے۔

ڈاکٹر کو تسلی ہوگئی۔ پس ماندہ علاقے سے نکل کر سعودی عرب جا بسا تھا۔ خوب کمایا، لیکن عورت کو گھر داری کی دنیا تک محدود رکھا۔ پہلی بیوی کم پڑھی لکھی کزن تھی، تین عدد بیٹیاں پیدا کرنے کے باعث مرعوب و مجبور۔ ڈاکٹر اپنے Y Chromose کی کرشمہ سازی سے واقفیت کے باوجود بیٹے کے چکر میں کم عمر نرس کو دوسری بیوی بنا لایا۔ ثمینہ کا احتجاج، آنکھوں کے راستے بہہ کر دوپٹے میں جذب ہوگیا۔ سعودی عرب میں الگ الگ فلیٹ تھے، سو نہ رابطہ نہ کھچ کھچ۔ دوسرے یہاں شیوخ کے لمبے چوڑے حرم، ثمینہ کے دل کو دلاسہ دیئے رکھتے۔ مگر پاکستان آکر، اکلوتی بیویوں کا راج دل پر گھونسے چلانے لگا۔ حنا اوپری منزل اور ثمینہ نچلی منزل کی مالکن بن گئی۔

حنا کے ہاں بھی بیٹی کی پیدائش نے ثمینہ کا جی خاصا ہلکا کر دیا تھا۔ ٦ سالہ سونی کی اُٹھان، نئی نسل کی تمام تر خصوصیات سمیت کسی اور ہی سمت کا اشارہ دے رہی تھی۔ مگر بچی سمجھ کر سب فی الحال بے خبر تھے۔ روبی کی منگنی، باہر رہنے والے بھانجے سے کر کے ڈاکٹر مطمئن تھا۔ دُور تھا۔ فون پر بھی شاذ و نادر رابطہ ہوتا مگر ماں کی موجودگی میں۔ منگیتر سے رسمی سلام دعا کے دوران، کتنی ہی میٹھی میٹھی سرگوشیاں دل ہی دل میں دم توڑ دیتیں۔ دوسری جانب شاہد کے رومانوی الفاظ کے جواب میں صرف ''جی جی'' کی تکرار ہوتی تو وہ جل کر فون پٹخ دیتا۔ ٹھک کی وہ آواز کئی دن روبی کے دل اور بدن کو سلگائے رکھتی۔ رابعہ خود میں مگن رہنے والی دبّو سی زندگی سے بے زار نظر آتی تھی۔ شاید پابندیوں سے گھبرا کر اس نے خواب دیکھنا بھی ترک کر دیئے تھے۔

رہ گئی انجو۔ پارہ تھی پارہ، اُس کا انگ انگ بولتا تھا، تھرکتا تھا، آنکھیں ابرو ہونٹ حتیٰ کہ پاؤں بھی ایک خاص ردھم کے ساتھ ہر وقت حرکت میں رہتے، چاہے وہ لیٹی ہو یا بیٹھی ہو۔ ماں بار بار ٹوکتی اس حرکت پر۔ لیکن وہ تو اندر کا کوئی اضطراب تھا۔ انجو کے بس میں تھوڑا ہی تھا۔

وہ پورے گھر میں جھونکے کی مانند، کسی شرارے کی مانند گھوم جاتی، ان کہی کہہ جاتی، باغیانہ جملے، اعتراضات، باپ کی آمرانہ مملکت کی شان میں گستاخیاں۔ماں کے ہاتھ سبزی بناتے وقت کانپ کانپ جاتے۔مگر روبی کی بے زبانی کو زبان مل رہی ہوتی۔حنا انجو کی باتیں سن کر سوکن کی بے بسی پر مسکراتی۔ثمینہ کی نگاہیں التجا کرتیں۔نہ بولو۔نہ بولو۔کچھ نہ بولو۔کچھ نہ کھولو۔

اس سارے قصے میں موٹی بھدی برکتے اور اُس کا میاں گنگو بہت اہم تھے۔اس بے رنگ ماحول میں ایک رنگ دار دھبہ تھا گنگو اور وہ بھی سیاہ کالا۔گنگو بس پورا گونگا ہونے سے رہ گیا تھا۔پورا جملہ۔پوری کہانی ایک دو لفظوں میں سمونے کا عادی۔مالکوں کے آگے بیل کی طرح سر جھکائے رکھتا۔اپنی بدصورت اور بدہیئتی کے باعث گھر اور گھر کی عزت کا Ideal محافظ۔پردے لگی گاڑیوں کو صرف وہی چلا سکتا تھا، شاپنگ، سکول، کالج کے لئے خواتین اور بچیوں کو لے جانا اُسی کی ذمہ داری تھی۔

دوسری طرف برکتے کی بدصورتی، دونوں بیویوں کے لئے خطرے کا لال نشان بننے سے قاصر تھی، سو اندرونی محاذ پر امن تھا۔ڈاکٹر شانت۔مگر دو پلاٹ چھوڑ کر دائیں ہاتھ والے گھر اور پیچھے والے گھر میں بالترتیب دو اور تین عدد کڑیل نوجوانوں کی موجودگی کا انکشاف کچھ بے چینی کا باعث بن گیا۔نئی روشنی کے پروردہ، انگریزی بولتے، برمودا میں ملبوس، گاڑیاں بھگاتے ہلا گلا کرتے، یہ کھاتے پیتے گھرانوں کے نوجوان کسی بھی وقت سرخ بتی کا روپ دھار سکتے تھے۔سو گھر کی تمام کھڑکیوں پر باہر کی جانب سے بھی پکی چقیں باندھ دی گئیں۔دیواروں پر کانٹے دار باڑ لگا دی گئی۔پردے لگی گاڑیوں میں حجاب کے ساتھ ساتھ آنکھوں پر کالے چشمے بھی نصب کرنا ضروری تھے۔تمام ممکنہ حفاظتی اقدامات کے باوجود ڈاکٹر اکثر بچیوں کی صحت چیک کرنے کے بہانے ان کے چہروں اور آنکھوں کو بغور دیکھتا۔کسی ڈھکے چھپے راز کی تلاش میں۔مگر حیران مردہ لٹکے ہوئے چہرے اور جھکی ہوئی نظریں اسے مطمئن کر دیتیں۔

پھر وہ حسبِ پروگرام، نچلی اور اوپری منزل پر موجود اپنی مملکتوں کو تاراج کرنے کے عمل میں مصروف ہو جاتا۔بیڈروم کا دروازہ لاک ہوتے ہی مردہ لٹکے چہروں پر عقبس ناچنے لگتا، آنکھوں میں چمک لہراتی، روبی خوف کی آڑ لے لیتی، رابعہ بے نیازی کا پردہ ڈال لیتی، مگر انجو کا تجسس اور احتجاج اس کی زبان سے بہہ نکلتا۔وہ جیب خرچ سے چوری چھپے خریدے ہوئے موبائل پر Internet کھول کر روبی اور رابعہ کو بھی سات جہانوں کی سیر کروانے لگتی۔وہ دونوں بھی سہمی سہمی سکرین پر بکھرے رنگوں میں الجھتی چلی جاتیں۔

گھنٹوں بند دروازے کے پیچھے اُن کی پراسرار خاموشی ماں کو خوفزدہ کرنے لگتی مگر ڈاکٹر اپنی کامیاب حاکمیت کے نشے میں مسکرانے لگتا۔انجو نے کچن کی کھڑکی کے باہر لٹکی چق میں بڑے طریقے سے درزیں بنا

لیں تھیں۔ جن کے درمیانی فاصلے سے اس کی شعلہ اگلتی آنکھیں دائیں بازو والے گھر کے دو سجیلے نوجوانوں کو دیکھ سکتی تھیں۔ جو جانے کس دنیا میں مست کبھی کبھار ہی نظر آتے تھے۔ البتہ ان کی آوازیں، میوزک، قہقہے چق کے پار کی دنیا کا طلسم عیاں کرتے تھے۔ ان کی بھاری مردانہ آوازیں انجو کے جسم میں سنسنی سی بھر دیتیں۔ انجو کا جی چاہتا ان میں سے کوئی ایک۔ اچانک ہی اسے اپنے کلاوے میں بھر لے۔

ان کی ہنستی کھلکھلاتی سمارٹ سی ماں جب پورچ میں کھڑی انہیں آتے جاتے چومتی تو انجو کے سینے میں سانس اٹک سی جاتی، اس لمحے اس کی سوچ پر بھی سنسر لازم ہو جاتا۔

Internet کے ذریعے چوری چھپے کھلا کتابچہ اب ایک بہت بڑا گیٹ بن چکا تھا۔ ہر طرح کی آمدو رفت کے لئے۔ تینوں بہتیں وقت کی چال اور افتاد کو سمجھ رہی تھیں۔ روبی تو انجو کے احسان تلے دبی تھی کہ گھر میں Internet کی اجازت نہ ہونے کے باوجود انجو نے اپنے خفیہ موبائل کے ذریعے شاہد سے اس کی vidio chat ممکن بنا دی تھی۔ وہ رات گئے کمبل میں دُبکی، سکرین پر شاہد کے چہرے سے چہرہ ملائے، اُبلتے جذبات کو ٹھنڈا کرتی رہتی۔ اتنے ماڈرن زمانے میں، اتنے posh علاقے میں ایسے طور طریقے، آس پاس کے لوگوں کو ابنارمل لگے، پھر اپنے کاندھے اُچک کر سب to hell with کے انداز میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

رات گئے کبھی کبھار تمام خواتین، ڈاکٹر کے ساتھ ڈربے کی مرغیوں کی طرح، پرس پر ڈوپٹے لپیٹ کر بتیاں بجھا کر تھوڑی دیر کو ہوا خوری کے لئے آتیں۔ یوں جیسے مچھلیاں سانس لینے کو سطح آب پر اُبھرتی ہیں، چند لمحے اور پھر گہرے پانی میں غوطہ لگا جاتی ہیں۔ فرق اتنا تھا کہ مچھلیاں سطح آب پر اُبھرنے اور پانی میں غوطہ لگانے کے عمل میں آزاد تھیں۔

ان چند لمحوں کے دوران بھی، دبی دبی، خوف زدہ آوازیں، پراسرار سکوت کو توڑنے میں ناکام رہتیں، سواندھیرے کی خاموشی میں چند سسکتی سانسوں کا اضافہ کر کے وہ پھر پردوں اور دیواروں میں چھپ جاتیں۔

بقول انجو ''بھیڑ بکریوں جیسی ڈرو عورتوں کے اس گلے میں صرف انجو ہی میں'' کالی بھیڑ'' بننے کے جراثیم وافر مقدار میں موجود تھے۔ کبھی کبھار تو وہ جھنجھلا کر برکتے کی خوش بختی پر ناز کرتی۔ برکتے کو چق کی درزوں سے مالی اور دوسرے نوکروں سے باتیں کرتے، ہنستے دیکھ کر وہ روبی اور رابعہ کو بھی بلا لیتی؛

''دیکھو کتنے مزے سے گپیں لگا رہی ہے۔ آزاد پرندے جیسی۔ کاش میں برکتے ہی ہوتی۔'' یہ سن کر رابعہ کی غنودگی بھری آنکھیں لمحے بھر کو اُبلتیں اور پھر کہیں دُور ڈوب جاتیں۔ وہ ہونٹ بھینچ کر وہاں سے کھسک جاتی۔ روبی مسکرانے لگتی کہ شاہد سے طویل گفتگو کے سلسلوں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ گنگو کا اشارہ

پاتے ہی برکتے کیوں سارے کام ٹال کر چپکے سے سرونٹ کوارٹر کی راہ لیتی ہے۔

ایک دن رابعہ آخر بول پڑی ''انجو گنگو کو دیکھ کر برکتے کی آنکھیں چمکیں یا وہ اس کے پیچھے سرونٹ کوارٹر میں جائے۔ تمہیں کیا مسئلہ ہے؟''

انجو تڑپ کر بولی ''ہر طرف تو مسئلہ ہے۔ اوپر نیچے آگے پیچھے۔ internet پر۔ اور ہاں تم بی بی حاجن رات چپکے چپکے کس سے باتیں کررہی تھیں میرے موبائل پر۔''

رابعہ صاف مکر گئی ''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ روبی ہوگی شاہد بھائی کے ساتھ۔'' اور وہاں سے کھسک گئی۔ تب انجو رخ روبی کی جانب موڑ دیتی گفتگو کا ''سچ بتاؤ شاہد بھائی کے ساتھ باتیں کرتے وقت تمہیں کیسا لگتا ہے؟ ویسا ہی جیسا۔ جیسا۔'' پھر چپ کر جاتی۔ روبی واش روم میں اپنے جسم کے کرنٹ کو ختم کرنے کے لئے منہ پر یخ پانی کے چھینٹے مارنے لگتی۔

انجو نے اپنے آنچ دیتے جذبوں اور جسم کو بہلانے کے لئے برکتے کا سہارا لیا۔ کمر پر خارش کے بہانے دن میں کئی کئی بار برکتے کے کالے بھدے نرم ہاتھ، انجو کی کمر سہلاتے۔ رفتہ رفتہ انجو کو نشہ سا ہونے لگا برکتے کے ہاتھوں کا۔ ماں نے کئی بار معائنہ کیا مگر نرم و ملائم کمر پر نہ دانے تھے نہ خشکی۔ بس برکتے کے ہاتھوں کی رگڑ کی وجہ سے سرخ سرخ دھاریاں تھیں۔ جانے رابعہ ایسے موقع پر کیوں غنودگی سے بھری آنکھوں سمیت کسی کونے کھدرے میں غائب ہو جاتی۔ خارش session کے دوران انجو اور برکتے کے درمیان معمول سے ہٹ کر بھی گفتگو ہونے لگی۔ برکتے اپنے بچپن لڑکپن کے قصے، گاؤں کے معاشقے، کھیتوں میں ملاقاتوں اور شادیوں کی رودادیں بھی چسکے لے لے کر سنانے لگی۔ ان کہانیوں میں پراسراریت تھی۔ ملفوف رومانی کہانیاں، جسم جاں کی فتوحات قصے۔

رابعہ......کبھی کبھار ناگواری سے دونوں کو دیکھتی اور کروٹ بدل لیتی۔ ایک دن انجو نے شرارتاً پوچھ لیا ''برکتے اتنے کالے دیو، حبشی جیسے گنگو کے ساتھ کیسے۔'' برکتے کے کالے رنگ میں گلابی رنگ کی پچکاری سی چلی۔

''باجی جی مرد کا پیار، رنگ روپ کا محتاج نہ ہووے جی۔ یہ تو سپ کے ڈنگ جیسا ہووے جی۔ زہر کے نشے جیسا؟''

انجو کے بدن پر سانپ رینگنے لگے۔ رابعہ چادر تلے کانپنے لگی۔ اسے خیال آیا۔ باپ اوپری منزل میں ہوتا ہے تو ماں بولائی بولائی پھرتی ہے۔ باپ نیچے ہو تو اوپر چیزوں کا پٹخنا اور چلانا بڑھ جاتا ہے۔ شاید زہریلا نشہ اُترنے کا اثر ہوگا!

برکتے کے خارشی اور مالشی session لمبے ہوتے گئے۔ انجو کے لئے برکتے کے ہاتھ سیاہی چوس

بن گئے۔ اس کی ضد، گفتگو کی کڑواہٹ، بغاوت کا زہر۔ برکتے کے ہاتھ چوسنے لگے۔ دھیرے دھیرے۔ دیر دیر تک۔! ماں نے سکھ کا سانس لیا۔ ڈاکٹر کی عدم موجودگی میں وہ کئی بار اب حنا کے ساتھ اپنے بھائی کے ساتھ شاپنگ وغیرہ کرنے چلی جاتی کہ گنگو بچیوں کو لانے لے جانے پر مامور تھا۔

لیکن سمندر کی پرسکون سطح کے نیچے جوار بھاٹے اُبل رہے تھے۔ جلد ہی سونامی آ گیا۔ ماں نے سرمنہ پیٹ لیا۔ بات انجو کی ہوتی تو ۴۱۰ وولٹ کا کرنٹ نہ لگتا۔ یہ تو رابعہ تھی۔ ماں نے گنہگار کا نام پوچھا۔ رابعہ ٹک ٹک غنودگی لئے آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ برکتے کی طلبی ہوئی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ سب کو سختی سے منع کر دیا گیا کسی کے منہ سے بات نہ نکلے۔ آخر مار پیٹ کے بعد رابعہ نے گنگو کا نام لے ڈالا۔

کہ شہرِ نارسا تک اسی بھدے کالے بے ڈھنگے گنگو کی رسائی تھی۔ Beauty & Beast کا خیال شاید کسی ایسی گھٹن زدہ فضا کے کسی کھلے دریچے سے نکلا ہوگا۔

پردہ دار عورت کہاں جاتی۔ کئی بار اوپر کی سیڑھیاں چڑھی اتری۔ آخر ہمتکر کے حنا کے پاس جا بیٹھی۔ اسے مشترکہ شوہر کی عزت کا واسطہ دیا۔ حنا نے طعنہ دینے کو منہ کھولا تو ثمینہ نے اس کی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''حنا یہ طعنوں کا وقت نہیں۔ رابعہ اور سونی کی رگوں میں ایک ہی باپ کا خون دوڑ رہا ہے کل کلاں۔''

حنا نے بات کاٹ کر مدد کا وعدہ کر لیا۔ ڈاکٹر نے چند دن تک کراچی جانا تھا، اس کی غیر حاضری میں راز داری کے ساتھ مسئلہ حل کرنے کا سوچا گیا۔ آخر حنا کی ٹریننگ کام آنے والی تھی۔ فلائٹ کینسل ہوگئی۔ ڈاکٹر اچانک گھر پلٹ آیا۔ کاروائی جاری تھی۔ ڈاکٹر کو ائیر پورٹ چھوڑنے کے بعد چابی مالی کے حوالے کر کے گنگو بیوی سمیت غائب ہو چکا تھا۔ گھر کی عزت کا جنازہ ڈاکٹر کے کاندھوں پر رکھ کر۔ اور وہ جو بدصورت بھدے گنگو کو گھر پر رکھ کر مطمئن تھا، سر پکڑے اب سوچ رہا تھا۔

''کم بخت بہتر شکل وصورت کا ہوتا تو کوئی نہ کوئی خاندانی پیوند لگا کر ٹاٹ کے ٹکڑے کو مخمل بنا دیتا۔ پر اب رابعہ کو زہر کا ٹیکہ لگا دوں یا خود زہر پی لوں!''

تبھی وہ رابعہ جس کی آنکھیں روشنی میں پوری کھل نہیں پائی تھیں۔ چیختی چلاتی اندر سے برآمد ہوئی۔ پیچھے پیچھے بوکھلائی ہوئی ثمینہ اور حنا۔ رابعہ نے شعلہ اُگلتی آنکھوں سے باپ کو دیکھا اور سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے بولی ''خبردار جو میرے بچے کو مارنے کی کوشش کی کسی نے۔ گھر میں کسی مرد کو آنے تو دو۔ چاہے وہ گنگو کی ہی اولاد ہو۔''

دھڑ دھڑ دھڑ ڈاکٹر پر دیواریں گرنے لگی تھی۔

◄◄ ● ►►

● انجم قدوئی

بے نشاں

پاکستان ایرپورٹ پر اترتے وقت ہم سب بے پناہ خوش اور پرجوش تھے۔ایک عجیب سی مسرت ہم سب کے دلوں میں لہریں لے رہی تھی کافی عرصے بعد ہمارا یہ خواب پورا ہوا تھا اور ہم ساری دوستوں کا گروپ پاکستان کی سرزمین میں اتر چکا تھا۔

ہم سات دوستوں کا یہ گروپ مختلف جگہوں کی سیاحی میں مشغول تھا دراصل ہماری تقریباً ساری ہی ذمہ داریاں پوری ہو چکی تھیں بچوں کی تعلیم شادیاں اور گھر کی تکمیل اب کچھ حق تو ہماری اپنی خواہشوں کا تھا۔ہم لوگ اپنے پورے گروپ کے ساتھ ہندوستان کے مختلف صوبوں کی سیر کرتے ہوئے اب پاکستان پہنچ چکے تھے جو کہ اب ہمارا نہیں تھا پھر بھی ہمیں اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ویسے ہی لوگ وہی زبان وہی ہنسی۔

ایرپورٹ سے ہوٹل پہنچتے پہنچتے سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے اور ہوٹل پہنچ کر ہم سب اونچی آواز میں اپنی پسند کے شہر دیکھنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔کسی کو کراچی دیکھنا تھا اور کسی کو لاہور دیکھنا تھا۔ کوئی حیدرآباد سندھ دیکھنا چاہتا تھا اور کسی کو ٹکسلا جانے کی پڑی تھی۔

میں نے غور کیا کہ مسز روپا کپور کچھ خاموش سی ہیں ان کی عمر تقریباً پچپن برس کی ہوگی۔وہ ہم سب میں سینیر تھیں ہم سب ان کی عزت کرتے تھے دراصل اس گروپ کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی تھی ہم سب تو بیچ میں آکر ان میں شامل ہوتے گئے۔

میں نے ان سے پوچھا۔''آپ کون سی جگہ دیکھنا چاہتی ہیں؟ روپا جی؟''

''میں پنڈی جانا چاہتی ہوں۔''

''پنڈی کس طرف ہے یہ کوئی چھوٹا شہر ہے یا پھر کوئی گاؤں؟''

وہ میری نادانی پر مسکرائیں اور بولیں

''میرا مطلب ہے راولپنڈی۔جو لوگ یہاں رہتے ہیں وہ اسے پنڈی ہی کہتے ہیں۔

''آپ کو کیسے معلوم کیا آپ پہلے آچکی ہیں۔'' مجھے حیرت سی ہوئی وہ تھوڑی دیر خاموش مجھے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

''میں وہیں پیدا ہوئی ہوں اور وہیں پلی بڑھی ہوں۔'' ان کی آواز بہت نرم اور اداس سی تھی انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ۱۹ برس کی تھیں تب ان کی شادی ہوگئی اور وہ کیرالہ چلی گئیں اب تو ان کی زبان بھی تامل ہوگئی ہے اور وہ کھانے بھی ساؤتھ انڈین ہی بنانے لگی ہیں جیسے کہ وہ وہاں کے مقامی لوگ بولتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ چاہتی تھی کہ ایک بار وہ واپس جائیں۔ اپنا ملک اور گھر دیکھیں اور اب جا کر انہیں یہ موقعہ نصیب ہوا۔

جب ہماری فلائٹ اسلام آباد پہنچی اور ہم سب ایر پورٹ کے باہر آئے تو سردی کی شدّت سے کانپ گئے۔ وہاں ایسی سردی تھیں جیسی کہ کسی ہل اسٹیشن پر ہوتی ہے۔ روپا کپور نے ہمیں بتایا کہ یہ شہر بہت بعد میں بسا ہے۔ یہ شہر تقسیمِ ملک کے وقت نہیں تھا۔ پہاڑیوں کو کاٹ کر بسایا گیا ہے۔ وہاں کی سڑکیں بہت چوڑی تھیں بے حد خوبصورت شاپنگ مال تھے اور بے حد حسین روز گارڈن وہاں کی زینت بڑھا رہے تھے۔ ہم چاہ رہے تھے کہ اسلام آباد میں کچھ دن رک جائیں مگر مسز کپور راولپنڈی جانے کے لئے بے چین تھیں۔ راولپنڈی وہاں سے کافی قریب تھا مگر کوئی جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ میں نے خود ہی یہ فیصلہ کیا کہ مجھے ان کے ساتھ جانا چاہئے۔ وہ بہت پر جوش تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ چالیس برس کے بعد اپنا گھر دیکھیں گی۔ میں نے قریب کی فلاور شاپ سے ایک اچھا سا بکے بنوایا اور ان سے کہا کہ وہ یہ پھول اس گھر کے نئے مالک مکان کو دیں ٹھیک ہے؟ وہ مسکرا دیں مجھے لگا کہ وہ میرے اس خیال سے بہت خوش ہوگئیں۔

جب ہم ٹیکسی لے کر چلے تو مسز روپا ہمیں اک گائیڈ کی طرح راستہ بتا رہی تھیں۔ اک پرانی بلڈنگ کو دیکھ کر انہوں نے بتایا کہ یہ ان کے دوست کنول دھیر کا مکان ہے اور وہ دیوالی منانے یہاں آیا کرتی تھیں۔ پورے راستے وہ مجھے ایک ایک چیز بتا رہی تھیں ایک بہت بڑی زیورات کی دوکان دیکھ کر انہوں نے بتایا کہ یہ بہت چھوٹی سی دوکان تھی ان کے دور کے رشتے دار کی جن کا نام ساگر تھا اور اب شاید یہ ان کے بچے چلا رہے ہوں گے۔ راستے میں ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوئیں۔

''یہ مقبول خان چاچا کی حویلی ہے۔ میں اپنے بچپن میں یہاں بہت کھیلی ہوں بہت بڑا باغ ہے اس حویلی کے پیچھے۔'' وہ اتنی زیادہ خوش تھیں کہ وہ میری طرف دیکھے بغیر ہی ساری باتیں کر رہی تھیں وہ کسی بھی بلڈنگ سے اپنی نظر ایک لمحے کے لئے بھی ہٹانا نہیں چاہتی تھیں شائد وہ یہ سوچ رہی تھیں کہیں یہ منظر پیچھے نہ ہٹ جائے اور وہ دیکھ نہ سکیں ڈرائیور چائے پینے رک گیا تو وہ ٹیکسی سے اتر گئیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر پیدل چلنے لگیں۔ وہ مجھے چپّہ چپّہ دکھا رہی تھی۔

''یہ دیکھو؟'' انہوں نے ایک دو منزلہ بے حد پرانہ سا مکان دکھایا یہ میری سہیلی عارفہ کا مکان ہے ہم اور عارفہ یہاں کھیلتے تھے انہوں نے برابر کے پارک کی طرف اشارہ کیا ایک گھر کے سامنے وہ پھر ٹھہر گئیں۔

''تمہیں پتہ ہے۔؟''وہ میری طرف مڑیں اور اشارے سے بتانے لگیں۔''یہ رتن چاچا کا گھر ہے ایک بار ممانے مجھے کھیر کا پیالہ دے کر ان کے لئے بھیجا تھا......''وہ اک لمحہ رکیں۔

''اچانک اک شخص تیزی سے چاچا کے گھر سے نکلا اور مجھ سے ٹکرا گیا......ساری کی ساری کھیر ......گرم کھیر میرے کپڑوں پر گر گئی۔''

''آپ ان صاحب کو جانتی تھیں......؟''

''نہیں ......اس وقت تو نہیں......وہ مسکرائیں شادی کے بعد اچھی طرح جان گئی ہوں اب وہ میرے شوہر ہیں۔''ہم ہنستے ہوئے اور آگے بڑھ آئے......وہ بتاتی رہیں......''یہ اسپتال ڈیڈی کے دوست عظمت علی چاچا نے بنوایا تھا۔اب تو بہت بڑا ہے پہلے بس ایک چھوٹا سا نرسنگ ہوم تھا۔پتہ نہیں اب اسے کون چلا رہا ہوگا،عظمت چاچا تو بہت ضعیف تھے......شاید انکے بیٹے......یا کوئی اور......"

ڈرائیور گاڑی لے کر پیچھے آ رہا تھا مگر اب وہ ٹیکسی میں بیٹھنے کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر چکی تھیں میں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہی چل رہی تھی......اور اچانک وہ رک گئیں اور میرا ہاتھ بہت زور سے پکڑ لیا۔

''یہاں میرا گھر......''

یہ اک موڑ تھا جہاں پر اچھی خاصی پر رونق مارکٹ تھی بڑی بڑی شاپ،ویڈیو لائبریری اور شاندار ہوٹل چمک رہے تھے۔انہوں نے رک کر چاروں طرف دیکھا ڈرائیور ٹیکسی روک کر اتر آیا تھا۔

''میڈم۔آپ کو یقین ہے یہ ہی وہ جگہ ہے............؟''

''ہاں......ہاں۔مجھے یقین ہے۔میں یہاں پیدا ہوئی ہوں میں نے یہاں اپنی زندگی کے پندرہ برس گزارے ہیں تم یہاں نہیں پیدا ہوئے ہو۔ (انہوں نے ڈرائیور کو جھڑک دیا)۔ میں غلطی کیسے کر سکتی ہوں...........''انہوں نے بے چینی سے ہر طرف دیکھا عمارتوں کے پیچھے جھانکتی رہیں۔انہیں یقین تھا کہ ان کا گھر یہیں پر ہے شاید ان نئی عمارتوں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ان کی حالت اس بچّے کی سی تھی جو دنیا کے میلے میں کہیں کھو گیا ہو......اور اپنا گھر نہ ملنے پر پریشان ہو......وہ حیران حیران سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔اور بڑبڑا رہی تھیں......

''ارے میں اپنا گھر نہیں پہچانوں گی میرا گھر...... پتہ ہے ایک بار برآمدے میں فرش بن رہا تھا...... یہاں پورٹیکو میں......تو میں دوڑتی ہوئی آئی اور سیمنٹ گیلی تھی تو...... گیلی سمینٹ پر میرے پیروں کے نشان بن گئے اور پھر ڈیڈی نے اس کو ٹھیک نہیں کرنے دیا تھا،انہوں نے کہا یہ روپا کا گھر ہے اور روپا کے پیروں کے نشان اس گھر کی پہچان ہیں۔ بالکل انٹرنس پر میرے پیروں کے نشان تھے تم دیکھنا۔''وہ اس نئی بلڈنگ کے باہر بے چین کھڑی تھیں۔

میں نے بڑھ کر چوکیدار سے پوچھا۔ ''یہ ہوٹل کب بنا ہے۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بولا کوئی نو، دس برس ہوگیا جناب۔

''تم یہاں کب سے کام کررہے ہو۔''

''بی بی صاحبہ جب سے یہ پرانی بلڈنگ توڑی جارہی تھی تو میں مزدور تھا پھر یہاں کام مل گیا چوکیدار کا۔'' روپا خاموش رہیں۔ ''کیا یہاں پر کوئی پیلے رنگ کا دومنزلہ مکان تھا......؟''

''جی ہاں یہاں پر اس طرح کی عمارت تھی......کافی پہلے......''

''اور اس کے داخلی دروازے پر پیروں کے نشان بھی تھے؟'' مجھے بھی بہت بے چینی تھی۔

''بی بی صاحب وہ تو ہم نہیں جانتے...... جب وہ عمارت توڑی جارہی تھی تو......''

''چپ رہو......چپ ہوجاؤ۔'' روپا زور سے چلاّئیں اور ٹیکسی میں جاکر پچھلی سیٹ پر گرگئیں۔ چوکیدار حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''وہ میری دوست کا مکان تھا۔ ہم انڈیا سے آئے ہیں'' میں نے اس کی حیرت دور کی اور آہستہ آہستہ ٹیکسی کی طرف بڑھی......وہ رورہی تھیں کانپ رہی تھیں کچھ بول بھی رہی تھیں۔

''......یہ میرا گھر ہے......میرے دادا جی نے بنایا تھا...... یہ میری روح ہے......میرے اپنے سب یہاں پیدا ہوئے یہیں ان کی موت ہوئی یہ زمین یہ پیڑ یہ ہوا یہ پانی یہ سب ہمارا ہے......بس ایک دن کوئی لائن کھینچ دیتا ہے۔ایک۔صرف ایک لائن......ایک سنگل لائن مجھے اجنبی بنادیتی ہے۔ایک لکیر ملک کو کاٹ دیتی ہے......دوملک بنادیتی ہے...... مجھے فارنر بنادیتی ہے میں اپنی ہی زمین پر فارنر ہوگئی، غیر ملکی ہو گئی۔کوئی سمجھ نہیں سکتا میرا دکھ میرا درد......'' آنسوان کے رخسار پر بہہ رہے تھے۔

میں خاموش تھی۔ بالکل خاموش۔ میں نے انہیں تھام لیا تھا وہ کانپ رہی تھیں۔ وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیقراری سے رورہی تھیں۔ میں نے انکو گلے لگایا......میری آنکھیں بھی انکی بے بسی پر بھیگ رہی تھیں۔

اور تب میں نے دیکھا کہ وہ پھول جو میں لے کر آئی تھی میں نے بے خیالی میں روپا کی گود میں رکھ دیئے تھے۔ گھر کی پرانی مالکن کی گود میں پھول مسکرارہے تھے مگر وہ گھر جس کے داخلی دروازے پر ان کے قدموں کے نشان تھے وہ اب نہیں تھا...... کہیں بھی نہیں تھا......!

◀◀ ● ▶▶

Flat No:1, Zakariya Market
Medical Road
Aligarh-202001(U.P)

● نسترن احسن فتیحی

ٹھوکر

دیکھو......سنبھل کر......، آرام سے......، کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ یہ وہ فرمودات تھے جو وہ شعور میں قدم رکھنے کے پہلے سے سن رہا تھا۔شائد اس لئے بھی کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہی اس نے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

وقت بھاگتا رہا اور وہ وقت سے زیادہ تیز خود بھی بھاگتا رہا، اسے بے حد چاہنے والے ماں باپ پاس رہتے یا دور...... ''دیکھو سنبھل کر'' کی بازگشت اس کا پیچھا کرتی، وہ جھنجھلاتا مگر اس کے اطوار نہ بدلتے۔

چار چار سیڑھیاں پھلانگ کر اترنا، اونچائی سے کود جانا، تیز گاڑی چلا کر آفس پہنچنا، سگنل کی قانون شکنی کرنا یا ریلوے پلیٹ فارم پر کبھی بھی اوور برج کا استعمال نہ کر کے ریلوے ٹریک سے کود پھاند کر پلیٹ فارم بدلنا اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ کام میں بھی وہی جلد بازی آج یہ جاب، کل وہ کمپنی......آج اس شہر کل اس شہر......پھر بھی وہ کامیاب ہوتا گیا۔

ماں کی موت کے بعد اس نے کوشش کی کہ والد اس کے ساتھ رہ جائیں مگر وہ نہ مانے۔ اس کے ساتھ یہاں وہاں کرنا ان کے بس کا نہیں تھا۔ بس سمجھانا اب بھی نہ چھوڑا...... کہتے پہلے تمہیں ہماری توجہ کی ضرورت تھی اب مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مگر اسے اتنا سوچنے سمجھنے کی عادت ہی کہاں تھی، اس کی زندگی کی رفتار بے ڈھنگی ہی رہی۔ بیٹے کی محبت میں وہ خود کبھی کبھی آ کر مل جایا کرتے۔ آج بھی آنے والے تھے، بار بار تاکید کی ''......اسٹیشن لینے آجانا، وقت پر آنا میں کمزور ہو گیا ہوں۔ ٹرین سے اترنے میں دقت ہوتی ہے۔ گاڑی تیز مت چلانا......اور وہ اب لینے جا رہا تھا، حسب عادت اسے دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے سگنل کو نظر انداز کرتا، آندھی طوفان کی طرح اسٹیشن پہنچا......ٹرین آچکی تھی اور اب اگلی منزل کی طرف کوچ کے لئے سگنل گرین ہو چکا تھا۔

''اوہ شٹ، بابا......اترے کہ نہیں۔'' پلیٹ فارم پر بہت بھیڑ تھی۔ پھر بھی سب کو دھکے دیتا مطلوبہ ڈبے کی طرف بڑھا۔ کچھ لوگ پلیٹ فارم پر ایک ہی جگہ راستہ روکے جمع تھے اس نے کسی کو دھکا دے کر راستہ بنایا......قدموں کے نیچے ایک پانی پانی کی بوتل لڑھکتی ہوئی آئی وہ مہارت سے اسے پھلانگتا ہوا

نکل گیا نکلتے وقت ان کانپتے ہاتھوں پر نظر پڑی جس سے چھوٹ کر وہ بوتل لڑھک گئی تھی......مگر وہ اس بیمار شخص کوٹھوکر لگنے سے صاف بچا گیا تھا......جلدی نہ ہوتی تو رک جاتا......کوئی مصیبت میں تھا، تماشبیوں نے بھیڑ لگا رکھی تھی مگر اسے اپنے بابا کو لینا تھا وہ ساری ٹرین دیکھ کر مایوسی سے اتر آیا۔شائد اتر کر کہیں اس کا انتظار کررہے ہونگے۔وہ باہر بھاگا......کچھ دیر پہلے جہاں بھیڑ تھی وہ اب تتر بتر ہو چکی تھی، وہاں دو پولیس والے کھڑے تھے،وہ شخص جو جاتے وقت حالت نزاع میں تھا اب اس کی موت ہو چکی تھی اس کے چہرے پر کسی نے تولیہ ڈال دیا تھا......وہ افسوس کے ساتھ وہاں سے گزر گیا......بابا کہاں ہونگے فون کروں...... اس نے رک کر بابا کو فون ملایا گھنٹی بجنے لگی تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''......بابا پک دی فون۔'' رنگ سنتے ہوئے وہ بے چینی سے بدبدایا۔......فون رسیو ہوتے ہی بابا کے بولنے سے پہلے بول اٹھا آپ کہاں ہیں، میں کب سے......''

دوسری طرف سے جو جواب ملا اسے سن کر اس کا چہرہ سفید ہو گیا اس نے ریسور کان میں لگائے ہوئے پلٹ کر دیکھا......پلیٹ فارم پر پڑی ہوئی لاش کے پاس کھڑا ہوا پولس والا بابا کے فون پر اس سے مخاطب تھا وہ لڑکھڑا کر دو قدم بڑھا تو کسی چیز کوٹھوکر لگی، اس نے دیکھا یہ وہی پانی کی بوتل ہے جسے اس وقت اپنی جلد بازی میں وہ پھلانگ کر نکل گیا تھا۔اس نے جھک کر بوتل اٹھائی......ایک کمزور کانپتا ہوا ہاتھ نظروں میں کوندھا......اور اس کے ضمیر پر ایک گہری ٹھوکر مار کر بوتل اس کے کانپتے ہاتھوں سے گرگئی۔

◄◄ ● ►►

M/43, Abul Fazal Enclave
Near Shan e Ilahi Masjid
Jamiya Nagar Okhla
New Delhi 110025

سہ ماہی ندائے ادب (جنوری تا مارچ ۲۰۲۳ء)

مدیر : فہیم بسمل قیمت : ۸۰ روپے

صفحات : ۱۲۲

ملنے کا پتہ

۲۹۰، ایمن زئی، جلال نگر، جاہ جہاں پور، اتر پردیش ۲۴۲۰۰۱ (انڈیا)

ثالث پر تبصرے

● ڈاکٹر شاہد جمیل

’ثالث‘ مونگیر (جلد ۶۔۷، شمارہ ۲۱۔۲۲ جنوری تا جون، ۲۰۲۲) کا ضخیم ’شوکت حیات نمبر‘ ۴۹۶ صفحات پر محیط، چیدہ معیاری تخلیقات سے مزّین ولبریز، صحافتی ہنرمندی کا اعلیٰ نمونہ اور مدیرانِ رسائل کے لئے راہنما بھی ہے۔ گمان اغلب ہے کہ مدیراعلیٰ، اقبال حسن آزاد کی یقین دہانی پر کہ وہ بعد از مرگ اِسی پائے کا نمبر شائع کریں گے، میرے علاوہ کئی اور ادبا وشعرا بھی جامِ فنا نوش کرنے کے لئے آمادہ ہوجائیں گے۔

اقبال حسن آزاد کی سیرت وافعال کا میں زمانِ طالب علمی سے مشاہد وشاہد رہا ہوں۔ موصوف علاّمہ اقبال کے نسخۂ کارگر ’’یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم‘‘ پر عمل پیرا رہے ہیں۔ ہدف مارنے میں وہ ارجن صفت ہیں۔ کتابی سلسلہ ’ثالث‘ اُن کا سوئیٹ ڈریم ہے اور پہلا عشق اور پہلی اولاد سی محبوب تر۔ یہی سبب ہے کہ نو برسوں کے قلیل عرصے میں یہ مقامِ رشک وافتخار تک جا پہنچا اور اپنے ہی سابقہ ریکارڈوں کو توڑتا بھی رہا ہے۔ ’ثالث‘ روزِ اوّل سے رن وے سا ہے کہ اقبال حسن آزاد نے صرف باصلاحیت مبتدیوں کو اونچی اڑان کے مواقع فراہم نہیں کئے بلکہ بیشتر نامور تخلیق کاروں کی عظمتوں اور اُن کی گرانقدر خدمات کا جیتے جی اور بعد از مرگ اعتراف کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ اِس کا بیّن ثبوت، ’گوشۂ شموئل احمد‘، ’گوشۂ حسین الحق‘ اور ’شوکت حیات نمبر‘ ہے۔

علم وآگہی میں غیر معمولی اضافے کرتی اور تشنہ لبی کو سیرابی بخشتیں معیاری تخلیقات کو صرفِ نظر کر کے، ’شوکت حیات نمبر‘ کے سرسری مطالعے کی بنیاد پر تبصرہ یا تجزیہ کرنا کارِ سہل ہے۔ لیکن اِس غیر منصفانہ رویّے سے مشمولات کی حصولیابی کے لئے مدیرانِ رسالہ کی جہد وغوّاصی نیز تخلیق کاروں کی محنتِ شاقّہ کا حق ادا نہیں ہوگا۔ یہ سہل پسندانہ عمل ویسا ہی ہوگا، جیسے کوئی سیّاح تاج محل دیکھ کر کہے: ’’اچھا ہے۔‘‘

شہنشاہِ طنز وظرافت، رضا نقوی واہی نے کسی بسیار نویس مبصّر سے دریافت کیا تھا:

آپ ہر قسم کی کتابوں پر لکھتے رہتے ہیں تبصرہ کیوں کر
وقت اتنا کہاں سے لاتے ہیں جوہرِ فن جویوں دکھاتے ہیں
کرتے ہیں کب مطالعہ حضرت کیسے ملتی ہے اِس قدر فرصت
ہنس کے بولے مطالعہ کیسا پڑھ کر لکھا تو تبصرہ کیسا

افسوس! واہی کے اِس طنز کو بسیار نویسوں نے نسخۂ کارگر سمجھ لیا۔

مطالعے کے معاملے میں میرا رویّہ واضح اور طے شدہ ہے۔ میں کسی تخلیق کو باریک بینی سے پڑھتا ہوں یا نہیں پڑھتا۔ دورانِ تخلیق ویسا ہی محتاط رویّہ اختیار کرتا گویا کائی جمی چٹّانوں پر ننگے پاؤں چل رہا ہوں۔ جملہ سازی کے وقت میں انتخابِ الفاظ کے ساتھ مطمحِ نظر کی ترسیل اور پیرائے بیان پر سخت نظر رکھتا ہوں۔ ماہرِ فن انجینئر کی طرح پیمائش شدہ خاکے پر عمل پیرا نہیں ہوتا بلکہ تخلیق کے فطری بہاؤ کو منطقی انجام تک پہنچنے دیتا ہوں کہ مجھے معلوم ہے، ہر تخلیق کار کے مخصوص و محدود قارئین ہوتے ہیں۔ الحمدللہ! میرے قارئین، صاحبِ نظر اور اہلِ علم و دانش ہیں۔

'شوکت حیات نمبر' کے سنجیدہ قارئین بھی دورانِ مطالعہ محسوس کریں گے کہ شوکت حیات جیسا شخص اور فکشن نگار بننا آسان نہیں اور اقبال حسن آزاد جیسا باصلاحیت، اولعزم اور مہم جو، مدیر بھی کم ملیں گے۔ نیز متحیّر کن دریافت اور نئے انکشافات سے علم و آگہی میں متواتر اضافہ ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے، شوکت حیات کے فن اور شخصیت سے واقفیت اور حصولِ علم و آگہی اور متنوع دریافت و انکشافات سے اپنی زنبیل بھرنے کے لئے قاری کو لازمی طور پر مشمولاتِ رسالہ کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا ہوگا۔

'اداریہ'' خلافِ توقع غیر متاثر کن ہے۔ لگتا ہے، مسودے کو پریس کے حوالے کرنے سے قبل اِسے عجلت میں تحریر کیا گیا اور لوٹتی برات کے چھوٹے سامان کی طرح مہیّا کرا دیا گیا ہے۔ آفتاب عالم اطہر گیاوی اور غلام مجتبیٰ مہر کی حمد و نعت بھی روایتی ہیں۔ 'کوائف' دراصل شوکت حیات نمبر کا آغازیہ ہے۔ اِس کے تحت ادارہ نے شوکت حیات سے متعلقہ کوائف کو پیش کیا ہے۔

'مضامین' کے تحت حسن و سلیقے سے کل انیس مضامین شامل کئے گئے ہیں، جن میں پروفیسر وہاب اشرفی کے مضمون 'شوکت حیات کی افسانہ نگاری' کو شرفِ اوّلیت بخشا گیا ہے۔ یہ مضمون، جویائے علم و آگہی کی تشنگی اور طلب کو سیرابی بخشتا ہے۔ ایسا نہیں لگتا کہ یہ مضمون شوکت حیات نے جبراً لکھوایا ہے یا شوکت حیات کے آتنک سے خوفزدہ ہو کر موصوف نے گلوخلاصی کے لئے اِسے لکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مضمون نہیں بلکہ ایک معتبر صاحبِ نظر ناقد کا اپنے ہم عصر منفرد و ممتاز افسانہ نگار، شوکت حیات کے فنّی محاسن کا کھلے دل سے یہ اعتراف ہے کہ

''دراصل شوکت حیات ایک Protest کے فنکار ہیں۔ جن کے یہاں ناہمواریوں کے خلاف مسلسل جدوجہد ملتی ہے۔ صرف گلہ نہیں ملتا بلکہ ان سے ٹکرانے کا عزم بھی ملتا ہے......شوکت حیات کے افسانے فکری اور فنّی افسانے کے ارتقاعی کیفیت کی مثالیں ہیں۔ جن میں زندگی کی دھڑکنیں ہر جگہ محسوس کی جاسکتی ہیں۔ ایک انقلابی ذہن میں کیسی تخلیقی روشنی پیدا ہوسکتی ہے اس کا ایک مکمل منظرنامہ شوکت حیات

کے افسانے ہیں......اردو افسانے کی مجموعی تاریخ میں ان کی جگہ معتبر بھی ہے اور محفوظ بھی۔''

موصوف نے شوکت حیات کے مشہورِ زمانہ افسانے 'گنبد کے کبوتر'، 'سرپٹ گھوڑا'، 'بانگ'، 'شکنجہ'، 'کوبڑ'، 'مسٹر گلیڈ'، 'پھسنڈا' اور 'پاؤں' کا عمدہ تجزیہ اور سچوئیشن سیریز کے افسانوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ بالترتیب 'گنبد کے کبوتر' اور 'سرپٹ گھوڑا' کا تجزیہ ملاحظہ کیجئے:

''(گنبد کے کبوتر کا) بنیادی Theme اس کی شہادت کے بعد بسیرا کرنے والے کبوتروں کا ہے جو شام کے وقت لوٹتے ہیں تو ان کا آشیانہ موجود نہیں ہوتا...... کبوتروں اور مسلمانوں کو یکجا کیجئے تو افسانے کی قماش، نہج اور اثر پذیری ازخود نمایاں ہو جائے گی......ان (شوکت حیات) کا خلاقانہ ذہن اپنے اردگرد پھیلے ہوئے مسائل کو نہ صرف سمجھنے کی کوشش کرتا بلکہ انہیں فکر و فن کی راہ دے کر تخلیقی Vision میں مبدّل کرنا بھی جانتا ہے۔''

''......ایک افسانہ ہے ''سرپٹ گھوڑا'' اسے ناولٹ بھی کہہ سکتے ہیں......اس کا تناظر ہندستان کے وہ عوام ہیں جن کے مقدّر میں سکون نہیں......آج کی تیز رفتار زندگی میں عام شہری کن مراحل سے گزر رہا ہے اس کا آئینہ خانہ ''سرپٹ گھوڑا'' ہے.....شوکت حیات اپنے اس طویل افسانے میں بھی اپنے فن کو قربان نہیں کرتے۔ یہ ان کا ایسا وصف ہے جو بہت کم ان کے معاصرین کے حصّے میں آیا ہے۔''

وارث علوی نے اپنے مضمون (دیباچہ) 'شوکت حیات کی افسانہ نگاری' میں سچ کہا ہے کہ ''شوکت حیات آدمی ذرا ترنگی بھی ہیں اور ضدّی بھی۔ اب وہ افسانے شائع کرانے پر راضی ہو گئے تو بضد ہیں کہ پہلے مجموعے کا دیباچہ خاکسار لکھے...... چنانچہ دیباچہ کو ہی لبیک کہنے میں عافیت نظر آئی۔''

وارث علوی کا یہ پُر خلوص اور بیحد معلوماتی دیباچہ شوکت حیات کی سیرت و فن پر تحریر کردہ فن پارہ اور ایک جیّد اہلِ علم و دانش کا عطا کردہ تصدیق نامہ ہے:

''شوکت حیات کا نام ۷۰ کی دہائی میں نمایاں ہے......شوکت حیات ان جیالے لوگوں میں سے ہیں جو نہ کسی نقاد کی توجہ کی پروا کرتے ہیں نہ دوسروں کی بخشی ہوئی بیساکھیوں پر راہِ ادب طے کرتے ہیں۔ وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور اپنے اظہار و بیان کے طریقے آپ ہی ایجاد کرتے ہیں......شوکت حیات کو زبان و بیان پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ ان کے معمولی افسانوں میں بھی یہ حسن برقرار رہتا ہے......ان کا افسانہ 'گنبد کے کبوتر' اردو کے چند بہترین افسانوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ بلکہ شاہ کار کا درجہ رکھتا ہے...... شوکت حیات کے یہاں نئے تجربات اور اجتہادات میں دلچسپی ہے لیکن پابستگی نہیں۔ اِسی لئے ان کے یہاں ایک ہی رنگ کے افسانے نہیں ملتے۔ ان کے افسانوں میں موضوع اور طرزِ بیان کا کافی تنوع

ہے...... یہ حقیقت ہے کہ شوکت حیات کے اچھے افسانے کرداروں کی انفرادیت، فضا بندی اور پلاٹ کی نہایت نازک پیچیدگیوں کے حامل ہیں۔''

یہ دیباچہ عمدہ، مختصر، جامع اور چشم کشا ہے۔

فاروق ارگلی اپنے مضمون 'شوکت حیات کا فن' میں ایک وسیع عصری پس منظر میں شوکت حیات کی سیرت اور فن پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ان کے افسانوں بالخصوص 'بھائی'، 'سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'، 'رانی باغ' اور 'مادھو' وغیرہ کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ دیکھئے:

''شوکت حیات کے افسانے عصر حاضر کے ایسے افسانوں کی داغ بیل ڈالتے ہیں جو بیک وقت عصری اور آفاقی افسانوں کے آمیزے اور اختصاص و انفراد سے مملو ہیں۔ وقت، سماج، روایت، سیاست، نفسیات، ثقافت اور فکر کی جکڑ بندیوں کو جھیلتے ہوئے افسانوں کی تصویر کشی جس دردمندی کے ساتھ شوکت حیات کے یہاں ملتی ہے، دوسروں کے یہاں نہیں ملتی......شوکت حیات اردو افسانے کے عصری منظر نامے پر کسی اتباع و تقلید کے بغیر اپنی نجی رنگ و آہنگ کے ساتھ نظر آئے......شوکت حیات کی چند ایک کو چھوڑ کر ہر تخلیق ان کی فکری و فنّی خصوصیات سے آراستہ ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ شوکت حیات نے اب تک جو بھی لکھا پوری ذمّہ داری سے اور چھان پھٹک کر اپنے اسلوب، معیار اور تخصص کو برقرار رکھنے کی کوشش کے ساتھ لکھا ہے اور اپنے مرتبے پر حرف نہیں آنے دیا ہے...... عشق و محبت اور عورت و مرد کے جسمانی رشتوں کے حوالے سے بھی ان کے یہاں دل کو چھو لینے والی کہانیاں موجود ہیں......ڈراما اور ناٹک سے تعلق زمانۂ طالب علمی سے رہا ہے، کئی ڈرامے لکھے بھی ہیں، اداکاری کی اور سوتر دھار بھی بنے، ان کے ناٹکوں 'گانے کا بخار'، 'اندھے کا سپنا'، 'پنکھے والا'، 'گنبد کے کبوتر' اور 'داماد کا چناؤ' بہت پسند کئے گئے۔ یہ مضمون بیحد معلوماتی اور داد طلب ہے۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی نے اپنے مضمون 'شوکت حیات کے افسانے' میں اُن کے افسانے 'مسٹر گلیڈ'، 'چیخیں'، 'بھائی'، 'گنبد کے کبوتر' اور 'پھسینڈا' کا بہترین تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے کہ ''وہ (شوکت حیات) سکّہ رائج الوقت تحریکات و رجحانات کے کبھی زیر اثر نہیں رہے نہ نام نہاد ترقّی پسندی کی چکا چوند میں ان کی آنکھیں خیرہ ہوئیں، نہ جدیدیت کی داخلیت میں گم ہوئے نہ مابعد جدیدیت کی فارمولہ بازی کے چکّر میں پڑے......شوکت حیات نے اپنے ادر گرد کے واقعات اور سانحات کو جس خوبی اور فنکاری سے پیش کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ان کے یہاں ماجرا نگاری، پلاٹ، جاندار کردار سبھی کچھ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کے افسانے محض واقعات کی کھتونی نہیں ہیں۔ انہوں نے جس باریکی سے واقعات کی پرتوں کو کھولا ہے، جس جزئیات نگاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سماج کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا ہے وہ ان

کا کمال ہے۔'' یہ اعتراف، ایک معتبر ہم عصر دانشور کا ہے۔

پروفیسر صفدر امام قادری نے اپنے مضمون 'شوکت حیات کا ناول/ ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'': ایک تنقیدی جائزہ' میں ناول/ نالٹ کا جائزہ انتہائی باریک بینی سے لیا ہے۔ موصوف کا ایک بڑا اختصاص یہ ہے کہ وہ موضوع کا حق ادا کرتے اور اپنے مفروضے، دلائل اور نتیجے سے قاری کو نہ صرف چونکاتے بلکہ اُنھیں قائل کرتے اور مکمل قرآت کے لئے مجبور بھی کردیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

''شوکت حیات فکری اعتبار سے احتجاج کے فنکار ہیں اور اُن کی اکثر تحریریں اختلاف، مزاحمت سے شروع ہو کر انقلاب کی دھمک تک پہنچتی ہیں۔ شوکت حیات ستّر کی دہائی کے افسانہ نگاروں میں اپنی تخلیقی بوقلمونی اور تکنیکی اعتبار سے چاق و چوبند ہونے کے سبب کم از کم چار دہائیوں سے اردو افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں قائم رہے۔ 'سرپٹ گھوڑا' جدیدیت کے زور تھم جانے اور استعاراتی اسلوب بیان کے عہدِ شباب کے بعد کی تحریر ہے۔ اسے ناولٹ کے طور پر پیش کرنے کے ارادے سے ہرچند کہ انھوں نے نظر ثانی کی تھی۔ 'سرپٹ گھوڑا' جیسے قصے کو سیاسی اور سماجی واقعہ نگاری کی معاونت سے ایک اچھی خاصی ضخامت کا ناول نہیں بنایا بلکہ بنیادی قصے کو اُسی قدر پھیلنے کے لئے راستہ دیا جس قدر فطری طور پر گنجائشیں تھیں۔ یہی سبب ہے کہ 'سرپٹ گھوڑا' کی نظر ثانی کے باوجود بنیادی حیثیت ناولٹ کی ہی رہی۔ 'سرپٹ گھوڑا' میں شوکت حیات نے ناول نگاری کے تمام لوازم شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ، سیاست، سماجیات کے ساتھ جنس، فرقہ واریت اور ٹریڈ یونین کے بہت سارے مناظر اس میں شامل کر کے پلاٹ کو استحکام دیا گیا ہے۔ یہ ناولٹ متوقع خدشات اور اُس سے پیدا شدہ مسائل کی کہانی ہے۔ یہ ناولٹ ملک کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کی پیشکش اور ذہنی تبدیلیوں کا مرقع تو ہے مگر اِسے سیدھے طور پر تسلیم کرنے کا کوئی رویّہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ 'سرپٹ گھوڑا' اصل میں زندگی کی قوت ہے۔ ہار اور جیت، دوڑ اور بھاگ، سب سے ہم آخر پائیں گے کیا؟ اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ ناول اپنی زندگی کی ہار اور جیت کی کہانی ہے۔ شوکت حیات نے واقعی حیاتِ انسانی کا نوحہ اس ناول کے چند صفحات میں سمو دیا ہے۔'' صفدر امام کے تجزیئے کا نچوڑ یہ ہے: ''شوکت حیات ناول کی حد تک مشاق نہیں کہے جاسکتے۔''

شوکت حیات کے بہی خواہ، ہم عصر منفرد و ممتاز افسانہ نگار اور صحافی، ڈاکٹر سیّد احمد قادری اپنے مضمون 'شوکت حیات اور ان کے افسانے' میں رقمطراز ہیں:

''شوکت حیات کا پہلا افسانہ 'بکسوں سے دبا آدمی' عابد سہیل لکھنؤ کے مشہور زمانہ رسالہ 'کتاب' میں ۱۹۷۰ء کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ شوکت حیات کا شمار ان خوش نصیب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جن کے ذکر کے بغیر ان کے عہد کی افسانہ نگاری کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں ہوا۔ ۱۹۷۰ کے بعد کی دہائی کے

کئی افسانہ نگاروں میں ایک تثلیث شوکت حیات، شفق اور حسین الحق کی ہوا کرتی تھی۔شوکت حیات پر خصوصی گوشہ کلام حیدری صاحب نے ۱۹۷۱ کے ۲۱۔۲۲ کے شمارے پیش کیا تھا۔اس خصوصی گوشہ کی اشاعت کے بعد تو شوکت حیات کی شہرت کو پر لگ گئے۔ میں اپنے ہفتہ وار اخبار 'بودھ دھرتی' میں مختلف شخصیات پر گوشے شائع کر رہا تھا۔شوکت حیات نے مجھ سے اپنا گوشہ نکالنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ سرورق پر ان کے شاندار اسکیچ کے ساتھ ''ایک شمارہ شوکت حیات کے نام'' ۱۴/ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو شائع کیا۔شوکت حیات نے زندگی کے نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور شدّت سے محسوس کیا ہے۔ مطالعہ کی گہرائی، مشاہدے کی وسعت اور تجربات کی تپش نے ان کے بیشتر افسانوں میں حیات و کائنات کی جدّت طرزی اور فنکارانہ حسن کی آمیزش سے افکار و اظہار کا شاہکار بنانے کی کوشش کی ہے۔شوکت حیات نے افسانوی ادب میں اپنی ایک خاص شناخت بنائی ہے جو ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔''

سیّد احمد قادری نے شوکت حیات کے کئی افسانوں پر گفتگو کی ہے اور نامور ناقد، شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک اقتباس درج کرتے ہوئے اپنا ریمارکس بھی پیش کیا ہے:

''اُن (شوکت حیات) کے یہاں جو خاص بات مجھے نظر آئی وہ یہ ہے کہ ان کی کہانیاں صرف سماجی شعور کا ہی پتہ نہیں دیتیں بلکہ ان کے یہاں 'سماجی ضمیر' کو پوری گہرائی کے ساتھ گرفت میں لینے کا رجحان بھی ملتا ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی نے شوکت حیات کے کس یا کن افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ رائے قائم کی تھی اس بات کا اندازہ نہیں ہوسکا۔اس (گنبد کے کبوتر) افسانے میں سماجی ضمیر کے احساسات کے ساتھ ساتھ اپنی گہری سیاسی بصیرت کا بھی احساس کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔'' اِسی مضمون کا ایک پیراگراف (جس کا آغاز یہ ''شوکت حیات کی خواہش تھی کہ......') ایسا بھی ہے جس میں خاکہ کا فلیور ہے۔ یہ خاکہ آمیز مضمون بیحد معلوماتی، چشم کشا، دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اپنے مضمون 'شوکت حیات کے افسانوی اختصاص' میں شوکت حیات کے افسانے 'بھائی'، 'تفتیش'، 'سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'، 'گنبد کے کبوتر'، 'پھسینڈا'، 'گھونسلا'، 'شکنجہ'، 'مسٹر گلیڈ'، 'قرارداد'، 'اپنا گوشت'، 'رحمت صاحب' اور 'کوبڑ' وغیرہ پر بہترین گفتگو کی ہے۔موصوف کا یہ خیال ہے کہ ''شوکت حیات افسانوی ادب میں ''اکہانی'' کی آواز بلند کرتے ہوئے ساتویں دہائی میں داخل ہوئے۔ یہ اینٹی اسٹوری لکھنے کی تحریک تھی جس کے ڈانڈے بلراج مینرا کی ''کمپوزیشن'' سیریز اور سریندر پرکاش کے ''تلقارمس'' سے ملتے تھے۔شوکت حیات نے بھی ایسی کہانیاں بڑی تعداد میں لکھیں۔مگر ان کی شناخت احتجاج پر مبنی افسانے ''بانگ'' سے قائم ہوئی۔لہٰذا ''بانگ'' شوکت حیات کے ساتھ ساتھ اردو

افسانے کا بھی Turning of Piont ثابت ہوا۔'' یہ مضمون شہاب ظفر اعظمی کے علم و دانش اور عمدہ طرزِ اظہار کا عکّاس ہے۔

ڈاکٹر صغیر افراہیم نے اپنے مضمون ''گنبد کے کبوتر'' تہذیب کی مسماری کا استعارہ' میں 'گنبد کے کبوتر' کا خصوصی جائزہ لیتے ہوئے کئی دیگر افسانوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ موصوف نے سچ کہا ہے کہ ''اس (گنبد کے کبوتر) مجموعے کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی رسالوں میں بکھرے ہوئے افسانوں کی بنیاد پر تقریباً تمام ناقدینِ فکشن نے ان کے فکری اور فنّی رجحانات پر بھرپور توجہ دی۔ ۱۹۷۰ کے بعد بیانیہ کی واپسی پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس لحاظ سے شوکت حیات کے یہاں بیانیہ اپنی مانوس شکل میں واپس آیا۔ سرپٹ گھوڑا، پھسینڈا، تفتیش، بلی کا بچہ، سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، اپنا گوشت، بانگ، پاؤں، چیخیں، مادھو اور گنبد کے کبوتر اپنے مخصوص طرزِ بیان کے اعتبار سے شوکت حیات کے کامیاب افسانے ہیں۔''

ضغیر افراہیم نے 'گنبد کے کبوتر' کے جائزے کا آغاز یہ شوکت حیات کے ہم عصر منفرد و ممتاز فکشن نگار، انیس رفیع کے اِن خیالات کو بنایا ہے:

''شوکت حیات کی کہانی، گنبد کے کبوتر'' میں تعبیر کی کئی جہتیں ہیں۔ ہر جہت اپنی الگ معنویت رکھتی ہے۔ تہہ دار کہانی کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ امکانات کے مختلف پہلوؤں کو کھنگالا جا سکے، معنویت کے اضافے کیے جا سکیں۔ گنبد کے ساتھ کبوتر ایک مخصوص کمیونٹی کی پہچان فراہم کرتا ہے، جو دیگر موجود ملّتوں کے درمیان اپنے تشخص کی سلامیت کی خاطر اسٹیٹ آف کونفرنٹیشن Confrontation of State میں ہے۔''

موصوف نے 'گنبد کے کبوتر' کے عالمانہ جائزے کا نچوڑ یہ نکالا ہے کہ ''شوکت حیات کی یہ (گنبد کے کبوتر) کہانی داخلی زندگی پر خارجی اثرات کی نمایاں مثال ہے۔ افسانہ نگار نے پورے اعتماد اور آگہی سے فرد اور معاشرے کے مظاہر کو خوبصورت اشاروں میں متشکل کیا ہے۔ اسی لئے اس کہانی میں استعاروں اور علامتوں کے ساتھ ساتھ ایمائیت اور منظری ربط بھی موجود ہے۔'' صغیر افراہیم نے اِس کے علاوہ افسانہ 'پاؤں' اور 'چیخیں' کا بھی چشم کشا تجزیہ کیا ہے۔ یہ مضمون قابلِ مطالعہ اور داد طلب ہے۔

ڈاکٹر سیّد اشہد کریم کا مضمون 'شوکت حیات اور ''گنبد کے کبوتر''، ڈاکٹر حامد علی خاں کا 'شوکت حیات کا فن'، ڈاکٹر منصور خوشتر کا 'شوکت حیات اردو افسانے کی منفرد آواز'، ڈاکٹر صالحہ صدیقی کا 'حیات اردو افسانہ: شوکت حیات کا فکری و فنّی مطالعہ'، عرفان رشید کا 'شوکت حیات: صداقتوں کا کہانی کار'، ڈاکٹر قسیم اختر کا 'شوکت حیات کے افسانوں کا اختصاصی پہلو'، ایم خالد فیاض کا 'سن ستّری افسانے کا قضیہ اور شوکت حیات کے نظریات'، ڈاکٹر زرنگار یاسمین کا 'شوکت حیات کے امتیازات'، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ کا 'شوکت حیات

اردو افسانے کا سنگ میل'، ڈاکٹر گلاب سنگھ کا 'شوکت حیات کے افسانوں میں سانس لیتی سچائیاں' اور ڈاکٹر نزہت پروین کا مضمون 'شوکت حیات کے افسانے' معلوماتی، چشم کشا اور ناقدین کے اپنے اپنے علم و آگہی کے عکّاس ہیں۔ کاش! اتنی گنجائش ہوتی کہ میں ان مضامین پر بھی دو چار جملوں میں اظہارِ خیال کر پاتا۔

'خاکے' کالم کے تحت منفرد خاکہ نگار، مشتاق احمد نوری کا خاکہ 'افسانے کا سکندر: شوکت حیات' کو بھی شرفِ اوّلیت حاصل ہے۔ یہ خاکہ بیحد معلوماتی اور دلچسپ تو ہے ہی اِس کا اندازِ بیان بھی شگفتہ و دلکش ہے۔ دورانِ مطالعہ مجھے ایسا لگا، گویا میں خاکہ پڑھ نہیں رہا بلکہ خاکہ نگار کی بنائی ڈاکومنٹری فلم دیکھ رہا ہوں۔ یہی اس خاکے کا اختصاص و انفراد ہے۔ خاکے کی قرآت میں افسانے سا لطف ملتا اور اختتام بھی افسانے سا ہے۔ پیش کردہ بعض واقعات کا میں چشم دید گواہ بھی ہوں۔ موصوف نے شوکت حیات کی متحرّک و شاندار سیرت سازی کی ہے:

''وہ خود کو انا میت کا امام سمجھتا تھا اور جب بھی جدید فکشن پر گفتگو کرتا تو اپنے سامنے آئینہ رکھ لیتا خود کے علاوہ اُسے کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے ہم عصروں کو پڑھتا ہی نہ تھا۔ وہ اپنے سحر میں مبتلا تھا اور حد درجہ نرگسیت کا شکار تھا۔ ایسے لوگ سماج سے کٹ کر تنہا ہو جاتے ہیں اور بعد میں احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شوکت کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُسے نہ خود پر اعتماد تھا اور نہ دوسروں پر بھروسہ۔ اُسے کچھ بھی کہیں وہ معصومیت سے سنتا۔ یہ الگ بات کہ وہ کرتا وہی جو اُس کے من میں آتا۔ محفلوں میں اپنی بے ربط گفتگو اور فلوٹنگ ریمارکس سے دوست کھوتا گیا اور اُس کے بہی خواہوں کی فہرست کم ہونے لگی۔ رات اچانک شوکت حیات کو دورہ پڑا۔ وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ بھابھی دوڑی آئیں جب تک مددگار آتے افسانے کا سکندر پوری دنیا فتح کر کے آخرت کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ نظر گھمائی تو مشکل سے آٹھ دس آدمی موجود تھے۔ سکندر حیات جسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ آخری سفر میں موجود تھا۔'' خاکہ نگار نے شوکت حیات کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے کہ ''جدیدیت کے دور میں پورے ہندوستان میں شوکت حیات جدیدیت کا امام سمجھا جاتا تھا وہ فکشن کا سکۂ رائج الوقت تھا۔ اکیسویں صدی میں شوکت نے بہت کم لکھا۔''

شوکت حیات کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کے ساتھ اگر چند مثبت خصائص کا بھی ذکر کیا جاتا، تب شوکت حیات کی مکمل شبیہ اُبھرتی کہ انسان خیر و شر کا آمیزہ ہے۔ شوکت حیات کی مہمان نوازی، صاف گوئی اور اپنی بیماری کے اظہار و اعتراف سے متعلقہ متعدّد واقعات اور باتیں میرے ذہن میں از خود مجسّم و متحرّک ہو گئیں۔

ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ نامور فکشن نگار، عبدالصمد کا خاکہ 'وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی' ایک منفرد و ممتاز خاکہ نگار کا، اپنے ہم عصر، شوکت حیات کی شخصیت اور اُن کے افسانوں کے فنّی محاسن کا عکّاس و اعتراف ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر عبدالصمد یہ خاکہ شوکت حیات کی زندگی میں

شائع کروا دیتے،تب شوکت حیات مقروض کی طرح حیلے بہانے سے ملک الموت کے تقاضے کوٹالتے رہتے اور کسی پروگرام میں جب شوکت حیات کا عبدالصمد سے آمنا سامنا ہو جاتا،تب وہ لپک کراُن کے سینے سے لپٹ کے کہتے: ’’بھیوا! میرا سچّا دوست نکلا۔ کچھ لوگ نہیں چاہتے تھے،عبدالصمد سے مل کر رہوں۔ اِسی لئے مجھے بہکایا اور تمھارے خلاف کر دیا تھا۔ پہلے جو کچھ کہا، وہ بہکاوے میں کہا تھا۔ بھیوا! آج سے یاری پکّی۔‘‘
عبدالصمد کا طرزِ بیان ملاحظہ کیجئے:

’’بلا شبہ وہ (شوکت حیات) ایک بہت ذہین اور فعال افسانہ نگار تھا جس نے اپنی ذہانت اور شعور کی بالیدگی کے سبب چند بہت اچھے افسانے لکھے جو دوسروں کے لئے قابلِ رشک بن گئے۔ شوکت حیات کو اگر طرح طرح کے بھرم نہ گھیر لیتے تو وہ یقیناً وہاں سے بہت آگے جاتا، جہاں وہ تقریباً ٹھہر سا گیا تھا۔اس کے مزاج کی اضطرابیت اور اپنے سمیت سبھی لوگوں پر عدم اعتماد نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔شوکت حیات کی ایک کمزوری یہ تھی کہ اسے بہکانا، ورغلانا بہت آسان تھا،خاص کر ذاتی معاملوں میں وہ کان کا خاصا کچّا تھا۔ دوسروں پر اعتماد کھوتے کھوتے اس نے خود پر بھی اپنا اعتماد کھو دیا تھا۔ اپنے ہم عصروں میں زبان و بیان کے معاملے میں اس کی حیثیت مسلّم ہے۔موضوع کے سلسلے میں وہ بہت محتاط تھا۔ اس کے لکھنے کی رفتار بہت تیز نہیں تھی۔شوکت حیات کو بڑا شوق تھا کہ لوگ اس کی افسانہ نگاری پر مضامین لکھیں۔ وہ ہر کس و ناکس سے اس کی فرمائش کرتا تھا۔اس نے کم لکھا مگر اچھا لکھا۔ اگر اس نے اپنے مزاج، اپنی بعض تحریروں اور غیر ضروری طور پر بول پڑنے کی عادت پر قابو رکھا ہوتا تو وہ اس مقام تک ضرور جا پہنچتا جس کا وہ مستحق تھا۔شوکت حیات بلاشبہ ایک بڑا افسانہ نگار تھا۔ زندگی میں تو اس کی قدر نہیں ہوئی،مگر آنے والی نسلوں پر اس کا قرض ہمیشہ باقی رہے گا۔ وہ ایک مکمل انسان تھا۔ جہاں اس کے اندر کچھ کمزوریاں تھیں وہاں اچھائیوں کا ایک بھر مار اس کے اندر موجود تھا۔‘‘ یہ خاکہ داد وتحسین کا مستحق ہے۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی کا خاکہ ’شوکت حیات‘ وہ دیباچہ ہے، جسے شوکت حیات کے غیر مرتب افسانوں کے مجموعے کے لئے تحریر کیا گیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ یہ شطرنج کے گھوڑے کی طرح فقط ڈھائی قدم چلا۔موصوف نے بھی شطرنج کے کھلاڑی سا ایسی چال چلی کہ شوکت حیات کے شخصی خصائص وخصائل اور اُن کے افسانوں کے فنّی محاسن ڈیڑھ صفحات میں سما گئے: ’’بلاشبہ ان (شوکت حیات) کا فن سن ستّر سے ہی پنپنا شروع ہو گیا تھا جس کا نقطۂ عروج ’گنبد کے کبوتر‘ ہے جو آجکل میں شائع ہوا اور ’کتھا ایوارڈ‘ سے نوازا گیا۔ مجموعہ ’گنبد کے کبوتر‘......ان کا نقطۂ عروج تھا اور یہی ان کی فکر وفن کا نقطۂ انجماد بھی۔ان کی بہت ساری خوبیوں اور خرابیوں میں ایک بات یہ تھی کہ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے وہ ببانگ دہل اس کا اظہار بھی کرتے

تھے۔ جب میرے اداریہ لکھنے پر پابندی لگادی گئی تو قارئین آجکل نے دہلی سے لے کر پٹنہ تک اس کے خلاف احتجاج کیا۔ایک احتجاجی محفل۔ میں شوکت حیات نے اپنے روایتی انداز میں زور دیتے ہوئے اپنی بات کہی کہ اداریہ لکھنا ایک ایڈیٹر کا بنیادی حق ہوتا ہے اور اس سے اتفاق یا اختلاف قارئین کا حق۔''

غضنفر کا خاکہ 'ساز بوالعجبی کا تارِحیات' کا ایک بڑا اختصاص یہ ہے کہ منفرد و ممتاز فکشن نگار، غضنفر حسبِ معمول شعوری طور پر اپنے مخصوص طرزِ بیان سے قارئین کو مسحور و متاثر بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے، موصوف نے آتش لکھنوی کے اِس قول کو پیکر عطا کرنے کا ٹھان لیا ہو:

''بندشِ الفاظ جڑنے میں نگوں سے کم نہیں''

یہی سبب ہے کہ جملہ سازی، فضابندی، ماحول آفرینی اور سیرت سازی میں موصوف کا انفراد قابلِ داد و تحسین ہے:''......ایک مخصوص محفل میں پروفیسر گوپی چند نارنگ پر اپنا خاکا ''نارنگ کے نورنگ'' پیش کیا۔خاکا کے ختم ہوتے ہی وہ شخص نہایت مضطربانہ لہجے میں بول پڑا۔''باپ رے باپ! اتنی مبالغہ آمیز تعریف! تم تو بدنام ہوجاؤ گے۔'' لیکن جواب میں جیسے ہی اس نے میرا یہ جملہ سنا ''میں نے سوچا تھا کہ نارنگ صاحب کے بعد اسی اسٹائل میں آپ کا بھی خاکا قلم بند کروں گا مگر اب جب کہ آپ کو میرا یہ انداز ہی پسند نہیں تو نہیں لکھوں گا۔'' تو اس کا اضطراب یکا یک پر سکون ہوگیا اور وہ جھٹ سے بول پڑا۔''نہیں نہیں بابو! تمھارا یہ انداز بہت اچھا ہے۔ بہت ہی پیارا ہے، بہت ہی سچا ہے۔ پہلے والا جملہ تو میرے منہ سے حسد سے نکل گیا تھا مگر اب جو میں بول رہا ہوں یہ سب کچھ رشک سے باہر آ رہا ہے۔خدا کی قسم کھا کر کہو کہ میرے خاکے تک تم اس انداز کو ترک نہیں کرو گے۔'' مجھے معلوم نہیں کہ اِس شاندار خاکے کو شوکت حیات نے پڑھا، خوش ہوئے اور دعائیں دیں یا غضنفر نے بعد از مرگ ایفائے عہد کیا ہے۔ جملہ سازی ملاحظہ کیجئے:''پتا نہیں اس (شوکت حیات) فکشن نگار نے اپنی بیوی کے کان میں کون سا فسوں پھونکا ہے یا اسے کس الّو کا 'گوشت' کھلایا ہے کہ شوہر سے محبت کرنے میں اس نے میدانِ عاشقی میں اترنے والے نوخیز عاشقوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے اور شوہر پریم اور پتی بھگتی میں ارشاد پروین سے میرا بائی بن گئی۔''

آخر میں غضنفر نے کھلے دل سے یہ اعتراف بھی کیا ہے:''متضاد معانی سے مزّین ذات، متلون مزاجی صفات، سرد و گرم کیفیات اور پیچیدگیوں سے پُر نفسیات والا یہ شوکت حیات اپنے لئے چاہے جو ثابت ہو، ہمارے لئے تو باعثِ لطف و انبساط ہے کہ اسے دیکھ کر سن کر اور پڑھ کر ہمارے سازِ حیات اور تارِ احساسات جھنجھنا اور گنگنا اٹھتے ہیں۔''

'شوکت حیات...... کچھ یادیں...... کچھ باتیں' ڈاکٹر منظر اعجاز کا آٹھ صفحات پر محیط خاکہ ہے،

جس میں شوکت حیات کے بشری خصائص وخصائل کے ساتھ حصولِ علم کی غیر معمولی طلب کو مخصوص زاویے سے اور ایسے لب و لہجے میں بیان کیا گیا ہے کہ موصوف کی سیرت کے منفی پہلو گومڑ کی طرح نمایاں ہو گئے اور ُان کی عظمت کو گہن لگ گیا: ''بہار اردو اکادمی میں بلراج کومل کا سہ روزہ توسیعی خطبہ چل رہا تھا۔ بلراج کومل نے اپنے خطبے میں شموئل احمد اور شوکت حیات وغیرہ کے افسانوں کا ذکر تعریفی انداز میں کیا۔ اس کے بعد صدارتی خطبے کی باری آئی تو وہاب اشرفی......خطبہ دینا شروع کیا......شوکت حیات سامعین کے مجمعے سے اٹھے اور بڑے ہی جارحانہ انداز میں بولے۔''وہاب بھائی! میں آپ کو نقاد مانتا ہی نہیں ہوں۔" ابرار رحمانی نے آجکل کے ان شماروں کے اداریے پڑھ کر سنائے جن کے حوالے سے ان کے خلاف شکایات درج کرائی گئی تھیں۔ وہاب صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں ابرار رحمانی کو مشورہ دیا کہ......کسی بھی طرح کے تنازع سے بچنا چاہیے۔ نشست برخاست ہوئی۔ شوکت حیات اچانک قدرے بلند آواز میں بول پڑے۔

''کیسے ہیں وہاب بھائی؟''

''کیا پوچھتے ہیں کیسے ہیں۔ ہر روز جیتے ہیں، ہر روز مرتے ہیں۔'' وہاب صاحب نے جواب دیا۔ لیکن دو چار لمحے کے توقف میں ہی ان کے تیور کچھ اور تھے۔ وہ رک گئے۔ پلٹے اور شوکت حیات کے روبرو ہوتے ہوئے بولے۔''جب تک آپ پر مضمون نہ لکھ لیں تب تک نہیں مریں گے۔'' اور ہفتہ دس روز کے اندر اندر شوکت حیات کے حوالے سے وہاب صاحب کا ایک طویل مضمون 'قومی تنظیم' میں آگیا۔ اور واقعی حسن احمد کا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ بلراج کومل والے پروگرام میں شوکت حیات کا جارحانہ رویّہ وہاب اشرفی پر دباؤ بنانے کے لئے تھا۔ شوکت حیات جو چاہتے تھے وہ ہو گیا۔''خود پسند شوکت حیات تو بہت پہلے سے ہی خود کو ایک عظیم الشان فکشن رائٹر سمجھتے تھے۔ اور اپنے ہم عصر، ہم مشربوں کو شاید ہی خاطر میں لاتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی تو کسی سے فون پر الجھ جاتے تھے اور اکثر ان کا رویّہ حاسدانہ بھی ہو جاتا تھا۔''

خاکہ نگاری میں خاکہ نگار کی نظر، نظریے اور تعلقات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ خاکہ نگار نے کیا دیکھا اور کیسا محسوس کیا اور وہ قارئین کو کیا کیا دکھانا اور کیسا محسوس کرانا چاہتا ہے، اِس عمل میں اُس کے ذاتی تعلقات معاون و حارج ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر منظر اعجاز نے انتہائی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے شاگرد ناپسندیدہ، شوکت حیات کی زندگی میں اُن پر خاکہ نہیں لکھا۔ بعد از مرگ لکھا کہ مُردے شکوہ واحتجاج بھی نہیں کر سکتے۔

اقبال حسن آزاد کا خاکہ 'بھول بھلیاں اور شوکت حیات' کا عنوان ہی نہیں، مکمل خاکہ دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اقبال حسن آزاد منفرد و ممتاز افسانہ نگار ہیں یا شاعر و خاکہ نگار؟ اِس تثلیث کے بعد جب نظر 'ثالث' کی ادارت پر جا ٹھہرتی ہے، تب لگتا ہے، کارہائے نمایاں کا یہ

مربع دراصل چار بُرج ہیں، جن پر اقبال حسن آزاد کی ادبی فتوحات کے جھنڈے نصب ہیں۔ آفرین!

اقبال حسن آزاد خاکہ نگاری کے فن سے کما حقہ واقف ہیں۔ یہی سبب ہے کہ شوکت حیات کی حیات و کارنامے غنچۂ ناشگفتہ کی طرح مٹھی کھولتے ہیں۔ شوکت حیات سے پہلا تعارف، پہلی ملاقات اور سراپے کے ذکر کے بعد ایسی ملاقات و واقعات اور تجربات کا انتخاب و اذکار، جن سے شوکت حیات کے منفی و مثبت اعمال و خیالات منعکس ہوتے ہیں۔ اِس خاکے کا سب سے بڑا اختصاص یہ ہے کہ اِس میں شوکت حیات اپنے تمامتر بشری خصائص و خصائل کے ساتھ مکمل نظر آتے ہیں: ''جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے کون کون سے افسانے شائع ہونے جا رہے ہیں تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔'' ''یہ تو میں نہیں بتاؤں گا۔ آپ اسے نکلوا دیں گے۔''

''میں بھلا کیوں اور کیسے نکلواؤں گا۔''

''لوگ ایسا کرتے ہیں۔'' شوکت حیات نے جواب دیا اور میں نے ان کی بات پر فوراً ''یقین بھی کر لیا تھا کیونکہ خود میرے ساتھ ایسا ہو چکا تھا۔ وہ ایک بات ہمیشہ کہتے کہ اردو والوں نے ان کی قدر نہیں کی۔ پھر کہتے یار! کبھی مونگیر بلاؤ اور میری خدمت میں روپیوں کی تھیلی پیش کرو۔ دیکھو فلاں جگہ مجھے اتنی رقم کی تھیلی ملی۔ میں نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ شوکت حیات کی اپنے بیشتر ہم عصروں سے نہیں بنتی۔ کبھی عبدالصمد سے بگاڑ بیٹھے اور کبھی شموئل احمد سے۔ منظر اعجاز کی بیٹی کی شادی کے موقع پر شوکت حیات اور عبدالصمد ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک سیمینار میں شوکت حیات اور شموئل احمد اغل بغل بیٹھے خوش گپّیاں کر رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ شوکت حیات دل کے صاف ہیں۔ جب میں نے ''ثالث'' کے گوشۂ شموئل احمد کا اعلان کیا تو ان کی بیگم کا فون آیا۔ کہنے لگیں کہ اقبال بھائی! شموئل احمد پر گوشہ مت نکالئے، شوکت حیات پر گوشہ نکالئے۔ میں نے کہا شوکت حیات وعدہ تو کرتے ہیں مگر وفا نہیں کرتے۔ ان پر گوشہ نکالنا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی میں نے وعدہ کیا اور کہا ان شاء اللہ ثالث میں شوکت حیات پر گوشہ ضرور نکلے گا۔ لیجئے گوشہ کی جگہ پورا نمبر ہی نکل گیا۔''

نائب مدیرہ، 'ثالث' نشاط پروین کا خاکہ 'شوکت حیات سے دو ملاقاتیں' پڑھ کر بیحد خوشی ہوئی کہ مقناطیسی شخصیت اقبال حسن آزاد کی رفاقت نے موصوفہ کو مدیرہ اور قلمکار بنا دیا۔ اِس خاکے کا اختصاص اِس کا شگفتہ اندازِ بیان ہے: ''ایک بار میں بہار اردو اکادمی کے پروگرام میں اپنے شوہر کے ساتھ گئی تھی۔ صوفے پر تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف شموئل احمد دوسری جانب اقبال حسن آزاد اور درمیان میں شوکت حیات۔ (شوکت حیات) دل میں تمنا پال چکے تھے کہ بہار اردو اکادمی کے اگلے سیکریٹری وہی بنیں گے۔ وہ سب سے کہہ رہے تھے آپ لوگ دعا کیجئے۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ یہ کرسی میری ہوگی۔ سبھی نے ان شاء اللہ

کہہ کر ایڈوانس میں مبارکباد بھی دے ڈالی۔ شوکت حیات سے دوسری اور آخری ملاقات پروفیسر صفدر امام قادری صاحب کی بیٹی کی شادی کے موقع پر ہوئی۔ وہ چلتے چلتے کہہ رہے تھے اقبال صاحب میں آؤں گا مونگیر اور سیمنار بھی ہوگا۔ ان کی اہلیہ نے کہا۔ ''ایک قدم تو چل نہیں سکتے ہیں اور جائیں گے مونگیر...... پہلے گھر چلئے۔''

نشاط پروین کے حافظے کو میں داد دیتا ہوں کہ موصوفہ نے من وعن واقعے کو بیان کیا ہے کہ میں بھی اردو اکادمی میں شریکِ محفل تھا۔

تجزّیہ نگار کا عمل ورویّہ ماہرِ فن غواص سا ہوتا ہے۔ وہ بھی تخلیق کے بطنِ بطون میں پہنچ کر تخلیق کار کے فن، زبان و بیان اور اسلوب و پیش کش کا بہ نظر غائر جائزہ لیتا اور قابلِ ذکر نکات اور فنّی محاسن و معائب کا بہ طریق احسن اظہار کرتا ہے۔ نیز وہ تخلیق کار کے بشری خصائص وخصائل کو بھی مرکزِ نگاہ میں رکھتا ہے۔

'تجزّیہ' کے تحت مشتاق احمد نوری کا تجزّیہ ''ذائقہ'' میں نئے ذائقے کی دریافت' کو بھی شرفِ اوّلیت حاصل ہے، جس کا وہ مستحق ہے۔ مشتاق احمد نوری فکشن کے بہترین تجزّیہ نگار ہیں۔ تجزّیہ کے لئے احباب فرمائش کرتے اور موصولہ کتب ایک دوسرے سے دبی چپی صبر ایوبی کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔ اللہ کرے موصوف میرے مجموعہ 'ابابیل کی ہجرت' پر تجزّیئے کا ایفائے عہد کریں۔

شوکت حیات کا مشہورِ زمانہ افسانہ 'ذائقہ' کے اِس مدلّل ولاجواب تجزّیئے کے لئے اقبال حسن آزاد بھی قابلِ مبارکباد ہیں۔ شوکت حیات نے مشتاق احمد نوری کو نجات دہندہ سمجھ کر رودادِ المناک سنا کے دادرسی کی یہ فریاد کی تھی: ''اقبال حسن آزاد نے مونگیر کے ادیبوں کو جمع کر کے میری کہانی کو کنڈم کیا اور وہاں سے آٹھ دس لیٹر میری مخالفت میں زبیر رضوی کو لکھے اور زبیر نے سارے خطوط رسالے میں شائع کر دیے۔ میری بہت کرکری ہو رہی ہے۔ تم ان خطوط کو پڑھو اور کسی طرح مجھے بچاؤ۔''

ڈانجح کنٹرول کے لئے تحریر کردہ مشتاق احمد نوری کے تجزّیے کا سب سے بڑا اختصاص، پیش کردہ دلائل وجواز ہیں۔ وہ قلم چلانے اور قلم گھمانے میں ماہر ہیں۔ انھوں نے معترضین کے اعتراضات کے نہلے پر، دہلا پٹک کر قارئین کو بھی ہکّا بکّا کر دیا ہے۔ اُن کے قلم برداشتہ لکھنے کا میں چشم دید گواہ رہا ہوں۔ محکمہ کے سہ ماہی رسالہ 'بھاشا سنگم' کا میں 'پرویز شاہدی نمبر' ایڈیٹ کر رہا تھا۔ اُن دنوں مشتاق احمد نوری بیمار تھے۔ لہٰذا میں نے بھی ایک نشست میں شوکت حیات کی طرح موصوف سے ڈکٹیشن لیا تھا۔

'ذائقہ' کا تجزّیہ مشتاق احمد نوری کی مدلّل سحر بیانی کا فن پارہ ہے۔ لطف اندوز ہونے کے لئے قاری کو اِس کا مطالعہ کرنا اور بعد از مطالعہ آفرین کہنا ہی ہوگا۔

شوکت حیات کا افسانہ ''بانگ'' عنوان کے تحت غضنفر کا مختصر ترین تجزّیہ شامل ہے۔ غضنفر بہترین

انشا پرداز اور جملہ سازی اور سحر بیانی میں طاق ومشاق ہیں۔ خاکہ نگار اگر فسانہ نگار اور شاعر بھی ہو تو اُس کی انشاپردازی میں ازخود آبشارسی روانی اور قوسِ قزح سا دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس عمل میں غضنفر اپنی تمامتر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے اور قاری کو مسحور ومبہوت کر کے خود بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

''بانگ کی بڑی اہمیت ہے خواہ وہ علامہ اقبال کی بانگ ہو یا شوکت حیات کی۔ خواہ کسی درندے کی بانگ ہو یا پرند کی۔ بانگ نہ ہو تو صبح نہ ہو، دن نہ نکلے۔ حیات میں حرکت نہ ہو۔ معاملات میں برکت نہ ہو۔ کائنات بیدار نہ ہو۔ انسان برسرِ پیکار نہ ہو۔ کارِ کاروبار نہ ہو، حالات سازگار نہ ہوں، شعور وادراک ہشیار نہ ہوں۔ بانگ وہ سُر ہے جس کے تال پر سیاہ افق سے سرخ شعاعیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ پو پھٹ جاتی ہے۔ سورج نکل آتا ہے۔ جس کے شور سے زورِ جبّار تھرّا اٹھتا ہے۔ رعبِ زردار لرز اٹھتا ہے۔ کاخِ امرا کے در و دیوار ہل جاتے ہیں۔ اوقات اور حالات بدل جاتے ہیں۔'' اِسی پیرائے بیان میں اقتباسات کے حوالوں سے غضنفر نے افسانہ 'بانگ' کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ ایک مخصوص فلیور کا مثالی تجزیہ ہے۔

'شوکت حیات کے افسانے ''میّت'' کا تجزیہ' کے عنوان سے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے بہترین تجزیہ کیا ہے۔ ایک منفرد وممتاز فکشن نگار جب کسی افسانے یا ناول کا تجزیہ کرتا ہے، تب وہ تخلیق کے اہم نکات اور فنّی محاسن ومعائب کو بہتر پیرائے بیان میں سامنے لاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''یہ کہانی میاں، بیوی کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ شوہر کے مظالم کی کہانی ہوسکتی ہے کیونکہ میّت بیوی کی ہے۔ مرنے کا سبب کچھ بھی رہا ہو، مولانا کی شکل میں سماج موجود ہے، جو ایسے وقت میں بہت جلدی میں ہوتا ہے۔ اُسے صرف میّت کو قبر تک لے جانے کی جلدی نہیں ہوتی بلکہ وہ رشتے ناطوں کو بھی دفنا دینا چاہتا ہے۔ ایک خاص بات ہے اور وہ ہے انتظار۔ یہ کن لوگوں کا انتظار ہو رہا ہے؟ کون ہے جس کا انتظار، میّت کا شوہر، مسجد کے امام، سماج کے افراد......سب کر رہے ہیں۔ یہ انتظار ہی ہے جو کہانی کی کلید ہے۔ بہت کم ہوتا ہے کہ شوکت حیات کی کہانی کی کلید آپ کے ہاتھ آجائے۔ شوکت حیات کی کہانی ''میّت'' عہدِ حاضر کی تلخ حقیقتوں کا تلخ اظہار ہے۔ ''میّت'' عصری حسیّت سے لبریز ایک عمدہ کہانی ہے جو اپنے سوالوں سمیت قاری کے اندر اتر جاتی ہے اور قاری پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی اچھی کہانی کی پہچان ہے۔''

'افسانہ ''کوبڑ'' اخلاقی وتہذیبی اقدار کی زوال پذیری کا اشاریہ' ڈاکٹر توصیف احمد ڈار' کا تجزیہ ہے۔ موصوف نے عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''معاشرے میں والدین، بھائی بہن اور دوسرے خونی رشتوں کی معنویت رفتہ رفتہ مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ ان بندھنوں کی دیکھ بھال اور عزت وحفاظت کو آج کی نئی نسل وقتی ضیاع گردانتی ہے۔ یہ افسانہ

اگرچہ بظاہر ہمارے یہاں تہذیبی و ثقافتی اور سماجی و معاشرتی سطح پر پھیلی ہوئی بداعتقادی اور بیراہ روی کا بیانیہ ہے لیکن بین السطور میں ان تمام منفی تصوّرات سے اپنی سوسائٹی کو پاک وصاف کرنے کا پیغام بھی اس میں بلا شبہ موجود ہے۔شوکت حیات زندگی اور زمانے کی بدلتی ترجیحات اور ان کے انسانی تہذیب، ثقافت، اخلاقیات، تفکرات، تصورات اور عقائد وغیرہ پر مرتب ہو رہے منفی ومثبت اثرات کا فنّی خاکہ پیش کرنے کو اپنا مطمح گردانتے ہیں۔'' یہ تجزّیہ بھی قابلِ داد ومطالعہ ہے۔

'مکالمہ' کے تحت 'شوکت حیات سے گفتگو' نثار احمد صدیقی کا قابلِ مطالعہ اور داد طلب انٹرویو ہے۔ میں موصوف کی ادبی صلاحیتوں سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ اُن کے بہت سارے انٹرویوز کو پڑھ چکا ہوں۔ مدیرِ رسالہ نے اُن کے انٹرویو کو بھی شرفِ اوّلیت بخشا ہے، جس کا وہ مستحق ہے۔ نثار احمد صدیقی کے انٹرویو کا یہ اختصاص ہے کہ وہ طویل سوالات نہیں پوچھتے بلکہ مختصر سوال پوچھ کر انٹرویو دینے والی شخصیت سے بہت سی معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے شوکت حیات سے اُن کی تازہ اور تازہ ترین کہانیوں کے متعلق جانکاری طلب کی۔ جواب میں شوکت حیات نے 'سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'، 'میّت'، 'رانی باغ'، 'تفتیش'، 'بھائی' اور 'بیکنٹھ اسحاق نگر' کے متعلق چشم کشا باتوں اور اہم نکات کا انکشاف کیا۔ ایک نفسیاتی نکتہ یہ ہے کہ انٹرویو دیتے وقت تخلیق کار کی ذہنیت نئے مکان میں شفٹ اُس مالکن سی ہو جاتی ہے، جو گھر آئے مہمانوں کو اپنے مکان کے کونے کھدرے کو بھی دکھا دکھا کی اُس کی اہمیت وافادیت کو ثابت کرنے لگتی ہے۔شوکت حیات بھی اپنے افسانوں کے رموز ونکات کو اُسی طرح سمجھاتے ہیں، جیسے ایک باخبر گائڈ، سیّاح کو۔ نثار احمد نے شوکت حیات سے کئی مفید وکارآمد باتوں حاصل کر لیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے: ''۱۹۷۰عیسوی کے بعد کے اپنی طرح کے تمام افسانہ نگاروں کو 'انا م نسل' اور ان کی کہانیوں کو 'انام کہانیاں' اور مجموعی تخلیقی رویّوں کو 'انامیت پسندی' سے تعبیر کیا۔ ہم ۱۹۷۰ کے بعد کے جینون لوگوں نے کہانی کی مسمار شدہ عمارت کے ملبے کو صاف کر کے اینٹ سے اینٹ جوڑ کر کہانی کی عمارت کھڑا کیا۔ ۱۹۷۰ کے بعد ۱۹۹۰عیسوی اور نئی صدی میں امتدادِ وقت کے ساتھ انامیت نے نامیاتیت کی صورت اختیار کی اور بعد ازاں امکانیت پسندی کے رجحان کا فروغ ہوا، جو ہنوز جاری ہے اور جسے بعض لوگ مابعد جدیدیت کا نام دیتے ہیں۔ گروپ بندی کسی کو وقتی طور پر اہم بنا سکتی ہے۔ اگر تخلیق میں دم ہے تو بغیر کسی گروپ بندی کے وہ اپنا وجود منوا لیتی ہے۔ مجھے دیکھئے! میرا تعلق گروپ بندی سے نہیں ہے۔ میرے خیال میں گروپ عمومی طور پر ایک منفی رجحان ہے اور اس سے فنکار کا وقت خواہ مخواہ برباد ہوتا ہے۔''

تخلیق کار کا انٹرویو اُس کی شخصیت اور اُس کے فن کو سمجھنے میں بڑے معاون ہوتے ہیں۔ کبھی کبھا

وہ جوشِ خطابت میں وہ بات بھی بول جاتا ہے، جسے صفحۂ قرطاس پر قدم رکھنے نہیں دیتا۔ یہ انٹرویو شوکت حیات کے فن کو بہتر طور پر سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

اِس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بعض انٹرویو لینے والے کا مطمحِ نظر سیلف پروجیکشن بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ قارئین اُن کی ذاتی معلومات اور علم و آگہی سے بھی متاثر ہوں۔ نثار احمد صدیقی کے اس انٹرویو میں اِس ذہنیّت کا دور دور تک سراغ نہیں ملتا۔ مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ اِس انٹرویو کے لئے سوال نامہ ارسال کر کے جوابات حاصل کئے گئے ہیں۔

'شوکت حیات سے مکالمہ' ڈاکٹر غالب نشتر کا مختصر اور روایتی طرز کا انٹرویو ہے۔ گمان اغلب ہے کہ یہ انٹرویو بھی سوال نامہ ارسال کر کے جوابات حاصل کئے گئے ہیں۔ غالب نشتر کے سوال، ''وہ کون سی پہلی کہانی تھی جو ناقدین اور قارئین کی توجہ کا مرکز بنی'' کے جواب میں شوکت حیات نے اپنے افسانے ''بانگ'' پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور بہار میں افسانہ نگاری کی موجودہ صورتحال کے متعلق سچ کہا کہ ''بہار میں افسانہ نگاری نے ابتدا سے ہی اردو ادب میں اپنی جڑیں جما رکھی ہیں۔ ابھی تو بہار کو نہ صرف یہ کہ فکشن کا سب سے بڑا اگڑھ مانتا ہوں بلکہ فکشن کی راجدھانی سے تعبیر کرتا ہوں۔''

کالم 'شوکت حیات کے خطوط' میں چند خطوط شامل کئے گئے ہیں۔ اگر مکتوب الیہ کے جوابی خطوط محفوظ ہوتے اور اُنھیں شاملِ اشاعت کر لیا جاتا، تب باہمی بات چیت اور مراسم و تعلقات کا بھی پتا چلتا۔ خط لکھتے وقت مشاہیرِ ادب کی ذہنی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ مکتوب نگار کبھی کبھار مکتوب الیہ سے بےتکلّف میں ذاتی زندگی کے احوال اور ہم عصروں کے متعلق ریمارکس نیز ادب کے حوالے سے ایسی باتیں بھی رقم کر دیتا ہے، جنھیں وہ تحریر و تقریر میں نہیں لاتا۔ لہٰذا مشاہیرِ ادب کے خطوط بڑے اہم، چشم کشا اور خفیہ سُرنگ کی طرح ہوتے ہیں، جن کے توسط سے قارئین اور ریسرچ اسکالرز، اُن کی ذات و نفسیات کے علاوہ پوشیدہ فنّی نکات و رموز تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ شوکت حیات کے خطوط کے مندرج چیدہ چیدہ جملوں سے نہ صرف موصوف کی شخصیت اور اعمال و افکار کے کئی گوشے از خود منوّر ہو جائیں گے بلکہ ایک جانی پہچانی شخصیت کی واضح شبیہ بھی پردہ ذہن پر متحرّک و مجسّم ہو جائے گی۔ بہ الفاظِ دیگر شوکت حیات اپنے خطوط میں بشری صفات، خصائص و خصائل کے ساتھ مکمل انسان نظر آتے ہیں۔

منفرد و ممتاز فکشن نگار، قرۃ العین حیدر کو ارسال کردہ خط میں شوکت حیات نے لکھا: ''آج کل میں ''کارِ جہاں دراز'' کی نئی قسط پڑھ رہا ہوں۔ ممتاز شیریں کا میں بیحد مدّاح ہوں اور انہیں افسانوں کی اب تک کی سب سے بڑی ناقد مانتا ہوں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ آپ کو میرے جیسے نئے لوگوں کے سلسلے

میں حوصلہ افزا رویّہ اختیار کرنا چاہئے۔''

ڈاکٹر ابرار رحمانی کو یہ لکھا: ''ایوانِ اردو میں آپ کا مضمون ''۱۹۴۰ عیسوی کے بعد اردو کہانی'' پڑھا۔ آپ کی ایک دو باتوں سے اختلاف کے باوجود مضمون بیحد پسند آیا۔'' پھر 'آجکل'، 'ذہن جدید'، 'شاعر' اور 'ایوانِ اردو' میں شائع افسانہ 'مسٹر گلیڈ'، 'تفتیش'، 'کوبڑ' اور 'تھوڑی سی آگ' اور کالم 'نوائے امروز' کے تحت شائع اپنے بائیوڈاٹا کا ذکر کرتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں لکھا: ''اگر مذکورہ کہانیاں پڑھنے کا موقع ملا تو رائے جان کر خوشی ہوگی۔ جواب کا انتظار رہے گا۔''

ڈاکٹر سیّد احمد قادری کو شوکت حیات نے کئی خطوط لکھے۔ دو خطوط کے چیدہ چیدہ جملے ملاحظہ کیجئے:

''میں نے لگ بھگ دس بارہ سال تک چار اخباروں میں کام کر کے اپنے گھر کا خرچہ چلایا ہے۔ اس لئے میں خود کو صحافی بھی مانتا ہوں۔ غیاث احمد گدّی پر آپ کی کتاب دیکھی۔ حیرت ہوئی کہ جہاں آپ نے ایک سے ایک لوگوں کو اس میں شامل کیا، غیاث احمد گدّی پر لکھے گئے میرے دو اہم مضامین میں سے کسی کو اس لائق نہیں سمجھا۔ ''غیاث احمد گدّی سے آخری ملاقات'' اور ''غیاث احمد گدّی کے افسانے'' یہ دونوں مضامین ایوانِ اردو میں شائع ہوئے تھے۔ بے اعتنائی دیکھتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے پرانے رفیق مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔ میں نے کتاب نما کے طویل مہمان اداریہ ''سن ستّری اور نامیاتی فسانے: انحراف اور تسلسل'' میں آپ کا نام لیا تھا۔ میرے مرنے کے بعد تو آپ لوگ کلمۂ خیر سے مجھے نوازیں گے ہی۔ جب تک زندہ ہوں اس وقت تک بھی تو میری ادبی زندگی کی گواہی دیجئے۔''

عین تابش کو لکھے خط میں اُنھیں شاباشی دیتے ہوئے استدعا کی ہے: ''خوشی ہوتی ہے کہ میرے بعد کی نسل میں تم نے نامیاتی شاعری سے اپنا ایک مخصوص اور منفرد مقام بنایا ہے۔ حسین الحق کو میرا سلام کہو۔ انہیں سمجھاؤ کہ ادھیڑ عمر میں مطلب پرست دوست تو بہت ملتے ہیں لیکن نوجوانی کے زمانے کے دوست کی ناسٹلجائی اہمیت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے ساتھ لڑنا اور پیار کرنا دونوں ہی اچھا لگتا ہے۔ کچھ دوست ہم لوگوں کے درمیان دوری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں میری اہمیت کا احساس دلاؤ۔''

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کو ارسال کردہ خط میں لکھا: ''شاعر کے تازہ شمارے میں آپ کا تازہ مضمون ''اردو افسانہ کا صد سالہ سفر: ایک مختصر جائزہ'' پڑھا۔ آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے ۱۹۷۰ عیسوی کے بعد کے افسانوں کے تعلق سے میری کارکردگیوں کو یاد رکھا اور میری دو کہانیوں ''گنبد کے کبوتر'' اور ''گھڑیال'' کا تذکرہ شامل کیا۔ طویل مضمون ''۱۹۷۰ کے بعد والے'' (مطبوعہ تنقید نمبر ۱/استعارہ) کے صفحہ ۱۱۸ پر ۱۹۷۰ کے بعد کے اہم افسانہ نگاروں میں آپ کا بھی ذکر کیا ہے۔''

رفیع حیدر انجم کو خط لکھ کر اظہارِ تشکّر پیش کیا ہے: ’’آپ نے میری کہانی کا بہت اچھا تجزّیہ کیا ہے۔ جی خوش ہوگیا۔ جن رخوں کی نشاندہی کی ہے، اُن سے میں متفق، مطمئن اور مسرور ہوں۔‘‘

اقبال حسن آزاد کو لکھا: ’’میری کہانیوں پر عام طور پر میری ریاست کے لوگ سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپ کی پسندیدگی کا خط پڑھ کر میں چونک پڑا۔ آپ کہانی کی روح تک پہنچ گئے۔‘‘

اور ڈاکٹر ارشد رضا کو لکھے خط میں رقمطراز ہیں: ’’یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم نے ’’مرشد‘‘ کو اپنے رسالے کے مشہور گوشے ’’اس شمارے کی منتخب کہانی‘‘ کے لئے منتخب کیا ہے۔ ’’مرشد‘‘ یقیناً میری چند ایسی کہانیوں میں شامل ہے جو یادرکھی جائے گی۔‘‘

’شوکت حیات کے مضامین‘ کے تحت شوکت حیات کے مضمون بالترتیب ’معاصر اردو افسانہ: تغیر و تبدل اور امکانی حقیقت نگاری‘، ’مابعد جدید افسانہ‘ اور ’میری تھیوری سازی اور میرے افسانے‘ شامل کئے گئے ہیں۔ تینوں مضامین شوکت حیات کے وسعتِ مطالعہ، علم وآگہی، نظر و نظریے میں قطعیّت کے علاوہ پختہ تر ناقدانہ صلاحیتوں کے عکّاس ہیں۔ زبان و بیان ناقدانہ اور اسلوبِ نگارش متاثر و مرعوب کن ہے۔ مذکورہ مضامین کے مطالعے سے بلاشبہ قارئین کے علم و دانش اور آگہی میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ اگر شوکت حیات اپنے ہم عصر، شموئل احمد کی طرح فکشن کی تنقید پر بھی اپنی توجّہ مرکوز رکھتے، تب اُن کا شمار بھی فکشن کے بڑے ناقدین میں ہوتا۔ اقتباسات کے توسط سے قارئین کو نہ وہ لطف مطالعہ ملے گا اور نہ آگہی کی طلب وتڑپ کی تشنگی کو سیرابی ملے گی۔ اِس وضاحت کے ساتھ ’معاصر اردو افسانہ: تغیر وتبدل اور امکانی حقیقت نگاری‘ کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

’’معاشرتی اور سیاسی وسماجی حالات سے عدم اطمینان ہی افسانہ نگار کے تخلیقی وصف کو اجاگر کرتا ہے۔ اس کے اظہار وابلاغ کو تہدار اور ہمہ جہت بناتا ہے، تاکہ وہ زندگی اور اپنے عندیے کی پیشکش میں (جسے دوسرے لفظوں میں نقطہ نظر بھی کہتے ہیں) محض ایک ترجمان بن کر فوٹو گرافر، جرنلسٹ اور ہمدرد مشاہد کا رویّہ اختیار نہ کرے بلکہ زندگی کے اندرون سے پھوٹتی ہوئی ٹیڑھی میڑھی، گڈ مڈ، شفاف اور دھندلی شعاعوں کو اپنے افسانوی قلم کی گرفت میں لے سکے۔ ہمہ جہت زندگی اپنے تخلیقی Process سے گزر کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور غالبًا اسی لئے پریم چند نے کہا تھا کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر بڑے سے بڑا افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ لکھتے وقت افسانہ نگار خود وہ انسان نہیں رہتا جو عام لمحوں میں ہوا کرتا ہے۔ اس کا تخلیقی ذہن تغیر وتبدل کے مراحل سے گزرتا ہوا تحت الشعور اور لاشعوری طور پر ان لمحوں کے رقیق اور دھواں دھواں عناصر کو بھی اپنے تخلیقی انہماک میں شامل کرتا چلا جاتا ہے۔‘‘

شوکت حیات اپنی خود شناسی کا تعیّن اور خودستائی کا اعلان خود ہی کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر

موصوف ہم عصر ناقدین اور قارئین کا صبر سے انتظار نہیں کرتے کہ وہ اُن کی تخلیقی صلاحیتوں، وجدان اور اُن کے کارہائے نمایاں کا ذکر کریں گے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے مضامین میں خودستائی کا موقع اور جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ 'مابعد جدید افسانہ' کا ابتدائیہ ملاحظہ کیجئے: "اگر اسے خودستائی پر محمول نہ کیا جائے تو اس حقیقت کا اظہار غیر مناسب نہیں ہوگا کہ مابعد جدید افسانے کے ابتدائی نقوش کا سراغ راقم الحروف کے ۱۹۷۰ء کے زمانے میں پیش کردہ انامیت، انام نسل اور انام افسانوں کے تصورات اور رویّوں میں ملتا ہے۔ اس زمانے کے ''میں کا تعارف''، ''سچوئیشن سیریز کیوں''، ''قصہ جدید وقدیم'' اور دیگر مضامین میں ان کے بیج جا بجا بکھرے پڑے ملتے ہیں۔''

مضمون 'میری تھیوری سازی اور میرے افسانے' میں خودستائی کا فلیور قدرے کڑک ہے۔ اِس المیے کا سبب معاصر ناقدین کا اپنے قابلِ قدر تخلیق کاروں کی ادبی صلاحیتوں اور شخصی عظمتوں سے اغماض ہے۔ المختصر شوکت حیات کے مضامین قابلِ مطالعہ اور داد و تحسین کے مستحق ہیں۔

مشمولاتِ شوکت حیات نمبر میں منتخبہ افسانہ 'گنبد کے کبوتر'، 'رانی باغ'، 'مرشد'، 'ذائقہ'، 'بانگ'، 'میّت' اور 'کوبڑ' اور ناولٹ 'سرپٹ گھوڑا' کے متعلق ناقدین اور تجزیہ نگاروں کے اذکار و افکار کے بعد راقم الحروف کا تجزیاتی مطالعہ ناقابلِ برداشت طوالت کا سبب بن جائے گا۔ لٰہذا بہتر یہی ہوگا کہ قارئین شوکت حیات کے مذکورہ بہترین افسانوں کی قرآت سے محظوظ و مسرور ہوں۔

'تبصرے' کے تحت غضنفر کے سوانحی ناول 'دیکھ لی دنیا ہم نے' پر اقبال حسن آزاد کے قابلِ مطالعہ بہترین تجزیاتی تبصرے کو بھرتی کے شعر کی طرح شوکت حیات نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔ بہتر یہ ہوتا کہ شوکت حیات کا تبصرہ یا پھر 'گنبد کے کبوتر' پر تحریر کردہ تبصرے کو جگہ دیا جاتا۔

'ثالث پر تبصرے' کے تحت عشرت ظہیر، سلیم انصاری، عظیم اللہ ہاشمی، ڈاکٹر منصور خوشتر، ریحان کوثر اور رونڈر جوگلیکر کے تبصرے اور 'مکتوبات' کے تحت فاروق ارگلی، مرغوب اثر فاطمی، عین تابش، غزال ضیغم، فخر الدین عارفی، غلام نبی کمار، ڈاکٹر اختر آزاد، وسیم فرحت، وسیم احمد فدا، جرنلسٹ اقبال، مختار بلال، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، احسان تابش اور ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر گیاوی کے خطوط شامل کئے گئے ہیں۔ اِس ضمن میں یہ اعتراف کرتا چلوں کہ مدیرِ رسالہ کے لئے قارئین کے خطوط بڑی اہمیت کے حامل اور مانند فیڈ بیک ہوتے ہیں۔ ماہنامہ 'سفیر ادب'، پٹنہ کو بہتر سے بہترین کی راہ پر گامزن کرنے میں قارئین کے خطوط بڑے معاون ثابت ہوئے تھے۔ ظاہر ہے اقبال حسن آزاد بھی ان خطوط کو شئیر بازار کے سنسیک ڈسپلے کی طرح دیکھ کر حکمت عملی بناتے ہوں گے۔

اختتامی کلمات کے تحت میں اپنے ذاتی خیالات و تاثرات پیش کرتا ہوں کہ شوکت حیات بلاشبہ

ایک عبقری اور جینوئن فکشن نگار تھے۔ اس بات کا انھیں بخوبی احساس تھا، لیکن یہ امر اُن کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ پذیرائی کے لئے اُنھیں اپنی زندگی قربان کرنی ہوگی۔ بعد از مرگ اُن کی گرانقدر خدمات کا، اعلان اور تحریری اعتراف کرنے والوں کا ایک بڑا طبقہ از خود سامنے آجائے گا۔ کاش! موصوف اِس تلخ حقیقت کے واقف کار ہوتے کہ ہمارا ادبی معاشرہ شروع سے ہی مردہ پرست رہا ہے۔ عہد ساز غالب تا حیات ناقدری کے شاکی رہے اور شاد عظیم آبادی جیسے عبقری شاعر کو جیتے جی یہ طعنہ دینا پڑا:

پردہ پوشانِ وطن تجھ سے تو اتنا نہ ہوا ایک چادر کو ترستی رہی تربت میری

لہٰذا ہم عصر ناقدین کو گروپ بندی کے حصار میں جینوئن اور گدڑی کے لعل کو بھی لانا ہوگا اور ریسرچ اسکالروں کو بھی ''گروسیوا'' اور ''گرو پریکرما'' کے ساتھ ہم عصر باصلاحیت مبتدی اور نظر انداز قابلِ ذکر تخلیق کاروں پر بھی قلم اٹھانا ہوگا۔

یہ فخر مجھے بھی حاصل ہے کہ میں بھی شوکت حیات کا ہم عصر رہا ہوں۔ اُنھیں منچ پر شیر سا دھاڑتے اور بلند بانگ قہقہوں سے محفل میں جان ڈالتے اور تقریب میں نظر انداز کئے جانے پر پُر زور احتجاج کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ میں اُس وقت ششدر رہ گیا تھا، جب وہ میرے محکمے کی ایک تقریب میں کھڑے ہوکر ایک پروفیسر کو مجبور کر دیا تھا:

''آپ نے افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر شاہد جمیل کا نام شامل نہیں کیا، شامل کیجئے! میں اِن کے افسانوں کو پڑھ چکا ہوں۔'' شوکت بھائی اُس وقت بیٹھے تھے، جب موصوف نے میرا نام شامل کیا۔ ظاہر ہے موصوف کا یہ احتجاج ذاتی نوعیت کا نہیں تھا۔ موصوف چٹکی بھر ملی خوشی سے بچوں سا خوش ہوتے، چراغِ اُمید کی لو کو مدھم پڑتے دیکھ کر وہ خود لو بڑھاتے۔ کبھی کبھار اُنھیں مایوسی کے غار میں اُترتے ہوئے بھی میں نے دیکھا ہے۔ اُن کے دکھ درد کو سنا، ساتھ کھایا پیا اور اہلِ خانہ کو بچوں سا اُن کا کیئر کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ مقامِ محمود پر دیکھنے اور بڑے انعام واعزاز سے نوازے جانے کی بھابھی کی چاہت وتڑپ کو بھی دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ شوکت حیات میدانِ عمل میں دُھن کے پکّے تھے۔ جہادِ زیست اور تکمیلِ خواہش کی راہ میں حائل دیوارِ چین ہو یا آگ کا دریا، انھیں عبور کر لینے کا وہ عزم ویقین رکھتے تھے۔ لیکن فطرتاً وہ پارہ صفت اور عجلت پسند تھے۔ وہ دور اندیش اور مصلحت پسند نہیں تھے۔ دل کے سچّے اور کان کے کچّے تھے۔ کسی کی رائے یا انفارمیشن کو فی الفور تسلیم کر لیتے اور اپنی رائے بدلنے میں بھی اُنھیں دیر نہیں لگتی تھی۔ اُن میں شیر کے شکاری سا صبر وتحمّل اور صحیح وقت پر نشانہ مارنے کا ہنر بھی نہیں تھا۔ لہٰذا اُن کی خواہشات، لبِ ساحل ریت پر بنائے گئے گھروندوں کی طرح پامال ہوتی گئیں۔ اِن باتوں کے باوجود موصوف کئی اور صفاتِ عالیہ سے بھی

متصف تھے۔ وہ جویائے علم و دانش ہی نہیں تھے بلکہ اُنھیں اپنے علم و دانش کا فہم و گمان بھی تھا۔ وہ منافق نہیں تھے۔ اپنے خیالات و جذبات کا وہ اعلانیہ اظہار کرتے تھے۔ مثلاً '' وہ تاحیات شموئل احمد، عبد الصمد اور حسین الحق کو اپنا بدخواہ مانتے اور مشتاق احمد نوری کو کبھی دوست اور کبھی دشمن قرار دیتے رہے۔ پُر لطف بات یہ کہ دورانِ گفتگو وہ مجھ سے ہی میرے افسانوں کی خوب تعریفیں کرتے تھے، لیکن جب میں نے اپنا مجموعہ 'ابابیل کی ہجرت' پیش کیا، تب وہ فہرست دیکھ کر بولے تھے : '' تمھارے افسانے کو میں رسائل میں پڑھتا رہا ہوں۔'' توصیفی کلمات کے بعد وہ بولے تھے: '' میرا دل چاہتا ہے، مجموعے پر ایک مضمون لکھوں، لیکن نہیں لکھوں گا۔ تم شمولہ (شموئل احمد) کے دوست ہو، میرے نہیں۔ اگر تم راج بھاشا ایوارڈ کے لئے دل سے کوشش کرتے تو مجھے بھی مل چکا ہوتا۔ مجھے معلوم ہے، تم نے جسے چاہا، اُسے ایوارڈ دلوایا۔''

میں معذرت خواہ ہوں کہ مذکورہ باتیں شجرِ ماضی سے پکے پھلوں کی طرح ٹپک گئیں۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شوکت بھائی جنّت میں 'شوکت حیات نمبر' کے مطالعے کے بعد مسکراتے ہوئے شاد عظیم آبادی کا یہ مصرع گنگنا رہے ہوں گے:

"ڈھونڈھو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم"

دیدہ زیب سرورق کے لئے نعیم یاد کو، شوکت حیات نمبر کی بہترین تہذیب و پیشکش کے لئے مدیر و معاون مدیر کو اور گتھی ہوئی کمپوزنگ کے لئے کمپوزر کو اور عمدہ طباعت کے لئے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی کے منتظمین کو داد و تحسین اور مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

◀◀ ● ▶▶

● عشرت ظہیر

'ثالث' کا جاذبِ نظر اور جاذبِ توجہ 'شوکت حیات نمبر' پیشِ نظر ہے۔

اس شمارہ کے اداریہ کے پہلے پیراگراف، یعنی ابتدائی محض چند سطروں میں اقبال حسن آزاد نے حیات انسانی کی حقیقت کو جس طرح منکشف کیا ہے، سمیٹ لیا ہے، اس نے ذہنِ تصور پر زندگی کی مختصر مدت کی طویل داستان اجاگر کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، وقت کا بلاخیز اور پرشور دریا بہہ رہا ہے، اور انسان کی حقیقت اس آبِ رواں میں کچھ بھی نہیں۔ انسان اور انسان کی زندگی کی اس بے بضاعتی اور ہنگامی حالات کے دائرے در دائرے میں نہ زندگی رکتی ہے اور نہ حوصلوں کو لگام لگانا درست ہے۔

یہاں شوکت حیات کی یاس انگیز موت کے تاسف کا اظہار بھی بین السطور میں پنہاں ہے اور اس پر ملال صورت حال سے ابھر کر عملی اقدام اور عزم کے اشارے اور ترغیب بھی نمایاں ہیں، جس کی مثالی اور

حقیقی صورت 'شوکت حیات نمبر' کی شکل میں مجسم ہے۔

فہرست دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی پیش کش میں، مضامین، خاکے، تجزیے، انٹرویو اور شوکت حیات کی نگارشات کے انتخاب کی پیش کش کے توسط سے شوکت حیات کی شخصیت، زندگی اور ادب و فن کا پوری طرح احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کوشش میں محض بڑے اور مستند ناموں کا لحاظ ہی نہیں بلکہ مواد و موضوع کے تنوع اور اظہار و اسلوب کی تازگی کو ہی اہمیت دی گئی ہے۔

شوکت حیات کی افسانہ نگاری پر وہاب اشرفی اور وارث علوی کے مضامین کی شمولیت افسانہ نگاری پر نہ صرف ان کے مضبوط گرفت کی فنی سند کی حیثیت ہے، بلکہ یہ ان کے فن کے ہمہ جہت اور لطیف و باریک بیں نکتوں تک رسائی کا بھی وسیلہ ہے۔

وہاب اشرفی نے اپنے مضمون 'شوکت حیات کی افسانہ نگاری' میں ان کی افسانہ نگاری کے ہمہ جہت پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے 'سرپٹ گھوڑا' کو افسانے کے زمرے میں رکھتے ہوئے لکھا ہے:

> ''...اس کی بنت میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا ہے کہ اس کا تناظر ہندوستان کے وہ عوام ہیں جن کے مقدر میں سکون نہیں۔ ہیجان واضطراب کا شکار ہو کر وہ ایک ایسی زندگی گزارتے ہیں، جسے کسی حال میں بھی انسان کی معتدل زندگی کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے کئی Shades، ایک طرف جبر و اختیار کی کہانی سامنے لاتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ ہجر و وصال کی کیفیتوں کا بھی احاطہ کرتے ہیں، لیکن یہ صورتیں اکہری نہیں۔ یہ تمام نکات ایک تخلیقی سطح پر دیکھے گئے ہیں۔''

وہاب اشرفی نے اپنے عالمانہ اظہار بیان اور تنوع آمیز نکات کے محور میں ان کے افسانے پھسنڈا، تفتیش، بلی کا بچہ، گھڑیال، سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، بیگانگی، گنبد کے کبوتر کو زیر بحث لاتے ہوئے ان کے عروج فن کو متعین کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا ہے:

> ''مجھے شوکت حیات کے افسانوں میں ذوجہتی کیفیتوں کا احساس ہوا۔ ایک طرف تو شوکت حیات اس امر میں کامیاب ہیں کہ سوالات کھڑے کریں تو دوسری جانب وہ ہر افسانے کو ایک مکمل اکائی دینے میں کامیاب ہیں۔ یہ اکائی زندگی کے کسی مسئلے سے متعلق ہو کر تخلیق کی ایک قاش بن جاتی ہے۔''

وارث علوی کا مضمون 'شوکت حیات کی افسانہ نگاری' غالباً شوکت حیات کے کسی افسانوی مجموعے کے لیے بطور دیباچہ تحریر کیا گیا تھا، لیکن اس مختصر مضمون میں بھی وارث علوی نے شوکت حیات کے

افسانے 'گنبد کے کبوتر' سانپ سے نہ ڈرنے والا بچہ، تفتیش، بلی کا بچہ اور مادھو کو زیر بحث لایا ہے، اور اپنی تحریر کو وقیع اور ذی اعتبار بنانے کے لیے انھوں نے 'گنبد کے کبوتر' کے بیان میں سید محمد اشرف کے اسی موضوع سے متعلق افسانہ 'دوسرا بن باس' کا بھی تذکرہ کیا ہے، اور 'گنبد کے کبوتر' کے اختتامیہ کو 'سعادت حسن منٹو کی طرح غیر متوقع انجام کی ضرب کاری اور ہولناک حقیقت کا استعارہ' کے روپ میں تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے افسانہ 'مادھو' جو پریم چند کے افسانہ 'کفن' کی پیروڈی ہے، کی توضیح میں شفق کے افسانہ 'دوسرا کفن' کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس امر سے عیاں ہے کہ وارث علوی نے شوکت حیات کے فن کو وسیع تناظر میں دیکھنے، پرکھنے اور پیش کرنے کی سعی کی ہے—

پروفیسر صفدر امام قادری نے اپنے مضمون 'شوکت حیات کا ناول/ ناولٹ سرپٹ گھوڑا، ایک تنقیدی جائزہ' کے ابتدائی، تمہیدی بیان میں شوکت حیات کو احتجاج کے فنکار کے روپ میں دیکھتے ہوئے ان کے فنی ارتقا کو واضح کیا ہے۔

پروفیسر صفدر امام قادری کا یہ مضمون اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے، لیکن اس مضمون کا تناظر وسیع کینوس کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ تمہیدی طور پر اس میں نہ صرف آزادی کے آس پاس کے فکشن کی جھلکیاں اور حوالے ہیں بلکہ عبدالصمد، شفق، حسین الحق، سید محمد اشرف، شموئل احمد، غضنفر، انور خان اور مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کے تذکرے سے بھی اسے مزین کر کے فکر کی راہ طے کی گئی ہے۔ اس طویل منظر نامہ کے اشاریے کے بعد ناولٹ 'سرپٹ گھوڑا' میں شوکت حیات کے 'قدرت کلام' اور موضوعی تناظر پر سیر حاصل اور مؤثر گفتگو کی گئی ہے۔ صفدر امام قادری نے اپنے مضمون میں لطیف اور دوربیں نظریوں کو دلکش اور دلنشیں پیرایۂ فکر میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''گھوڑا طاقت کا استعارہ ہے۔ سودا نے اسے زوال کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ ایم۔ ایف۔ حسین نے اس گھوڑے کو شہوانی قوت کے طور پر رنگوں کے امتزاج سے تیار کیا ہے۔ شوکت حیات بھی اس استعارے کو کچھ اور بڑے معنوں میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ناول کے آغاز میں انھوں نے غالب کا مشہور شعر یوں ہی نہیں پیش کیا ہے:
>
> رو میں رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
>
> پہلا مطلب تو یہی واضح ہے کہ یہ 'سرپٹ گھوڑا' اصل میں زندگی کی قوت ہے۔ ہار اور جیت، دوڑ اور بھاگ، سب سے آخر ہم پائیں گے کیا؟ اس سے یہ سمجھا

جاسکتا ہے کہ یہ ناول اپنی زندگی کی ہار اور جیت کی کہانی ہے اور 'سرپٹ گھوڑے' کی
ٹاپ رفتہ رفتہ اور مدھم اور ختم ہونے کی نشانی ہے...''

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اپنے مضمون 'شوکت حیات کا افسانوی اختصاص' میں موضوعاتی اعتبار سے ان کے افسانوں کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے:

(i) ایسے افسانے جن میں مرکزیت کردار کو حاصل ہے۔

(ii) دوسری طرح کے افسانوں میں اہمیت کردار کے بجائے ماجرا کو ہے۔

انھیں نکتوں پر ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اپنے مضمون کی بنیاد قائم کی ہے اور ان کے افسانے بھائی، تفتیش، گنبد کے کبوتر، پھسنڈا، گھونسلا، فارمولا، شکنجہ، قرارداد، مسٹر گلیڈ، رحمت صاحب، اپنا گوشت، اور کوبڑ کو اپنے مطالعہ کے دائرے میں لاتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا ہے:

''یہ افسانے ایک مخصوص اور منفرد مزاج کے آئینہ دار ہیں اور افسانوی
زبان کی توانائی، اسلوب و اظہار کی تہہ داری اور افسانوی تجربات کی نادرہ کاری کو
بھرپور طریقے سے ظاہر کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر صغیر افراہیم نے اپنے مضمون کا محور 'گنبد کے کبوتر' کو بنایا ہے اور اپنے پیش کردہ مضمون 'گنبد کے کبوتر تہذیب کی مسماری کا استعارہ' میں متذکرہ افسانہ میں استعاروں اور علامتوں کے ساتھ ساتھ ایمائیت اور منظری ربط کی موجودگی کے حوالے سے واضح کرتے ہیں کہ:

''اس تہہ دار کہانی میں تعبیر کے امکانات کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو اپنے
تھیم سے جڑا ہوا ہے۔ کہانی میں کسی بھی واقعہ کا ذکر ہو، مرکزی واقعہ کی بدلی ہوئی شکل میں
حاوی رہتا ہے اس لیے یہ کہانی روایت کے مسمار ہونے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے...''

ڈاکٹر منصور خوشتر اپنے مضمون 'شوکت حیات اردو افسانے کی منفرد آواز' میں شوکت حیات کے افسانوں میں ادبی شعور، ذہنی ارتقا اور سائنسی بصیرت کے حوالے سے ان کے افسانوں کا جائزہ پیش کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ:

''...شوکت حیات کی تحریروں میں حزن و یاس اور المیہ عناصر کو تلاش
کرتے ہیں تو ان کی تحریروں کے آہنگ میں ارسطو کی 'بوطیقا' پوری طرح اپنی تمام
کیفیتوں کے ساتھ جلوہ نما ہوتی ہے۔''

باب 'خاکہ' کے تحت مشتاق احمد نوری، عبدالصمد، ڈاکٹر ابرار رحمانی، غضنفر، منظر اعجاز اور پروین شاکر

کے خاکے شوکت حیات کی شخصیت، ان کی زندگی کے اطوار، ان کے کردار اور فنی رویے کو عکس ریز کرتے ہیں۔

خاکہ نثری صنف ادب کا مشکل فن ہے۔ اسے انگریزی میں Personal Sketch اور Pen Portrait کے دلچسپ اور دلنشیں نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لفظ پن پورٹریٹ کی بازگشت میں ایک انوکھی معنوی کیفیت کا احساس جاں گزیں ہے اور اس کی تمام تر خصوصیات اور نکاتِ فن پردۂ ذہن پر ابھر آتے ہیں۔

مشتاق احمد نوری کا خاکہ 'افسانے کا سکندر: شوکت حیات' فن خاکہ نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس خاکہ میں انھوں نے شوکت حیات کی شخصیت کی باطنی و ظاہری، مثبت و منفی اوصاف اور پہلوؤں کو بصورت الفاظ مجسم کیا ہے۔ مشتاق احمد نوری چونکہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، لہٰذا اس خاکہ کا اختتام افسانوی تاثر و حزن طاری کیے دیتا ہے:

"... نہ بیٹا نہ بہو، نہ بیٹی نہ داماد نہ ہی کوئی ادیب شاعر دوست دشمن کوئی نہیں۔
اتنی خاموشی اور تنہائی میں آخری سفر طے ہوگا یہ شوکت نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

'وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی' میں عبدالصمد نے شوکت حیات کی فکری تہہ داری، پیچیدگیاں، عادات و اطوار اور رجحان و میلان کا خوبصورتی کے ساتھ احاطہ کیا ہے اور شوکت حیات کی حقیقت آمیز قلمی تصویر پیش کی ہے:

"... دھیرے دھیرے وہ ایک زبردست عدم اعتماد کا شکار ہو گیا۔ اسے کسی پر بھروسہ نہیں رہا... ایک زمانہ تھا جب وہ ناول کو دوسرے درجے کی صنف کہتا تھا، افسانے کو پہلے درجے کی، مگر جب بعد میں اس نے ایک طویل افسانہ لکھا، سرپٹ گھوڑا۔ اسے وہ بہت دنوں تک ناول، کبھی ناولٹ کہتا رہا... "

اقبال حسن آزاد نے اپنے خاکہ 'بھول بھلیاں اور شوکت حیات' میں شوکت حیات کے تعلق سے، تاثرات، تصورات اور واقعات کی پروازوں کے توسط سے شوکت حیات کی شعوری، غیر شعوری اور جبلی طرز ادا کو دائرہ تحریر میں لایا ہے اور صنف خاکہ کے تقاضوں کے تحت ان کی خوبیوں، کوتاہیوں اور شخصیت کے مختلف پرتوں کو نمایاں کرتے ہوئے حقیقی تصویر پیش کی ہے:

"وہ ایک بات ہمیشہ کہتے کہ اردو والوں نے ان کی قدر نہیں کی۔ پھر کبھی کہتے یار! کبھی مونگیر بلاؤ اور میری خدمت میں روپیوں کی تھیلی پیش کرو۔ دیکھو فلاں جگہ مجھے اتنی رقم ملی ہے... "

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو، جس سے ان کی تلون مزاجی ظاہر ہے:

''ایک دفعہ میں پٹنہ گیا تو ان کا فون آیا۔ کہنے لگے ایک پبلشر نے ناول لکھنے کے لیے مجھے ایک لاکھ روپیہ ایڈوانس دیا ہے۔ سبزی باغ کے فلاں ہوٹل میں ایک روم بک کروایا ہے اور ڈکٹیشن کروانے کے لیے ایک خوبصورت اور جوان سکریٹری مہیا کرادی ہے، جب میں نے انھیں بتایا کہ آج کل میں پٹنہ ہی میں ہوں تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ آج شام مجھ سے ہوٹل میں آکر ملو۔ میں تمھیں سکریٹری سے بھی ملواؤں گا۔ میں وقت مقررہ پر ان کے بتائے ہوئے ہوٹل پہنچ گیا اور انھیں رِنگ کیا۔ ایک بار... دو بار... تین بار، لیکن انھوں نے فون ہی نہیں اٹھایا—''

شوکت حیات کی زندگی کے یہ اوراق افسانے کی طرح ہمہ جہت، تہہ دار اور رمز سے بھرے ہیں اور حیران کن صورت حال خلق کرتے ہیں:

''... اور لوگ ان کی بھول بھلیوں جیسی الجھی ہوئی شخصیت کی تہیں کھولنے میں لگ گئے—''

کسی تخلیق کا تجزیاتی مطالعہ اہم بھی ہوتا ہے اور دلچسپ بھی۔ کسی ایک ہی تخلیق سے متعلق کئی مختلف تجزیاتی مطالعے میں دلچسپ اور حیران کن بُعد بھی ظاہر ہوتا ہے۔

یہاں کسی ایک افسانہ پر دو تجزیہ کار کی تحریریں تو نہیں، لیکن مشتاق احمد نوری کا 'ذائقہ، میں نئے ذائقے کی دریافت'، غضنفر کا 'شوکت حیات کا افسانہ 'بانگ'، پروفیسر اسلم جمشید پوری کا 'شوکت حیات کے افسانے 'میت' کا تجزیہ' اور ڈاکٹر توصیف احمد ڈار کا 'افسانہ کوبڑ: اخلاقی وتہذیبی اقدار کی زوال پذیری کا اشاریہ' میں تجزیہ کار فنکاروں نے اپنی جولانیٔ طبع اور باریک بیں زاویۂ نگاہ کے جوہر دکھلائے ہیں اور افسانے کی تہیں کھولنے اور گرہ کشائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

کسی فنکار سے مکالمہ یا انٹرویو ایک دلچسپ عمل بھی ہے اور خطرناک بھی۔ دلچسپ یوں ہے کہ سوال وجواب کے سلسلے قارئین کو اپنے پسندیدہ فنکار کی زندگی، شخصیت اور فن سے متعلق اوجھل گوشے سے آشنا ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ چونکہ یہ روبرو گفتگو کا عمل ہے، لہٰذا اکثر سوالات کے چکرویو میں فنکار خود کو حصارِ تذبذب میں پاتا ہے اور اپنے نہاں خانۂ دل میں دبی باتوں کا غیر شعوری طور پر اظہار کر جاتا ہے اور یہ مقام گویا خطرناک صورت پیدا کرتا ہے۔

یہاں دو مکالمے یا انٹرویو شریک اشاعت ہیں۔ نثار احمد صدیقی کا 'شوکت حیات سے گفتگو' اور

ڈاکٹر محمد غالب نشتر کا 'شوکت حیات سے مکالمہ۔'

نثار احمد صدیقی کے ایک سوال کے جواب میں شوکت حیات نے سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، گنبد کے کبوتر، میت، رانی باغ، تفتیش اور بھائی کو اپنی پسندیدہ کہانی کے طور پر ذکر کیا ہے—

غالب نشتر سے مکالمہ میں شوکت حیات نے ایک سوال کے جواب میں اپنے افسانوی رجحان و رویے کو واضح کرتے ہوئے کہا:

> ''میں نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی ملی جلی تھیوری کو اختیار کیا، کسی ایک تھیوری کے افسانے نہیں لکھے۔ ایک فن کار کو ان تمام چیزوں سے ماورا ہو کر لکھنا چاہیے۔ سو میں نے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر نئے انداز کی کہانیاں لکھیں تو تھیوری کی سطح پر اس بات کا اعلان کیا کہ میں اور میری نسل جینیس افسانہ نگار نہ تو ترقی پسند ہیں اور نہ جدید۔ مابعد اور ہیئت و فکر کی سطح پر ان دونوں سے الگ ہیں۔ لہٰذا ان کی الگ شناخت ہونی چاہیے۔ اس شناخت کو میں نے 'انام نسل' اور 'انامیت' کا نام دیا—''

فنکار کے خطوط اُس کے رجحان و میلان کے شفاف اظہار کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کی کڑی کے طور پر اس نمبر میں شوکت حیات کے چند خطوط بھی شامل اشاعت ہیں، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر ابرار رحمانی، عین تابش، سید احمد قادری، رفیع حیدر انجم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، اقبال حسن آزاد اور ڈاکٹر ارشاد رضا کو لکھے ہیں—

کسی بھی مضمون یا افسانے کے تعلق سے قارئین کی پسند مختلف ہوتی ہے، لہٰذا مضامین اور افسانے کا انتخاب صبر آزما اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ یہاں شوکت حیات کے چند مضامین اور کچھ افسانوں کا انتخاب شامل اشاعت۔ مضامین اور افسانے کے عنوانات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انتخاب مستند اور معتبر ہیں کہ یہ نگارشات شوکت حیات کے معرکہ آرا تخلیقات ہیں اور ان کے شاہکار اور نمائندہ ہونے پر اکثریت کا اتفاق بھی ہے—!

یہ خوبصورت اور دستاویزی 'شوکت حیات نمبر' اقبال حسن آزاد کی محنت شاقہ کا ایسا ادبی نمونہ ہے، جو نسل در نسل شائقین ادب کے لیے سیرابی کا باعث بھی ہوگا اور ادبی تحقیقات میں بطور حوالہ معاون کی صورت تاریخ میں محفوظ بھی رہے گا۔

اس یادگار، تاریخ ساز شوکت حیات نمبر میں اقبال حسن آزاد کے خواب کو تعبیر تک پہنچانے میں ان کے دمساز فنکار بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ :

کسی نے دھوپ بخشی ہے کسی نے چاندنی دی ہے

◄ ● ►

● سلیم انصاری

ثالث کا شمارہ۲۱ - ۲۲بے حد ضخیم، دیدہ زیب اور اپنے مشمولات کے سبب تاریخی اور دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔شوکت حیات کی شخصیت اور فکروفن پر مرکوز ثالث کا یہ شمارہ نہ صرف ریسرچ اسکالرز کے لئے قطب نما اور افادیت کا حامل ہے بلکہ ادب کے سنجیدہ قارئین کے لئے بھی اہم ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ شوکت حیات اردو فکشن کے باب میں ٹرینڈ سیٹر (trend setter) تھے۔گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں جن افسانہ نگاروں کو بدلتی ہوئی قدروں کے زیر اثر اہمیت اور اولیت حاصل تھی ان میں شوکت حیات کا نام سرِ فہرست ہے۔یہاں یہ بات قابلِ ذکر اور قابلِ تشویش ہے کہ شوکت حیات کو ناقدین کی وہ توجہ نہیں ملی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے،جس کی ایک وجہ تو غالباً یہ ہے کہ ان کا افسانوی مجموعہ کافی تاخیر سے شائع ہوا،دوسرے انہیں lobbying یا پی آر شپ نہیں آتی تھی ، وہ out spoken بھی تھے اور بہت جلد اپنے دوستوں اور خیر خواہوں کو ناراض بھی کر لیتے تھے۔انہیں ان عادات واطوار کا نقصان بھی بہت ہوا مگر ان سے پیار کرنے والوں اور ان سے ہمدردانہ سلوک کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔

ثالث کے مدیر ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے اپنے اداریہ میں واضح کیا ہے کہ شوکت حیات کی خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں ہی ثالث پر گوشہ نکلے مگر ان کی یہ خواہش بوجوہ پوری نہ ہو سکی۔زیرِ نظر شمارہ شوکت حیات پر ایک بھرپور نمبر کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جس میں ان کی شخصیت اور فکروفن کے تقریباً تمام پہلوؤں پر تحاریر شامل ہیں۔جس کا ثبوت یہ ہے کہ 496 صفحات پر مشتمل اس شمارے میں تقریباً ساڑھے چار سو صفحات شوکت حیات کے لیے مختص ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے اتنا وقیع نمبر شائع کر کے شوکت حیات سے اپنی بے لوث دوستی کا حق ادا کر دیا ہے اور یہ ایک ایسی ادبی نیکی ہے جس کا ثواب برسوں تک ادب میں جاری وساری رہے گا۔یہی نہیں شوکت حیات پر تحقیقی کام کرنے والوں کی دعائیں بھی ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کو تا دیر ملتی رہیں گی۔

اس خصوصی نمبر میں شوکت حیات کے تعلق سے جو سب سے پہلا مضمون ہے وہ ڈاکٹر وہاب اشرفی کا ہے جس میں ان کے کئی افسانوں کے اقتباسات کی مدد سے ان کے یہاں موجود تخلیقی اور فکری نہج کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ڈاکٹر وہاب اشرفی بذاتِ خود صفِ اول کے نقاد تھے۔انہوں نے بانگ، مادھو اور شکنجہ جیسے افسانوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شوکت حیات کے یہاں احتجاج اور انحراف کا رویہ بھی موجود تھا جو ان کی فکر کی

زیریں لہروں میں موجزن تھا۔گنبد کے کبوتر ایک ایسا افسانہ ہے جو بابری مسجد کی شہادت کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اورشوکت حیات کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر وہاب اشرفی نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ گنبد کے کبوتر میں مسلمانوں اور کبوتروں کو یکجا کریں تو افسانے کی قماش، نہج اور اثر پزیری از خود واضح ہو جائے گی۔اس کے بعد وارث علوی کا ایک مختصر سا مضمون (جو گنبد کے کبوتر کا دیباچہ ہے) شامل کیا گیا ہے جس میں شوکت حیات کی افسانہ نگاری پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ان کے مطابق شوکت حیات کو زبان اور بیان پر غیر معمولی عبور حاصل ہے اور ان کے معمولی افسانوں میں بھی یہ حسن برقرار رہتا ہے۔وارث علوی نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے زیادہ تر افسانے نفسیاتی اور سماجی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان کا طریقۂ کار حقیقت نگاری ہے۔انہوں نے بھی افسانہ ''گنبد کے کبوتر'' کو اردو کے چند بہترین افسانوں میں شمار کیا ہے۔

فاروق ارگلی نے اپنے مضمون ''شوکت حیات کا فن'' میں ان کے افسانوں کی تکنیک کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے ان کے مطابق انسانی معاشرے کی ناہمواریوں، ستم ظریفیوں اور تلخ ترین حقیقتوں پر شوکت حیات کے بعض افسانے ناقابلِ فراموش اور اپنی نظیر آپ ہیں۔ میرے نزدیک ان کے یہاں انسانی رشتوں اور تہذیبی رشتوں کے زوال پر بھی کئی افسانے موجود ہیں۔شوکت حیات کے افسانے'' کوبڑ'' پر اپنی رائے دیتے ہوئے فاروق ارگلی نے لکھا ہے کہ یہ کوبڑ مفلسی اور تمول کے فرق کی علامت ہے جسے شوکت حیات کی اشترا کی فکر اور فنکارانہ تخلیقیت نے بڑی سنگین علامت بنا دیا ہے۔

پروفیسر صفدر امام قادری نے اپنی گفتگو شوکت حیات کے ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' پر مرکوز رکھی ہے ۔ان کے مطابق سرپٹ گھوڑا کی اشاعت ۲۰۰۲ میں پہلی بار شب خون میں ہوئی پھر انہوں نے اسے ازسرِ نو ایک بالکل نئے فارمٹ یعنی ناولٹ کے فارم میں منتقل کیا اور رانچی سے ڈاکٹر سرور عثمانی کی ادارت میں نکلنے والے سہ ماہی ادبی رسالے مفاہیم کو اشاعت کے لیے پیش کر دیا۔ پروفیسر صفدر امام قادری نے یہ بھی وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ ''سرپٹ گھوڑا'' جدیدیت کے زور تھم جانے اور استعاراتی اسلوب بیان کے عہدِ شباب کے بعد کی تحریر ہے۔شوکت حیات کے افسانے زیادہ طویل نہیں بلکہ ایجاز واختصار ان کے تخلیقی طریقۂ کار کا فطری عمل ہے۔لہٰذا انہوں نے'' سرپٹ گھوڑا'' کو بھی اتنا ہی پھیلنے دیا جتنی گنجائش ہو سکتی تھی۔ ناولٹ متوقع خدشات اور اس سے پیدا شدہ مسائل کی کہانی ہے،فساد اور اس کے بعد ماحول میں پھیلی ہوئی کشیدگی اس ناولٹ کی بنیاد میں ہے۔مضمون نگار کے مطابق یہ ناولٹ ملک کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کی پیشکش اور ذہنی تبدیلیوں کا مرقع تو ہے مگر اسے سیدھے طور پر تسلیم کرنے کا رویہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ڈاکٹر سید احمد قادری نے اپنے مضمون میں اعتراف کیا ہے کہ افسانوی ادب میں شوکت حیات نے جس حسن و معیار کے ساتھ گرانقدر اضافہ کیا ہے انہیں کبھی بھی

فراموش نہیں کیا جاسکتا۔انہوں نے افسانوی ادب میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔

اس خاص شمارے میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا بھی ایک مضمون شامل ہے جس میں انہوں نے شوکت حیات کے افسانوی اختصاص پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔انہوں نے اپنے اس مضمون میں جہاں دوسرے کئی اور افسانوں پر بحث کی ہے وہیں ''پھسینڈا'' جیسے افسانے کا بھی ذکر کیا ہے جو ہندو مسلم مشترکہ کلچر کے زوال اور نکسل آندولن کے مسائل پر ایک کامیاب افسانہ ہے۔شوکت حیات نے اس افسانے یہ سچ دکھانے کی ہمت کی ہے کہ نکسل آندولن جو انسانی خدمت اور اعلیٰ مقاصد کے ساتھ شروع ہوا تھا، کس طرح پراگندگی کا شکار ہو کر احتجاج کے بجائے استحصال کی علامت بن گیا ہے۔اس موضوع پر افسانے کی کرافٹ آسان نہ تھی مگر شوکت حیات نے جس ہنرمندی سے افسانے کی بافت کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے لکھا ہے کہ شوکت حیات کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں۔وہ اردگرد کی زندگی کا مشاہدہ بڑی گہرائی اور باریکی سے کرتے ہیں اور زندگی سے متعلق ہر مسئلے پر غور وفکر کر کے اسے اپنے افسانے کا حصہ بناتے ہیں۔اس اعتبار سے دیکھیں تو شوکت حیات کا تخلیقی اور فکری وژن کئی جہتوں میں منعکس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صغیر افراہیم نے ''گنبد کے کبوتر'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور اسے تہذیب کی مسماری سے تعبیر کیا ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردار ایک جذباتی اور حساس مسلمان ہے، اس کہانی کی کئی جہتیں ہیں اور ہر جہت کی ایک الگ تعبیر۔اس طرح دیکھیں تو کہانی میں معنوی اور فکری سطح پر تہ داری کا احساس ہوتا ہے۔بابری مسجد کی مسماری کے پس منظر میں لکھی گئی اس کہانی میں کبوتروں کے بے ٹھکانہ ہونے کی ایک تعبیر مشترکہ کلچر اور تہذیبی تشخص کی مسماری میں پوشیدہ ہے۔سید اشہد کریم نے بھی اپنے مضمون میں ''گنبد کے کبوتر'' کی بافت پر اپنی رائے پیش کی ہے۔ان کے مطابق گنبد کا رشتہ ہماری تاریخ اور تہذیب کے ساتھ ساتھ مذہبی شناخت کا بھی حصہ ہے اور کبوتر امن وآشتی کی علامت ہیں۔وارث علوی نے اس افسانے کو حقیقت نگاری کا مظہر بتایا ہے ۔حالانکہ جس ہنرمندی سے شوکت حیات نے اس موضوع کو بیان کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔اپنے مضمون میں ڈاکٹر محمد حامد علی خان نے یہ انکشاف کیا ہے کہ شوکت حیات ادب میں کسی بھی تحریک یا ازم سے وابستہ نہیں تھے۔ان کے مطابق ان کے تخلیقی تیور اور روایت سے انحراف وبغاوت کے میلان کو دیکھتے ہوئے ترقی پسند ادیبوں نے ان کی طرف خوب ڈورے ڈالے اور اپنی کانفرنسوں میں بھی شرکت کی دعوت دی، وہ شریک بھی ہوئے لیکن ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ڈاکٹر منصور خوشتر نے اپنے مضمون میں شوکت حیات کو اردو افسانے کی ایک منفرد آواز سے تعبیر کیا ہے۔ان کے مطابق شوکت حیات کا فکری محور انسان ہے اور ان کے یہاں فرقہ وارانہ فسادات اور مشترکہ کلچر کے زوال کے علاوہ پرانی تہذیبوں اور قدروں کی شکست وریخت بھی نظر آتی ہے۔اس

طرح ان کے افسانے سماجی، سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی حالات کی عکاسی کرنے میں کامیاب ہیں۔

ثالث کے شوکت حیات نمبر کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ریسرچ اسکالرز کے مضامین کو بھی خاطر خواہ نمائندگی دی گئی ہے اور یہ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کا ایک مستحسن عمل ہے۔اسی طرح ادب میں نئی لکھنے والوں کی نئی کھیپ وجود میں آتی ہے۔اس سلسلے میں عرفان رشید کا مضمون اچھا ہے، جس میں انہوں نے شوکت حیات کے کئی افسانوں کے اقتباس سے ان کے فنی اور فکری نظام کو سمجھنے کی کوش کی ہے۔ان کے مطابق ''گنبد کے کبوتر'' میں افسانہ نگار قارئین کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان ہجرت کا درد و کرب اب بھی جھیل رہے ہیں اور یہ افسانہ اس تلخ حقیقت کو منعکس کرتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ڈاکٹر قسیم اختر جو مارواڑی کالج کشن گنج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں انہوں نے اپنے مختصر مضمون میں کئی افسانوں کے اقتباسات پیش کئے ہیں تاہم ان کے افسانے ''کوا'' کو ایک علامتی افسانہ قرار دیا ہے، ان کے مطابق افسانہ نگار نے بھوک کے فلسفیانہ اظہار اور سرحد پار سے اپنے ملک کا موازنہ کرکے افسانہ کو خوبصورت بنانے کی کوشش کی ہے۔شوکت حیات کے افسانوں کے تعلق سے انہوں نے ایک بڑی اہم بات کی ہے کہ انہوں نے تہذیبی اور سیاسی اظہار میں بھی جذباتیت کا سہارا نہیں لیا ہے۔

ایم۔خالد فیاض نے اپنا مضمون، شوکت حیات کے تنقیدی مجموعہ ''بانگ'' کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔شوکت حیات نے ادب میں نامیاتی افسانے یا نامیاتیت کی اصطلاح رائج کرنے کی بہت کوششیں کی اور اس کے حق میں عقلی اور فکری دلائل بھی دیے۔اپنی اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے یہ تو افسانوں کے پارکھ یا فکشن کے نقاد ہی بتا سکتے ہیں۔ایم۔خالد فیاض نے اپنے مضمون میں یہ بھی بتایا ہے کہ شوکت حیات نے ہمیں ادب میں امکانی حقیقت نگاری یا امکانیت پسندی کی اصطلاح سے بھی متعارف کرایا ہے۔فکشن کے میدان میں شوکت حیات کی تنقیدی بصیرت سے کسی انحراف کی گنجائش نہیں، سن ستر کے بعد کے افسانہ نگاروں پر باقاعدگی سے اظہارِ خیال کرنے والوں میں شوکت حیات کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ڈاکٹر زرنگار یاسمین نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ شوکت حیات کے اندرون میں جو فنکار پوشیدہ ہے اس کی فطرت میں احتجاج ہے اس لیے وہ ایسے مواقع پر بھی احتجاج کی گنجائش نکال لیتے ہیں جہاں اس کا موقع نہیں ہوتا۔ڈاکٹر زرنگار یاسمین کی یہ رائے اگر درست ہے تو شوکت حیات کے یہاں فکری تضاد اور تصادم کی نشاندہی کرتی ہے۔ڈاکٹر وصیہ عرفانہ نے اپنے مضمون میں شوکت حیات کو اردو افسانے کے سنگِ میل سے تعبیر کیا ہے۔انہوں نے کئی افسانوں کے اقتباسات کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شوکت حیات کی فکر کا محور انسان ہے اور انہوں نے انسان کے باطن کی بیکرانی کو دراصل اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔انہوں نے زندگی سے فرار یا

گریز کی راہ اختیار کرنے کی بجائے زندگی سے متصادم ہونے کو مقدم جانا اور عرفانِ ذات کی ابدی جستجو کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ڈاکٹر وصیہ عرفانہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے لہجے کی بلند آہنگی کہیں کہیں کہانی کی تاثیر میں اضافہ کرنے کی بجائے ان کے افکار و نظریات کا پروپیگنڈا محسوس ہونے لگتی ہے۔اس حوالے سے انہوں نے شوکت حیات کے ایک افسانے ''سرخ اپارٹمنٹ'' کا ذکر کیا جس میں وہ اپنے سیاسی، سماجی اور اخلاقی نظریات کو پیش کرنے میں عجلت کا شکار ہو گئے ہیں۔ڈاکٹر گلاب سنگھ کے مطابق ترقی پسندی اور جدیدیت کے عروج و زوال کے دور میں شوکت حیات نے ایسے افسانے سے روبرو کرایا جو اپنی فکر و تخلیق،طرز و اسلوب،انداز و نگارش، تیور و تکنیک،ٹریٹمنٹ اور عندیہ کے اعتبار سے بالکل الگ،سب سے جدا اور سب سے منفرد تھا۔ڈاکٹر نزہت پروین نے بھی اپنے مضمون میں ان کے افسانے سرخ اپارٹمنٹ کا ذکر کیا ہے ان کے مطابق یہ ایک نظریاتی افسانہ ہے، جس میں دیواروں پر ضرب بھی پڑتی ہے، بنیادیں بھی ہلتی ہیں، عمارت بھی گرتی ہے۔مگر نظریہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔غالباً شوکت حیات کا اشارہ سقوطِ ماسکو اور اشتراکی نظریات کے انہدام کی طرف ہو۔

ثالث کے اس خصوصی نمبر میں سات خاکے بھی شامل ہیں،جن سے ریسرچ اسکالرز کے حق میں اس شمارے کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔اس سلسلے میں سب سے پہلا خاکہ مشتاق احمد نوری کا ہے جو بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔تقریباً 17 صفحات پر محیط اس خاکے میں مشتاق احمد نوری نے شوکت حیات سے اپنے بنتے بگڑتے رشتوں اور کھٹی میٹھی یادوں کو اس خاکے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ شوکت حیات اردو فکشن کا مرد تھا مگر اندر سے بہت ٹوٹا ہوا تھا۔اسے ایک ہی غم تھا کہ اس کی وہ پزیرائی نہیں ہو سکی جو اس کا مقدر تھی۔مشتاق احمد نوری نے اس خاکے میں یہ بھی تفصیل سے بتایا ہے کہ انہوں نے اپنے محکمے میں ڈیپوٹیشن پر شوکت حیات کی تقرری کے لیے کس طرح اس کی مدد کی، کتنے لوگوں سے اس کی سفارش کی، کتنے پاپڑ بیلے مگر محکمہ کی اندرونی سیاست کے نتیجے میں وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔مشتاق احمد نوری نے اپنی تحریر میں شوکت حیات کی ان عادات و اطوار کا بھی ذکر کیا ہے جن سے اس کے دوست اور ہمدرد ناراض ہو جایا کرتے تھے یہاں تک کہ اس نے اپنے کسی ریمارک سے شمس الرحمٰن فاروقی کو بھی ناراض کر لیا تھا نتیجتاً انہوں نے شب خون کے افسانوی انتخاب میں شوکت حیات کا ایک افسانہ بھی شامل نہیں کیا جب کہ شوکت حیات کے زیادہ تر افسانے شب خون میں ہی شائع ہوئے تھے۔عبدالصمد کا خاکہ بھی بہت عمدہ ہے۔۱۹۹۰ میں اپنے ناول دوگز زمین پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملنے پر شوکت حیات کے منفی ردِ عمل کا ذکر بھی انہوں نے خاکے میں کیا گیا ہے۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اپنی عمر کے آخری بیس برسوں میں وہ عجیب و غریب ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو گیا تھا۔ان بشری کمزوریوں کے باوجود وہ بلاشبہ ایک بڑا افسانہ نگار تھا،اس کی زندگی میں اس کی خاطر خواہ قدر نہیں

ہوئی مگر آنے والی نسلوں پر اس کا قرض ہمیشہ باقی رہے گا۔شوکت حیات پر غضنفر کا بھی ایک خاکہ سازِ بوالعجبی کا تارِ حیات کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔جس میں انہوں نے شوکت حیات کے ذہن ودل میں تضادات اور تصادم کی نشاندہی کی ہے،اس کے یہاں بیک وقت عجلت پسندی بھی نظر آتی ہے اور اطمینانِ قلب بھی۔ڈاکٹر منظر اعجاز نے اپنے خاکے ''شوکت حیات......کچھ یادیں......کچھ باتیں'' میں شوکت حیات کے تعلق سے کچھ واقعات کو قلم بند کیا ہے،ان کے مطابق بھی شوکت حیات کی شخصیت میں تضاد موجود تھا،ان کا انداز جارحانہ تھا۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ شوکت حیات اپنی زندگی کے آخری کچھ برسوں میں نفسیاتی مریض بھی ہو گئے تھے اور علاج کے لیے اسی ہسپتال میں داخل کیے گئے تھے جس میں کبھی مجاز لکھنوی زیرِ علاج رہے تھے۔وہ اپنی بیماری کے دوران بے سر پیر کی بھی اڑانے لگتے تھے۔رانچی سے واپسی کے بعد وہ خود یہ کہتے پھرتے تھے کہ آئن اسٹائن کی اتفاقاً ایک رگ پھڑک اٹھی تھی جس کے نتیجے میں وہ ایک عظیم سائنس داں بنا۔

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے بھی شوکت حیات پر ایک خاکہ اس خاص نمبر میں شامل کیا ہے جس میں انہوں نے شوکت حیات سے متعلق اپنے ذاتی تجربات کو قلم بند کیا ہے۔ان کے مطابق شوکت حیات کی شخصیت الجھی ہوئی تھی ، وہ بہت جلد اپنے دوستوں کو ناراض کر لیتے تھے مگر پھر جلد ہی سارے گلے شکوے بھلا کر گلے بھی مل لیتے۔نشاط پروین نے اپنے خاکے میں شوکت حیات سے اپنی دو ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے ان کے مطابق شوکت حیات نے بہار اردو اکادمی کے سکریٹری بننے کا بھی سپنا پال رکھا تھا جو پورا نہ ہو سکا۔

ثالث کے اس شمارے میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے شوکت حیات کے چار افسانوں کا تجزیہ بھی شامل کیا ہے۔مشتاق احمد نوری نے ان کے افسانے ''ذائقہ'' کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے،جس سے افسانے کی بافت اور کرافٹ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔''ذائقہ'' ذہنِ جدید میں شائع ہوئی تھی جسے زیادہ تر لوگوں نے جنس پر مبنی ایک افسانہ قرار دیا تھا مگر مشتاق احمد نوری نے اسے اپنے طور پر ایک بالکل نئی نہج پر سمجھنے کی کوشش کی۔انہوں نے واضح کیا کہ اگر یہ کہانی محض جنس پر مبنی ہوتی تو اپنے دوسرے ہی باب میں ختم ہو جاتی۔لیکن افسانہ نگار نے کہانی میں ماں کے ہاتھ کے کھانوں کے ذائقے کو کہانی کا کلائمکس بنا دیا ہے جو ہوسٹل کے کھانوں میں مفقود ہے۔اس طرح اس کہانی پر جنس زدگی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔غضنفر نے شوکت حیات کے افسانے ''بانگ'' کا مختصر تجزیہ کیا ہے۔

شوکت حیات کے افسانے ''میت'' کا تجزیہ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کیا ہے ان کے مطابق یہ کہانی عہدِ حاضر کی تلخ حقیقتوں کا اظہار ہے انہوں نے افسانے کے تانے بانے ، زبان و بیان ، واقعات کی تفصیل، قصے کی مرکزیت کے پیش نظر شوکت حیات کے اس افسانے کو black satire سے تعبیر کیا ہے۔اسلم جمشید پوری نے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''میت'' کئی سوالات بھی قائم کرتی ہے جو قاری کے ذہن ودل پر سیدھا اثر انداز

ہوتے ہیں۔ڈاکٹر توصیف احمد ڈار نے افسانے ''کوبڑ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے اخلاقی وتہذیبی اقدار کی زوال پزیری کا اشاریہ بتایا ہے۔ان کے مطابق لوٹ کھسوٹ اور ظلم و جبر کا سامنا کرنے کے باوجود کہانی کا مرکزی کردار کسی فوری تشدد یا ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کرتا، یہ افسانہ نگار کی تخلیقی بصیرت کا قابلِ داد پہلو ہے۔

ثالث کے اس خاص نمبر میں شوکت حیات کے دو مکالمات بھی شامل ہیں، سب سے پہلی گفتگو نثار احمد صدیقی نے کی، حالانکہ یہ بات کہیں واضح نہیں کی گئی کہ یہ گفتگو کب اور کہاں ہوئی، مگر دورانِ گفتگو جو سوالات کی گیئے وہ عصری ادب کی سمت و رفتار سے سروکار رکھتے ہیں۔ایک سوال کے جواب میں انہوں نے اپنا موقف اس طرح واضح کیا کہ ناقد کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ تخلیق کار اور تخلیق کا تجزیہ کے بجائے اس پر اپنی تھیوری کا اطلاق کرے۔زمانی اعتبار سے مابعد جدید فکر کی اہمیت ہوسکتی ہے لیکن فکری اعتبار سے یہ امکانیت پسندی کے مختلف shades پر مشتمل ہے۔دوسرا مکالمہ ڈاکٹر محمد غالب نشتر نے قائم کیا ہے جس میں وہ کئی ایسے سوالات کرنے میں کامیاب ہیں جن کا تعلق موجودہ ادب کی بدلتی ہوئی صورتِ حال سے ہے۔ایک سوال کے جواب میں شوکت حیات نے بتایا کہ ان کی پہلی کہانی ''بانگ'' نے سب سے پہلے ناقدین اور ادب کے سنجیدہ قارئین کی توجہ کا مرکز بنی جو ایمرجنسی اور فاشزم کے خلاف احتجاجی کہانی تھی حالانکہ اس کہانی کو شمس الرحمٰن فاروقی نے مصلحت کی بنیاد پر شب خون میں شائع کرنے سے معذوری ظاہر کردی تھی۔اس شمارے میں شوکت حیات کے کچھ خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں جو مختلف اوقات میں ادبی شخصیات کو لکھے گئے ہیں۔ان خطوط سے شوکت حیات کے ادبی موقف اور تحفظات کا عندیہ ملتا ہے۔

شوکت حیات نمبر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں شوکت حیات کے کئی مضامین اور افسانے بھی شامل کیے گئے ہیں جن سے ان کی مجموعی ادبی شخصیت سے آگاہی ہو جاتی ہے۔اپنے مضمون معاصر اردو افسانہ:تغیر وتبدل اور امکانی حقیقت نگاری میں شوکت حیات نے بتایا ہے کہ 70 کے بعد کی نسل ترقی پسندوں اور جدیدیوں کی از حد داخلیت پسندی سے اوبی ہوئی تھی۔ان کے مطابق اس دوران لکھے گئے افسانے عدم توازن کا شکار ہوگئے تھے۔انہوں نے اپنے اس مضمون میں بھی انامیت، نامیاتی کہانی، انام کہانی اور انامیاتیت وغیرہ کی اصطلاحات کو بھی اپنے موقف کا حصہ بتایا ہے۔اپنے مضمون مابعد جدید افسانہ میں بھی انہوں نے جدیدیت سے انحراف کرتے ہوئے اپنا یہ موقف دہرایا ہے کہ آج کا افسانہ محض چرب زبانی، کرتب بازی اور لفظوں کا گورکھ دھندا نہیں۔فکری نقطۂ نظر اور سماجی سروکار سے احتراز بھی اس کا شیوہ نہیں۔آج کا افسانہ اپنا جواز بھی خود فراہم کرتا ہے۔میری تھیوی سازی اور میرے افسانے میں شوکت حیات نے اصرار کیا ہے کہ ان کے افسانے اس تناظر میں دیکھے جائیں کہ یہ وہ نئے جدید اور مابعد جدید افسانے ہیں جو

دراصل نامیاتی اورامکانی ہیں اورانامیت، نامیاتیت اورامکانیت پسندی کے اوصاف سے مملو ہیں۔

شمارے کے آخر میں شوکت حیات کے سات افسانے اورناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' کوبھی شامل کیا گیا ہے۔ان افسانوں میں گنبد کے کبوتر، رانی باغ، مرشد، ذائقہ، بانگ، میت اورکوبڑ ہیں۔ چونکہ ان افسانوں پر اسی شمارے میں خاصی گفتگوہوچکی ہے، لہٰذاان کے بارے میں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ یہ افسانے شوکت حیات کے نمائندہ افسانے ہیں اوران پرآنے والے وقتوں میں بھی گفتگواوررائے زنی ہوتی رہے گی۔

اس شمارے میں غضنفر کی سوانح ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' پرڈاکٹر اقبال حسن آزاد کا تبصرہ شامل ہے جس میں مبصر نے غضنفر کی شخصیت کے کئی روپ کا تذکرہ ہے۔ثالث پر تفصیلی تبصرہ کرنے والوں میں عشرت ظہیر، سلیم انصاری (راقم الحروف)، عظیم اللہ ہاشمی، اصغر شمیم، ڈاکٹر منصور خوشتر، ریحان کوثر اور رو ندر جوگلیکر کے نام شامل ہیں۔اس کے علاوہ مکتوبات کے کالم کوبھی ضخامت کے باوجود حسبِ دستور جگہ دی گئی ہے۔

مجموعی طور پر ثالث کا یہ شمارہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہےاورآئندہ شوکت حیات پر تحقیق کرنے والوں کے لیے حددرجہ افادیت کا حامل ہے۔اتنے ضخیم شمارے کے لیے ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی کوششوں اور محنت کوسلام کہ انہوں نے شوکت حیات سے اپنی دوستی کا حق بھی ادا کیااورایک اہم ادبی فریضہ بھی ادا کیا ہے۔

◄ ● ►

● ڈاکٹر احسان عالم

کتابی سلسلہ ''ثالث'' شوکت حیات نمبر، شمارہ ۲۱۔۲۲ نہایت آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آچکا ہے۔اقبال حسن آزاد کی ادارت میں پابندی کے ساتھ شائع ہونے والا یہ رسالہ یوجی سی کیئرلسٹ میں شامل ہے۔اس وجہ سے اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔اس رسالہ نے ادبی حلقوں میں بہت جلد اپنی پہچان قائم کرلی ہے۔

اقبال حسن آزاد اپنے اداریہ میں لکھتے ہیں کہ آج کل پوری دنیا میں ایک عجیب سا ہنگامہ برپا ہے۔لیکن یہ ہنگامہ خیزی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔اگر دنیا کی تواریخ پرنظر ڈالی جائے تو آپ پائیں گے کہ یہ جہان آب وگل روز اول سے ہی ہنگاموں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔آدم خاکی کو دنیا میں کبھی بھی آرام اور چین حاصل نہیں ہوا۔آپ جسے زمانہ امن سمجھتے ہیں وہ دراصل ماندگی کا وقفہ ہے۔اوراس وقفے کے بعد پھروہی شوروشر، وہی زیروزبر، وہی ہنگامہ خیزی۔

اقبال حسن آزاد نے اردوادب کی ایک اہم شخصیت شوکت حیات پرنمبر نکال کررسالہ ''ثالث'' کودستاویزی حیثیت کا حامل بنا دیا ہے۔شوکت حیات عصرنو میں اردوافسانے کی منفرد آواز تھے۔تقریباً پانچ

دہائیوں تک وہ اردو افسانے کے افق پر چھائے رہے۔افسانے کی منفرد پہچان کے نام نمبر شائع کر کے اقبال حسن آزاد نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

زیر مطالعہ شمارہ میں حمد ،نعت ،شوکت حیات کے کوائف کے علاوہ بیس مضامین، خاکے، تجزیے، مکالمے،شوکت حیات کے خطوط،شوکت حیات کے مضامین،شوکت حیات کے افسانے، ناولٹ وغیرہ ہیں۔

رسالہ ''ثالث'' میں شامل پہلا مضمون ''شوکت حیات کی افسانہ نگاری'' کے عنوان سے ہے جسے پروفیسر وہاب اشرفی نے تحریر کیا ہے۔شوکت حیات کے حوالے سے موصوف لکھتے ہیں:

> ''دراصل شوکت حیات ایک Protest کے فنکار ہیں۔جن کے یہاں ناہمواریوں کے خلاف مسلسل جدوجہد ملتی ہے،صرف گلہ نہیں ملتا بلکہ ان سے ٹکرانے کا عزم بھی ملتا ہے۔تو کیا شوکت حیات ایسی صورت حال سے نپٹنے میں براہ راست برہنہ رویہ اختیار کرتے ہیں؟ جواب نفی میں ہے۔ وہ پختہ ذہن کے فنکار کی طرح آہستہ آہستہ اپنے ذہن کی تصویر کو مکمل کرتے ہیں اور اس کی تکمیل میں مناسب رنگ بھرتے ہیں جو ہر طرح سے متوازن ہوتا ہے۔'' (ص:۱۲)

وارث علوی اردو ادب کا ایک نمایاں نام ہے۔موصوف نے شوکت حیات کی افسانہ نگاری پر اپنی تحریر رقم کی ہے۔ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شوکت حیات ان جیالے لوگوں میں سے ہیں جو نہ تو کسی نقاد کی توجہ کی پروا کرتے ہیں نہ دوسروں کی بخشی ہوئی بیساکھیوں پر راہ ادب طے کرتے ہیں۔وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور اپنے اظہار و بیان کے طریقے آپ ہی ایجاد کرتے ہیں۔

فاروق ارگلی ''شوکت حیات کا فن'' کے عنوان سے ایک طویل مضامین قلمبند کیا ہے۔ان کے فن کے حوالے سے موصوف لکھتے ہیں:

> ''شوکت حیات سائنس کے طالب علم ہیں،انسانی نفسیات ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔انہوں نے انسانی زندگی اور سماج کا سائنٹفک تجربہ کیا ہے اور اپنے گرد وپیش وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور کرداروں کی نفسیاتی تحلیل کے ساتھ گونا گوں موضوعت پر زندہ اور متحرک افسانے تخلیق کیے۔موضوعات وہی ہیں جو ہندوستانی سماجی نظام میں نت نئی صورتوں میں سامنے آتے رہتے ہیں،ان پر مسلسل لکھا بھی جاتا رہا ہے لیکن یہ اس ذہن فنکار کا کمال ہے کہ انداز بیان،ٹریٹمنٹ اور مخصوص زاویۂ نظر ہی اس موضوع میں نئی زندگی اور تازگی کا احساس کراتے ہیں۔'' (ص:۲۸)

ڈاکٹر ابرار رحمانی نے بھی شوکت حیات کے افسانوں سے بحث کی ہے۔ان کے افسانوی انداز بیان کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں کہ تمام افسانوں میں شوکت حیات نے اپنے اردگرد کے واقعات اور سانحات کو جس خوبی اور فنکاری سے پیش کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ان کے ہاں ماجرا نگاری، پلاٹ، جاندار کردار سبھی کچھ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ان کے افسانے محض واقعات کی کھتونی نہیں ہیں۔انہوں نے جس باریکی سے واقعات کی پرتوں کو کھولا ہے، جس جزئیات نگاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سماج کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا ہے وہ ان کا کمال ہے۔

پروفیسر صفدر امام قادری نے ''شوکت حیات کا ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔''سرپٹ گھوڑا'' کے تعلق سے موصوف لکھتے ہیں:

> ''سرپٹ گھوڑا'' جدیدیت کے زور تھم جانے اور استعاراتی اسلوب بیان کے عہد شباب کے بعد کی تحریر ہے۔'شب خوں' میں اشاعت کے بعد شوکت حیات نے اس تحریر کو دوبارہ لکھنے کی کوشش کی اور اسے ظاہری طور پر پھیلانے میں وہ کامیاب رہے۔اسے ناولٹ کے طور پر پیش کرنے کے ارادے سے ہر چند کہ انہوں نے نظر ثانی کی تھی مگر عبدالصمد یا مشرف عالم ذوقی کی طرح سیاسی اور سماجی واقعات اور معاملات کی شمولیت سے اس کی ضخامت بڑھانے کے شاید وہ خوگر نہ ہوئے۔اس سے ان کے فنی طریقہ کار کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔'' (ص:۴۷)

ڈاکٹر سید احمد قادری اردو زبان وادب کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔انہوں نے ''شوکت حیات اور ان کے افسانے'' کے عنوان سے مضمون تحریر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں: ''شوکت حیات کا شمار ان خوش نصیب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جن کے ذکر کے بغیر ان کے عہد کی افسانہ نگاری کا کوئی بھی تذکرہ مکمل نہیں ہوا۔ بہار سے تعلق رکھنے والے ۱۹۷۰ء کے بعد کی دہائی کے کئی افسانہ نگاروں میں ایک تثلیث شوکت حیات، شفق اور حسین الحق کی ہوا کرتی تھی، بلکہ ہندو پاک کے اس دور کے افسانہ نگاروں کے سلسلے میں بھی کوئی تذکرہ یا مضمون ہوتا ان میں بھی شوکت حیات تقریباً پہلے نمبر پر ہی ہوتے تھے۔'' (ص:۶۲)

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی (صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ) کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ان کی تحریریں ہندوستان کے معتبر رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کا اردو جرنل ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ جرنل ان کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے۔انہوں نے ''شوکت حیات کا افسانوی اختصاص'' کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''شوکت حیات خوشبوؤں، خوبصورتیوں، روشنیوں، رنگوں اور امن وآشتی کی متلاشی ایک بے چین و بے قرار شخصیت کے مالک تھے۔ یہ بے قراری اور بے چینی شاید اس لئے تھی کہ متعفن فضاؤں نے خوشبوں کو جلا وطن کر دیا ہے، بدصورت کرداروں نے خوب صورتیوں کو نیست و نابود کر دیا ہے اور اندھیروں نے اجالوں کو مقفل کیا ہوا ہے۔ شوکت حیات امن وآشتی کی جلاوطنی اور خوب صورتی و روشنی کی قفل بندی پر پُرزور احتجاج کرتے ہیں۔ وہ ناہمواریوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے صرف گلہ نہیں کرتے بلکہ ان سے ہمہ وقت ٹکرانے کو تیار بھی رہتے ہیں۔'' (ص:۱۷)

''گنبد کے کبوتر'' تہذیب کی مسماری کا استعارہ'' عنوان سے ڈاکٹر صغیر افراہیم نے ایک جامع مضمون تحریر کیا ہے۔ ''گنبد کے کبوتر'' شوکت حیات کا ایک بہترین افسانوی مجموعہ ہے جو ۲۰۱۰ میں منظر عام پر آیا۔ شوکت حیات کی فنکارانہ خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

''شوکت حیات کو بیان پر فنکارانہ دسترس حاصل ہے۔ اس لیے یہاں مکالموں کا تفاعل، واقعہ یا صورت حال کی تشریح کا نہیں بلکہ حسیاتی اور جذباتی تاثر کی شدت میں اضافہ کرنے کا ہے۔ Irony یہ ہے کہ مذہبی شدت پسندی اور اس کے نتائج سے دونوں فرقے نبرد آزما ہیں مگر تلقین اسے کی جارہی ہے جو زیادہ مظلوم ہے۔ اسی سے کہا جارہا ہے کہ سوچنے کا انداز بدلو، قوت برداشت پیدا کرو، قناعت سے کام لو۔ اگر ایک ٹھکانا کھو گیا تو یہ نہ سمجھو کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔'' (ص:۸۹)

ڈاکٹر محمد حامد علی خان ''شوکت حیات کا فن'' کے موضوع سے لکھتے ہیں کہ شوکت حیات نام ہے ایک نہایت ہی حساس افسانہ نگار کا، ایک پُرمغز اور مفکر تنقید نگار کا جسے عبور حاصل ہے نہایت ہی ہموار نثر اور غیر معمولی زبان لکھنے پر جسے قدرت حاصل ہے بیان قصہ کے دوران یا نقطہ نظر کی وضاحت کے دوران زبان و بیان میں سب رفتاری کا رس گھولنے پر اور یہی وہ خوبیاں رہیں کہ ۱۹۷۰ء کے آس پاس جب شوکت حیات نے افسانہ نگاری شروع کی تو چند افسانوں کی اشاعت کے بعد ہی نہ صرف یہ کہ سنجیدہ قریوں کا ذہن ان کی طرف متوجہ ہوا بلکہ ادبی رسائل کے مدیران نے بھی ان کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا اور شوکت حیات کا قلم نت نئے بلکہ ان چھوئے موضوعات کو اپنی مخصوص رواں، سبک زبان میں افسانوں کا لباس دیتے ہوئے برق رفتاری کے ساتھ آگے نکلتا گیا۔

سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' کے مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر نے ''شوکت حیات: اردو فسانے کی منفرد آواز''

کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ شوکت حیات کے افسانوں کا فکری محور انسان ہے۔ وہ فرد کے داخلی اور خارجی بحران کا مطالعہ اس کے سماجی احوال کے ساتھ کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بعض کرداروں کے ذریعہ سماج کے کھوکھلے نظام اور دوغلے رویوں کے خلاف پرزور آواز بلند کی ہے۔''

ڈاکٹر صالحہ صدیقی (اسسٹنٹ پروفیسر، گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اردو، سمستی پوری کالج سمستی پور) نے ''حیات اردو افسانہ: شوکت حیات کا فکری وفنی مطالعہ'' کے عنوان سے اپنا مضمون لکھا ہے۔ شوکت حیات کے افسانوں کے تعلق سے وہ لکھتی ہیں: ''شوکت حیات کی کہانیوں کے کردار ہندوستانی معاشرے کے کردار ہیں جن میں ہر مذہب اور ہر ملت کے افراد شامل ہیں۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب، بدنیک، ظالم مظلوم، سنگ دل رحم دل، صاب شاکر جلد باز، کاہل انقلاب پسند ہر قسم کے کرداران کی کہانیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔'' (ص: ۱۲۱)

''شوکت حیات کے امتیازات'' کے عنوان سے ڈاکٹر زرنگار یاسمین نے ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں شوکت حیات کی افسانہ نگاری کے چند اہم خصوصیات کا تذکرہ بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ شوکت حیات ترقی پسند تحریک کے آخری دور اور جدیدیت کے ابتدائی زمانے میں ادبی منظرنامے پر ابھرے۔ یہ ۱۹۷۰ء کے آس پاس کا عہد تھا جب ترقی پسندی اپنے بال و پر تقریباً سمیٹ چکی تھی....ایسے ماحول میں جن گنے چنے افسانہ نگاروں نے اپنی راہ خود نکالی، کہانیوں کو چیستاں اور معمہ بننے سے بچایا اور استعاروں سے رشتہ جوڑنے کے باوجود کبھی ابہام پر اصرار نہیں کیا، ان میں شوکت حیات بھی ایک ہیں۔

ڈاکٹر وصیہ عرفانہ نے ''شوکت حیات: اردو افسانے کا سنگ میل'' کے عنوان سے ایک عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ اپنی سادہ، سلیس اور منفرد زبان میں محترمہ لکھتی ہیں:

> ''شوکت حیات نے انسان کے باطن کی بیکرانی کو دراصل اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے انسان کے اندرونی اضطراب کو اپنے افسانوں کے حوالے سے پیش کیا۔ اس اضطراب کی بے شمار وجوہات تھیں۔ یہ رشتوں کی شگفتگی کی وجہ سے ہو یا محبتوں کی صارفیت کی وجہ سے، سیاسی اتھل پتھل کی وجہ سے ہو یا معاشرتی کشاکش کی وجہ سے، اجتماعی نظام اس کا سبب ہو یا انفرادی گھٹن اس کی وجہ۔ مختلف اور متنوع اسباب یا حالات کی وجہ سے انسان کا باطن جن کیفیات کا اسیر ہوتا ہے، ان کو متشکل کرنا شوکت حیات کا امتیازی وصف ہے۔'' (ص: ۱۵۳)

''شوکت حیات کے افسانوں میں سانس لیتی سچائیاں'' ڈاکٹر گلاب سنگھ کا ایک پُرمغز مضمون

ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شوکت حیات نے اپنی تھیوری کے مطابق نامیاتی افسانے لکھ کر ادبی سفر کا آغاز کیا۔ انہوں نے جہاں روایت سے کہانی لی وہیں ترقی پسندیت سے جرأت مندی، حق گوئی اور بے باکی کو قبول کیا اور جدیدیت سے علامت نگاری کا اثر کیا۔ انہوں نے زبان و بیان میں بھی نئی روشنی پیدا کی چنانچہ ان کے نئے لہجے، کھرے زبان و بیان، ہیئت کے مختلف تجربوں، تکنیک کے نئے استعمال، فکری تعمق اور تخلیقی شعور کی روشنی میں لکھے گئے افسانوں کو ادبی دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

شوکت حیات پر کئی ادیبوں نے خاکے بھی تحریر کئے ہیں۔ اس شمارہ میں پہلا خاکہ بعنوان ''افسانے کا سکندر: شوکت حیات'' ہے جسے مشتاق احمد نوری نے لکھا ہے۔ اپنے خاکہ میں وہ لکھتے ہیں:'' شوکت حیات کا نام ذہن میں آتے ہی یادوں کے ستارے جھلملانے لگتے ہیں۔ اس چکاچوند میں یادوں کا انتخاب بہت جان لیوا ہوتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بھولوں کیا یاد کروں۔

''وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی'' کے عنوان سے معروف فکشن نگار عبدالصمد نے شوکت حیات پر ایک عمدہ خاکہ لکھا ہے۔ اپنے منفرد نوعیت کے خاکہ میں لکھتے ہیں:''شوکت حیات نے اپنی پوری زندگی جس چیز پر بہت محنت کی، وہ اس کی فن افسانہ نگاری تھی۔ وہ اپنی افسانہ نگاری کو عبادت درجہ دیتا تھا بلکہ شاید اس سے بھی کچھ بڑھ کے۔ وہ افسانہ کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے پر محنت کرتا تھا۔ ایک آدھ لفظ کی صحت پر اسے کچھ شک بھی ہوتا تو وہ اس کی درستگی کی جستجو میں لگ جاتا تھا۔'' (ص:۲۱۰)

معروف فکشن نگار غضنفر ''ساز بوالعجبی کا تارِ حیات'' عنوان سے ایک دلچسپ خاکہ رقم کرتے ہیں۔ اپنے خاکے میں شوکت حیات کے تعلق سے لکھتے ہیں:''جس شوکت حیات کے دل و دماغ میں لوہار کی بھٹی سے نکلے اسپات پر پڑی ہتھوڑے کی چوٹ سے چھٹکے شراروں کی مانند سرخ چنگاریاں اڑتی رہتی ہیں، اسی شوکت حیات کے لباس میں ہرے، نیلے پیلے رنگ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کپڑوں کی زمینوں پر رنگوں کے گل بوٹے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اندر کی زمین پر غم و غصے اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے کتنے انگارے بچھے ہوئے ہیں۔'' (ص:۱۲۱)

اس کے علاوہ ''شوکت حیات .....کچھ یادیں.....کچھ باتیں'' (ڈاکٹر منظر اعجاز)، ''بھول بھلیاں اور شوکت حیات'' (اقبال حسن آزاد)، ''شوکت حیات سے دو ملاقاتیں'' (نشاط پروین) خاکے کافی توجہ طلب ہیں۔

شوکت حیات کی کہانیوں مثلاً ''ذائقہ، بانگ، میت، کوبڑ'' پر مشتاق احمد نوری، غضنفر، پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر توصیف احمد ڈار نے تجزیے پیش کیے ہیں۔ مکالمے کے تحت ''شوکت حیات سے گفتگو'' اور ''شوکت حیات سے مکالمہ'' عنوان سے نثار احمد صدیقی اور ڈاکٹر محمد غالب نشتر نے متاثر کرنے والی گفتگو پیش کی ہے۔

قرۃالعین حیدر، ڈاکٹر ابرار رحمانی، عین تابش، سید احمد قادری، رفیع حیدر انجم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، اقبال حسن آزاد اور ڈاکٹر ارشد رضا کے نام شوکت حیات کے خطوط کو ’ثالث‘‘ کے اس شمارہ میں شامل کیا گیا ہے۔

قارئین کی دلچسپی کے مدنظر شوکت حیات کے مضامین ’’معاصر اردو افسانہ: تغیر و تبدل اور امکانی‘‘، ’’حقیقت نگاری‘‘، ’’مابعد جدید افسانہ‘‘، ’’میری تھیوری سازی اور میرے افسانے‘‘ شامل اشاعت ہیں۔

’’گنبد کے کبوتر، رانی باغ، مرشد، ذائقہ، بانگ، میت، کوبڑ‘‘ شوکت حیات کے اہم افسانے ہیں جنہیں رسالہ کے پیش نظر شمارہ میں شامل کیا گیا ہے۔

’’ثالث‘‘ کے گزشتہ شماروں پر کئے گئے تبصرے شامل ہیں۔ مکتوبات کے تحت فاروق ارگلی، مرغوب اثر فاطمی، عین تابش، غزال ضیغم، فخر الدین عارفی، غلام نبی کمار، ڈاکٹر اختر آزاد، وسیم فرحت، وسیم احمد فدا، جرنلسٹ اقبال، مختار بلال، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، احسان تابش، ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر گیاوی کے خطوط اس شمارہ میں موجود ہیں۔

اس طرح ’’ثالث‘‘ کا یہ شمارہ یقیناً دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ زبردست طریقے سے اس شمارے کی پذیرائی ہو رہی اور مزید ہوگی۔

◂◂ ● ▸▸

● رفیع حیدر انجم

کتابی سلسلہ ’’ثالث‘‘ شمارہ ۲۱۔۲۲ (شوکت حیات نمبر) مدیر اعزازی جناب اقبال حسن آزاد کے خوابوں کی تعبیر کا خوبصورت استعارہ ہے۔ رسالہ ’’ثالث‘‘ کی شناخت ادبی صحافت میں اب مستحکم ہو چکی ہے۔ شوکت حیات نمبر کے اداریہ میں اقبال حسن آزاد رقم طراز ہیں کہ ’’شوکت حیات کی بڑی خواہش تھی کہ ’’ثالث‘‘ میں ان پر گوشہ نکلے۔ افسوس کہ ان کی زندگی میں یہ کام نہ ہو سکا۔ لہذا میں نے ’’ثالث‘‘ میں ان پر گوشہ نکالنے کا ارادہ کیا.......... اس شمارے کے ترتیب کے دوران اتنی کثیر تعداد میں مضامین موصول ہوئے کہ گوشے کی جگہ پورا نمبر تیار ہو گیا۔‘‘ ’’ثالث‘‘ کا شوکت حیات نمبر اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال حسن آزاد نے نہ صرف یہ کہ شوکت حیات کی خواہش کا احترام کیا بلکہ اردو کے ایک منفرد و مایہ ناز فکشن نگار کے تخلیقی جہات کے تمام گوشوں کو منور کرنے میں کامیاب رہے۔ دستاویزی نوعیت کا یہ ضخیم شمارہ جس قرینے اور سلیقے سے مزین ہے، اقبال حسن آزاد کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فہرست میں اداریہ، حمد، نعت اور کوائف شوکت حیات کے بعد مشاہیر ادباء کے انیس مضامین شامل کئے گئے ہیں جن کے مطالعے کے بعد شوکت حیات کی فنِ افسانہ نگاری کے اسرار و رموز ہم پر کھلتے چلے جاتے ہیں۔ مستند و معتبر

مضمون نگار حضرات کے مضامین سے اخذ شدہ درج ذیل اقتباسات کو ذہن میں رکھنا یا ان پر غور وفکر کرنا شوکت حیات کے افسانوں کے امتیاز وانفراد سے واقفیت کے لئے ناگزیر ہیں۔

''دراصل شوکت حیات ایک Protest کے فنکار ہیں جن کے یہاں ناہمواریوں کے خلاف مسلسل جدوجہد ملتی ہے۔صرف گلہ نہیں ملتا بلکہ ان سے ٹکرانے کا عزم بھی ملتا ہے۔'' (پروفیسر وہاب اشرفی)

''شوکت حیات کو زبان اور بیان پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ان کے معمولی افسانوں میں بھی یہ حسن برقرار رہتا ہے۔ان کی نثر بڑی ہموار ہے۔'' (وارث علوی)

''شوکت حیات کے افسانوں میں اشاریت، رمزیت، ایمائیت اور علامت آرائی ضرور ہے۔ تشبیہات واستعارات کی نادرہ کاری بھی ہے لیکن شب خونی تجریدیت کی وہ طلسم سازی نہیں جہاں کہانی غائب ہوجاتی ہے اور نا قابل فہم انشا پردازی افسانہ کہلاتی ہے۔'' (فروق ارگلی)

''ان کے افسانے محض واقعات کی کھتونی نہیں ہیں۔انہوں نے جس باریکی سے واقعات کے پرتوں کو کھولا ہے، جس جزئیات نگاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سماج کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا ہے وہ ان کا کمال ہے۔'' (ڈاکٹر ابرار رحمانی)

''نئے اور انوکھے استعارے وضع کرنا، تفصیلات کے بجائے اشاروں میں گفتگو اور معنوی اعتبار سے متن میں ذرا پیچیدگی اتار دینے کی کوشش کرنا شوکت حیات کے وہ آزمودہ نسخے ہیں جنہیں وہ اپنے فکشن کا بہر طور حصہ بناتے رہے ہیں۔'' (ڈاکٹر صفدر امام قادری)

''شوکت حیات نے جدیدیت کے ہنگامی اور بحرانی دور میں بھی زندگی کی شدتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں ہئیتی اور فنی تجربہ کرنے کے باوجود سیاسی اور سماجی اعتبار سے ایک طرح کی حقیقت پسندی پر زور دیا ہے۔'' (ڈاکٹر سید احمد قادری)

''شوکت حیات کے اکثر افسانے بیانیہ لہجہ لئے ہوئے سامنے آئے مگر ان کا بیانیہ بالکل برہنہ اور شفاف نہیں ہوتا۔وہ ہلکے سے ابہام اور پردہ داری کے قائل ہیں جو تخلیق کے حسن کو بڑھاتی ہے اور تاثیر کی شدت میں سرتاسر اضافہ کرکے نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔'' (ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی)

''شوکت حیات کے یہاں موضوعات کا تنوع حیرت انگیز ہے۔'' (ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی)

''۱۹۷۰ کے بعد بیانیہ کی واپسی پر جو خصوصی توجہ دی گئی ہے اس لحاظ سے شوکت حیات کے یہاں بیانیہ اپنی مانوس شکل میں واپس آیا ہے۔'' (ڈاکٹر صغیر افراہیم)

''بیسویں صدی کا نصف آخر اور اکیسویں صدی کے ابتدائی حصے کی تاریخ کے دھندلے صفحات

جب بھی صاف ہوں گے تو اخبار کے تراشے، ٹی وی کے آسکرین شاٹ اور شوکت حیات کے افسانے اس ۷۰ سالہ ہندوستان کو سمجھنے میں معاون ہوں گے۔'' (ڈاکٹر سید اشہد کریم)

''۱۹۷۰ کے بعد جو بھی افسانہ نگار افسانوی منظرنامے پر نمودار ہوئے ان میں کوئی بھی شوکت حیات سے بہتر زبان یا نثر نہیں لکھ سکے۔'' (ڈاکٹر محمد حامد علی خان)

''شوکت حیات کے بعض افسانوں کے واقعات اور کردار پہلی نظر میں فرضی معلوم ہوتے ہیں لیکن جیسے جیسے آپ اس کردار کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ واضح ہوتا چلا جاتا ہے کہ ایسا ممکن ہے چاہے ایک لاکھ میں کوئی ایسا واقعہ اکیلا ہی کیوں نہ ہو۔'' (ڈاکٹر منصور خوشتر)

''شوکت حیات کی افسانہ نگاری کی بنیادی خصوصیات حقیقت نگاری اور اصلاح معاشرہ ہے۔ اس لئے وہ مقصدی افسانے لکھنے میں ذرا بھی نہیں کتراتے۔'' (ڈاکٹر صالحہ صدیقی)

''سچویشن سیریز کے ذریعے جدید افسانے کو انھوں نے توقیت عطا کی۔'' (عرفان رشید)

''شوکت حیات کے افسانوں میں زندگی کی نیرنگیاں پائی جاتی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دراصل ان کے افسانے شوکتِ حیات ہیں۔'' (ڈاکٹر قسیم اختر)

''شوکت حیات نے ''بانگ'' اور ''گنبد کے کبوتر'' کے عنوان سے بہترین افسانے ہی تخلیق نہیں کئے بلکہ افسانوی تنقید بھی لکھی گو وہ خود کو کوئی باقاعدہ نقاد نہیں سمجھتے۔'' (ایم۔خالد فیاض)

''افسانے کے بارے میں ویسے یہ بات مشہور ہے کہ ہر کہانی اپنا اسلوب خود وضع کر لیتی ہے۔ شوکت حیات کے متنوع موضوعات کو الگ الگ اسالیب میں دیکھ کر اس بات کی صداقت مان لینی پڑتی ہے۔'' (ڈاکٹر زرنگار یاسمین)

''شوکت حیات نے انسان کے باطن کی بیکرانی کو دراصل اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔'' (ڈاکٹر وصیہ عرفانہ)

''شوکت حیات کی بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے کہانی کو واپس لے کر آئے اور ادب میں تخلیقی جمود کو توڑنے کی بھی کامیاب کوشش کی۔'' (ڈاکٹر گلاب سنگھ)

''شوکت حیات نے افسانے میں ایک نیا تجربہ کیا جس کا نام انھوں نے انامیت رکھا۔'' (ڈاکٹر نزہت پروین)

مندرجہ بالا اقتباسات سے شوکت حیات کی فنِ افسانہ نگاری کے تمام جہات سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ فکشن کی تنقید شوکت حیات کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

شوکت حیات نمبر میں سات خاکے شائع کئے گئے ہیں۔ خاکہ نگاری کا فن شخصیت کی ہو بہو عکاسی کا نام ہے جس میں نہ صرف شخصیت کی ظاہری تصویر کشی کی جاتی ہے بلکہ باطن کا بھی احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کسی شخص کے ظاہر و باطن کا شگفتہ نثر میں احوال ایک عمدہ خاکے کا تاثر قائم کرتا ہے۔

شوکت حیات کے ظاہری خدوخال کے بارے میں مشتاق احمد نوری اپنے خاکہ میں لکھتے ہیں کہ

''اس کی شخصیت کافی مرعوب کن تھی. بڑا سا سر، کشادہ پیشانی، چوڑا چہرہ، دراز قد، گرج دار اور مرعوب کن آواز جسے سنتے ہی مقابل خواہ مخواہ سحر میں مبتلا ہو جائے۔ وہ خود کو انانیت کا امام سمجھتا تھا اور جب بھی جدید فکشن پر گفتگو کرتا تو اپنے سامنے آئینہ رکھ لیتا۔ خود کے علاوہ اسے کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ اپنے ہم عصروں کو پڑھتا ہی نہ تھا۔ اور شوکت حیات کے باطن کے احوال یہ ہیں کہ شوکت حیات اردو فکشن کا مرد تھا لیکن اندر سے بہت ٹوٹا ہوا تھا۔ ایک ہی غم تھا کہ اس کی وہ پزیرائی نہیں ہو سکی جو اس کا مقدر تھی۔''

مشتاق احمد نوری کے خاکہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے شوکت حیات کے ظاہر و باطن کو ایک ماہر نفسیات کی نظر سے دیکھا پرکھا اور جانا سمجھا ہے۔ جہاں تک پزیرائی کی بات ہے تو میرا خیال ہے کہ اردو افسانے کے حوالے سے ان کو ہمیشہ ایک بلند مقام پر رکھا گیا ہے۔ فکشن کے ہر بڑے ناقد نے انہیں اپنے تنقیدی مضامین میں سرِ فہرست رکھا اور فکشن کے تمام بڑے سیمیناروں میں انہیں مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ ان کے افسانے تمام اعلیٰ و معیاری رسالوں میں ترجیحی بنیاد پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ ہندی کے نامور افسانہ نگاروں کے درمیان بھی مقبول تھے۔ پزیرائی سے شوکت حیات کا مقصد اگر قومی سطح کے ادبی اداروں سے انعام/ایوارڈ ہے جو انہیں نہ مل کر ان کے دیگر ہم عصر افسانہ نگاروں کو مل گیا تو اس میں قصور ان کی کوتاہی کی تھی۔ شوکت حیات دراصل اس خود ساختہ زعم میں رہتے تھے کہ بغیر کسی Creative Evidence کے انہیں ایوارڈ دے دیا جائے جب کہ اصولاً ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی اخیر وقت میں آیا۔

عبدالصمد نے اپنے خاکہ میں معنی خیز جملے تحریر کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''اس کا قہقہہ بہت مشہور تھا۔ مختلف لوگ اس کے اپنے اپنے طور پر معنی نکالتے تھے۔ کبھی لگتا کہ یہ قہقہہ اس کے دل سے نکلا ہے۔ اس میں کوئی دکھاوا، کوئی کھوٹ، کوئی ریاکاری، کوئی مصلحت نہیں۔ کبھی یوں محسوس ہوتا کہ اس نے قہقہہ زبردستی لگایا ہے۔ اس میں کئی رنگوں کی آمیزش ہے۔''

ان جملوں میں قہقہہ ایک استعارہ ہے جو شوکت حیات کے باطن میں آتی جاتی لہروں کی غمازی کررہا ہے۔ ان لہروں میں کہیں قرار ہے تو کہیں انتشار ہے۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی اپنے خاکہ میں بیان کرتے ہیں کہ

''جب میں رسالہ ''آجکل'' میں آیا تو وہاں ان سے باضابطہ ملنے ملانے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور نتیجہ بایں جا رسید کہ وہ مجھ کو اپنا چھوٹا بھائی کہنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں قلم تو رہا لیکن قلم کا استعمال کب کرنا ہے، کیسے کرنا ہے اور کتنا کرنا ہے، شاید اس کا اندازہ وہ نہیں کرسکے۔''

ان جملوں سے آپ شوکت حیات کی غیر سنجیدہ اور بے نیازانہ ادبی روش کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

غضنفر اپنے خاکہ میں شوکت حیات کی بوالعجبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''اس کی عجلت پسندی کا یہ عالم ہے کہ اس کے کسی کام میں ذرا سی بھی تاخیر اسے غضبناک کردیتی ہے۔ ہتھے سے اکھاڑ دیتی ہے۔ جامے سے باہر کردیتی ہے۔''

یہاں شوکت حیات کے behaviortemperedShort کو محسوس کیا جاسکتا ہے.

ڈاکٹر منظر اعجاز نے شوکت حیات کی یادوں کے حوالے سے ان کی ان منتشر خیالی رکیفیات کی نشاندہی کی ہے جو ان کے اندرون میں کروٹیں بدلتی رہتی تھیں۔ شوکت حیات کو تاحیات یہ قلق رہا کہ وہ کسی باوقار عہدے پر فائز نہ ہوسکے۔ اخیر وقت میں انہوں نے اس سمت میں سنجیدگی سے سوچنا اور عمل پیرا ہونا چاہا مگر مناسب وقت گزر چکا تھا۔ ڈاکٹر منظر اعجاز نے لکھا ہے کہ ''افسانہ نگاری میں غالباً ان کے واحد استاد سہیل عظیم آبادی تھے جو نظریاتی طور پر ترقی پسند افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔''

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے جسے میں نے شان الرحمان کی زبانی سنا تھا۔ شان الرحمٰن سے دوران گفتگو شوکت حیات کی افسانہ نگاری کا ذکر نکل آیا تو وہ بتاتے ہیں کہ ایک بار شوکت حیات ان کے والد محترم سہیل عظیم آبادی سے اپنے افسانوں پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے اس بات پر اڑ گئے کہ میرے تمام افسانے انام نسل کے حوالے سے انام افسانے ہیں۔ کافی حیل وحجت کے بعد سہیل عظیم آبادی نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ اگر یہ انام افسانے ہیں تو ہوں گے مگر یہ ناجائز بچے سمجھے جائیں گے۔

اقبال حسن آزاد نے بھی اپنے خاکہ میں شوکت حیات کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ''بھول بھلیاں اور شوکت حیات'' کے عنوان سے ان کا خاکہ واقعی شوکت حیات کے باطن میں آراستہ بھول بھلیاں کی دریافت ہے۔ آخری خاکہ نشاط پروین کا ہے جس میں شوکت حیات سے دو ملاقاتوں کا دل

چسپ تذکرہ ہے۔تمام خاکوں کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ شوکت حیات کی شخصیت میں منفی شیڈز کا عمل دخل زیادہ رہا ہے۔مگر کلی طور پر منفیت ہی ہو،ایسا بھی نہیں ہے۔انہیں اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے بوجوہ پرخاش ہو تو ہو، وہ اپنے بعد کے تازہ کار و توانا افسانہ نگاروں سے متاثر بھی تھے اور ان کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کھلے دل سے کرتے تھے۔تجزیے کے تحت شوکت حیات کے افسانوں ذائقہ، بانگ، میت اور کوبڑ کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔افسانہ ''ذائقہ'' کا تجزیہ مشتاق احمد نوری کا ہے۔عنوان ہے''ذائقہ میں نئے ذائقے کی دریافت'' یہ وہ دریافت ہے جسے افسانہ نگار شوکت حیات نے اپنے افسانہ میں پوشیدہ رکھا تھا۔اس افسانے پر اقبال حسن آزاد نے اپنے شہر کے چند ادیبوں کے ہمراہ رسالہ''ذہنِ جدید'' کے لئے ایک مذاکرہ کرایا تھا۔اس مذاکرے میں شامل بیشتر شرکاء کی رائے تھی کہ افسانے میں ماں اور بیٹے کے مقدس رشتے کی تذلیل کی گئی ہے اور یہ کہ افسانے میں جنسی تلذذ کی کارفرمائی ہوئی ہے۔لہٰذا افسانہ قابل مذمت ہے۔اس مذاکرے کی رپورٹ''ذہنِ جدید'' میں شائع ہوئی تو شوکت حیات اتنے کنفیوژن کے شکار ہو گئے کہ انہیں سمجھ نہیں آیا، افسانے میں کیوں، کیسے اور کہاں جنسی تلذذ در آیا ہے۔یہاں تین باتیں ہو سکتی ہیں۔پہلی بات یہ کہ وہ افسانہ کے خالق تھے اور معترضین حضرات کا جواب بہتر طریقے سے دینے کے لئے کافی تھے۔دوسری بات یہ کہ وہ چاہتے تھے، کوئی دوسرا بڑا افسانہ نگار افسانہ کے پوشیدہ پہلوؤں کو اجاگر کرے اور اصل ذائقے کی نشاندہی کرے۔تیسری بات یہ کہ وہ افسانے کی نگیٹیو پبلیسیٹی چاہتے تھے۔شوکت حیات جس مزاج کے افسانہ نگار تھے، یہ بعید از قیاس بھی نہیں تھا۔محمد غالب نشتر کے انٹرویو میں شوکت حیات نے ایک جگہ کہا بھی ہے کہ'' کہانی شائع ہونے کے بعد مخالفت کی بھی شروعات ہوئی۔اسی مخالفت نے شہرت کی بھی کھڑکی وا کردی۔''

بہرکیف، مشتاق احمد نوری نے اپنے تجزیہ میں یہ واضح کرنے میں کامیاب رہے کہ افسانہ کسی طور بھی نہ تو جنسی تلذذ حاصل کرنے کے لئے لکھا گیا ہے اور نہ ہی ماں اور بیٹے کا مقدس رشتہ مجروح ہوا ہے۔یہ افسانہ اس ذائقے کی بات کرتا ہے جو آج کی جدید طرز حیات بدذائقہ ہو چکا ہے بلکہ یہ ذائقہ اپنی اصل لذت اور صورت کو کھو چکا ہے جو ایک صالح معاشرے کی علامت کے طور پر نسلِ انسانی میں سینہ بہ سینہ چلا آرہا تھا۔

افسانہ''بانگ'' کا تجزیہ مشہور و مقبول فکشن نگار غضنفر نے کیا ہے۔غضنفر کی نثر اتنی خوبصورت الفاظ اور دلکش اندازِ بیان سے مرصع ہوتے ہیں کہ بلند آہنگ کے افسانے کی تفہیم میں بھی نرمی، انکساری اور ملائمیت در آتی ہے۔انہوں نے جامعیت کے ساتھ افسانہ''بانگ'' کے مختلف وقوعوں کا احاطہ اتنی باریک بینی سے کیا ہے کہ افسانہ کی معنوی تہہ داری سے قاری کی آگاہی ہو جاتی ہے۔

افسانہ''میت'' کا تجزیہ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کیا ہے۔''میت'' بظاہر شفاف بیانیہ کا افسانہ

معلوم پڑتا ہے مگر سادگی میں پرکاری شوکت حیات کا امتیاز رہا ہے سو اس پرکاری کی بازیافت تجزیہ نگار نے فنکاری سے کیا ہے۔ تجزیہ قدرے طویل ہو گیا ہے۔

افسانہ ''کوبڑ'' کے تجزیہ میں ڈاکٹر توصیف احمد ڈار اخلاقی و تہذیبی اقدار کی زوال پذیری کو دریافت کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

مکالمہ کے تحت شوکت حیات سے نثار احمد صدیقی اور ڈاکٹر محمد غالب نشتر کا انٹرویو پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں انٹرویو سے شوکت حیات کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ان کے مطمح نظر کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے بعد ادارہ کی طرف سے شوکت حیات کے چند خطوط شامل کئے گئے ہیں جو انہوں نے قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر ابرار رحمانی، عین تابش، سید احمد قادری، پروفیسر اسلم جمشید پوری، اقبال حسن آزاد، ڈاکٹر ارشد رضا اور راقم الحروف کو مختلف وقتوں میں لکھے تھے۔ ان خطوط سے شوکت حیات کی متعلقہ ادیبوں سے فکشن کے حوالے سے پرخلوص و محبانہ وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔

شوکت حیات نمبر میں فکشن پر ان کے دو اہم تنقیدی مضامین اور اور ایک پیش لفظ جو ان کے افسانوں کے مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' میں شامل ہے، پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد کے اوراق میں شوکت حیات کے سات افسانے اور ایک ناولٹ کی اشاعت سے رسالہ ''ثالث'' کو وقار و اعتبار بخشا گیا ہے۔

رسالے کی معنویت میں مزید اضافہ کے لئے غضنفر کے سوانحی ناول ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' پر اقبال حسن آزاد کا تفصیلی تبصرہ ہے۔ اس سوانحی ناول کی عصری ادب میں بڑی شہرت ہے۔ غضنفر اردو فکشن کا ایک مستند و معتبر نام ہے۔ ان کی ہر تخلیق اپنی انفراد و امتیاز میں ثانی نہیں رکھتی۔ میں اقبال حسن آزاد کی اس بات کی تائید کرتا ہوں کہ ''غضنفر کا اسلوب ایک ایسا جادو ہے جو قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔''

''ثالث'' کے بقیہ اوراق میں گزشتہ شماروں کے حوالے سے مشاہیر ادباء کے تبصرے اور مکتوبات بھی لائقِ توجہ ہیں۔

مجموعی طور پر ''ثالث'' کا شوکت حیات نمبر ایک دستاویزی نوعیت کا شمارہ ہے جسے اردو ادب کے اسکالرز محفوظ رکھنا پسند کریں گے۔ اس نمبر کی اہمیت و افادیت کی گونج پوری ادبی دنیا میں سنائی دے رہی ہے۔ یہ شمارہ اقبال حسن آزاد کا شوکت حیات اور افسانوی ادب سے کمٹمنٹ کا قابل تحسین ثبوت ہے۔

◄◄ ● ►►.

● فخر الدین عارفی

اقبال حسن آزاد نے جو ''ثالث'] کے مدیر اعزازی ہیں، سب سے پہلے ان کی خدمت میں اپنی

جانب سے میں مبارک باد پیش کردوں کہ یہ شائد میرے لیے لازم بھی ہے اور ضروری بھی۔ انہوں نے بہت ایمان داری سے اپنا اخلاقی فرض ادا کردیا ہے، اس لیے کہ ''ثالث'' کا شوکت حیات نمبر شائد شوکت حیات کی وفات کے بعد شائع ہونے والے کسی قابل ذکر اور معیاری رسالے کا پہلا وقیع نمبر ہے، جو شوکت حیات پر شائع کیا گیا ہے۔ ۴۹۶ صفحات پر محیط یہ خاص نمبر یقیناً کئی اعتبار سے اپنی اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔ اس نمبر میں جو مضامین، خاکے اور تجزیے پیش کیے گے وہ سب اہم ہیں، اور میرے خیال میں مطالعہ کے لائق ہیں۔ خاص طور پر درج ذیل ادیبوں اور تخلیقی فنکاروں کے مضامین، تجزیے اور تبصرے اپنے منفرد موضوعات کے لحاظ سے بہت اہم ہیں اور متنوع بھی۔ ان سب کی نگارشات کو یقیناً اردو فکشن کے سنجیدہ قارئین نہ صرف پڑھیں گے، بلکہ ان رشحات قلم سے استفادہ بھی کریں گے۔ ان کی غیر مکمل فہرست درج ذیل ہے:

پروفیسر وہاب اشرفی، وارث علوی، فاروق ارگلی، ڈاکٹر ابرار رحمانی، صفدر امام قادری، سیّد احمد قادری، شہاب ظفر اعظمی، صغیر افراہیم، حامد علی خان، منصور خوشتر، صالحہ صدیقی، قسیم اختر، عرفان رشید، ایم۔ خالد فیاّض، گلاب سنگھ، زرنگار یاسمین، وصیہ عرفانہ، مشتاق احمد نوری، نزہت پروین، عبدالصمد، غضنفر، منظر اعجاز ،اقبال حسن آزاد، نشاط پروین، اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر توصیف احمد ڈار، نثار احمد صدیقی، غالب نشتر وغیرہ۔

شوکت حیات نمبر میں شوکت حیات سے مکالمے کے علاوہ خود شوکت حیات کے تخلیقی فن پاروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ جو یقیناً شائقین ادب کے لیے بہت اہم تحفہ ہیں۔ ان سب کے علاوہ بعض مشاہیر کے نام خطوط کو بھی نمبر میں مناسب جگہ دی گئی ہے۔ شوکت حیات کے مضامین بھی شریک اشاعت ہیں اور شوکت حیات کے نمائندہ افسانے بھی۔ ان کا ایک ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' بھی شامل اشاعت ہے۔ اقبال حسن آزاد کا اداریہ اچھا اور دانشورانہ ہے۔ شوکت حیات کے جن افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

گنبد کے کبوتر، رانی باغ، مرشد، ذائقہ، بانگ، میّت، کوبڑ، وغیرہ......

اس نمبر میں شوکت حیات کے تحریر کردہ چند مضامین کو بھی شائع کیا گیا ہے، مثلاً: ''معاصر اردو افسانہ: تغیّر وتبدل اور امکانی حقیقت نگاری'' ''مابعد جدید افسانہ، میری تھیوری سازی اور میرے افسانے'' وغیرہ

جلد نمبر ۶۷ شمارہ نمبر ۲۱۔۲۲۔ قیمت ۵۰۰ روپے۔ رابطے کے لیے موبائل نمبر:

9430667003

◂◂ ● ▸▸

● کامران غنی صبا

شوکت حیات مرحوم (اللہ انہیں غریق رحمت کرے) بحیثیت انسان مجھے کبھی پسند نہیں آئے۔ وہ

بہتوں کو پسند نہیں تھے لیکن پھر بھی صاحب سلامت کی حد تک مخالفین سے اُن کے مراسم تھے۔ میں تعلق ڈھونے کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے اپنا یہ شعر بہت پسند بھی ہے۔

منافقت نہیں آتی سو، رنجشوں کے بعد تعلقات کا ہم اختتام کرتے ہیں

شوکت حیات صاحب سے فون پر کبھی کبھار میری بات چیت ہو جایا کرتی تھی۔ جب سے انہوں نے ''پندار'' میں اپنے اوپر خصوصی گوشہ کی اشاعت کے لیے اصرار کرنا شروع کیا اور بار بار تقاضا کرنے لگے تب سے میں نے اُن سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ پھر ایک بار کچھ ایسا ہوا کہ میں نے مکمل طور پر اُن سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اب اُن کی وفات کے بعد اُس واقعہ کا ذکر مناسب نہیں ہے۔

شوکت حیات ذاتی طور پر مجھے گرچہ کبھی پسند نہیں آئے لیکن ادبی حوالے سے میں نے ہمیشہ ان کا احترام کیا۔ دربھنگہ ٹائمز کے ناول نمبر میں اشاعت کے لیے جب اُن کے ناول ''زہریلا پمفلٹ'' کا ایک باب موصول ہوا تو میں نے کوئی مخالفت نہیں کی۔ اُن کا کوئی بھی افسانہ قرات کا حصہ بنے بغیر میری نظر سے نہیں گزرا۔ ان کی شخصیت کی پُر اسراریت نے اوروں کی طرح مجھے بھی ہمیشہ حیران کیا۔ میں تو ادب کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ میری رائے کی اہمیت ہی کیا ہے لیکن اِس حقیقت سے انکار کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ شوکت حیات اردو فکشن کا ایک معتبر نام تھا، ہے اور رہے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ شوکت حیات کو سب سے زیادہ نقصان اگر کسی نے پہنچایا تو وہ خود اُن کا وجود ہے۔ یہ شعر ان کی شخصیت پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

میں اپنے آپ سے آگے نکل سکا نہ کبھی مرا وجود مرے راستے کا پتھر تھا

یہ سچ ہے کہ شوکت حیات کی قدر اُن کی زندگی میں نہ ہو سکی اور یہ بھی سچ ہے کہ اُن کی وفات کے بعد بھی انہیں اس طرح یاد نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ قابلِ مبارکباد ہیں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کہ انہوں نے ''ثالث'' کا پورا ایک شمارہ شوکت حیات کے لیے وقف کر دیا۔ ''ثالث'' کا تازہ شمارہ ۴۹۶ صفحات پر مشتمل شوکت حیات نمبر ہے۔ اِس خصوصی شمارہ میں شوکت حیات کے فن پر ۲۰ ر مضامین، ۷ ر خاکے، ۴ ر افسانوں کے تجزیے، ۲ ر انٹرویو، شوکت حیات کے ۷ ر منتخب افسانے، ایک ناولٹ (سرپٹ گھوڑا) اور شوکت حیات کے تین مضامین شامل ہیں۔ مضامین، تجزیے، خاکے، افسانے اور انٹرویو کا تناسب اقبال حسن آزاد کے حسن ادارت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

مضامین کے حصے میں پروفیسر وہاب اشرفی، وارث علوی، فاروق ارگلی، ڈاکٹر ابرار رحمانی، پروفیسر صفدر امام قادری، ڈاکٹر سید احمد قادری، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر صغیر افراہیم، ڈاکٹر سید اشہد کریم، ڈاکٹر حامد علی خاں، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، عرفان رشید، ڈاکٹر قسیم اختر، ایم خالد فیاض، ڈاکٹر زرنگار

یاسمین، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ، ڈاکٹر گلاب سنگھ اور ڈاکٹر نزہت پروین نے شوکت حیات کی افسانہ نگاری کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا ہے۔شوکت حیات کے فن کو سمجھنے میں یہ مضامین انتہائی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

میری نظر میں ''شوکت حیات نمبر'' کا سب سے خاص حصہ خاکوں پر مشتمل ہے۔ان خاکوں کو پڑھنے کے بعد شوکت حیات کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہمارے تصور میں ابھرتی ہے۔مشتاق احمد نوری، شوکت حیات سے بہت قریب رہے ہیں۔انہوں نے شوکت حیات کے آخری سفر تک ان کا ساتھ نبھایا، یہاں تک کہ اُس وقت جب ان کے انتہائی قریبی دوستوں اور رشتہ داروں نے بھی اُن کا ساتھ چھوڑ دیا، نوری صاحب نے حق دوستی ادا کیا۔وہ کووڈ ۱۹ کی دہشت کے دور میں شوکت حیات کے جنازے میں شامل ہوئے۔مشتاق احمد نوری نے اپنے خاکے میں تمام جزئیات کے ساتھ شوکت حیات کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی کی ہے۔یہاں تک کہ بعض ایسی باتیں بھی لکھ گئے ہیں جن سے شوکت حیات کے ساتھ ساتھ خود مشتاق احمد نوری کا خاکہ بھی ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔مثلاً:

''میں نے اُسے اطمینان دلایا اور یہ بھی کہا کہ بڑا بابو کی مٹھی گرم کر دوتا کہ وہ تمہارے خلاف آئندہ سے نہ لکھے۔''

''شدید غصے کی حالت میں اکثر میں الف ننگا ہو جاتا ہوں اور کیا کیا بک جاتا ہوں مجھے معلوم نہیں رہتا۔''

''اس کی حماقت بھری معصومیت پر مجھے بہت غصہ آیا،اس کے ساڑھو کو کچھ گالیاں دیں اور اسے کہا کہ بھولے راجہ دوستوں کو پہچاننا سیکھو، ساڑھو کی (۔۔۔۔۔) پر لات مارو۔'' (قوسین کے بیچ کا لفظ کیا ہوگا، سمجھا جا سکتا ہے۔)

مشتاق احمد نوری کے خاکے کا آخری حصہ شوکت حیات کی زندگی کی وہ دردناک حقیقت ہے جسے پڑھتے ہوئے بدن پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔شوکت حیات کی زندگی کو قریب سے سمجھنے کے لیے مشتاق احمد نوری کا خاکہ ضرور پڑھنا چاہیے۔عبدالصمد، ڈاکٹر ابرار رحمانی، غضنفر، ڈاکٹر منظر اعجاز، اقبال حسن آزاد اور نشاط پروین کے خاکے بھی اہم ہیں۔ان خاکوں کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شوکت حیات سے ذاتی طور پر اُن کے ہم عصروں کو شکایتیں ضرور رہی ہیں لیکن ان کے فن کا اعتراف اُن کے مخالفین نے بھی کیا ہے۔

''شوکت حیات نمبر'' میں دو انٹرویو بھی شامل ہیں۔یہ انٹرویو نثار احمد صدیقی اور ڈاکٹر محمد غالب نشتر نے لیے ہیں۔دونوں انٹرویو میں کل ملا کر ۱۵ سوالات پوچھے گئے ہیں لیکن ان میں اکثر سوالات عمومی

نوعیت کے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شوکت حیات سے کچھ ایسے سوالات بھی پوچھے جانے چاہیے تھے جن سے ان کے ذہنی رویے بلکہ ذہنی انتشار کی وجوہ کی گرہیں کھلتیں۔

شوکت حیات کے سات افسانے اور ایک ناولٹ (سرپٹ گھوڑا) کو ثالث کے اس خصوصی شمارے میں جگہ دی گئی ہے۔ ساتھ ہی شوکت حیات کے کچھ خطوط بھی اس نمبر میں شامل کیے گئے ہیں۔ کُل ملا کر مدیر رسالہ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے شوکت حیات پر ایک بھرپور نمبر نکال کر اپنا ادبی اور اخلاقی فریضہ ادا کیا ہے۔ ثالث کا یہ خاص نمبر ۵۰۰/روپے میں بک امپوریم پٹنہ یا ڈاک کے ذریعہ ثالث کے دفتر شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ مونگیر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

◄◄ ● ►►

● ڈاکٹر احسان تابش

ثالث کا ''شوکت حیات نمبر'' معروف افسانہ نگار جناب اقبال حسن آزاد کی مدیرانہ صلاحیت کا آئینہ دار ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے۔ مضامین، خاکے اور تجزیے اہمیت کے حامل ہیں. خاص طور پر خاکے اور تجزیے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ثالث کے گزشتہ شمارے پر تبصرے قابل مطالعہ ہیں۔ اس پر آشوب دور میں ثالث دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔

سال ۱۹۷۷ء کا تھا شوکت حیات سے میری پہلی ملاقات آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں ہوئی تھی۔ کبھی شوکت حیات بسکومان کے آس پاس مل جاتے کبھی سبزی باغ میں دکھ جاتے۔ جب بھی ملتے بس یہی کہتے لکھتے رہو پڑھتے رہو پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔ پھر بولتے بولتے نہ جانے انہیں کیا ہو جاتا۔ بڑبڑاتے ہوئے کہتے اردو والے اردو کے دشمن ہیں۔ آستین کے سانپ ہیں۔ شوکت حیات میرے دوست نہال مرحوم کے ساڑھو تھے۔ شوکت حیات گیا جب بھی آتے ان سے میری ملاقات ہوتی۔ ''بانگ'' اور ''گنبد کے کبوتر'' کو بار بار پڑھنے کو کہتے۔

شوکت حیات جدوجہد کی علامت تھے۔ انہیں ہمیشہ اپنوں سے گلہ رہا۔ اردو فکشن میں شوکت حیات ایک بڑا نام تھا ہے اور رہیگا۔

فکشن کے سمیناروں میں نظر آنے والے شوکت حیات کے افسانے معیاری رسالوں میں چھپتے رہے پھر بھی اردو بستی کے لوگوں سے انہیں شکایت تھی۔ ''میں'' کے دائرے سے شوکت حیات کبھی باہر نہیں نکلے۔ سوالات کرنا اور لکھنا ان کی عادت تھی۔ ان کا جارحانہ انداز ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ ان کا ''میں'' انہیں چاٹ گیا۔ وہ نفسیاتی مریض بن گئے۔ انتشار کے شکار ہو گئے تھے شوکت حیات۔ وہ کسی کی

نہیں سنتے تھے۔اپنے کہے کو حرف آخر سمجھتے تھے۔اپنی بات پر اٹل رہتے تھے۔

ثالث کے شوکت حیات نمبر میں ان کی شخصیت کے کئی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔معروف فکشن نگار غضنفر کا تجزیہ اپنی مثال آپ ہے۔

شوکت حیات کے بارے میں فیسر وہاب اشرفی کا خیال ہے۔

''شوکت حیات کے یہاں ناہمواری کے خلاف جدوجہد ملتی ہے۔وہ پختہ ذہن کے فنکار کی طرح آہستہ آہستہ اپنے ذہن کی تصویر کو مکمل کرتے ہیں۔ایک انقلابی ذہن میں کیسی تخلیقی روشنی پیدا ہوسکتی ہے اس کا ایک مکمل منظر نامہ شوکت حیات کے افسانے ہیں۔''

وارث علوی لکھتے ہیں۔

''شوکت حیات ان جیالے لوگوں میں ہیں جو نہ تو کسی نقاد کی توجہ کی پروا کرتے ہیں۔وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور اپنے اظہار و بیاں کے طریقے آپ ہی ایجاد کرتے ہیں۔

''فاروق ارگلی'' کی نظر میں

''شوکت حیات'' کے افسانے عصر حاضر کے ایسے افسانوں کی داغ بیل ڈالتے ہیں جو بیک وقت عصری اور آفاقی افسانوں کے آمیزے اور اختصاص و انفراد سے مملو ہیں۔افسانوں کی تصویر کشی جس دردمندی کے ساتھ شوکت حیات کے یہاں ملتی ہے وہ دوسروں کے یہاں نہیں۔

اردو فکشن نگار مشتاق احمد نوری رقمطراز ہیں

.''شوکت حیات''اردو فکشن کا مرد تھا لیکن اندر سے بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

پروفسر صفدر امام قادری خوب لکھتے ہیں۔''سرپٹ گھوڑا'' پر انہوں نے ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے......فکری تناظر میں اہم اور منفرد ہے۔ان کی ناقدانہ بصیرت بھی خوب ہے۔

صغیر افراہیم،مشاق احمد نوری،اقبال حسن آزاد،سید اشہد کریم،منصور خوشتر،حامد علی خاں،زرنگار یاسمین اور سید احمد قادری کا مضمون معلوماتی ہے۔

فکشن نگار مشتاق احمد نوری،عبدالصمد،اور اقبال حسن آزاد کے خاکے لائق مطالعہ ہیں۔اسلم جمشید پوری،غضنفر اور مشتاق احمد نوری کے تجزئے رسالے کی معیار کا پتہ دیتے ہیں۔

شوکت حیات کے خطوط اور مشاق احمد نوری کی تحریر''افسانے کا سکندر. شوکت حیات'' پڑھ کر شوکت حیات کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔

میری نظر میں شوکت حیات

قصہ کہنے کا فن جانتے تھے ۔چہروں کی بھیڑ میں منفرد تھے۔سماجی استحصال ، معاشرے کی ناہمواری، اخلاقی زوال ،سیاسی نفرت ، دہشت گردی پر گہری نظر رکھنے والے شوکت حیات نے عہد حاضر کے درد کرب کو فنکاری سے پیش کیا۔ وہ ایک اچھے مفکر تھے۔عقل وشعور ان کا پختہ تھا۔ ماحول کا مشاہدہ باریک بینی سے کرنے والے اپنی بات پر اڑنے والے''میں'' کے دائرہ میں رہنے والے کا نام شوکت حیات تھا۔سوانحی ناول ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' معروف قلمکار غضنفر کی تصنیف ہے۔اس تصنیف پر اقبال حسن آزاد کا تبصرہ خوب سے خوب تر ہے.!

ہڈی کا درد سر اٹھا رہا ہے۔اب لکھنا مشکل ہو رہا ہے۔

آخر میں بس اتنا کہنا ہے کہ ثالث کا'' شوکت حیات نمبر'' طالب علموں کے لئے فائدہ بخش ہے۔غرض ''شوکت حیات نمبر'' معیاری معلوماتی اور قابل قدر ہے اور ثالث کی اہمیت وافادیت منفرد و قابل تعریف ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مانگ کر نہیں خرید کر پڑھنے والے بنیں۔

اللہ پاک شوکت حیات کی مغفرت فرمائے آمین۔

بندہ جیسا بھی تھا لاجواب تھا۔

◀◀ ● ▶▶

● صابر رضا رہبر

زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان رسالہ 'ثالث' مونگیر کا شوکت حیات نمبر کے مطالعہ سے شاد کام ہوا۔رسالہ کی ترتیب وتہذیب مدیر محترم اور ان کی ٹیم کی صلاحیتوں کی منھ بولتی تصویر ہے۔'ثالث' کا اپنے مشمولات اور حسن انتخاب کے لحاظ سے تاریخی شمارہ ہے جسے علم وادب کی دنیا میں زبردست پذیرائی ملی۔شوکت حیات اپنے عہد کے مستند، نامور اور البیلے فن کار تھے۔اردو ادب میں 'انامیت' کی تھیوری ان کی مرہون ہے۔اپنے مخصوص رنگ وآہنگ کے سبب اردو ادب میں ان کی منفرد شناخت قائم ہوئی۔وہ 'انام نسل'،'انام افسانے' کے بنیاد گزار قرار پائے اور 'نامیاتی افسانوں'، 'نامیاتیت'،'امکان پسندی'، اور 'مابعد جدید افسانوں' کی وجہ سے موضوع بحث رہے۔

اس خصوصی شمارہ کے اجرا کی تقریب میں راقم الحروف کو بھی شرکت کا موقع ملا۔ بزم صدف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام منعقد اس تقریب میں شوکت حیات کی زندگی کے مختلف گوشوں پر شرکاء نے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ان کے فکر وفن کے ساتھ ان کی ذاتی زندگی سے متعلق کچھ کہی اَن کہی باتوں کو بھی موضوع گفتگو بنایا گیا۔روایتاً تقریباً تمام مقررین نے کہا کہ شوکت حیات کی زندگی میں انہیں وہ پذیرائی نہیں ملی یا وہ

مقام نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ آدھا سچ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب کو 'انا میت' کی تھیوری دینے والے فن کار کو اردو دنیا نے یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے وہ اردو کے تقریباً تمام قومی سیمیناروں میں بلائے جاتے رہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سیمینار میں بھی وہ مدعو کیے جاتے رہے۔ ساہتیہ اکادمی کے گرانٹ پر انہوں نے ملک بھر کے ثقافتی علاقوں کی سیر وسیاحت کی۔ ''گنبد کے کبوتر'' کے لیے ۱۹۹۶ء میں قومی کتھا ایوارڈ دیا گیا۔ ۲۰۰۸ء میں بہار اردو اکادمی نے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے سرفراز کیا اور چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی نے ۲۰۰۹ء میں شیلڈ آف آنر سے نوازا۔ گنبد کے کبوتر کے لیے ۲۰۱۱ء میں یوپی اردو اکادمی کا پہلا انعام دیا گیا۔ ایسے میں یہ کہنا کہ ان کے ساتھ اعزاز، اکرام اور احترام میں ناانصافی کی گئی مناسب نہیں لگتا ہے۔ کتنے فنکار ہیں جنہیں دنیا و ملک کے تمام اعزاز وایوارڈ مل گئے ہوں۔ حالانکہ اسی تقریب میں جناب اسلم جاوداں اور جناب امتیاز کریمی نے متعدد واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی طبیعت میں داخل چلبلا پن ان کے ادبی انحطاط کا باعث بنا۔ جناب اسلم جاوداں کی اس بات سے میں مکمل طور پر متفق ہوں کہ شوکت حیات کا لا ابالی پن، مزاج کی ترنگ اور ضد کے ساتھ ساتھ ان کے گھر والوں کا رویہ بھی ان کے فنی وادبی زوال کے لیے قصوروار ہے۔ ان کے اہل خانہ ان کی حوصلہ افزائی کے بجائے ادبی تنظیموں کی نظر اندازی اور ایوارڈ وغیرہ نہ ملنے پر ان کی مایوسی کو جائز قرار دیتے رہے جس کے سبب وہ ذہنی انتشار کے دلدل میں پھنستے چلے گئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ ادبی دنیا نے انہیں یکسر فراموش کر دیا بلکہ انہیں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا مگر خود ان کے مزاج نے انہیں ادب نوازوں اور ادبی تنظیموں سے دور کر دیا۔ ان کے رنگ روپ، طبیعت میں بچکانہ پن اور عدم سنجیدگی نے لوگوں کو ایک خوف میں مبتلا کر رکھا تھا۔ لوگوں کو لگتا تھا کہ شوکت حیات کو پروگرام میں بلانے سے مٹی پلید ہو جائیگی اور ایسے خدشات کا اظہار کئی مقررین نے بھی کیا۔ وہ ایک بار انقلاب کے ارکان کی دعوت کرنا چاہتے تھے۔ احمد جاوید صاحب سے باتیں ہو چکی تھیں پھر بھی ایک شام اچانک ہاف پینٹ اور گنجی میں بڑے بڑے رنگ برنگے مالوں سے لدے انقلاب کے دفتر میں آدھمکے۔ ان کے اس رنگ روپ کو دیکھ کر گیٹ پر تعینات گارڈ بھی ان کے پیچھے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ ادھر دفتر میں گھستے ہی کرخت آواز میں بولے کہ دعوت ہے، یہ یاد دلانے آیا ہوں، احمد جاوید صاحب انہیں بیٹھنے کے لیے کہتے رہے مگر وہ اسی تیزی کے ساتھ نکل گئے۔

میری مرتب کردہ کتاب 'عرضداشت' پر انہوں نے پیش لفظ لکھا ہے۔ جب کتاب چھپ کر آئی تو پروفیسر صفدر امام قادری صاحب نے ایک کاپی انہیں کے گھر پہنچانے کے لیے کہا کہ جب دفتر جاتے ہوئے وقت نکال کر ان کے فلیٹ بھی چلے جائیے گا۔ میں نے ان سے کال کر کے وقت بھی لے لیا مگر جب فلیٹ پر

پہنچا تو دیکھا کہ دروازے کے سامنے کئی دن کے اخبار پڑے ہیں۔ایسا لگتا تھا جیسے یہ فلیٹ کئی دنوں سے بند ہےاور ہاکر اخبار باہر ہی چھوڑ جاتا ہے۔ میں پریشان ہوگیا۔گارڈ سے پوچھا،تو معلوم ہوا کہ وہ بغل کے اپارٹمنٹ میں اپنی بیٹی کے گھر پر ہیں۔وہاں سے جب انہیں کال کیا کہ میں آپ کے فلیٹ پر ہوں تو جواب آیا کہ میں باہر ہوں۔ میں جواب سن کر جھلا گیا اور صفدر سر کو فون کیا۔تھوڑی دیر بعد صفدر سر نے بتایا کہ ان کی بیٹی کے فلیٹ پر چلے جائیں وہ وہیں ہیں۔(دراصل انہوں نے اخبارات اس لیے پھیلا دیے تھے تا کہ آنے والوں کو لگے کہ وہ کئی دنوں سے گھر پر نہیں ہیں) جب فلیٹ پر پہنچا اور بیل بجائی تو بھاری بھرکم شوکت حیات نے دروازہ کھولا اور کھڑے کھڑے عرضداشت کا پیش لفظ پڑھنے لگے۔ میں کھڑا رہا سنتا رہا۔تھوڑی دیر بعد پیچھے ہٹتے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں اندر داخل ہوکر ہیلمٹ صوفے کے نیچے رکھ کر بیٹھ گیا۔وہ بھی صوفے پر براجمان ہوگئے اور تیز آواز میں مقدمہ کی قرأت کرنے لگے۔خیر ہوا کہ وہ دو چار صفحات کی ورق گردانی کے بعد ہی کتاب بند کر کے مقدمہ کی تعریف کرنے لگے۔ان کا سلسلہ کلام منقطع نہیں ہو رہا تھا۔ ادھر دفتر کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ میں نیڈر رے سہمے انداز میں قطع کلام کی جسارت کرتے ہوئے دفتری مجبوری بتا کر جانے کی اجازت چاہی۔انہوں نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر کہا کہ ہاں ٹھیک ہے جائیں،صحافی کی دفتری مجبوریاں ہوتی ہیں اور کچھ کہنے سننے کا موقع بھی نہیں دیا۔جھٹ سے فلیٹ کا دروازہ بند کرلیا۔ میں نیچے آیا تو یاد آیا کہ ہیلمٹ بھول آیا ہوں ، اسی لیے دوبارہ سیڑھیاں چڑھ کر گیا۔بیل بجائی تو دروازکھولا۔ میں نے کہا کہ ہیلمٹ رہ گیا ہے اسے لینے............ ’’نہیں نہیں بابو یہاں نہیں ہے۔گاڑی پر چھوڑ کر آئے ہوں گے۔‘‘ان کے اصرار پر پھر نیچے آیا ،پھر اوپر گیا دو تین بار سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایسا لگ رہا تھا کہ میں ابھی ابھی بھری برسات سے آیا ہوں۔آخر میں نے اس ہیلمٹ سے ہاتھ دھونے میں ہی عافیت سمجھی اور صفدر سر کو کال کر کے کہا سر! عرضداشت کی ایک کاپی کے ساتھ ساتھ میرا ہیلمٹ مفت گیا۔یہ تو غنیمت رہا کہ دفتر سے واپسی میں کسی ٹریفک پولیس والے سے سامنا نہ ہوا ورنہ......

ثالث میں شامل تمام مضامین اچھے ہیں بالخصوص صفدر امام قادری، اقبال حسن آزاد،مشتاق احمد نوری،غضنفر،ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی،ڈاکٹر ابرار رحمانی،سید احمد قادری اور ڈاکٹر صغیر افراہیم کے مضامین کافی معلومات افزا اور دلچسپ ہیں۔شوکت حیات کے افسانوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ثالث نے معیار و مواد کے لحاظ سے اپنی منفرد شناخت کو برقرار رکھا ہے اس کے لیے مدیر پروفیسر اقبال حسن آزاد اور ان کے رفقاء کار کو نیک خواہشات و مبارکباد۔ دعا ہے کہ ثالث کا یہ سفر سدا جاری رہے۔

● ڈاکٹر شازیہ کمال

ثالث کے تازہ شمارہ (۲۱-۲۲) 'شوکت حیات نمبر' ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ابھرنے والے ممتاز افسانہ نگار شوکت حیات کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر مبنی ہے۔ان کا انتقال ۲۱اپریل ۲۰۲۱ء کو ہو گیا تھا۔ثالث نے یہ شمارہ ان کی افسانوی و ادبی خدمات کو وقف کیا ہے۔اس کے سبھی مضامین اور دیگر تمام تخلیقات موصوف مذکور سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔رسالے کے مدیر اقبال حسن آزاد صاحب قابل داد ہیں کہ وہ بڑی جانفشانی سے اردو کی بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں۔یوں تو ثالث کا ہر شمارہ منفرد اور اچھوتا ہوتا ہے۔شوکت حیات ہم عصر اردو افسانے کی ایسی منفرد شخصیت ہیں جنھوں نے بحیثیت افسانہ نگار قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت قائم کر لی ہیں۔انھوں نے کہانیوں کی بھر مار نہیں لگائی مگر فنی اور اسلوبیاتی سطح پر اردو افسانے کو نئی اڑان ضرور دی ہے۔انھوں نے اپنی تحریروں میں کئی نئی تھیوریز اپنائی جن کا ذکر شمارے میں جا بجا ملتا ہے۔

شمارے کا آغاز مدیر کے گراں قدر اداریے سے ہوتا ہے۔شوکت حیات سے متعلق اپنے خیالاتِ وہ یوں درج کرتے ہیں۔

''شوکت حیات ہمارے عہد کے منفرد اور البیلے افسانہ نگار تھے۔وہ صرف افسانہ نگار ہی نہیں تھے بلکہ نظریہ ساز بھی تھے۔انھوں نے اردو ادب کو انامیت کی تھیوری دی۔ان کی بے وقت موت نے اردو افسانے کو بہت نقصان پہنچایا۔''

وہ آگے لکھتے ہیں۔

''شوکت حیات کی بڑی خواہش تھی کہ ''ثالث'' میں ان پر گوشہ نکلے۔افسوس کہ ان کی زندگی میں یہ کام نہ ہو سکا۔لہذا میں نے ثالث کے ایک شمارے میں ان پر گوشہ نکالنے کا ارادہ کیا۔اس وقت میرے ذہن میں یہ صاف نہیں تھا کہ اس گوشے میں شوکت حیات کے فن اور زندگی کے کن گوشوں پر روشنی ڈالی جائے۔بس ایک ادھوری خواہش تھی جسے پورا کرنا تھا۔''

اس شمارے کو نکالنے کا جو سفر تھا اسے انھوں نے اس شعر سے تشبیہ دی ہے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

اداریے کے بعد آفتاب عالم اطہر گیاوی کی حمد اور غلام مجتبیٰ مہر کی نعت پیش کی گئی ہیں جس سے شمارے میں خوبصورت روحانی فضا قائم ہوتی ہے۔اس کے بعد' کوائف شوکت حیات' درج ہے۔یہاں ان کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کا معروضی تعارف پیش کیا گیا ہے۔بعد ازیں مضامین کا سلسلہ ہے۔یہاں کل ۹۱ مضامین ہیں۔ان میں ہم عصر ادیبوں و ناقدوں کے علاوہ ان اہالیان علم ونقد کے خیالاتِ

بھی درج ہیں جواب ہمارے بیچ نہیں رہے۔ان مضامین نگاروں میں پروفیسر وہاب اشرفی (شوکت حیات کی افسانہ نگاری)، وارث علوی (شوکت حیات کی افسانہ نگاری)، فاروق ارگلی (شوکت حیات کا فن)، ڈاکٹر ابرار رحمانی (شوکت حیات کے افسانے)، پروفیسر صفدر امام قادری (شوکت حیات کا ناول/ ناولٹ "سرپٹ گھوڑا" ایک تنقیدی جائزہ)، ڈاکٹر سید احمد قادری (شوکت حیات اور ان کے افسانے)، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی (شوکت حیات کے افسانوی اختصاص)، ڈاکٹر صغیر افراہیم (گنبد کے کبوتر، تہذیب کی مسماری کا استعارہ)، ڈاکٹر سید اشہد کریم (شوکت حیات اور گنبد کے کبوتر)، ڈاکٹر حامد علی خاں (شوکت حیات کا فن)، ڈاکٹر منصور خوشتر (شوکت حیات اردو افسانے کی منفرد آواز)، ڈاکٹر صالحہ صدیقی (حیات اردو افسانہ: شوکت حیات کا فکری وفنی مطالعہ)، عرفان رشید (شوکت حیات: صداقتوں کا کہانی کار)، ڈاکٹر قسیم اختر (شوکت حیات کے افسانوں کا اختصاصی پہلو)، ایم خالد فیاض (سن ستری افسانے کا قضیہ اور شوکت حیات کے نظریات)، ڈاکٹر زرنگار یاسمین (شوکت حیات کے امتیازات)، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ (شوکت حیات اردو افسانے کا سنگ میل)، ڈاکٹر گلاب سنگھ (شوکت حیات کے افسانوں میں سانس لیتی سچائیاں) اور ڈاکٹر نزہت پروین (شوکت حیات کے افسانے) کے نام شامل ہیں۔ مذکورہ بالا تمام مضامین میں شوکت حیات کی افسانہ نگاری کی انفرادیت اور اس کے اختصاصی پہلو سامنے آئے ہیں۔مضامین کے بعد متعدد خاکے درج ہیں۔ یہ خاکے مشتاق احمد نوری (افسانے کا سکندر :شوکت حیات)، عبدالصمد (وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی)، ڈاکٹر ابرار رحمانی (شوکت حیات)، غضنفر (ساز بوالعجمی کا تار حیات)، ڈاکٹر منظر اعجاز (شوکت حیات ......کچھ یادیں......کچھ باتیں)، اقبال حسن آزاد (بھول بھلیاں اور شوکت حیات)، اور نشاط پروین (شوکت حیات سے دو ملاقاتیں) نے تحریر کیے ہیں۔
تنقیدی مضامین کسی تخلیق کار کے فن کو پرکھنے کا اگر زریعہ ہوتے ہیں وہیں خاکے اس کی شخصیت کو منعکس کرتے ہیں۔بعد ازاں ان کی چند کہانیوں کے تجزیے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ ذائقہ میں نئے ذائقہ کی دریافت، شوکت حیات کا افسانہ بانگ، شوکت حیات کا افسانہ ''میت'' کا تجزیہ، افسانہ ''کوبڑ'' اخلاقی و تہذیبی اقدار کی زوال پزیری کا اشاریہ کے عنوان سے بتدریج مشتاق احمد نوری، غضنفر، پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر توصیف احمد ڈار نے رقم کیے ہیں۔اس کے بعد شوکت حیات کی زندگی میں ان سے ہوئی گفت وشنید کا گوشہ ہے جسے 'مکالمے' سے موسوم کیا آپ ہے۔ان میں شوکت حیات سے گفتگو (نثار احمد صدیقی) اور شوکت حیات سے مکالمہ (ڈاکٹر محمد غالب نشر) درج ہیں۔اس کے بعد افسانہ نگار کی چند کہانیوں گنبد کے کبوتر، رانی باغ، مرشد، ذائقہ، بانگ، میت، کوبڑ اور ناولٹ سرپٹ گھوڑا کو شمارہ میں شامل کیا گیا ہے۔ان

افسانوں کے اندراج سے شمارہ مزید توجہ طلب اور اہم بن گیا ہے۔

بعدازیں پروفیسر غضنفر کے نئے ناول 'دیکھ لی دنیا ہم نے' پر مدیر اقبال حسن آزاد نے اپنا تبصرہ پیش کیا ہے۔آخر میں ثالث کے گزشتہ شمارے پر متعدد اہل علم کے تأثرات درج ہیں اور بالکل اخیر میں ان محبّ علم وادب کے خطوط مرقوم ہیں جو ثالث کو پڑھتے ہیں اور اسے اپنی ادبی غذا تصور کرتے ہیں۔

الغرض یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ شمارہ شوکت حیات کی زندگی اور ان کی افسانوی وادبی خدمات کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ یہ دستاویزی اہمیت کا حامل شمارہ ہے جس کی حیثیت تاریخی ہوگئی ہے۔

◄◄ ● ►►

● ڈاکٹر وصیہ عرفانہ

شوکت حیات موجودہ عہد کے نہایت منفرد اور صاحب طرز افسانہ نگار تھے۔انہوں نے انسان کے باطن کی بیکرانی کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا اور ہر لحظہ اس بات کو مدنظر رکھا کہ ان کے افسانے اور قاری کے درمیان ترسیل کا رشتہ قائم رہے۔ایک ایسے زمانے میں جب ترقی پسندوں کی خارجیت کے ردعمل کے طور پر جدید افسانہ نگار مبہم علامتوں کے سہارے افسانے کی عمارت تعمیر کر رہے تھے،شوکت حیات نے اپنے افسانوں کے ذریعے کہانی پن کے بنیادی عناصر کی بازیافت کا عمل سرانجام دیا۔انہوں نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۷۰ء میں کیا لیکن ان کا افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آیا جس کے لئے انہیں مختلف اداروں کے ذریعے انعام واکرام سے نوازا گیا۔

شوکت حیات جس پائے کے افسانہ نگار رہے،اس لحاظ سے ان کے فکر وفن پر کم لکھا گیا۔بقول مدیر ثالث،ان کی بڑی خواہش تھی کہ ''ثالث'' میں ان پر گوشہ نکلے جو کہ ان کی زندگی میں مکمل نہ ہوسکی۔مبارکباد کے مستحق ہیں مدیر ''ثالث'' جناب اقبال حسن آزاد جنہوں نے شوکت حیات کی ناتمام خواہش کو مزید وسعت دے کر ''ثالث'' کا شوکت حیات نمبر ترتیب دے دیا۔''ثالث'' کا ۶۹۴ صفحات پر مشتمل ضخیم ترکتابی سلسلہ مختلف مضامین،یادداشتیں،خاکے،نمائندہ افسانے اور ان پر تحریر کردہ تجزیئے اور ان کی حیات کے مختلف گوشے کو کامیابی سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔شوکت حیات کی زندگی میں اس کارنامے کی انجام دہی نہ ہونے کی حساسیت اداریئے میں واضح طور پر جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کتابی سلسلے کی ضخامت،جامعیت،مشمولات کی اہمیت اور عوامی سطح پر اس کی مقبولیت یقیناً مرہم کاری کا کام کرے گی۔شوکت حیات نمبر کے دیگر مشمولات کے مطالعے سے پہلے میں ایک اہم بات پر روشنی ڈالنا چاہوں گی کہ میرا مضمون ''شوکت حیات: اردو افسانے کا سنگ میل''،نیا مضمون نہیں ہے بلکہ یہ میں نے ۲۰۱۱ء میں تحریر کیا تھا اور یہ سہ ماہی ''آمد'' پٹنہ،کتابی سلسلہ ۱،اکتوبر تا

دسمبر ۲۰۱۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔شوکت حیات صاحب نے مطالعے کے بعد فون کے ذریعے میری حوصلہ افزائی کی تھی اور ۳۰؍نومبر ۲۰۱۱ء کو دعائیہ کلمات تحریر کرتے ہوئے مجھے اپنا افسانوی مجموعہ ’’گنبد کے کبوتر‘‘ ارسال کیا تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو شوکت حیات پر لکھی گئی ابتدائی تحریروں میں اس مضمون کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ان کی وفات کے بعد یہی مضمون ادبی پورٹل ’’ادبی میراث‘‘ پر بغرض تعزیت اپلوڈ کیا گیا تھا۔میں نے مدیر ’’ثالث‘‘ کو مطلع کر دیا تھا۔شاید سہواً یہ تفصیل درج نہیں ہو سکی ہے۔

کتاب کی شروعات ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر گیاوی کی حمد شریف اور جناب غلام مجتبیٰ مہر کی نعت شریف سے ہوئی ہے ۔ بعدازاں ادارے نے شوکت حیات صاحب کے حیات وفن کے تعلق سے ایک اشاریہ پیش کیا ہے۔شوکت حیات کی افسانہ نگاری کے حوالے سے جید نقاد وہاب اشرفی اور وارث علوی کے اہم مضامین شوکت حیات کے فکر وفن کے دروبست کو نمایاں کر رہے ہیں۔اردو افسانے کی تاریخ میں ان کی معتبر اور محفوظ جگہ کا اعتراف کرتے ہوئے وہاب اشرفی لکھتے ہیں کہ ایک انقلابی ذہن میں کیسی تخلیقی روشنی پیدا ہو سکتی ہے، اس کا ایک مکمل منظر نامہ شوکت حیات کے افسانے ہیں۔شوکت حیات کے سلسلے میں وارث علوی کی یہ رائے سند کا درجہ رکھتی ہے کہ شوکت حیات ان جیالے لوگوں میں سے ہیں جو نہ تو کسی نقاد کی توجہ کی پرواہ کرتے ہیں نہ دوسروں کی بخشی ہوئی بیساکھیوں پر راہ ادب طے کرتے ہیں۔وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور اپنے اظہار و بیان کے طریقے آپ ہی ایجاد کرتے ہیں۔وارث علوی نے زبان و بیان پر شوکت حیات کی گرفت کا بارہا اظہار کیا ہے۔وہ اعتراف کرتے ہیں کہ شوکت حیات کے اچھے افسانے کرداروں کی انفرادیت، فضا بندی اور پلاٹ کی نہایت نازک پیچیدگیوں کے حامل ہیں۔شوکت حیات کے افسانوی فن پر روشنی ڈالتے ہوئے فاروق ارگلی رقمطراز ہیں کہ انسانی معاشرے کی ناہمواریوں، ستم ظریفیوں اور تلخ ترین حقیقتوں پر شوکت حیات کے بعض افسانے ناقابل فراموش اور اپنی نظیر آپ ہیں۔فاروق ارگلی نے ڈرامہ نگاری اور ان کی اداکاری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی نے نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ شوکت حیات کے فکر وفن کا احاطہ کیا ہے۔بحیثیت مدیر ماہنامہ آجکل، انہوں نے افسانے کی صورتحال سے متعلق جس فکر کا اظہار کیا ہے وہ افسانہ نگاروں کے لئے مشعل راہ بن سکتا ہے اگر غور کیا جائے۔انہوں نے شوکت حیات کے حوالے سے بالکل صحیح فرمایا کہ تیس پینتیس سال کی فنکاری اور ریاضت کے بعد بھی وہ اپنے افسانوی مجموعے کی اشاعت کے لئے سرگرداں نہیں رہے۔ابرار رحمانی صاحب کا یہ تجزیہ مبنی بر حقیقت ہے کہ کتاب گردی کے اس دور میں بھی شوکت حیات کا اس طرف دھیان نہ دینا ان کے جینوئن فنکار ہونے پر دال ہے۔

پروفیسر صفدر امام قادری نے نہایت باریک بینی سے شوکت حیات کے ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔انہوں نے اپنا مطالعہ محض اس ناولٹ تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ شوکت حیات کے فکری وفنی رویہ پر بالغ نظری سے نگاہ ڈالی ہے۔ان کی یہ رائے اہمیت کی حامل ہے کہ زندگی اور سماج کے بنیادی سروکاروں، حقیقی موضوعات اور سچے تجربات نے شوکت حیات کے یہاں فکری توازن کے امکانات کو روشن کیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے شوکت حیات کے افسانوی ارتکاز کی مہارت کا اعتراف کیا ہے جس کی وجہ سے وہ فکروخیال کی طویل وبسیط دنیا کو برتنے کے باوجود اپنے مخصوص تجریدی ایجاز اور جامعیت سے قصے کو بے وجہ طول دینے سے بچتے رہے۔صفدر امام قادری نے ''سرپٹ گھوڑا'' کا مختلف ابواب کے حوالے سے تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے اور تمام جزئیات پر نگاہ ڈالی ہے۔اس ناولٹ کی قرآت نہ کرنے والا بھی کہانی کے تمام نشیب وفراز سے محض متعارف ہی نہیں ہوتا بلکہ خود کو ناولٹ کے مہیب اور حساس ماحول کا حصہ بنا ہوا محسوس کرتا ہے۔تجزیہ نگار کی اس رائے سے مکمل اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہندوستان کی سیاست اور معاشرے کے نظام فکر میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں، وہ سماج کے ہر حلقے میں درآئی۔لہٰذا شوکت حیات نے اس موضوع کو صرف 'گنبد کے کبوتر' میں ہی نہیں برتا بلکہ یہ ان کی اور دوسرے لکھنے والوں کی سائیکی میں ایک زندہ حقیقت کی طرح بس گیا ہے۔اس حوالے سے شوکت حیات نے حیاتِ انسانی کا نوحہ اس ناول کے چند صفحات میں سمودیا ہے۔

ڈاکٹر سید احمد قادری نے شوکت حیات کے افسانوں پر نظر ڈالتے ہوئے ان کے فنی وفکری رویوں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔وہ اعتراف کرتے ہیں کہ شوکت حیات نے جدیدیت کے علمبردار ہونے کے باوجود جدیدیت کی بھول بھلیوں میں خود کو زیادہ نہیں بھٹکایا۔انہوں نے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ افسانوں میں علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں سے حسن تو پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن افسانویت، ماجراسازی اور کردارنگاری ہی کامیاب افسانے کی ضمانت بنتے ہیں۔نتیجتاً ان کے یہاں مختلف اور متنوع عصری مسائل پر ان کی فکرمندی اور فنی ہنرمندی دیکھنے کوملتی ہے۔سید احمد قادری نے ۱۴ا کتوبر ۱۹۸۵ء میں اپنے ہفتہ وار اخبار ''بودھ دھرتی'' کا ایک شمارہ شوکت حیات کے نام مختص کرکے شائع کیا جس کے مشمولات کو شوکت حیات کتابی شکل میں شائع کرنے کے خواہش مند تھے جو بوجوہ شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مختلف افسانوں کے حوالے سے شوکت حیات کے افسانوی اختصاص کی شناخت کا مرحلہ انجام دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں سماجی ناہمواریوں اور ماحول کے جبر کا تذکرہ نعرہ بازی اور پروپگینڈے کے انداز میں نہیں ہے بلکہ سماجی بے انصافیوں اور ماحول کے نامساعد ہونے

کا فنکارانہ اظہار ان کی افسانہ نگاری کا خاص جزو ہے۔ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی اس رائے سے مکمل اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ ان کی کہانیاں نادار، محنت کش، محروم اور بے روزگار لوگوں کی صدائیں ہیں، جبر و استبداد، استحصال و داداگیری اور تہذیب و سیاست کے نام پر مکاریوں کو اکسپوژ کرتی ہیں۔اس اکسپوژر میں ان کے اندر کا فنکار تمام واقعے، حادثے اور المیے پر بہت خاموشی کے ساتھ اپنا احتجاج درج کراتا رہتا ہے مگر یہ احتجاج نعرہ یا پروپگینڈہ نہیں بنتا کیونکہ فنکارانہ چابکدستی اور حسن کاری ان کی آواز کو پُر تاثیر اور پُر کشش بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر صغیر افراہیم نے ''گنبد کے کبوتر'' کو تہذیب کی مسماری کا استعارہ قرار دیا ہے۔اس کہانی کے حوالے سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ بیک وقت بابری مسجد کے سانحہ کی پہلی برسی کی طرف اشارہ کے ساتھ ہی ساتھ متضاد ذہنی کیفیتوں کا احاطہ کرتی ہے اور ایک قدیم تہذیب کے مسمار ہونے کے استعارہ کے طور پر بھی ابھرتی ہے۔گنبد قدیم تہذیب کا استعارہ ہے اور اس تہذیب کے مسمار ہونے سے جسے تکلیف پہنچتی ہے وہ کبوتر ہے۔شوکت حیات نے فنکارانہ مہارت سے واقعہ کے بدصورت پہلو کی جانب اشارہ کیا ہے کہ مذہبی شدت پسندی اور اس کے نتائج سے دونوں فرقے نبرد آزما ہیں لیکن تلقین اسے کی جارہی ہے جو زیادہ مظلوم ہے، کہ سوچنے کا انداز بدلو، قوت برداشت پیدا کرو، قناعت سے کام لو۔اس افسانے کے تناظر میں ڈاکٹر صغیر افراہیم کی یہ رائے اہم ہے کہ افسانہ نگار نے پورے اعتماد اور آگہی سے فرد اور معاشرے کے مظاہر کو خوبصورت اشاروں میں متشکل کیا ہے۔اسی لئے اس کہانی میں استعاروں اور علامتوں کے ساتھ ساتھ ایمائیت اور منظری ربط بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر اشہد کریم نے بھی اپنے مطالعہ کو ''گنبد کے کبوتر'' کے اردگرد محدود رکھا ہے۔وہ گنبد کو تاریخ و تہذیب کے ساتھ ساتھ مذہبی شناخت کا حصہ قرار دیتے ہیں اور کبوتر کو امن و آشتی کی علامت جن کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ شدت اضطراب کو ظاہر کرتی ہیں۔ڈاکٹر اشہد کریم نے مذکورہ افسانے میں شوکت حیات کے اسلوب میں نثری نظم کا پیکر تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔

ڈاکٹر محمد حامد علی خان نے دلچسپ پیرائے میں شوکت حیات کے فن پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔وہ شوکت حیات کے فنی رویے کے سلسلے میں اعتراف کرتے ہیں کہ وہ افسانوں میں تجربات اور امکانات کے دروں کو نہ صرف یہ کہ وا رکھنا چاہتے ہیں بلکہ ہم عصر افسانہ نگاروں کو بھی دعوت دیتے ہیں۔ڈاکٹر محمد حامد علی خان کو اس صورتحال پر افسوس ہے کہ جدیدیت کے اس دور میں علامت نگاری اور تجریدیت کے قائلوں نے شوکت حیات کی جانب دیکھنا مناسب نہیں سمجھا لیکن پے در پے مختلف تجربوں سے پُر افسانے شگاف، دراڑ، خلا، انت کا انت، ڈھلان پر رکے ہوئے قدم، بانگ، تین مینڈک، کاغذ کا درخت، ہوسٹل، سیلاب اور پھر گنبد کے کبوتر جیسے

شاہکار افسانے منظر عام پر آئے تو قارئین کے ساتھ ساتھ ناقدین کو بھی احساس ہوا کہ فکری، فنی اور داخلی زندگی کے مقدس آتش کدہ سے تپا ہوا علامتی تمثیلی افسانے کا دور شروع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر منصور خوشتر نے شوکت حیات کو اردو افسانے کی منفرد آواز سے موسوم کیا ہے۔ ان کی رائے اہمیت کی حامل ہے کہ اخلاقی وجذباتی بحران، سماجی وسیاسی ظلم وجبر، مسابقتی عہد میں زندگی کی بے مقصدیت اور بے معنویت، عالمی دہشت گردی کے نتیجے میں پنپنے والی بے یقینی اور بے نام خوف، طبقاتی استحصال کے منطقی نتائج وغیرہ کو انہوں نے اپنے افسانوں کے وسیلے سے پیش کیا ہے اور ان تمام مراحل میں تخلیقی ضبط کے دامن کو خوش اسلوبی سے تھامے رکھنا ہی ان کا فنی امتیاز ہے۔ ڈاکٹر منصور خوشتر نے اختصار و جامعیت کے ساتھ شوکت حیات کی انفرادیت کی نشاندہی کی ہے۔

ایم خالد فیاض نے رسالے میں شامل مضامین کی عام نہج سے ہٹ کر شوکت حیات کے تنقیدی افکار اور ان کے نظریات سے بحث کی ہے۔ شوکت حیات نے ''انامیت''، ''انام نسل''، ''انام افسانے'' کی اصطلاحات وضع کر کے سن ستر کے بعد کے ایسے افسانوں کو اس زمرے میں شامل کیا تھا جس نے جدید افسانے کے منفی اور شدت پسند عناصر سے بغاوت کرتے ہوئے افسانے کو سماجی اور معروضی زندگی اور اس کے سیاسی مسائل سے بھی جوڑا اور کہانی پن یا افسانویت کے عنصر کو بھی تقویت دی۔ ''مابعد جدید افسانہ'' کی اصطلاح بھی شوکت حیات ایسے ہی افسانوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ خالد فیاض صاحب کی یہ رائے بھی معتبر ہے کہ شوکت حیات نے بانگ اور گنبد کے کبوتر کے عنوان سے بہترین افسانے ہی تخلیق نہیں کئے بلکہ افسانوی تنقید بھی لکھی۔ گو وہ خود کو کوئی باقاعدہ نقاد نہیں سمجھتے لیکن اس کے باوجود سن ستّر کے اس افسانوی گروہ اور افسانے کی شعریات مرتب کرنے میں ان کا اہم کردار ہے۔ انہوں نے اس عہد کے افسانے کا مقدمہ بھی لڑا ہے اور اس عہد کے افسانوی نظریے کو واضح بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر زرنگار یاسمین نے شوکت حیات کے فکر وفن کے تعلق سے بہت عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے اور ان کے فکری وفنی امتیازات کو روشن کرنے کی سعی کی ہے۔ شوکت حیات کے مختلف افسانوں کی فکر، ہیئت، تکنیک، متن اور اسلوب کے جائزے کے حوالے سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتی ہیں کہ شوکت حیات کا نمایاں امتیاز ان کی فکری اور عملی آزادروی ہے۔ وہ قدیم وجدید کی درمیانی منزل پر ردوقبول کے جذبوں سے معمور آزادانہ طرز نگارش کو ہی شوکت حیات کا بنیادی امتیاز قرار دیتی ہیں۔ مضمون میں گہرائی، ایجاز اور جامعیت ہے جو شوکت حیات کے مطالعہ کے سلسلے میں کافی معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صالحہ صدیقی نے شوکت حیات کا فکری وفنی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا خیال

ہے کہ شوکت صاحب نے اپنے گردوپیش کی محرومیوں، ناکامیوں، ظلم وزیادتیوں، ناانصافیوں کو ہر پل محسوس کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک گہرا دکھ اور المیہ سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔وہ یہ بھی اعتراف کرتی ہیں کہ شوکت حیات کے یہاں ایک نئے ہندوستان کے تصور اور ہندوستانیوں کی نئی فکر کو پروان چڑھانے کی کوشش واضح طور پر نظر آتی ہے۔

عرفان رشید نے شوکت حیات کو صداقتوں کا کہانی کار قرار دیا ہے۔ان کی یہ رائے درست ہے کہ جدیدیت کے ہنگامی اور بحرانی دور میں بھی شوکت حیات نے زندگی سے ادب کے رشتے کو مضبوطی سے قائم رکھا اور اپنے افسانوں میں ہیئت اور تکنیک کے تجربوں کے باوجود بھی حقیقت پسندی پر زور دیا۔

ڈاکٹر قسیم اختر نے شوکت حیات کے افسانوں کے اختصاصی پہلو پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔وہ شوکت حیات کی فکری صداقت اور فنی انفرادیت پر زور دیتے ہیں۔ان کی یہ رائے نہایت اہم ہے کہ شوکت حیات نے انقلابی ذہن کو تخلیقی فکر سے ہم آہنگ کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے افسانے محض واقعات کی کھتونی نہیں ہیں بلکہ فکری ارتباط، سماجی سروکار، ذہنی کیفیات اور فنی ابعاد کے التزام سے نمایاں مقام کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر گلاب سنگھ نے اپنے مختصر مقالے میں شوکت حیات کے افسانوں میں سانس لیتی سچائیوں کی تلاش وجستجو کا عمل انجام دیا ہے۔شوکت حیات کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے کہانی کو واپس لے کر آئے اور ادب میں تخلیقی جمود کو توڑنے کی کامیاب کوشش کی۔ڈاکٹر نزہت پروین شوکت حیات کے افسانوں کا سرا ترقی پسند رجحان سے ملاتے ہوئے اعتراف کرتی ہیں کہ اسلوب کی سطح پر وہ ترقی پسندوں سے تھوڑا سا الگ نظر آتے ہیں۔

''ثالث'' کے اس شمارے نے شوکت حیات کے فکری وفنی پہلوؤں کی پیشکش کے ضمن میں انیس مقالوں کو اپنے اوراق میں سمیٹ کر دستاویزی اہمیت اختیار کر لی ہے۔مقالوں کے بعد شوکت حیات پر ان کے دوستوں اور ہمعصروں کے ذریعے لکھے گئے مختلف خاکوں نے اس رسالے کی معنویت اور وقعت میں مزید اضافہ کیا ہے۔مشتاق احمد نوری، عبدالصمد، ڈاکٹر ابرار رحمانی، غضنفر، ڈاکٹر منظر اعجاز، اقبال حسن آزاد اور نشاط پروین نے اپنے خاکوں کے توسط سے شوکت حیات کی نجی زندگی، عادات و اطوار، ضابطہ حیات، اخلاقی حسنات اور بشری کمزوریوں کو یوں آئینہ کیا ہے کہ شوکت حیات کی شخصیت پوری طرح منعکس ہوگئی ہے۔ بعد ازاں، شوکت حیات کے افسانوں ذائقہ، بانگ، میت اور کوبڑ پر مشتاق احمد نوری، غضنفر، پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر توصیف احمد ڈار کا تحریر کردہ تجزیہ رسالے کا اہم حصہ ہے۔شوکت حیات سے لئے گئے انٹرویوز اور مختلف لوگوں کو لکھے گئے ان کے خطوط نہ صرف شوکت حیات کی شخصیت کے متنوع گوشوں کو اجاگر کرنے

میں معاون ہورہے ہیں بلکہ اردو افسانے کے تئیں ان کی فکرمندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ شوکت حیات اپنے عہد میں اردو افسانے میں در آنے والی افراط وتفریط سے مطمئن نہیں تھے۔ترقی پسندوں کی خارجیت اور سپاٹ پن اور جدیدیت کے ہمنواؤں کے نت نئے تجربات نے اردو افسانے کے مستقبل کی جانب سے انہیں مایوس کیا تھا۔وہ ایک جینوئن فنکار تھے۔لہٰذا انہوں نے اس افراط وتفریط کی درمیانی راہ منتخب کی۔انہوں نے سپاٹ بیانیہ سے پرہیز کیا اور کہانی میں کہانی پن کے بنیادی عنصر کی اہمیت پر زور دیا۔علائم وابہام کو برتنے کے باوجود اپنے افسانوی پیشکش میں افسانے اور قاری کے مابین ترسیل کا ہر لحظہ خیال رکھا۔انہوں نے اپنی فکر اور رویے کو لفظوں کا پیرہن عطا کر کے اردو افسانے کے تعلق سے کئی مضامین بھی تحریر کئے جو اس رسالے کا اہم جزو ہیں۔

شوکت حیات کے نمائندہ افسانوں گنبد کے کبوتر، رانی باغ، مرشد، ذائقہ، بانگ، میت، کوبڑ اور ناولٹ سرپٹ گھوڑا کے متن کو اس رسالے میں شامل کر کے مدیر ’’ثالث‘‘ نے نہ صرف رسالے کی قدروقیمت میں اضافہ کیا ہے بلکہ ایسے قارئین، جنہوں نے شوکت حیات کے افسانوں کی قرأت نہیں کی ہے، کے لئے آسانی فراہم کی ہے۔ہمعصر رسائل وجرائد میں ’’ثالث‘‘ بلاشک وشبہ ایک انفرادی حیثیت کا حامل بن چکا ہے جس کی تائید وہ خطوط کرتے ہیں جو گذشتہ شمارے کے حوالے سے تحریر کئے گئے ہیں اور مذکورہ شمارے کے آخر میں جنہوں نے جگہ پائی ہے۔’’ثالث‘‘ کے شوکت حیات نمبر کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ رسالہ ایک دستاویزی اہمیت کا حامل ہے جس سے یقیناً طلباء اور محققین مستفیض ہوں گے۔

◀◀ ● ▶▶

● ڈاکٹر خالدہ ناز

کتابی سلسلہ ’’ثالث‘‘ کے شوکت حیات نمبر شمارہ ۲۱۔۲۲ کی گونج پوری ادبی دنیا میں سنائی دے رہی ہے۔اس ہلچل نے شوکت حیات کو حیات جاوداں عطا کر دیا ہے۔اپنی ضخامت اور کارآمد مواد کی وجہ سے اس کی اہمیت دستاویزی ہوگئی ہے۔اتنی خوبصورت پیش کش کے لیے اقبال حسن آزاد مبارک باد کے مستحق ہیں۔

’’ثالث‘‘ کا ہر شمارہ اُن کی فنی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اپنی محنت اور عرق ریزی سے وہ اسے بہتر سے بہتر بنانے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں۔اس میں موجود کوئی بھی تحریر ایسی نہیں ہوتی جو دعوت مطالعہ نہ دیتی ہو۔گھر میں جب اس کی آمد ہوتی ہے تو اس کا مطالعہ کیے بغیر زندگی ادھوری سی لگتی ہے۔بلاشبہ یہ رسالہ متحرک ادب کا ترجمان ہے۔اس نے ادبی حلقوں میں اپنی مکمل شناخت قائم کر لی ہے۔

اقبال حسن آزاد نے اردو ادب کی ایک قد آور شخصیت شوکت حیات پر نمبر نکال کر اسے تاریخی

حیثیت عطا کر دی ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ انہیں زندگی میں وہ پذیرائی نہ مل سکی جیسی ملنی چاہئے تھی۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد جو شہرت اس رسالہ کے توسط سے انہیں مل رہی ہے وہ باعث مسرت و شادمانی ہے۔ یہ اقبال حسن آزاد کا بے پناہ خلوص ہے کہ انہوں نے اتنی جانفشانی سے شوکت حیات کی تخلیقات اوران سے وابستہ مستنداور معتبر لوگوں کی تحاریر کو خوبصورتی کے ساتھ اس نمبر میں پیش کر دیا ہے۔

جیسے ہی رسالہ پر نظر پڑتی ہے شوکت حیات کی تصویر نعیم یاد کے بنائے ہوئے خوبصورت سرورق میں جگمگاتی دکھائی دیتی ہے اوراس کے اندرونی جانب چند یادگار تصویریں جس میں وہ اپنی فیملی اور کچھ معتبر و نامور ہستیوں کے ہمراہ جلوہ افروز ہیں جس سے ان کے شروع کے دنوں کے خدوخال کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی عمر کے بدلاؤ کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ پھر اقبال حسن آزاد کا اداریہ ہے۔ ایک رسالہ کی سب سے بڑی کامیابی اداریہ کی پُر مغز اور پر تاثیر سطور میں پوشیدہ ہوتی ہے اس کے ہر ایک لفظ سے مدیر کی شخصیت کی بھر پور عکاسی ہو رہی ہے۔ مجھے اچانک جنوری تا دسمبر ۲۰۲۰ء کا وہ شمارہ یاد آ گیا جو عالمی خواتین نمبر تھا اور کرونا کے عہد میں منظر عام پر آیا تھا جب لوگ ڈرے سہمے اپنے گھروں میں بیٹھے تھے۔ ایسے پر آشوب وقت میں اقبال حسن آزاد نے یہ نمبر نکال کر خواتین کو اعتماد بخشا اور بہترین اداریہ لکھ کر عورتوں کی مثبت سوچ سے متعارف کراتے ہوئے ان کی نظر سے دنیا اور سماج کی کامیاب تصویر پیش کی تھی۔ اس اداریہ میں شامل اقبال حسن آزاد کا یہ شعر مجھے بہت پسند آیا تھا۔

مرے رستے جب کوئی بھی الجھن سر اٹھاتی ہے　　میں اپنی زندگی کا رخ وہیں سے موڑ دیتا ہوں

یہ سچ ہے کہ منفی سوچیں صرف ہمیں نقصان ہی پہنچاتی ہیں۔ ہمارے اندر ہمیشہ آگے بڑھنے کا حوصلہ ہونا چاہئے۔ پیش نظر اداریہ میں بھی اقبال حسن آزاد کی فلسفیانہ باتیں دامن دل کو کھینچ رہی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ’’آج کل پوری دنیا میں ایک عجیب سا ہنگامہ برپا ہے لیکن یہ ہنگامہ خیزی کوئی نئی چیز نہیں ہے اگر دنیا کی تواریخ پر نظر ڈالی جائے تو آپ یہ پائیں گے کہ یہ جہان آب و گل روز اول سے ہی ہنگاموں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔‘‘ ایسی باتیں سچ مچ مثبت سوچیں عطا کرتی ہیں۔

پھر شوکت حیات کے بارے میں یہ اعتراف کہ ان کی موت کی خبر سن کر مجھے دلی صدمہ پہنچا۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ’’ثالث‘‘ میں ان پر گوشہ نکلے۔ افسوس کہ ان کی زندگی میں یہ کام نہ ہوسکا۔‘‘ لیکن اب ’’ثالث‘‘ کا شوکت حیات نمبر نکال کر اقبال حسن آزاد نے شوکت حیات کو بھر پور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

۴۹۶ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم شمارہ حسب معمول ’’حمد‘‘ (آفتاب عالم اطہر گیاوی) اور ’’نعت‘‘ (غلام مجتبیٰ مہر) سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد شوکت حیات کے فن پر تحریر کیے گئے انیس مضامین شایع کیے گئے ہیں۔ جن میں پروفیسر وہاب اشرفی، وارث علوی، فاروق ارگلی، ڈاکٹر ابرار رحمانی، پروفیسر صفدر امام قادری، ڈاکٹر سید احمد

قادری، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر صغیر افراہیم، ڈاکٹر سید اشہد کریم، ڈاکٹر حامد علی خاں، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، عرفان رشید، ڈاکٹر قسیم اختر، ایم۔خالد فیاض، ڈاکٹر زرنگار یاسمین، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ، ڈاکٹر گلاب سنگھ اور ڈاکٹر نزہت پروین کے نام شامل ہیں۔ یہ سارے مضامین شوکت حیات کے فن کو بحسن وخوبی اجاگر کرتے ہیں۔ان مضامین کے بعد شوکت حیات پر مشتاق احمد نوری، عبدالصمد، ڈاکٹر ابرار رحمانی، غضنفر، ڈاکٹر منظر اعجاز، اقبال حسن آزاد اور نشاط پروین کے ذریعہ تحریر کیے گئے سات خاکے شایع کیے گئے ہیں جن سے شوکت حیات کی زندگی کے کئی مخفی گوشے بھی روشن ہو گئے ہیں۔خاکہ لکھنا ایک مشکل فن ہے اور ایک اچھے خاکہ نگار کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو پیچھے کر کے صاحب خاکہ کو آگے کردے۔ یہ سارے خاکے اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔

اس خاص نمبر میں شوکت حیات کے سات نمائندہ افسانے ''گنبد کے کبوتر''،''رانی باغ''،''مرشد''، ''ذائقہ''،''بانگ''،''میّت''،اور''کوبڑ''شامل اشاعت ہیں۔اوران میں سے چار افسانوں''ذائقہ''،''بانگ''،''میّت'' اور کوبڑ'' کا تجزیہ بالترتیب مشتاق احمد نوری، غضنفر، پروفیسر اسلم جمشید پوری، اور ڈاکٹر توصیف احمد ڈار نے کیا ہے۔شوکت حیات کا افانہ''ذائقہ'' میں پہلے بھی پڑھ چکی تھی لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت میں اس کے اندرون میں اترنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔اس افسانے پر مشتاق احمد نوری کے چشم کشا تجزیے نے اس افسانے کو مجھ پر منکشف کردیا۔ان کے علاوہ ان کا اکلوتا ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' بھی پیش کیا گیا ہے۔

ان نگارشات کے علاوہ شوکت حیات سے لیے گئے دو اہم انٹرویوز (نثار احمد صدیقی اور ڈاکٹر غالب نشتر) بھی شایع کیے گئے ہیں جن سے ادب کے بارے میں شوکت حیات کے خیالات ونظریات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

اس خاص نمبر ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شوکت حیات کے ذریعے مشاہیر کے نام لکھے گئے کئی اہم خطوط کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ یہ خطوط قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر ابرار رحمانی، عین تابش، ڈاکٹر سید احمد قادری، رفیع حیدر انجم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، اقبال حسن آزاد اور ڈاکٹر ارشد رضا کے نام لکھے گئے تھے۔ان خطوط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شوکت حیات ادب میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے ازحد سنجیدہ تھے۔

شوکت حیات افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ تنقید نگار بھی تھے۔اوران کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ''بانگ'' بھی منصہ شہود پر آ چکا ہے۔اس شمارے میں افسانے کے تعلق سے شوکت حیات کے تین اہم مضامین بھی شامل ہیں۔

''تبصرے''اور''ثالث پر تبصرے''اس رسالے کے مستقل کالم ہیں۔ زیرنظر شمارے میں غضنفر کے خودنوشت ناول''دیکھ لی دنیا ہم نے'' پر اقبال حسن آزاد نے تفصیلی اور پُر مغز تبصرہ کیا ہے جبکہ ثالث شمارہ نمبر ۲۰ پر عشرت ظہیر، سلیم انصاری، عظیم اللہ ہاشمی، اصغر شمیم، ڈاکٹر منصور خوشتر، ریحان کوثر اور رویندرا جوگلیکر

نے عمدہ اور تجزیاتی تبصرے کیے ہیں۔

''مکتوبات'' کے کالم میں فاروق ارگلی، مرغوب اثر فاطمی، عین تابش، غزال ضیغم، فخر الدین عارفی، غلام نبی کمار، ڈاکٹر اختر آزاد، وسیم فرحت، جرنلسٹ اقبال، مختار بلال، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، احسان تابش اور ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر گیاوی کے خطوط اس رسالے کی بے پناہ مقبولیت کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

اس رسالہ کی جاذبیت کی ایک بڑی وجہ اس کی خوبصورت پیش کش اور ترتیب ہے۔اقبال حسن آزاد نے تشنگان ادب کی بھرپور سیرابی کردی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ شوکت حیات کی شخصیت کچھ اپنی کچھ لوگوں کی زبانی متعارف ہوتی چلی جارہی ہے۔

بلاشبہ ''ثالث'' کا یہ شمارہ دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔بے شک اقبال حسن آزاد نے شوکت حیات کے فن اور شخصیت کو اس طرح یکجا کر دیا ہے کہ ادبی دنیا میں ''ثالث'' کی موجودگی کا احساس ہمیشہ برقرار رہے گا اور اس کی پذیرائی ہوتی رہے گی۔

◀◀ ● ▶▶

● مظفر نازنین

گذشتہ سال یعنی 2021 میں میں نے ''ثالث'' کا ایک شمارہ فیس بک پر دیکھا تھا۔جو یو جی سی کیئر لسٹیڈ ہے۔پھر اچانک یہ خمار اُٹھنے لگا کہ اس معیاری اور موقر رسالے کے لیے کوئی بہت اہم مضمون ارسال کروں کہ اچانک ایک دن اس رسالے کے مدیر اعزازی اقبال حسن زاد صاحب نے ''ثالث'' کا شوکت حیات نمبر بذریعہ ڈاک ارسال کیا جس کے لیے میں آنجناب کی شکر گذار ہوں۔یہ ضخیم نمبر جب ہاتھ میں آیا تو کئی باتیں اچانک ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگیں۔میرا تعلق کولکاتا (مغربی بنگال) سے ہے جہاں اردو اخبارات کے قاری کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔اس شہر سے صرف نصف درجن اخبارات شائع ہوتے ہیں۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو اخبارات کا سرکولیشن بہت کم ہے۔یہاں معاملہ صرف اردو اخبارات کا نہیں ہے بلکہ آج کے ڈیجیٹل ورلڈ میں دیگر زبانوں کے اخبارات کا بھی یہی حال ہے۔Book Culture دھیرے دھیرے ختم ہوتا جارہا ہے۔آج کل Bank Transaction سے لے کر Grocery Items تک سب کچھ آن لائن دستیاب ہیں۔

ایسے پُر آشوب دور میں جبکہ اردو رسائل کے خریدار عنقا ہیں اردو کے کسی رسالے کا مسلسل شائع ہونا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔اس رسالے کو دیکھ کر اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ بہار اردو زبان وادب کا گہوارہ ہے۔ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی بہ نسبت یہاں اردو زبان وادب اور صحافت کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

گذشتہ نو برسوں سے تسلسل کے ساتھ شایع ہونے والا رسالہ ''ثالث'' زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان ہے۔یہ کافی اہم اور معیاری رسالہ ہے۔''ثالث'' کا شوکت حیات نمبر معروف افسانہ نگار شوکت حیات کی خدمات کا اعتراف ہے۔ بلاشبہ اس رسالے کو دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔یہ رسالہ آن لائن بھی دستیاب ہے۔

نعیم یاد (خوشاب، پاکستان) کا بنایا ہوا سرورق انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔سرورق پر شوکت حیات کی تصویر ہے جبکہ اندرونی صفحے پر شوکت حیات کی کی چند یادگار تصویریں ہیں جن میں شوکت حیات کے ساتھ ان کی اہلیہ ارشاد پروین ، بیٹے اتم حیات، بیٹی انعم کے علاوہ معروف فکشن نگار سلام بن رزاق، مرزا حامد بیگ، عبدالصمد، شموئل احمد، مشتاق احمد نوری اور اقبال حسن آزاد کی تصویریں بھی شامل ہیں۔

رسالے کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد کے پُر مغز اداریئے کے بعد آفتاب عالم اطہرؔ گیاوی کی ایمان افروز حمد اور عشق رسول میں ڈوبی ہوئی غلام مجتبیٰ مہرؔ کی نعت دل و نگاہ کو روشن کر رہی ہیں۔اس کے بعد شوکت حیات کوائف پیش کیے گئے ہیں۔بعدازاں معروف نقادوں کے اُنیس مضامین ''شوکت حیات کی افسانہ نگاری'' (پروفیسر وہاب اشرفی)، ''شوکت حیات کی افسانہ نگاری'' (وارث علوی)، ''شوکت حیات کا فن'' (فاروق ارگلی)، ''شوکت حیات کے افسانے'' (ڈاکٹر ابرار رحمانی)، ''شوکت حیات کا ناول/ناولٹ 'سرپٹ گھوڑا' ایک تنقیدی جائزہ'' (پروفیسر صفدر امام قادری)، ''شوکت حیات اور ان کے افسانے'' (ڈاکٹر سید احمد قادری)، ''شوکت حیات کے افسانوی اختصاص'' (ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی)، ''گنبد کے کبوتر' تہذیب کی مسماری کا استعارہ'' (ڈاکٹر صغیر افراہیم)، ''شوکت حیات اور ''گنبد کے کبوتر'' (ڈاکٹر سید اشہد کریم)، ''شوکت حیات کا فن'' (ڈاکٹر حامد علی خاں)، ''شوکت حیات......اردو افسانے کی منفرد آواز'' (ڈاکٹر منصور خوشتر)، ''حیات اردو افسانہ......شوکت حیات کا فکری و فنی مطالعہ'' (ڈاکٹر صالحہ صدیقی)، ''شوکت حیات......صداقتوں کا کہانی کار'' (عرفان رشید)، ''شوکت حیات کے افسانوں کا اختصاصی پہلو'' (ڈاکٹر قسیم اختر)، ''سن ستری افسانے کا قضیہ اور شوکت حیات کے نظریات'' (ایم۔خالد فیاض)، ''شوکت حیات کے امتیازات'' (ڈاکٹر زرنگار یاسمین)، ''شوکت حیات......اردو افسانے کا سنگ میل'' (ڈاکٹر وصیہ عرفانہ)، ''شوکت حیات کے افسانوں میں سانس لیتی سچائیاں'' (ڈاکٹر گلاب سنگھ) اور ''شوکت حیات کے افسانے'' (ڈاکٹر نزہت پروین) قاری کے علم میں اضافہ کر رہے ہیں۔

پروفیسر وہاب اشرفی اپنے گرانقدر مضمون میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ''اردو افسانے کی مجموعی تاریخ میں ان کی جگہ معتبر بھی ہے اور محفوظ بھی۔'' وارث علوی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''شوکت ھیات کو زبان اور بیان پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔'' جبکہ فاروق ارگلی اپنے مضمون کا خاتمہ ان الفاظ میں

کرتے ہیں ''شوکت حیات سائنس کے طالبعلم ہیں انسانی نفسیات ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔انہوں نے انسانی زندگی اور موضوعات کا سائنٹفک تجزیہ کیا ہے۔''

اس شمارے میں شامل دیگر مضامین بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں ۔ یہ مضامین فکشن رائٹرز اور ریسرچ اسکالرز کے لیے بہت معاون ثابت ہوں گے اور ان سے اردو افسانے کے تئیں شوکت حیات کی بیش بہا خدمات کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔

معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری کا تحریر کردہ خاکہ ''افسانے کا سکندر......شوکت حیات پڑھنے کے بعد وہ وقت ذہن کے پردے پر رقص کناں ہونے لگا جسے کورونا کال کا نام دیا گیا تھا۔اس پُر آشوب دور میں دنیا بھر میں بشمول وطن عزیز ہندوستان میں جو تباہی ہوئی تھی اسے یاد کر کے کلیجہ منھ کو آجاتا ہے ۔ کتنے ہی عزیز و اقارب، دوست رشتہ دار، ادیب وشاعر ہم سے جدا ہو گئے ۔ الہٰی! پھر وہ دن کسی کو دیکھنا نصیب نہ ہو۔اس خاکے کی آخری چند سطریں پڑھ کر آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔مشتاق احمد نوری لکھتے ہیں:''نہ بیٹا، نہ بہو، نہ بیٹی، نہ داماد۔نہ ہی کوئی ادیب، شاعر دوست، دشمن کوئی نہیں۔اتنی خاموشی اور تنہائی میں آخری سفر طے ہوگا یہ شوکت نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''نوری صاحب کے اس خاکے کو پڑھ کر موصوف کی شوکت حیات سے قربت اور رفاقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔عبدالصمد صاحب اپنے خاکے میں لکھتے ہیں:''ہر ہفتہ فون کرنا ان کا معمول بن گیا تھا۔''اقبال حسن آزاد لکھتے ہیں:''جب میں نے 'ثالث' کے گوشہ' شموئل احمد کا اعلان کیا تو ان کی بیگم کا فون آیا۔ کہنے لگیں کہ اقبال بھائی! شموئل احمد پر گوشہ مت نکالیے،شوکت حیات پر گوشہ نکالیے۔میں نے کہا کہ شوکت حیات وعدہ تو کرتے ہیں مگر وفا نہیں کرتے ۔ان پر گوشہ نکالنا بہت مشکل ہے۔پھر بھی میں نے وعدہ کیا اور کہا کہ ان شاء اللہ ''ثالث'' میں شوکت حیات پر گوشہ ضرور نکلے گا۔ لیجئے گوشہ کی جگہ پورا نمبر ہی نکل رہا ہے۔''

ان خاکوں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ شوکت حیات کے شیدائیوں سے ان کو کتنی محبت تھی ۔ ''ثالث'' کا شوکت حیات نمبر اسی محبت اور احترام کا نتیجہ ہے۔

خاکوں کے بعد شوکت حیات کے چار اہم افسانوں ''ذائقہ''''بانگ''، ''میّت''اور کوبڑ کے تجزیے شامل ہیں جنھیں بالترتیب مشتاق احمد نوری، غضنفر، پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر توصیف احمد ڈار نے تحریر کیا ہے۔

ان نگارشات کے علاوہ شوکت حیات کے دو انٹرویو بھی اس نمبر میں شامل ہیں۔ پہلا انٹرویو نثار احمد صدیقی نے لیا ہے اور دوسرا ڈاکٹر محمد غالب نشتر نے۔ دونوں انٹرویو اپنی جگہ اہم ہیں اور ان سے شوکت حیات کے خیالات ونظریات کی وضاحت ہوتی ہے۔

اس شمارے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں شوکت حیات کے چند اہم خطوط بھی شامل ہیں

جوانہوں نے قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر ابرار رحمانی، عین تابش، ڈاکٹر سید احمد قادری، رفیع حیدر انجم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، اقبال حسن آزاد اور ڈاکٹر ارشد رضا کے نام لکھے تھے۔ یہ خطوط شوکت حیات کی شخصیت کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ عین تابش کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''یہ بھی جانتے ہو میرا بچپن سہسرام میں گزرا ہے۔ میرے والد وہیں پوسٹیڈ تھے۔ اس کے بعد یتیمی کا جو پہاڑ میرے اوپر گرا تو اب تک اس کے نیچے دبا ہوا کراہ رہا ہوں۔'' یہ جملے یقیناً بہت جذباتی ہیں اور ان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک انسان کی زندگی میں باپ کی کتنی اہمیت ہے۔ یہ وہی سمجھ سکتا ہے جو نوجوانی میں یتیم ہو گیا ہو۔ اس خط میں انہوں نے حسین الحق کا بھی کر کیا ہے اور ان کے ساتھ جو کشیدگی پیدا ہوئی اسے ان لفظوں میں بیان کیا ہے: ''ویسے یار اب اس ادھیڑ عمر میں کیا لڑائی اور جھگڑا! سچ مچ میں حسین کو مانتا ہوں لیکن ادھیڑ عمر کے میرے کچھ دوست ہم لوگوں کے درمیان دوری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں میری اہمیت کا احساس دلاؤ۔'' اردو ادب میں آپسی چپقلش شاید روز اول سے ہی موجود ہے۔

ڈاکٹر سید احمد قادری کے نام خط میں لکھتے ہیں: ''میرے مرنے کے بعد تو آپ لوگ کلمۂ خیر سے مجھے نوازیں گے ہی، جب تک زندہ ہوں اس وقت تک بھی میری ادبی زندگی کی گواہی دیجئے۔'' یقیناً ایک ادیب کی اہمیت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب وہ اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے کسی شاعر نے کہا ہے کہ:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس　　یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

اقبال حسن آزاد کے نام خط میں رقم طراز ہیں: ''آپ کی پسندیدگی کا خط پڑھ کر چونک پڑا۔ آپ دیگر بہاریوں سے یکسر مختلف ہیں۔ اس کرم فرمائی کے لیے ممنون ہوں۔ آپ کہانی کی روح تک پہنچ گئے۔''

شوکت حیات افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ تنقید نگار بھی تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''بانگ'' بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ ''ثالث'' شوکت حیات نمبر میں افسانے سے متعلق ان کے تین مضامین بھی شامل ہیں جن سے شوکت حیات کی تنقیدی بصیرت کا پتا چلتا ہے۔

رسالے کے آخر میں شوکت حیات کے سات اہم افسانے (۱) گنبد کے کبوتر (۲) رانی باغ (۳) مرشد (۴) ذائقہ (۵) بانگ (۶) میّت (۷) کوبڑ شامل اشاعت ہیں جو رسالے کے معیار و وقار میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ شوکت حیات کا واحد ناول/ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' بھی شریک اشاعت ہے۔

۴۹۶ صفحات کے اس شمارے میں ۴۴۵ صفحات شوکت حیات کے لیے مختص ہیں جبکہ ۵۱ صفحات میں تبصرے اور مکتوبات ہیں۔ غضنفر کے سوانحی ناول ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' پر اقبال حسن آزاد نے ایک پُر مغز تبصرہ تحریر کیا ہے جبکہ ثالث کے پچھلے شمارے پر عشرت ظہیر، سلیم انصاری، عظیم اللہ ہاشمی، اصغر شمیم، ڈاکٹر

منصور خوشتر، ریحان کوثر اور رویندر راجو گلیکر نے تبصرے کیے ہیں
آخر میں فاروق ارگلی، مرغوب اثر فاطمی، عین تابش ،غزال ضیغم،فخر الدین عارفی،غلام نبی کمار، ڈاکٹر اختر آزاد، وسیم فرحت، وسیم احمد فدا، جرنلسٹ اقبال، مختار بلال، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، احسان تابش اور ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر گیاوی کے خطوط شامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال حسن آزاد نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس نمبر کی اشاعت کے لیے اقبال حسن آزاد کے ساتھ مدیر ثالث، ثالث آفاق سالح اور نائب مدیرہ نشاط پروین بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بلاشبہ شوکت حیات جس مقام کے مستحق تھے وہ انہیں ان کی زندگی میں حاصل نہیں ہوسکا۔ اس خصوصی شمارے نے شوکت حیات کو حیات نو بخش دیا ہے۔ اُمید کی جانی چاہیے کہ اس شمارے کی اشاعت کے بعد شوکت کے فن اور شخصیت پر سنجیدگی کے ساتھ کام ہوگا۔

◄ ● ►

● محمد مرشد

اب سے نو برس پہلے جب رسالہ ثالث کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا تھا، اس وقت تک اقبال حسن آزاد کے تین افسانوی مجموعے اور ایک تحقیقی کتاب منظر عام پر آ چکے تھے اور تین دہائیوں سے زیادہ عرصے تک درس وتدریس کے میدان میں ان کی خدمات قابل توجہ تھیں۔ لوگوں نے ثالث جیسے نئے رسالے کو اِسی طور پر لیا کہ یہ رسالہ دوسرے بہت سارے رسائل کی طرح دو چار شمارے نکل کر آپ اپنی موت مر جائے گا، مگر جیسے جیسے اِس رسالے نے اپنے بال وپَر پھیلائے، ہم نے دیکھا کہ اس کا دائرۂ اثر بھی بڑھا لکھنے والوں کا حلقہ تو سب سے زیادہ وسیع ہوا۔ کیا نئے اور پرانے لکھنے والے اور ہندستان کے گوشے گوشے کے علاوہ پاکستان سے یوروپ تک پھیلے ہوئے اردو کے ادیبوں اور شاعروں بالخصوص افسانہ نگاروں کے لیے ’ثالث‘ ایک ایسا پلیٹ فارم بن گیا جیسے یہ اردو کا حقیقتاً عالمی رسالہ ہو۔ عام شماروں کے ساتھ خاص شمارے اور خصوصی گوشوں کا بھی ایک معرکۃ الآرا سلسلہ اس رسالے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ فکشن نمبر، خواتین نمبر اور اب شوکت حیات نمبر ایک ضخیم خصوصی شماروں کا یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو بامعنیٰ بھی ہے اور مستقبل کے لکھنے والوں کے لیے تحقیقی دستاویز بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ آج جب کہ سرکاری رسائل دَم توڑتے نظر آرہے ہیں اور تمام ناشر بن کر اردو کی کتابوں اور رسائل کی خرید وفروخت کا معاملہ کوہ کنی کے برابر معلوم ہوتا ہے، ایسی حالت میں پانچ پانچ سو صفحات پر مشتمل شمارے نکالنے کا حوصلہ ہی بڑی بات ہے اور اقبال حسن آزاد نے شوکت حیات پر خصوصی شمارہ نکال کر یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ شعبۂ ادارت کے مالی دشواریوں پر بھی حسب ضرورت قادر ہیں۔ اِس کام کے لیے وہ خصوصی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اقبال حسن آزاد بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، اِس وجہ سے ثالث رفتہ رفتہ افسانہ اور افسانے کی تنقید کے

حوالے سے اپنی شناخت قایم کرتا گیا۔ ثالث کے اکثر و بیشتر گوشے افسانہ نگاروں کے حوالے سے سامنے آئے۔
کسی ایڈیٹر سے بالعموم یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تمام اصناف ادب میں ایک توازن قایم رکھے اور سب کے لیے موزوں مقام کا تعین کرے، مگر جب ہم یہ جانتے ہیں کہ کوئی ادیب یا شاعر یا فن کار حقیقتاً کسی خاص فن کا ماہر یا کسی خاص شعبۂ علم کا رسیا ہے تو ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ وہ شخص اس میدان میں اپنی مہارت کو ثابت کرتے ہوئے اپنے رسالے کو نیا رُخ دے۔ اقبال حسن آزاد چوں کہ افسانہ نگار ہیں۔ اس لیے اپنے رسالے کے لیے انھوں نے اپنی ماہرانہ دنیا کے اندر رہتے ہوئے غذا تلاش کی۔ ثالث کے تمام شماروں پر یہ نظر ڈال لیں تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ انھوں نے اپنے رسالے میں افسانہ نگاروں کو اور افسانے سے متعلق تنقیدی مضامین شایع کیے۔ اس سے رسالے کی پہچان قایم ہوئی اور کم مدت میں یہ رسالہ اہالیان قلم اور شائقین ادب کے درمیان اعتبار پانے میں کامیاب ہوا۔

شوکت حیات نمبر کی اشاعت بھی حقیقتاً اِسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یہاں اِس بات کا موقع نہیں کہ اہلِ علم حلقے میں شوکت حیات کی ادبی خدمات کے سلسلے میں اپنے معروضات پیش کروں اور اِس بات کی بھی یہاں گنجائش نہیں کہ اُن سے مختلف مواقع پر ذاتی اور ادبی ملاقاتیں رہیں، اُنکے مجھ پر کیسے تاثرات قایم ہوئے۔ اِسے مستقبل پر میں اٹھا رکھتا ہوں۔ آج شمارہ ثالث کے خصوصی شمارے کے حوالے سے چند تعارفی کلمات اور مشاہدیات درج کرانے پر اکتفا کروں گا۔ ظاہری طور پر رسالہ ثالث کے اِس شمارے کو ملاحظہ کریں تو اس میں شوکت حیات کے سلسلے سے انیس تنقیدی مضامین، سات خاکے، چار افسانوی تجزیے، دو مکالمے، شوکت حیات کے آٹھ خطوط، چار تنقیدی مضامین، سات نمایندہ افسانے اور 'سرپٹ گھوڑا' عنوان سے شوکت حیات کا مکمل ناولٹ ایسے آزادانہ حصے ہیں جن سے شوکت حیات نمبر کی تکمیل ہوئی ہے۔

ایڈیٹر نے نئے اور پرانے مضامین کچھ اس طرح سے مِلا جُلا کر رِسالے میں شامل رکھے ہیں جن سے کسی پچھلے مضمون کو پڑھتے ہوئے کسی باسی پَن یا اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ اپنے ڈھائی صفحہ کے اداریے میں انھوں نے اِس رسالے کے نکالنے کے اسباب اور شمارے کی تحریروں کے سلسلے سے اختصار کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ انھوں نے صفدر امام قادری، قسیم اختر اور ڈاکٹر ارشد رضا کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے مواد کی فراہمی میں دستِ تعاون بڑھایا۔ نئے مضامین اور نئے خاکوں کا بھی انھوں نے نام بہ نام تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر وصیہ عرفانہ کے مضمون کو نئے مضامین کی فہرست میں رکھا ہے۔ اگر چہ یہ پہلے کئی جگہوں پر شایع ہو چکا ہے مگر اس مضمون کے معیار اور شوکت حیات کے افسانوں کے سلسلے سے بنیادی نکات پر گفتگو کرنے کے لیے داد نہ دینا مناسب بات نہ ہوگی۔ پرانے مضامین میں وہاب اشرفی اور وارث علوی کے مضامین کو دوبارہ شایع کرنا پڑھنے والوں کی ذہن سازی کے لیے ضروری تھا لیکن اِسی کے ساتھ مہدی جعفر کا پرانا مضمون بھی یہاں

شامل ہوتا تو شوکت حیات کے بعض افسانوں کی بالخصوص جدیدیت زدہ افسانوں کی تفہیم میں سہولت ہوتی۔

شوکت حیات کی افسانہ نگاری کی خصوصیات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے جو انیس مضامین اِس رِسالے میں شامل ہیں، اُن میں سے اکثر و بیشتر شوکت حیات کے بہت سارے افسانوں کا موضوعاتی اور تکنیکی جائزہ لیتے ہوئے ہمیں اُس مقام تک پہنچاتی ہے جہاں ہمیں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ۱۹۷۰ء کے بعد کے نسل کے وہ بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ابرار رحمانی، سید احمد قادری، شہاب ظفر اعظمی، وصیہ عرفانہ وغیرہ کے مضامین تنقیدی اعتبار سے شوکت حیات کے افسانوں کی نئی گرہیں کھولتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے شوکت حیات کے افسانوں کی ایک وسیع وعریض دنیا ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے اور ہمارے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اردو ادب دنیا میں ان کی اہمیت کیوں کر ہے۔

شوکت حیات کے واحد ناولٹ 'سرپٹ گھوڑا' کی اشاعت کے ساتھ اس شمارے کا سب سے طویل تنقیدی مضمون اِسی ناولٹ کے حوالے سے پروفیسر صفدر امام قادری کا شایع کیا گیا ہے۔ شوکت حیات افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ شہرت رکھتے تھے اور کسی نقاد نے کبھی ان کے ناولٹ پر کوئی مختصر سا بھی مضمون نہیں لکھا۔ صفدر امام قادری نے اس سرد مہری کے برخلاف اِس ناولٹ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور شوکت حیات کے مخصوص فن کو اجاگر کرنے میں کامیابی پائی ہیں۔

نثار احمد صدیقی اور محمد غالب نشتر کے دو مختصر انٹرویو بھی اس رسالے میں شامل کر کے شوکت حیات کے مزاج اور طریقۂ کار کو سمجھنے کیلئے ہمیں ایک راستہ سمجھایا۔

تنقیدی مضامین کے سلسلے کی ایک کڑی وہ چار تجزیے ہیں جو اِس شمارے میں اہتمام کے ساتھ شایع کیے گئے ہیں۔ صغیر افراہیم اور سید اشہد کریم کے مضامین بھی گنبد کے کبوتر کے حوالے سے ہیں۔ اِس لیے انھیں بھی تجزیے کے حصے میں جوڑ کر ملاحظہ کرنا چاہیے۔ مشتاق احمد نوری، غضنفر، اسلم جمشید پوری اور توصیف احمد ڈار کے تجزیے خاصے ہیں اور شوکت حیات کے افسانوی ذہن کے بہت سارے دریچے کھولنے کے لیے ہمیں اُکساتے ہیں۔

اِس خاص شمارے میں شوکت حیات کے سات خاکے اور یادداشتوں پر مشتمل مضامین شایع کیے گئے ہیں۔ یہ نہایت دل چسپ ہیں اور اِن خاکوں کی مدد سے شوکت حیات کی ایک مکمل تصویر تیار کی جاسکتی ہے۔ اُن کی طاقت اور ان کی کمزوریاں اُن کے تضادات اور اُن کی بوالعجبیاں سب آئینہ ہیں۔ ایک بھی خاکہ نگار ایسا نہیں کہ جس نے غیض وغضب میں یا حالتِ جلال میں شوکت حیات کو پچھاڑنے کی کوشش کی ہو۔ خاص طور پر غضنفر، مشتاق احمد نوری، عبدالصمد اور اقبال حسن آزاد کے خاکے شوکت شناسی کے نئے راستے قایم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شوکت حیات کوئی تنقید نگار تو نہیں تھے مگر کبھی کبھی وہ مضامین لکھ لیتے تھے۔ مضمون نویسی کے دوران وہ

باضابطہ طور پر نقاد کا رول اپنا لیتے تھے۔ انھوں نے غیاث احمد گدی اور سہیل عظیم آبادی کے سلسلے سے اتنے قیمتی مضامین لکھے ہیں جن سے کوئی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ وہ ایک باضابطہ نقاد بھی تھے۔ رسالہ ثالث کے ساتھ یہ اچھا ہوا کہ شوکت حیات کے اس رُخ کو پسِ پشت نہیں ڈالا گیا اور اُن کے تین مضامین نمونے کے طور پر شایع کیے گئے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ افسانہ نگاری کے تعلق سے ہی یہ سارے مضامین یہاں پیش کیے گئے ہیں۔ اِن کے مطالعے سے یہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ شوکت حیات اپنی نسل اور اپنی تحریروں کو اقرار کے لیے علمی طور پر کس طرح مستفید کرتے تھے۔ شوکت حیات اس موضوع پر ہمیشہ مستعد لکھنے والے کی طرح ہمارے سامنے آتے ہیں۔

شوکت حیات کے نمایندہ سات افسانے اِس خصوصی شمارے میں شامل ہیں۔ یہ ماننا تو کسی کے لیے بھی مشکل ہونا چاہیے کہ شوکت حیات کے فن کی نمایندگی کرنے کے لیے کیا یہی سات افسانے ہیں یا کوئی اور فہرست بنائی جاسکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُن کے فن اور نفسِ مضمون کو بنیاد بنائیں تو کم از کم ایسی دو فہرستیں اور بننی چاہیے۔ جن سے شوکت حیات ہماری آنکھوں کے سامنے آئینہ ہوسکتے تھے۔ مگر اتنا تو کہنا پڑے گا کہ یہ ساتوں افسانے اپنے خاص رنگ کے ہیں۔ اور اِن میں سے پانچ افسانوں گنبد کے کبوتر، ذائقہ، بانگ، میت اور کوبڑ کے تنقیدی تجزیے بھی اِس رسالے میں موجود ہیں کہ اس کا معنیٰ یہ بھی ہوئے کہ کوئی بھی پڑھنے والا اصل تخلیق کو پڑھ کر نقادوں کے غلط یا صحیح فیصلوں کو پڑھ کر اپنے طور پر جائزہ لے سکتا ہے۔

تقریباً ۴۴۰ صفحات اس رسالے میں شوکت حیات کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں باقی مکتوبات ثالث پر تبصرے اور غضنفر کی خودنوشت پر تبصرہ جسے امور راس رسالے کے حصہ ہیں۔ اس شمارے کی اصل خوبی یہ ہے کہ شوکت حیات کی شخصیت کا بُت قائم کرنے سے زیادہ اُن کی فنی اور تخلیقی جہات کو روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے نئے پڑھنے والوں کے لیے جہانِ معنیٰ روشن ہوسکتے ہیں۔ نئی نسل کے لیے شوکت شناسی کے نئے راستے شاید یہیں سے کھلیں۔ ان کی زندگی میں غالباً یہ راستہ مختلف اسباب سے بند رہا کم از کم اِس قدر شناسی سے شوکت حیات کبھی سیر نہ ہوئے۔ خدا بھلا کرے اقبال حسن آزاد کا جنھوں نے اُن کی وفات کے محض ایک برس بعد وہ علمی راستہ کھول لیا ہے جہاں نئے ذہن اور شعور سے شوکت حیات کو سمجھنے کی کوشش شروع ہوگئی۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ شمارہ دوسرے رسائل کے لیے راہ نمائی کا کام کرے گا اور دیگر شخصیات پر اِسی طرح کے بھرپور شمارے شایع کرنے کا ایک چلن قایم ہوگا۔

◄◄ ● ►►

● ڈاکٹر توصیف احمد ڈار

”دنیا ہے تو ہر طرح کے ہنگامے بھی ہیں۔ ان ہنگاموں سے ڈرنا چاہیے نہ گھبرانا، بلکہ ان کا مقابلہ کرنا

چاہیے۔لیکن یہ مقابلہ آرائی وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔''اقبال حسن آزاد کے یہ تحریر کردہ جملے بظاہر مختصر ہیں لیکن قدرے وسیع المفہوم ہیں اور مبنی بر حقیقت بھی۔تاریخ گواہ ہے کہ انسانیت کی فلاح و بقاء کے تمام تر امکانات انسان کی تعمیری جدو جہد میں ہی مضمر ہے ہیں اور تا قیامت اس صداقت کی حیثیت مسلم ہے۔وہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ کیوں نہ ہو محنت، لگن، ایمان داری اور خلوص وہ بنیادی اوصاف ہیں جو اس کی ترقی و کامیابی کے ضامن قرار پاتے ہیں۔اکیسویں صدی کا یہ تہذیبی و ثقافتی منظر نامہ جہاں ایک انسان کو ہر لمحہ نئی نئی خواب گاہوں کی سیر کراتا ہے، نئے نئے حقائق، ایجادات، انکشافات اور تجربات سے اس کی زندگی کو مزید ہمواری کی طرف گامزن کراتا ہے وہیں اس کے سامنے چیلنجز کا ایک ایسا انبار بھی کھڑا کیے ہوا ہے کہ جس سے نبرد آزما ہونا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ادب کسی بھی ہئیت و تکنیک اور کسی بھی فکری سانچے (ذاتی یا عوامی) کو محیط کیوں نہ ہو اپنے عہد کے اثرات سے بحر حال مستثنیٰ نہیں ہوتا ہے۔پھر ادب بلکہ معیاری ادب کی تشہیر و ترسیل اور ادب کے سنجیدہ قارئین کو مناسب غذا فراہم کرنا بھی آج کے دور کا ایک صبر آزما معاملہ بن چکا ہے اور بلا شبہ محض گنے چنے افراد ہی (انفرادی یا اجتماعی طور پر) اس عمل کو بخوبی سرانجام دینے میں فی الحال کامیاب نظر آتے ہیں۔انہیں ادب دوست شخصیات میں اقبال حسن آزاد اور ان کے اشتراک میں کام کرنے والے دوسرے منتظمین کا بھی شمار ہے۔

کتابی سلسلہ ''ثالث'' کے اب تک بائیس (۲۲) شمارے اشاعت کے مراحل سے گزر چکے ہیں۔ منظر عام پر آتے ہی یہ تمام شمارے اپنی اہمیت وافادیت منوانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔اس کتابی سلسلے کا تازہ شمارہ (بائیسواں شمارہ) بھی گزشتہ شماروں کی طرح ہی بہت ضخیم، معیاری اور نادر تخلیقی، تحقیقی و تنقیدی مشمولات کی بنا پر قارئین کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔واضح رہے کہ یہ تازہ شمارہ اردو ادب کے ایک مستند اور معروف عام تخلیق کار ''شوکت حیات'' کی حیات و ادبی خدمات کو محیط ہے۔شوکت حیات کی حیات، شخصیت اور تخلیقی انفرادیت کے متنوع گوشوں سے متعلق ملک اور بیرون ملک کے قد آور محققین اور ناقدین کی تحریریں اس شمارے کی معنویت کو دوبالا کرتی ہیں۔مضامین ، خاکے، تجزیے، شوکت حیات کے خطوط، شوکت حیات کے مضامین، شوکت حیات کے افسانے اور ناولٹ کے علاوہ تبصرے اور قارئین کے خیالات جیسے الگ الگ موضوعاتی خانوں میں منقسم اس شمارے کی ترتیب و تنظیم میں جس حکمتِ عملی سے کام لیا گیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔

شوکت حیات اپنی تخلیقی ذہانت سے ادبی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں۔ان کے کم وبیش تمام فن پارے اردو ادب بالخصوص اردو فکشن کا قابلِ قدر سرمایہ گردانے جاتے ہیں۔انہوں نے اپنی معاصر زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو جس متوازن انداز میں ادبی جامہ پہنایا ہے وہ انہیں ادبی روایت میں لائق احترام مقام عطا کرتا ہے۔اس حقیقت کا اعتراف اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر وہاب اشرفی اپنے الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں:

''وہ (شوکت حیات) پختہ ذہن کے فن کار کی طرح آہستہ آہستہ اپنے ذہن کی تصویر کو مکمل کرتے ہیں اور اس کی تکمیل میں مناسب رنگ بھرتے ہیں جو ہر طرح سے متوازن بھی ہوتا ہے، کہیں کوئی لاتعلق داغ دھبہ نہیں۔اب جو تصویر سامنے آتی ہے وہ حقیقت واقع کا عکس محض نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر ایک ایسی تخلیقی جوت ہوتی ہے جو اس کی شدت کو سرتا پا بڑھا دیتی ہے۔ نتیجے میں افسانہ نگار کی غایت افسانہ بن کر ایک پیکرِ تخلیق میں ڈھل جاتی ہے۔''

(پروفیسر وہاب اشرفی: شوکت حیات کی افسانہ نگاری۔مشمولہ ''ثالث۔شوکت حیات نمبر''۔مارچ تا جون ۲۰۲۲ء۔ص ۱۲)

شوکت حیات نے جس زمانے میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اُس وقت اردو ادب ترقی پسندی اور جدیدیت کے تصورات کے تلے اپنی بقا کو قائم رکھے ہوئے تھا، کچھ عرصے کے بعد مابعد جدیدیت کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوئیں اور ادبی منظرنامے میں قدرے تبدیلی واقع ہوئی۔شوکت حیات کی تخلیقات میں بھی، خواہ فکری سطح پر یا کہ فنی اعتبار سے، ان تبدیلیوں کے آثار کسی نہ کسی صورت میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔زیرِ تجزیہ شمارے میں شامل وارث علوی، فاروق ارگلی، ڈاکٹر ابرار رحمانی، پروفیسر صفدر امام قادری، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر صغیر افراہیم، ڈاکٹر منصور خوشتر، پروفیسر اسلم جمشید پوری کے علاوہ دوسرے مایہ ناز قلم کاروں کی تحریریں شوکت حیات کے اس تخلیقی ارتقا کی تفہیم وتوضیح کے حوالے سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ان مضامین اور تجزیوں کے بغور مطالعے سے نہ صرف شوکت حیات بلکہ اردو ادب کی تاریخ کے مختلف ادوار کی امتیازی خصوصیات، موضوعاتی واسلوبیاتی ترجیحات، سماجی ومعاشرتی صورتِ حال وغیرہ کا بھی بخوبی نظارہ ہوتا ہے۔جیسے:

''حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت کے ہنگامی اور بحرانی دور میں علامتوں، استعاروں اور تشبیہات کا جادو فن کاروں کے سر چڑھ بول رہا تھا اور ہر چھوٹا بڑا فن کار جدیدیت کی دوڑ میں آگے نکل جانا چاہ رہا تھا اور اپنی شناخت کے لیے اپنے جدید افسانوں کی طرح طرح تاویل اور تشریح دے رہا تھا......لیکن ان افسانہ نگاروں میں سے جینوئن افسانہ نگاروں نے اینٹی پلاٹ، اینٹی اسٹوری، اینٹی ہیرو، سرریلزم اور شعور کی رو کی بھو بھلیوں میں خود کو زیادہ نہیں بھٹکایا۔ان افسانہ نگاروں نے بڑی شدت سے اس بات کو بھی محسوس کیا کہ صرف ذات کی تنہائی، کرب، گھٹن، خوف اور تذبذب میں محدود رہ کر اور سماجی و معاشرتی مسائل سے جڑے بغیر افسانہ، قاری کو متوجہ نہیں کرسکتا۔'' (ڈاکٹر سید احمد قادری:

شوکت حیات اوران کےافسانے۔مشمولہ ”ثالث۔شوکت حیات نمبر“شمارہ نمبر۲۲۔ص ۶۳)

ڈاکٹرسید احمد قادری کےمضمون کےمندرج بالا اقتباس کےعلاوہ اس شمارے میں شامل کم وبیش تمام تنقیدی مضامین اپنے آپ میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔پروفیسر وہاب اشرفی، وارث علوی، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر سید احمد قادری اور ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی وغیرہ نے شوکت حیات کی افسانوی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ پیش کرکے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ یقیناً غور طلب ہیں۔ان کے افسانوں کی جو متنوع تعبیرات سامنے لائی گئی ہیں، وہ ان کی ادب فہمی پر دال ہیں۔اس تازہ شمارے میں پروفیسر صفدر امام قادری کا مضمون بعنوان ”شوکت حیات کا ناول ’سرپٹ گھوڑا‘: ایک تنقیدی جائزہ“ وہ واحد مضمون ہے جس میں شوکت حیات کے ناول ”سرپٹ گھوڑا“ سے کے حوالے سے سیر حاصل تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔پروفیسر موصوف نے جس انہما کی اور بصیرت افروز انداز میں اس ناول کی تمام جزئیات کو کھنگالا ہے، وہ اسے کئی مضامین پر بھاری ثابت کردیتا ہے۔

ثالث کے اس تازہ شمارے میں جو خاکے شامل ہیں وہ شوکت حیات کی شخصیت، ان کے مزاج و مذاق، ان کے رویے، طرز فکر زندگی گزارنے کے طور طریقے اور خاندانی پس منظر وغیرہ کی دلچسپ داستان ہیں ۔اور تو اوران کے مطالعے سے شوکت حیات کے پورے دور کی تہذیبی وثقافتی تاریخ،علم وادب کی سرگرمیاں، سماجی ومعاشرتی ضوابط، ادبا کی آپسی نوک جھونک کی بھی ایک منظّم جھلک دکھائی دیتی ہے۔اس لحاظ سے یہ خاکے قارئین کے مطالعے کے لیے ایک اہم اضافہ ہیں۔قلم کاروں نے صنفِ خاکہ کی فنی نذاکت کا بھرپور لحاظ رکھتے ہوئے تصویر کے دونوں رُخ اس قدر متناسب پیرائے میں سامنے رکھے ہیں کہ شوکت حیات کی شخصیت کی ایک مکمل اور جیتی جاگتی تصویر نگاہوں میں جلوہ گر ہوجاتی ہے۔مشتاق احمد نوری، عبدالصمد، ڈاکٹر ابرار رحمانی، غضنفر، ڈاکٹر منظر اعجاز، اقبال حسن آزاد، نشاط پروین وہ قلم کار ہیں جن کے خاکے اس مخصوص شمارے کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ چند ایک مثالیں یہاں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ شوکت حیات کی شخصیت کے کچھ اہم پہلوؤں سے آپ بھی روشناس ہوجائیں اور ساتھ ہی ساتھ خاکہ نگاروں کی کمالِ فن کاری کا بھی مظاہرہ ہوجائے:

”اس (شوکت حیات) کی شخصیت کافی مرعوب کن تھی۔ بڑا سر، کشادہ پیشانی، چوڑا چہرہ، دراز قد اور گرجدار اور مرعوب کن آواز جسے سنتے ہی مقابل خوامخواہ سحر میں مبتلا ہوجائے۔ وہ خود کو انانیت کا امام سمجھتا تھا اور جب بھی جدید فکشن پر گفتگو کرتا تو اپنے سامنے آئینہ رکھ لیتا خود کے علاوہ اسے کوئی نظر ہی نہیں آتا۔آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ اپنے ہم عصروں کو پڑھتا ہی نہ تھا یہ بات اس نے مجھے خود بتائی اور یہ بھی کہا کہ سلطان بھائی نے تاکید کی کہ کسی ہم عصر کو نہ پڑھو تاکہ تمہاری تحریر کسی سے متاثر نہ ہو۔ وہ اپنے سحر میں مبتلا تھا اور حد درجہ نرگسیت کا شکار تھا۔ایسے لوگ سماج سے کٹ کر تنہا ہوجاتے ہیں اور بعد میں احساس

کمتری کے شکار ہوجاتے ہیں ۔شوکت حیات کے ساتھ بھی یہی ہوا۔‘‘(مشتاق احمد نوری:افسانے کا سکندر:شوکت حیات ۔مشمولہ’’ثالث ۔شوکت حیات نمبر‘‘شمارہ۲۲۔ص۱۸۵)

’’ایک زمانے میں جب وہ اپنی بسکو مان کی نوکری میں بہت فعال تھا، وہاں کی یونین بھی اسی کے دم سے فعال تھی، اکثر و بیشتر یا تو وہ بہت مصروف رہتا یا غائب رہتا۔بسکو مان کے نکڑ پر چائے ناشتے کا ایک جھونپڑا تھا جہاں شوکت حیات کا کھاتہ کھلا ہوا تھا وہ موجود رہتا تو وہاں دوستوں کی محفل جمتی ہی رہتی، موجود نہیں رہتا تب بھی یار لوگ اس کے کھاتے سے چائے ناشتہ کر کے ہی لوٹتے۔اس بات کا برا ماننا تو دور، وہ بہت خوش ہوتا تھا۔اس سے اس کا بجٹ ضرور گڑبڑ جاتا تھا، مگر اس کو اس کی پروا کب تھی۔‘‘(عبدالصمد: وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی۔مشمولہ ’’ثالث ۔شوکت حیات نمبر‘‘شمارہ۲۲۔ص۲۰۹)

کتابی سلسلہ ثالث کے زیرِ تجزیے شمارے میں شامل شوکت حیات کے مضامین ان کی تنقیدی بصیرت اور ادب فہمی کے مقام و معیار کو سمجھنے کے سلسلے میں حوالے کا درجہ رکھتے ہیں۔علاوہ ازیں شوکت حیات کے خطوط جہاں ان کی نفسیات اور جذبات و احساسات کا پتا دیتے ہیں وہیں اس شمارے میں شاملِ اشاعت ان کے افسانے ان کے تخلیقی تناظرات پر دال ہیں۔مجموعی طور پر ثالث کا یہ تازہ شمارہ اپنے آپ میں ایک ایسا تحقیقی، تنقیدی و تخلیقی گلدستہ ہے جس کا ہر پھول اپنی خوشبو اور چمک سے دل کو موہ لیتا ہے۔رسالے کی اس قابلِ فخر اشاعت پر اس کے سرپرست یقیناً مبارک بادی کے مستحق ہیں۔

◄● ►

● ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر گیاوی

خالص ادبی رسالہ ثالث شمارہ نمبر 22-21 یعنی شوکت حیات نمبر کا مطالعہ کیا۔معتبر اور تجربہ کار ادباء و ناقدین کے تحریروں کو بغور پڑھا۔دل کی گہرائیوں تک اک اک جملہ اتر گیا اور میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اقبال حسن آزاد ثالث آفاق صالح اور نشاط پروین کا شوکت حیات پر مختلف ناقدین و ادباء کی آراء کا انتخاب کرنا مستقبل میں اردو پر تحقیق کرنے والوں کیلئے مشعل راہ ثابت ہوں گی اور یہ کہ انکا یہ عظیم ادبی کارنامہ اردو کی تاریخ میں رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

ثالث کے مدیران کے عقل و فہم کی داد دینی ہوگی۔رسالہ کی شروعات حمد و نعت سے کرتے ہیں جو ایک نئی اور اہم پیش رفت ہے۔حمد تو ناچیز کی تحریر ہے نعت غلام مجتبیٰ مہر کی لی گئی ہے۔ناچیز نے بھی حمد میں خدا کی تعریف اور صفات بیان کیا ہے یہ شعر دیکھیں۔

تو خالق و مالک ہے رازق بھی خدایا ہے   تو نے ہی خداوندا ہر شئے کو بنایا ہے

غلام مجتبیٰ مہر کی نعت پاک کا یہ شعر دیکھیں۔

ظلمتیں رخصت ہوئیں باطل کا سر نیچا ہوا   واقعی نور نبی سے گھر کے گھر روشن ہوئے

اوران کے انداز بیاں کی داد دیں۔

اب آیئے آگے بڑھتے ہیں ۔شوکت حیات کی سوانح حیات مختصر میں صفحہ نمبر 10 پر ملاحظہ فرمائیں اور شوکت حیات کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔

شوکت حیات پر پہلا مقالہ پروفیسر وہاب اشرفی کا ہے جو میری طالب علمی کے زمانے میں میرے استاد رہ چکے تھے۔وہ لکھتے ہیں۔

"دراصل شوکت حیات ایک protest کے فنکار ہیں جن کے یہاں ناہمواریوں کے خلاف مسلسل جدوجہد ملتی ہے صرف گلہ نہیں بلکہ ان سے ٹکرانے کا عزم بھی ملتا ہے"۔

ان الفاظ سے شوکت حیات کو سمجھنے کا شعور ملتا ہے۔انہوں نے مثال کے طور پر شوکت حیات کے افسانہ "سرپٹ گھوڑا" کا حوالہ دیا ہے۔وہ کہتے ہیں آج کی تیز رفتار زندگی میں عام شہری کن مراحل سے گذر رہا ہے اس کا آئینہ خانہ "سرپٹ گھوڑا" ہے۔

افسانہ ''کوبڑ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے وہاب اشرفی لکھتے ہیں۔

افسانہ ''کوبڑ'' میں دو سگے بھائیوں کی کہانی قلم بند کی گئی ہے۔ایک کو کسی طرح مشرق وسطی نگل گیا جہاں اسکی آمدنی خاصی ہوگئی ہے اسکے مقابلے میں اس کا غریب بھائی بھی ہے جو گھر ہی پر رہتا ہے سب کے لئے مخلص، گھر کے لئے بھی اور باہر کیلئے بھی۔

یہ دوری دراصل معاشی دوری ہے جو اپنے ہی بھائی سے اسے بیگانہ بنائے ہوئے ہے۔

پروفیسر صفدر امام قادری اپنے مقالہ'' سرپٹ گھوڑا'' ایک تنقیدی جائزہ میں لکھتے ہیں۔

''سرپٹ گھوڑا'' میں شوکت حیات نے ناول نگاری کے تمام لوازمات شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ناول کو فارم لیس آرٹ کہا گیا ہے اس لئے شوکت حیات نے یہاں طرح طرح کے مصالحے جمع کئے ہیں ۔تاریخ، سیاست، سماجیات کے ساتھ جنہیں فرقہ واریت اور ٹریڈ یونین کے بہت سارے مناظر اسمیں شامل کرکے پلاٹ کو استحکام دیا گیا ہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں۔

''ماحول میں موجود کشیدگی اور متوقع ناشدنی کے لفظی پیکر بنانے میں شوکت حیات کو ناول کی مرکزی استعارے سے بہت مدد ملی ہے''سرپٹ گھوڑا'' گھوڑے کی ٹاپ دوڑنے اور آگے بڑھنے بہ تدریج قریب آنے کی

جو کیفیات ہیں اس سے وہ ہیبت نا کی بالکل سامنے آجاتی ہے جس کی پیش کش وہ اس ناول میں چاہتے ہیں۔''

بلڈوزر سسٹم سے غریبوں کا کیا نقصان ہوتا ہے وہ سرپٹ گھوڑا میں رکشہ والے کی زبان سے سنئے اور شوکت حیات کی فنکارانہ صلاحیتوں کی داد دیجیئے۔

صفدر امام قادری ''سرپٹ گھوڑا'' کا یہ اقتباس تحریر کرتے ہیں جو بلڈوزر سسٹم پر چھپا ہوا طنز ہے۔ اوراس میں غریبوں کے دل کا درد کی ٹیس چھپی ہوئی ہے۔

''روتے ہوئے رکشے والے کی گفتگو ان لفظوں میں ادا ہوتی ہے۔''

''تم جس علاقے جس بستی کو ڈھونڈ رہے ہو اسے عرصہ پہلے بلڈوزروں نے چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا.........بلڈوزروں نے سب کچھ اجاڑ دیا.......بھری پری بستی کو ملبے میں تبدیل کیا اور پھر چٹیل میدان بنا دیا.........مرکزی کردار کو اپنی دردناک زندگی کا قصہ سناتے ہوئے رکشہ والا روتے ہوئے کہتا ہے۔'' بیٹے میں نے تو صبر کرلیا تھا لیکن آج بار بار اس چٹیل میدان کو دیکھ کر پرانے زخم ہرے ہوگئے......... بابو جی بابو جی.........تم سن رہے ہو۔؟

ڈاکٹر سید اشہد کریم الفت اپنے مقالہ ''شوکت حیات اور گنبد کے کبوتر'' میں رقم طراز ہیں

''گنبد کے کبوتر'' ایک علامتی افسانہ ہے جو بابری مسجد کے انہدام پر لکھا گیا ہے۔اس افسانہ کے اندر ایک شدید اضطرابی کیفیت ملتی ہے.......ویسے ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ملک کے بعد بابری مسجد کا انہدام بھی ایک اہم سیاسی وسماجی اور تاریخی وتہذیبی موضوع ہے جس کی بساط مذہب ہے۔

اقبال حسن آزاد کے مقالہ'' بھول بھلیاں اور شوکت حیات'' کے مطالعہ سے شوکت حیات کے متعلق بہت کچھ جاننے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ایک معلوماتی مضمون ہے اور شوکت حیات کے مزاج کے سمجھنے کیلئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

ڈاکٹر منظر اعجاز کے مقالہ ''شوکت حیات......کچھ یادیں...... کچھ باتیں۔'' کے مطالعہ سے بھی شوکت حیات کی زندگی اور انکے مزاج کے تعلق سے بہت سی باتیں قاری کے علم میں آتی ہے۔ لکھتے ہیں "شوکت حیات کا جارحانہ انداز بھی دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی اور وحشت بھی۔ غالبًا دس سال سے زیادہ کی بات ہے۔ بہار اردو اکادمی میں بلراج کومل کا سہ روزہ توسیعی خطبہ چل رہا تھا۔ وہ اردو افسانے کے حوالے سے گفتگو کررہے تھے۔ پروفیسر وہاب اشرفی مسند صدارت پر تمکن تھے۔صدارتی خطبے کی باری آئی تو وہاب اشرفی اپنا مخنی سا جسم لئے اٹھے اور منمنی سی آواز میں خطبہ دینا شروع کیا۔ وہ آخری مرحلے میں تھے کہ شوکت حیات سامعین کے مجمع سے اٹھے اور بڑے ہی جارحانہ انداز میں بولے۔

''وہاب بھائی میں آپ کو نقاد مانتا ہی نہیں ہوں۔''

وہ آگے لکھتے ہیں اور شوکت حیات کے مزاج کا دوسرا یعنی نرم رخ بیان کرتے ہیں۔ بہر حال نشست برخاست ہوئی۔ وہاب اشرفی کے ساتھ دوسرے لوگ بھی نکلے۔ شوکت حیات پیچھے تھے۔ اور میں (منظر اعجاز) شوکت حیات کے ساتھ تھا۔ شوکت حیات اچانک قدرے بلند آواز میں بول پڑے: ''کیسے ہیں وہاب بھائی؟''

اس طرح منظر اعجاز شوکت حیات کے مزاج کا جارحانہ انداز اور دوستانہ انداز دونوں پیش کر رہے ہیں۔

اس شمارہ میں مشتاق احمد نوری کا تجزیہ ''ذائقہ میں نئے ذائقے کی دریافت'' ایک معرکۃ الآراء تحریر ہے۔ شوکت حیات کے جس افسانہ کو غیر اخلاقی کہہ کر اس وقت کے ناقدین نے مسترد کر دیا تھا اس افسانہ پر تجزیہ لکھ کر مشتاق نوری نے یہ ثابت کر دیا کہ شوکت حیات کی تحریر کچھ اور ہوتی ہے اور اس کا مطلب کچھ اور ہی نکلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''کہانی ذائقہ'' کو میں نے الگ انداز سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر اس نکتے پر بحث کی جاتی ہے کہ ایسا ہوا، ویسا ہوا، جو ظاہری طور پر اچھا یا خراب، قابل مذمت یا قابل ستائش ہو سکتا ہے۔ میں وہ کہا ہوا پر بحث نہیں کرنا چاہتا.......... میرے ذہن میں نکتہ صرف یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟

کن حالات میں ہوا؟ اور ایسا ہونے کے لئے بنیادی وجوہات کیا کیا ہیں؟ مشتاق نوری کا " ذائقہ " پر تجزیہ شوکت حیات کی فنی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ شوکت حیات کا یہ افسانہ موجودہ نسل کے تہذیبی زوال اور اخلاقی پستی کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''سماج کے اندر پیسے کی ہوڑ، آسائشوں کی فراوانی، سب سے آگے نکلنے کی للک انسان کو اپنے تہذیبی اثاثے سے غیر فطری طور پر محروم کرتی جا رہی ہے۔ اسے بدیش کی دولت اور گھر کا تابناک مستقبل نظر آتا ہے۔ بیوی کی رنگین ساڑی اور کلائی کے سونے کے کنگن کی چمک بھی نظر آتی ہے لیکن اس چمک دمک کے اندر وہ اس بھوک سے بے خبر رہتا ہے جو جسم کی اس رنگینی کے اندر بے قابو سیلاب کی طرح مضبوط سے مضبوط پشتہ توڑنے کیلئے بے قرار رہتی ہے۔''

وہ آگے لکھتے ہیں۔

''یہ کہانی ہمارے تہذیبی زوال کی کہانی ہے جہاں نہ تو شرافت ہے اور نہ اقدار کی پاسداری...... یہ کہانی یہ بھی بتاتی ہے کہ آج کے ہپوکریٹ دور میں ہم ہر طرح کی آلودگی سے متاثر ہو کر اپنے تہذیبی تشخص سے محروم ہوتے جا رہے ہیں اور اپنے اقدار کی پاسداری جسے ہم پرکھوں کی امانت سمجھ کر نئی نسل کو سونپنا چاہتے ہیں اسے آج کی نسل نے سنبھالنے سے انکار کر دیا ہے۔''

دیگر مقالے وارث علوی ، فاروق ارگلی، ڈاکٹر ابرار رحمانی ، ڈاکٹر سید احمد قادری ، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی ، ڈاکٹر صغیر افراہیم، ڈاکٹر حامد علی خان، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر صالحہ صدیقی ،عرفان رشید، ڈاکٹر قسیم اختر، ایم خالد فیاض، ڈاکٹر زرنگار یاسمین ، ڈاکٹر وصیہ عرفان ، ڈاکٹر گلاب سنگھ، ڈاکٹر نزہت پروین، عبدالصمد، غضنفر، نشاط پروین ، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈکٹر توصیف احمد ڈاڑ کے ہیں ساتھ ہی مکالمے اور شوکت حیات کے خطوط اور شوکت حیات کے مضامین کے ساتھ ہی شوکت حیات کے مشہور افسانوں کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ جن کے مطالعہ سے شوکت حیات کے افسانوں کو ان کی افسانوی حیثیت کو ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو پرکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس شمارے میں فاروق ارگلی مرغوب اثر فاطمی ، عین تابش ،غزال ضیغم ،فخر الدین عارفی ، غلام نبی کمار، ڈاکٹر اختر آزاد، وسیم فرحت ، وسیم احمد فداء، جرنلسٹ اقبال مختار بلال ، ڈاکٹر صالحہ صدیقی ، ڈاکٹر احسان تابش اور ناچیز ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر کے مکتوبات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مدیران ثالث کسی بھی مخلص قاری ادیب و نقاد اور شاعر کو مایوس نہیں کرتے اور شامل اشاعت کر کے ان کا حوصلہ بڑھاتے رہتے ہیں۔ اس سے رسالہ کا ادبی معیار بے حد بلند ہو جاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مدیران ثالث کسی ایک ادیب کا انتخاب کرتے ہیں اور ان کے متعلق ناقدین کے مضامین تلاش کرا سے شائع کرتے ہیں جس سے اس ادیب کے متعلق ساری معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے ثالث کی مقبولیت کا راز اور مدیران ثالث کے خلوص کا ثبوت اور ثالث کی انفرادیت جو اسے دوسرے رسالوں سے ممتاز کرتی ہے۔

●

● شبنم پروین

شوکت حیات اُن شخصیتوں میں سے ایک ہیں جن کے دوستوں اور ہم عصروں نے اُن کے خوب خوب خاکے اُڑائے۔ خاکے ہماری زندگی کے اوبڑ کھابڑ راستوں سے برآمد ہوتے ہیں، اِس لیے لکھنے والا ایک ساتھ خوشی اور غم، مزاح اور سنجیدگی اور کبھی کبھی محبت اور نفرت دونوں طرح کے جذبوں سے لیس ہوتا ہے اور اسی عالم میں کسی شخص کے خاکے کو مُرتّب کرتا ہے۔ اردو میں خاکوں کی ایک ایسی روایت بنی ہوئی ہے جہاں یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اُنھیں پڑھتے ہوئے ہم ہنسیں یا روئیں۔ ’نذیر احمد کی کہانی‘ سے لے کر ’دوزخی‘ تک لکھنے والا پڑھنے والوں پر جادو کرتا جاتا ہے۔ پڑھنے والا گھبراتا ہے کہ یہ مذمت کیسے شروع ہوگئی مگر تحریر کے اگلے موڑ پر سنجیدگی کب ظرافت میں تبدیل ہوگئی اور گدگدی پیدا ہونے لگی، یہ پتا ہی نہیں چلتا۔ خاکہ نگاری کا ایک عجیب وغریب معاملہ یہ ہے کہ آپ پڑھنے والے میں اس شخصیت کے تعلق سے ایک محبت پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ بھلے ہی اسے دوزخی کہیں مگر اس کے تذکرے میں پڑھنے والے کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور دلوں پر محبت کا سایہ پڑنے لگتا ہے۔

شوکت حیات کے حوالے سے رسالہ 'ثالث' کے خصوصی شمارے میں جو سات خاکے شائع ہوئے ہیں ،اُن میں سے کسی کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ شہکار ہیں اور انھیں اردو کے بڑے خاکوں میں شمار کیا جا سکتا ہے مگر شخصیت کی تہہ در تہہ کیفیات کو کھولنے کے لیے ان تمام خاکوں یا شخصی تاثرات میں سینکڑوں ایسے اشارے موجود ہیں جن کی مدد سے ہم کتاب کے صفحات پر شوکت حیات کی ایک بھری پُری تصویر گڑھ سکتے ہیں۔غضنفر،عبدالصمد ،مشتاق احمد نوری اور اقبال حسن آزاد کی تحریریں شخصیت شناسی کے مقاصد میں واقعتاً کامیاب ہیں اور ان خاکوں کو اردو کے بڑے اور مشہور خاکوں کے ساتھ رکھ کر لازمی طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

'ثالث' کے خصوصی گوشے میں پہلا خاکہ مشتاق احمد نوری کا ہے جس کا عنوان ''افسانے کا سکندر :شوکت حیات'' ہے۔ یہ اِس شمارے کی سب سے طویل تحریر ہے جو کوئی اُنیس صفحات پر مشتمل ہے۔یہی واحد تحریر ہے جس میں شوکت حیات کی زندگی کم و بیش عنفوان شباب سے قبرستان تک نظر آتی ہے۔شوکت حیات کی زندگی کے بہت سارے واقعات اس خاکے میں درج ہوئے ہیں۔کوئی بھی شخص جب اپنے کسی دوست کا خاکہ لکھتا ہے تو اس کے لیے ایک بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ کون سے واقعے کو تحریر کا حصہ بنائے اور کس بات کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔مشتاق احمد نوری نے جن واقعات کو چُنا ہے،ان سے شوکت حیات کی شخصیت کے کئی اَن سلجھے پہلو کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔انھوں نے بکھرے واقعات کو کچھ اس انداز سے سجایا ہے جس سے شوکت حیات کی عجیب وغریب زندگی اپنے آپ فلم کی طرح ہمارے سامنے آجاتی ہے۔شوکت حیات کو نئی ملازمت دلانے کا تذکرہ ذرا طویل ہے اور مصنف چاہتا تو بیان مختصر بھی ہو سکتا تھا مگر اس تذکرے میں شخصیت کی گتھیاں اُبھرتی جاتی ہیں۔

اس خاکے میں شوکت حیات کا اچھا اور بُرا سب کچھ ہے۔مشتاق احمد نوری نے جانے انجانے بہت سارے معاملات کو اپنے خاکے میں شامل کر دیا ہے۔شوکت حیات میں موجود اعتماد کی جس کمی کا مشتاق احمد نوری نے ذکر کیا ہے، وہ شروع کے دور سے لے کر آخری زمانے تک ظاہر ہو رہا ہے۔اسی طرح ان کے یہاں فیصلہ کن صورت حال کی باری کم ہی آتی تھی ،اس کے بارے میں مشتاق احمد نوری کی تحریر واضح اشارات فراہم کرتی ہے۔ایک نری جذباتیت کی وجہ سے شوکت حیات نے خود کو مذاق بنا لیا تھا۔شخصیت کے اس پہلو پر مشتاق احمد نوری نے بہت معقول گفتگو کی ہے۔اس خاکے کا آخری حصہ خون سے جگر سے لکھا گیا ہے۔اسی حصے میں شوکت حیات کی زندگی کا المیہ،لوگوں کی پہچان میں بھول اور انسانی زندگی کی بے بسی ،سب کچھ ظاہر ہو جاتی ہے۔خاکے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''کرونا کے دور میں تو لوگ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگے تھے۔ایک سے ایک موت نے دل مروڑ کر رکھ دیا تھا۔اسی دوران شوکت حیات کے بیمار ہونے

کی خبر ملی۔ بھابھی بیچاری اکیلی تھیں۔ بیٹا اتم حیات بیگم کے ساتھ دوبئی میں تھا۔ اسے کرونا ہونے کی خبر ہوئی تو بیٹی اور داماد دبئی نکل گئے اور ایر پورٹ پر ہی دونوں کو کورنٹائن میں بھیج دیا گیا۔ اور یہ وہی نازک گھڑی تھی جب رات اچانک شوکت حیات کو دورہ پڑا۔ وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ بھابھی دوڑی آئیں۔ جب تک مددگار آتے' افسانے کا سکندر پوری دنیا فتح کر کے آخرت کے سفر پہ روانہ ہو چکا تھا۔

صبح اطلاع ملی کہ پیر موہانی قبرستان میں صبح نو بجے تدفین ہوگی۔ میں قبرستان پہنچا۔ ہائے میرا یار شوکت سفید لباس میں بے نیاز سویا تھا۔ نظر گھمائی تو مشکل سے آٹھ دس آدمی موجود تھے۔ تدفین کے بعد ایک دراز قد کے عمر دراز شخص نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ شوکت کے کیا لگتے ہیں؟''

''نہیں' میں شوکت کا کچھ نہیں لگتا لیکن وہ میرا بہت کچھ لگتا تھا۔'' میں آبدیدہ ہو گیا۔ میری آواز پتھرا گئی۔

''تو پھر آپ کون ہیں؟''

میں نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں اس کا دوست ہوں مشتاق احمد نوری۔'' میرا نام سنتے ہی وہ چونکا۔ ''نوری صاحب، آپ کو جانتا ہوں میں۔ میں سکندر حیات ہوں، شوکت حیات کا چھوٹا بھائی۔'' میں حیرت زدہ تھا۔ شوکت حیات کی چھوٹے بھائی سے کبھی نہیں بنی۔ بس دن رات اپنے سادھو کا بکھان کرتا رہتا۔ ''سرپٹ گھوڑا'' میں پوری کہانی اس سادھو کے گرد ہی گھومتی ہے۔ میں سکندر بھائی کو اپنی کار سے لے کر اس کے نیو پاٹلی پترا فلیٹ گیا۔ سکندر کا بیٹا اپنی بڑی امی کے پاس گیا، وہ اس سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگیں۔ میں چپ تھا بس میرے آنسو جاری تھے۔ بھابھی مجھے دیکھ کر مزید بلکنے لگیں۔

''نوری بھائی! شوکت کو کچھ بھی ہوتا' کہتے سب سے پہلے نوری کو فون کرو اور دیکھیے اس بار فون کی نوبت ہی نہیں آئی۔

میں انھیں دلاسا بھی نہیں دے سکا تھا۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آنسوؤں کی اپنی زبان ہوتی ہے۔

سکندر حیات، جسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی، وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ

آخری سفر میں موجود تھا لیکن جو ساڑھو سب کچھ تھا' کرونا کے ڈر سے غائب تھا اور ساڑھوائین کا بھی پتہ نہیں تھا۔

نہ بیٹا نہ بہو، نہ بیٹی نہ داماد، نہ ہی کوئی ادیب شاعر دوست دشمن کوئی۔اتنی خاموشی اور تنہائی میں آخری سفر طے ہوگا، یہ شوکت نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''

اس شمارے میں دوسرا خاکہ عبدالصمد کا ہے۔عبدالصمد نے اپنے خاکے کا عنوان بہت دل پذیر رکھا ہے: "وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی۔"اس خاکے میں شوکت حیات کی ادبی زندگی کے نشیب و فراز پر بہت صاف ستھری گفتگو کی گئی ہے۔عبدالصمد نے یاد کیا ہے کہ ۱۹۷۰ء کے آس پاس جب وہ،شوکت حیات، علی امام، حسین الحق، اور شفق وغیرہ نے کس طرح ایک ہی زمانے میں لکھنا اور چھپنا شروع کیا مگر انھوں نے کھلے طور پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اس دور میں شوکت حیات کی اہمیت ان سب سے بڑھ کر تھی۔ بہ قول عبدالصمد "افسانہ نگاری کی دنیا میں جس کا ڈنکا اس وقت اونچی آواز میں بج رہا تھا، وہ شوکت حیات ہی تھے۔"عبدالصمد نے ابتدائی دور کے شوکت حیات کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت ایمانداری سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے ہم عصروں میں واقعتاً شوکت حیات کیا تھے اور اس دور میں ان کا کس طرح طلسم قائم ہوا تھا، انھوں نے لکھا ہے:

''بلا شبہ وہ ایک بہت ذہین اور فعال افسانہ نگار تھا جس نے اپنی ذہانت اور شعور کی بالیدگی کے سبب چند اہم اور اچھے افسانے لکھے جو دوسرے ہم عصروں کی لیے قابل رشک بن گئے اور لاشعوری طور پر ہمارے ذہنوں پر اس کا ایک نامعلوم رعب طاری ہو گیا تھا اور ہم اس سے مرعوب سا رہنے لگے تھے۔''

اس طرح انھوں نے اپنی طویل رفاقت، رقابت، دوستی اور دشمنی کے بہت سارے کل پُرزوں کو جوڑتے ہوئے اپنے ہم عصر افسانہ نگار کے بارے میں تقریباً وہ سچی بات کہہ دی ہے جسے دیر سویر حقیقت تسلیم کرنا چاہیے۔اس سے جُزوی اختلاف ہی ممکن ہے، مکمل انکار شاید ناممکن ہے۔عبدالصمد کے دو جملے ملاحظہ ہوں:

''شوکت حیات کو اگر طرح طرح کے بھرم نہ گھیر لیتے تو وہ یقیناً وہاں سے بہت آگے جاتا، جہاں وہ تقریباً ٹھہر سا گیا تھا؛ وہ بھی بہت سے لوگوں کی نگاہوں میں قابل رشک مقام تھا۔''

عبدالصمد نے واقعتاً یہ خدا لگتی کہی ہے۔عبدالصمد نے شوکت حیات کی شخصیت سے متعلق خاکے میں ان کے فن کے بارے میں اپنے بھرپور نتائج پیش کیے ہیں۔شوکت حیات کی زبان و بیان پر قدرت اور اس کے لیے ان کی مشقت کی انھوں نے واضح گواہی دی ہے۔کسی ہم عصر کا ایسے کُھلے بندوں

اقرار کرنا شعروادب کی اُس صحت مند روایت کا حصہ ہے جس میں ایک دوسرے کے حقیقی کارناموں کا اقرار و اقبال قائم رہتا ہے۔اس سلسلے سے عبدالصمد کے خاکے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''شوکت حیات نے اپنی پوری زندگی جس چیز پر بہت محنت کی، وہ اس کا فن افسانہ نگاری تھی۔وہ اپنی افسانہ نگاری کو عبادت کا درجہ دیتا تھا بلکہ شاید اس سے بھی کچھ بڑھ کے۔وہ افسانے کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے پر محنت کرتا تھا۔ایک آدھ لفظ کے لیے وہ ڈکشنریاں کھنگال دیتا تھا۔اس سے بھی جی نہیں بھرتا تو وہ دوستوں اور بزرگوں سے دریافت کرتا رہتا۔زبان پر اس قدر محبت کرتے ہوئے کم سے کم میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔زبان کے سلسلے میں اس کا شعور ہمیشہ بیدار رہتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں میں زبان کی غلطیاں تقریباً نہیں کے برابر ہوتی تھیں''۔

اس رسالے میں تیسرا مکمل خاکہ غضنفر کا ہے۔غضنفر کے دوسرے خاکوں کی طرح اس میں افسانویت اگر چہ کم ہے مگر شوکت حیات کی شایانِ شان زبان دانی کا ذوق ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔بات ۶۱ سال کی عمر میں باضابطہ عقیقہ اور اس کی دعوت سے شروع ہوتی ہے اور شوکت حیات کی زندگی سے متعلق اُن کے دیکھے بھالے واقعات ایک سلسلے سے آتے جاتے ہیں۔ان کی زندگی کے تضادات اور عجیب وغریب کیفیات کو انھوں نے اخلاص اور محبت سے ظاہر کیا ہے۔اسی طرح منظر اعجاز کے مضمون نما خاکے میں خاص طور پر ان کی تعلیمی زندگی سے متعلق کچھ واقعات اس طرح سے پیش کیے گئے ہیں جس سے شوکت حیات کی زندگی اور ان کا کھرا پن ظاہر ہو جائے۔ یہاں بھی وہی خوشگوار اور ناخوشگوار یادوں کے بیچ وہ ہمیں شوکت حیات کی زندگی کے کئی موڑ ظاہر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ابرار رحمانی اور محترمہ نشاط پروین کی مختصر ترین یادوں سے الگ اس رسالے میں مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد کا خاکہ خاصا دلچسپ ہے اور انھوں نے شوکت حیات کی زندگی کے کئی موڑ اپنے دیکھے بھالے واقعات کے آئینے میں پیش کیے ہیں۔اس خاکے سے بھی شوکت حیات کی شخصیت کے کچھ انجانے پہلو روشن ہوتے ہیں۔

رسالہ' ثالث' میں شائع شدہ خاکوں کو اگر اصحابِ علم کی رائے شماری مانا جائے تو یہ بات کُھل کر سامنے آتی ہے کہ شوکت حیات کی شخصیت میں روزِ اوّل سے ایک ایسی کجی تھی جسے انھوں نے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔تخلیق کار کی حیثیت سے یہ ٹیڑھ پن اُن کی بڑی طاقت اور مضبوطی تھا مگر ایک سماجی کردار کے طور پر یہ ان کی ایسی کمزور کڑی ہے جس نے صرف ان کی شخصیت کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ ان کی ادبی زندگی کو بھی مشکلوں میں ڈالا۔رفتہ رفتہ یہ کجی ان کی عادت اور مزاج کا حصہ ہوگئی۔وہ مختلف مواقع سے اس کا غیر ضروری استعمال بھی کرتے ہی تھے جس کے بار بار ناخوشگوار واقعات وحادثات سامنے آئے مگر سچائی یہی ہے کہ شوکت حیات ایسے

ہی تھے اور ایسے شوکت حیات سے پورے ملک کے قارئین ان سے محبت کرتے تھے۔'ثالث' میں جو خاکے شائع ہوئے ہیں، ان میں عیب کم نہیں ظاہر کیے گئے ہیں مگر محبت اور عقیدت کی ایک ایسی چادر تنی ہوئی ہے جس کے عوض ہم سب شوکت حیات کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اقبال حسن آزاد قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے شوکت حیات کے سلسلے سے شائع شدہ خصوصی شمارے میں تنقیدی و تحقیقی مضامین کے ساتھ ساتھ نمائندہ ادیبوں کے بہترین خاکے شائع کر کے ہمیں حقیقی شوکت حیات کو پہچاننے کے لیے بہترین مواد فراہم کر دیا۔

◄ ● ►

● محمد معتصم باللہ

زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان 'ثالث' شوکت حیات نمبر باصرہ نواز ہوا۔ 'ثالث' کا 'شوکت حیات نمبر' شوکت حیات کی وفات کے بعد شائع ہونے والا قابلِ ذکر اور اور معیاری رسالے کا پہلا وقیع نمبر ہے جو شوکت حیات پر مبنی ہے۔ 'ثالث' مونگیر، بہار سے شائع ہونے والا ایک اہم ادبی جریدہ ہے۔ جس نے جلد سنجیدہ ادبی حلقوں میں اپنی ایک الگ پہچان مستحکم کر لی ہے۔ اس رسالے کے مُدیر برصغیر کے مشہور و معروف افسانہ نگار اقبال حسن آزاد خود ایک متحرک قلم کار ہیں۔ ان کی نثری نگارشات قوس وقزح کی مانند ہیں۔ ان کے مضامین و مقالات، افسانے، اداریے اور احوالِ عصر وغیرہ کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اردو کے موتی پرو رہے ہوں۔ زندگی کی سرشاری ہو یا ادب کی دلربائی، قارئین کی دل جوئی ہو یا گداختگی...... ہر جگہ ان کا لب ولہجہ نرم رہتا ہے۔ ان کے یہاں نئے خواب وخیال، نئے نشیب وفراز، نئے پیچ وخم، نیا عرفان ورجحان، نیا اضطراب، نیا قیاس ونیا گمان، نیا یقین ونیا دھیان، نیا افق، نیا خورشید اور نیا قمر کے ساتھ نثر کی نئی زمینوں پر اپنے افکار وخیالات کے روشن نقوش ثبت کرنے والا نثر نگار عام نہیں، قدرے عبقری کہلانے کا مستحق ہے۔ اقبال حسن آزاد نے ترقی وتعمیر، تحسین و توصیف، عزووقار، شہرت ومقبولیت، تنظیم وتشکیل کی گراں قدر منزلیں بتدریج طے کی ہیں۔ اس کامیابی میں ان کی ہمہ وقتی جست خیزی، محنت ومشقت، فنی ریاضت اور ذہنی صلاحیت واہلیت کارفرما ہے۔

'ثالث' کا شمارہ (۲۱-۲۲) ایک ضخیم شمارہ ہے جو ۴۹۶ صفحات پر محیط ہے۔ یہ خاص نمبر یقیناً کئی اعتبار سے اپنی اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔ خاص طور پر ادیبوں اور تخلیقی فنکاروں کے مضامین اپنے منفرد موضوعات کے لحاظ سے بہت اہم ہیں اور متنوع بھی۔ ان سبھوں کی نگارشات کو یقیناً اردو فکشن کے سنجیدہ قارئین نہ صرف مطالعہ کریں گے، بلکہ ان رشحاتِ قلم سے استفادہ بھی کریں گے۔

مضامین کے باب میں پروفیسر وہاب اشرفی، وارث علوی، فاروق ارگلی، ڈاکٹر ابرار رحمانی، صفدر امام قادری، سید احمد قادری، شہاب ظفر اعظمی، صغیر افراہیم، حامد علی خاں، منصور خوشتر، صالحہ صدیقی، ڈاکٹر

سید اشہد کریم، عرفان رشید، ڈاکٹر قسیم اختر، ایم خالد فیاض، ڈاکٹر زرنگار یاسمین، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ، ڈاکٹر گلاب سنگھ اور ڈاکٹر نزہت پروین کے مضامین متاثر کرتے ہیں۔

خاکوں کے باب میں مشتاق احمد نوری، عبدالصمد، ڈاکٹر ابرار رحمانی، غضنفر، ڈاکٹر منظر اعجاز، اقبال حسن آزاد اور نشاط پروین متاثر کرتے ہیں۔ تجزیے اور مکالمے کے باب میں مشتاق احمد نوری، غضنفر، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر توصیف احمد ڈار، نثار احمد صدیقی اور ڈاکٹر محمد غالب نشتر وغیرہم ہیں جو یقیناً شائقینِ ادب کے لیے بہت اہم تحفہ ہیں۔ بعض مشاہیر کے نام خطوط کو بھی نمبر میں مناسب جگہ دی گئی ہے۔ شوکت حیات کے مضامین، نمائندے افسانے اور اُن کا ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' بھی شریکِ اشاعت ہے۔ اقبال حسن آزاد کا اداریہ پر مغز اور دانشورانہ ہے۔ اپنے اداریہ کی اہمیت وافادیت کے اشارے دیتے ہوئے اقبال حسن آزاد کہتے ہیں:

''آج کل پوری دنیا میں ایک عجیب سا ہنگامہ برپا ہے۔ لیکن یہ ہنگامہ خیزی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اگر دنیا کی تواریخ پر نظر ڈالی جائے تو آپ پائیں گے کہ یہ جہانِ آب وگل روزِ اول سے ہی ہنگاموں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ آدم خاکی کو دنیا میں کبھی بھی آرام اور چین حاصل نہیں ہوا۔ آپ جسے زمانۂ امن سمجھتے ہیں وہ دراصل ماندگی کا وقفہ ہے۔ ان ہنگاموں سے ڈرنا چاہئے نہ گھبرانا۔ بلکہ ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ لیکن یہ مقابلہ آرائی وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان میں الجھ گئے تو ناکامی اور نامرادی ہمارا مقدر بن جائے گی۔''

شوکت حیات کے افسانے مثلاً گنبد کے کبوتر، رانی باغ، مرشد، ذائقہ، بانگ، میت اور کوبڑ وغیرہ کو انتخاب کیا گیا ہے۔ اُن کے تحریر کردہ چند مضامین مثلاً ''معاصر اردو افسانہ: تغیر وتبدل اور امکانی حقیقت نگاری''، ''مابعد جدید افسانہ'' اور ''میری تھیوری سازی اور میرے افسانے'' اس نمبر میں شاملِ اشاعت ہے۔ تبصروں کے باب میں مختلف مشاہیرِ ادب کے تاثرات شامل ہیں جن میں عشرت ظہیر، سلیم انصاری، عظیم اللہ ہاشمی، اصغر شمیم، ڈاکٹر منصور خوشتر، ریحان کوثر اور رویندر جوگلیکر کے تفصیلی تبصرے، ثالث کی اہمیت وافادیت اور ادبی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ مکتوبات کے تحت مشاہیر اپنے خطوط کے ذریعہ فاروق ارگلی، مرغوب اثر فاطمی، عین تابش، غزال ضیغم، فخر الدین عارفی، غلام نبی کمار، ڈاکٹر اختر آزاد، وسیم فرحت، وسیم احمد فدا، جرنلسٹ اقبال، مختار بلال، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، احسان تابش اور ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر اور راقم الحروف (محمد معتصم باللہ) نے رسالہ کو مزین کیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ 'ثالث' ایک ادبی دستاویز ہے جو اپنے عہد کے ادبی سمت ورفتار اور معیار ومزاج کی تاریخ رقم کر رہا ہے جس کے لیے اقبال حسن آزاد کی محنت اور لگن کو فوقیت نہ دنیا

ادبی بد دیانتی ہوگی۔ امید ہے کہ مصنف جی جان، پورے ایمان اور بحیثیت تخلیقی فنکار اپنے ادبی سفر کی سیّاحی میں سند باد جہاز کی طرح سرگرم رہیں گے اور قارئین کو اپنے نثر گلستاں کے گل بوٹوں سے ہمیشہ فیضیاب کرتے رہیں گے۔ راقم الحروف اقبال حسن آزاد کو اس کتاب کی اشاعت پر صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہے:

خدا کرے نہ تھکیں حشر تک جنوں کے پاؤں ابھی منازل دشت و دمن کچھ اور بھی ہیں

◀ ● ▶

● محمد ولی اللہ قادری

رسالہ 'ثالث' (جلد نمبر ۶۔۷، شمارہ نمبر ۲۱۔۲۲) مونگیر کا شوکت حیات نمبر استاذی پروفیسر صفدر امام قادری نے عزیز القدر محمد مرجان علی کی معرفت ارسال فرمایا۔

اِس شمارہ میں صفدر امام قادری کا مضمون سب سے منفرد ہے۔ صفدر امام قادری نے شوکت حیات کے ناول / ناولٹ 'سرپٹ گھوڑا' کا بھرپور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ شوکت حیات کی افسانہ نگاری کے عنوان سے وہاب اشرفی مرحوم کا مضمون بھی شامل ہے۔ اِس مضمون میں اُنھوں نے 'سرپٹ گھوڑا' کو افسانہ یا ناولٹ بتایا ہے۔ اِس سے قاری اضطرابی کیفیت سے دوچار ہوجاتا ہے۔ مدیر پر لازم تھا کہ اِس سلسلے میں دوٹوک رائے دیتے۔ مقامِ مسرت ہے کہ صفدر امام قادری نے اِس سوال کے جواب پر روشنی ڈالی ہے۔ صفدر امام قادری کا یہ مضمون بہت کارآمد ہے۔ مضمون نگار نے حسبِ معمول واضح رائے پیش کی ہے۔ موصوف رقم طراز ہیں:

> ''سرپٹ گھوڑا' میں شوکت حیات نے ناول نگاری کے تمام لوازم شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کو فارم لیس آرٹ کہا گیا ہے، اس لیے شوکت حیات نے یہاں طرح طرح کے مسالے جمع کیے ہیں۔ تاریخ، سیاست، سماجیات کے ساتھ جنس، فرقہ واریت اور ٹریڈ یونین کے بہت سارے مناظر اس میں شامل کر کے پلاٹ کو استحکام دیا گیا ہے۔ افسانہ نگار کا فنّی ارتکاز اور موضوعاتی گٹھاؤ جیسے عوامل کچھ اس قدر گہرے طور پر یہاں شامل ہوئے ہیں جن سے اس بات پر ہمارا یقین بڑھ جاتا ہے کہ شوکت حیات نے محض صفحات بڑھانے کے لیے اس قصّے کو ناول کی دنیا نہیں عطا کی۔ چار پانچ صفحے میں ابواب ایسے بدلتے ہیں کہ یہ یقین کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہاں سے اب ناول کہاں جا رہا ہے یا جائے گا؟" (رسالہ ثالث، شوکت حیات نمبر، ص۔ ۴۸)

۴۹۶ / صفحات کے اس ضخیم نمبر میں ۱۹ / تنقیدی مضامین، ۷ / خاکے، ۴ / تجزیے، ۲ / مکالمے اور مشاہیر کے نام لکھے گئے شوکت حیات کے خطوط کی شمولیت ہوئی۔ نمونہ کے طور پر شوکت حیات کے سات مشہور افسانے اور ایک ناول 'سرپٹ گھوڑا' کو شامل کیا گیا ہے۔ رسالہ میں بیرونِ ہند کے قلم کار کی شمولیت

نے اس کے وقار کو دوبالا کر دیا ہے۔خطوط کے باب میں اگر مشاہیر کے خطوط بہ نام شوکت حیات کے چند نمونے بھی شامل ہو جاتے تو اس باب کی اہمیت وافادیت مزید بڑھ جاتی۔

شوکت حیات نمبر کا آغاز مدیرِ اعزازی کے اداریہ سے ہوتا ہے۔بعدہٗ تبرکاً آفتاب عالم اطہر گیاوی کی لکھی گئی حمد ہے۔جب کہ غلام مجتبیٰ مہر کی نعت ہے۔دونوں شعری تخلیقات مناسب ہیں۔

کوائف کے باب میں شوکت حیات کا سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔اُس کو مزید بہتر بنایا جا سکتا تھا۔مضامین کے باب میں پروفیسر وہاب اشرفی (شوکت حیات کی افسانہ نگاری)، وارث علوی (شوکت حیات کی افسانہ نگاری)، فاروق ارگلی (شوکت حیات کا فن)، ڈاکٹر سیّد احمد قادری (شوکت حیات اور اُن کے افسانے)، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی (شوکت حیات کے افسانوی اختصاص)، ڈاکٹر سیّد اشہد کریم (شوکت حیات اور'گنبد کے کبوتر)، ڈاکٹر حامد علی خاں (شوکت حیات کا فن)، ڈاکٹر منصور خوشتر (شوکت حیات اردو افسانے کی منفرد آواز)، ڈاکٹر صالحہ صدیقی (حیاتِ اردو افسانہ شوکت حیات کا فکری وفنّی مطالعہ)، عرفان رشید (شوکت حیات: صداقتوں کا کہانی کار)، ڈاکٹر قسیم اختر (شوکت حیات کے افسانوں کا اختصاصی پہلو)، ایم خالد فیّاض (سنہ ستری افسانے کا قضیہ اور شوکت حیات کے نظریات)، ڈاکٹر زرنگار یاسمین (شوکت حیات کے امتیازات)، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ (شوکت حیات اردو افسانے کا سنگ میل)، ڈاکٹر گلاب سنگھ (شوکت حیات کے افسانوں میں سانس لیتی سچائیاں)، ڈاکٹر نزہت پروین (شوکت حیات کے افسانے)؛ کے مضامین شامل ہیں۔ اِس باب کے جملہ ۱۹؍مضامین میں شوکت حیات کے افسانہ پر بھرپور گفتگو سامنے آئی ہے۔سبھی مضمون نگاروں نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔خاکے کے باب میں''افسانے کا سکندر'' شوکت حیات (مشتاق احمد نوری)، 'وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی' (عبدالصمد)، 'شوکت حیات' (ڈاکٹر ابرار رحمانی)، 'ساز بوالعجبی کا تارِ حیات' (غضنفر)، 'شوکت حیات......کچھ یادیں......کچھ باتیں' (ڈاکٹر منظر اعجاز)، 'بھول بھلیاں اور شوکت حیات' (اقبال حسن آزاد) اور 'شوکت حیات سے دو ملاقاتیں' (نشاط پروین)؛ جیسے خاکے (ان میں سے بعض کو شخصی مضامین کہا جائے تو غلط نہ ہوگا) شامل ہیں۔

عبدالصمد کا مضمون قابل مطالعہ ہے اور اپنے مضمون میں انھوں نے حقیقی دوست کا حق ادا کیا ہے، مشتاق احمد نوری کی طرح نہیں۔اس طرح ڈاکٹر منظر اعجاز نے بھی اپنی یادداشت کو بہت ہی عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے دوران کے واقعات بلکہ شوکت حیات کے ذوق علم کو جس عمدہ انداز میں منظر اعجاز نے پیش کیا ہے وہ لائق تعریف ہے۔عبدالصمد نے بھی شوکت حیات کے ذوق علم اور حصول علم کے لیے شوکت اُن کے حیات کسر نفسی کے منظر کو بیان کیا ہے وہ بھی بہت خوب ہے۔

عبدالصمد اور منظر اعجاز کے مضمون کا ایک ایک اقتباس ملاحظہ کیا جائے۔ عبدالصمد رقم طراز ہیں:

''دل چسپ بات یہ ہے کہ اُس (شوکت حیات) نے یو۔جی۔سی NET بھی پاس کرلیا، اُس کا امتحان سنٹر کامرس کالج میں تھا جہاں صفدر امام قادری اردو کے استاد ہیں اور سارے امتحانات کی تیّاری میں اُنھوں نے ہی اُس کی مدد کی تھی۔ اُنھیں نیٹ کا امتحان دینے کا پتا اُسی وقت چلا جب انھوں نے امتحان کے کمرے میں شوکت حیات کو دیکھا۔ شوکت نے لائن تو بہت عمدہ چنی تھی مگر فیصلہ کرنے میں اتنی تاخیر کردی کہ وقت نکل گیا۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ NET وغیرہ کرنے کے بعد اُس کی بے پناہ خواہش تھی لیکچرر بننے، مگر اُس کے مزاج کی اضطرابیت اور اپنے سمیت سبھی لوگوں پر عدم اعتماد نے اُس کی پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔'' ص۔۲۰۶

منظر اعجاز لکھتے ہیں:

''وہ (شوکت حیات) جب آتے تھے، سوالوں کے دفتر لے کر آتے تھے۔ جو سوال کرتے میں اُس کا جواب دینے لگتا تو کہتے، ٹھہریے، لکھ لیتے ہیں اور پھر بستے میں سے رجسٹر نما کاپی نکالتے اور لکھنے لگتے۔ جواب مکمل ہو جاتا تو پھر کوئی نہ کوئی سوال کر دیتے اور پھر میں جواب میں جو کچھ بولتا وہ لکھنے لگتے۔ ظاہر ہے میں ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت انھیں نہیں دے سکتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ گھڑی کا کانٹا دو سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے کہا کہ شوکت بھائی! اب چلنا چاہیے اور چلتے چلتے ہم لوگوں نے ایک پیالی چائے پی لی۔ انھوں نے بستہ سمیٹا۔'' ص ۲۲۵

ڈاکٹر ابرار رحمانی، اقبال حسن آزاد (مدیر اعزازی) اور نائب مدیرہ نشاط پروین کے مضامین قابلِ مطالعہ ہیں۔ خاکوں کے باب میں سب سے زیادہ متاثر غضنفر کا خاکا 'ساز بو العجبی کا تارِ حیات' نے کیا۔ چھے صفحات پر پھیلا غضنفر کا خاکا شوکت حیات کی قدر شناسی میں بھرپور مدد کر رہا ہے۔ کم الفاظ میں زیادہ مفاہیم پیدا کرنے کا ہنر غضنفر کو خوب آتا ہے۔ یہاں اس کا مظاہرہ خوب ہوا ہے۔ ایک ہی جملہ میں صاحب خاکا کی شخصیت آشکار ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھیں:

''اس شخص کی شخصیت کی حیرت انگیزی اور اس کی سرشت کی تعجب خیزی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے یہاں بیک وقت عجلت پسندی بھی نظر آتی ہے اور اطمینان قلبی بھی۔'' (صفحہ ۲۱۷)

رباعی گوشاعر چوتھے مصرعے پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ یہاں بھی غضنفر نے خاکے کے اختتام پر شوکت حیات کی شخصیت کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''متضاد معانی سے مزین ذات، متلون مزاجی صفات، سرد وگرم کیفیات اور پیچیدگیوں سے پُر نفسیات والا یہ شوکت حیات اپنے لئے چاہے جو ثابت ہو، ہمارے لئے باعثِ لطف وانبساط ہے کہ اُسے دیکھ کر، سُن کر اور پڑھ کر ہمارے سازِ حیات اور تارِ احساسات جھنجھنا اور گنگنا اٹھتے ہیں۔'' [صفحہ ۲۲۱]

تجزیہ کے باب میں مشتاق احمد نوری سرِ فہرست ہیں۔ ان کا لکھا ہوا مضمون 'ذائقہ' میں 'نئے ذائقے کی دریافت' شامل ہیں۔ علاوہ ازیں شوکت حیات کا افسانہ 'بانگ' پر غضنفر کا تبصرہ مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے شوکت حیات کا افسانہ 'میت' کا بہترین اور بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر توصیف احمد ڈار نے شوکت حیات کا افسانہ 'کوبڑ' کا جائزہ لیا ہے۔ اس تجزیہ میں تجزیہ نگار نے افسانہ 'کوبڑ' کو اخلاقی و تہذیبی کی زوال پزیری کا اشاریہ بتایا ہے۔ تجزیہ کے باب میں شامل چاروں افسانہ کے علاوہ 'گنبد کے کبوتر' 'رانی باغ' اور 'مرشد' اکلوتا ناول رناولٹ 'سرپٹ گھوڑا' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ شوکت حیات کے ساتوں افسانے اور ناول رناولٹ کا متن کو شامل کر کے اچھا کیا گیا ہے تاکہ قاری کو تنقید نگاروں کی آرا اور ان کے ناول کی تفہیم میں آسانی ہو۔

مکالمہ کے ضمن میں دو انٹرویو شامل شمارہ ہے۔ نثار احمد صدیقی کا انٹرویو 'شوکت حیات سے گفتگو' جب کہ ڈاکٹر محمد غالب نشتر کا لیا گیا انٹرویو 'شوکت حیات سے مکالمہ' کے عنوان سے ہے۔ دونوں انٹرویو سے شوکت حیات کی شخصیت کے بعض نمایاں گوشے واضح ہو رہے ہیں۔

شوکت حیات کے مضامین کے تحت شوکت حیات کے تین تنقیدی مضامین بلا ترتیب 'معاصر اردو افسانہ: تغیر وتبدل اور امکانی حقیقت'، 'مابعد جدید افسانہ'، 'میری تھیوری سازی اور میرے افسانے' شامل ہیں۔ تینوں مضامین سے شوکت حیات کی تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک مضمون شوکت حیات کی تنقید نگاری پر ہو جاتا تو بہت مزہ آ جاتا۔

تبصرہ کے باب میں مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد کا غضنفر کا سوانحی ناول 'دیکھ لی دنیا ہم نے' کا واحد تبصرہ ہے۔ علاوہ ازیں ثالث کے گزشتہ شمارہ پر عشرت ظہیر، سلیم انصاری، عظیم اللہ ہاشمی، اصغر شمیم، ڈاکٹر منصور خوشتر، ریحان کوثر اور رویندر جوگیلکر کے تبصرے ہیں۔ مکتوبات کے باب میں چودہ حضرات کے مختصر اور طویل آرا سے رسالہ ثالث کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ رسالہ 'ثالث' کے چند شمارے کی زیارت صفدر امام قادری کے دولت کدہ پر ہوتی رہی اور کبھی کبھار الٹ پلٹ کر دیکھ لیا۔ لہٰذا اس کی مقبولیت کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

اس خصوصی شمارہ شوکت حیات نمبر کے مطالعہ سے افسوس ہوا کہ اس قدر معیاری ادبی رسالے سے راقم الحروف اب تک کیوں محروم رہا۔ بہر کیف اہالیان بہار کے سلسلے میں یہ بات مشہور ہے کہ بہاری اپنے جیالوں کے اعتراف میں بخل سے کام لیتا ہے۔ ایک حد تک یہ بات درست بھی ہے۔ لیکن رسالہ 'ثالث' کا یہ شمارہ اُس بات کی تردید کرتا ہے اور یہ شمارہ ادبی دنیا کی طرف سے فرض کفایہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس عظیم پیش کش کے لیے مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد، مدیر ثالث آفاق صالح اور نائب مدیرہ نشاط پروین پوری سمیت پوری ٹیم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ یہ نمبر شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر بہار اور بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس نمبر کی قیمت ۵۰۰؍روپے مناسب ہے۔ 'ثالث' آن لائن بھی دستیاب ہے جس سے www.salismagazine.in پر بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

◄ ● ►

● جرنلسٹ اقبال

زندہ و متحرک زبان کا ترجمان ''ثالث'' کا شمارہ ۲۱۔۲۲ مشہور و معروف ادیب شوکت حیات کے نام سے منسوب ہے۔

مدیر اعزازی ڈاکٹر اقبال حسن آزاد اپنے اداریہ میں لکھتے ہیں کہ شوکت حیات کی خواہش تھی کہ ''ثالث'' میں ان پر گوشہ نکلے مگر افسوس کہ یہ کام ان کی زندگی میں نہ ہو سکا۔ لیکن جب اس کا ارادہ کیا تو اس شمارے کی ترتیب کے دوران اتنی کثیر تعداد میں مضامین موصول ہونے لگے کہ گوشے کی جگہ پورا نمبر تیار ہو گیا۔

انہیں اعتراف ہے کہ میں نے جیسے ہی اس گوشے کا اعلان کیا میرے عزیز دوست پروفیسر صفدر امام قادری نے بہت سارا مواد مجھے ارسال کر دیا۔ علاوہ ازیں شوکت حیات کے ناولٹ سرپٹ گھوڑا پر ایک پر مغز مقالہ بھی لکھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر قسیم اختر اور ڈاکٹر ارشد رضا نے بھی میری مدد کی۔ ڈاکٹر سید احمد قادری، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر قسیم اختر، ڈاکٹر زرنگار یاسمین، ڈاکٹر گلاب سنگھ، ڈاکٹر نزہت پروین نے مضامین لکھے وہیں مشتاق احمد نوری، عبدالصمد، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر منظر اعجاز، راقم الحروف اور محترمہ نشاط پروین نے اپنی یادوں کو سمیٹا اور شوکت حیات کا خاکہ لکھا۔

واقعی ۴۹۶ صفحات پر مشتمل یہ شمارہ اگر ادبی دستاویز کا حصہ بن چکا ہے تو اس میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی اپنی ادبی حیثیت کا بھی بڑا دخل ہے۔

اس شمارے میں اقبال حسن آزاد نے نہ صرف شوکت حیات سے متعلق بھرپور مضامین، خاکے، ان کے افسانے پر تجزیہ و تبصرہ، انٹرویو، ان کے خطوط شامل کئے ہیں بلکہ موصوف کے ۷ شاہکار افسانے ''گنبد کے

کبوتر''،''رانی باغ''،''مرشد''،''ذائقہ''،''بانگ''،''میت''،''کوبڑ'' کے علاوہ ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' بھی شامل کیئے ہیں تاکہ میری طرح جو قاری شوکت حیات کے افسانے ناولٹ نہ پڑھ سکے ہوں وہ مطالعے میں لے آئیں اوران پر لکھے گئے ملک کے نامور مصنفین کے مضامین، خاکے کی اہمیت، بے لاگ تبصرے کو سمجھ سکیں۔

اس شمارہ کے ملنے سے پہلے میں نے شوکت حیات کے صرف دو افسانے اور چند مضامین ہی پڑھے تھے لہذا شوکت حیات نمبر موصول ہوتے ہی پہلے کوائف شوکت حیات، انٹرویو، شوکت حیات کے خطوط، شوکت حیات کے مضامین، ان کے افسانیا ور ناولٹ کو پڑھا اور پھر مضامین اور خاکے، تجزئے۔

اس شمارے میں پرفیسر وہاب اشرفی، وارث علوی، فاروق ارگلی، ڈاکٹر ابرار رحمانی، پروفیسر صفدر امام قادری، ڈاکٹر سید احمد قادری، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر صغیر افراہیم، ڈاکٹر سید اشہد کریم، ڈاکٹر حامد علی خان، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، عرفان رشید، ڈاکٹر قسیم اختر، ایم خالد فیاض، ڈاکٹر زرنگار یاسمین، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ، ڈاکٹر گلاب سنگھ، ڈاکٹر نزہت پروین کے مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

پروفیسر وہاب اشرفی اپنے مضمون کے آخری سطر میں لکھتے ہیں کہ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شوکت حیات کے افسانے فکری وفنی افسانے کے ارتقائی کیف کی مثالیں ہیں جن میں زندگی کی دھڑکنیں ہر جگہ محسوس کی جاسکتی ہیں۔ایک انقلابی ذہن میں کیسی تخلیقی روشنی پیدا ہوسکتی ہے اس کا ایک مکمل منظر نامہ شوکت حیات کے افسانے ہیں۔اردو افسانے کی مجموعی تاریخ میں ان کی جگہ معتبر بھی ہے محفوظ بھی۔

بقول وارث علوی شوکت حیات ان جیالے لوگوں میں سے ہیں جو نہ تو کسی نقاد کی توجہ کی پروا کرتے ہیں نہ دوسروں کی بخشی ہوئی بیساکھیوں پر راہ ادب طئے کرتے ہیں۔وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور اپنے اظہار و بیان کے طریقے خود ہی ایجاد کرتے ہیں۔

دبستان اردو فاروق ارگلی اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں کہ، ہندوستان کی مسلم اقلیت آزادی کے بعد سے اب تک جانے کتنے المیوں کا شکار ہوئی ہے۔تازہ ترین سب سے بڑا گھاؤ بابری مسجد کی شہادت ہے۔اس سانحۂ عظیم پر ''گنبد کے کبوتر'' جیسا علامتی فلسفیانہ افسانہ لکھ کر شوکت حیات نے اردو افسانہ نگاروں کی اب تک کی سب سے اگلی صف میں وہ مقام حاصل کرلیا ہے جو ہمعصروں میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔

بقول ڈاکٹر منصور خوشتر، لارنس LawrenceHere'sPaid ۱۸۳۰۔۱۸۸۵ء نے لکھا ہے کہ فکشن جب تک فلسفہ نہ بن جائے بڑا فکشن کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہوتا۔اس بات کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ہر واقعہ کوئی عمدہ اور بہترین کہانی نہیں ہوتا۔البتہ فکشن نگار کا تخلیقی ذہن اور vision کسی معمولی واقعے کو بھی غیر معمولی بنا دیتا ہے۔شوکت حیات اس معاملے میں بھی اپنے عہد کیا مابعد عہد کے تخلیق

کاروں سے دوقدم آگے ہی ہیں۔وہ آگے کی سوچتے ہیں اور پیش آمدہ واقعات کی روشنی میں مابعد اپنے فکری تنوع کے سبب ایسا خیال پیش کرتے ہیں جو واقعی آنے والے وقت کے لئے شہادت بن جاتا ہے۔ان کی تخلیق کی گہرائی اور تہہ داری کو سمجھنے کے لئے حالات سے واقف ہونا ضروری ہے۔جب تک قاری اپنے معاشی،سیاسی اور سماجی سروکار سے واقف نہیں ہوگا اسے شوکت حیات سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ڈاکٹر قسیم اختر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ شوکت حیات ایسے فن کار تھے جنھوں نے ہمیشہ اپنے نظریے کی اور اپنی فکری اور تحریکی حیثیت کی وضاحت کی۔ان کا یہ رویہ دراصل ان کی فن کاری کی صداقت بھی ہے،ساتھ ہی فن اور فن کاروں کی شایان شان بھی۔

اس شمارے میں مشتاق احمد نوری،عبدالصمد،ڈاکٹر ابرار رحمانی،غضنفر،ڈاکٹر منظر اعجاز،اقبال حسن آزاد اور نشاط پروین نیبہت ہی عمدہ خاکے لکھے ہیں۔مشتاق احمد نوری کا خاکہ افسانے کا سکندر: شوکت حیات پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔وہ لکھتے ہیں شوکت حیات اردو فکشن کا مرد تھا لیکن اندر سے بہت ٹوٹا ہوا تھا ایک ہی غم تھا کہ اس کی وہ پذیرائی نہیں ہوسکی جو اس کا مقدر تھی۔جب میں نے مجموعے کی اشاعت پر زور دے کر کہا کہ جب تک تمہارا مجموعہ نہیں آئے گا تب تک تمہارے فکشن کا مجموعی مطالعہ کیسے ہوگا تو بہت معصومیت سے بولا۔

''بھیو!!ایک بات بتاویں،مجھ سے اپنے افسانے کا انتخاب ہی نہیں ہوتا۔''

یہ سن کر اس کی معصومیت پر ترس آیا اور میں نے کہا کہ کسی سنڈے میں تمہارے گھر آتا ہوں اور میں خود انتخاب کردوں گا۔یہ سن کر بہت خوش ہوا میرا ہاتھ دبایا لیکن وہ دن کبھی نہیں آیا کیوں کہ اسے نہ خود پر اعتماد تھا نہ دوسروں پر بھروسہ۔تجزیے کالم میں ''ذائقہ میں نئے ذائقے کی دریافت'' (مشتاق احمد نوری)،شوکت حیات کا افسانہ ''بانگ''،(غضنفر)،شوکت حیات کے افسانہ میت کا تجزیہ (پروفیسر اسلم جمشید پوری)،افسانہ ''کوبڑ'' اخلاقی وتہذیبی اقدار کی زوال پذیری کا اشاریہ (ڈاکٹر توصیف احمد ڈار) نے شوکت حیات کے افسانوں کا بہت ہی عمدہ تجزیہ کیا ہے۔

اس شمارے میں شامل ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' مبصر اقبال حسن آزاد و ثالث پر تبصرے بقلم عشرت ظہیر،سلیم انصاری،عظیم اللہ ہاشمی،اصغر شمیم،ڈاکٹر منصور خوشتر،ریحان کوثر،رونڈر جوگلیکر بھی خوب ہیں۔مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ شمارہ ''شوکت حیات نمبر'' خاص کر ریسرچ اسکالروں کے لئے ایک اہم ادبی دستاویز ہے۔

◀◀ ● ▶▶

تبصرے

نام کتاب	:	آبیاژہ (غضنفر کے ناول)
مرتب	:	ڈاکٹر ریشا قمر
سن اشاعت	:	۲۰۰۲ء
صفحات	:	۹۰۴
قیمت	:	۱۲۰۰/روپے
زیر اہتمام	:	صدف انٹرنیشنل (دوحہ،قطر)
سرورق	:	نعیم یاد (پاکستان)
مبصر	:	اقبال حسن آزاد، مدیر اعزازی ''ثالث'' مونگیر (انڈیا)

حالیہ برسوں میں جتنے بھی ناول نگار آسمان ادب پر ابھرے ہیں ان میں سب سے زیادہ رنگا رنگ اور متنوع ناول غضنفر کے قلم سے نکلے ہیں۔دیگر ناول نگاروں کی طرح انہیں کسی ایک فریم میں فٹ نہیں کیا جا سکتا۔ان کے یہاں سیاست کی بازی گری کی تصویریں بھی ہیں اور حالات حاضرہ کی بھی۔رومان کا رنگ بھی ہے اور نفسیات انسانی کی گرہ کھولنے کی کوشش بھی۔تشنگی بھی ہے اور سیرابی بھی۔ان کے نو ناولوں میں یہ مختلف رنگ جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔جس طرح جگنوؤں کو مٹھی میں بند نہیں کیا جا سکتا،خوشبوؤں کو قید نہیں کیا جا سکتا، ہواؤں کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا اسی طرح غضنفر کی تحریروں کو معنیٰ کی زنجیریں نہیں پہنائی جا سکتیں کیونکہ غضنفر کی نگارشات کسی لچکیلی شے کی طرح ہاتھوں سے پھسلی جاتی ہیں۔

غضنفر ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔کبھی کبھی تو یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ کسی ایک شخص میں اتنی ساری خوبیاں کہاں سے سما گئی ہیں۔وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار، محقق، غزل گو، نظم گو اور خاکہ نگار تو ہیں ہی ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی خودنوشت ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' بھی تحریر کی ہے جس نے ادبی دنیا میں ہلچل مچا رکھی ہے۔''آبیاژہ'' ان کے نو ناولوں کا مجموعہ ہے جن کے نام حسب ذیل ہیں۔(۱) پانی،(۲) کینچولی،(۳) کہانی انکل،(۴) دویہ بانی،(۵) فسوں،(۶) وِش منتھن،(۷) مم،(۸) شوراب،(۹) مانجھی

''آبیاژہ'' کا تعارف کراتے ہوئے مشہور فکشن نگار سید محمد اشرف کہتے ہیں:

''معاصر اردو ادب میں غضنفر کے علاوہ شاید ہی کوئی ادیب ایسا ہو جس نے چھوٹے بڑے نو (۹) ادبی ناول ادب کو دیے ہوں۔ بات صرف تعداد کی نہیں، معیار کی بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ غضنفر سے زیادہ کسی ہم عصر نے اتنی رنگا رنگ اصناف میں طبع آزمائی بھی نہیں کی ہے۔'' (آبیاژہ: صفحہ نمبر۔۱۱)

ایک بڑے قلم کار کا اپنے ہم عصر ادیب کی ادبی خدمات کا اعتراف اپنے آپ میں ایک سند کا درجہ رکھتا ہے۔

اس کتاب کا نام ''آبیاژہ'' ہے۔ یہ لفظ آپ کو کسی لغت میں نہیں ملے گا۔ یہ دراصل غضنفر کے زرخیز ذہن کی اختراع ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ریشما قمر لکھتی ہیں کہ:

''آبیاژہ'' پہلی بار غضنفر کے ناول ''پانی'' یں پڑھا تو میں چونک اُٹھی۔ معنی نہ جاننے کے باوجود یہ لفظ مجھے بہت اچھا لگا۔ اور اس لفظ کا مفہوم سمجھنے کے لیے میں ناول 'پانی' میں کھو گئی۔ کتاب کے آخری کنارے تک پہنچتے پہنچتے یہ بے معنی لگنے والا لفظ پوری طرح بامعنی ہو گیا۔ اس میں بہت سے حقائق جھلملا اُٹھے۔ اس لیے یہ استعارہ بھی بن گیا۔ پتا چلا کہ پیاس بھڑک نہ جائے، کیفیت تشنگی سیماب نہ بن جائے، اضطراب اشتعال میں نہ بدل جائے، ضرورت کا تموج تلاطم نہ پیدا کر دے۔ اس امکانی صورتِ حال سے بچنے کے لیے 'آبیاژہ' پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے جو طرح طرح کے 'آبیاژے' پیش کیے جاتے ہیں ان میں فنون لطیفہ بھی ہیں اور ان فائن آرٹ والے آبیاژوں کی بھی کئی قاشیں ہیں جن کا اپنا اپنا روپ ہے، اپنا اپنا رنگ ہے، اپنا اپنا نور ہے جن کے کچھ عکس غضنفر کے ناول 'پانی' اور ان کے دیگر ناولوں میں بھی منعکس ہوئے ہیں۔ مجھے غضنفر کے ناولوں کو یکجا کرنے کا خیال آیا تو ایک عنوان کی بھی تلاش شروع ہوئی۔ کئی نام ذہن میں آئے مگر کسی نہ کسی وجہ سے رد ہوتے چلے گئے کہ اچانک 'آبیاژہ' چمک گیا اور ایسا چمکا کہ اس کتاب یعنی غضنفر کے ناولوں کے کلیات کا سرنامہ بن گیا۔'' (آبیاژہ، صفحہ نمبر۔۱۳)

''بے نظیر انوکھی اشیا کی جاذبیت اور عجیب الہیئت ہستیوں کی محویت میں منہمک تھا کہ اسے اپنی پشت پر انگلیوں کی ہلکی سی تھپتھپاہٹ محسوس ہوئی۔ نگاہیں پیچھے پلٹ آئیں۔ ویسی ہی ایک عجیب الہیئت ہستی سامنے کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

''تم کون ہو اور یہاں کس طرح اور کس لیے آئے ہو؟''

''میں ایک پیاسا ہوں۔ پانی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا ادھر آ نکلا ہوں۔ آپ کون ہیں؟ بیابان میں یہ عمارت کیسی ہے؟ اور یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''میں ایک محقق ہوں اور یہ عمارت دارالتحقیقات ہے۔ یہاں موجودات کا مطالعہ ہوتا ہے۔ غیر موجودات کی کھوج ہوتی ہے۔ اشیاء کی ماہیت معلوم کی جاتی ہے۔ کائنات کے اندر ہونے والے تغیرات

کے اسباب وعلل کا پتا لگایا جاتا ہے۔اس جہانِ بے کنار میں امکاناتِ حیات پر غور وخوض کیا جاتا ہے۔نئے نئے حقائق دریافت ہوتے ہیں اور ایجادو انکشافات سے دنیا کو روشناس کیا جاتا ہے۔''

''لگتا ہے، میں مناسب مقام پر آ پہنچا ہوں۔شاید اب میری مشکل آسان ہو جائے۔''

''تمھاری مشکل کیا ہے اجنبی؟ کون سا پیچیدہ مسئلہ ہے جس کی عقدہ کشائی چاہتے ہو؟''

''جناب! میری بس ایک ہی مشکل ہے اور وہ ہے میری پیاس...... یہ پیاس۔''

آواز رک گئی اور زبان خشک ہونٹوں پر پھرنے لگی۔

''واقعی تم بہت پیاسے لگتے ہو۔میں ابھی آیا۔'' وہ ایک میز کے پاس سے ایک ڈبہ اٹھالایا۔

''لو،اسے چوسو! یہ ''آبیاژہ'' ہے۔اس سے تمھاری پیاس بجھ جائے گی۔''اس نے اس میں سے ایک سفید چوکور ٹکیا نکالی اور بے نظیر کی طرف بڑھادی۔

''کیا سچ مچ اس سے پیاس بجھ جائے گی؟'' بے نظیر نے ٹکیا اپنے ہاتھ میں لے کر نگاہیں اس پر مرکوز کردیں۔

''چوس کر تو دیکھو! تمھیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔''('پانی' مشمولہ 'آبیاژہ' صفحہ نمبر ۵۱۔۵۲)

کہتے ہیں کہ ''جل ہی جیون ہے'' غضنفر اس راز کو جان گئے ہیں۔ان کی تحریروں میں جا بجا ''پانی'' کی اہمیت اُجاگر کی گئی ہے۔اور جس طرح پانی جانداروں کو زندگی بخشتا ہے اسی طرح اس پانی نے بھی غضنفر کی نگارشات کو حیات دوام بخش دیا ہے۔

''مجھے ایک ایسے راستے کی جستجو ہے جو کسی سرچشمے تک جاتا ہو۔جہاں پہنچ کر پیاس بجھتی ہو، تشنگی مٹتی ہو۔''

''تمھیں میں بتا سکتا ہوں ایسے راستے کا پتا۔''

''کیا سچ مچ آپ ایسے راستے کو جانتے ہیں؟''

''میں صرف جانتا ہی نہیں بلکہ اس راستے پر چل کر چشمے تک جا بھی چکا ہوں۔میں تمھیں بھی اس چشمے تک پہنچا سکتا ہوں جس کا پانی پی کر تم ابد تک کے لیے اپنی پیاس سے نجات پا سکتے ہو۔''

''کیا ایسا بھی کوئی چشمہ ہے؟''

''ہاں، ہے اور کوئی بہت دور بھی نہیں ہے وہ اسی بیابان میں ہے۔

''کیا وہ واقعی اسی بیابان میں ہے؟''

''ہاں، یہاں سے کچھ فاصلے پر ظلمات ہے۔اس ظلمات میں ایک چشمہ ہے۔نام جس کا چشمۂ حیواں ہے۔اس چشمے کا پانی آب حیات کہلاتا ہے

آب حیات وہ آب ہے۔، جو پیاس سے بیتاب ذی روحوں کی بیتابی ہمیشہ ہمیش کے لیے دور کر دیتا ہے جسے پی کرانسان امر ہوجاتا ہے حیاتِ جاوید پالیتا ہے۔''

''آب حیات! نام تو سنا ہے۔لیکن کیا واقعی ایسا کوئی آب ہے؟''

''بے شک ایسا آب ہے۔شاید تمھیں یقین نہیں آرہا ہے۔لیکن چند گھنٹوں بعد اسے تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھو گے اور لبوں سے لگاؤ گے تو تمارا یہ شک تمھارے ذہن و دل سے جاتا رہے گا اور تم بے اختیار آمنّا وصدّقنا بول پڑو گے۔''

''لیکن مجھے آب حیات نہیں پانی چاہیے......صرف پانی۔میں امر ہونا نہیں چاہتا۔میں تو بس زندہ رہنا چاہتا ہوں......صرف زندہ......'' (ناول ''مم'' مشمولہ 'آبیاژہ' صفحہ نمبر۔۶۳۳)

غضنفر دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے لیے صرف پانی چاہیے آب حیات نہیں۔

مختلف علوم وفنون اور زبانوں پر دسترس ہونے کی وجہ سے غضنفر کی تحریروں میں ایسی رنگارنگی اور حسن پیدا ہو گیا ہے جس کی مثال کم ازکم اردو ادب میں کہیں اور نہیں ملتی ہے۔ان کا اسلوب گنجلک یا ناقابل فہم نہیں ہے بلکہ اس میں ایک ایسا فنی رچاؤ پایا جاتا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔اور یہ گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے قاری کا اس سے آزاد ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی باشعور قاری اس کی گرفت سے آزاد ہونا چاہتا بھی نہیں۔

ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

''تعلیم کا سیدھا سفر یہ ہے کہ وہ راہ میں روشنی بکھیرے۔اندھیروں کو سمیٹے۔آندھیوں کا رخ موڑے۔پتھروں کو ہٹائے۔کانٹوں کو کند کرے۔گڈھوں کو بھرے۔زمین کو ہموار بنائے۔اخلاق کا علم اُٹھائے۔کردار کا پرچم لہرائے۔اقدار کی تبلیغ کرے۔دل ودماغ کا معالج بنے۔آنکھوں میں نور بھرے، چہرے کو چمکائے۔روح کو بالیدگی بخشے۔ادراک کو صیقل کرے۔احساس کو برمائے۔تخیل کے پر کھولے۔جذبات کو جگائے۔تخلیقیت کے کلوں کو اکسائے اور ایک صاف ستھری،صحت مند،تخلیقی اور کامیاب زندگی کی ضمانت دے۔لیکن آج اس نے الٹا سفر شروع کر دیا ہے۔تعلیم اب تیرگی، بے ایمانی،اخلاق سوزی،کردار کشی اور جسمانی ،ذہنی وروحانی علالت کی علامت بن گئی ہے۔'' (ناول ''فسوں'' مشمولہ ''آبیاژہ'' صفحہ نمبر۔۴۲۵)

ڈاکٹر ریشا قمر ایک بیدار مغز اسکالر ہیں۔انہوں نے نہ صرف غضنفر کے تمام ناولوں کا بغور مطالعہ کیا بلکہ اس کتاب پر اٹھارہ صفحات ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا جس سے غضنفر کے ناولوں کی تفہیم آسان ہو گئی ہے۔یہ ایک بڑا کام تھا اور ڈاکٹر ریشا قمر اس سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوئی ہیں۔

یہ کتاب بزم صدف انٹرنیشنل (دوحہ،قطر) کے زیر اہتمام ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے

شایع ہوئی ہے اور نہایت دیدہ زیب ہے۔اس کا سرورق پاکستان کے مشہور خطاط نعیم یاد نے بنایا ہے جو اپنی بھرپور معنویت کی بنا پر یاد رکھا جائے گا۔

اس کتاب کی اشاعت کے لیے غضنفر اور ڈاکٹر ریشا قمر، دونوں کو میری جانب سے دلی مبارکباد۔

◀◀ ● ▶▶

نام رسالہ	:	دربھنگہ ٹائمز، دربھنگہ (پیئر ریویو اردو جرنل)
		اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۲ء (جلد۔۱۷، شمارہ نمبر۔۴)
مدیر	:	ڈاکٹر منصور خوشتر
رابطہ	:	شوکت علی ہاؤس، پرانی منصفی، لال باغ، دربھنگہ (بہار)
صفحات	:	۴۰۰ قیمت : ۵۰۰ روپے
موبائل	:	9234772764
مبصر	:	اقبال حسن آزاد

دنیائے ادارت میں ڈاکٹر منصور خوشتر کی حیثیت ایک جن کی سی ہے۔اس دور ابتلا میں وہ نہایت ثابت قدمی اور دلجمعی کے ساتھ اردو کا ایک شاندار اور جاندار رسالہ پابندیٔ وقت کے ساتھ نکال رہے ہیں۔یہ عمل قابل تعریف بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔کئی اہم نمبر اور گوشے نکال کر انہوں نے رسائل کی دنیا میں ایک اہم مقام بنالیا ہے۔

''دربھنگہ ٹائمز'' کے تازہ ترین شمارے میں اردو کے مشہور و معروف فکشن رائٹر خالد جاوید پر ایک بھرپور گوشہ ہے۔ابھی پچھلے ہی دنوں موصوف کو ان کے ناول ''نعمت خانہ'' کے انگریزی ترجمے The Paradise of Food (ترجمہ باراں فاروقی بنت شمس الرحمٰن فاروقی) پر جے۔سی۔بی ایوارڈ ملا اور اس رسالے نے آناً فاناً ان پر گوشہ نکال کر دنیائے ادب کو حیران کر دیا۔یہ کام کوئی جن ہی کر سکتا ہے۔اور کمال تو یہ کہ اس میں خالد جاوید پر صرف گوشہ ہی نہیں ہے بلکہ مضامین، فکشن مطالعہ، فرد اور فنکاری، تبصراتی مضامین، کتھا کہانی، انٹرویو، نظمیں، غزلیں، نئی کہانی نئے دستخط، نئی غزل نئے دستخط، کتابوں کی باتیں کے عنوانات سے مختلف کالم بھی شامل اشاعت ہیں۔علاوہ ازیں المنصور ٹرسٹ دربھنگہ کی کارگردگی اور خیال آباد (قارئین کے خطوط) سے بھی اسے مزین کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر منصور خوشتر نے اپنے اداریئے میں جناب خالد جاوید کو ایوارڈ ملنے پر انہیں صمیم قلب سے مبارکباد دی ہے اور اپنی اس سعی کو قارئین کے حضور پیش کرنے پر مسرت کا اظہار کیا ہے۔

''گوشۂ خالد جاوید'' میں خورشید اکرم، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر محمد نہال

افروز، محمد عاصم بدر، خورشید حیات جیسے اہم نام موجود ہیں۔ اس کے علاوہ خالد جاوید کے ناول ''نعمت خانہ'' کا ایک باب ''شور'' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ سارے مضامین نہایت اہم اور معلوماتی ہیں۔ ریسرچ اسکالرز کو ان سے کافی مدد ملے گی۔

گوشۂ خالد جاوید کے علاوہ مضامین کے ضمن میں عتیق اللہ، غضنفر، عشرت ظہیر، ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں اور جاوید حسن کے مضامین پیش کیے گئے ہیں۔

عتیق اللہ کا مضمون ''کووڈ۔۱۹ کا حاصل جام جہاں نما'' افسانوی انداز میں لکھا گیا۔ یہ نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ موصوف نے اب تک فکشن پر طبع آزمائی کیوں نہیں کی۔ اور وہ افسانے اور ناول لکھیں تو ان اصناف میں بھی بہت جلد مقام عالیہ حاصل کر لیں گے۔

غضنفر نے فکشن کی نئی شکل مائیکرو فکشن پر بحث کی ہے اور عمدہ نکات بیان کیے ہیں۔ انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس تحریر کو مائکرو فکشن کہا جا سکتا ہے اور کسے نہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ شفق ہمارے عہد کے ایک عمدہ افسانہ نگار تھے مگر افسوس کہ ان کی موت کے بعد لوگ انہیں بھولنے لگے ہیں۔ عشرت ظہیر نے ''شفق کا داستانی لہجہ اور امتیازِ فن'' لکھ کر انہیں عمدہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر اطہر مسعود خان رامپور لائبریری سے منسلک ہیں۔ اردو شعر و ادب پر ان کی نظر گہری ہے۔ انہیں ''اشاریئے'' بنانے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ انہوں نے پروفیسر قمر رئیس کی مرتبہ کتاب ''منشی پریم چند چند، شخصیت اور کارنامے: تحقیقی مطالعہ'' پر ایک عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔

اردو میں ڈراما کی صنف زوال پذیر ہے۔ پتا نہیں کیوں ہمارے قلم کاروں نے اس جانب زیادہ توجہ نہیں کی۔ حبیب تنویر بحیثیت ڈراما نگار پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ جاوید حسن نے ''حبیب تنویر کے ڈراموں میں ہندوستانی تہذیب'' لکھ کر اس صنف کا حق ادا کر دیا ہے۔

''فکشن مطالعہ'' کے تحت حالیہ برسوں میں شایع ہونے والے تین اہم ناولوں تلک الایام (نور الحسنین)، آخری سواریاں (سید محمد اشرف) چمراسر (شموئل احمد) پر بالترتیب پروفیسر قدوس جاوید، نور الحسنین اور ڈاکٹر سید احمد قادری نے گرانقدر مضامین لکھے ہیں۔ ''فرد اور فنکاری'' کے ذیل میں منصور خوشتر اور ان کی تازہ کتاب ''طرز اظہار'' (ڈاکٹر امام اعظم) فہمیدہ ریاض: تانیثیت سے ردنو آبادیات تک (ڈاکٹر اشرف لون)، سلطان آزاد کی ظرافت شناسی (ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی)، آسمان صحافت کے شمس و قمر (ڈاکٹر محمد افضال قاسمی)، حکیم دمری......ایک نابغۂ روزگار شخصیت (سلیم انصاری)، احسان عالم کے تنقیدی انفراد و اختصاص (ڈاکٹر عبد الرافع)، اردو افسانے کا نمایاں نام: علی عباس حسینی (ڈاکٹر محمد

سالم)، علامہ اقبال ایک آفاقی شاعر (ڈاکٹر محمد ایوب) سرسید احمد خاں: ایک اہم شخصیت (ڈاکٹر مولانا عبد الحئی قاسمی) کی شمولیت نے اس کالم کو وقار و اعتبار بخشا ہے۔

تبصراتی مضامین کی ذیل میں عطا عابدی کی کتاب ''آزادی کے بعد بہار کے ادبی رسائل'' (ڈاکٹر محمد ذاکر حسین)، فردنامہ کلیم الدین احمد: شہاب ظفر اعظمی کا تحقیقی کارنامہ (ڈاکٹر فیضان حسن ضیائی)، مکرم نیاز کا افسانوی مجموعہ ''راستے خاموش ہیں'' کا ایک معروضی جائزہ (علیزے نجف) شامل ہیں۔ یہ سارے مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں اور قابل مطالعہ ہیں۔

''کتھا۔کہانی'' کے تحت صرف پانچ افسانے شامل اشاعت ہیں مگر یہ سارے افسانے اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں۔ شجر کاری (غضنفر)، سکتے میں کھلی آنکھ (نعیم بیگ)، اپنا اپنا درد (نور شاہ)، بیک گراونڈ (ڈاکٹر شہناز فاطمی)، تب کیا ہوگا؟ (اشفاق برادر)۔ ہر افسانہ ہمارے سامنے ایک نئی دنیا کا انکشاف کرتا ہے۔ مستند افسانہ نگاروں کے علاوہ چار نئے لکھنے والوں کی کہانیاں ''نئی کہانی، نئے دستخط'' کے عنوان سے شامل کی گئی ہیں۔ گمشدہ موسم کی کہانی (عاصم بدر)، سرقستان کی شہریت (وسیم احمد علیمی)، ماضی کی بازیافت (محمد فیصل کسانہ) رجّو (عبدالرحمٰن شفیع)۔ یہ ایک اچھی پہل ہے۔ اس سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

اردو کے بزرگ ترین اور اہم ترین افسانہ نگار، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ سلام بن رزاق کا انٹرویو ڈاکٹر ناصر الدین انصار نے لیا ہے اور خوب لیا ہے۔ سلام بن رزاق کے جوابات نپے تلے اور ٹو دی پوائنٹ ہیں۔

نثری حصے کے ساتھ ساتھ شعری حصہ بھی خاصا جاندار اور وقیع ہے۔ اس میں فوزیہ رباب کی تین نظمیں۔ فیضان الحق کی ایک نظم اور این۔ کے۔ بجاج انجم کی ہندی کویتا (ترجمہ: ڈاکٹر منصور خوشتر) شامل ہیں۔ علاوہ ازیں کرشن کمار طور، پروفیسر طرزی، ڈاکٹر رؤف خیر، معین شاداب، اقبال حسن آزاد، مرغوب اثر فاطمی، انور آفاقی اور ڈاکٹر منصور خوشتر کی غزلیں قارئین کے شعری ذوق کی آبیاری کرتی دکھائی دے رہی ہیں۔ پرانے شاعروں کے ساتھ ساتھ سات نئے غزل گو حضرات عاقب صابر، شبیر احمد ڈار، سفیر صدیقی، نعیم سرمد، امان عباس، جمال الدین نواز، شہباز رضوی کی غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

رسالے کا تبصراتی حصہ بھی خوب ہے۔ اس میں مہ جبیں خان (شہرذات)، ریحان غنی (محبّ اردو حمید انور اور بک امپوریم)، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (آئینۂ تنقید، اسلوبیاتی مباحث، بیتے پل کا اک اک پل، جلد اول)، ڈاکٹر احسان عالم (قمر اعظم ہاشمی ......فردنامہ، ثالث......شوکت حیات نمبر، شاداں فاروقی......حیات اور کارنامے)، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ (ناز برداران اردو، لمعات طرزی)، ڈاکٹر منصور خوشتر (شکست ذات، مجیر احمد آزاد کے دیہی افسانے، انداز سخن) یہ سارے تبصرے تفصیلی ہیں اور تبصرے کا حق ادا کرتے ہیں۔

''المنصور ٹرسٹ'' دربھنگہ کا ایک مشہور ادارہ ہے جس کے تحت علمی و ادبی سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں۔اس شمارے میں اس ٹرسٹ کی کارگزاریاں بھی پیش کی گئی ہیں۔

ہر رسالے میں قارئین کے خطوط ایک خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔اس سے رسالے کی انفرادیت ومقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔گزشتہ شمارے پر سلام بن رزاق، عبد الصمد، پروفیسر عبد المنان طرزی، حقانی القاسمی، سلیم انصاری، کامران غنی صبا، غلام نبی کمار، مشتاق احمد وانی، مستفیض احد عارفی، محمد ضیاء العظیم، رونق شہری، شمیم قاسمی، فطین اشرف، خلیق الزماں نصرت، خورشید حیات، پروفیسر سید احتشام الدین اور انوار الحسن وسطوی کے خطوط دربھنگہ ٹائمز کے مناظر عاشق ہرگانوی نمبر کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ زیر نظر شمارہ محفوظ کرنے کے لائق ہے۔شاید اسی لیے رسالے کے مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر نے اسے پکی جلد میں پیش کیا ہے۔میں اس خوبصورت، بامعنی اور اہم شمارے کے لیے مدیر کے ساتھ ساتھ مجلس ادارت اور مجلس مشاورت کے تمام اراکین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

◄◄ ● ►►

نام کتاب	:	سب رنگ (ہندی کی شاہکار کہانیوں کے ترجمے)
ترجمہ وتقدیم	:	صابر رضا رہبر
صفحات	:	۳۰۴ قیمت: ۴۵۰ سن اشاعت: ۲۰۲۲ء
مصنف کا پتہ	:	(مستقل) محلہ حسن پور، پوسٹ بسبٹہ، ضلع سیتامڑھی
حالیہ پتہ	:	وائٹ ہاؤس، نوگھرواں، نزد ڈاکٹر ذاکر حسین ہائی اسکول، سلطان گنج، پٹنہ
موبائل	:	۹۴۷۰۷۳۸۱۱۱
مبصر	:	اقبال حسن آزاد

نئی نسل کے قلم کاروں میں صابر رضا رہبر کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی اور مترجم بھی۔زیر نظر کتاب ہندی کی شاہکار کہانیوں کے تراجم کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ۵۳ صفحات پر محیط مصنف کا تحریر کردہ بسیط وبلیغ مقدمہ ہے۔اس مقدمہ میں کہانی خاص طور پر ہندی کہانی کے آغاز وارتقاء پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ان کا خیال ہے کہ ہم ہندی میں جسے کہانی کہتے ہیں اسی کو اردو میں افسانہ کہتے ہیں۔میرا بھی یہی خیال ہے۔

زیر مطالعہ کتاب میں ہندی کی چودہ بہترین کہانیوں کے ترجمے شامل ہیں جن کے عنوانات

حسب ذیل ہیں:

۱۔کہانی کا پلاٹ (شیو پوجن سہائے)
۲۔فیصلہ (بھیشم ساہنی)
۳۔جلاد (پانڈے بیچن شرما اگر)
۴۔دہلیز (نرمل پانڈے)
۵۔بارش،دھواں اور دوست (پریہ درشن)
۶۔او مریم! (منیشا کل شریشٹھ)
۷۔لوک تنتر کی پیکنگ (جے نندن)
۸۔ملبے کا مالک (موہن راکیش)
۹۔رستے گھاؤ (بوٹا سنگھ)
۱۰۔تاریک راہیں (ڈاکٹر دوست علی بلوچ)
۱۱۔پتاجی کے نام (سوشانت سپریے)
۱۲۔دوسری دنیا (نرمل ورما)
۱۳۔پرندے (نرمل ورما)
۱۴۔ڈر (ڈاکٹر رشمی شیل)

ان کہانیوں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے کہ ہندی کہانی اردو افسانے سے کہیں آگے ہے۔اردو والے ان کہانیوں کو پڑھ کر فن کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔جہاں تک ترجمہ نگاری کا سوال ہے تو ماہرین ادب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ایک مشکل ترین فن ہے۔ترجمے کا حق وہی ادا کر سکتا ہے جو بیک وقت کئی زبانوں کا ماہر ہو اور زبان کی نزاکتوں کو سمجھتا ہو۔

ان ہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

ان ترجمہ شدہ کہانیوں کو پڑھ کر صابر رضا رہبر کی گوناگوں صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ان تراجم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ترجمے نہیں بلکہ اصل معلوم ہوتے ہیں۔

اس مجموعے میں جن کہانی کاروں کو شامل کیا گیا ہے وہ سبھی ادب کے مہارتھیوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے بغیر ہندی ادب کی کوئی بھی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اردو والوں کے درمیان بھی مشہور و مقبول ہیں۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صابر رضا رہبر کی مرتبہ ''سب رنگ'' (ہندی کی شاہکار کہانیوں کے ترجمے) نہ صرف ایک لائق مطالعہ کتاب ہے بلکہ ایک ادبی اور تاریخی دستاویز بھی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب	:	تیرہ افسانے (بہار کی یونیورسٹیوں میں شامل)
مرتب	:	ڈاکٹر قسیم اختر
سن اشاعت	:	۲۰۲۲ء
قیمت	:	۳۵۰/روپے

صفحات : ۲۷۶

رابطہ : 8210498674

مبصر : اقبال حسن آزاد

ڈاکٹر قسیم اختر نوجوان ناقد ہیں اور پورنیہ کالج میں اردو کے استاد ہیں۔ فی زمانہ اردو کے ایسے اساتذہ بہت کم ہیں جو خود سے کچھ لکھنا جانتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر مانگے کے اجالے سے اپنی تقدیر روشن کرتے ہیں۔ اس اندھیرے میں ڈاکٹر قسیم اختر جیسے لوگوں کا دم غنیمت ہے جو اپنے قلم کی روشنی سے اس تاریکی کو کم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

''تیرہ افسانے'' ان کی مرتبہ کتاب ہے جس میں اردو کے تیرہ افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے دراصل بہار کی یونیورسٹیوں کے ایم اے کے نصاب میں شامل ہیں۔

''اپنی بات'' کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ:

''افسانوں کا یہ انتخاب نصابی ضروریات کے پیش نظر کیا گیا ہے۔ اس انتخاب میں جتنے افسانے شامل ہیں، وہ بہار کی سبھی یونیورسٹیوں کے اردو ایم اے کے نصاب میں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ طالبعلموں کے لئے یہ مشکل کام ہے کہ ان تیرہ افسانوں کے لیے مختلف تیرہ افسانہ نگاروں کے مجموعوں کو کھنگالیں اور اپنے مطلب کے افسانے کو حاصل کریں۔ ایک پریشان کن بات یہ ہے کہ ایم اے اردو کی تعلیم مہیا کرنے والے سبھی کالج بڑے شہروں میں واقع نہیں ہیں جہاں ہر طرح کی سہولتیں دستیاب ہیں۔ بہت سارے طلباء ایسے علاقوں اور خطے سے آتے ہیں جہاں کوئی لائبریری نہیں ہے اور نہ اردو کتابوں کی کوئی دکان ہے۔ ایسے میں اردو ایم اے کے طلباء کے لئے ان تیرہ افسانوں کی تلاش بجائے خود ایک دشوار امر ہے۔ طلباء کی انہی پریشانیوں اور ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے ان افسانوں کے انتخاب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اردو افسانے کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے بھی گفتگو پیش نظر رہی کہ طلباء اس صنف کی روایت سے بھی آگاہ ہوسکیں۔'' (اپنی بات، صفحہ نمبر ۷)

اس کے بعد مرتب نے ۶۳ صفحات پر محیط ایک مبسوط مضمون تحریر کیا ہے جس میں افسانے کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی ابتدا اور ارتقاء پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس مجموعے میں شامل تیرہ افسانہ نگاروں کا تعارف اور ان کے افسانوں کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے جس طلباء کے ساتھ ساتھ اساتذہ کو بھی آسانی ہوگئی ہے۔ اس کتاب میں شامل افسانوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ کفن...... پریم چند ۲۔ اپنے دکھ مجھے دے دو...... راجندر سنگھ بیدی

۳۔ آدھے گھنٹے کا خدا...... کرشن چندر ۴۔ صنوبر کے سائے...... حجاب امتیاز علی

۵۔ہتک......سعادت حسن منٹو
۶۔چوتھی کا جوڑا......عصمت چغتائی
۷۔ڈائن......شکیلہ اختر
۸۔بدصورت لڑکی......سہیل عظیم آبادی
۹۔بابا لوگ......غیاث احمد گدی
۱۰۔ایک درخت کا قتل......اختر اورینوی
۱۱۔کارمن......قرۃ العین حیدر
۱۲۔بے نام گلیاں......کلام حیدری
۱۳۔آخری کوشش......حیات اللہ انصاری

اب یہاں پر ایک سوال میرے ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر نصاب بنانے والوں کا مطمح نظر کیا ہے۔کیا وہ اردو کے طلباء کو بار برداری کا جانور سمجھتے ہیں جن پر جتنا چاہے بوجھ لاد دیں۔دوسال کے کورس میں کل ملا کر اٹھارہ پرچے ہیں اور ہر پرچہ ۱۰۰ نمبر کا ہے۔زیر نظر کتاب پرچہ نمبر تین کے نصاب کو سامنے رکھ کر ترتیب دی گئی ہے۔اس پرچے میں تیرہ افسانے شامل ہیں۔ان میں بھی زیادہ تر طویل افسانے ہیں جو افسانے کی بجائے ناولٹ کہے جانے کے مستحق ہیں مثلاً اپنے دکھ مجھے دے دو، آدھے گھنٹے کا خدا، بابا لوگ اور کارمن۔اگر ان افسانہ نگاروں کو شامل ہی کرنا تھا تو ان کی مختصر افسانوں کا انتخاب کیا جاتا۔شکیلہ اختر، اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی کے نسبتاً کمزور اور غیر معروف افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔غیاث احمد گدی، کلام حیدری اور حیات اللہ انصاری کے افسانوں کو تو اس انتخاب میں شامل ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔

بہر کیف! ڈاکٹر قسیم اختر کو ایک اہم اور مشکل کام انجام دینے پر دلی مبارکباد۔

◀◀ ● ▶▶

کتاب	:	شفیع مشہدی کے افسانے (تعارف وانتخاب)
مرتب	:	ڈاکٹر ہمایوں اشرف
اشاعت	:	۲۰۲۲ء
صفحات	:	۲۷۶
قیمت	:	۳۵۰/روپے
مبصر	:	پروفیسر منظر اعجاز

ڈاکٹر ہمایوں اشرف جواں سال نقادوں اور محققوں میں امتیازِ خاص کے حامل اس لئے بھی قرار دئے جاسکتے ہیں کہ انہوں نے ترتیب وتدوین کے حوالے سے اپنے ہم عمر معاصرین کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان کے اس نوعیت کے کام کی طویل فہرست بہت ہی طویل ہے جو فی الحال میرے تخمینے میں نہیں آسکتی۔زیر نظر کتاب اسی نوعیت کی ہے جس میں شفیع مشہدی کے تیس افسانوں کو انہوں نے ''شفیع نامہ'' کے زیر عنوان اپنے

دیباچے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔اس دیباچے میں شفیع مشہدی کے سوانحی احوال وادبی کوائف کو بھی شامل کیا ہے۔''میں اور میرے افسانے'' کے عنوان کے تحت شفیع مشہدی کی ایک اہم تحریر بھی شامل کتاب ہے۔علاوہ ازیں شفیع مشہدی سے ایک ادبی گفتگو یعنی انٹرویو بھی ہے۔اور پھر ہمایوں اشرف نے ہر افسانے پر بہ اختصار چند اپنے ناقدانہ تاثرات بھی پیش کئے ہیں جو''کچھ ان کہانیوں کے بارے میں'' کے تحت ان کے قلم سے وارد ہوئے ہیں۔اسی کے بعد تیس کہانیاں ترتیب دی ہیں جن کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) کرچیاں	(۲) شونا رہرین	(۳) جھاگ	(۴) سنیچر شاہ
(۵) بنتِ زلیخا	(۶) سبکدوش	(۷) طوطے کا انتظار	(۸) قہر درویش
(۹) ہوئے کیوں نہ غرق دریا	(۱۰) جھینی جھینی رے چدریا	(۱۱) دیمک	(۱۲) قصہ راما کاکا
(۱۳) سید کی حویلی	(۱۴) سبز پرندوں کا سفر	(۱۵) آہنی ہے پیرہن	(۱۶) انتقام
(۱۷) گرتی دیواریں	(۱۸) کافور کی خوشبو	(۱۹) سوئیٹ سلطان	(۲۰) روشنی کی آگ
(۲۱) کبوتر	(۲۲) آگ	(۲۳) میک اپ	(۲۴) بڑی سرکار
(۲۵) مٹی کی خوشبو	(۲۶) نیلے بادبان والی کشتی	(۲۷) جلدی کرو	(۲۸) بھٹوں کی فصل
(۲۹) سلوٹیں	(۳۰) پیاس		

زبان وادب سے متعلق شفیع مشہدی صاحب کی خدمات کئی جہتوں پر مشتمل ہیں۔وہ شاعر بھی ہیں اور بہت اچھے شاعر ہیں۔انہوں نے ریڈیو اور ٹی.وی. کے لئے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔یہاں تک کہ اسٹیج ڈراموں سے بھی خاصی رغبت رہی ہے۔تحقیق اور ترتیب وتدوین کے کاموں سے بھی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ وہ خود کو خادمِ اردو قرار دیتے ہیں اور یہ غلط بھی نہیں کیوں کہ اردو زبان کے فروغ وارتقاء کی تحریک سے ان کی دیرینہ وابستگی رہی ہے اور اب بھی ہے۔لیکن جیسا کہ میں نے کہا وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے تقریباً ایک سو افسانے لکھے ہیں اور جو کچھ لکھا ہے چھان پھٹک کر لکھا ہے۔بیشتر کہانیاں واردات حقیقی اور سچے واقعات پر مشتمل ہیں۔میرے لئے تحیّر آمیز بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں ایک ہی نشست میں لکھے ہیں باوجود اس کے کسی افسانے میں جھول جھال یا ڈھیل ڈھال نہیں ہے۔

زیرِ نظر افسانے کی فہرست میں کچھ ایسے افسانے بھی ہیں جو رسائل وجرائد کے مطبوعہ تو ہیں ہی علاوہ ازیں پہلے کے منتخب افسانوی مجموعہ''سنی حکایت ہستی'' میں بھی شامل ہیں۔ویسے افسانہ نگاری میں ان کے بڑھتے قدم بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔سفر جاری ہے۔

دیکھیئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا   گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

آیئے اب زیرِ نظر افسانوں سے متعلق مرتبِ کتاب ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے نقد ونظر اور تبصرے وتاثرات پر بھی تا حد امکان سرسری نظر ڈالتے چلیں۔ شروع کرتے ہیں پہلے افسانہ ''کرچیاں'' سے۔ ہمایوں اشرف اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''عصر حاضر کی پُر پیچ زندگی، اس کے نشیب وفراز، فرد کی نفسی اور داخلی کیفیات، اس کی محرومی، محزونی، اس کی ایلی نیشن اور بیگانہ وشی، اس کی اجنبیت اور تنہائی اوراس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا منفی رویّہ، ذات کے گم شدہ حصّے کی تلاش، بے چہرگی اور بے سمتی کا کرب، زمین سے اجڑنے اور جڑوں سے اکھڑنے کا احساس، ماضی (ذاتی، تہذیبی) کی بازیافت، زندگی کی لایعنیت اور بے مقصدیت، قدروں کی ٹوٹتی بکھرتی کرچیاں، زندگی کی تہوں سے ابلنے والا احساس اور ایک نئی بصیرت کو جن افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیق کی اساس بنایا، ان میں شفیع مشہدی کا نام نمایاں طور پر قابل ذکر ہے''۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے جدیدیت کے رجحان کے امتیاز واختصاصات کی مجموعی کیفیت درج بالا اقتباس میں بیان کردی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس رجحان کے نمائندہ افسانوں میں شفیع مشہدی صاحب کا افسانہ اپنی یافت کے لحاظ سے بھی نمایاں ہے۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے اس عبارت میں اس کی طرف اشارہ کردیا ہے۔ ''کرچیاں'' پر انہوں نے الگ سے بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ''شفیع مشہدی کے نمائندہ افسانوں کی پہلی کہانی 'کرچیاں' ہے۔ اس کا مرکزی تصوّر وجود کی ٹوٹتی بکھرتی کرچیاں ہیں''۔

اسی نوعیت کی دوسری کہانی ''شونار ہرین'' یعنی سونے کا ہرن ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ یہ کہانی شعور کی رو، stream of consiusness کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ یہ کہانی تنقید وتبصرہ اور تجزیہ کے لئے علمی استعداد کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ علم نفسیات، مارکسزم، وجودیت Existensialism کے اثرات بھی نمایاں ہیں اور سب سے بڑھ کر اس میں متصوفانہ تصوّرات کی بھی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا نقطۂ عروج اسی تصوّر سے متعلق ہے۔ اس پر ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا تبصرہ بعض پہلوؤں سے بے حد اہم ہے۔ لیکن بعض مصطلحات جو علم نفسیات سے متعلق ہیں عام قاریوں کے لئے سنگ راہ ثابت ہوسکتی ہیں لیکن افسانے کے معیار کے مطابق ہے۔ وجودیت کا مسئلہ یہاں بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدیدیت میں نفسیات اور وجودیت چولی دامن کی طرح ساتھ ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ شفیع مشہدی صاحب کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ علم نفسیات کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ انہوں نے افسانہ نگاری کا آغاز ترقی پسند تحریک کے زوال آمادہ دور میں کیا۔ اس کے بعد جدیدیت کا دور آیا لیکن انہوں نے کسی

تحریک یا رجحان سے وابستگی اختیار نہیں کی البتہ ان سے متاثر ضرور ہوئے۔ان کے اثرات کی نشاندہی ان کے متعدد افسانوں سے ہوتی ہے۔ جہاں تک ''شونار ہرین'' کا تعلق ہے تو اس کا آغاز ہی نفسیاتی پیچیدگی کے اظہار سے ہوا ہے۔اس کے مرکزی تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے لکھا ہے:

''افسانہ 'شونار ہرین' کا مرکزی تصور بھی انسان کی محرومی و محزونی ہے۔کہانی کا بنیادی کردار محبت میں ناکامی کا منھ دیکھتا ہے اور اسے اپنے اردگرد کی دنیا تاریکی میں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔وہ خود کو ایک سرنگ کے بیچ معلق پاتا ہے جس کے نیچے گہری اتھاہ کھائی ہے اور اوپر کی اونچائی لامعلوم۔اسے اپنی گزشتہ زندگی کی یاد آتی ہے۔ریزی ڈینسی میں محبوب کے ساتھ گھومنا، چار باغ، دل کشا، امام باڑہ وغیرہ میں سیر کرنا۔پھر اسے وہ سیاہ گھوڑا یاد آتا ہے جو ریس میں منھ کے بل گر گیا تھا۔اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ سرنگ کی لامحدود گہرائیوں میں گرتا جا رہا ہے۔اس نے تاریکیوں میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو سیاہ گھوڑا اس کے پہلو میں مردہ پڑا تھا۔اس میں کردار کی نفسیات کو بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے''۔

مسئلہ یقیناً نفسیاتی ہے اور اس میں واقعی کردار کی نفسیات کو بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ کہانی کا بنیادی کردار محبت میں ناکامی کا منھ دیکھتا ہے۔اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ تو یہاں معرضِ بیان میں نہیں آیا ہے لیکن میرے ذاتی مطالعے کے مطابق اس کا بنیادی سبب معاشی بنیادوں پر طبقاتی کشمکش ہے۔محبوب کا جو Socio economic اور cultural status ہے، وہ عاشق زار کا نہیں۔ یہاں وہاں گھومنا اور سیر سپاٹے پر نکلنا ایک طرح سے اوقات گزاری کا مشغلہ ہے لیکن ایک موقع پر یہ عاشق بالواسطہ طور پر اپنی محبت کا اظہار یوں کرتا ہے کہ: ''محبت کے بارے میں تمہارا خیال کیا ہے تو محبوب کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے اور کہتی ہے It is an obsessive phyconeurosis یعنی'' کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا''۔ذرا آگے بڑھ کر شعلۂ شوق اور بھڑکتا ہے اور عاشق، معشوق کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے تو وہ بجلی کے جھٹکے کی سی کیفیت میں ہاتھ کھینچ لیتی ہے اور عاشق کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔اسی لئے کسی شاعر نے کہا ہے:

اے دل نہ الجھنا تھا یوں سنگ سے آہن سے　　　وہ جیسے تھے ویسے ہیں تو ٹوٹ گیا چھن سے

اور یہی کیفیت اسے ایسے نفسیاتی مرض میں مبتلا کر دیتی ہے جسے فراقؔ گورکھپوری نے ''کابوس'' سے تعبیر کیا ہے۔شفق کا ایک ناول ''کابوس'' ہی کے عنوان سے منظر عام پر آ چکا ہے لیکن ''کانچ کا بازی گر''میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے اور یہی کیفیت احمد یوسف کے بعض افسانوں میں بھی ملتی ہے۔

اس میں مہا کال کے حوالے سے ایشور اور آدم کے مکالمے بھی ہیں۔اس

میں واضح طور پر وجودیت کے مغربی مفکرین کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت غیر ضروری نہیں ہوگی کہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس یہی وجودی فکر و فلسفہ ہے جو تمام تر قنوطیت پسند ہے۔اس میں خدا کے وجود کا انکار پایا جاتا ہے لیکن اس افسانے میں خدا کا انکار بظاہر نہیں پھر بھی بالواسطہ طور پر دیکھیں تو خدا کے وجود کو فرضی قرار دے کر تمسخر اور مضحکہ سے کام لیا گیا ہے۔واضح رہے کہ یہ شفیع مشہدی صاحب کا نظریہ نہیں، کردار کے ذریعے وجودی فکر و فلسفہ کو بروئے کار لایا گیا ہے۔سیاہ گھوڑا جو ریس میں منھ کے بل گر گیا تھا اور بالآخر وہ مردہ پایا جاتا ہے۔یہ تمنّاؤں، ارمانوں اور آرزوؤں کی موت کا استعارہ ہے جسے اس کہانی میں رابندر ناتھ ٹیگور کے ''شونار ہرین'' سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ دراصل رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک گیت اسی عنوان سے ان کے سرمایۂ سخن میں شامل ہے۔رابندر ناتھ ٹیگور نے بطور علامت اسے رامائن کے ایک واقعہ سے اخذ کیا ہے۔ یہ دراصل متصوفانہ نکات پر مشتمل ہے۔ میں نے دو ڈھائی دہائی قبل لکھا تھا کہ '' تصوف، مذاہب کی روح ہے''۔رابندر ناتھ ٹیگور نے ''شونار ہرین'' کے ذریعے اسی روح کو نکھار کر پیش کرنے کی مستحسن کاوش کی ہے۔سہانہ منظور نے رابندر ناتھ ٹیگور کے اس گیت کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اور اس کی تشریح و تعبیر بھی پیش کی ہے۔انہوں نے لکھا ہے:

"There is a reference to Sita's yearing for the golden dear during her exile in the poem, an episode which led to her kidnaping by Ravana in Ramayana".

رامائن کے اس episode کا واقعہ یہ ہے کہ بن باس کے زمانہ میں سیتا جی نے دیکھا کہ ایک سونے کا ہرن چوکڑی بھرتا سامنے سے گزر گیا۔انہوں نے شری رام کو آواز دی اور یہ واقعہ سنایا اور گزارش کی کہ سونے کے اس ہرن کو پکڑ کر لے آئیں۔انہوں نے جواب دیا کہ سونے کا ہرن نہیں ہوتا۔ یہ چھلاوا ہے، مایہ ہے لیکن سیتا جی کی خواہش کے مطابق انہیں ہرن کی تلاش میں جانا ہی پڑا۔ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو سیتا جی نے لکشمن جی کو ان کی تلاش کے لئے دوڑایا۔ لکشمن جی نے ایک ریکھا کھینچ دی اور کہا کہ اس سے باہر نہ نکلئے گا اور وہ چلے گئے۔ان کے جاتے ہی راون سادھو کے بھیس میں آیا اور بھکشا مانگی۔ سیتا جی نے ریکھا کے اندر ہی سے اسے کچھ دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر دینا ہی ہے تو ریکھا سے باہر آ کر دو۔ لامحالہ سیتا جی کو ایسا ہی کرنا پڑا۔اور راون انہیں اغوا کر کے لے اڑا۔

رامائن کے اس واقعہ کے ذریعہ جو عالم انسانی کے لئے پیغام نشر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ:

"Remain yourself under the limitation" یعنی اپنی خواہشوں کو حد سے آگے بڑھنے نہ دو۔ اس کو محدود اور قابو میں رکھو۔ یہ دنیا جو دکھائی دیتی ہے، بظاہر بہت حسین ہے لیکن بباطن بہت قبیح ہے۔ یہ تصوف کا نہایت ہی اہم نکتہ ہے اور یہی بات قرآن مجید میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی لئے میں نے تصوف کو مذاہب کی روح قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے کوئی تفصیلی تجزیہ پیش نہیں کیا ہے کیوں کہ یہاں اس کی گنجائش بھی نہیں تھی لیکن جتنا کچھ اس افسانے کے بارے میں لکھ دیا ہے، وہ کم نہیں ہے۔ انہوں نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ دوسرے افسانوں کی بھی روح نچوڑ کر ہدیۂ قارئین کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی، ادبی حلقے میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی اس کاوش قلم کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور دور تک اور دیر تک اس کی پذیرائی ہوتی رہے گی۔

☆☆

نام کتاب	:	جدیدیت کے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی
مصنف	:	اجئے مالوی
مبصر	:	ڈاکٹر توصیف بریلوی (علی گڑھ)

شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو تنقید میں نہ صرف اپنا الگ مقام پیدا کیا بلکہ اردو ادب میں ایک خاصی مدت تک اپنے رجحان "جدیدیت" کا لوہا بھی منوایا۔ وہ بیک وقت نقاد، فکشن نگار، ماہر لسانیات اور شاعر بھی تھے۔ اردو تنقید و تحقیق کے حوالے سے انہوں نے متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ اردو تنقید میں جدیدیت کے بنیاد گزار فاروقی صاحب ہی ہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ یہ رجحان مقبول ہوا یا نہیں۔ زیر نظر تحریر کا مقصد ڈاکٹر اجے مالوی کی ترتیب کردہ کتاب "جدیدیت کے علم بردار شمس الرحمٰن فاروقی" کا مختصر جائزہ پیش کرنا ہے۔

مذکورہ کتاب کی ابتدا ایک پر مغز اور مدلل مقدمے کے ساتھ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اجے مالوی نے شمس الرحمٰن فاروقی کے نظریات سے اختلاف بھی کیا ہے اور انہیں سراہا بھی اور اس کو حوالوں کے ساتھ کتاب میں پیش بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

> "جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے نصیر الدین ہاشمی کی کتاب "قدیم اردو" کو اپنے مقدمہ کو مضبوط بنانے کے لیے دیدہ و دانستہ نظر انداز کر دیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اردو کو اسم زبان کے طور پر ہی موضوع بنایا ہے۔ وہ اس سلسلے میں کج مج غلط سلط انگریزی تراجم سے وافر مدد لیتے ہیں۔" (کتاب ہذا، ص: ۱۴)

مندرجہ بالا تحریر سے نہ صرف ڈاکٹر اجے مالوی کی بے باکی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے بلکہ یہ فلسفہ

بھی آشکار ہوتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی ادبی میدان میں کوئی بھی تحریر حرف آخر نہیں ہوسکتی ہے۔ڈاکٹر صاحب نے کتاب میں شمس الرحمٰن فاروقی پر ایک تفصیلی توقیت نامہ بھی پیش کیا ہے جس میں شمس الرحمٰن فاروقی کی پیدائش، وفات، رہائش اور تعلیم کے علاوہ ان کی کتب کی الگ الگ فہرست سازی بھی کی ہے۔اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اجے مالوی نے دل جمعی کے ساتھ کام کیا ہے۔ان کتابوں میں انگریزی، اردو، ہندی کے علاوہ ترجمہ شدہ کتابوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ تنقید، تدوین اور صحافت سے متعلق کتابوں کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے حتیٰ کہ فاروقی صاحب کی لکھی ہوئی یا مرتب کردہ کسی بھی کتاب کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔لہٰذا آئندہ زمانے میں شمس الرحمٰن فاروقی پر تحقیق کرنے والوں کو آسانی ہوگی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی زندگی میں متعدد ممالک کا سفر کیا۔ان میں بعض اسفار ذاتی نوعیت کے ہیں لیکن بیشتر ادبی نوعیت کے ہیں۔ڈاکٹر اجے مالوی نے فاروقی صاحب کے ان اسفار کے متعلق معلومات فراہم کی ہے جو بہت اہم ہے۔

ڈاکٹر اجے مالوی نے کتاب ہذا میں فاروقی صاحب پر دو انٹرویو بھی شامل کیے ہیں۔پہلا انٹرویو مناظر عاشق ہرگانوی اور دوسرا رحیل صدیقی/احمد محفوظ کا ہے۔ان دونوں انٹرویوز میں مختلف ادبی زاویوں سے سوالات اور ان کے جوابات ملتے ہیں۔ان انٹرویوز سے فاروقی صاحب کے تنقیدی نظریات اور سروکار واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

مذکورہ کتاب کا تیسرا باب مضامین سے متعلق ہے جس میں فاروقی صاحب پر اردو ادب کی مایہ ناز شخصیات سے لے کر کچھ طالب علموں کے بھی مضامین شامل ہیں جو کہ تعداد میں ۳۳ ہیں۔ان مضمون نگاروں میں انتظار حسین، غلام شبیر رانا، شیخ محمد عقیل، حقانی القاسمی اور پروفیسر علی احمد فاطمی کے نام بطور خاص ہیں۔راقم کا مضمون بھی فاروقی صاحب کے ناول ''قبض زماں'' پر شامل کتاب ہے۔اس باب میں موصوف کی تمام ادبی سرگرمیوں پر خامہ فرسائی کی گئی ہے اور مختلف نوعیت کے مضامین بھی لکھے گئے ہیں جو نہ صرف فاروقی صاحب کے ادبی مقام کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ مضمون نگاروں کے مختلف النوع موضوعات کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔فاروقی صاحب کی تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے جناب شیخ محمد عقیل اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں:

> ''شمس الرحمٰن فاروقی ان شخصیات میں سے ہیں جن کی تنقیدی تحریروں سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا ہے۔تنقید کے بہت سے اہم مباحث کی تفہیم کا ذریعہ ان کی تنقیدی تحریریں رہی ہیں۔اگر میں یہ کتابیں نہ پڑھتا تو شاید تنقید کی مبادیات سے صحیح طور پر واقف نہ ہو پاتا۔اس حقیقت کے اعتراف میں مجھے بخل

سے کام نہیں لینا چاہئے کہ فاروقی اور ان کے معاصرین کی تحریریں میرے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہی ہیں۔'' (کتاب ہذا،ص:۱۳۷)

حقانی القاسمی صاحب کچھ یوں لکھتے ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی نابغۂ عصر تھےاور علوم وادبیات کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔تنقید کے باب میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔معاصر نقادوں میں وہ سرفہرست سمجھے جاتے تھے۔ماہنامہ 'شب خون' کے ذریعے انہوں نے بہت سے نئے ذہنوں کی تربیت کی اور جدیدیت کے رجحانات اورزاویے سے روشناس کیا۔ اس جدیدیت سے اختلاف کی بہت گنجائش ہے مگر جدیدیت نے بہت سے تخلیقی ذہنوں کو متحرک ومہمیز کیا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بہت سے نئے نظریات ورجحانات سے واقفیت کا ذریعہ یہی تحریک بنی اسی لیے یہ تحریک کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہی۔'' (کتاب ہذا،ص:۱۴۲)

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی حیثیت کیا ہے اور عصر حاضر کے نقادوں نے بھی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔

یوں تو پوری کتاب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو خراج عقیدت ہے لیکن بالخصوص آخری باب خراج عقدت سے تعلق رکھتا ہے جس میں شعرائے کرام نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

اس کتاب کے مجموعی مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مذکورہ کتاب میں بہت ہی معلومات اور اہم مواد شامل ہے جو نہ صرف فاروقی صاحب کو سمجھنے میں معاون ہے بلکہ تنقید کے میدان میں نئے گوشوں پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ڈاکٹر اجے مالوی کی یہ کاوش قابل تحسین ہے۔

◄◄ ● ►►

نام کتاب	:	معاصر اردو افسانہ:فکری جہات اور ڈاکٹر مجیر احمد آزاد
مبصر	:	ڈاکٹر منصور خوشتر، دربھنگہ

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد سرزمین دربھنگہ میں نئی نسل کے جواں سال ادیبوں میں کافی فعال اور متحرک ہیں۔ایم اے، بی ایڈ اور پی ایچ۔ڈی کرنے کے بعد +۲ ایل ایم ہائی اسکول آنند پور، دربھنگہ میں انچارج ہیڈ ماسٹر ہیں۔انہوں نے ادبی زندگی کی شروعات ۱۹۸۸ء میں کی۔افسانہ نگاری، تنقیدی مضامین، تبصرہ نویسی ان کا خاص مشغلہ ہے۔خصوصی طور پر افسانہ نگاری میں وہ زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ان کے افسانے اردو کے مؤقر

رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ویسے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جہاں معاشرے کا استحصال نظر آتا ہے۔ ان کے سات افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے (۱) ڈوم (۲۰۰۴ء)، (۲) اندھیرے کا کرب (۲۰۰۹)، (۳) دور دیس میں (۴) جھکی ہوئی شاخ (۲۰۱۳)، (۵) ٹھہری ہوئی صبح (2015)، (۶) آ! کہانی سنتے ہیں (بچوں کے لئے۔۲۰۱۶)، (۷) کلاس ٹاپر (۲۰۱۹) ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر کتابیں ''دربھنگہ میں اردو افسانہ نگاری'' (تحقیق و تدوین)، ''شاداں فاروقی: حیات اور خدمات'' (تحقیق و انتخاب) ''مقالات طرزی''، ''منظوم مقالے'' (ترتیب) منظر پر آ چکی ہیں اور قارئین کے درمیان پسند کی گئی ہیں۔ انہوں نے نہ صرف افسانے لکھے ہیں بلکہ معاصر اردو افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر بھی اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی تازہ ترین کتاب ''معاصر اردو افسانہ: فکری جہات'' ہے۔ اس میں افسانہ اور افسانہ نگاران کے تعلق سے ان کے مضامین شامل ہیں۔

اس کتاب کے انتساب کے یہ الفاظ چونکاتے ہیں اور اہل علم و نظر کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ بہت سارے افسانہ نگاروں کی تخلیقات پہ ہم سب کی ناہ نہیں ٹھہرتی ہے۔ ''ان افسانہ نگاران کے نام کیا ہے جن پر ناقدین کی نگاہ اب تک نہیں پڑی۔''

''پیش لفظ'' میں ڈاکٹر مجیر احمد آزاد لکھتے ہیں کہ ''معاصر اردو افسانہ موضوعاتی اعتبار سے متنوع اور ہمہ گیر ہے۔ اس کے محتویات میں معاشرے کا ہر رنگ موجود ہے۔ ہمارا معاشرہ جو نت نئی تبدیلیوں کی آماج گاہ ہے، اس کے باطن کی راز نہانی اور تصویر کشی افسانے کا خاصہ ہے۔ یہ تبدیلیاں انسان کے فکر و عمل کی راہیں طے کرتی ہیں۔ اس میں احساس شکست خوردگی کے باوجود جینے کا حوصلہ ہے۔ خواب بننے اور اسے حقیقت کی مالا میں پرونے کا عمل بھی ہے تو مٹھی میں ریت اٹھا کر خالی ہاتھ رہ جانے کا سچ بھی ہے۔ نامرادیاں، ناکامیاں ہیں تو خوشی کا ایک پل بھرپور جینے کا جذبہ بھی شامل ہے۔ اپنوں سے بچھڑنے کا غم ہے تو ہجرت کی طاقت سے آگاہی بھی ہے۔ سائنسی ایجادات سے زندگی کی آسانیوں کی حصولیابی اور معاشی خوشحالی نے سماج کے رنگ و روپ کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ شہری کلچر کے خمیر سے پنپتے ہوئے اطوار اور طرز رہائش آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے اور ادب جو معاشرے کا آئینہ ہوا کرتا ہے ان رنگوں کو اپنے کینوس پر ڈال کر نئی تصویریں وضع کرنے میں لگا ہوا ہے۔ یہاں فن کار کی دسترس میں جو بھی آتا ہے وہ سماج یا اس کے حالات کے ذریعہ آتا ہے اس لئے عصر کا افسانے میں شامل ہونا عین فطری ہے۔''

''اگنی پریکشا دینے والا افسانہ نگار: نعیم کوثر'' کے عنوان سے ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے نعیم کوثر کی افسانہ نگاری کا جائزہ بڑے ہی خوبصورت الفاظ میں لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نعیم کوثر کا افسانہ ''اگنی پریکشا'' ایک بے حد کامیاب کہانی ہے۔شمسہ کے کردار کی توانائی موضوع کو کامیابی تک ہم کنار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔یوں تو افسانے کا مین اسٹریم دنگا فساد سے رونما ہونے والا المناک حادثہ ہے۔گرجا گھر کے بورڈنگ میں بیس لڑکوں کے ساتھ میڈم شمسہ بلوائیوں کے مرغے میں قید ہے۔بچوں کی نگہبانی اور محافظت کی ساری تدبیریں ناکام ہو چکی ہیں۔ایسے وقت میں شمسہ کا دلیری بھرا قدم جذبۂ انسانیت کو فتح یاب کر جاتا ہے۔فلش بیک میں شمسہ اپنے بچپن کو یاد کرتی ہے۔اسکی یادوں کا سرا بھی انسانیت کا درس ہے۔پیدائش کے بعد اس کی ماں کا دودھ نہیں اترنا اور والد کے ذریعہ دوسری زچاؤں کے دودھ سے اس کی سیرابی اور دادی کا پرانی روایت کی پاسداری۔افسانے کا یہ حصہ پُچّی ہے۔''(ص:۲۰۔۱۹)

بھاگلپور کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے حسن رہبر کی افسانہ نگاری سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر مجیر احمد آزاد لکھتے ہیں: ''حسن رہبر بزرگ افسانہ نویس ہیں۔وہ ایک عرصے سے افسانے لکھ رہے ہیں۔پہلا افسانوی مجموعہ ''ایک پل کا فاصلہ'' (سال اشاعت ۱۹۸۹ء) کے ذریعے انہوں نے سنجیدہ ادبی حلقے میں اپنی پہچان بنائی اور اس سفر کی کئی منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے جارہے ہیں۔ان کے افسانوں میں عصری مسائل اور تقاضے کی پیش کاریاں زیادہ اپیل کرتی ہیں۔انہوں نے انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ہمارے گردوپیش کی کہانیوں کو انہوں نے بڑی ہی خوبصورتی سے تخلیق کا حصہ بنادیا ہے۔''(ص:۳۷)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اپنی تخلیقی دولت مندی کے سبب جانے جاتے ہیں۔انہوں کئی کامیاب کہانیاں لکھیں جن پہ گفتگو ہوئی۔ان کے افسانوی مجموعہ ''بکھری اکائیاں'' کے افسانوں سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر مجیر احمد آزاد لکھتے ہیں:

''پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ہمہ جہت فنکار ہیں۔شاعری اور نثر نگاری دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ایک سو پچاس سے زیادہ کتابیں ان کی ادبی وابستگی کا روشن باب ہے۔فکشن کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔انہوں نے افسانہ نگاری کے ذریعے معاشرے کو آئینہ کیا ہے۔ان کے افسانوں میں عصری موضوعات کی ہمہ رنگی موجود ہے،بیان میں سادگی اور پرکاری ہے۔''بکھری اکائیاں'' ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے۔اس کے افسانے تازگی لیے ہوئے ہیں۔موضوعاتی تنوع کے باوجود جو ایک بات واضح ہو کر ابھرتی ہے وہ ہے افسانہ نگار کی بے چینی،کبھی ذات سے تو کہیں سماج سے اور کہیں کہیں تو حالات کی ستم ظریفیوں کے وہ اس قدر نباض فنکار ہو جاتے ہیں کہ افسانہ اور حقیقت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ان کے یہاں عصری حسیت متوجہ کرتی ہے اور حالات وواقعات بیان کرنے کا اپنا الگ انداز ہے۔افسانہ'' کالا اتوار'' ان کے شاہکار افسانوں میں سے ایک ہے۔فسادات کی نفسیات،فسادات کی تکنیک، پلان اور اس کا منظر جس طرح اس افسانے میں در آیا ہے۔''

مشتاق احمد نوری کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے ان کے کرداروں کی پیش کش کو موضوع بنایا ہے۔ بڑی ہی خوبصورتی سے اان کے افسانوں کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مشتاق احمد نوری کے افسانوں کا یہ مطالعہ ایک ایسے سفر کی روداد ہے جس میں منزل کی تلاش اور اپنی خواہش کی تکمیل کا جذبہ کارفرما ہے۔ مطالعے کے اس یاترا میں میری ملاقات ''میں'' سے ارریہ کے ایک گاؤں میں ہوتی ہے۔ یہ وہ ''میں'' ہے جو تعلیم یافتہ ہے، اعلی عہدے پر فائز ہے، تخلیق کار ہے اور باوقار زندگی بسر کررہا ہے۔ پٹنہ سے اپنے گھر آیا ہے، بقرعید کا دن ہے۔ عیدگاہ کے پاس ٹرین سے گر کر ایک نامعلوم شخص زخمی ہوا ہے، اس کا سر پھٹ گیا ہے، وہ خون سے لت پت ہے اور تڑپ رہا ہے۔ ''میں'' کو اس حادثہ کی خبر ہوتی ہے کہ زخمی کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔''

ڈاکٹر قیام نیر اردو زبان وادب کے خاموش خادم ہیں۔ انہوں بہار میں اردو افسانہ نگاری کے حوالے سے اہم تحقیقی کام انجام دئے ہیں۔ تحقیق وتنقید میں کئی کتابیں ان کی کوششوں کا ثمرہ ہیں۔ بحیثیت افسانہ نگار بھی انہوں نے جگہ پائی ہے۔ افسانوی مجموعہ ''دھند'' کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر مجیر احمد آزاد ان کی ادبی کارگزاروں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر قیام نیر کی فکشن سے گہری دلچسپی ہے۔ انہوں نے افسانے لکھے، ناول کی تخلیق کی۔ افسانوی ادب کی تحقیق وجستجو کو کتابی پیرہن کیا۔ ''بہار میں اردو افسانہ نگاری (ابتدا تا حال) اور ''بہار میں تخلیقی نثر آزاد کے بعد'' (دو جلدوں میں) ان کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیت کی دلیل ہے۔ دونوں تصنیفات کا مطالعہ فکشن سے وابستگی اور حسن انتخاب کا نمونہ ہے ''بچھڑی دلہن'' کے نام سے انہوں نے ناول لکھا جسے سراہا گیا۔ ''میری جو شامت آئی'' ان کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ وہ برسوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے ''پرواز'' لدھیانہ، ''گلبن'' احمد آباد، ''فروغ ادب'' اڑیسہ، ایوان اردو'' دہلی اور ''زبان وادب ''پٹنہ وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ ''تنہائی کا کرب'' (۱۹۸۴ء) اور ''تحفہ'' (۲۰۰۰) افسانوی مجموعے سے ان کی افسانہ نگاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''دھند'' ہے۔''

معاصر اردو افسانہ: فکری جہات میں شامل ''اگنی پریکشا دینے والا فنکار نعیم کوثر''، ''نسیم محمد جان کی تخلیقیت''، ''کرشن بیتاب کی افسانہ نگاری''، ''حسن رہبر کا تخلیقی رویہ''، ''سلطان شاہد: ''وہ ایک پل کا'' تخلیق کار''، ''قصہ گوئی کی فنکاری اور اظہر نیر کی کہانیاں''، ''سماجی مسائل کی عکاسی اور فاروق راہب کے افسانے''، ''سماجی ڈسکورس اور یسین احمد کے افسانے''، ''بے کسوں کے ترجمان افسانہ نویس: شرافت حسین''، ''بکھری اکائیاں اور مناظر عاشق ہرگانوی''، ''دیپک بدکی کی افسانہ نگاری''، ''مشتاق احمد نوری

کے افسانوں کے کردار''،''قیام نیر کا افسانوی مجموعہ''دھند'':ایک مطالعہ''،''شموئل احمد کی افسانہ نگاری''،''آنندلہر کی افسانہ نگاری''،''زمینی حقائق اورسید احمد قادری کے افسانے''،''کہانی بیان کرنے والامنفردافسانہ نگار:وسیم حیدر ہاشمی''،''تنویراختر رومانی کے افسانے بنام اصلاح پسندی''،''سہیل جامعی کی افسانہ نگاری''،''رحمٰن شاہی کے افسانے''،''عطا عابدی اور بچوں کی کہانیاں''،''احمد صغیر کے دلت افسانے''،''آصفہ نشاط کے افسانے:اختصاصی مطالعہ''،''بہارشر ربار'' کے افسانے:ایک مطالعہ''،''ناری گاتھا اورسلمی صنم کے افسانے''،''شبیر اصغر کا''الف''،''خالدہ ناز کے افسانے: تجزیاتی مطالعہ''،''شیر کا احساس''اوراوینا ش امن''ایسے مضامین ہیں جن سے عصری افسانہ نگاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان موضوعات پرڈاکٹرآزادنے کہیں تفصیل تو کہیں اختصار سے گفتگو کی ہے۔

اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کی پیش نظر کتاب افسانہ نقد و تجزیہ کے باب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے وہیں مصنف کی فکشن سے گہری وابستگی اور مطالعہ پسندی کی مثال ہے۔

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب	:	محبّ اردو حمید انور اور بک امپوریم
مرتب	:	ڈاکٹر محمد ممتاز فرح
اشاعت	:	۲۰۲۲ء
قیمت	:	۳۵۰روپے
مبصر	:	بینام گیلانی

جناب ڈاکٹرفرخ کی تصنیف''محبّ اردو حمید انور اور بک امپوریم''ہم دست ہوئی۔مذکورہ کتاب کے ہم دست ہوتے ہی یہ ناچیز حیرت زدہ رہ گیا۔وہ اس باعث کہ کتب خانوں پر تو بہت ساری کتابیں خلق ہوئی ہیں لیکن کسی کتاب کی دکان پر اور کتاب کی دکان کے مالک کی شخصیت ،اخلاق،طرز معاشرت،رواداری،ادب دوستی پر ۳۳۶صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب احقر کی نگاہ سے پہلی دفعہ گزری۔بلا چوں و چرا اسے ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔کیونکہ اس میں ارض ہند کی بہت ساری بلند قد شخصیات کی تحاریر وافکاروخیالات شامل ہیں۔اس طرح مصنف نے نہ صرف ادباء،وشعراء،کی یادوں کوتازہ کیا ہے بلکہ ارض ہند کے ماضی کے ان ادباء،وشعراء،نیز محقق وناقد کو پھر سے ایک نئی زندگی عطا کردی ہے۔جنہیں لوگوں نے رفتہ رفتہ یا تو فراموش کردیا ہے یا کرتے جارہے ہیں۔ان حالات میں اپنے اکابرین کے اسمائے گرامی کی حفاظت مشکل سے مشکل امر ہوتا جارہا ہے۔اب قابل غور امر یہ ہے کہ جب اکابرین کی یادوں کو محفوظ رکھنا

انتہائی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ایسے میں محض ایک کتاب کی دکان اور اس دکان کے دکاندار کی یادوں کو محفوظ رکھنے کی سعی بلیغ کی گئی ہے۔کیا یہ حیرت انگیز اور جرأت آمیز امر نہیں ہے۔یادش بخیر شہر پٹنہ کے قلب میں واقع محلّہ سبزی باغ کی ایک تنگ سی گلی میں قائم رحمانیہ ہوٹل کبھی شہر پٹنہ کے ادباء، وشعراء کے یکجا ہونے کے مقام کے طور پر مشہور رہا۔ویسے وہ ہوٹل آج بھی قائم ودائم ہے۔لیکن اب وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی ہے۔عین اسی قسم کا ایک ہوٹل شہر نشاط کلکتہ کے محمد رفیع قدوائی روڈ میں واقع ڈائمنڈ ہوٹل تھا۔اب وہ ختم ہو چکا ہے۔تاہم ماضی میں وہ بھی پٹنہ کے رحمانیہ ہوٹل کی ہی طرح کافی مشہور ومقبول رہا۔جو سرزمین کلکتہ کے شعراء وادباء کی باہمی نشستوں کا مرکز رہا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیشتر شہروں میں ادباؤ شعراء کی نشستن وبرخاستن کے لئے ایک مخصوص مقام کے طور پر کوئی نہ کوئی ہوٹل مشہور رہا ہے۔لیکن ایک کتاب کی دکان جو واقعی بہت ہی چھوٹی سی ہے۔وہاں بہت ہی بڑی بڑی وجید شخصیات کی آمد ورفت لگی رہتی تھی۔معاصر دور میں بھی ویسی ہی آمد ورفت جاری ہے۔لیکن یہ بھی ایک بلاتر دید حقیقت ہے کہ فی زمانہ وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔جو بات اس دکان کے بانی جناب حمید انور صاحب کے دور میں تھی۔مذکورہ کتاب کی دکان ''بک امپوریم'' سبزی باغ پٹنہ کی نسبت سے ناچیز کے ایک قریبی دوست ڈاکٹر عطا عابدی کچھ یوں رقمطراز ہیں۔

''اردو دنیا کے ادباء وشعراء میں شاید ہی کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو بک امپوریم کے بارے میں نہیں جانتے ہوں۔یا اس کے نام سے واقف نہ ہوں تقریباً نصف صدی سے ''بک امپوریم'' کا نام اردو کی اکثر کتابوں میں کتاب ملنے کا پتہ کے طور پر درج ہوتا رہا ہے۔دیکھنے میں تو بک امپوریم کتب ورسائل کی ایک چھوٹی سی دکان ہے لیکن اپنی افادیت اور محبوبیت کے سبب عاشقان اردو کے لئے ایک سنگم ایک مرکز اور کبھی کبھی ایک مطالعہ گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔بک امپوریم کی اس حقیقت میں اس کے بانی مرحوم حمید انور صاحب کی منفرد شخصیت کا اہم رول رہا ہے۔مرحوم صرف ایک دکاندار نہیں تھے مجھے بلکہ شعرا ادبا اور مصنفین ومئولفین سے ان کے تعلقات کی نوعیت پیشہ ورانہ ہونے کے باوجود ادیبانہ صورت بھی رکھتی تھی۔ان کے ادبی ذوق وشوق کی وجہ سے سے ان کے نام بڑے بڑے ادباء سے لے کر نئے اور سطح کے ادبا کی کتابیں اور خطوط میں جہاں مرحوم کی اخلاقی رواداری وشرافت اور خوش طبعی کا ذکر ہے وہیں اردو زبان کو ادب کے حوالے سے بھی کئی کارآمد اشارے ملتے ہیں۔''

کوئی بھی انسان یوں ہی مشہور نہیں ہو جاتا ہے یا کوئی بھی انسان پیدائشی مقبول نہیں ہوتا ہے۔انسان جب عالمِ وجود میں آتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنی ماں کی گود میں ماں کی ممتا کو محسوس کرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ تمام رشتہ داروں سے مانوس ہو کر رشتوں کی قدر واہمیت کو سمجھتا ہے۔پھر وہ معاشرے میں پہنچتا ہے

تب جا کر اپنے معاشرتی حقوق وفرائض سے روشناس ہوتا ہے۔ بہ تدریج یونہی بڑھتے بڑھتے اپنے کردار و اعمال کی بنیاد پر شہرت اور مقبولیت حاصل کرتا۔ بک امپوریم کے بانی جناب حمید انور صاحب کی داستان زندگی بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ آپ کے صاحب زادے جناب ممتاز فرخ آپ کے متعلق یوں گویا ہیں۔

''والد صاحب صبح اٹھتے ،غسل کرتے ،قران کی تلاوت کرتے اور چائے پی کر کمرہ سے نکل جاتے۔ باری باری دوست احباب کے گھر جا کر ان لوگوں کی خیریت دریافت کرتے۔ ہم وطن اور بچپن کے دوست راغب الہدیٰ صاحب کے گھر بھی جاتے۔ کبھی کبھی وہاں سے ناشتہ وغیرہ کر کے نکلتے یا پھر جو بیمار ہیں ان کی عیادت کرتے۔ وہ جو مستقل طور پر روزانہ دکان آتے ،اگر وہ کچھ دنوں تک دکان نہیں آتے تو ان کی خیریت دریافت کرنے کے لئے چلے جاتے۔ اگر کوئی آدمی کسی اسپتال میں بھرتی ہے جو اپنے گاؤں کا ہے یا جان پہچان کا ہے اس کی خیریت وحالت جاننے کے لئے چلے جاتے۔ صبح میں اٹھنے کا یہ فایدہ ہوتا تھا کہ ٹھیک ۹ بجے آ کر دکان کھول دیتے تھے۔ وقت پر دکان کھولتے اور وقت پر بند کرتے۔ وہ وقت کے بڑے پابند تھے۔ وہ معینہ وقت پر موجود رہتے تھے۔ کسی کو انتظار نہیں کراتے اور نہ ہی کسی کا انتظار انہیں پسند تھا۔''

یہ تھے حضرت حمید انور صاحب کے کچھ معمولات زندگی۔ یوں تو دیکھنے میں یہ کچھ معمولی معمولی امور ہیں لیکن حقیقتاً یہی انسانی صفات عالیہ انسان کو مشہور ومقبول بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں اور ہر دلعزیزی بھی بخشتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں دنیا وآخرت کے لئے اخلاق بہت بڑا سرمایہ ہے۔ لیکن صد افسوس کہ تھوڑی سی بھی عزت وشہرت حاصل ہوتے ہی انسانوں کے اندر سے سب سے پہلے یہی سب سے بڑا سرمایہ رخصت ہونے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ اس انسان میں بداخلاقی سرایت کر جاتی ہے۔ جو دین ودنیا کے لحاظ سے بہت ہی زیاں رسا ہوتی ہے۔ لیکن جناب حمید انور کی اخلاقی قدر کے متعلق آپ ہی کے ہم وطن جناب پروفیسر شہنواز شبلی بن علقمہ شبلی کچھ یوں رقم فرماہیں۔

''حمید دادا بے غرض اور بے لوث دوستی اور رشتہ داری نبھانے کے گر سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اپنے ملنے والوں کے درمیان کھلی کتاب تھے، جو چاہے جس طرح چاہے انہیں بہ آسانی پڑھ لے۔ جن سے دوستی اور رشتہ داری قائم کی ان سے دوستانہ مراسم تا عمر نبھانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ بے حد مخلص اور اخلاص پسند طبیعت کے مالک تھے۔ مدبر وتعقل وتحمل وتفکر، شرافت ونفاست، دانائی وحکمت ،بصیرت و بصارت، دور بینی ودوراندیشی اور خاکساری وانکساری جیسے اوصاف ان کی شخصیت، ان کی گفتگو اور ان کے رکھ رکھاؤ سے عیاں تھے۔ ان کا اختصاصی پہلو یہ بھی تھا کہ اگر ان کا کوئی قریبی دوست یا رشتہ دار کسی نئے یا اجنبی شخص کو اپنے حوالے سے ان کے پاس بھیج دیتا تو وہ اس شخص سے نہ صرف بھرپور تعاون کرتے بلکہ اسے

اپنا عزیز بھی بنا لیتے۔مزید برآں اس کی اتنی دلجوئی و پذیرائی کرتے کہ اسے اجنبیت کا احساس نہ ہوتا۔‘‘

ناچیز یہاں اس امر کی توضیح ناگزیر تصور کرتا ہے کہ پروفیسر شہنواز شبلی نہ صرف بک امپوریم کے بانی جناب حمید انور صاحب کے صرف ہم وطن ہیں بلکہ اس خانوادہ کے بہت قریب رہے ہیں۔چونکہ حمید انور صاحب تلاش رزق میں شہر نشاط کلکتہ گئے اور کافی عرصے تک وہاں مقیم بھی رہے چنانچہ آمد و رفت بھی جاری رہی۔اس طرح دونوں کے درمیان قربت میں اضافہ ہوتا گیا۔چنانچہ دونوں ہی ہر خوشی و غم میں برابر کے شریک رہے۔اس لئے شہنواز شبلی جس گہرائی سے جناب حامد انور کا علم رکھتے ہیں اتنا کوئی بیرونی شخص نہیں رکھ سکتا۔

معروف وجید عالم و صاحب طرز ناقد و محقق حضرت حقانی القاسمی اپنے تجربات و مشاہدات و ملاقات کی بنیاد پر جناب حمید انور اور آپ کی کتاب کی دکان بک امپوریم کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

’’پٹنہ کی تاریخی و تہذیبی شناخت کے بہت سے حوالے ہیں مگر شائقین اردو کے لئے وہاں جو ایک روشن حوالہ ہے اس کا نام بک امپوریم ہے۔یہ بہار میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان ہے مگر اس کی شہرت و شناخت کا دائرہ صرف سبزی باغ تک محدود نہیں ہے بلکہ پورے ہندوستان تک پھیلا ہوا ہے جس طرح پرانی دہلی میں مولوی سمیع اللہ قاسمی کا ’کتب خانہ عزیزیہ‘ ہندوستان بھر کے ادیبوں اور شاعروں کا مرکز ہوا کرتا تھا جہاں جوش، فراق، مجروح، جگر، حسرت، حفیظ، سائل، ساحر اور نہ جانے کیسے کیسے شعراؤ ادباء آتے اور محفلیں جمتیں، ادبی گفتگو ہوتی اور بڑے بڑے ادیب و شاعر بھی وہاں لکڑی کے تخت اور بنچ پر بیٹھنے میں فخر محسوس کرتے۔اسی طرح بک امپوریم پر کھڑے کھڑے کتابوں کا مطالعہ کرنے میں ادباء و شعراء مسرت محسوس کرتے تھے۔ہندوستان کے دار السطنت دہلی میں جو ادبی اور ثقافتی مرکزیت ’کتب خانہ عزیزیہ‘ کو حاصل تھی وہی مرکزیت بہار کے دارالحکومت پٹنہ میں ’بک امپوریم‘ کو حاصل ہے۔یہاں بھی ادباء و شعراء کا جمگھٹا رہتا تھا اور باہر سے آنے والے ادیبوں اور شاعروں کے لئے کشش کا ایک مرکز بھی ہوا کرتا تھا۔دراصل بک امپوریم کی قوت کشش جو شخصیت تھی اس کا نام حمید انور تھا۔ان کے خلوص، محبت اور ادبی شوق و ذوق کی وجہ سے ایک چھوٹی سی جگہ میں پوری اردو دنیا سما گئی تھی۔یہ صرف کتابوں کی فروخت کی ایک چھوٹی سی دکان نہیں تھی بلکہ ادبی موضوعات و مباحث پر ادبی معرکہ آرائیوں اور مکالموں کا ایک مرکز بھی تھی۔بک امپوریم ادیبو، شاعروں اور صحافیوں کا ایک خوبصورت سنگم تھا۔اس کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں ہندوستان بھر کے رسائل و جرائد بہ آسانی مل جاتے تھے اور الگ الگ ادبی موضوعات پر کتابیں بھی دستیاب ہو جاتی تھیں۔پوری کتابی دنیا سے واقفیت کا ایک اہم وسیلہ بھی یہی ادارہ تھا۔بک امپوریم نے نہ صرف کتابوں کی فروخت کا کام کیا بلکہ اہم کتابوں کی اشاعت بھی اس ادارہ نے کی۔کتابوں کی ایک چھوٹی سی

دکان بہت مختصر عرصہ میں ایک بڑی کتابی کائنات میں تبدیل ہو جائے گی یہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا مگر حمید انور کے خلوص نے یہ معجزہ کر دکھایا۔‘‘

حضرت قاسمی صاحب کی نوک قلم سے ایسے توصیفی الفاظ اس امر کے بین ثبوت ہیں کہ بک امپوریم اوراس کے بانی جناب حمید انور صاحب کی حیثیت منفرد رہی ہے۔

یہ کتاب ’’محبّ اردو حمید انور اور بک امپوریم‘‘ کل سات ابواب پر مشتمل ہے۔اس کے پہلے باب میں کل ۳۴ مضامین ہیں۔کیا یہ حیرت انگیز نہیں ہے کہ محض ایک کتاب کی دکان اوراس کتاب کی دکان کے بانی و مالک جو ایک زبان وادب سے محبت کرنے والے انسان تو رہے۔لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تخلیقیت سے کنارہ کش ہی رہے۔ایسی شخصیت پر کل ۳۵ مضامین کا ہونا بڑی بات ہے۔جبکہ مضامین نگاروں میں ماضی وحال کے ہر درجہ کے مضمون نگار شامل ہیں۔مثال کے طور پر پروفیسر افصح ظفر، انیس رفیع، ضیا الرحمٰن غوثی، طلحہ رضوی برق، ظفر کمالی، عاصم شہنواز شبلی، عبدالصمد، عطا عابدی، قاسم خورشید، کوثر مظہری، مشرف عالم ذوقی، مناظر عاشق ہرگانوی، سید احمد قادری اور نثار احمد صدیقی جیسے کہنہ مشق اور بلند قد اہل قلم ہیں۔مذکورہ کتاب کے مشمولات میں شامل مضامین کچھ مختصر بھی ہیں اور کچھ طویل بھی۔غرض کہ ان میں جناب حمید انور اور بک امپوریم کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔

بعدازیں دو ابواب پر مشتمل مکتوبات ہیں۔جن میں پہلا باب ’’مشاہیر کے مکتوبات تعلقات کے حوالے سے‘‘ ہے۔دوسرا باب ’’مشاہیر کے مکتوبات تعزیت کے حوالے سے‘‘ ہے۔یہ ایک بلاتردید حقیقت ہے کہ جو بھی شخص عالم ہستی میں آتا ہے اور عہد طفلی سے عہد شباب میں قدم رکھتا ہے اس کا ایک حلقۂ احباب ہوتا ہے۔یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ احباب اپنے گاؤں، محلّہ یا شہر تک ہی محدود ہوں بلکہ یہ حلقہ ریاستی، قومی، یا عالمی طور پر بھی وسیع ہوسکتا ہے۔اب یہ وسعت انسان کے اخلاق، کردار، معاملات، ذوق اور ضروریات پر منحصر کرتی ہے۔اس معاملے میں دو ہی قسم کے افراد کا حلقہ بہت وسیع ہوسکتا ہے......ایک اہل قلم اور دوسرا تاجر۔لیکن ناچیز یہاں جس شخص کا ذکر خیر لے کر بیٹھا ہے وہ نہ تو کوئی بین الاقوامی تاجر ہیں اور نہ ہی کوئی بہت بلند قد اہل قلم ہیں۔پھر بھی آپ کے حلقہء احباب کی وسعت کو دیکھ کر عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے۔مذکورہ کتاب کے اس دوسرے باب میں کل ۵۶ مکتوبات ہیں۔ویسے یہ اعداد تو حیرت انگیز نہیں ہیں کیونکہ زندگی میں کتنے ہی لوگوں سے کہاں کہاں، کب کب اور کس کس مقام پر نیز کن کن اسباب کے باعث ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔چنانچہ ان ۵۶ مکتوبات کو حیرت انگیز اور تحیر خیز نہیں کہا جا سکتا ہے۔حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ان مکتوبات کے مکتوب نگار کون کون سی شخصیات ہیں اور کہاں کہاں سے تعلق رکھتے ہیں۔ان مکتوب نگاروں کی شخصیت اور حیثیت کیا ہے۔اسی کے باہم ان کے قد کی بلندی کتنی ہے۔یہ واقعی

تحیر خیز امر ہے کہ ایک عام شخص جو صرف ایک کتاب کی دکان کا مالک ہے۔اس کے حلقہء احباب میں شامل ایسے ایسے جید اور بلند قد اہل قلم ہیں جن کے قریب جانے میں خود اہل قلم کے قدموں میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔مثال کے طور پر ناچیز کے استاد محترم حضرت علقمہ شبلی، علی سردار جعفری، مظہر امام، خالد ندیم (مہاراشٹر) حرمت الکرام (مرزا پور) فضا ابن فیضی (مئو ناتھ بھنجن) سلام بن رزاق (ممبئی) انیس ساز (کراچی) مظفر حنفی (دہلی)، پروفیسر حامد ندیم، شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آبادی آباد) شام بارک پوری (کھلنا) پروفیسر فضیل احمد قادری (شیلانگ) یہ ان ۵۶ مکتوب نگاروں میں چند معدودے اسمائے گرامی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی مقبولیت اور شہرت کہاں کہاں تھی اور کن کن شخصیات کی نگاہوں میں آپ کی قدر و منزلت تھی۔ دنیائے ادب میں شہرت و مقبولیت حاصل کرنا کوئی کار سہل نہیں ہے۔وہ بھی اس دور میں جب ارض ہند پر دنیا کے منفرد نقاد و ادبا و شعراء ہوتے تھے۔

مذکورہ کتاب کا تیسرا باب بہ عنوان ''مشاہیر کے مکتوبات: تعزیت کے حوالے سے'' ہے۔اس باب میں ۲۴ تعزیتی مکتوبات ہیں۔اب ظاہر سی بات ہے کہ یہ مکتوبات کن کن شخصیات کے ہوں گے۔ بلا شبہ جن جن شخصیات سے آپ کے تعلقات استوار تھے۔ ہاں ایسے مواقع پر صاحبان شہرت کے قدردانوں اور چاہنے والوں میں وہ بھی شامل ہوتے ہیں جن سے ان کے تعلقات استوار نہیں ہوتے۔ چنانچہ ناچیز کو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تعزیتی مکتوبات مزید بھی ہوں گے۔ کیونکہ ایسے مواقع پر اپنے پرائے سب کے سب یاد کرتے ہیں۔ممکن ہے کہ ان مکتوبات کی حفاظت نہیں ہو پائی یا ان میں کچھ خاص نہیں ہوں گے۔علاوہ ازیں مذکورہ کتاب میں ایک باب کی حیثیت سے ''ڈائری کے منتخب حصّے'' اور ایک باب ''متفرقات'' پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں ہی ابواب کافی معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔

الغرض کتاب ''حمید انور اور بک امپوریم'' ایک منفرد کتاب ہے۔جس سے بات پایہء ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اگر اخلاق بلند ہو تو مقبولیت و شہرت خود قدم بوسی کو دوڑی چلی آتی ہے۔وہ بھی ایسی شہرت جو سرحدوں کے پار بھی چلی جاتی ہے۔ جہاں تک ادبی کتاب کی دکان کا سوال ہے تو ویسی کتنی دکانیں ہیں۔عین اسی جگہ جہاں پر بک امپوریم ہے، کئی ادبی و دینی کتابوں کی دکانیں ہیں لیکن انہیں وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہیں ہے جو بک امپوریم کو حاصل ہوئی ہے۔ادبی دنیا میں شخصیت کا تعین بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔اس کے لئے اہل قلم حضرات کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر شخصیت کا تعین ہوتا ہے۔ ایسا کم ہی مشاہدے میں آتا ہے کہ محض اخلاق کی اساس پر کسی نے اپنی بین الاقوامی شخصیت تعمیر کی ہو۔

◄◄ ● ►►

مکتوبات

- ویسے تو کسی اردو رسالہ کا خصوصی شخصیت نمبر آج ہمارے ادبی کاروبار کا حصہ بن گئے ہیں۔لیکن ثالث کے ''شوکت حیات نمبر'' پر اس کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا کہ یہ شوکت حیات کے انتقال کے بعد منظر عام پر آیا ہے اور محض اعتراف فن کی علامت ہے۔ دیکھا جائے تو یہ خصوصی شمارہ کئی معنوں میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ عقیدت اور محبت کے ایسے والہانہ اظہار سے عبارت ہے جو ایک طرف تو صاحب نمبر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے تو دوسری طرف نقد و نظر کے نئے در بھی وا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد صاحب بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے شوکت حیات کے انتقال کے بعد اعتراف فن اور حق دوستی ادا کرتے ہوئے متذکرہ شمارے کو زیور طبع سے آراستہ کیا۔

اردو زبان و ادب کے بسیط منظر نامے پر ادھر پچاس سال میں جو افسانہ نگار بام افق پر چمکے اور اپنی تابانی سے ایک جہاں کو منور کیا ان میں شوکت حیات کا نام یقیناً معتبر بھی ہے اور اہم بھی۔ بقول ڈاکٹر اقبال حسن آزاد وہ صرف افسانہ نگار ہی نہیں تھے بلکہ نظریہ ساز بھی تھے۔انھوں نے اردو ادب کو انامیت کی تھیوری دی۔ ان کے قدردانوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ان کا ایک افسانہ ''گنبد کے کبوتر'' جو بابری مسجد کی شہادت کے پس منظر میں ہے بہت مقبول ہوا۔

تقریباً پانچ سو صفحات پر محیط زیر نظر شمارے میں ڈھائی درجن انتہائی معتبر قلمکاروں نے شوکت حیات کی شخصیت اور ان کی افسانہ نگاری پر سیر حاصل گفتگو کی اور ان کے فن پاروں کو سراہا ہے۔اس کے علاوہ شوکت حیات کے لکھے ہوئے مشاہیر کے نام خطوط ان کے تنقیدی مضامین اور ان کے سات منتخب افسانے اور ایک ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' بھی اس ضخیم نمبر میں شامل ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ادبی کساد بازاری کے اس دور میں بھی ثالث کا یہ شوکت حیات نمبر طالب علموں اور ادب دوستوں کے ہمیشہ کام آئے گا۔ ضیاء فاروقی (بھوپال)

- ثالث کا شوکت حیات نمبر گذشتہ ہفتے ہی مل چکا تھا۔ کافی ضخیم ہے۔ ۴۹۶ صفحات پر مشتمل۔ اس کے لیے اقبال حسن آزاد مبارکباد کے مستحق تو بنتے ہی ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ان کی جان کا ہی کو بھی سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں اردو دوست ہیں۔ ایسے مدیروں میں نہیں جو کرتے کم ہیں کہتے زیادہ۔ ظاہر ہے اتنے ضخیم شمارے کو پڑھنے کے لیے وقت درکار ہے۔ فی الحال کچھ خاکے اور دو ایک مضامین ہی پڑھ پایا ہوں۔ خاکہ پڑھ کر مشتاق احمد نوری صاحب کو فون کیا۔ کیونکہ انھوں نے وہ وہ لکھا گویا وہ بھی میرے دل میں تھا کے مصداق ثابت ہوا۔ میں نے انھیں مبارکباد بھی دی اور دو ایک جگہ ان کے خیالات سے انحراف بھی کیا۔ انحراف کی یہ صورت کچھ زیادہ ہی شدید ہوگئی جب وارث علوی کے مضمون پر نظر ٹھہری۔ افسوس کہ وہ مرحوم ہو چکے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ اگر زندہ ہوتے تو ان کے اس مضمون کے بارے میں سیکھنے کی غرض سے کچھ سوالات ضرور پوچھتا۔ بہر حال تفصیلی گفتگو پھر کبھی فی الحال اقبال حسن آزاد صاحب کے لیے مبارکباد اور شکر گزار ہوں کہ انھوں نے یہ دستاویزی شمارہ عنایت کیا۔ شبیر احمد (کولکاتہ)

- سہ ماہی ثالث شمارہ نمبر ۲۱۔۲۲ بابت جنوری ۲۲ تا جون ۲۲ میرے سامنے ہے جو شوکت حیات نمبر کی شکل میں شائع ہو کر ادب نوازوں کے ذوق مطالعہ کی تسکین کا سامان بن کر چرچا میں ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے اور رنگ کا سلکشن مدیران کے حسنِ لطافت کا پتا دیتا ہے۔ اداریہ میں حوصلہ مندی پر زور دیا گیا ہے۔ یہ حوصلہ ہی تو ہے جس کے دم پر اتنا ضخیم نمبر نکل پانا ممکن ہو سکا ہے۔ شوکت حیات فکشن کا بڑا نام ہے جس کا ایک زمانہ معترف ہے۔ انہیں سنِ بلوغت سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ اس شمارے میں شامل ان کے افسانوں کو پہلے بھی پڑھا ہوگا لیکن شاید اتنا نہیں سمجھ سکا تھا جتنا کہ اب۔ ان کا اسلوب، ٹریٹمنٹ اور اختصار انہیں کا حصہ ہے۔ اقبال حسن آزاد صاحب نے ان پر نمبر نکال کر بڑا کام کیا ہے اور اپنے سینئر کو بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ورنہ حالات تو یہ ہیں کہ اپنے سوا آج کسی کو کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آتا۔ کسی کا قول یاد آتا ہے کہ بڑا وہ نہیں جو خود کو بڑا سمجھتا ہے بلکہ بڑا وہ ہے جو دوسرے کو بڑا بناتا ہے۔ صفر ایک کے ہندسہ کی بغل میں کھڑا ہو کر صفر کو دس (۱۰) بنا دیتا ہے۔

اقبال حسن آزاد صاحب نے موصوف کی شخصیت کے حوالے سے نادر مضامین یکجا کیے ہیں۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں کتنی کد و کاوش کرنی پڑی ہوگی۔ اس سے صاحب شمارہ کی شخصیت کے تمام گوشوں پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ رسرچ اسکولرس کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے فکشن نگاروں کے لیے وافر مواد اکٹھا کر دیے گئے ہیں۔ نوجوان نسل کے مضمون نگاروں میں ڈاکٹر اشہد کریم، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، ڈاکٹر قسیم اختر وغیرہم نے متاثر کیا۔ نثار احمد صدیقی نے موصوف سے مفصل انٹرویو لیا ہے جس سے صاحبِ مصاحبہ کی پرت در پرت کھلتی گئی ہے۔ میں تمام مضامین پر الگ الگ تبصرہ کرنے کا خود کو اہل نہیں پاتا ہوں اور اختصار بھی ملحوظ ہے۔ گزشتہ شمارے یعنی حسین الحق نمبر میں شائع میرے لکھے تعزیتی قطعات پر مشاہیر نے اپنے تبصرے میں، پسندیدگی کا اظہار کیا ہے، میں ان کا شکر گزار ہوں۔ میری شاعری کے حوالے سے حسین الحق کے مضمون پر سلیم انصاری، عشرت ظہیر، ریحان کوثر، منصور خوشتر صاحبان نے مثبت تبصرے کیے ہیں، ان کی ذرہ نوازی ہے۔

کل ملا کر یہ شمارہ بلاشک دستاویزی حیثیت کا حامل ہے جو معیار کے اعتبار سے بھی نئی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ واقعی اسے پکی جلد بنوا کر محفوظ رکھا جانا چاہیئے۔ فاروق ارگلی صاحب نے بھی اسکی طرف اشارہ کیا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ اقبال صاحب کے ترکش میں ابھی بہت کچھ ہے۔ مدیران اور جریدہ، سب کی صحت و کامرانی کی دعا کرتا ہوں۔

مرغوب اثر فاطمی (گیا، انڈیا)

- برصغیر کے مشہور و معروف افسانہ نگار اقبال حسن آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ ''ثالث'' کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اپنے ہر نئے شمارے کے ساتھ وہ ادبی دنیا میں ثالث کی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ اقبال حسن آزاد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اس پر آشوب دور میں بھی رسالہ ثالث کو ہاتھوں ہاتھ پہنچا رہے ہیں۔ شوکت حیات جو اس عہد کے اہم افسانہ نگار تھے اور اپنی زندگی میں ہی بے توجہی کا شکار رہے۔ ثالث نے شوکت حیات نمبر شائع کر کے کچھ حد تک ان کی روح کو سکون پہنچائی ہے۔ ۴۹۶ صفحات پر مشتمل ثالث کے اس شوکت حیات نمبر میں ان کے فن اور زندگی کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ اس شمارے

میں شوکت حیات پر۱۹ مضامین، ۷ خاکے،۳ تجزیے،۲ مکالمے اور شوکت حیات کے۳ خطوط کے علاوہ شوکت حیات کے تین مضامین، ۷/افسانے اور ایک ناولٹ شامل اشاعت ہیں۔ ثالث نے ہمیشہ سے ہی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس شوکت حیات نمبر میں بھی نوجوان ریسرچ اسکالرز کی اچھی خاصی تعداد دکھائی دے رہی ہے جنہوں نے شوکت حیات کے فن اور شخصیت کے حوالے سے اپنا ایک الگ زاویہ پیش کیا ہے۔ ثالث کا یہ شمارہ اردو دنیا میں ایک اہم اضافے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے اس خوبصورت رسالے اور شوکت حیات نمبر کے لئے اقبال حسن آزاد صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اصغر شمیم (کولکاتہ)

- ’زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان‘‘ ’’ثالث‘‘ ’شوکت حیات نمبر‘، جلد نمبر ۶۔۷ اور شمارہ ۲۱۔۲۲ باصرہ نواز ہوا۔ جو علم وادب کے خزانوں سے معمور ہے۔ ہم سبھی اس امر سے واقف ہیں کہ اس پُر آشوب و پرفتن دور میں ادبی رسالے کی اشاعت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ’ثالث‘ میں مشہور ادیبوں اور افسانہ نگاروں پر مشتمل مقالات اور نمبرات کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جو اردو محققین کے لیے مشعلِ راہ سے کم نہیں ہے۔

شوکت حیات پر مختلف ادبا کے تحریر کیے گئے مضامین، خاکے، تجزیے، مکالمے، شوکت حیات کے خطوط، اُن کے مضامین، افسانے، ناولٹ نیز ’ثالث‘ پر مختلف مشاہیر کے تبصرے اور مکتوبات قابلِ ذکر ہیں۔ پُر تکلّف اور متحرک انداز کی ایسے رسائل جن سے علمی تشنگی کی تسکین کے ساتھ خیالات ونظریات کی بلند پروازی میں مدد ملے، اسے ضرور استفادہ کرنا چاہئے۔

مجموعی طور پر ’ثالث‘ کے تمام شمارے تازگی وتوانائی سے پُر نہایت ہی قیمتی اور تشفی بخش ہیں۔ ’ثالث‘ ظاہری ومعنوی دونوں اعتبار سے سنجیدہ رسالہ ہے۔ یقیناً اس رسالے سے آنے والے وقتوں میں تحقیق وتنقید کے نئے باب وا ہونگے۔ ہم سبھوں کی ذمہ داری ہے کہ خودمختار رسالوں کے اشاعت میں ہر طرح کا تعاون پیش کریں۔ لہٰذا راقم الحروف دعا گو ہے کہ خدا اس معیاری اور خوبصورت رسالہ کو نظرِ بد سے محفوظ رکھے اور مُدیران سے وابستہ افراد کو عمر درازی نصیب ہو۔ آمین! بہرحال راقم الحروف مناظر

حسن شاہیںؔ کے درج ذیل شعر کے توسّط سے آپ کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے:۔

یہ برق و باد کی یورش، یہ سر پھرا طوفاں   یہی تو وقت ہے شاہیںؔ اُڑان بھرنے کا

معتصم باللہ (مگدھ یونیورسیٹی، گیا)

- عظیم المرتبت پروفیسر اقبال حسن آزاد صاحب کا تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں کہ انھوں نے بطور تحفہ مجھے ثالث کا شوکت حیات نمبر عنایت کیا ہے۔اس سے قبل بھی وہ مجھے ثالث کے مطالعے کا موقع فراہم کرتے رہے ہیں۔

ستر کی دہائی میں اردو افسانے کے بڑے اور نئے منظر نامے پر جن افسانہ نگاروں نے اپنی پہچان ثبت کی ہے ان میں شوکت حیات نہایت ہی ممتاز اور منفرد مقام کے مالک ہیں۔ یہ نمبر موصوف کے لیے قابل قدر خراج عقیدت ہے۔میں اس کار ہائے نمایاں کے لیے اقبال حسن آزاد صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نوشاد احمد کریمی (بتیا، انڈیا)

- ثالت ۲۱۔۲۲ کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ جو شوکت حیات نمبر کے طور پر شائع ہوا ہے ۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ حضرت شوکت حیات اپنی زندگی میں اتنا ضخیم اور خوبصورت نمبر دیکھ لیتے تو شاید اللہ سے مزید جینے کی اجازت مانگتے اور مرنے کا ارادہ ترک کر دیتے۔ اسے میری مبالغہ آرائی پر محمول نہیں سمجھنا چاہیے۔انھیں قریب سے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ زندگی بھر اس خواہش کی تکمیل کے لیے بے قرار رہے۔ زندگی میں تو کوئی اس کام کے لیے سامنے نہیں آیا لیکن وفات کے بعد اقبال حسن آزاد نے انھیں اس رنج وغم اور خواہش سے آزاد کر دیا۔ یقیناً عالم ارواح سے اگر شوکت بھائی اسے دیکھ رہے اور سن رہے ہوتے تو انھیں ایک گونا اطمینا ہو جاتا۔

کہتے ہیں کہ شوکت حیات نے بہت کم لکھا اور شاید اس بات میں سچائی بھی ہو کیوں کہ جب ہم بہار میں اردو فکشن کی صورت حال پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو تصویر کچھ اور بنتی ہے۔ دور کیوں جائیے ان کے معاصرین جو ہمیشہ ان کے آس پاس یا ساتھ ساتھ رہے ان میں سے بیشتر بالحاظ مقدار ان سے بہت آگے ہیں۔ عبد الصمد ہوں یا حسین الحق، مشتاق احمد نوری ہوں یا شموئل احمد، ترنم ریاض ہوں یا ذکیہ مشہدی، سید محمد اشرف

ہوں یا طارق چھتاری، یہ سبھی ان سے آگے ہیں اور اگر ذوقی کو بھی جوڑ لیں وہ تو سب سے آگے نظر آتے ہیں، اگر ذوقی کو مہلت ملی ہوتی تو پچھلے دو سال میں اتنا کچھ اپنے سرمایہ میں اضافہ کر لیتے جتنا کہ شوکت کی کل کائنات ہے۔اس حقیقت کہ باوجود سچائی یہ ہے کہ جب بھی سنہ ۷۰ یا سنہ ۸۰ کے بعد فکشن پر کوئی سنجیدہ گفتگو یا بحث ہوتی ہے تو اس میں بلاشبہ شوکت حیات کا نام بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

۵۰۰ صفحات پر یہ مشتمل شمارہ اچھا تو ہے مگر اس میں آپ نے صلح کل کا فارمولہ اپنایا ہے یہ بڑی اچھی بات ہے۔آپ اپنے جونیئرس کا نہ صرف اعتراف کرتے ہیں بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔لیکن یہ مجلّہ یا کسی رسالہ کی صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔یو شڈ بی سلکٹیو اور آپ کو چوزی ہونا پڑے گا۔آخر ایڈیٹر کی پسند اور ناپسند بھی تو ضروری ہے۔آپ سے آپ کا حق کس نے چھینا ہے۔آپ نے موصول ہونے والے سبھی مضامین، تجزیے، خاکے اور انٹرویو کو شامل کر لیا ہے۔نتیجتاً ان میں تکرار کی صورت ہمیں کھلتی ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ مضامین میں کئی قلم کاروں نے اوروں کی تنقید کی بیساکھی کے سہارے منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں نو آموز اور پختہ کار قلم کار کی کوئی تفریق نہیں۔

میرا جو مضمون آپ نے شامل کیا ہے وہ کم وبیش ۱۸ سال پرانا ہے۔یہ مضمون پہلی دفعہ اکتوبر ۲۰۰۴ میں ماہنامہ 'سبق اردو' میں 'دیباچہ ایک غیر مرتب افسانوی مجموعے کا' کے عنوان سے شائع ہوا جس کے بارے میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ شوکت حیات کی فکر وفن پر بہت سے ناقدین نے بہت کچھ لکھا ہے۔میں نے بھی ایک مقالہ 'دیباچہ ایک غیر مرتب افسانوی مجموعہ کا' لکھا۔جسے پہلے ایک رسالہ نے شائع کیا پھر بھیونڈی کے رسالہ 'تکمیل' میں گوشۂ 'شوکت حیات' میں شائع ہوا۔لیکن یہاں عنوان بدل کر شوکت حیات کے افسانے کر دیا گیا۔'دیباچہ ایک غیر مرتب افسانوی مجموعہ کا' کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ہوا یوں کہ بہت پہلے شوکت بھائی نے بہار اردو اکیڈمی سے اپنا افسانوی مجموعہ چھپوانے کے لیے مالی تعاون لیا تھا لیکن وہ پیسہ کھا پی کر بیٹھ گئے اور افسانوی مجموعہ ایک عرصہ تک منتظر اشاعت رہا،لیکن جب میں نے اپنا یہ مضمون شائع کرا دیا تو وہ بڑے فکر مند ہوئے۔بالآخر ان کا مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہوا۔یہی

مجموعہ/کہانی ان کا نقطۂ عروج تھا اور یہی ان کی فکروفن کا نقطۂ انجماد بھی۔

مضامین کے علاوہ خاکے کے تحت بشمول ناچیز کہ آپ نے سات خاکے دیئے ہیں۔ مشتاق احمد نوری اور عبدالصمد کے خاکوں کا تو کوئی جواب نہیں۔انھوں نے واقعی دوستی اور فن کا حق ادا کر دیا ہے۔غضنفر، ڈاکٹر منظر اعجاز، اقبال حسن آزاد اور نشاط پروین بھی کم نہیں۔خط کے طوالت کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ ابرار رحمانی (نئی دہلی)

- ابھی ابھی ثالث کا ''شوکت حیات نمبر'' شمارہ ۲۱۔۲۲ موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ اقبال حسن آزاد بھائی آپ کی محبت کو سلام میری نظر میں یہ شمارہ دستاویزی حیثیت کا حامل اور آپ کی فکری وسعت، مدیرانہ صلاحیت کا آئینہ ہے۔ ریسرچ اسکالر کے لئے معلوماتی ہے۔مشمولات اور ترتیب خوب ہے۔''ثالث'' اردو کے فروغ کی ایک اہم کڑی ہے۔سرورق جاذب نظر ہے۔مطالعہ کرنے کے بعد اپنے تاثرات قلم بند کرونگا۔ ڈاکٹر احسان تابش (گیا)

- کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے
آتش کے اس شعر کا اطلاق سوفی صد میری اس کاوش پر ہوتا ہے جس کا ثمرہ ثالث کا شوکت حیات نمبر کی شکل میں مجھے آخر مل ہی گیا۔اسے مدیر ثالث کا کمال کہیں یا شوکت بھیا کی محبت کہ آج جب رسالوں کے قارئین اور خریداروں کا ہر سمت رونا ہے، یہ شمارہ، مفت یا تحفتاً کیا کہیں مول لے کر بھی ایک دفعہ ناچیز کے ہاتھوں سے پھسل چکا تاہم اس جواں مرد نے آتش کے اس شعر کو یاد کیا اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ اویناش امن (پٹنہ)

◄ ● ►

اقبال حسن آزاد کا

چوتھا

افسانوی مجموعہ

اوس کے موتی

(زیر طبع)